اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے 24 ویں فقہی سمینار مؤرخہ 1 تا 3/ مارچ 2015ء منعقدہ دار العلوم اسلامیہ اوچرا (کیرالا) میں پیش کئے جانے والے علمی وتحقیقی مقالات اور مباحثات کا مجموعہ]

ایفا پبلیکیشنز - نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	اعضاءواجزاءانسانی کا عطیہ
صفحات	:	641
قیمت	:	470/روپئے
سن طباعت	:	جنوری 2016

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

161-ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر:9708
جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
ای میل:ifapublication@gmail.com
فون:011 - 26981327

مجلس ادارت

١- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی
٢- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
٣- مولانا بدر الحسن قاسمی
۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۵- مولانا عتیق احمد بستوی
٦- مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۹

پہلا باب: تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ		۱۳
سوالنامہ		۱۵
تلخیص مقالات	مفتی محمد سراج الدین قاسمی	۱۹
عرض مسئلہ:		
سوال نمبر (۱، ۲، ۳، ۴)	مولانا خورشید احمد اعظمی	۷۷
سوال نمبر (۵)	مفتی رجیب احمد	۹۰
سوال نمبر (۶، ۷)	مولانا محمد ظفر عالم ندوی	۹۸
سوال نمبر (۸، ۹)	مفتی عبد الرزاق قاسمی	۱۰۹

دوسرا باب: تعارف موضوع

انسانی اعضاء واجزاء کا عطیہ - میڈیکل سائنس کے نقطۂ نظر سے	پروفیسر سید مسعود احمد	۱۲۱
سائنسدانوں نے مصنوعی خون تیار کرلیا	......	۱۳۳

تیسرا باب: تفصیلی مقالات

اجزاء واعضاء انسانی کا عطیہ	مولانا بدر احمد مجیبی ندوی	۱۳۷
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور اس کے احکام	مولانا اقبال بن محمد ٹنکاروی	۱۵۹
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	مولانا خورشید احمد اعظمی	۱۸۲
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی	۱۹۲
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ - اسلام کی نظر میں	مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی	۲۱۶
اجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا نقطۂ نظر	مولانا محمد فاروق دربھنگوی	۲۲۵

زندہ انسان کے اعضاء کا تبرع-فقہ حنفی کی روشنی میں	مفتی فرید احمد بن رشید کاوی	۲۴۱
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا نقطہ نظر	مولانا محمد انیس ندوی	۲۵۵
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف	مولانا محمد ظفر عالم ندوی	۲۶۴
اعضاء انسانی کا عطیہ اور اسلام	مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی	۲۷۵
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	مولانا محمد عثمان بستوی	۲۹۰
اعضاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	۳۰۸
انسانی اعضاء واجزاء سے متعلق شرعی مسائل	مولانا اکرام الحق ربانی ندوی	۳۲۲
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اسلام کی نظر میں	مفتی محمد خالد حسین قاسمی نیموی	۳۳۳
بلڈ بینک کا قیام ضرورت اور اندیشے	مفتی امتیاز ولنوی	۳۴۶
اعضاء انسانی جگر اور آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ-احکام ومسائل	مولانا ریحان مبشر قاسمی	۳۵۷
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	مفتی اعجاز الحسن باندے القاسمی	۳۷۴
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام	مفتی آفتاب عالم غازی	۳۸۴
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	مفتی عمر امین الٰہی	۴۰۷
انسانی خون کا عطیہ اور اسلام کا موقف	مولانا محمد عفان منصور پوری	۴۲۴
اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ سے متعلق احکام	مفتی امانت علی قاسمی	۴۳۵
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور مسائل واحکام	مفتی محمد نصر اللہ ندوی	۴۴۵
اعضاء واجزائے انسانی سے استفادہ	مولانا محمد جمیل اختر جلیلی	۴۵۵
اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ سے متعلق مسائل واحکام	مولانا اشتیاق احمد اعظمی	۴۷۵
اجزاء انسانی کا عطیہ	مولانا محمد مغفور باندوی	۴۸۵
اعضاء انسانی کا عطیہ اور اس کے شرعیہ احکام	مولانا محمد فرقان فلاحی	۴۹۶

چوتھا باب: مختصر تحریریں

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور شرعی احکام	مفتی شبیر احمد قاسمی	۵۱۱
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف	مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی	۵۲۰
اعضاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف	مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی	۵۲۶
انسانی اعضاء کا عطیہ اور اسلام	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	۵۳۵
اعضاء واجزاء انسانی کی پیوندکاری	مولانا محمد ذکوان بن مولانا عمران	۵۴۴
اجزاء انسانی کا عطیہ-اسلام کی روشنی میں	مفتی محمد ابوبکر قاسمی	۵۴۹
انسانی اعضاء واجزاء کا عطیہ-شرعی تناظر میں	مفتی جنید بن محمد پالنپوری	۵۵۳
اعضاء انسانی کا عطیہ	مفتی محمد سلطان کشمیری	۵۶۰
اعضاء انسانی کا عطیہ-فقہ شافعی کی روشنی میں	مفتی رجیب قاسمی	۵۶۶

اعضاء انسانی کے عطیہ کا حکم شرعی	مفتی جسیم الدین قاسمی	۵۷۳
اجزاء انسانی کا عطیہ- اسلامی تناظر میں	مفتی عبدالرشید قاسمی (کانپور)	۵۷۸
اعضاء وجزاء انسانی کا عطیہ- خطرات واندیشے	مولانا محمد نعمت اللہ قاسمی (کھگڑیا)	۵۸۷
اعضاء انسانی کا عطیہ- اسلامی تناظر میں	مفتی شبیر یعقوب دیولوی	۵۹۵
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	مولانا ارشد علی رحمانی	۶۰۰
اجزاء انسانی کا عطیہ	مولانا اشرف عباس قاسمی	۶۰۸
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	مولانا محمد رمضان علی فرقانی	۶۱۵
بلڈ بینک، دودھ بینک اور منی بینک کے شرعی احکام	مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہی	۶۲۳
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور فقہ شافعی	مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی (شافعی)	۶۳۳

☆☆☆

پیش لفظ

انسان کی ایک بنیادی ضرورت علاج ہے، زمانہ قدیم سے علاج کے لئے تین وسائل کا استعمال ہوتا رہا ہے: جمادات، نباتات اور حیوانات- گزشتہ زمانہ میں یہ بات ممکن نہیں ہوتی تھی کہ بطور علاج ایک انسان کا عضو دوسرے انسان کو لگا دیا جائے، اس میں دہری دشواریاں تھیں، جو شخص اپنا عضو دینا چاہے، اس کے لئے ہلاکت کا خطرہ ہوتا تھا، اور جس کو ضرورت ہو، اس کو وہ عضو منتقل کر دیا جائے اور جسم اس اجنبی عضو کو قبول بھی کر لے، اس کے لئے کوئی ٹکنالوجی موجود نہیں تھی۔

انسان نے اللہ تعالی کی دی ہوئی عقل کو استعمال کرتے ہوئے آج یہ صلاحیت حاصل کر لی ہے کہ ایک انسان کے عضو کو دوسرے انسان کو اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں کی زندگی محفوظ رہے، چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے پہلے فقہی سمینار منعقدہ دہلی میں گردوں کی پیوندکاری پر تفصیل سے بحث کی تھی اور اس سلسلہ میں فیصلہ کیا تھا؛ لیکن انسانی اعضاء واجزاء کے استعمال کی اور بھی کئی شکلیں ہیں، ان پر بھی غور کرنے کی ضرورت تھی؛ کیونکہ اب یہ مسائل میڈیکل دنیا میں کثرت سے پیش آ رہے ہیں، چنانچہ اکیڈمی کے چوبیسویں فقہی سمینار منعقدہ دار العلوم اسلامیہ اوچرا (کیرالہ) مورخہ ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۵ء مطابق ۹-۱۱/ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ انسانی اعضاء واجزاء کا عطیہ کرنے اور ان سے انتفاع کے جائز ہونے اور نہ ہونے کے موضوع کو شامل کیا گیا اور اس پر تقریباً ۸۰ مقالات ملک کے مختلف حصوں سے آئے، سمینار میں تفصیل سے مسائل پر بحث ہوئی اور تجاویز منظور کی گئیں، اکیڈمی شروع سے کوشش کرتی رہی ہے کہ اس علمی سوغات کو دوسرے اہل علم تک بھی پہنچایا جائے؛ چنانچہ اب تک اس نوعیت کے پچاس سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، یہ مجموعہ بھی اس میں ایک قیمتی اضافہ ہے، جو موضوع سے متعلق سوالنامہ، مقالات، تلخیصات، عرض مسائل، سمینار میں ہونے والے مباحث اور تجاویز پر مشتمل ہے، جسے اکیڈمی کے

شعبہ علمی کے رفیق عزیزی مولانا محمد سراج الدین قاسمی نے حسن ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے، اللہ تعالی ان کو اس کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور امت کے لئے اس کو نفع کا ذریعہ بنائے۔

(خالد سیف اللہ رحمانی)

جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

تاریخ: 13 ر دسمبر 2015، مطابق یکم ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

پہلا باب

تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ:

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

انسانی اعضاء واجزاء کے عطیہ سے متعلق تمام مقالات کے جائزے اور مباحث کے بعد سمینار یہ محسوس کرتا ہے کہ اس موضوع کا تعلق جہاں شرعی احکام سے ہے وہیں طبی جدید سہولیات اور تحقیقات سے بھی ہے، اس سمت میں آئے دن نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اس لئے بتدریج شرعی احکام بھی آتے رہیں گے۔ اس وقت تک کی جو جدید طبی تحقیقات سامنے آئی ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل تجاویز سمینار نے طے کئے ہیں:

۱- خون انسانی جسم کا ایک اہم اور بنیادی جزء ہے جس سے حیات انسانی کا بقا مربوط ہے، اگر کسی انسان کو خون کی ضرورت پڑ جائے اور ماہر ڈاکٹر کی تجویز ہو کہ اس کے لئے خون ناگزیر ہے تو انسانی جان بچانے کے لئے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو عطیہ کرنا جائز ہے، اسی طرح کسی مسلمان کے لئے اس سے لینا بھی جائز ہے۔

۲- ایسے بلڈ بینک جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہیں اور وہ بینک ضرورتمندوں کو مفت خون فراہم کرتے ہیں وہاں مسلمان کے لئے خون کا عطیہ کرنا جائز ہے۔

۳- رضا کارانہ بلڈ کیمپ لگانا اور بلڈ بینک قائم کرنا بھی انسانی ضرورت کے پیش نظر جائز ہے اور یہ انسانی خدمت میں شامل ہے۔

۴- ایسے نازک موقع پر جہاں خون کا عطیہ نہ کرنے کی صورت میں جان کا خطرہ ہے وہاں مطلوبہ گروپ کے حامل موجود شخص کے لئے اپنا خون عطیہ کرنا ایک اہم انسانی فریضہ اور شرعاً پسندیدہ عمل ہے۔

۵- موجودہ طبی تحقیق کے مطابق زندہ شخص کے جگر کے بعض حصہ کو دوسرے ضرورتمند انسان کو منتقل کرنا ممکن ہو گیا ہے اور عطیہ کرنے والے کے جگر کے بقیہ بچے ہوئے حصے کا چند مہینوں میں مکمل ہو جانا تجربہ میں آچکا ہے،

اس لئے جگر کی منتقلی اور پیوند کاری اپنے کسی عزیز یا دوست کے لئے رضا کارانہ طور پر جائز ہے، البتہ خرید وفروخت قطعاً جائز نہیں ہے۔

۶- انسانی دودھ کا بینک قائم کرنا جائز نہیں، اگر بینک قائم ہوتو اس میں دودھ جمع کرنا اور اس میں کسی طرح کا تعاون کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

۷- مرد یا عورت کے مادہ تولید کا بینک قائم کرنا یا کسی مرد یا خاتون کا کسی بینک کو یا کسی ضرورتمند کو مادۂ تولید فروخت کرنا یا بلا قیمت فراہم کرنا یا لینا حرام ہے۔

۸- زندہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ دوسرے ضرورتمندوں کے لئے منتقل کرنا جائز نہیں ہے، البتہ مردہ کا قرنیہ کسی ضرورتمند کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں اس سلسلہ میں فیصلہ کو موخر کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

سوالنامہ:

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

اسلام میں انسانی زندگی کے تحفظ کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ حالت اضطرار میں جان بچانے کے لئے حرام اشیاء کو کھانے اور پینے کی بھی اجازت دی گئی ہے، انسانی زندگی کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ علاج بھی ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے علاج کرانے کی ترغیب دی ہے، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جیسے بیماریاں اللہ کی مشیت سے پیدا ہوئی ہیں، اسی طرح دوائیں بھی اللہ ہی کے حکم سے وجود میں آئی ہیں؛ لہذا جب بیمار ہو جاؤ تو دوا کا استعمال کیا کرو، خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا علاج کرایا ہے۔

قدیم زمانہ میں عام طور پر نباتات اور جمادات سے علاج کیا جاتا تھا، بعض دوائیں زمین کے اجزاء سے حاصل کی جاتی تھیں، جیسے: چونا، لوہا، سونا، چاندی وغیرہ، اور نباتات تو بے شمار ہیں جن کا دوا کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے اور میڈیکل سائنس کی ترقی کے اس دور میں بھی بیشتر دوائیں نباتات ہی سے حاصل کی جاتی ہیں، جمادات ونباتات کے علاوہ حیوانی اجزاء سے علاج کی صورت بھی زمانہ قدیم سے پائی جاتی ہے، شہد کے شفا ہونے کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، فقہاء کے یہاں بعض جانوروں کے دودھ یہاں تک کہ خون سے بھی علاج کا ذکر ملتا ہے، حدیث سے بطور علاج اونٹنی کے پیشاب استعمال کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ چنانچہ بعض فقہاء اس کے قائل ہیں۔

موجودہ سائنسی ترقی سے پہلے انسانی اجزاء سے علاج کا ایک دو صورتوں کو چھوڑ کر تذکرہ نہیں ملتا، جیسے کتب فقہ میں عورت کے دودھ کو کان کے درد میں بطور دوا کے استعمال کرنے کا ذکر پایا جاتا ہے؛ لیکن انسانی اعضاء اور دوسرے اجزاء کے ذریعہ علاج کا تذکرہ نہیں ملتا، انسانی اجزاء میں سے ایک شخص کا خون دوسرے شخص کو چڑھانے کی اجازت ہے، اور ایک شخص کے عضو کی دوسرے شخص کے جسم میں پیوندکاری کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یہ موضوع اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سمینار میں زیر بحث آچکا ہے اور ایک موقر عالم دین کے اختلاف کے ساتھ شرکاء سمینار نے اسے جائز قرار دیا ہے، دوسری فقہ اکیڈمیوں کے فیصلے بھی اسی نقطہ نظر پر مبنی ہیں۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص دوسرے متعین فرد کو یا کسی بھی ضرورت مند کو زندگی کے تحفظ یا کسی اہم ترین

جسمانی منفعت کے حصول کے لئے اپنے کسی جزء یا عضو کا عطیہ کرسکتا ہے؟ یہ مسئلہ اس لئے قابل غور ہے کہ ایک طرف اس میں انسانی مدد کا پہلو ہے جو شریعت میں ایک پسندیدہ فعل ہے، دوسری طرف انسان کا پورا وجود قابل احترام ہے، انسان کا اپنے کسی عضو یا جزء کو دوسرے کو استعمال کے لئے دے دینا بظاہر انسانی تکریم کی مغایر معلوم ہوتی ہے۔

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

۱- کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بناء پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے؟

۲- قدرتی اور غیر معمولی حادثات میں خون کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے؛ کیوں کہ ایک ہی وقت میں بہت سارے زخمیوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مریض کو جس گروپ کا خون مطلوب ہو فوری طور پر اس گروپ کا خون مہیا نہیں ہوتا؛ چنانچہ اس ضرورت کو پوری کرنے کے لئے بلڈ بینک قائم ہیں جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہیں اور ایسے بینک بھی عام طور پر خون کی قیمت وصول نہیں کرتے، مفت خون فراہم کرتے ہیں؛ البتہ چاہتے ہیں کہ اس کے بدلے میں متاثر شخص کے متعلقین بھی خون کا عطیہ دیں جو دوسرے مریض کو کام میں آئے، کیا ایسے بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کر سکتے ہیں؟

۳- خدمت خلق کی مختلف تنظیمیں وقتاً فوقتاً بلڈ کیمپ قائم کرتی ہیں؛ تاکہ ایمرجنسی حالات کے لئے خون کا عطیہ حاصل کیا جائے اور اسے بلڈ بینک میں محفوظ کرا دیتی ہیں، آج کل بعض مسلم تنظیمیں بھی ایسے کیمپ قائم کر رہی ہیں، خاص طور پر بڑے شہروں میں رسول ﷺ کی تاریخ ولادت میں ایسے کیمپ لگا کرتے ہیں اور برادران وطن پر اس کا اچھا اثر مرتب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس صرف لینے والا ہاتھ نہیں ہے، دینے والا ہاتھ بھی ہے، تو کیا مسلمانوں کے لئے ایسے رضا کارانہ بلڈ بینک کا قائم کرنا جائز ہوگا؟

۴- خون کے عطیہ کے سلسلہ میں ایک قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ہی ملتا ہو اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو تو اس کا خون دینا واجب ہوگا یا مستحب یا صرف جائز؟

۵- انسانی جسم کا ایک اہم ترین عضو جگر ہے، جو غذا کو ہضم کرنے اور انسان کو غذا میں غیر محسوس طور پر آجانے والے مسموم اجزاء سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک جگر کی پیوند کاری کو ناممکن سمجھا جاتا تھا؛ لیکن جدید میڈیکل ترقی نے اس کو ممکن بنا دیا ہے اور خود ہندوستان میں اس کے کئی کامیاب آپریشن ہو چکے ہیں، ایک زندہ انسان کا جگر دوسرے انسان کو نہیں لگایا جا سکتا؛ کیونکہ انسان جگر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہے، البتہ جس شخص کا انتقال ہو چکا ہو، انتقال کے

فوراً بعد اس کا جگر نکالا جاسکتا ہے؛ کیونکہ پہلے انسان کے دل و دماغ کی موت ہوتی ہے، اس کے بعد چند گھنٹوں تک اعضاء اور خلیات میں حیات باقی رہتی ہے اگر اس کے باقی رہتے ہوئے کوئی عضو نکال لیا جائے تو وہ دوسرے کو کام آسکتا ہے، کیا اس طرح کسی متعین مریض کو اس کی جان بچانے کے لئے یا اس عضو کو محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دیا جاسکتا ہے تا کہ ایک انسان کی جان بچائی جاسکے۔

۶- بینائی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اسی لئے قرآن مجید میں بطور احسان کے قوت بصارت کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے، نابینا ہونے کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ابھی تک کی تحقیق کے مطابق اس کا علاج نہیں ہوسکتا؛ لیکن بعض صورتوں میں اس کا علاج ممکن ہے کہ ایک انسان کے آنکھ کے قرنیہ کی اس نابینا کے حلقۂ چشم میں پیوندکاری کردی جائے، اس طرح اس کو بینائی حاصل ہوسکتی ہے، ایک زندہ شخص کی آنکھ سے بھی اسے حاصل کیا جاسکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی چند گھنٹے کے اندر مردہ سے قرنیہ حاصل کیا جاسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف: اگر کوئی زندہ شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرے اور سوچے کہ میرا کام تو ایک آنکھ سے چل سکتا ہے، اس سے ہمارے دوسرے بھائی کی آنکھیں بھی روشن ہوجائیں گی تو کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟

ب: کیا کسی شخص سے قرنیہ اس کی موت کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے؛ تا کہ کسی متعین شخص کو بینائی فراہم کیا جاسکے؟

ج: آج کل اس مقصد کے لئے آئی بینک بھی قائم ہیں، جس میں رضا کارانہ طور پر آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے اور جس کو ضرورت درپیش ہو، آئندہ اس کے حق میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، کیا ایسے بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے؟

۷- پانچویں اور چھٹے سوال میں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ اگر مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ حاصل کرنی جائز ہو تو اس سلسلہ میں کس کی اجازت معتبر ہوگی، خود اس شخص کی، یا اس کے ورثہ کی، یا دونوں کی؟ یعنی مردہ کی وصیت کافی ہوگی، یا صرف ورثہ کی اجازت دینا کافی ہوگا، یا مردہ کی وصیت کے ساتھ ساتھ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف سے آمادگی بھی ضروری ہوگی؟

۸- اللہ تعالیٰ نے ہر نومولود کے لئے اس کی ماں کے سینے میں صحت بخش دودھ کا خزانہ رکھا ہے، قرآن مجید کا بھی ارشاد ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں اور تمام میڈیکل سائنس دانوں کا بھی اتفاق ہے کہ بچہ کے لئے سب سے محفوظ، تقویت بخش اور بہترین غذا ماں کا دودھ ہے، سوائے اس کے کہ ماں کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ اس کا دودھ بچہ کے لئے مضر ہوجائے، لیکن قدیم زمانہ سے یہ رواج رہا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی دودھ پلایا کرتی

تھیں اور دودھ پلانے والی عورتوں کو اس کی اجرت دی جاتی تھی، اسی پس منظر میں شریعت اسلامی نے رضاعت کو حرمت موبدہ کا ایک سبب مانا ہے، موجودہ دور میں خاص طور پر مغربی معاشرہ میں خواتین کی کسب معاش کی جدوجہد میں شامل ہوجانے کی وجہ سے یہ مزاج پروان چڑھا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلانا نہیں چاہتیں، اس پس منظر میں مغربی ملکوں میں بہت سے دودھ بینک قائم ہوگئے ہیں، جو اپنا دودھ فراہم کرنے والی عورتوں کو معاوضہ ادا کرتے ہیں اور ضرورت مند بچوں کو دودھ مہیا کرکے ان سے معاوضہ وصول کرتے ہیں؛ گویا یہ انسانی دودھ کی تجارت کی ایک شکل ہے، ہندوستان میں بڑھتے ہوئے معیار زندگی کی وجہ سے خواتین میں ملازمت کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے اور یہاں بھی اس طرح کے بینک قائم کئے جانے کی توقع ہے، تو ایسے بینک کو عوض دے کر یا بلاعوض کسی خاتون کا دودھ مہیا کرنا اور پھر اس دودھ کی ضرورت مند بچوں کے لئے فروخت کا کیا حکم ہوگا؟ اور اگر یہ صورت جائز ہو تو حرمت رضاعت کے سلسلہ میں کیا احکام ہوں گے؟

۹- موجودہ مغربی تہذیب نے عملاً اور بہت سی جگہ قانوناً اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ نسبی شناخت کا تحفظ ضروری نہیں ہے اور بچوں کی ماں کی طرف نسبت کافی ہے، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مردوں اور عورتوں میں خاصی تاخیر کے ساتھ نکاح کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس کے مختلف محرکات ہیں، جیسے ہر طرح کے معاشی اور سماجی فکر سے آزاد ہوکر اعلی ڈگریاں حاصل کرنا، عورتوں کا ملازمتیں کرنا، ایک عمر تک صنفی لذت اٹھانے کے لئے آزاد زندگی گذارنا، طلاق کا مشکل قانون، جس میں مرد پر ڈھیر ساری ذمہ داریاں عائد کردی جاتی ہیں وغیرہ، اس کی وجہ سے ایک دوسرا نقصان یہ ہے کہ بانجھ پن بڑھتا جارہا ہے اور بہت سے میاں بیوی فطری طور پر اولاد سے بہرہ یاب نہیں ہو پاتے، اس کے لئے مادہ منویہ بینک قائم کئے جاتے ہیں، جن مردوں کے مادہ منویہ میں تولیدی صلاحیت کے حامل جرثومے نہیں ہوتے ہیں، یہ ان کو کارگر جرثومے فراہم کرتے ہیں، اور جن عورتوں میں تولید کے لائق بیضے پیدا نہیں ہو پاتے ہیں، ان کے لئے بیضے فراہم کرتے ہیں، اب اس طرح کے بینک مشرقی ممالک اور مغربی تہذیب کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی قائم کئے جارہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے بینک قائم کرنا، کسی مرد یا خاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورت مند مرد یا خاتون کو مادہ منویہ کا فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا کیا جائز ہوگا؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

مفتی محمد سراج الدین قاسمی☆

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا چوبیسواں فقہی سمینار سرسبز وشاداب، عربی تہذیب وتمدن کے حامل صوبہ کیرالہ کے مشہور شہر کولم میں منعقد ہو رہا ہے، جس کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے اس اعتبار سے اولیت کا شرف حاصل ہے کہ اسلام کی بہاریں سب سے پہلے یہیں پہنچیں، اکیڈمی نے چوبیسویں فقہی سمینار کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا تھا، ان میں سے ایک موضوع ''اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ'' ہے، اس موضوع سے متعلق انتہائی قیمتی وتحقیقی مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے، مقالات کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ مقالات کی تلخیص بھی ضخیم ہوجائے گی، اس لئے تلخیص کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ جو دلائل مشترک تھے، ان دلائل کو ذکر کرتے وقت حوالہ کے لئے صرف چند مقالہ نگاران کا نام درج کیا گیا ہے، نیز بعض مقالہ نگاران نے موضوع کے مالہ وماعلیہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے، ان میں سے بعض بحثیں ایسے موضوع سے متعلق تھیں، جن پر اسلامک فقہ اکیڈمی ''اعضاء کی پیوندکاری، پلاسٹک سرجری اور ضرورت وحاجت'' جیسے عناوین سے سمینار منعقد کر چکی ہے، اس لئے ان بحثوں کو قصداً حذف کر دیا گیا، تاکہ تلخیص کی ضخامت بار خاطر نہ ہو۔

تلخیص کی تکمیل تک جن حضرات کے مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

مولانا ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا محمد فاروق بن عبداللہ کرشنپور، مولانا محمد ذکوان بن مفتی عمران، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مفتی ابوحماد غلام رسول منظور قاسمی، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی محمد سلطان کشمیری، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی، مفتی فرید احمد بن رشید کاوی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، خواجہ نظام الدین الیوسفی، مولانا عبدالخالق ندوی، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا محمد قمرالزماں ندوی، مولانا محمد افضل حسین قاسمی،، مولانا محمد انیس ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا سید تاج الدین رشادی، مفتی

☆ رفیق شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

لطیف الرحمٰن، مفتی شبیر یقعوب دیولوی، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی اکمل یزدانی قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مفتی عابد الرحمٰن بجنوری، مفتی فرید احمد بن رشید کاوی، مفتی جسیم الدین قاسمی، مفتی امتیاز ولنوی، مولانا اکرام الحق ربانی ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہی، مفتی محمد منت اللہ قاسمی، مولانا محمد فرقان فلاحی، مولانا محمد رجیب قاسمی، مولوی وجیہ الدین احسن، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی، مولوی محمد عمران بن حنیف، مفتی یوسف بن داؤد دایلولوی، مفتی محمد نصر اللہ ندوی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا طارق انور قاسمی، مفتی محمد قمر عالم قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی اعجاز الحسن باندے قاسمی، مفتی عبدالرزاق خان صاحب، مولانا عبدالحکیم قاسمی پالنپوری، مولانا عبدالمنان صاحب، مفتی ابصار احمد ندوی، مفتی آفتاب عالم غازی، مفتی عمر امین الہی۔

اس تمہید کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، پہلا سوال یہ ہے:

سوال نمبر ۱-(الف) کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ کر سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بوقت ضرورت اور متبادل کی فراہمی نہ ہونے کی صورت میں خون کا عطیہ درست ہے، بعض مقالہ نگاروں نے ضرورت وحاجت کے اقسام اور ضرورت کے تحقق کے شرائط پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، جبکہ بعض مقالہ نگاروں نے نقل دم کے شرائط پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

بوقت ضرورت نقل دم کے جواز پر فاضل مقالہ نگاروں نے جن آیات واحادیث مبارکہ اور کتب فقہ کی عبارتیں نقل کی ہیں وہ تقریباً مشترک ہیں، اس لئے اختصار کے ساتھ ان دلائل کو ذکر کیا جاتا ہے۔

مریض کا کسی کے دم سے استفادہ تداوی بالمحرمات کے قبیل سے ہے، اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ فقہاء کے یہاں تداوی بالمحرمات کی کیا حیثیت ہے؟

مولانا محمد ظفر عالم ندوی تداوی بالمحرمات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: تداوی بالمحرمات خود حنفیہ کے یہاں مختلف فیہ ہے:

امام ابوحنیفہؒ کا مشہور قول یہی ہے کہ حرام اشیاء سے علاج درست نہیں ہے، البتہ امام ابو یوسفؒ نے علاج کے لئے محرمات کے استعمال کی اجازت دی ہے، علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: "وقدوقع الاختلاف بين مشائخنا في التداوي بالمحرم ففي النهاية عن الذخيرة: الاستشفاء بالحرام يجوز إذا علم أن فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر" (البحر

الرائق ۱/۱۱۶)۔

صاحب درمختار لکھتے ہیں:''اختلف التداوي بالمحرم وظاهر المذهب المنع كما فى رضاع البحر، لكن نقل المصنف ثمة وهنا عن الحاوي وقيل: يرخص إذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان وعليه الفتوى''(درمختار ۱/۳۶۵)(مولانا محمد عثمان گورینی)۔

جن فقہاء نے حرام اشیاء سے علاج ومعالجہ کو بوقت ضرورت جائز قرار دیا ہے، انہوں نے درج ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

۱-حضور ﷺ نے اصحاب عرینہ کو اونٹ کا پیشاب پینے کو بطور دوا اجازت دی تھی (بخاری حدیث:۶۸۰۵)(مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی اشتیاق احمد اعظمی)۔

۲-حضرت عرفجہؓ کو اضطراری حالت کی وجہ سے سونے کی ناک بنانے کا حکم آپ ﷺ نے دیا تھا، روایت میں ہے:''قطع أنفه يوم الكلاب فاتخذ أنفا من فضة فأنتن عليه فأمره النبي ﷺ أن يتخذ أنفا من ذهب''(نسائی حدیث:۵۱۷۱، ۵۱۷۲)(مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی اشتیاق احمد اعظمی، مفتی عبدالرزاق، مفتی ابوحماد)۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''والاستشفاء بالحرام جائز عند التيقن بحصول الشفاء فيه، كتناول الميتة عند المخمصة، والخمر عند العطش، وإساغة اللقمة، وانما لايباح بمالايستيقن حصول الشفاء به''(بدائع الصنائع ۱/۶۱)(مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:''يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم، أن شفاء ه فيه، ولم يجد في المباح مايقوم مقامه، وان قال الطبيب: يتعجل شفاء ک ففيه وجهان''(فتاوی ہندیہ ۵/۳۵۵)(مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی محمد فاروق، مفتی محمد اشتیاق احمد، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبدالرزاق، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد نصر اللہ)۔

عطاء بن ابی رباح کا مسلک بھی جواز کا ہے، ابن جریج فرماتے ہیں:''سمعت عطاء يسأله انسان نعت له أن يشترط على كبره، فيشرب ذلک الدم من وجع كان به، فرخص له فيه، قلت له: حرمه الله تعالى؟قال: ضرورة، قلت له: انه لولم يعلم ان في ذلک شفاء، ولكن لا يعلم وذكرت له ألبان الأتن عندذلک، فرخص فيه أن يشرب دواء''(مصنف عبدالرزاق حدیث:۱۷۱۲۴)(مفتی شاہجہاں ندوی)۔

ابن حزم لکھتے ہیں:"من أكره على شرب الخمرأواضطرإليها لعطش، او علاج، أولدفع خنق، فشربها، أوجهلها فلم يدر أنهاخمرفلا حد على أحد من هؤلاء"(المحلی ۱۲/۳۷۶)(مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

شافعیہ کے نزدیک شراب کے علاوہ تمام حرام اور ناپاک اشیاء سے علاج کرنا درست ہے۔

امام نووی تحریر فرماتے ہیں:"وأما التداوي بالنجاسات غير الخمر فهو جائز، سواء فيه جميع النجاسات غير المسكر، هذا هو المذهب، والمنصوص، وبه قطع الجمهور" (المجموع ۹/۵۰)(مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

امام نووی دوسری جگہ لکھتے ہیں:"قال أصحابنا: وإنما يجوز التداوي بالنجاسة إذا لم يجدطاهرا ليقوم مقامها فإن وجده حرمت النجاسات بلا خلاف"(المجموع ۹/۵۱)(مولانا طارق قاسمی)۔

شافعیہ نے شراب کو مستثنیٰ کیا ہے، وجہ استثناء یہ حدیث شریف ہے:"سأل النبي ﷺ عن الخمر، فنهاه أو كره، أن يضعها، فقال: إنما أصنعها للدواء، فقال: إنه ليس بدواء، ولكنه داء"(مسلم حدیث:۱۹۸۴)۔

البتہ جمہور نے اس حدیث کو اختیاری حالت یا متبادل فراہم ہونے کی صورت پر محمول کیا ہے(دیکھئے: مقالہ مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

امام نووی تداوی بالمحرمات کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال أصحابنا:وإنما يجوز ذلک إذا كان المتداوي عارفا بالطب يعرف أنه لايقوم غيرهذامقامه أوأخبره بذلک طبيب عدل مسلم"(المجموع ۹/۵۱)(مولانا طارق انور)۔

مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک حرام اشیاء کا استعمال بطور علاج بھی درست نہیں ہے، ابن العربی مالکی تحریر فرماتے ہیں:"لايتدواى بها بحال ولابالخنزير"(الجامع لأحکام القرآن ۲/۲۳۱)(دیکھئے: مقالہ مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

عدم جواز کے دلائل:

۱- حدیث رسول :"إن الله أنزل الداء والدواء وجعل لكل داء دواء، فتداووا،ولاتداوو بحرام"(ابوداؤد حدیث: ۳۸۷۴، یہ روایت متکلم فیہ ہے)(مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

۲-"نهى رسول الله ﷺ عن الدواء الخبيث"(ابوداؤد حدیث: ۵۳۸۷۰)(مقالہ مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

جمہور نے عدم جواز سے متعلق تمام روایات کو حالت اختیار اور متبادل کی فراہمی کی صورت پر محمول کیا ہے (مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

مولانا ظفر عالم ندوی ابن حزم کے حوالے سے لکھتے ہیں: "**جاء اليقين بإباحة الميتة والخنزير عند خوف الهلاک من الجوع، فقد جعل تعالى شفاء نا من الجوع المهلک فيما حرم علينا فی تلک الحال، ونقول: نعم ان الشيء مادم حراما علينا فلا شفاء لنا فيه فإذا اضطررنا إليه فلم يحرم علينا حينئذ بل هو حلال فهو لنا حينئذ شفاء وهذا ظاهر الخبر**" (بحوالہ فقہی مقالات ۴/ ۱۵۲)۔

جن حضرات نے محرمات سے علاج کو درست قرار دیا ہے، انہوں نے اضطرار کی قید لگائی ہے، کہ اضطرار کی صورت میں تداوی بالمحرمات جائز ہے، اضطراری حالت سے کیا مراد ہے، تو اس سلسلہ میں مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں: اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کو خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو اور خون دینے سے اس کو جان بچنے کا ظن غالب ہو (معارف القرآن ۱/ ۳۶۵)۔

انتقال دم کے شرائط:

بعض مقالہ نگاران نے نقل دم اور دم سے استفادہ کے شرائط بھی تحریر کی ہیں، ذیل میں ان شرطوں کو ذکر کیا جاتا ہے:

۱- متبرع ایسا شخص نہ ہو کہ اگر اس سے خون لیا جائے تو وہ خود ایسے ضرر میں مبتلی ہو جائے جو اسے موت تک پہنچا دے، یا ایسے مرض تک پہنچا دے جس سے صحت یابی کا امکان ختم یا کم ہو جائے۔

۲- متبرع کا خون ایڈز جیسے امراض متعدیہ سے سالم ہو۔

۳- خون کے علاوہ کوئی متبادل دوسری دوا نہ ہو۔

۴- کوئی ماہر طبیب خون کے استعمال کو ناگزیر قرار دے (مفتی محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا محمد عفان، مولانا آفتاب عالم غازی)۔

۵- محض قوت یا جسمانی حسن میں اضافہ مقصود نہ ہو (مفتی محمد اقبال ٹنکاروی)۔

مولانا ابصار احمد صاحب مزید شرائط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۶- انتقال خون کے وقت حاجت کی مقدار سے زیادہ خون نہیں لیا جائے گا۔

۷- خون دینے والا خون کی قیمت وصول نہ کرے (البیوع المحرمۃ والمنہی عنہا ۱/ ۴۲۸)۔

علماء ہند کے فتاوے:

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

کسی انسان کا خون علاج کی غرض سے دوسرے انسان کے جسم میں داخل کرنا اگر اس کی شفایابی اس پر بقول طبیب حاذق منحصر ہوگئی ہو، مباح ہے، یہ شبہ کہ انسان کے اجزاء کا استعمال ناجائز ہے، اس لئے وارد نہ ہونا چاہئے کہ استعمال کی جو صورت مستلزم اہانت ہو وہ ناجائز ہے، اور جس میں اہانت نہ ہو تو بضرورت اس کا استعمال ناجائز نہیں ہے، جیسے موئے مبارک کو پان میں دھو کر وہ پانی مریض پر چھڑکا یا پلایا جاتا تھا (مولانا محمد عفان منصور پوری)۔

مفتی شفیع صاحب نقل دم کے تعلق سے لکھتے ہیں: تحقیق اس مسئلہ کی یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جز ہے اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا مذکورہ دونوں وجہوں سے حرام ہو، لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعت کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوئے:

اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے کے بدن میں داخل کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت پیش نہیں آتی، اس کی مثال دودھ کی سی ہوئی جو بدن انسانی سے نکلتا ہے اور دوسرے انسان کا جز بن جاتا ہے، اور جہاں تک نجاست کا معاملہ ہے تو بعض فقہاء نے اضطرار کی صورت میں خون کے استعمال کی اجازت دی ہے۔

(دیکھئے: مقالہ مفتی محمد فاروق، مولانا محمد عفان، مفتی اشتیاق احمد اعظمی، مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

علماء عرب کی آراء:

عطیہ خون سے متعلق وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"یجوز نقل العضو من جسم إلی جسم آخر، إن کان هذا العضو یتجدد تلقائیا کالدم والجلد، ویراعی فی ذلک کون الباذل کامل الأهلیة وتحقق الشروط الشرعیة المعتبرة" (موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرۃ ۹/۵۰۷)۔

شیخ ابن باز فرماتے ہیں: **"حکم التبرع بالدم: لا بأس في ذلک ولا حرج فیه عند الضرورة"** (فتاوی ابن باز ۲۰/۷۱) (دیکھئے: مقالہ مفتی فیاض احمد حسینی)۔

عطیہ دم کے جواز پر دکتور حسام الدین بن موسی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان التبرع بالدم من الأمور الضرورية للناس ولا أبالغ إن قلت أن حكمه فرض كفاية، إذا قام به البعض سقط الإثم عن الباقين وذلک لما يترب عليه من إنقاذ المرضى والجرحى فى الحوادث المختلفة، وعلى الإنسان أن يبذل دمه تبرعا، وحسبة لله تعالى، ولا يطلب أي مقابل عند تبرعه بدمه لإنقاذ حياة الإنسان محتاج ذلک الدم، ولا يجوز أخذ العوض مقابل هذا الدم......" (فتاوی یسئلونک ۱/۱۲۶)(مقالہ مفتی فیاض احمد حسینی)۔

مفتی محمد عثمان گورینی "احکام الجراحۃ الطبیۃ" کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"فالحاصل شروط جواز نقل الدم ينحصر في الشروط الأربع: أن يكون المريض محتاجا إلى نقل الدم، وأن يتعذر البديل، وأن لايتضرر شخص المنقول منه الدم بأخذه منه، وأن يقتصر في نقل الدم على مقدار الحاجة" (احکام الجراحۃ الطبیہ ص ۵۸۳)۔

۱-(ب) کیا کسی مسلمان کے لئے جائز ہوگا کہ بوقت ضرورت وہ کسی غیر مسلم کا خون اپنے جسم میں منتقل کرائے؟

اس سلسلہ میں مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ ایک مسلمان کے جسم میں کسی مسلمان کا خون ہی منتقل ہوتاہم اس کو شرط کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔

بعض مقالہ نگاران نے اس کی نظیر میں دودھ پلانے والی عورت کے مسئلہ کو ذکر کیا ہے، علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

"ولا بأس بأن يستاجر المسلم الظئر الكافرة والتى قدولدت من الفجور، لأن خبث الكفر فى اعتقادها دون لبنها، والأنبياعليهم السلام والرسل صلوات عليهم فيهم من أرضع بلبن الكوافر، وكذلک فجورها لا يؤثرفي لبنها" (المبسوط للسرخسی ۱۵/۲۳۱)(مولانا محمد عفان)۔

مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں:

نفس جواز میں کوئی فرق نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کافر یا فاسق یا فاجر انسان کے خون میں جو اثرات خبیثہ ہیں، ان کے منتقل ہونے اور اخلاق پر اثر انداز ہونے کا قوی خطرہ ہے، اس لئے صلحاء امت نے فاسق وفاجر عورت کا دودھ پلوانے کو بھی پسند نہیں فرمایا ہے، بناء علیہ کافر اور فاسق انسان کے خون سے تابمقدور اجتناب بہتر ہے (جواہر الفقہ ۴/۴۰)(مولانا محمد عفان)۔

مفتی اشتیاق احمد صاحب نے تائید میں کویت کی فتوی کونسل کا فتوی نقل کیا ہے، استفتاء کی عبارت یہ ہے:

"ماحكم الشريعة الإسلامية بنقل دم المسلم لغير المسلم وبالعكس؟"

کونسل نے اس استفتاء کا جواب یہ دیا ہے:"بأنه لا بأس بذلك ولا يمنع من ذلك ما يتصوره البعض من كون غير المسلم نجسا، لقوله تعالى:"إنما المشركون نجس" فإن هذه النجاسة معنوية" (مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ الکویتیۃ ۲/ ۲۹۵)۔

۱-(ج) غیر مسلم کو بوقت ضرورت خون دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں تقریباً مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ بر واحسان کرنے کا حکم قرآن واحادیث میں دیا گیا ہے، اس لئے بر واحسان کا تقاضا یہ ہے کہ غیر مسلموں کو بھی ضرورت کے وقت خون دیا جائے اور اس کی جان بچانے کی کوشش کی جائے، اس موقع سے بعض مقالہ نگاران نے قرآن کی ان آیات سے استدلال کیا ہے:

۱-"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم" (سورۂ ممتحنہ:۸)۔

۲-"ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا" (سورۂ انسان:۸)۔

۳-"ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا" (سورۂ مائدہ:۳۲) (مقالہ مفتی فرید، مولانا محمد نصر اللہ ندوی)

سوال نمبر ۲- قدرتی اور غیر معمولی حادثات میں خون کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے؛ کیوں کہ ایک ہی وقت میں بہت سارے زخمیوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مریض کو جس گروپ کا خون مطلوب ہو فوری طور پر اس گروپ کا خون مہیا نہیں ہوتا؛ چنانچہ اس ضرورت کو پوری کرنے کے لئے بلڈ بینک قائم ہیں جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہیں اور ایسے بینک بھی عام طور پر خون کی قیمت وصول نہیں کرتے، مفت خون فراہم کرتے ہیں؛ البتہ چاہتے ہیں کہ اس کے بدلے میں متاثر شخص کے متعلقین بھی خون کا عطیہ دیں جو دوسرے مریض کو کام میں آئے، کیا ایسے بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کرسکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں بجز چند افراد کے اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ جس طرح پیش آمدہ ضرورت کے تحت خون کا عطیہ درست ہے، اسی طرح متوقع ضرورت کے پیش نظر بھی بلڈ بینک میں خون دینا درست ہے، اس مسئلہ میں مؤقر اصحاب افتاء کی بھی رایوں میں اختلاف ہے، مفتی عبد الرحیم لاجپوری صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ بلڈ بینک میں خون جمع کرانا درست نہیں ہے، جبکہ مفتی نظام الدین صاحبؒ اور مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ متوقع ضرورت کے پیش نظر بینکوں میں خون جمع کرانا درست ہے (فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۱۷۳، محمود الفتاوی ۴/ ۵۶۷) (مقالہ مولانا محمد عثمان، مولانا رمضان علی فرقانی، مفتی جنید)۔

ذیل میں مقالہ نگاران حضرات کی آراء ذکر کی جاتی ہیں:

جن حضرات کی رائے یہ ہے کہ بلڈ بینک میں خون دینا جائز نہیں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ خون دینا اور اس کا استعمال کرنا اپنے اصل کے اعتبار سے ناجائز ہے، البتہ کسی سخت ضرورت کے تحت طبیب حاذق کے مشورہ سے خون کا استعمال جائز ہے، اور بلڈ بینک کو جس وقت خون کا عطیہ دیا جاتا ہے، اس وقت کسی قسم کی ضرورت واضطرار واقع نہیں ہے، البتہ اضطرار کی توقع ہے اور متوقع اضطرار کے لئے بلڈ بینک میں خون کا عطیہ دینا درست نہیں ہے، "إلا ما اضطررتم" کی قید اس کی دلیل ہے (دیکھئے: مولانا محمد فاروق)۔

مولانا امتیاز لکھتے ہیں: بلڈ بینکوں میں رضاکارانہ طور پر خون کا عطیہ کرنا قبل از وقت بلا ضرورت ہونے کی بنا پر ناجائز ہے اور سوال میں ذکر کردہ خدشہ کا متبادل طریق یہ ہے کہ عطیہ دہندگان کے خون کے گروپس مع اسامی کی فہرست تیار کردی جائے تاکہ بروقت رابطہ کرکے شخص مطلوب کو طلب کیا جاسکے۔

نیز مولانا موصوف نے بلڈ بینک میں ہونے والے کرپشن کا بھی ذکر کیا ہے، مفتی رجیب قاسمی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ بلڈ بینک میں خون میں HIV کے وائرس کا کافی خطرہ ہوتا ہے، اس لئے اس سے حتی الامکان بچنا چاہئے۔

مولانا محمد عفان لکھتے ہیں: کسی متوقع ضرورت کے لئے خون عطیہ کرنا درست نہیں ہے، بلکہ بالفعل ضرورت کا پایا جانا ضروری ہے۔

اس کے برخلاف اکثر مقالہ نگاروں نے بلڈ بینکوں میں خون جمع کرانے کی اجازت دی ہے، ذیل میں مقالہ نگاران حضرات نے جواز پر جن دلائل سے استدلال کیا ہے، ان کو بیان کیا جاتا ہے:

مفتی شاہ جہاں ندوی نے درج ذیل آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے:

"**وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم اليه**" (سورۂ أنعام: ۱۱۹)۔

جن لوگوں نے بلڈ بینک میں خون دینے کو جائز قرار دیا ہے، ان لوگوں نے اس قاعدے سے بھی استدلال کیا ہے: "**إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه**" (العنایۃ ۳۱۱/۷، کتاب أدب القاضي طبع دار الفکر، بیروت)۔

مولانا محمد عثمان گورینی لکھتے ہیں: ڈاکٹروں کے مطابق بغیر کسی مرض کے بھی خون نکلوانا جسم انسانی کے لئے مفید ہے، لہذا بغیر مرض کے بھی خون نکلوانا جائز ہے۔

"**لا حرج على الشخص المتبرع فی إخراج مسائل الدم من جسمه بل ان خروجه يعتبر علاجا ودواء ففيه منفعة ومصلحة ولذلک ورد السنة بمشروعية التداوي لحجامة كما ثبت بذلک**

بقوله عليه الصلاة و السلام"(احکام الجراحۃ الطبیۃ: ۵۸۲)۔

بلڈ بینکوں میں عطیہ خون کے جواز پر مولانا محمد ظفر عالم ندوی صاحب نے اس جزئیہ سے استدلال کیا ہے کہ مالکیہ کے یہاں مضطر کے لئے حرام کھانا بھی حلال ہے اور اگر بعد میں ضرورت پڑنے کا اندیشہ ہو تو اس کا ادخار کر لینا بھی جائز ہے، شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"**يجوز للمضطر التناول من الحرام حتى يشبع وله التزود،(ادخار الزاد) من الميتة ونحوها، إذا خشى الضرورة فى سفره، فإذا استغنى عنها طرحها، لأنه لا ضرر فى استصحابها**" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۲۶۱۴) (مولانا رمضان علی فرقانی)۔

اور مولانا محمد فاروق صاحب نے اس قاعدہ سے استیناس کیا ہے:

"**ان الشئ إنما يقدر حكما اذا كان يتصور حقيقة**"(قواعد الفقہ: ۶۳)۔

امام رافعی فرماتے ہیں: "**قال أصحابنا: يجوز له التزود من الميتة إن لم يرج الوصول إلى طاهر، قال النووي فان رجاه فوجهان: أصحهما يجوز وبه قطع القفال وغيره وزاد القفال فقال: يجوز حمل الميتة من غير ضرورة مالم يتلوث بها**"(المجموع ۹/ ۴۳) (مولانا طارق قاسمی کیرالا)۔

مولانا آفتاب عالم لکھتے ہیں: ہر گروپ کا خون پہلے سے اکٹھا کر کے رکھنا بھی ایک ضرورت ہے، ورنہ حرج لازم آئے گا۔

بلڈ بینک سے متعلق فتاوی:

حضرت مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ تحریر کرتے ہیں:

جب خون کے استعمال کی گو بدرجہ مجبوری گنجائش ہوگی تو چونکہ ایسی مجبوریاں اچانک بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور خون کی بہت زیادہ مقدار کی متقاضی ہو جاتی ہیں، لہذا ان اچانک پیش آمدہ ضروریات کے لئے ہر نمبر کے خون کا فراہم رکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے اور مقدار کی تعیین وتحدید معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں محفوظ رکھنا ضروری ہوگا، اور اس کا ایک خزانہ بھی لازم ہوگا، "**لأن الشئ إذا ثبت ثبت بلوازمه**"(نظام الفتاوی ۱/ ۳۵۶) (مفتی اقبال ٹنکاروی، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)۔

بلڈ بینکوں میں خون دینا تو اکثر مقالہ نگاروں کے مطابق جائز ہے، لیکن تقریباً تمام مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ ان بلڈ بینکوں میں خون فروخت کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ہبہ یا مکافات کے طور پر بینک کو مالی معاوضہ دیا جا سکتا ہے اس سے بینک

اپنے اخراجات پورے کریں۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ”كما لا يجوز بيع الدم وإنما يجوز التبرع بدفع عوض مالي على سبيل الهبة أو المكافاة عند نقل العضو أو التبرع بالدم في حالة التعرض لهلاک أوضرر“ (مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا محمد فاروق، مفتی عبدالرزاق، مفتی شاہجہاں ندوی)۔

خون کی بیع کے عدم جواز پر مفتی عبدالرزاق صاحب نے درج ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے:

حضرت ابو جحیفہ فرماتے ہیں: ”نهى رسول الله ﷺ عن ثمن الدم وثمن الكلب“ (بخاری حدیث: ۲۲۳۸)۔

سوال نمبر ۳- خدمت خلق کی مختلف تنظیمیں وقتاً فوقتاً بلڈ کیمپ قائم کرتی ہیں؛ تاکہ ایمرجنسی حالات کے لئے خون کا عطیہ حاصل کیا جائے اور اسے بلڈ بینک میں محفوظ کرادیتی ہیں، آج کل بعض مسلم تنظیمیں بھی ایسے کیمپ قائم کررہی ہیں، خاص طور پر بڑے شہروں میں رسول ﷺ کی تاریخ ولادت میں ایسے کیمپ لگاکرتے ہیں اور برادران وطن پر اس کا اچھا اثر مرتب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس صرف لینے والا ہاتھ نہیں ہے، دینے والا ہاتھ بھی ہے، تو کیا مسلمانوں کے لئے ایسے رضاکارانہ بلڈ بینک کا قائم کرنا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں اکثر فاضل مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ جس طرح ضرورت کے تحت خون کا عطیہ درست ہے، متوقع ضرورت کے تحت بلڈ کیمپ قائم کرنا بھی درست ہے، ”إذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه“، البتہ چند مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ فی نفسہ خون کا عطیہ اور خون کا بدن میں ادخال حرام ہے، ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی گئی ہے، لہذا ”الضرورة تتقدر بقدرها“ کے تحت بلڈ بینک کا قیام درست نہیں ہے۔

مؤقر ارباب افتاء کے بھی دو مختلف نقطہ نظر ہیں، مفتی نظام الدین اعظمی صاحبؒ سابق صدر شعبہ افتاء دارالعلوم دیوبند بلڈ بینک کے قیام کے حق میں ہیں، جبکہ مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ صاحب فتاوی رحیمیہ عدم جواز کے قائل ہیں، البتہ انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ متوقع ضرورت کی تلافی کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عطیہ دہندگان کے آسامی مع بلڈ گروپ کے محفوظ کرلیا جائے اور ضرورت کے وقت ان سے رابطہ کرکے اس ضرورت کو پورا کیا جائے۔

اب ذیل میں مؤقر فاضل مقالہ نگاران کے آراء مع دلائل ذکر کی جاتی ہیں:

مولانا محمد فاروق لکھتے ہیں: اکثر اکابر کی کتابوں میں عدم جواز ہی کا قول ہے، ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ خون دینا اور اس سے انتفاع کرنا اپنی اصل کے اعتبار سے قطعی حرام ہے، تاہم جواز ضرورت واضطرار کی وجہ سے ہے اور اضطرار کا

تحقق اس وقت ہوگا جبکہ مریض کی جان کو خطرہ ہو، اور بلڈ بینک کو جس وقت خون کا عطیہ دیا جاتا ہے، اس وقت کسی قسم کا اضطرار واقع نہیں ہے، بلکہ متوقع اضطرار کے لئے ہے، اس لئے بلڈ بینک میں خون کا عطیہ درست نہیں ہے۔

الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے: "ويشترط للأخذ مقتضى الضرورة، أن تكون الضرورة قائمة لامنتظرة، قال الشيخ عميرة: لو كانت الحاجة غير ناجائزة فهل يجوز الأخذ مما عساه يطرأ؟ الظاهر لا" (موسوعۃ الفقہیۃ ۲۸/ ۱۹۴)۔

لیکن بعض ارباب افتاء کی رائے یہ ہے کہ اچانک حادثات کے واقع ہونے سے بیک وقت کافی مقدار میں خون کی ضرورت پڑتی ہے اور اس وقت اتنے خون کی فراہمی مشکل ترین امر ہے اور تمام ضرورت مندوں کے متقاضی گروپوں کے خون کا مل جانا اور بھی مشکل امر ہے، لہذا طبی ضرورت کے پیش نظر قبل از وقت خون کی فراہمی کا نظم کرنا درست ہے، قاعدہ فقہیہ ہے: "ان الشئ انما يقدر حكما اذا كان يتصور حقيقة" (قواعد الفقہ ص ۶۳) (دیکھئے مقالہ مفتی محمد فاروق)۔

مفتی فرید احمد لکھتے ہیں: خون کے اخراج میں آسانی، متبرع کی جانب سے اس کا نقصان دہ نہ ہونا، حادثات کی کثرت، آپریشن کے جدید طریقے اور مختلف امراض میں اس کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کی اجازت ہونی چاہئے کہ بلڈ بینک میں اس کو مجتمع رکھا جائے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو کوئی چاہے اپنا خون تبرع کرے۔

مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں مضطر کے لئے میت سے ضرورت کا اندیشہ ہو تو تزود و ذخیرہ اندوزی درست ہے۔

چنانچہ کشاف القناع میں ہے:

"وله أي المضطر أن يتزودمنه أى المحرم إن خاف الحاجة إن لم يتزود، لأنه لاضرر فى استصحابها ولا في اعدادها لدفع ضرورته وقضاء حاجته ولا يأكل منها إلا عند ضرورته فان تزود فلقيه مضطر آخر لم يجزله بيعه منه، لأنه ليس بمال كبيعه من غيره ويلزمه اعطاؤه منه بغير عوض إن لم يكن هوأي المتزود مضطرا في الحال إلى ما معه فلا يعطي غيره، لأن الضرر لا يزال بالضرر" (کشاف القناع)۔

بعض مقالہ نگاران نے لکھا ہے کہ اس جزئیہ کا تقاضا یہ ہے کہ متوقع ضرورت کے پیش نظر بلڈ کیمپ قائم کرنا اور اس میں خون جمع کرانا درست ہے (دیکھئے مقالہ: خواجہ نظام الدین یوسفی، مفتی فرید احمد)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: "ويتفق الشافعية والحنابلة في أصح الروايتين مع المالكية في جواز التزود من المحرمات إذا خشى الضرورة فى سفره" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳/ ۵۲۲) (مولانا محمد عثمان بستوی)۔

جب خون کا عطیہ جائز ہے تو پھر حکومت کی نگاہ میں ملک وملت کے جذبہ قربانی کے اظہار کے لئے رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا نہ صرف مباح ہے بلکہ ایک اچھا قدم بھی ہے (مولانا ارشد رحمانی چمپارنی)۔

مولانا محمد عنایت اللہ نے بلڈ ڈونیشن کیمپ لگانا اور بلڈ کو بلڈ بینکوں میں محفوظ رکھنے کے جواز پر درج ذیل دلیل کو مستدل بنایا ہے:

۱-"الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/۸۵، القاعدۃ الخامسۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان)۔

اس کی شرح میں حموی لکھتے ہیں: "فالضرورة بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع هلك أوقارب وهذا تبيح تناول الحرام"۔

مولانا بدر احمد مجیبی صاحب لکھتے ہیں: مستقبل میں پیش آنے والے اس طرح کے واقعات کے لئے جن میں خون کی ضرورت پڑے گی اگر پہلے سے تیاری کرلیں اور بلڈ بینک قائم کرلیں اور اس میں خون جمع کریں تو کوئی حرج نہیں ہے، موصوف نے دلیل میں اسوہ یوسفی علیہ السلام کو پیش کیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے مصر میں حکومت کے ایک بڑے عہدہ پر فائز ہوکر مستقبل میں آنے والی قحط سالی کے مقابلہ کے لئے کئی سال قبل تیار کرلی تھی۔

مفتی شاہ جہاں ندوی نے بلڈ ڈونیشن کے قیام کو جائز قرار دیا ہے، البتہ موصوف نے یہ شرط ذکر کی ہے کہ بلڈ بینک کا قیام تجارت کے لئے نہ ہو، نیز بلڈ کیمپ کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ ایسے بینک میں خون محفوظ کرائے جہاں بلا تفریق مذہب ہر ایک کو ضرورت کے وقت خون دیا جاتا ہو۔

مولانا محمد رمضان علی فرقانی لکھتے ہیں:

بلڈ بینک دو اہم مقاصد کے لئے قائم کئے جاتے ہیں: ایک تو یہ کہ کسی غیر معمولی حادثہ کے وقت سارے زخمیوں کو خون مہیا ہوجائے اور سب کی جان بچ جائے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ مریض کو خون کا مطلوبہ گروپ مل جائے، لہذا "اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه" کے تحت جب خون کا عطیہ درست ہے تو اس کی بینکنگ بھی صحیح ہوگی۔

ارباب افتاء کے فتاوے:

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: جب خون کے استعمال کو گو بدرجہ مجبوری ہوگنجائش ہوگی، تو چونکہ ایسی مجبوریاں اچانک بھی پیدا ہوجاتی ہیں، اور خون کی بہت زیادہ مقدار کی متقاضی ہوجاتی ہیں......اوران کی جان بچانے کے لئے ان سب کو خون کا انجیکشن دینا ضروری ہوتا ہے، پھر اس میں بھی مریض کے خون کا گروپ اور جو خون چڑھایا جاتا ہے اس خون کا گروپ بالکل یکساں ہونا ضروری ہوتا ہے، ورنہ بجائے نفع کے نقصان کا

اندیشہ ہوجاتا ہے، اس لئے ان اچانک پیش آمدہ ضروریات کے لئے ہر نمبر کے خون فراہم رکھنا بھی ضروری ہوجاتا ہے اور مقدار کی تحدید وتعیین نہ ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں محفوظ رکھنا ضروری ہوگا، اس کا ایک خزانہ بنانا بھی لازم ہوگا، جس کو آج کل کی اصطلاح میں بینکنگ کا نام دیا جاسکتا ہے،"لأن الشئ إذا ثبت ثبت بجميع لوازمه"، لہذا اس فراہمی اور محفوظ رکھنے کے جو مناسب طریقے ہوں گے، اور ان میں جو اخراجات درکار ہوں گے، ان سب کو بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے برداشت کرنا ہوگا (نظام الفتاوی ۲/ ۴۲۲) (دیکھئے: مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

مفتی یوسف صاحب لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں:

مریضوں کی ضرورت کے پیش نظر خون کا مہیا رکھنا جائز ہے، اور خدمت خلق جبکہ حد جواز کے اندر ہو ظاہر ہے کہ بڑے ثواب کا کام ہے (مولانا محمد افضل حسین)۔

عرب علماء کے فتاوے:

مفتی ابوحماد "الافادة الشرعية في بعض المسائل الطبية" کے حوالہ سے لکھتے ہیں:"اعلم رحمک الله أن إنشاء بنوک الدم من ضرورات العصر لدعاء الضرورة الملحة له، وهو المعمول به في كل بلاد الدنيا،لاسيما مع كثرة الحوادث والحروب فى هذه الأزمنة، ويدخل هذا الفرع تحت تحقيق مقصد حفظ النفوس، وقد تواترت الأدلة على ذلک، أي على ضرورة حفظ النفس"۔

اسماعیل مرحبا فرماتے ہیں:"يجوز بنک الإسلامي لقبول ما يتبرع به الناس من دمائهم وحفظ ذلک لإ سعاف ممن يحتاج إليه المسلمون على أن لاياخذ البنک مقابلا ماليا من المرضى أو أولياء أمورهم عوض عما يسعفهم به من الدماء ولا يتخذ ذلک وسيلة تجارية للكسب لما فيه من المصلحة العامة للمسلمين" (البنوک الطبية البشرية واحكامها الفقهية ص ۲۴۱) (مولانا محمد مغفور باندوی)۔

بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ خون کے عطیہ کی اجازت ضرورت شدیدہ کے پیش آنے پر ہی اہون البلیتین کو اختیار کرتے ہوئے دیا گیا ہے، لہذا بروقت اگر کوئی ضرر یا مفسدہ درپیش نہیں ہے تو محض اندیشہ اور امکان کے پیش نظر کسی ممنوع کا ارتکاب درست نہیں ہوگا، یہ اصول فقہ کا قاعدہ ہے:"ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها" (الأشباہ والنظائر: ۱۱۹) (دیکھئے: مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

مولانا محمد عفان تحریر کرتے ہیں: مسلمانوں کو رضا کارانہ طور پر بلڈ بینک قائم کرنے کی اجازت تین وجہوں سے نہیں دی جاسکتی۔

اول: موہوم ضرورت کے پیش نظر رکھتے ہوئے خون جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

دوم: بلڈ بینک میں خون اسٹاک کرنے کے لئے قیمتا بھی خریدنا پڑسکتا ہے اور خون کی بیع جائز نہیں۔

سوم: بہت سے لوگ جونشہ وغیرہ کے عادی ہوتے ہیں وہ پیسے کمانے کی غرض سے خون جمع کرتے ہیں اور پیسہ حاصل کر کے نشہ آور اشیاء خریدتے ہیں۔

البتہ موصوف ضرورت مثلاً حالات وغیرہ خراب ہوں، ایسے موقع پر خون اسٹاک کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

مفتی فرید احمد لکھتے ہیں: حنفیہ اور جمہور کا مذہب تو یہ ہے کہ مضرت کو سد رمق ہی کے بقدر کھانے کی اجازت ہے، لہذا تزود اور ذخیرہ کی اجازت نہیں ہوگی، اس اصول کے تحت بلڈ بینک کی گنجائش نہیں ہوگی اور اسی اصول کے تحت حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ اور حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب کی رائے یہ ہے کہ بلڈ بینک میں خون جمع کرانا جائز نہیں ہے۔

سوال نمبر ۴-خون کے عطیہ کے سلسلہ میں ایک قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ہی ملتا ہو اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو تو اس کا خون دینا واجب ہوگا یا مستحب یا صرف جائز؟

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں کی آراء مختلف ہیں، اکثر فاضل مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ انسانی جان کا تحفظ فرض ہے، اس لئے اس صورت میں خون دینا واجب ہے، بشرطیکہ خون دہندہ کو خود اس سے کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو جبکہ بعض مقالہ نگاروں نے اس کو مستحب کا درجہ دیا ہے، اور بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ جب علاج سرے سے فرض ہی نہیں ہے، تو پھر کسی کو خون دے کر اس کے علاج کی تدابیر اختیار کرنا کیونکر فرض ہوگا؟

ذیل میں فاضل مقالہ نگاروں کی آراء مع دلائل ذکر کی جاتی ہیں:

مولانا مغفور باندوی لکھتے ہیں: O-Negative یہ خون کا ایک ایسا گروپ ہے جو کمیاب ہے، اس خون کی خاصیت یہ ہے کہ دوسرے گروپ کے خون کو قبول نہیں کرتا اور دوسرے تمام گروپ اس خون کو قبول کر لیتے ہیں، اور عام طور پر بلڈ بینکوں میں بھی یہ گروپ نہیں ملتا، چنانچہ اس گروپ کے حامل شخص کو اگر خون کی ضرورت پڑتی ہے تو اسی گروپ کے دوسرے شخص کو اپنا خون عطیہ کرنا "مالایتم الواجب إلا به فهو واجب" (روضۃ الناظر لابن قدامہ ۱۴/۸۳) کے تحت واجب ہوگا بشرطیکہ خون دینے سے اس کو خود کسی قسم کا ضرر لاحق نہ ہو (مفتی عبدالرزاق، مولانا محمد فرقان، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد فاروق، مولانا محمد منت اللہ)۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ خون دینا اصلا مندوب ہے، لیکن اگر ایک ہی شخص کے پاس اس گروپ کا خون ہو تو

گویااس کی جان اس ایک شخص کے عطیہ پر موقوف ہے، لہذااس اضطرار کے تحت خون دیناواجب ہوجائیگا(مولانا آفتاب عالم غازی، مولانامحبوب فروغ احمد)۔

جن لوگوں نے ایسی صورت مین خون کے عطیہ کوواجب قرار دیا ہے، مجموعی طور پران حضرات نے درج ذیل دلائل ذکر کئے ہیں، قرآن کریم کی آیت ہے:

۱-"**ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**"(سورۂ مائدہ:۳۲)۔

۲-"**من سقى شربة من الماء حيث لا يوجد فكأنما أحيا نفسا ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**"(ابن ماجہ:۲۴۷۴)(مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانامحمد سلمان)۔

۳-"**أطعمو الجائع وعود والمريض وفكواالعانى**"(ابوداؤد۲/۴۴۲)۔

شارحین حدیث نے اس کواضطراری حالت پرمحمول کیا ہےاورحکم اطعام کوواجب قرار دیا ہے(مولانامحبوب فروغ احمد قاسمی)۔

نیز مقالہ نگاران حضرات نے درج ذیل فقہی عبارتوں سے بھی استدلال کیا ہے:

قرطبی لکھتے ہیں:"**ولا خلاف بين أهل العلم متأخريهم ومتقدميهم فى وجوب رد مهجة المسلم عند خوف الذهاب والتلف بالشيء اليسير الذي لا مضرة فيه على صاحبه وفيه البلغة**"(قرطبی، سورۂ بقرہ آیت:۱۳۳ کی تفسیر کے تحت)(مفتی فریداحمد)۔

"**قوله:الندب لذاتها: أي وقد يعرض لها الوجوب كالهبة للمضطر**"(شرح مختصر خلیل للخرشی:۱۰۱۷)(مولانا آفتاب غازی)۔

مولانامحبوب فروغ نے اضطراری حالت میں عطیہ خون کے وجوب پراس جزئیہ سے استدلال کیا ہے:"**المحتاج إذا عجزعن الخروج يفترض على كل من يعلم حاله أن يطعم مقدار مايتقوى به على الخروج وأداء العبادات**"(عالمگیری۵/۳۳۸)۔

مفتی شاہجہاں ندوی نے درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے:

"**صيانة النفس عن الهلاك فرض بقدر الامكان**"(البنایہ۱۳/۲۶)۔

مولانامحبوب فروغ نے رضاعت صغیر کے مسئلہ سے بھی استدلال کیا ہے کہ اگر ماں کے علاوہ دودھ پلانے والی کوئی اورعورت موجودنہ ہوتوماں کودودھ پلانے پرمجبور کیا جائے گا۔

"أما اذا كان لاتوجدمن ترضعه تجبر الأم على الإرضاع صيانة للصبي عن الضياع"(ہدایہ ۲/۴۴۴)(مقالہ مولانا محمد فاروق)۔

مولانا محمد منت اللہ قاسمی نے درج ذیل عبارت پیش کیا ہے:

"خاف الموت جوعا ومع رفيقه طعام، أخذ بالقيمة منه قدر ما يسد جوعه، وكذالومع رفيقه ماء وخاف الموت عطشا أخذ قدر ما يدفع العطش فإن امتنع قاتل بلا سلاح، وإن كان الرفيق يخاف الموت عطشا وجوعا أيضا ترك له البعض" (مفتی ابوحماد غلام رسول)۔

عرب علماء کی آراء:

ڈاکٹر اسماعیل فرماتے ہیں:"إن الدم هو في الشيء اليسيرلا مضرة على صاحبه في بذله فإذا كان لإنقاذ حياة مسلم من الهلاك فهو واجب"(البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ:۲۵۹)(مولانا محمد مغفور باندوی)۔

فتاوی اللجنۃ میں ہے:"التبرع بالدم جائز إذا كان لا يؤخر على صحة المتبرع، لكن إذا ترتب عليه إنقاذ معصوم ولا يوجد غيره فإنه يجب والحالة هذه" (فتاوی اللجنۃ ۲۵/۶۹)(مفتی فیاض احمد حسینی)۔

دکتور ولید بن راشد السعیدان لکھتے ہیں:

"وأما إذا كانت هذه الفصيلة لا توجد في أحاد الناس لندرتها فإن المتبرع بها يكون فرض عين فى الحالات الضرورية الطارئة، أي التى يتوقف عليها إحياء النفس وحفظ الطرف من التلف، ويكون التبرع بالدم واجبا عينيا إذا لم يوجد أحد من المتبرعين إلا هذا الرجل، لكن هذا مشروط بأمن الضرر على المتبرع، وذلك لأن المتقرر شرعا أن الضرر لا يدفع بالضرر، والمتقرر أيضا أن صاحب الشيء أحق به من غيره إذا كان محتاجاله"(الإفادۃ الشرعیہ فی بعض المسائل الطبیۃ)(مقالہ مفتی ابوحماد غلام رسول)۔

جن حضرات نے ایسی صورت میں خون دینے کو جواز کے درجہ میں رکھا ہے، ان کی آراء مع دلائل درج ذیل ہیں:

مولانا اشتیاق احمد اعظمی صاحب لکھتے ہیں: مطلوبہ گروپ کے خون کے حامل شخص کو خون کا عطیہ دینا جواز ہی کے حدود میں ہونا چاہئے، کیونکہ اگر خود اسے خون کی ضرورت پڑ جائے تو اسی گروپ کا خون ملنا اس کے لئے بھی مشکل ہوگا تو دوسرے کی زندگی بچانے سے زیادہ اس کے لئے اپنی جان کی حفاظت ضروری ہے۔

مولانا عبد الرشید قاسمی لکھتے ہیں: جب نفس علاج ہی واجب نہیں تو خون دینا کیوں کر واجب ہوگا، لہذا خون دینا

مستحب ہوگا (نیز دیکھئے مقالہ: مفتی امتیاز دلنوی، مولانا محمد عفان، مولانا محمد ظفر عالم)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ کا فتویٰ:

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری فرماتے ہیں: انسان اپنے بدن یا کسی عضو کا مالک نہیں ہے، تو اس کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ اپنا خون نکلوا کر بلڈ بینک میں جمع کرادے (فتاویٰ رحیمیہ ۱۰/ ۲۹۵) (مولانا افضل حسین، مولانا محمد فاروق)۔

سوال نمبر ۵- انسانی جسم کا ایک اہم ترین عضو جگر ہے، جو غذا کو ہضم کرنے اور انسان کو غذا میں غیر محسوس طور پر آجانے والے مسموم اجزاء سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک جگر کی پیوندکاری کو ناممکن سمجھا جاتا تھا؛ لیکن جدید میڈیکل ترقی نے اس کو ممکن بنادیا ہے اور خود ہندوستان میں اس کے کئی کامیاب آپریشن ہوچکے ہیں، ایک زندہ انسان کا جگر دوسرے انسان کو نہیں لگایا جاسکتا؛ کیونکہ انسان جگر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہے، البتہ جس شخص کا انتقال ہوچکا ہو، انتقال کے فوراً بعد اس کا جگر نکالا جاسکتا ہے؛ کیونکہ پہلے انسان کے دل و دماغ کی موت ہوتی ہے، اس کے بعد چند گھنٹوں تک اعضاء اور خلیات میں حیات باقی رہتی ہے اگر اس کے باقی رہتے ہوئے کوئی عضو نکال لیا جائے تو وہ دوسرے کو کام آسکتا ہے، کیا اس طرح کسی متعین مریض کو اس کی جان بچانے کے لئے یا اس عضو کو محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دیا جاسکتا ہے تاکہ ایک انسان کی جان بچائی جاسکے۔

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں نے تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس سلسلہ میں اعضاء کی پیوندکاری سے متعلق علماء کے اختلافات، ان کے دلائل اور توجیہات ذکر کی ہیں، چونکہ اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) اس موضوع پر اپنا پہلا فقہی سمینار (۱-۳/ اپریل ۱۹۸۹ء کو نئی دہلی میں) کرچکی ہے، اور اس موضوع پر آنے والے مقالات اور مناقشات اور اکیڈمی کے فیصلے شائع بھی ہوچکے ہیں، اس لئے طوالت کے خوف سے ہم نے ان بحثوں کو نہیں ذکر کیا ہے، اور ہم نے صرف ان عبارتوں اور دلائل کی تلخیص کرنے کی کوشش کی ہے، جو اس سمینار کے موضوع سے متعلق ہے۔

اس سوال سے متعلق چند فاضل مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ احترام انسانیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے میت میں کسی قسم کے قطع و برید کی اجازت نہ دی جائے جبکہ اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اہون البلیتین پر عمل کرتے ہوئے اور میت کے مقابلہ میں زندہ انسان کی حرمت بہر حال بڑھی ہوئی ہے، اس لئے اضطرار کی حالت میں چند شرائط کے ساتھ اس کی گنجائش ہوگی۔

ذیل میں مقالہ نگاران کی آراء پیش خدمت ہیں:

مولانا اشتیاق احمد اعظمی لکھتے ہیں: کسی مریض کے عضو ئیس مثلاً جگر، پھیپھڑے اور گردہ وغیرہ کے فیل ہوجانے پر کسی مردہ یا زندہ کے جسم سے ان اعضاء کو نکال کر چند شرائط کے ساتھ جواز کا قول انسب معلوم ہوتا ہے۔

مفتی عبد الرشید قاسمی لکھتے ہیں: گردہ کی پیوند کاری اور زندہ شخص سے گردہ لینے کے جواز سے متعلق فقہ اکیڈمی کا فیصلہ اتفاق آراء کے ساتھ (سوائے مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب کے) آچکا ہے، علماء عرب پہلے ہی جائز قرار دے چکے ہیں، البتہ گردہ اور جگر میں فرق یہ ہے کہ گردہ دو ہوتے ہیں، اور جگر ایک، علماء گردہ کے عطیہ کے جواز پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ گردہ دو ہوتے ہیں، اس لئے ایک گردہ دینے کی گنجائش ہے، موصوف لکھتے ہیں: یہ فرق اب زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ اب جگر کے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر کے بھی مریض کی پیوند کاری کی جاسکتی ہے، نیز جب زندہ انسان کا گردہ لینا جائز ہے تو مردہ انسان کا لینا بدرجہ اولی جائز ہوگا، زندہ انسانوں کو دو گردوں کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ مردہ انسان کو اب جگر کی کوئی ضرورت نہیں۔

مولانا بدر احمد مجیبی لکھتے ہیں: جب کوئی شخص وصیت کر جائے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو کسی ضرورت مند کو دے دیا جائے تو اس کی وفات کے بعد وہ عضو نکال کر کسی ضرورت مند کو دیا جاسکتا ہے یا کسی طبی ادارہ کو دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ میت نے خود اس کی وصیت کی ہو اور اس کے وارثین بھی اس پر تیار ہوں۔

مفتی محمد اقبال ٹنکاروی نے مولانا بدر الحسن قاسمی صاحب کی کتاب سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے، اس کو اختصار کے ساتھ ہم نقل کرتے ہیں، تاکہ اس موضوع سے متعلق ضروری مباحث سامنے آجائیں اور پھر نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

(۵،۶) مولانا بدر الحسن قاسمی دامت برکاتہم لکھتے ہیں: آنکھیں، دل، گردے، جگر یا جسم کے دوسرے وہ حصے جو بیماری یا کسی حادثہ کا شکار ہوجانے کی وجہ سے کارآمد نہ رہے ہوں، ان کی جگہ پر سرجری کے ذریعہ انسانی یا حیوانی یا مصنوعی عضو لگانا؛ تاکہ مریض کی زندگی بچائی جاسکے یا اس کے ناکارہ عضو کی کارکردگی بحال کی جاسکے، اس مقصد کے لئے درج ذیل صورتیں استعمال میں لائی جاتی ہیں:

(۱) پلاسٹک یا کسی دھات سے تیار شدہ مصنوعی عضو کا استعمال، جیسے ٹوٹے ہوئے دانت یا کٹی ہوئی ناک کی جگہ پر سونے یا کسی دوسری دھات یا پتھر سے بنے ہوئے دانت یا ناک کا استعمال یا پھیپھڑے کی خرابی کو پلاسٹک وغیرہ کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش۔

(۲) ایسے حیوانات جن کی خلقت یا بعض اعضائے جسم، انسانی اعضاء سے مماثلت رکھتے ہیں، ان کے اجزائے جسم سے استفادہ اور ان کے ذریعہ تلف شدہ اور ناکارہ انسانی عضو کا کام لینے کی کوشش جیسے بندر وغیرہ کے بارے میں بعض

تجربات ڈاکٹروں نے کئے ہیں۔

(۳) خود مریض کے اپنے جسم کے کسی حصہ کی کھال، یا گوشت کا دوسرے حصہ کی خرابی دور کرنے کے لئے استعمال، جیسے سر کی کھال کاٹ کر اوپر کے ہونٹ میں پیدا ہو جانے والی خرابی دور کرنے کے لئے استعمال کی جائے یا ان کی کھال چہرے پر زخم وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی بدنمائی دور کرنے کے لئے استعمال کی جائے۔

(۴) دوسرے زندہ آدمی کا بطور عطیہ دیا ہوا یا خریدا ہوا کوئی عضو استعمال کیا جائے، جیسا کہ آج کل گردے کا چندہ اکٹھا کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے، اور سرکاری طور پر بعض ملکوں میں میڈیکل اداروں کے ماتحت اسے قانونی طور پر جائز کر لیا گیا ہے، اور لوگ خوش دلی سے اس مہم میں حصہ لینے لگے ہیں۔

(۵) مردہ کے جسم سے حاصل شدہ کارآمد اجزاء آنکھ کی پتلی، پھیپھڑے، دل وغیرہ کا استعمال، اور عام طور پر یہی صورت زیادہ مروج اور مشہور ہے۔

مولانا موصوف نے ان شکلوں کو ذکر کرنے کے بعد ہر ایک شکل پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، لیکن چونکہ ان میں سے اکثر شکلوں پر خود اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ''اعضاء کی پیوند کاری اور پلاسٹک سرجری'' کے عناوین سے سمینار منعقد کر چکی ہے، اس لئے ہم چوتھی اور پانچویں شکل پر مولانا کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

چوتھی صورت وہ تھی جس میں زندہ آدمی اپنا کوئی عضو دوسرے آدمی کی جان بچانے کی خاطر بطور عطیہ یا معاوضہ لے کر دے۔

شریعت میں دونوں جانوں کی حرمت یکساں ہے اور انسان کو خود اپنے ہاتھ پاؤں یا جسم کے کسی حصہ کو کاٹ کر فروخت کرنے یا بطور چندہ دینے کی اجازت نہیں دی گئی ہے، اس لئے کسی زندہ آدمی کے جسم سے ایسا کوئی عضو علیحدہ کرنا جس سے خود اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہو نہ تو وہ معاوضہ دے کر جائز ہوگا اور نہ بغیر معاوضہ کے، نہ خود اس کی اجازت سے اور نہ بغیر اس کی اجازت کے، کیوں کہ خود اسے بھی اپنے جسم پر ایسا تصرف کرنے کا حق شرعاً حاصل نہیں ہے، خود ایسا کرنا یا کرانا تو خودکشی کے مترادف ہے اور دوسرے کا اقدام قتل نفس کے حکم میں ہے اور دونوں ہی صورتیں حرام و ناجائز ہیں۔

البتہ بعض ایسے اعضاء جن کی قطع و برید سے خود اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا ہو اور نہ اسے کوئی غیر معمولی ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اس سے کسی دوسرے آدمی کی جان بچائی جا سکتی ہو، اصل قواعد کی رو سے گو کہ یہ بھی صحیح نہیں ہے؛ لیکن موجودہ زمانہ کے بعض اہل علم نے کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے اور اسی کے اساس پر بعض مسلم ممالک میں کلیہ (گردے) کے چندہ کا دروازہ کھولا گیا ہے، اس جواز میں دو پہلو سامنے رکھے گئے ہیں، ایک تو کسی انسان کی جان بچانے کی

اہمیت، دوسرے ڈاکٹروں کی طرف سے مسلسل یقین دہانی کہ اس سے عطیہ دینے والے شخص کی جان یا صحت پر کوئی قابل ذکر منفی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے، اس صورت میں بھی جواز کی شکل صرف اس وقت ہے جب کہ عطیہ دینے والا شخص بغیر کسی دباؤ یا لالچ کے اپنی خوشی سے کسی دوسرے کی جان بچانے کے لئے اپنا ایسا عضو قربان کر رہا ہو، جس سے خود اس کی صحت یا جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، نہ تو عمومی طور پر چندہ اکھٹا کرنا درست ہے اور نہ خرید وفروخت، چوں کہ جان بچانے کی مصلحت کسی ایک عضو کو اپنی مرضی سے تلف کرنے کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ تھی، اس لئے ضرورت کی حد تک ہی یہ جواز بھی محدود ہوگا، اگر مردہ حیوان کے اعضاء سے کام چل سکتا ہو یا مصنوعی عضو ہوسکتا ہے تو اس کی اجازت ہرگز نہ ہوگی، چوں کہ بعض صورتوں میں زندہ آدمی کا جگر ہی مثال کے طور پر کارگر ہوسکتا ہے، اس لئے یہ راہ کھولی گئی ہے، ورنہ آدمی خود اپنے اعضائے جسم کے بارے میں آزادانہ تصرف کرنے کا شرعاً مجاز نہیں ہے۔

آخری اور پانچویں صورت وہ ہے جس میں مردہ آدمی کے اعضاء سے کسی کی زندگی بچانے یا تکلیف دور کرنے کا کام لیا جائے، اور یہی صورت زیادہ پیش آنے والی ہے اور مدت سے فقہاء اور علماء دین کے درمیان بحث ونظر کا موضوع بھی یہی صورت رہی ہے۔

شریعت نے یوں تو مردہ لاش کا بھی وہی احترام باقی رکھا ہے جو زندہ کو حاصل ہے اور اس کی اہانت یا اس میں قطع وبرید کو بھی اسی طرح ناجائز قرار دیا ہے، جس طرح زندہ انسان کے جسم میں کاٹ چھانٹ کو، لیکن مصالح کے پیش نظر اور موجودہ سرجری میں غیر معمولی ترقی ہوجانے کے بعد اعضاء کی پیوندکاری کی افادیت تقریباً یقینی ہوجانے کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے، کیوں کہ کسی مردہ کی لاش سے آنکھ، دل یا پھیپھڑے کو کارآمد حالت میں نکال کر کسی دوسرے کے جسم میں لگانا اہانت کے لئے ہرگز نہیں ہوتا، بلکہ اس کے سڑگل جانے کے بجائے کسی ایسے آدمی کا جزو بدن بنا دینا جو اس کے بغیر اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا ہو زیادہ بہتر اور قرین مصلحت ہے، شرعی نقطۂ نظر سے جب کبھی بھی مصلحتوں اور مضرتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو اور مصلحت کا پہلو غالب نظر آئے تو اس کو ترجیح ہوگی، سوائے اس کے کہ کسی چیز کی حرمت صراحت کے ساتھ کتاب وسنت میں مذکور ہو تو وہاں مصلحت ومضرت سے قطع نظر شریعت کے حکم کی پیروی مطلوب ہوگی۔

یہ حکم صراحت کے ساتھ کتاب وسنت میں تو مذکور نہیں ہے، لیکن فقہاء نے بعض نظیریں ایسی ذکر کی ہیں، جن کو بنیاد بنا کر اس کے جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے۔

فقہ حنبلی کی مشہور کتاب ''المغنی'' میں مذکور ہے: اگر کوئی شخص کوئیں میں گر کر مرجائے اور لوگوں کو اس کنویں کے پانی کی ضرورت ہو تو لوہے کے کانٹے یا سلاخوں کے ذریعہ جس سے لاش کے پھٹ جانے کا امکان ہو اسے نکالا جاسکتا ہے وہ مزید

فرماتے ہیں:

''لأن حرمة الحی وحفظ نفسه أولی من حفظ المیت عن المثلة، لأن زوال الدنیا أهون علی الله من قتل مسلم، ولأن المسلم لو بلع مال غیره شق بطنه لحفظ مال الحی ، وحفظ النفس أولی من حفظ المال والله أعلم''.

ابن قدامہ نے جس زور وقوت سے زندہ آدمی کی زندگی بچانے کی خاطر مردہ کی لاش کی اہانت کے پہلو کو نظرانداز کرنے کا مسئلہ ذکر کیا ہے، اس سے مردہ کے جسم سے کارآمد اجزاء اس غرض سے الگ کرنے کا جواز بھی نکلتا ہے، تاکہ ان سے کسی کی جان بچائی جاسکے۔

شافعی فقیہ ومحدث امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''وإن ماتت امرأة وفی جوفها جنین حی شق جوفها لأنه استبقاء حی باتلاف جزء من المیت فاشبه إذا اضطر الی أکل جزء من المیت''.

بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:'' وان بلع المیت جوهرة لغیره وطالب بها صاحبها شق جوفه وردت الجوهرة له، وان کانت الجوهرة له ففیه وجهان: أحدهما یشق والثانی لا''۔

فقہ مالکی کی مشہور کتاب شرح مختصر خلیل میں بھی اسی کے مشابہ مسئلہ مذکور ہے، شرح کے الفاظ ہیں:''یجوز شق بطن المیت إذا توفرت البینة وهی الشاهد أو الیمین''.

فقہائے احناف بھی اس مسئلہ میں دوسروں سے الگ نہیں ہیں، علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب فتوی کا مدار سمجھی جاتی ہے؛ فرماتے ہیں:''حامل ماتت وولدها حی یشق بطنها ویخرج ولدها.ولو بلع مال غیره ومات هل یشق ؟ قولان: والاولی نعم''.

یہ تمام فقہی نظائر اس کی تائید کرتے ہیں کہ زندہ آدمی کی جان بچانے کی خاطر میت کی لاش میں تصرف کیا جاسکتا ہے، اس لئے پیوندکاری کی خاطر اگر میت کے ورثاء کی اجازت سے جسم کا کوئی کارآمد حصہ نکال لیا جائے تو مصلحت اور ضرورت کی بناء پر یہ جائز ہوگا، اسی طرح حادثہ وغیرہ کا شکار ہوجانے والے غیر معلوم اشخاص اور خاص طور پر غیر معلوم کی لاش سے کارآمد اجزاء علیحدہ کرلینا؛ تاکہ کسی کی جان بچائی جاسکے یا آنکھ وغیرہ سے معذور شخص کی اعانت کی جاسکے، از روئے شرع جائز ہوگا۔ (عصر حاضر کے فقہی مسائل: ص:۸۶ تا۱۰۰، ط: ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی)۔

مثلہ:

اس صورت میں یہاں مثلہ کا شبہ بھی ہورہا ہے، جو ممنوع ہے، مثلہ کے معنی انسان یا جانور کے اعضاء میں قطع وبرید

کے ہیں،حیوان کی طرف نسبت کے وقت اس کے کسی عضو کو کاٹنا مراد ہوگا،اور انسان میں ناک،کان،شرمگاہ یا اور کوئی عضو کاٹنا مراد ہوگا۔

نہایہ کے حوالہ سے مثلہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت علامہ محمد بن طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:''**المثلة: يقال مثلت بالحيوان مثلا، إذا قطعت أطرافه وشهوت به، ومثلت بالقتيل اذا حدعت أنفه أو أذنه أو مذاكيره أو شيئا من أطرافه**''(مجمع بحار الانوار: مادہ مثل،ص:۵۵۲،ج:۴،ط: مکتبہ دار الایمان المدینۃ المنورہ)

خلاصہ یہ ہے کہ مثلہ میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں: کسی کی صورت بگاڑنا اور سخت ایذا رسانی،کبھی کوئی عمل بالقصد ہوتا ہے اور اس میں مثلہ ہوجاتا ہے،پھر بھی وہ حد جواز میں آتا ہے،کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ(۱)قطع وبرید کبھی قصاصاً ہوتا ہے،یہ جائز بھی ہے،البتہ اس کا ترک (معافی ودیت) اولی ہے،اور کبھی یہ قطع وبرید زندہ آدمی میں عقوبت کے طور پر ہوتا ہے،جیسے چور کے ہاتھ کاٹنا،راستوں پر گذرنے والے مسافروں کو لوٹنے والے لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹنا۔

(۲)کبھی یہ قطع وبرید زندہ آدمی میں کسی مصلحت سے ہوتی ہے،جیسے کوئی مرض ہے اور آپریشن ضروری ٹھہرا یا کوئی ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ ہاتھ یا پاؤں کاٹنا ضروری ہوگیا،تو یہ جائز اور کبھی واجب کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے،اور کبھی حالات کو مدنظر رکھ کر اس قطع وبرید سے رکنا بھی پڑتا ہے،بلکہ کبھی ممنوع بھی ہوجاتا ہے۔

(۳)اور دوسرے کی مصلحت کے لئے زندہ آدمی میں قطع وبرید محل نظر واجتہاد ہے۔

(۴)اور میت میں خود میت کی مصلحت کے لئے یا دوسرے کے حق کے لئے اور کسی مضطر کے لئے قطع وبرید بھی محل نظر واجتہاد ہے۔

(۵)اور جو قطع وبرید محض عبث اور لہواً ہو،کوئی مصلحت یا کسی کا حق اس سے وابستہ نہ ہو یا محض کسی پر اپنے غصہ کی آگ بجھانے کے لئے قطع وبرید کیا تو یہ صورت یقیناً حدود جواز سے خارج؛ بلکہ حرام ہوگی۔

صورت نمبر ۱،۲،اور ۵ میں تو کوئی اختلاف نہیں،البتہ صورت نمبر ۳/اور ۴/میں چوں کہ نظر،غور اور اجتہاد کی گنجائش ہے،اسی لئے علماء کرام کے مابین اس باب میں اختلاف ہوا ہے،جیسا کہ اس کی کچھ وضاحت اوپر گذر چکی۔

جن مقالہ نگاران نے اس طرح کی وصیت کو جائز قرار دیا ہے،انہوں نے مشترکہ طور پر درج ذیل مستدلات ذکر کی ہیں،ان میں اکثر دلائل مشترک ہیں،اس لئے طوالت کے خوف سے ان میں ناموں کی فہرست کو حذف کردیا گیا ہے،البتہ جن مقالہ نگاروں نے کسی خاص نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے،ان کے ناموں کو ذکر کردیا گیا ہے۔

۱-"إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما"(الاشباہ للسیوطی ولابن نجیم)۔

۲-"لو كان أحدهما أعظم ضررا من الآخر فإن الأشد يزال بالأخف"(الاشباہ لابن نجیم)۔

علامہ زیلعی لکھتے ہیں:

۳-"ثم الأصل فى جنس هذه المسئلة أن من ابتلي ببليتين وهما مستساويتان يأخذ بأيهما شاء، وان اختلفا يختار أهونهما،لأن مباشرة الحرام لا تجوز إلا للضرورة ولا ضرورة في حق الزيادة"(تبیین الحقائق للزیلعی، باب شروط الصلاۃ)(مولانا بدر احمد مجیبی)۔

۴-"الضرر يدفع بقدار الإمكان"(مجلۃ الأحکام العدلیہ دفعہ:۳۱)(مفتی شاہجہاں ندوی)۔

۵-"ولواعترض الولد في بطن حامل ولم يوجد سبيل إلى استخراج ذلک إلا بقطع الولد إربا إربا، ولولم يفعل ذلک يخاف الهلاک على الأم، فإن كان الولد ميتافي البطن فلا بأس به، وإن كان حيا لامعنى لجواز القطع، لأن هذا قتل النفس لصيانة نفس آخروالشرع لم يرد بمثله"(المحیط البرہانی ۵/۲۵۲)۔

۶-علامہ موصلی تحریر کرتے ہیں:"امرأة حامل اعترض الولد في بطنها، ولا يمكن استخراجه إلا بأن يقطع ويخاف على الأم، إن كان ميتا لا باس به وإن كان حيا، لايجوز" (الاختیار شرح المختار للموصلی ۴/۱۷۹)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

۷-"حامل ماتت وولدها حي يشق بطنها ويخرج ولدها، ولو بلع مال غيره ومات هل يشق؟قولان:والأولى نعم"(مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

۸-"حامل ماتت فاضطرب في بطنها ولد فإن كان في أكبر الرأي أنه حي يشق بطنها، لأنا ابتلينا ببليتين فنختار أهونهما، وشق بطن الأم الميتة أهون من إهلاک الولد الحي"(بدائع الصنائع، کتاب الاستحسان)۔

علامہ سمرقندی اسی جزئیہ کی علت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"ترک التعظيم أهون من مباشرة سبب الموت"(تحفۃ الفقہاء ۳/۳۴۵)۔

مولانا بدر احمد مجیبی لکھتے ہیں:اس مسئلہ کی جو علت بیان کی گئی ہے"شق بطن الأم الميتة أهون من إهلاک

الولد الحي"یاترک التعظیم أهون من مباشرة سبب الموت"،اس سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ تکریم میت پر زندہ کی جان بچانے کو ترجیح دی جائے گی۔

المغنی میں مذکور ہے: اگر کوئی شخص کنویں میں گر کر مرجائے اور لوگوں کو اس کنویں کے پانی کی ضرورت ہو تو لوہے کے کانٹے یا سلاخوں کے ذریعہ جس سے لاش کے پھٹ جانے کا امکان ہو، اسے نکالا جاسکتا ہے، ابن قدامہ اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "لأن حرمة الحي وحفظ نفسه أولى من حفظ الميت عن المثلة، لأن زوال الدنيا أهون على الله من قتل مسلم" (مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں: "وإن امرأة ماتت وفي جوفها جنين حي شق جوفها، لأنه استبقاء حي بإتلاف جزء من الميت فأشبه إذا اضطر إلى أكل جزء من الميت" (مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

فقہ مالکی کی مشہور کتاب شرح مختصر خلیل میں ہے:

"يجوز شق بطن الميت إذا توفرت البينة وهي الشاهد أو اليمين" یعنی اگر میت کے پیٹ میں مال ہونے کا ثبوت شرعی طور پر ہوجائے تو پیٹ کا چاک کرنا درست ہے (مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

مولانا بدر احمد مجیبی لکھتے ہیں: فقہی قاعدہ کی رو سے اگر دو ضرر پائے جارہے ہیں تو ان میں جو زیادہ اہم اور شدید ہے اس کو دور کیا جائے گا اور کم اہم کو برداشت کرلیا جائے گا۔ زیر بحث مسئلہ میں زندہ انسان کو بچانا وفات یافتہ انسان کی لاش کی تکریم سے زیادہ ضروری ہے، انسانی زندگی کو بچانے کے لئے مردہ کھانے، زبان پر کلمۂ کفر جاری کرنے اور حرام اشیاء سے علاج کی بھی اجازت دی گئی ہے۔

مولانا فاروق صاحب لکھتے ہیں: جزئیات فقہیہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مردہ کے باب میں قدر تخفیف برتی گئی ہے جس کی وجہ سے مردہ کی تعظیم وکرامت سے قدر چشم پوشی برتتے ہوئے زندہ مضطر کی ابقاء حیات کی تدبیر کی گنجائش دی جاسکتی ہے، ''موسوعہ فقہیہ'' میں ہے:

"اتفق الفقهاء على أن المضطر إن لم يجد إلا آدميا محقون الدم لم يبح له قتله ولا إتلاف عضو منه مسلما كان أو كافرا لأنه مثلة فلا يجوز أن يبقى نفسه بإتلافه، واختلفوا فيما إذا وجد آدميا معصوما ميتا فأجاز بعض الحنفية والشافعية على أصح الطريقين وأشهرهما أكله، لأن حرمة الحى أعظم" (موسوعہ فقہیہ ۱۹۹/۲۸) (مولانا محمد فاروق)۔

علماء شوافع نے مضطر کے لئے مردہ انسان کو کھانے کی اجازت دی ہے جبکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا مردار نہ ہو،

کیونکہ زندہ کی حرمت وکرامت میت کی حرمت وکرامت کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے، شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:"**وأجاز الشافعية للمضطر أكل أدمي ميت إذا لم يجد ميتة غيره، لأن حرمة الحي أعظم من حرمة الميت**"(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۲۶۰۷)(مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

مولانا آفتاب غازی نے درج ذیل جزئیہ سے استدلال کیا ہے:

بہت سے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اضطرار کی حالت میں چند قسم کے زندہ لوگوں کو قتل کرکے کھایا جاسکتا ہے، امام نووی فرماتے ہیں:"**ويجوز له قتل الحربي والمرتد وأكلهما بلاخلاف، وأما الزاني المحصن، والمحارب وتارک الصلاة ففيهم وجهان أصحهما وبه قطع إمام الحرمين والمصنف والجمهور يجوز**"(المجموع ۴/۴۴)(مولانا آفتاب غازی)۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:"**فإن كان حربيا أو زانيا محصنا جازقتله والأكل منه**"(الجامع لاحکام القرآن ۲/۲۲۹)(مولانا آفتاب غازی)۔

علماء ہند کے فتاوے:

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب ایک استفتا کے جواب میں لکھتے ہیں: یہ شبہ کہ انسان کے اجزاء کا استعمال ناجائز ہے، اس لئے وارد نہ ہونا چاہئے کہ استعمال کی جو صورت کہ مستلزم اہانت ہو وہ ناجائز ہے، اور جس میں اہانت نہ ہو، تو بہ ضرورت وہ استعمال ناجائز نہیں(کفایت المفتی ۹/۱۴۳)(مولانا آفتاب غازی)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں:

کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ یہ وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد میرا جسم یا جسم کا فلاں عضو آنکھ، کان وغیرہ یا کچھ بھی فلاں شخص کو یا کسی اسپتال کو بطور عطیہ یا بعوض قیمت دے دیا جائے، اگر وصیت کرے گا تو یہ وصیت منعقد وصحیح بھی نہیں ہوگی اور اس کے مرنے کے بعد اس وصیت پر عمل کرنا بھی جائز نہ ہوگا جو لوگ یہ عمل کریں گے وہ سخت گنہگار ہوں گے، اس لئے کہ وصیت مملوکہ مال میں ہوتی ہے اور یہ جسم انسان کا مملوک نہیں بلکہ اللہ تعالی کی ملکیت ہے اور اس کے پاس محض بطور امانت ہے، نیز کوئی عضو خواہ مسلمان ہی کا ہو کٹ کر جسم سے الگ ہونے کے بعد جیفہ ومردار ہونے سے خارج نہیں ہوگا اور نہ وہ پاک وطاہر ہوگا، لہذا اتنا حصہ جسم مردار اور ناپاک ہی رہے گا اور وہ شخص کبھی نماز بھی نہ پڑھ سکے گا اور نہ کبھی طاہر ہی ہوسکے گا، ہاں اگر اضطراری صورت ایسی ہوجائے کہ احشاء جسم (اندرون جسم) میں مثلاً گردہ، پھیپھڑا، جگر، دل وغیرہ میں سے کوئی اس درجہ خراب ہوجائے کہ اس کو نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگانا ضروری ہوجائے اور ماہر معالجوں کے نزدیک جان

بری کے لئے اور زندگی بچانے کے لئے اس عمل کے بغیر چارہ نہ رہے، بلکہ یہی عمل متعین ہوجائے اور صحت وبقاز ندگی کا گمان غالب حاصل رہے تو اس اضطرار کی حالت میں جان باقی رکھنے کے لئے اس عمل کے بقدر اضطرار گنجائش ہو سکے گی، پھر یہ بھی کوشش لازم وضروری رہے گی کہ بجائے انسانی عضو کے کسی جانور کا عضو اور وہ بھی ماکول اللحم جانور کے عضو سے کام چل سکے تو صرف اسی عضو سے کام لیا جائے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/۳۸۸) (مفتی اقبال ٹنکاروی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

عطیہ کی وصیت کے لئے شرائط:

مولانا اشتیاق احمد اعظمی لکھتے ہیں: بہت سے معاصرین علماء بوقت ضرورت زندہ ومردہ انسان کے اعضاء سے پیوندکاری کے قائل ہیں، البتہ انہوں نے اس کے لئے درج ذیل شرائط ذکر کی ہیں:

۱- جس مردہ کے عضو کو لیا جارہا ہو وہ مرنے سے پہلے عطیہ کی وصیت کرچکا ہو، یا مرنے کے بعد اس کے ورثہ عطیہ پر راضی ہوں، یا لاوارث کی لاش ہو تو اولوالامر کی رضامندی سے اس کا عضو حاصل کرنا جائز ہوگا ورنہ جائز نہ ہوگا۔

۲- مریض کو اس عضو کی پیوندکاری کی واقعی ضرورت ہو، یعنی اس پیوندکاری کے بغیر یا تو اس کی زندگی کی بقا ممکن نہ ہو یا اس کی شدت تکلیف کم نہ ہوسکتی ہو۔

۳- پیوندکاری کے علاوہ کوئی اور علاج کارگر نہ ہو۔

۴- انسان کے لئے اپنی موت کے بعد اپنے کسی بھی ایسے عضو کو بطور عطیہ دینے کا جواز ہوگا جس کے بارے میں اطباء کی رائے ہو کہ اس عضو میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ اس سے دوسرے مریض کے لئے استفادہ کیا جاسکے، البتہ اعضاء تناسل اور موروثی صفات کو منتقل کرنے والے اعضاء کا عطیہ یا اس کا لینا جائز نہ ہوگا۔

۵- عطیہ دہندہ یا اس کے ورثہ کی تمام شرطوں کو عطیہ قبول کرنے والے کے لئے پابندی لازم ہوگی (مجموعۃ الفتاوی الشرعیہ الکویتیہ ۱۸/۵۰۹-۵۱۰ مشروط المتبرع بالأعضاء ۱/ ۴۲۳، ۴۲۴)۔

اردن کے دارالافتاء نے درج ذیل شرطوں کے ساتھ میت سے عضو کی منتقلی کو جائز قرار دیا ہے:

"منها: موافقة الميت أو والديه أو وليه بعد وفاته، أو ولي الأمر المسلم إذا كان المتوفى مجهول الهوية، وأن توجد الحاجة أو الاضطرار، وأن لا يكون بمقابل مادي......وذلک لحفظ كرامة الميت" (البیوع المحرمۃ والمنہی عنہا ۱/ ۴۱۶) (مولانا آفتاب غازی)۔

اعضاء کی پیوندکاری سے متعلق اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے فیصلے:

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸-۱۱/ جمادی الاول ۱۴۱۰ھ مطابق

۸-۱۱/دسمبر ۱۹۸۹ء کو اعضاء کی پیوندکاری سے متعلق درج ذیل تجاویز منظور کیں:

۱-کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کے لئے کسی متبادل کی ضرورت ہو تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے:

الف-غیر حیوانی اجزاء کا استعمال۔

ب-ایسے جانوروں کے اعضاء کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے اور جو بطریقہ شرعی ذبح کئے گئے ہوں۔

ج-جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے جن کا کھانا حرام ہے، یا حلال تو ہے لیکن بطریق شرعی ذبح نہیں کئے گئے ہیں، تو ایسی صورت میں ان غیر ماکول اللحم یا ماکول اللحم مگر غیر مذبوح جانوروں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے۔

اور اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو تو خنزیر کے اجزاء کا استعمال جائز نہیں۔

۲- اسی طرح ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔

۳- اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔

۴- اگر کوئی مریض ایسی حالت میں پہنچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ کسی دوسرے انسان کا عضو اس کے جسم میں پیوند نہ کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائے گی، اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا، اور ماہر قابل اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضو انسانی کی پیوندکاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے، اور عضو انسانی کی پیوندکاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضو انسانی اس مریض کے لئے فراہم ہے، تو ایسی ضرورت، مجبوری اور بے کسی کے عالم میں عضو انسانی کی پیوندکاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کے لئے مباح ہوگا۔

۵-اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچالے۔

۶- اگر کسی شخص نے ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوندکاری کے لئے استعمال کئے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جا سکتا اور ایسی وصیت اور خواہش

شرعاً قابل اعتبار نہیں۔

(نوٹ: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب کو دفعہ ۴،۵ سے اتفاق نہیں ہے)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (جدہ) کے فیصلے:

مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے (۱۸ تا ۲۳ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مورخہ ۶ تا ۱۱ فروری ۱۹۸۸ء میں) اس موضوع سے متعلق سمینار منعقد کیا تھا، جس کی تجاویز وقرارداد درج ذیل ہیں:

أولا: يجوز نقل العضو من مكان من جسم الإنسان إلى مكان آخر من جسمه مع مراعاة التأكد من أن النفع المتوقع من هذه العملية أرجح من الضرر المترتب عليها، وبشرط أن يكون ذلک لإيجاد عضو مفقود، أولإعادة شكله أو وظيفته المعهودة له، أو لإصلاح عيب أو إزالة دمامة تسبب للشخص أذى نفسيا أو عضويا۔

ثانيا: يجوز نقل العضو من جسم إنسان إلى جسم إنسان آخر، إن كان هذا العضو يتجدد تلقائيا، كالدم والجلد، ويراعى فی ذلک اشتراط كون الباذل كامل الأهلية، وتحقق الشروط الشرعية المعتبرة۔

ثالثا: تجوز الاستفادة من جزء من العضو الذی استؤصل من الجسم لعلة مرضية لشخص آخر، كأخذ قرنية العين لإنسان ما، عند استئصال العين لعلة مرضية۔

رابعا: يحرم نقل عضو تتوقف عليه الحياة، كالقلب من إنسان حيی إلى إنسان آخر۔

خامسا: يحرم نقل عضو من إنسان حيی يعطل زواله وظيفة أساسية فی حياته وإن لم تتوقف أصل الحياة عليها، كنقل قرنية العينين كلتيهما، أما إن كان النقل يعطل جزء ا من وظيفة أساسية فهو محل بحث و نظر، كما يأتی فی الفقرة الثامنة۔

سادسا: يجوز نقل عضو من ميت إلى حيی تتوقف حياته على ذلک العضو، أو تتوقف سلامة وظيفة أساسية فيه على ذلک، بشرط أن يأذن الميت قبل موته أوورثته بعد موته أو بشرط موافقة ولی أمر المسلمين إن كان المتوفی مجهول الهوية أولا ورثه له۔

سابعا: وينبغی ملاحظة أن الإتفاق على جواز نقل العضو فی الحالات التی تم بيانها، مشروط بأن لايتم ذلک بواسطة بيع العضو إذ لا يجوز إخضا ع أعضاء الإنسان للبيع بحال ما۔

أما بذل المال من المستفيد، ابتغاء ا لحصول على العضو المطلوب عند الضرورة أو مكافأة وتكريما، فمحل إجتهاد ونظر۔

ثامنا: كل ما عدا الحالات والصور المذكورة مما يدخل فى أصل الموضوع فهو محل بحث و نظر، ويجب طرحه للدراسة والبحث فى دوراة قادمة على ضوء المعطيات الطبية والأحكام الشرعيه"(قرارات مجمع الفقه الإسلامی ۱/۷۳)۔

مولانا محمد ظفر عالم مذکورہ بالاتجاویز نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

مذکورہ بالاتجاویز میں تجویز نمبر: ۳ میں سمینار کا فیصلہ درج ہے کہ آنکھ کا قرنیہ کسی بھی انسان کے لئے منتقل کرنا جائز ہے اور یہ اس صورت میں جبکہ دوسرے آنکھ سے زندگی کا عمل جاری ہو، اور تجویز نمبر: ۵ میں یہ صراحت کردگئی ہے کہ اگرایسا عضو نکال دیا گیا جس سے زندگی کا اساسی عمل اور وظیفہ متاثر ہوجائے تو پھر اس قسم کا عضو منتقل نہیں کیا جاسکتا بلکہ حرام ہے، جیسے دونوں آنکھ کا قرنیہ منتقل کرکے دوسرے انسان کو دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک آنکھ کا قرنیہ تو منتقل کرنا درست ہے لیکن دونوں آنکھ کا قرنیہ منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔

عرب علماء کی آراء:

شیخ عبدالناصر لکھتے ہیں:"ان هذه الآيات الكريمات قددلت على استثناء حالة الضرورة من التحريم المنصوص عليه فيها، فإن الانسان المريض إذا احتاج إلى نقل العضو فإنه سيكون في حكم المضطر، لأن حياته مهددة بالموت وإذا كانت حالته حالة الاضطرار فإنه يدخل في عموم الاستثناء الوارد في هذه الآيات ويباح نقل العضو إليه......ويترجح هنا جواز نقل الأعضاء من الحى والميت على نحوماذهب إليه أنصار المذهب الثانى"(البيوع المحرمة والمنهى عنها ۱/۴۲۱)(مولانا آفتاب غازی)۔

شیخ وہبہ زحیلی فقہاء کے مسالک کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:"بناء على هذه الآراء المبيحة عند الجمهور نقل بعض الأعضاء من الانسان للآخر كالقلب والعين والكلية إذا تأكد الطيب المسلم الثقة العدل موت المنقول عنه، لأن الحى أفضل من الميت"(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۲۶۰۹)(مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

جن حضرات کا نقطہ نظر یہ ہے کہ احترام انسانیت کے پیش نظر ایسا کرنا جائز نہیں ہے ان کے آراء مع دلائل ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں:

مولانا خورشید احمد اعظمی مجوزین اور مانعین دونوں کے دلائل بالتفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: عدم جواز کا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ناحق کسی بھی انسان کا خون بہانا حرام ہے، انسان خود اپنے جسم میں کوئی ایسا تصرف کرے جس سے اس میں عیب پیدا ہوجائے ناجائز ہے، چہ جائے کہ کوئی دوسرا کرے، انسان کے جزو سے انتفاع کی حرمت اس کے احترام واکرام کی وجہ سے ہے، نیز دوا وعلاج کے ذریعہ مرض کا ازالہ غیر یقینی ہے بخلاف بھوک کے کہ کھانے سے اس کا ازالہ یقینی ہے۔

مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی لکھتے ہیں: شریعت اسلام نے صرف زندہ انسان کے کارآمد اعضاء ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بیکار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے، اور مردہ انسان کے کسی عضو کی قطع وبرید کو بھی ناجائز لکھا ہے اور کسی کی اجازت ورضامندی سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی ہے اس میں مسلم وکافر سب کا حکم یکساں ہے۔

مولانا عفان منصور پوری لکھتے ہیں: انسان کی جان بچانے کے لئے شرعی حدود کے دائرہ میں رہتے ہوئے آخری حد تک کوشش کی جائے گی، لیکن دوسرے کی جان بچانے کی خاطر کسی امر محرم کا ارتکاب کرے، یہ درست نہیں، چنانچہ مردہ انسان کے کسی عضو کو نکالنا شرعا حرام ہے۔

مانعین کے دلائل:

جن حضرات کا نقطہ نظر عدم جواز کا ہے، ان لوگوں نے درج ذیل عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

۱-"والآدمی محترم بعد موته علی ما کان علیه في حیاته فکمالا یجوز التداوی بشئ من الآدمي والحي إکراما له فکذلک لا یجوز التداوي بعظم المیتة" (شرح السیر الکبیر ۱/۹۲) (مولانا محمد فاروق)۔

۲-"مضطر لم یجد میتتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع یدی وکلها، أو قال: اقطع منی قطعة فکلها لا یسعه أن یفعل ذلک ولا یصح أمره به کمالا یسع للمضطر أن یقطع قطعة من نفسه فیأکل" (فتاوی قاضی خان ومثلہ فی اکراہ البزازیہ علی ہامش الہندیہ ۲/۱۱۶ ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ۲/۳۳)۔

اور شرح سیر کبیر میں ہے:

۳-"ألا تری أنه لو ابتلی بمخمصة لم یحل له أن یتناول أحدا من أطفال المسلمین لدفع الهلاک عن نفسه" (۳/۲۶۹، ۲۷۰ مطبوعہ دکن)۔

"قال فی شرح السیر الکبیر وفیه دلیل جواز المداواة بعظم بال، وهذا لأن العظم لا یتنجس بالموت علی أصلنا لأنه لا حیوة فیه إلا أن یکون عظم الانسان أو عظم الخنزیر فانه یکره التداوی به،

لأن الخنزير نجس العين فعظمه نجس كلحمه لا يجوز الانتفاع به بحال، والآدمى محترم بعد موته على ما كان عليه فى حياته فكما لايجوز التداوى بشئ من الآدمى الحى إكراما له فكذلک لا يجوز التداوى بعظم الميت، قال رسول الله ﷺ: كسر عظم الميت ككسر عظم الحى"(۱/ ۹۰ طبع دکن)۔

۴-"قال فى الهداية: لا يجوز شعور الانسان ولا الانتفاع به لأن الآدمي مكرم لا مبتذل فلا يجوز أن يكون شئ من أجزائه مهانا مبتذلا"(ہدایہ/۳۹)۔

۵-"وقال ابن همام فى شرحه: وفى بيعه اهانتا له كذا فى النهاية بالانتفاع ومثله فى عامة كتب المذهب وفى العناية شرح الهداية: وجلد الآدمى لكرامة لئلا يتجابسه الناس على من كرم الله بابتذال اجزائه قال ابن الهمام فى توضيح بعض المسائل ان الاتفاق على ان حرمة المسلم ميتا كحرمته حيا"۔

۶-"وفى الدرالمختار من البيع الفاسد: وشعر الانسان لكرامة الآدمى، ولو كان كافر اذكره المصنف وغيره فى بحث شعر الخنزير"۔

"قال الشامي قوله: وشعر الانسان لا يجوز الانتفاع به لحديث "لعن الله الواصلة والمستوصلة" قوله ذكره المصنف حيث قال: والآدمى مكرم شرعا، ولو كان كافرا فإيراد العقد عليه وابتذاله به وإلحاقه بالجمادات إذلال له"(شامی ۴/ ۱۴۵)۔

۷-"وفى العالمگيريه باب التداوى من الحظر والاباحة: الانتفاع بأجزاء الآدمى لم يجز قيل للنجاسة وقيل: للكرامة هو الصحيح كذا فى جواهر الاخلاطى"(عالمگیری ۵/ ۳۹۰،وفی البدائع ۵/ ۱۳۲)۔

۸-"ولوسقط سنه يكره أن يأخذ سن ميت فيشدها مكان الأول بالإجماع وكذا يكره أن يعيدتلک السن الساقطة مكانها عند ابى حنيفة ومحمد ولكن يأخذ سن شاة ذكية فيشدها مكانها وقال ابويوسف: لا بأس بسنه ويكره من غيره" (ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ۲/ ۵۳۶،وفی الہندیہ ۵/ ۳۷۲)۔

۹-"وفى البحر الرائق: وان قطعت أذنه قال ابويوسف: لا بأس بأن يعيدها إلى مكانها وعندهما لايجوز"(بحر ۱/ ۱۱۳)۔

کتاب الأم میں ہے:

۱۰-"واذا كسر للمرأة عظم فطار فلا يجوز أن ترقعه إلابعظم ما يوكل لحمه ذكيا، وكذلک

إن سقطت سنه صارت ميتة فلا يجوز له أن يعيدها بعد ما بانت فلا يعيد سن شئ غير سن ذكي يوكل لحمه، وإن رقع عظمه بعظم ميتة أو ذكيى لا يوكل لحمه أو عظم انسان فهو كالميتة فعليه قلعه وإعادة كل صلاة صلاها وهو عليه فإن لم يقلعه أجبره السطان على قلعه فإن لم يقلع حتى مات لم يقلع بعد موته، لأنه صارميتا كله والله حسيبه، وكذلك سنه إذاندرت فإن اعتلت سنه فربطها قبل أن تنذر فلا بأس لأنها لاتصير ميتة حتى تسقط"(۱۵۴ کتاب الأم)۔

علماء ہند کے فتاوے:

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ رقم طراز ہیں:

صرف مضطر جان بچانے کے لئے مردہ انسان کا گوشت کھا سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مردہ کے کسی عضو کو علاج کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں، اگرچہ مریض کو ہلاکت کا خطرہ ہو، اسے اکل مضطر پر قیاس کرنا دو وجوہ سے صحیح نہیں ہے: ۱- اکل سے شبع وحیات متیقن ہے اور تداوی سے صحت متیقن نہیں، ۲- اکل کی صورت میں عضو ماکول بالکل ہلاک ولاشی ہوجاتا ہے، جبکہ پیوند لگایا ہوا عضو باقی رہتا ہے۔

مضطر زندہ انسان کا گوشت اور خود اپنا کوئی عضو کھا نہیں سکتا، اس سے معلوم ہوا کہ آج کل مریض کے کسی حصہ سے گوشت اتار کر دوسرے جگہ چڑھانے کا جو معمول ہے یہ ناجائز ہے، جب حالت اضطرار میں جان بچانے کے لئے اپنے یا دوسرے کے گوشت یا کھال کو کاٹ کر استعمال کرنا جائز نہیں تو تداوی کے لئے تو بدرجہ اولی جائز نہ ہوگا (احسن الفتاوی: کتاب الحظر والاباحت، عنوان توقیع الاعیان علی حرمۃ ترقیع الانسان، ۸/۲۷۲، ۲۷۳، طبع زکریا بک ڈپو دیوبند)۔

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

کسی فوت شدہ انسان کا جگر، آنکھ، دل وغیرہ دوسرے انسان کے جسم میں نہیں لگا سکتے، اگر کوئی آدمی ایسی وصیت کرتا ہے، جیسا کہ سوال میں درج ہے تو یہ وصیت کرنا جائز نہیں، اور وہ ناقابل نفاذ ہے، "أحدهما أن يوصى بما هو معصية عندنا وعندهم كالوصية للمغنيات والنائحات، فهذا لا يصح اجماعا" (مجمع الانہر ۲/۷۱۶) فقط واللہ اعلم (فتاوی محمودیہ: باب الحظر والاباحت ۱۲/۴۳۲، ۴۳۳ سوال نمبر: ۵۶۳ طبع مکتبہ محمودیہ میرٹھ)۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

یہ صورت بظاہر مفید ہے کہ مرنے والے کے سارے ہی اعضاء فنا ہونے والے ہیں، ان میں سے کوئی عضو اگر کسی انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے، یہ ایسا معاملہ ہے کہ عام لوگوں کی نظریں

صرف اس کے مفید پہلو پر جم جاتی ہیں اور اس کے وہ مہلک نتائج نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، مگر شریعت اسلام جو انسان اور انسانیت کے ظاہری اور معنوی صلاح وفلاح کی ضامن ہے، اس کے لئے مضر مہلک نتائج سے صرف نظر اور صرف ظاہری فائدہ کی بناء پر اس کی اجازت دے دینا ممکن نہیں، شریعت اسلام نے صرف زندہ انسان کے کار آمد اعضاء ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بیکار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے، اور مردہ انسان کے کسی عضو کی قطع وبرید کو بھی ناجائز کہا ہے، اور اس معاملہ میں کسی کی اجازت اور رضامندی سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی اور اس میں مسلم وکافر سب کا حکم یکساں ہے کہ کسی وقت کسی حال میں کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی طمع دامن گیر نہ ہو، اور اس طرح یہ مخدوم کائنات اور اس کے اعضاء عام استعمال کی چیزوں سے بالاتر ہیں، جن کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں اور دواؤں اور دوسرے مفادات میں استعمال کیا جاتا ہے، اس پر ائمہ اربعہ اور پوری امت کے فقہاء متفق ہیں اور نہ صرف شریعت اسلام بلکہ شرائع سابقہ اور تقریبا ہر مذہب وملت میں یہی قانون ہے (جواہر الفقہ: عنوان اعضائے انسانی کی پیوندکاری ۵۰/۲ طبع مکتبہ تفسیر القرآن دیوبند)۔

حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ آنکھ کے عطیہ کے وصیت سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

انسان اپنے بدن یا کسی عضو کا مالک نہیں ہے کہ اس میں جو چاہے آزادانہ تصرف کر سکے، ہدایہ اخیرین میں ہے: ''لأنه لا ولاية لهما علی دمهما ولهذا لا يمكنان الإباحة فلا يستباح برضاهما'' (ہدایہ اخیرین رص ۲۹)۔

لہذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص جو وصیت کر رہا ہے یہ وصیت فیما لا یملک ہے، اس لئے وصیت معتبر نہیں ہوگی اور اسی طرح جس کے لئے وصیت کی ہے اسے اس آنکھ کے مطالبہ کا حق حاصل نہ ہوگا، نیز اس میں اعضاء انسانی کی اہانت بھی ہے، حالانکہ انسان واجب التکریم ہے (فتاوی رحیمیہ ۵/۵۰ ۴) (دیکھئے مقالہ: مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

حضرت مفتی محمود صاحبؒ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: کسی فوت شدہ انسان کا جگر، آنکھ، دل وغیرہ دوسرے انسان کے جسم میں نہیں لگا سکتے ہیں، اگر کوئی آدمی ایسی وصیت کرتا ہے تو یہ وصیت ناجائز ہے اور وہ ناقابل نفاذ ہے (فتاوی محمودیہ ۱۸/۳۳۶) (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

سوال نمبر ۶- بینائی اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے اور اسی لئے قرآن مجید میں بطور احسان کے قوت بصارت کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے، نابینا ہونے کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ابھی تک کی تحقیق کے مطابق اس کا علاج نہیں ہوسکتا؛ لیکن بعض صورتوں میں اس کا علاج ممکن ہے کہ ایک انسان کے آنکھ کے قرنیہ کی اس نابینا کے حلقہ چشم میں پیوندکاری کردی جائے، اس طرح اس کو بینائی حاصل ہوسکتی ہے، ایک زندہ شخص کی آنکھ سے بھی اسے حاصل کیا جاسکتا ہے اور مرنے

کے بعد بھی چند گھنٹے کے اندر مردہ سے قرنیہ حاصل کیا جاسکتا ہے،سوال یہ ہے کہ:

الف: اگر کوئی زندہ شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرے اور سوچے کہ میرا کام تو ایک آنکھ سے چل سکتا ہے، اس سے ہمارے دوسرے بھائی کی آنکھیں بھی روشن ہوجائیں گی تو کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟

اس سوال میں تین شقیں ہیں، تینوں شقوں میں فاضل مقالہ نگاروں کی آراء مختلف ہیں، بعض مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ کسی زندہ یا مردہ شخص کا آنکھ کو عطیہ کرنا درست نہیں ہے، بعض حضرات کے نزدیک زندگی میں آنکھ عطیہ کرنا درست نہیں ہے، البتہ آنکھ عطیہ کی وصیت کرنا کہ بعد از مرگ اس کی آنکھ نکال لی جائے درست ہے، بعض حضرات کے نزدیک بعد از مرگ کی وصیت کرنا درست نہیں ہے، البتہ زندگی میں کسی کو عطیہ کے طور پر ایک آنکھ دینا درست ہے، ذیل میں فاضل مقالہ نگاران کی آراء ذکر کی جاتی ہیں:

درج ذیل فاضل مقالہ نگاران نے زندگی میں ایک آنکھ کے عطیہ کو اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ دینے والے کو کوئی ضرر نہ ہو اور اس ایک کی داعی ضرورت ہو (مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا محمد جمیل اختر، مولانا محمد رمضان علی فرقانی، مولانا محمد نعمت اللہ، مولانا مظاہر حسین وغیرہم)۔

مفتی فیاض احمد نے مذکورہ شرط کے درست ہونے پر درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے، علامہ سیوطی لکھتے ہیں: "**ولا يأكل المضطر طعام مضطر آخر... ولا قطع فلذة من فخذه ولا قطع فلذة من نفسه إن كان الخوف من القطع كالخوف من ترك الأكل**" (الأشباہ والنظائر ۱/۱۷۱ ۹)۔

درج ذیل مقالہ نگاران حضرات کی رائے یہ ہے کہ زندگی میں عطیہ تو درست نہیں ہے، البتہ وفات کے بعد کے لئے عطیہ کی وصیت کرنا درست ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی عبد الرشید قاسمی، مولانا بدر احمد مجیبی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی وغیرہم)۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: زندگی زندہ شخص کا کسی دوسرے شخص کو اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرنا جائز نہیں ہے، موصوف نے اس پر ان آیات واحادیث سے استدلال کیا ہے، جس میں قتل نفس سے منع کیا گیا ہے۔

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی لکھتے ہیں: ہر عضو کی تخلیق میں الٰہی مصلحت کارفرما ہے، جو اعضاء ایک سے زائد ہیں ان کی تخلیق میں یہی مصلحت نظر آتی ہے کہ اگر ان میں سے ایک میں خرابی پیدا ہوجائے تو دوسرا عضو اس کی جگہ پر کام کرسکے، تاکہ انسان اس عضو کی منفعت سے مکمل طور سے محروم نہ ہوجائے، اسی طرح انسان کی دونوں آنکھیں بھی اس کی ضرورت کے لئے ہیں، فاضل نہیں ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو دے دی جائے (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد عفان)۔

فاضل مقالہ نگاران نے درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے:

"مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع يدي وكلها أو قال: اقطع منى قطعة فكلها لا يسعه أن يفعل ذلک ولا يصح أمره به، كما لا يسع للمضطر أن يقطع قطعة من لم نفسه فيا كل" (فتاوی قاضی خاں ۳؍ ۲۴۷) (دیکھئے مقالہ: مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا محمد رمضان علی فرقانی)۔

مولانا آفتاب عالم غازی نے زندہ آدمی سے آنکھ لینے کی تین صورتیں نقل کی ہیں، ۱- دینے والے کی آنکھ سلامت ہو، اس صورت میں دینے والے کی آنکھ کا ضائع ہونا یقینی ہے اور لینے والے کی آنکھ کا ٹھیک ہونا امر محتمل ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ آنکھ کی روشنی سلامت نہ ہو، لیکن دوسروں کو لگا دیا جائے تو اس کی آنکھ روشن ہو سکتی ہو، دونوں صورتیں ناجائز ہیں، اس لئے کہ آنکھ انسان کی حاجت میں تو داخل ہے ضرورت میں نہیں، اور ایک انسان سے اس کا عضو حاصل کرنا اضطرار کی حالت میں جائز ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ کسی مرض کی وجہ سے آنکھ کاٹ کر علاحدہ کردی گئی ہو اور اس سے دوسرے کی آنکھ کو روشنی مل سکتی ہو، ایسی صورت میں اس علاحدہ کی ہوئی آنکھ سے استفادہ جائز ہوگا (مفتی محمد نصر اللہ ندوی)۔

مفتی عبدالرشید قاسمی لکھتے ہیں: اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے زندہ انسان سے دونوں قرنیوں کو منتقل کرنے کو تو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن اگر زندہ انسان اپنی ایک قرنیہ دینا چاہے تو اس پر کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو موقوف رکھا ہے۔

خامسا: "يحرم نقل عضو من انسان حي يعطل زواله وظيفة أساسية في حياته، وإن لم يتوقف سلامة أصل الحياة عليها كنقل قرنية العنين كلتيهما، أما إن كان النقل يعطل جزء امن وظيفة أساسية فهو محل بحث و نظر" (الفقہ الاسلامی ۷؍ ۵۱۲۴)۔

درج ذیل حضرات کی رائے یہ ہے کہ نہ تو زندگی میں آنکھ کا عطیہ درست ہے، اور نہ زندگی کے بعد آنکھ کے عطیہ کی وصیت کرنا درست ہے (مفتی لطیف الرحمٰن ولایت علی، مفتی فرید احمد، مفتی عبدالمنان، مفتی ابصار احمد ندوی، مولانا محمد عفان، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہم)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: آنکھ انسان کے ان اعضاء میں سے نہیں ہے جن پر انسان کی زندگی کا مدار ہے، اس لئے یہاں تو اضطرار کی حالت بھی نہیں پائی جارہی ہے کہ اس کے لئے کسی حرام کا ارتکاب کیا جائے، لہذا زندگی میں یا موت کے بعد بطور بیع یا ہبہ کسی کو اپنی آنکھ دینا یا وصیت کرنا اور مریض کا اسے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

مقالہ نگاران حضرات نے دونوں کے عدم جواز پر درج ذیل اصول سے استدلال کیا ہے:

"الضرر لا يزال بالضرر، أو الضرر لا يزال بضرر مثله أو أشده" (مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی فرید احمد، مولانا محمد فرقان فلاحی)۔

علماء ہند کے فتاوے:

مولانا یوسف لدھیانویؒ لکھتے ہیں: اعضاء انسانی کی پیوندکاری جائز نہیں اور ان کے اعضاء کے ہبہ کی وصیت باطل ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۹/۱۸۱) (مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

مفتی عبد الرحیم صاحبؒ لکھتے ہیں: موت اور ہلاکت سے بچانے کے لئے انسان کا خون بذریعہ انجیکشن لے کر انجیکشن کے ذریعہ مریض کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے یہ بوقت اضطرار جائز ہے، آنکھ کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے...بخلاف آنکھ نکالنے کے کہ آنکھ نکالنے سے ظاہری عیب بھی پیدا ہوتا ہے، اور آنکھ نکالنا مثلہ بھی ہے اور مثلہ حرام ہے، لہذا زندگی میں یا موت کے بعد بطور بیع یا ہبہ کسی کو اپنی آنکھ دینا یا وصیت کرنا اور مریض کا اسے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں، نفع سے انکار نہیں لیکن اللہ تعالی کا قول ہے: "وإثمهما أكبر من نفعهما" حرام ہی ہوگا کہ نقصان نفع سے زیادہ ہے اور اس طریقہ میں انسانیت کی توہین بھی ہے (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۶۲) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی لطیف الرحمٰن ولایت علی)۔

مفتی محمد نظام الدین صاحب اعظمیؒ لکھتے ہیں: کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ یہ وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد میرا جسم یا جسم کا فلاں عضو کان وغیرہ کچھ بھی فلاں شخص کو یا کسی ہسپتال کو بطور عطیہ یا بعوض قیمت دے دیا جائے اگر وصیت کردے گا تو وصیت منعقد و صحیح بھی نہ ہوگی، اور اس کے مرنے کے بعد اس وصیت پر عمل کرنا بھی جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ وصیت مملوک مال میں ہوتی ہے، اور یہ جسم انسان کا مملوک نہیں ہے، بلکہ اللہ کی ملک ہے اور اس کے پاس محض بطور امانت کے ہے، بغیر حکم شرع وحکم خدا ایک انگلی بھی کاٹ ڈالنا جائز نہیں ہے، بلکہ حرام وسخت گناہ ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۳۸۸) (مولانا خورشید احمد اعظمی)

مفتی فرید احمد لکھتے ہیں: اس طرح کے تبرع کے عدم جواز کی ایک بہترین دلیل ڈاکٹر علی قرہ داغی نے یہ بھی ذکر کی ہے کہ درحقیقت ایسا تبرع تبرع بالنفس کی طرح ہے جو درست نہیں اور یہ اس طور پر کہ ایسے تبرع کے نتیجہ میں یا تو اس عضو کی منفعت بالکلیہ ختم ہو جائے گی مثلاً ایک آنکھ کے تبرع سے دوسرے کی بینائی بھی چلی جائے گی یا علی الأقل جسم کا ظاہری جمال ختم ہو جائے گا اور جنایت میں ان دونوں صورتوں میں حنفیہ کے یہاں کمال دیت واجب ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت تبرع بالنفس ہے جو درست نہیں ہے (قضایا فقہیہ فی نقل الأعضاء: ۹۸)۔

۶-(ب): کیا کسی شخص سے قرنیہ اس کی موت کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے؛ تاکہ کسی متعین شخص کو بینائی فراہم کیا جاسکے؟

اس سوال کے جواب میں درج ذیل فاضل مقالہ نگاران نے موت کے بعد آنکھ کے عطیہ کو چند شرائط کے ساتھ

درست قرار دیا ہے (مفتی رجیب کیرالہ، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عمر امین، مولانا محمد رمضان علی فرقانی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد نصر اللہ ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا بدر احمد مجیبی ندوی، مفتی ابوبکر قاسمی، مفتی مظاہر حسین، مفتی عبد الرشید قاسمی)۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی لکھتے ہیں: کسی شخص کا قرنیہ اس کی موت کے بعد بشرطیکہ اس نے خود عطیہ کرنے کی وصیت کر رکھی ہو، یا اس کے ورثہ کی اجازت سے کسی بھی متعین شخص کو لگایا جانا جائز ہوگا۔

مفتی فیاض احمد لکھتے ہیں: موت کے بعد آنکھیں نکالنے میں کسی تکلیف کا امکان نہیں ہے اور نہ تبرعا دینا تکریم انسانی کے خلاف ہے، اس لئے ضرورت شدیدہ کے موقع سے نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے۔

علامہ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: "**تجوز الاستفادة من العضو التی استئوصل من الجسم لعلة مرضية لشخص آخرکأخذ قرنية العين لانسان ماعند استيصال العين لعلة مرضية**" (موسوعۃ الفقہ الاسلامی ۹/۵۰۷) (مفتی فیاض احمد)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں: "**يجوز عند الجمهور نقل بعض أعضاء الانسان لآخر كالقلب والعين والكلية، لأن الحی أفضل من الميت وتوفير البصر أو الحياة لانسان نعمة عظمی مطلوبة شرعا، وإنقاض الحياة من مرض عضال أونقص خطير أمر جائز لضرورة**" (الفقہ الإسلامی ۴/۲۶۰۹) (مفتی عبدالرشید قاسمی)۔

مولانا شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: گرچہ انسان اپنے جسم کا مالک نہیں، لیکن اسے ایک گونہ تصرف کا اختیار ہے، موت کے بعد قرنیہ عطیہ کرنے کی وصیت کرنا درست ہے بشرطیکہ وارثین کو موت کے بعد اعتراض نہ ہو۔

جبکہ درج ذیل حضرات کی رائے یہ ہے کہ کسی مردے کی بھی آنکھ نکالنا جائز نہیں ہے (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد عفان، مفتی لطیف الرحمٰن، مولانا محمد نعمت اللہ، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبد المنان، مفتی ابصار احمد ندوی، مولانا آفتاب غازی)۔

عدم جواز کی بعض حضرات نے یہ وجہ بھی لکھی ہے کہ اس طرح کے آپریشنوں میں بعض تحقیقات کے مطابق بہت کم کامیابی مل رہی ہے، چنانچہ امریکی رسالہ "سیربین" نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے: پہلے اس (آنکھ) کے پردے کو نقصان پہنچنے کی صورت میں اس کی جگہ وہ پردہ لگا دیا جاتا تھا جو ایسے لوگوں کے مرتے ہی ان کی آنکھ سے حاصل کرلیا جاتا تھا، جو اسے بطور عطیہ دینا چاہتے تھے، لیکن بعض اسباب کی بنا پر جنہیں ابھی تک سمجھا نہیں جاسکا ہے، اس طرح لگائے جانیوالے

بہت سے پردے دھندلا جاتے تھے اور آدمی دوبارہ بصارت سے محروم ہوجاتا تھا (جواہر الفقہ ۷/۴۷، بحوالہ رسالہ سیر بین/ص ۳۳، امریکہ ۱۹۶۷) (مولانا آفتاب عالم غازی)۔

جامعہ ازہر کی مجلس فتوی نے آنکھ کا قرنیہ لینے کو جائز قرار دیا ہے، فتوی کی عبارت یہ ہے: "**ترى اللجنة جواز نقل جزء من عين الميت لا صلاح عين الحي، إذا توقف على ذلک إصلاحها أو قيامها بما خلقها الله له**" (مجلۃ الأزہر ۲۰/۲/۷۴۲)۔

مولانا آفتاب غازی لکھتے ہیں کہ مذکورہ فتوی قابل تحقیق ہے، کیونکہ انسانی اعضا سے استفادہ کی اجازت بالکل اضطراری حالت میں ہوتی ہے اور صورت مسئولہ ضرورت میں داخل نہیں بلکہ حاجت میں داخل ہے اور حاجت کی وجہ سے انسانی اعضاء کے قطع وبرید کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب مفتی عبدالرحیم صاحب کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں: آنکھ کی بینائی کے لئے کسی دوسرے زندہ یا مردہ انسان کی آنکھ کا استعمال شرعا درست نہیں کہ اجزاء انسانی کی تکریم وتعظیم کے منافی ہے، "**الانتفاع بأجزاء الآدمي لم يجز**" (فتاوی رحیمیہ ۶/۲۸۵)۔

۶-(ج): آج کل اس مقصد کے لئے آئی بینک بھی قائم ہیں، جس میں رضا کارانہ طور پر آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے اور جس کو ضرورت درپیش ہو، آئندہ اس کے حق میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، کیا ایسے بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں درج ذیل حضرات کی رائے یہ ہے کہ آئی بینک کا قیام جائز ہے (مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد ظفر عالم، مولانا محمد رمضان علی فرقانی، مفتی مظاہر حسین، مفتی عبدالرشید قاسمی)۔

تاہم درج ذیل حضرات کی رائے یہ ہے کہ زندہ شخص کا اپنی آنکھ کو آئی بینک میں دینا درست نہیں ہے، البتہ اگر میت نے زندگی میں وفات کے بعد آئی بینک میں آنکھ عطیہ کرنے کی وصیت کی ہو تو پھر اس کی وصیت کے مطابق آئی بینک میں اس کی آنکھ عطیہ کرنا درست ہے۔

مولانا شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں: زندہ شخص کے لئے آئی بینک میں آنکھ کا عطیہ درست نہیں ہے، البتہ مردہ شخص آئی بینک کو اپنی آنکھ عطیہ دے سکتا ہے، بشرطیکہ یہ غالب گمان ہو کہ جس کو یہ آنکھ لگائی جائے گی وہ کامیاب رہے گی (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی عمر امین الہی، مولانا محمد فرقان فلاحی)۔

مولانا بدر احمد مجیبی نے یہ شرط لگائی ہے کہ ایسے آئی بینک میں دینا درست ہے جہاں سے کسی معذور کو بطور عطیہ دیا جاتا ہے۔

اس کے بالمقابل متعدد فاضل مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ زندگی میں یا مرنے کے بعد آئی بینک میں آنکھ جمع کرانا جائز نہیں ہے (مولانا آفتاب غازی، مولانا نعمت اللہ، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد عفان، مفتی لطیف الرحمٰن، مفتی عبدالمنان، مفتی ابصار احمد ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کے کسی حصہ کا عطیہ یا ہبہ کرے، اس لئے نہ کسی متعین فرد کو اپنی آنکھ دے سکتا ہے اور نہ کسی ادارہ یا بینک کو عطیہ کر سکتا ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد لکھتے ہیں؛ آئی بینک میں قرنیہ کا عطیہ محل نظر ہے، اس لئے کہ ضرورت ابھی متحقق نہیں ہے، صرف متوقع ہے، نیز آنکھ کی بینائی نہ ہونے کی وجہ سے جان کا خطرہ بھی نہیں ہے، اس لئے اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

مولانا آفتاب غازی کی رائے ہے کہ زندہ آدمی کی وہ آنکھ جو کسی عذر کی بنا پر حلقہ چشم سے علاحدہ کردی گئی ہو اور اس آدمی کے لئے وہ کارگر نہ ہو اور دوسرے آدمی کے لئے کارگر ہو سکتا ہو تو اس کے لئے بینک میں عطیہ کرنا درست ہے۔

اسی طرح مولانا نعمت اللہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ: مردہ شخص کی آنکھ کسی بھی صورت میں آئی بینک میں دینا جائز نہیں ہے، البتہ زندہ شخص اپنی آنکھ آئی بینک میں دے سکتا ہے۔

سوال نمبر ۷- پانچویں اور چھٹے سوال میں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ اگر مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ حاصل کرنی جائز ہو تو اس سلسلہ میں کس کی اجازت معتبر ہوگی، خود اس شخص کی، یا اس کے ورثہ کی، یا دونوں کی؟ یعنی مردہ کی وصیت کافی ہوگی، یا صرف ورثہ کی اجازت دینا کافی ہوگا، یا مردہ کی وصیت کے ساتھ ساتھ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف سے آمادگی بھی ضروری ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاران کے نقاط نظر مختلف ہیں: ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان چونکہ اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، اس لئے آنکھ کے عطیہ کی وصیت بھی ناجائز اور غیر شرعی ہے، اسی طرح ورثہ کے لئے بھی میت کے جسم سے انتفاع کی اجازت دینا شرعاً غیر معتبر ہے، جبکہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ انسان کو اپنے اوپر ایک گونہ تصرف کا حق ہے، اس لئے اس طرح کی وصیت شرعاً درست ہے، البتہ جواز کی صورت میں کس کی اجازت معتبر ہوگی، میت کی یا ورثہ کی؟ یا دونوں کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگاران کی رائے قدرے مختلف ہیں، بعض مقالہ نگاروں نے دونوں

کی اجازت کو ضروری قرار دیا ہے، جبکہ بعض حضرات نے کسی کی اجازت کو ضروری قرار نہیں دیا ہے۔

ذیل میں فاضل مقالہ نگاران کی آراء مع دلائل ذکر کی جاتی ہیں:

مولانا محمد ظفر عالم ندوی لکھتے ہیں: انسان کا بوقت موت اپنے اعضاء کو عطیہ کرنے کی وصیت کرنے کے سلسلہ میں فقہاء کے دو نقطہاء نظر ہیں: ایک یہ کہ اعضاء انسانی کو عطیہ کرنے کی وصیت کرنا درست نہیں ہے، اس نظریہ کے حاملین کے سامنے وہ نصوص ہیں جن میں انسان کو نہایت ہی مکرم قرار دیا گیا ہے اور اعضاء انسانی کی قطع و برید کو اس کی تکریم کے منافی عمل بتایا گیا ہے، دوسرے یہ کہ انسان کو جو اعضاء عطا کئے گئے ہیں وہ ان کے پاس بطور امانت ہیں، ملکیت نہیں، لہذا اس میں تصرف کا اختیار یا عطیہ کی وصیت کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کا اپنے اعضاء کو عطیہ کرنا درست ہے، اور شائستہ انداز میں میت کے اعضاء کی قطع و برید اس کی اہانت میں داخل نہیں ہے، اور کسی انسان کی جان بچانے کے لئے ایسا کرنا جائز اور انسانی ہمدردی کی ایک اچھی مثال ہے۔

درج ذیل حضرات نے اس طرح کی وصیت کو ناجائز لکھا ہے (مولانا حبیب بن یوسف، مفتی محمد نعمت اللہ، مولانا ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی، مولانا محمد عفان، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عبد الرزاق، مفتی یوسف بن داؤد، مولانا محمد افضل حسین، مفتی ابصار احمد، مفتی عبد المنان وغیرہم)۔

مولانا حبیب بن یوسف لکھتے ہیں: وصیت کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کی وصیت کی جائے وہ مال متقوم ہو اور وہ وصیت کرنیوالے کی ملک ہو، "**وشرطها كون الموصى أهلا للتمليك والموصى له أهلا للتملك، والموصى به بعد الموصى مالا قابلا للتمليك**" (ہندیہ ۶/ ۹۰)، لہذا انسان اپنے کسی عضو کا نہ تو ہبہ کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو دینے کی وصیت کرسکتا ہے، اور اگر کسی نے وصیت کر بھی دی تو اس کی وصیت نافذ نہیں ہوگی (فتاوی بینات ۴/ ۳۵۲، ۳۵۳) (مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد افضل حسین)۔

جو لوگ اس وصیت کو جائز قرار دیتے ہیں، ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں وصیت سے اس کے لغوی معنی مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں مطلب کسی انسان کا اپنے حق سے سبکدوش ہوجانا ہے اور اپنے اوپر قدرت دینا ہے اور انسان اس کا مجاز ہے (مفتی عمر امین الہی)۔

مولانا محمد افضل حسین صاحب لکھتے ہیں: مفتی عبد الرحیم صاحبؒ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: جو شخص وصیت کررہا ہے، یہ وصیت فیما لا یملک یعنی ایسی چیز کے متعلق ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے، اس لئے وصیت معتبر نہیں ہوگی اور اسی طرح جس کے لئے وصیت کی ہے اسے اس آنکھ کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ اس میں اعضاء انسانی کی اہانت

بھی ہے، حالانکہ انسان واجب التکریم ہے (فتاوی رحیمیہ ۱۰/۳۱۸-۳۱۹)۔

جن حضرات نے اعضاء کے عطیہ کی وصیت کو درست قرار دیا ہے، ان میں سے چند نام یہ ہیں: (مولانا محمد رمضان علی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا جمیل اختر، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا آفتاب غازی، مولانا محمد فاروق، مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی فیاض احمد، مولانا محمد عثمان گورینی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا اکرام الحق، مولانا محمد توقیر بدر، مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی شبیر یعقوب، مفتی محمد نصر اللہ وغیرہم)۔

البتہ جواز کی صورت میں کس کی اجازت معتبر ہوگی، اس سلسلہ میں مقالہ نگاران حضرات کی آراء مختلف ہیں:

درج ذیل حضرات نے میت اور ورثہ دونوں کی اجازت کو ضروری قرار دیا ہے (مولانا محمد رمضان علی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا بدر احمد مجیبی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا اکرام الحق، مولانا محمد توقیر بدر، مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

ان حضرات نے لکھا ہے کہ میت کے وصیت کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ اس آدمی نے اپنی زندگی میں برغبت ورضاء، بلا جبر واکراہ اجازت دی ہو، کیونکہ وہ اپنے جسم کا مالک ہے، نیز اس کے ورثہ کی اجازت اور ان کی طرف سے آمادگی بھی ضروری ہوگی، کیونکہ موت کے بعد اس کی تکفین وتدفین ورثہ کے ذمہ ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ انسان اپنے جسم کا امین ہے، اس لئے کچھ نہ تصرف کا حق اسے حاصل ہے، چنانچہ انسان کو قاطع اعضاء سے قصاص لے، یا دیت لے یا معاف کردے، ان سب کا اسے اختیار ہے (مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی وغیرہما)۔

مفتی عبدالرشید قاسمی لکھتے ہیں ورثہ کی اجازت بھی ضروری ہے، کیونکہ شریعت نے ورثہ اور ولی کو بھی بعض اختیارات دیئے ہیں، مثلاً اگر میت پر نماز ہوچکی ہو اور ولی نے نماز جنازہ نہیں پڑھی تو وہ دوبارہ نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے، اسی طرح مورث کے مقتول ہونے کی صورت میں ورثہ کو قاتل سے، قصاص، صلح عمد، دیت یا معافی کا پورا اختیار ہوتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ میت کے جسم پر ورثہ کو کسی درجہ میں اختیار رہتا ہے۔

بعض مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ صرف میت کی اجازت ووصیت کافی ہوگی یا اس کے انتقال کے بعد ورثہ کی اجازت کافی ہے، اگر میت نے اجازت دے دی ہو تو پھر ورثاء کے انکار کا کوئی اعتبار نہیں ہے (دیکھئے: مقالہ مفتی فیاض احمد، مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی لکھتے ہیں: دونوں کی اجازت کی ضرورت فقہاء معاصرین نے ضروری نہیں قرار دیا ہے،

بلکہ کویتی علماء کونسل نے اپنے فتویٰ میں مردہ کی وصیت کے بغیر بھی عندالضرورت نقل اعضاء کی اجازت دی ہے۔

مولانا جمیل صاحب کی رائے یہ ہے کہ اخلاقی طور پر وارثین سے اجازت لینا بھی مناسب ہے۔

مولانا آفتاب غازی لکھتے ہیں: جن صورتوں میں اعضا کا عطیہ جائز ہے، ان میں میت کی اجازت ضروری ہوگی، کیونکہ ہر شخص کو اپنے نفس پر ولایت حاصل ہے، "**هذا الإذن يمكن أن يكون صآدرامن الميت قبل موته باعتبار ولايته على نفسه**" (البیوع المحرمۃ والمنہی عنہا ۱/۴۵۱)۔

مولانا جمیل صاحب نے اس رائے کی تائید میں درج ذیل جزئیوں کا ذکر فرمایا ہے:

۱-"**وبه تبين ان ملك الإنسان لا يزول بموته فيما يحتاج إليه**" (بدائع الصنائع ۱۰/۲۷۷)۔

۲-"**إن الوصية من جانب الموصى وقدتمت بموته تمامالا يلحقه الفسخ من جهته**" (مجمع الأنہر ۴/۴۲۱)۔

مفتی عبدالرشید قاسمی شیخ وہبہ زحیلی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: کہ "**يجوز نقل عضو من الميت إلى حي بشرط أن ياذن الميت أوورثته**" (الفقہ الإسلامی وادلتہ ۷/۵۱۲۴)۔

اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں وصیت نہیں کی تو کیا موت کے بعد اس کے ورثاء اس کے جسم سے انتفاع کی اجازت دینے کے مجاز ہیں، اس سلسلہ میں علماء کی دورائیں ہیں: اکثر علماء کی رائے جواز کی ہے، اوران کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی نے قتل کیا تو مقتول کے ورثاء کو اسے معاف کرنے کا بھی اختیار ہے، گویا کہ اس کے جسم کا حق ورثاء کی طرف منتقل ہوگیا، اسی طرح اگر کسی نے دوسرے پر تہمت لگائی اور یہ مقذوف حد قذف کے مطالبہ سے پہلے ہی مرگیا تو حد قذف کا مطالبہ ان کے ورثاء کی طرف منتقل ہوگا، اگر وہ دعویٰ قائم کر کے حد جاری کرنا چاہیں تو انہیں اس کا حق ہوگا اور معافی کا بھی حق ہوگا (مفتی عمرامین الٰہی، مولانا آفتاب غازی)۔

مولانا آفتاب غازی لکھتے ہیں کہ میت نے پہلے اجازت نہ دی ہو اور صراحتاً منع بھی نہ کیا ہو تو موت کے بعد والدین یا دوسرے ولی کی اجازت سے عطیہ کیا جاسکتا ہے۔

مفتی عمرامین الٰہی لکھتے ہیں: میت کی وصیت بھی کافی ہوگی، اور ورثہ کی اجازت بھی کافی ہوگی (مفتی محمد نصر اللہ)۔

مفتی فیاض احمد محمود نے تائید میں یہ عبارت پیش کی ہے:

"**يجوز نقل عضو من ميت إلى حي تتوقف حياته على ذلک العضو بشرط أن ياذن الميت قبل موته أوورثته بعد موته أو بشرط موافقة ولي أمر المسلمين إن كان المتوفى مجهول الهوية**

أولا ورثة له" (موسوعة الفقه الإسلامی والقضایا المعاصرۃ ۱۳/ ۲۳)۔

مولانا محمد مغفور باندوی نے اس اقتباس کو پیش کیا ہے:

"یجوز نقل عضو من میت الوصي...بشرط أن یاذن المیت أو ورثة بعد موته أو یشترط موافقة ولي المسلمین إذا کان المتوفی مجهول الهویة ولا وراثة له" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ/ ۱۸۹)۔

اسی طرح فتاوی یوروپ میں ہے: کسی میت کا ایسا عضو کسی زندہ انسان میں منتقل کرنا جائز ہے، جس پر زندگی کی بقایا کسی بنیادی وظیفہ کی سلامتی منحصر ہو، بشرطیکہ خود میت نے اپنی موت سے پہلے یا اس کے بعد اس کے ورثہ نے اور اگر میت کی شناخت نہ ہو یا لاوارث ہو تو مسلمانوں کے سربراہ نے اس کی اجازت دے دی ہو (فتاوی یورپ رص ۹۵) (مولانا آفتاب غازی، مفتی فیاض احمد)۔

۸- اللہ تعالی نے ہر نومولود کے لئے اس کی ماں کے سینے میں صحت بخش دودھ کا خزانہ رکھا ہے، قرآن مجید کا بھی ارشاد ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں اور تمام میڈیکل سائنس دانوں کا بھی اتفاق ہے کہ بچہ کے لئے سب سے محفوظ، تقویت بخش اور بہترین غذا ماں کا دودھ ہے، سوائے اس کے کہ ماں کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ اس کا دودھ بچہ کے لئے مضر ہو جائے، لیکن قدیم زمانہ سے یہ رواج رہا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی دودھ پلایا کرتی تھیں اور دودھ پلانے والی عورتوں کو اس کی اجرت دی جاتی تھی، اسی پس منظر میں شریعت اسلامی نے رضاعت کو حرمت موبدہ کا ایک سبب مانا ہے، موجودہ دور میں خاص طور پر مغربی معاشرہ میں خواتین کی کسب معاش کی جدوجہد میں شامل ہو جانے کی وجہ سے یہ مزاج پروان چڑھا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلانا نہیں چاہتیں، اس پس منظر میں مغربی ملکوں میں بہت سے دودھ بینک قائم ہو گئے ہیں، جو اپنا دودھ فراہم کرنے والی عورتوں کو معاوضہ ادا کرتے ہیں اور ضرورت مند بچوں کو دودھ مہیا کر کے ان سے معاوضہ وصول کرتے ہیں؛ گویا یہ انسانی دودھ کی تجارت کی ایک شکل ہے، ہندوستان میں بڑھتے ہوئے معیار زندگی کی وجہ سے خواتین میں ملازمت کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے اور یہاں بھی اس طرح کے بینک قائم کئے جانے کی توقع ہے، تو ایسے بینک کو عوض دے کر یا بلا عوض کسی خاتون کا دودھ مہیا کرنا اور پھر اس دودھ کی ضرورت مند بچوں کے لئے فروخت کا کیا حکم ہوگا؟ اور اگر یہ صورت جائز ہو تو حرمت رضاعت کے سلسلہ میں کیا احکام ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں چند مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ ضرورت کے پیش نظر ملک بینک کا قیام درست ہے، اور اس سے استفادہ کی گنجائش ہے، جبکہ اکثر مقالہ نگاران حضرات کی رائے یہ ہے کہ ملک بینک سے رضاعت سے وابستہ

تمام احکام معطل ہو جائیں گے، نیز اس سے پیدا ہونے والے مفاسد اس کے منافع سے کئی درجہ بڑھی ہوئی ہیں، اس لئے ملک بینک کا قیام شرعاً جائز نہیں ہوگا۔

اور اگر ملک بینک سے دودھ حاصل کر کے کسی بچہ کو پلا دیا، تو اس بچے کے رضاعی ماں کون ہوگی، اور رضاعی بھائی وبہن کون لوگ ہوں گے، اس شق پر تقریباً تمام مقالہ نگاران کا اتفاق ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ جو دودھ حاصل کیا گیا ہے، وہ کس عورت کا تھا، تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں ہوگی، نیز اس عورت کا دودھ جن جن بچوں نے پیا ہے وہ رضاعی بھائی بہن ہوں گے، لیکن اگر یہ معلوم نہ ہو سکے اور عموماً معلوم ہو بھی نہیں پاتا ہے، تو محض شک کی وجہ سے کسی سے بھی احکام رضاعت ثابت نہیں ہوگا، تاکہ نکاح کا دروازہ تنگ نہ ہو جائے۔

اس خلاصہ کے بعد فاضل مقالہ نگاران کی آراء مع دلائل پیش خدمت ہیں:

جواز کے قائلین:

درج ذیل فاضل مقالہ نگاروں نے ضرورت کے پیش نظر ملک بینک کے قیام کو درست قرار دیا ہے:

(مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد عثمان، مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی نصر اللہ)۔

البتہ مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی کی رائے یہ ہے کہ دودھ کے فروخت کی اجازت ہے، اور دودھ بینک کو دودھ کا عطیہ دینا بھی جائز ہے، لیکن کسی مسلمان کے لئے دودھ بینک سے خریدنا یا عطیہ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے نکاح ورضاعت کے احکام متاثر ہوں گے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں: دودھ کی بیع وشراء تو جائز نہیں ہے، البتہ بلاعوض دودھ بینک میں جمع کیا جا سکتا ہے، تاکہ ضرورتمند مستحق بچے فائدہ اٹھا سکیں (مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی نصر اللہ)۔

مولانا ظفر عالم ندوی لکھتے ہیں؛ انسان دودھ کی خرید وفروخت جزء انسانی ہونے کیوجہ سے جائز نہیں، لیکن اس کی خرید وفروخت نے حاجت کا درجہ اختیار کر لیا ہے، کیونکہ بہت سے مائیں بعض وجوہات کے سبب دودھ نہیں پلا سکتیں، اس لئے بچوں کی ضرورت کے پیش نظر اس معاشرہ میں جہاں اس طرح کے لین دین کا رواج جاری ہو چکا ہو، یہ بیع جائز ہوگی۔

جن حضرات نے ملک بینک کے قیام کو اور اس سے استفادہ کو جائز قرار دیا ہے، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

مرضعہ کو بطور اجرت دی جانے والی رقم دودھ ہی کا عوض ہوتی ہے، اس لئے اگر وہ بکری کا دودھ پلا دے تو اجرت

کی مستحق نہ ہوگی۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

''أما المرضع فلا تكلف بشئ سوى الإرضاع، فإن أرضعته بلبن شاة فلا أجر لها، لأنها لم تأت بالعمل الواجب عليها'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/۷۲۸۱) (مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

رضاعت حرمت کا مؤبدہ کا سبب ہے، اس کی خرید وفروخت سے اس کی حرمت کی شناخت مشکل ہوجائے گی، اس دشواری کے حل کے لئے مولانا محمد ظفر عالم صاحب لکھتے ہیں: بعض اہل علم مثلاً امام لیث بن سعد، علامہ ابن حزم اور امام احمد بن حنبل کا ایک قول یہ ہے کہ حرمت رضاعت اس وقت ثابت ہوگی جب بچہ متعارف طریقہ پر عورت کی چھاتی سے دودھ پیئے ورنہ رضاعت کا رشتہ قائم نہیں ہوگا اور اس سے پردہ کے احکام بھی مرتب نہیں ہوں گے۔

موصوف لکھتے ہیں: اس قول کو بنیاد بنا کر موجودہ دور کے اہل علم نے انسانی دودھ کا بینک قائم کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اور بینک کا مخلوط دودھ استعمال کرنے کی صورت میں حرمت رضاعت ثابت نہ ہونے کو ترجیح دی ہے (الانجاب فی ضوء الاسلام للقرضاوی رص ۵۰-۵۷)۔

مولانا ریحان مبشر نے معاصر اہل علم کے نقاط نظر بھی ذکر کئے ہیں کہ ایسے بینک کے قیام کے سلسلے میں بنیادی طور پر تین نقطہائے نظر ہیں:

۱- مجمع الفقہ الاسلامی نے اپنے سمینار منعقدہ ۱۴۰۶ھ میں اس طرح کے بینک کے قیام کو ناجائز قرار دیا ہے۔

۲- ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مصر کے مفتی شیخ عبد اللطیف حمزہ اور شیخ علی التسخیری کی رائے یہ ہے کہ بنوک الحلیب کا قیام اور اس سے دودھ حاصل کرنا جائز ہے۔

۳- بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جب ایسے بینک کا قیام ناگزیر ہوجائے تو درج ذیل شرائط کے ساتھ اجازت دی جاسکتی ہے:

الف- ہر عورت کا دودھ علاحدہ شیشی میں رکھا جائے۔

ب- ہر شی پر دودھ عطیہ کرنیوالی عورت کا نام لکھ دیا جائے۔

ج- جو نومولود اس دودھ کو استعمال کرے، اس کا نام پتہ رجسٹر میں لکھ دیا جائے۔

د- بچے کو اس عورت کے بارے میں خبر دی جائے کہ وہ اس کے رضاعی ماں ہے۔

جن حضرات نے اس طرح کے بینک کے قیام کو جائز قرار دیا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کے بینک کے

قیام میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، کیونکہ رضاعت کی بعض صورتوں میں ائمہ کے درمیان خود اختلاف ہے، اور امام لیث اور اصحاب ظواہر کے نزدیک اور امام احمد بن حنبل نے حرمت رضاعت کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ بچہ متعارف طریقہ پر عورت کی چھاتی سے دودھ پیئے۔

شریعت نے دودھ پلانے والی عورت کو ماں قرار دیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وأمهاتكم اللاتي أرضعنكم وإخواتكم من الرضاعة'' (سورۂ نساء: ۲۳) اور بینک سے محض دودھ لینے سے مادری پن کا تحقق نہیں ہوتا، کیونکہ حرمت رضاعت کے سلسلہ میں جو الفاظ آئے ہیں وہ سب کے سب ''ر''، ''ض''، ''ع'' مادہ پر مشتمل ہیں، مثلاً: رضاعت، مرضعہ، ارضاع اور یہی الفاظ احادیث میں بھی آئے ہیں اور اس کے معنی عورت کی چھاتی کو منہ میں لینا اور چوسنا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ فقہاء نے رضاعت کے سلسلہ میں معلوم اور یقینی رضاعت پر حرمت کا مدار رکھا ہے، جہاں شک ہو وہاں حرمت متعلق نہیں ہوتی اور بینک سے دودھ لینے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ بچہ نے کس کس عورت کا دودھ پیا ہے (مقالہ: مولانا ریحان مبشر)۔

مفتی نظام الدین صاحبؒ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: ڈھائی سال سے کم عمر بچہ کو کسی عورت کا بھی دودھ پلانا جائز ہے، اور یہ الگ بات ہے کہ مسلمان و دیندار عورت کا دودھ پلانا بہتر ہے، باقی جواز میں کوئی کلام نہیں، اس لئے بغیر ضرورت اور بقدر ضرورت اس کا مہیا رکھنے کی گنجائش ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۴۰۳) (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

عدم جواز کے قائلین کا نقطہ نظر:

اس کے برخلاف اکثر مقالہ نگاران نے ملک بینک کے قیام کو ناجائز قرار دیا ہے، ان حضرات نے عدم جواز کی بنیادی طور پر تین وجوہات ذکر کی ہیں: انسان کا دودھ بیچنا ناجائز ہے، اس لئے کہ دودھ انسان کا جزء ہے، اور جزء انسان کی خرید و فروخت شرعاً درست نہیں ہے، نیز اس میں عورت کی اہانت ہے کہ وہ اپنا دودھ برتن میں نکالے اور پھر اس کو بیچے، یا مشین کو اس کی چھاتی سے لگایا جائے اور مشین سے اس کا دودھ نکالا جائے، ۲- اس سے احکام رضاعت معطل ہو جائیں گے، اور رشتہ رضاعت خلط ملط ہو جائے گا، ۳- اس سے بہت سے مفاسد پیدا ہوں گے جن کا ازالہ ناممکن ہے، پہلے دونوں وجوہات میں ائمہ کرام کے درمیان جزوی اختلافات بھی ہیں، اس لئے ہم پہلے ملک بینک سے پیدا ہونے والے مفاسد کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

مفتی محمد اقبال ٹنکاروی نے ملک بینک سے ہونے والے مفاسد کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

انساب کا اختلاط: حفاظت انساب مقاصد شرعیہ میں سب سے اہم اور بڑا مقصد ہے اور دودھ بینک میں عورتوں کے دودھ کے خلط ملط سے نسب میں خلط واقع ہوسکتا ہے اور ایک بچہ جس نے کسی بینک کا دودھ پیا ہے، اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کی رضاعی ماں کون ہے اور رضاعی بہن کون؟ اور اگر دانستہ طور پر بھی اپنی رضاعی ماں یا اس کے اصول وفروع میں کسی سے نکاح کرلیا تو حرام ہوگا۔

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں: ''**الكبيرة التاسعة والخمسون بعد المأتين عقد الرجل على محرم بنسب أو رضاع أو مصاهرة وإن لم يطأ، وعد هذا كبيرة هو ما وقع في كلام بعض المتاخرين، لكنه لم يعمم المحرم ولا ذكر وإن لم يطأ وذلک مراده بلا شک ثم لما ذکره نوع اتجاه، لأن إقدامه على عقد النكاح على محرمة خرقه......**'' (الزاجر عن اقتراف الکبائر/ص ٣٩٩)۔

٢-فساد اخلاق: جب بچہ کئی عورتوں کا مخلوط دودھ پیئے گا تو اس دودھ کی وجہ سے ان عورتوں کے اخلاق سے بھی متاثر ہوگا اور ان عورتوں کی صفات اس میں منتقل ہوسکتی ہے، اسی لئے حضرت عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ یہودی، نصرانی اور فاسق فاجر عورتوں کے دودھ کسی بچہ کو پلائے جانے کو ناپسند فرماتے تھے، ''**كره أبوعبد الله الارتضاع بلبن الفجور والمشركات، وقال عمر بن الخطاب وعمر بن عبد العزيز: اللبن يشتبه فلا تستق من يهودية ولا نصرانية ولازانية، ولا يقبل أهل الذمة المسلمة ولايرى شعورهن، ولأن لبن الفاجرة ربما أفضى إلى شبه المرضعة في الفجور ويجعلها أما لولده فيعتبربهاويتضرر طبعا وتعيرا، والارتضاع من المشركة يجعلها أما لها حرمة الأم مع شركها**'' (المغنی لابن قدامہ کتاب الرضاع ٧/ ٥٣٢) (مفتی فیاض احمد محمود، مفتی عبدالرزاق)۔

٣-امراض کا پھیلنا: اگر دودھ والی عورت میں کوئی متعدی مرض ہو تو اس مرض کا دودھ کے واسطہ سے بچہ تک پہنچنے کا قوی امکان ہے۔

٤-عورتوں کی کرامت کی پامالی: اگر ان امہات کا دودھ نکال کر بینک میں دیا جائے تو یہ اس کی حرمت وکرامت کے منافی ہے (مفتی محمد اقبال ٹنکاروی، مفتی فیاض احمد محمود)۔

مفتی محمد اقبال ٹنکاروی لکھتے ہیں: فقہی قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف نفع ہو، اور دوسری طرف مفسدہ ہو تو عموماً مفسدہ کو مقدم کیا جاتا ہے، نیز مبیح ومانع جمع ہوجائے تو عموماً مانع کو ترجیح دی جاتی ہے، یہاں نفع یا مبیح شیرخوار ضرورت

مند بچوں کو دودھ پہنچانا ہے، اور مفاسد متعدد ہیں، اس لئے مفسدہ کو ترجیح دیتے ہوئے دودھ کے خرید وفروخت کی اجازت نہ ہوگی (مفتی اشرف عباس)۔

ملک بینک کے قیام سے متعلق ایک اہم جزء یہ بھی ہے کہ کیا انسانی دودھ کی خرید وفروخت شرعا جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کے درمیان اختلاف ہے، حنفیہ کے یہاں انسانی دودھ کی خرید وفروخت شرعا درست نہیں ہے، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک جائز ہے، اور اس سلسلہ میں حنابلہ کے مختلف اقوال ہیں۔

حنفیہ کے یہاں عورت کا دودھ بیچنا جائز نہیں ہے، ذیل میں بطور استشہاد چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

١-"**ولا يجوز بيعه(لبن الآدمی)عندالحنفية وهوقول جماعة من الحنابلة**" (الموسوعة الفقہیہ ١٩٩/٣٥) (مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

٢-صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:"**ولا بيع لبن امرأة فی قدح، وقال الشافعی: يجوز بيعه، لأنه مشروب طاهر، ولنا أنه جزء الآدمی وهو بجميع أجزاءه مكرم مصون عن الابتذال بالبيع**" (ہدایہ باب البیع الفاسد ٣٩/٣) (مفتی محمد اقبال ٹنکاروی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

٣-مبسوط میں ہے:"**لايجوز بيع لبن بني آدم علی وجه من الوجوه عندنا، ولا يضمن متلفه أيضا وقال الشافعي:يجوز بيعه ويضمن متلفه ......وحجتنا في ذلك:أن لبن الآدمی ليس بمال متقوم، فلا يجوز بيعه ولا يضمن متلفه كالبزاق، والمخاط والعرق**" (المبسوط للسرخسی ١٢٥/١٥، بیروت) (مفتی شبیر احمد مرادآباد، مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

٤-علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں؛"**قوله :لبن امرأة بالجر، أي لم يجز بيع لبن المرأة، لأنه جزء الآدمي، وهو بجميع أجزاءه مكرم مصون عن الابتذال بالبيع**" (البحر الرائق ١٣٢/٦، کوئٹہ) (مفتی شبیر احمد مرادآباد)۔

دودھ مال نہیں ہے اور مبیع کے درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مال ہو، علامہ کاسانی لکھتے ہیں:"**ولنا أن اللبن ليس بمال فلا يجوز بيعه، والدليل على أنه ليس بمال إجماع الصحابة......لأنه لا يباح به الانتفاع شرعا على الإطلاق بل لضرورة تغذية الأطفال، وماكان حرام الانتفاع به شرعا إلا لضرورة لا يكون مالا كالخمر والخنزير**" (بدائع الصنائع ١٤٥/٥) (مفتی محمد نصر اللہ)۔

شافعیہ کے نزدیک عورت کے دودھ کی خرید وفروخت درست ہے، امام نووی لکھتے ہیں:"**بيع لبن الآدميات**

جائز عندنا لاكراهة فيه هذا المذهب وقطع به الأصحاب إلا الماوردي والساشي والروياني" (المجموع ۹/ ۲۵۴، کتاب البیوع، باب مایجوز بیعہ ومالا یجوز دارالفکر) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی فیاض ندوی)۔

مالکیہ کے یہاں انسانی دودھ کی خرید وفروخت درست ہے، "ويجوز بيع لبن الآدميات، لأنه طاهر منتفع به" (مواہب الجلیل ۴/ ۲۶۵) (مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

حنابلہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے، لیکن خرقی اور ابن قدامہ کے نزدیک خاتون کے دودھ کی خرید و فروخت درست ہے، ابن قدامہ لکھتے ہیں: "فأما بيع لبن الآدميات، فقال أحمد: أكره واختلف أصحابنا في جوازه فظاهر كلام الخرقي جوازه، وهذا قول ابن حامد ومذهب الشافعي و ذهب جماعة من أصحابنا إلى تحريم بيعه...والأول أصح، لأنه لبن طاهر منتفع فجاز بيعه كلبن الشاة، ولأنه يجوز أخذ العوض عنه في إجارة الظئر فأشبه المنافع ويفارق العرق، وسائر أجزاء الآدمي يجوز بيعها فانه يجوز بيع العبد والأمة" (المغنی ۴/ ۱۹۶) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی فیاض احمد)۔

جن فقہاء نے انسانی دودھ کے خرید وفروخت کو درست قرار دیا ہے، انہوں نے اجرت مرضعہ سے استدلال کیا ہے کہ مرضعہ کی اجرت بالاتفاق جائز ہے تو مرضعہ کے دودھ کی فروختگی درست کیوں نہیں ہوگی؟

ان فقہاء کا جواب امام محمد نے ان الفاظ میں دیا ہے: "جواز إجارة الظئر دليل على فساد بيع لبنها، لأنه لما جازت الإجارة ثبت أن سبيله سبيل المنافع وليس سبيله سبيل الأموال، لأنه لوكان مالالم تجز الإجارة ألا ترى أن رجلا لواستأجر بقرة على أن يشرب لبنها لم تجز الإجارة، فلما جاز إجارة الظئر ثبت أن لبنها ليس مالا" (فتح القدیر ۶/ ۲۸۹، ۳۹۰، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد طبع زکریا ۱۴۲۱ھ) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

شیخ عبدالناصر تمام ائمہ کے اقوال کی روشنی میں لکھتے ہیں: "بعد عرض الآراء على نحوما استخلصناه ومراجعة ما استدل به كل فريق، يتضح لنارجحان القول بعدم جواز لبن الآدمية الحرة" (البیوع المحرمة والمنہی عنہا ۱/ ۴۴۳) (مولانا آفتاب عالم غازی)۔

ملک بینک سے منسلک یہ مسئلہ بھی ہے کہ چونکہ ملک بینک میں مختلف عورتوں کا دودھ جمع رہتا ہے، کسی کا کم تو کسی کا زیادہ، ایسی صورت میں کیا حرمت رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اکثر مقالہ نگاران حضرات کی رائے یہ ہے

کہ حرمت رضاعت کے لئے قلیل وکثیر کی کوئی تفریق نہیں ہے، نیز رضاعت کے ثبوت کے لئے بچہ کا عورت کے پستان سے منہ لگا کر پینا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ ناک یا منہ میں دودھ ڈال دیا جائے تو اس سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی، کیونکہ اس طرح دودھ ڈالنے سے بھی ہڈیوں کی نشوونما، گوشت میں اضافہ اور بچہ کی غذائی ضرورتیں پوری ہوتی ہے، یہی قول امام شعبی، امام ثوری اور حنفیہ کا ہے، اور حضرت امام احمد کی دو روایتوں میں سے اصح روایت بھی ہے، نیز یہی مسلک امام مالک کا بھی ہے۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں: ”والسعوط كالرضاع وكذلک الوجور، واختلفت الرواية في التحريم بهما فأصح الروايتين أن التحريم يثبت بذلک كمايثبت بالرضاع، وهوقول الشعبی، والثوری، وأصحاب الرائے وبه قال مالک في الوجور“ (المغنی ۹/۱۹۶) (مولانا محمد فاروق)۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”ويستوی في تحريم الرضاع الارتضاع من الثدی والإسعاط والإيجار، لأن المؤثر في التحريم هو حصول الغذاء باللبن، وانبات اللحم وإنشاز العظم وسد المجاعة“ (بدائع الصنائع ۵/۹۲۱) (مولانا محمد فاروق)۔

اس مسئلہ کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت سہلہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! سالم کے میرے پاس آنے سے ابوحذیفہ کو ناگواری ہوتی ہے حالانکہ وہ ان کے حلیف ہیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کو دودھ پلادو، چنانچہ انہوں نے حضرت سالم کو دودھ پلادیا، اور چونکہ حضرت سالم بڑے تھے، اس لئے دودھ پلانے کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ انہوں نے تھوڑا دودھ نکال کر کسی برتن میں رکھ دیا، اور اسے حضرت سالم نے پی لیا، طبقات ابن سعد میں ہے: ”كان يحلب في مسعط أو إناء قدر رضعة فيشربه سالم كل يوم خمسة أيام“ (الطبقات الکبری لابن سعد ۸/۲۱۲) یہ واقعہ گرچہ خصوصیات نبوی میں سے ہے، لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ طریقہ معتاد کے علاوہ بھی اگر بچہ کو دودھ پلادیا جائے تو حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی (دیکھئے مقالہ: مولانا ریحان مبشر)۔

چند عورتوں کا دودھ مخلوط ہوجائے تو کیا اس سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟

اگر چند عورتوں کا دودھ مخلوط ہوجائے تو اس سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرات ائمہ کا اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک اگر دو عورتوں کا دودھ مخلوط ہوجائے تو جس عورت کا دودھ غالب ہوگا، صرف اسی سے حرمت ثابت ہوگی، دوسری عورت سے ثابت نہیں ہوگی، اور اگر دونوں عورتوں کا دودھ مساوی ہو تو دونوں سے حرمت ثابت ہوگی، جبکہ امام محمد اور امام زفر کی رائے یہ ہے کہ دونوں عورتوں سے حرمت ثابت ہوگی، خواہ کسی

کا دودھ کم ہو یا زیادہ، یہی قول امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ”وقالت المالكية ومحمدوزفر يثبت التحريم من المرأتين جميعا، سواء تساوى مقدار اللبنين أو غلب أحدهما الآخر، وهوالراجح لدي“(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۲۸۵)۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں: ”وإن حلب من نسوة وسقيه الصبي فهو كما ارتضع من كل واحدة منهن“(المغنی ۹/ ۱۹۹)(دیکھئے: مقالہ مولانا محمد فاروق)

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: ”وإذا اختلط لبن امرأتين تعلق تحريم بأغلبهما عند أبي يوسف، وقال محمد وزفر: يتعلق التحريم بهما“(ہدایہ ۲/ ۳۳۲، رشیدیہ)۔

حنفیہ میں سے بہت سے فقہاء نے امام محمد اور امام زفر کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے، ”وفي الشامية: قال في العناية: وهو أظهر وأحوط، وفي شرح المجمع: قيل: إنه الأصح، وفي الشرنبلالية: ورجح بعض المشائخ قول محمدو إليه مال صاحب الهداية“(شامی ۴/ ۴۱۲، طبع زکریا)(مولانا محمد فاروق)۔

عورتیں بچوں کو دودھ پلانے میں احتیاط سے کام لیں!

عورتیں بچہ کو دودھ پلانے میں احتیاط سے کام لیں، اور جو عورتیں بچوں کو دودھ پلاتی ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن بچوں کو دودھ پلا رہی ہیں، ان کے نام ونسب کو بالکل محفوظ رکھے، تاکہ حرمت ابدیہ میں اشتباہ والتباس نہ ہو۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ”والواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غيرضرورة وإن فعلن ذلک فليحفظن أو يكتبن كذا سمعت من مشائخی“ (ہندیہ ۱/ ۴۱۱، فتح القدیر ۳/ ۴۱۸)(مولانا محمد فاروق، مولانا ریحان مبشر)۔

”وفي الشامية: واذا أرضعن فليحفظن ذلک وليشتهرنه ويكتبنه احتياطا“(شامی ۴/ ۴۰۲) (مولانا محمد فاروق)۔

رضاعت کی حرمت نسب کی حرمت کی طرح ہے، اس لئے عورتوں کو تلقین کی گئی ہے کہ ہر بچہ کو دودھ نہ پلاتی رہے، ”الواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة، فإن فعلن فليحفظن وليثبتن احتياطا“(فتاوی ولوالجیہ ۱/ ۳۶۴، کتاب الرضاع، مکتبہ دارالایمان، سہارنپور، یوپی)(مولانا محبوب فروغ احمد، مولانا محمد فاروق)۔

نیز شوہر کی اجازت کے بغیر کسی بچے کو دودھ پلانا مکروہ ہے، علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: ”امرأة ترضع صبيا من غير إذن زوجها يكره لها ذلک إلا إذا خافت هلاک الرضيع فحينئذلا باس به“ (البحرالرائق ۳/ ۳۸۷)

(مولانا محمد فاروق)۔

جن حضرات نے ملک بینک کے قیام کو ناجائز لکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ بینک میں موجود دودھ کو اگر بچہ نے پی لیا، تو مدت رضاعت ان تمام عورتوں سے ثابت ہوگا جن عورتوں کا دودھ اس نے پیا ہے، نیز ان عورتوں کے دودھ پینے والے تمام لڑکے اور لڑکیاں اس کے رضاعی بھائی اور بہن ہوجائیں گے، اور اس بات کا پتہ لگانا کہ کن کن عورتوں کا دودھ بچہ نے پیا ہے، اور کن کن بچوں نے ان عورتوں کا دودھ پیا ہے، تقریباً ناممکن ہے اور جب یہ ممکن نہیں ہے تو رضاعت سے مرتب ہونے والے احکام معطل ہوکر رہ جائیں، لہذا ملک بینک قائم کرنا شرعاً ناجائز ہے (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد فاروق)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: مدت رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پینے سے چونکہ احکام رضاعت عائد ہوتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص دودھ بینک قائم کرتا ہے تو اس کو یہ بھی اہتمام التزام کرنا ہوگا کہ ہر عورت کے دودھ اور اس کے پینے والے بچہ کا ریکارڈ بھی رکھے اور اس سے اس بچہ کے اولیاء کو واقف کرائیں اگر یہ نظم نہیں ہوسکتا ہے تو پھر دودھ بینک قائم کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اگر ملک بینک سے کسی نے دودھ خرید کر بچہ کو پلا دیا اور یہ نہ معلوم ہو کہ یہ دودھ کس عورت کا ہے، اور کس کس بچے نے اس عورت کے دودھ کو پیا ہے تو اس اشتباہ کی صورت میں حرمت رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ اس شق سے متعلق مقالہ نگاران حضرات کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں حرمت رضاعت کسی سے ثابت نہیں ہوگی، اور جن لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ملک بینک کا قیام اور اس سے استفادہ جائز ہے، انہوں نے اسی قسم کے جزئیہ سے استدلال کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسی اشتباہ کی صورت میں جب حرمت رضاعت کسی سے ثابت نہیں ہوگی، پھر ملک بینک کے قیام سے اور اس سے استفادہ سے مانع جواز کوئی چیز نہیں، ذیل میں ہم ان عبارتوں کو پیش کرتے ہیں جن کے جواز اور عدم جواز دونوں کے قائلین نے پیش کیا ہے کہ اشتباہ کی صورت میں کسی سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔

مفتی شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: بدرجہ مجبوری بینک سے دودھ خریدنے والے پر ضروری ہے کہ جس ڈبہ پر دودھ والی عورت کا نام ہو، اسی ڈبہ کو خریدے تاکہ رضاعت کے احکام اس سے ثابت ہوں، لیکن اگر کسی نامعلوم خاتون کا دودھ بچہ پی لے تو محض شک سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی، موصوف نے ابن ہمام کی اس عبارت ''**ادخلت الحلمة فی فم الصغیر وشکت فی الارتضاع لاتثبت الحرمة**'' (فتح القدیر ۳/۴۳۹) سے استدلال کیا ہے۔

مولانا بدر احمد مجیبی لکھتے ہیں: ایسی صورت میں تمام ہی عورتوں سے نکاح حرام ہونا چاہئے، کیونکہ قاعدہ ہے: ''**الأصل فی الأبضاع التحریم فإذا تقابل في المرأة حل وحرمة غلبت الحرمة**'' (الاشباہ للسیوطی)۔

لیکن اس میں حرج عظیم لازم آئے گا، اسی لئے مجبورا کسی عورت سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، ''فی فتاوی قاضی خان: صبية أرضعها قوم كثير من أهل القرية أقلهم أو أكثرهم، لا يدري من أرضعها وأراد واحد من أهل تلك القرية أن يتزوجها، قال أبو القاسم الصفار: إذا لم تظهر له علامة ولا يشهد أحد له بذلك يجوز نكاحها، وهذا من باب الرخصة كيلا يفسد باب النكاح'' (الاشباہ لابن نجیم: ص ۶۷)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں: رضاعت اگر مشتبہ ہوجائے تو نکاح کے باب میں توسع برتا گیا ہے اور حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بینک میں دہندہ عورتوں اور دودھ حاصل کرنے والے بچوں وبچیوں کا ریکارڈ موجود ہے اور ہر دو کو معلوم بھی ہو تو حرمت رضاعت ثابت ہوگی، اور اگر اس طرح کوئی ریکارڈ نہ ہو اور دودھ مخلوط ہو تو پھر کسی سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی (مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی محمد نصر اللہ، مولانا محمد عثمان، مفتی ابصار احمد)۔

مقالہ نگاران حضرات نے اس مسئلہ کے تعلق سے کہ اشتباہ کی صورت میں کسی عورت سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، کتب فقہ سے درج ذیل عبارتیں پیش کی ہیں:

۱-''فالرضاع يظهر بأحد أمرين: أحدهما الاقرار، والثاني البينة، أما الإقرار فهو أن يقول لا مرأة تزوجها هي أختي من الرضاع، وأما البينة فهي أن يشهد على الرضاع رجلان أو رجل وامرأتان، ولا يقبل على الرضاع أقل من ذلك'' (بدائع الصنائع ۴؍۱۴) (مفتی محمد نصر اللہ)۔

۲-''لوأرضعها أكثر أهل قرية ثم لم يدر من أرضعها فأراد أحدهم تزوجها إن لم تظهر علامة ولم يشهد بذلك جاز'' (الدر المختار علی الرد ۲؍۴۳۹، کتاب الرضاع، رشیدیہ پاکستان) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۳-''وفي الخانية صغير وصغيرة شبهة الرضاع ولا يعلم ذلك حقيقة، قالوا: لا بأس بالنكاح بينهما، هذا إذا لم يخبر بذلك أحد، فإن أخبر به عدل ثقة يأخذ بقوله، ولا يجوز النكاح بينهما'' (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱؍۲۱۳، الفن الأول، القاعدة الثالثة، دار الکتاب دیوبند)۔

۴-''امرأة دخلت حلمة ثديها فى فم رضيع ولا يدرى أدخل اللبن فى حلقه أم لا؟ لايحرم النكاح وكذا صبية أرضعها بعض أهل القرية، ولا يدرى من هو، فتزوجها رجل من أهل تلك القرية يجوز، لأن إباحة النكاح أصل فلا يزول بالشك'' (الاختیار لابن مودود الحنفی ۳؍۱۳۰) (مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

۵-''أما لوشک فیه بأن أدخلت الحلمة فی فم الصغیر وشکت فی الارتضاع لا تثبت الحرمة بالشک وهو کما علم أن صبیة أرضعتها إمرأة من قریة ولا یدری من هی فتزوجها رجل من أهل تلک القریة صح، لأنه لم یتحقق المانع من خصوصیة إمرأة'' (فتح القدیر ۳/ ۳۰۴، ۳۰۵) (مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا محمد ریحان مبشر، مفتی ابصار احمد ندوی، مولانا بدر احمد مجیبی ندوی)۔

۶-''صبیة أرضعها بعض أهل القریة لا یدری من أرضعتها منهن فتزوجها رجل من أهل تلک القریة فهوفی سعة من المقام معها فی الحکم کذا فی المضمرات، وإن تنزهوا عن ذلک فهو أفضل'' (فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۴۵)۔

۷-''صغیروصغیرة ولا یعلم حقیقة قالوا: لابأس بالنکاح بینهما'' (شرح الحموی علی الاشباہ والنظائر ص ۲۱۳)۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''وإذا وقع الشک في وجود الرضاع أوفی عدد الرضاع المحرم هل کملا أولا، لم یثبت التحریم، لأن الأصل عدمه فلا نزول عن الیقین بالشک، کما لو شک في وجود الطلاق وعدده'' (المغنی مع الشرح الکبیر ۹/ ۱۹۴) (مولانا ریحان مبشر، مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کا فیصلہ:

انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے مورخہ ۲۲ تا ۲۸ دسمبر ۱۹۸۵ء میں منعقد ہونے والے سمینار میں ملک بینک سے متعلق درج ذیل قرار دادیں پاس کیں:

''أولا: منع إنشاء بنوک حلیب الأمهات في العالم الاسلامي''۔

''ثانیا: حرمة الرضاع منها'' (فتاوی الشبکۃ الاسلامیہ، الباب مخاطر بنوک الحلیب ۱۳/ ۱۵۴۳) (مفتی ابصار احمد ندوی، مولانا محمد مغفور باندوی)۔

ہیئۃ کبار العلماء کا فتوی:

بینک سے دودھ حاصل کر کے بچہ کو پلانے کو ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب نے ناجائز قرار دیا ہے، فتوی کا متن درج ذیل ہے:

''لا یجوز استحلاب الأمهات والاحتفاظ بحلیبهن وتغذیة طفل آخر، لما فی ذلک من

الجهالة المؤدية إلى هتك حرمات الرضاع التى يقع التحريم بهاشرعا من جهة المرضعة ومن جهة صاحب اللبن ومن جهة الرضيع إذ أنه يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب وقال النبي ﷺ: من اتقى الشبهات فقد استبراء لدينه وعرضه"(مجلۃ البحوث الاسلامیہ ۲۱/ ۲۴)(مفتی محمد نصر اللہ)۔

علماء عرب کی آراء:

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رقم طراز ہیں:"إن الإسلام يعتبر الرضاع لحمة كلحمة النسب، يحرم به ما يحرم من النسب باجماع المسلمين، ومن مقاصد الشريعة الكلية المحافظة على النسب، وبنوك الحليب مؤدية إلى الاختلاط أو الريبة،أن العلاقات الاجتماعية في العالم الاسلامى توفر للمولود الخداج أو ناقص الوزن أو المحتاج إلى اللبن البشري في الحالات الخاصة ما يحتاج إليه من الاسترضاع الطبيعي، الأمر الذي يغنى عن بنوك الحليب، وبناء على ذلك قرر: منع إنشاء بنوك حليب الأمهات في العالم الإسلامي، ثانيا:حرمة الرضاع منها"(موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرۃ ۹/ ۴۷۷)(مفتی فیاض احمد محمود، مولانا محمد عثمان، مفتی عبد الرشید قاسمی)۔

سوال نمبر ۹- موجودہ مغربی تہذیب نے عملاً اور بہت سی جگہ قانوناً اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ نسبی شناخت کا تحفظ ضروری نہیں ہے اور بچوں کی ماں کی طرف نسبت کافی ہے، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مردوں اور عورتوں میں خاصی تاخیر کے ساتھ نکاح کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس کے مختلف محرکات ہیں، جیسے ہر طرح کے معاشی اور سماجی فکر سے آزاد ہوکر اعلی ڈگریاں حاصل کرنا، عورتوں کا ملازمتیں کرنا، ایک عمر تک صنفی لذت اٹھانے کے لئے آزاد زندگی گذارنا، طلاق کا مشکل قانون، جس میں مرد پر ڈھیر ساری ذمہ داریاں عائد کردی جاتی ہیں وغیرہ، اس کی وجہ سے ایک دوسرا نقصان یہ ہے کہ بانجھ پن بڑھتا جارہا ہے اور بہت سے میاں بیوی فطری طور پر اولاد سے بہرہ یاب نہیں ہو پاتے، اس کے لئے مادہ منویہ بینک قائم کئے جاتے ہیں، جن مردوں کے مادہ منویہ میں تولیدی صلاحیت کے حامل جرثومے نہیں ہوتے ہیں، یہ ان کو کارکر جرثومے فراہم کرتے ہیں، اور جن عورتوں میں تولید کے لائق بیضے پیدا نہیں ہو پاتے ہیں، ان کے لئے بیضے فراہم کرتے ہیں، اب اس طرح کے بینک مشرقی ممالک اور مغربی تہذیب کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی قائم کئے جارہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے بینک قائم کرنا، کسی مرد یا خاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورت مند مرد یا خاتون کو مادہ منویہ کا فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا کیا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ منی بینک کا قیام اور بینک سے منی حاصل کرنا شرعا ناجائز وحرام ہے، اس ضمن میں بعض حضرات نے مصنوعی بارآوری کی صورتیں اوران سے متعلق احکام بھی ذکر کئے ہیں، لیکن چونکہ اس موضوع سے متعلق گذشتہ سمینار میں متفقہ طور پر تجاویز پاس ہوچکی ہیں، اس لئے اس بحث کے ذکر کی غالبا یہاں ضرورت نہیں ہے۔

لہذا اصل موضوع سے متعلق مقالہ نگاران نے مجموعی طور پر اس کے حرمت پر جو دلائل اور اسباب بیان کئے ہیں ان کو نقل کیا جاتا ہے:

مفتی رجیب صاحب نے اس کو زنا خفی سے تعبیر کیا ہے، کہ جس طرح عزل ''وادخفی'' ہے، یہ بھی زنا خفی ہے۔

مفتی اشتیاق صاحب لکھتے ہیں: زناکاری اور اس طرح سے بارآوری میں کوئی فرق نہیں ہے، سوائے اس کے کہ زناکاری میں فطری وسیلے کو استعمال میں لایا جاتا ہے، اور یہاں مشینوں کے ذریعہ اس مادہ کو رحم خاتون میں پہنچایا جاتا ہے۔

مقالہ نگار حضرات نے لکھا ہے کہ اسلام نے نسب کے تحفظ پر بہت زور دیا ہے اور نسب کے حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يسقى ماءه زرع غيره**'' (ابوداؤد، باب وطي السبايا، رقم الحديث: ۲۱۵۸) (مفتی امانت علی قاسمی، مفتی رجیب کیرالہ، مولانا اسرار الحق سبیلی، مفتی شاہ جہاں ندوی وغیرہم)۔

نسب کی حفاظت ہی کے تعلق سے یہ حدیث بھی مروی ہے: ''**أيما امرأة أدخلت على قوم من ليس منهم فليس من الله في شئ، ولن يدخلها جنة، وأيما رجل جحدولده وهو ينظر إليه احتجب الله منه وفضحه على رؤس الخلائق في الأولين والآخرين**'' (مشکوۃ ۲۸۷/۲۱) (مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

مقالہ نگاران حضرات نے مجموعی طور پر منی بینک کے درج ذیل مفاسد ذکر کئے ہیں:

۱- مادہ منویہ انسان کا جز ہے اور جزء انسانی سے انتفاع بلاضرورت جائز نہیں ہے، اور یہاں بلاضرورت اپنا مادہ منویہ بینک کو فراہم کیا جارہا ہے۔

۲- منی بینک کے قیام کی وجہ سے نسب خلط ملط ہوجائے گا۔

۳- ایک عورت جو اپنے رحم میں کسی اجنبی کے منی کو داخل کرائے گی اس میں کشف عورت لازم آئے گا، جبکہ ہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۴- منی بینک کا قیام اسلام کے نظریہ کے مخالف ہے کہ اسلام کا تصور یہ ہے کہ اللہ تعالی کے حسب مشیت آدمی

صاحب اولاد ہوتا ہے، یا اولاد سے محروم ہوجاتا ہے، جبکہ منی بینک کا قیام اس بنیاد پر مبنی ہے کہ ہر کسی کو اولاد کی نعمت سے بہرہ ور کیا جاسکتا ہے (مفتی امانت علی قاسمی)۔

۵-اس صورت میں مرد یا عورت کے مادہ منویہ کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور مادہ منویہ کی خرید وفروخت شرعا درست نہیں ہے، ”ولا ینعقد بیع الملاقیح والمضامین، والمقلوح ما فی رحم الأنثی“ (الفتاوی الہندیہ ۳/۱۱۶)۔

۶-اس میں استمنا بالید کا ارتکاب ہے جو کہ حرام ہے۔

۷-بہت ممکن ہے کہ منی دینے والے کی محرم عورتیں بھی منی بینک سے منی حاصل کر کے حاملہ ہوجائیں (مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا بدر احمد مجیبی ندوی، مولانا آفتاب عالم غازی، مفتی عبد الرشید قاسمی، مفتی محمد عفان، مفتی عبد الرزاق، مولانا محمد فاروق، مولانا خورشید احمد اعظمی ودیگر مقالہ نگاران)۔

عرب علماء کے فتاوے:

فتاوی اسلامیہ (جس کے اصحاب افتاء، شیخ بن باز، صالح العثیمن، عبداللہ بن عبدالرحمٰن جبرین ہیں) میں ہے:

”لا یجوز التبرع بذلک (أی المنی) فیما یظهر لما یستلزمه من مس العورات، واستعمال الأشیاء القذرة وملامسة النجاسة مع أنه غیر متحقق الثبوت، والله تعالی هو الخالق المتصرف ”یهب لمن یشاء اناثا ویهب لمن یشاء الذکور أویزوجهم ذکرانا واناثآ ویجعل من یشاء عقیما“، ولیس هناک ضرورات وعلی المرأ أن یرضی بما خلق الله وأعطاه (فتاوی اسلامیہ، حکم التبرع بالدم ۴/۴۱۶) (مفتی امانت علی قاسمی)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

(سوال نمبر:۱،۲،۳،۴)

مولانا خورشید احمد اعظمی☆

ہندوستان کے جنوبی ساحل، کیرالہ کی سرزمین پر، اسلامی، فقہ اکیڈمی انڈیا کے منعقدہ چوبیسویں سیمینار کے موضوعات خمسہ سے ایک موضوع ''اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ'' کے سوالات ۱،۲،۳،۴ عطیۂ خون اور نقل دم سے متعلق عرض مسئلہ پیش خدمت ہے:

اس موضوع پر اکیڈمی کے توسط سے کل ۷۱ مقالے موصول ہوئے، جن میں دو مقالے مکرر تھے، مقالہ نگار کی تعداد انہتر (۶۹) ہے، اکیڈمی نے خون کے عطیہ سے متعلق چار سوالات قائم کئے تھے۔

سوال نمبر(۱): کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے:

جواب میں تمام ہی مقالہ نگار نے انسان کے معزز و مکرم ہونے، لوجہ الکرامۃ اس کے اجزاء سے انتفاع کے عدم جواز اور خون کے نجس ہونے کا ذکر کیا ہے، مگر تمام مقالے اس پر متفق ہیں، کہ اگر مریض حالت اضطرار میں ہو، طبیب حاذق کے بقول خون چڑھائے بغیر جان بچنے کی امید نہ ہو، انسانی خون کا بطور دوا کوئی بدل نہ ہو، تو اس کے لئے کسی انسان کا خون بقدر ضرورت چڑھوانا جائز ہے، اور اگر بلا عوض خون دستیاب نہ ہو تو اس کے لئے خریدنا بھی جائز ہے، محض حصول قوت و زینت کیلئے جائز نہیں، اور مسلمان کو جائز ہے کہ اگر اپنا خون دینے سے اسے ضرر لاحق نہ ہو، تو کسی بھی حالت اضطرار میں مبتلا مریض کو خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، بلا عوض و قیمت اپنا خون عطا کرے، مسئلہ متفق علیہ ہے مگر عرض مسئلہ کی رعایت میں دلائل و شواہد کی تفصیل مناسب معلوم ہوتی ہے۔

☆ محلہ رگھوناتھ پورہ، مئو۔

دلائل:

(۱) حالت اضطرار میں خون چڑھوانے کے جواز کی دلیل کے طور پر ارحم الراحمین ،مولی عز وجل کی طرف سے قرآن کریم میں محرمات کے استعمال کے لئے دی گئی رخصت "فمن اضطر غير باغ و لا عاد" نیز " فمن اضطر فی مخمصةغير متجانف لاثم فإن الله غفور رحيم" اور "قد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم إليه" کا ذکر اکثر مقالہ نگار نے صراحۃً کیا ہے اور بعض نے اپنے الفاظ میں اس کے معنی ومفہوم پر اکتفا کیا ہے

(۲) دوسری دلیل، احادیث رسول اللہ ﷺ سے حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کو سونے کی ناک بنوانے کی اجازت، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما کو خارش کی وجہ سے ریشم کا لباس استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمانا ہے، جبکہ یہ دونوں چیزیں مردوں کے لئے حرام ہیں، مگر بوجہ ضرورت وحاجت، شارع ﷺ نے اس کی رخصت واجازت مرحمت فرمائی ہے، اس کا ذکر کیا ہے، محترم مولانا اشتیاق احمد، ابوحماد، قمر الزماں ندوی، محمد انیس ندوی، محمد توقیر بدر، عبدالرزاق امروہہ، اعجاز الحسن، عبدالحکیم، محمد سلطان، محمد عظمت اللہ اور محمد قمر عالم صاحبان نے۔

(۳) حدیث نبوی سے ایک اور دلیل عرنیین کا واقعہ ہے کہ، رسول اللہ ﷺ نے ان کو بطور علاج اونٹ کے دودھ اور پیشاب پینے کا حکم فرمایا، اس کا ذکر کیا ہے، مولانا ابوحماد، محمد سلطان، خواجہ نظام الدین، جسیم الدین، آفتاب غازی، انیس احمد اور مولانا اشتیاق احمد صاحبان نے موضع استشہاد اونٹ کا پیشاب ہے، جسے بطور علاج تجویز کیا گیا۔

پھر ان نصوص سے ماخوذ قواعد فقہیہ:

(۴) "الضرورات تبيح المحظورات" کی صراحت کیا ہے مولانا اقبال محمد، محمد جمیل اختر، عبدالخالق ندوی، محمد مغفور باندوی، اکمل یزدانی، جسیم الدین، امتیاز ولنوی، عبدالرزاق، محمد منت اللہ، امانت اللہ، وجیہ اللہ احسن، محمد فرقان، محمد قمر عالم، عبدالحکیم، آفتاب غازی، خورشید احمد اعظمی اور مولانا عبدالحیٔ صاحبان نے۔

(۵) "الضرر يزال"، کا تذکرہ کیا ہے، مولانا جمیل اختر، مغفور باندوی، عبدالرزاق امروہہ، محمد فرقان، امانت علی قاسمی اور خورشید احمد اعظمی نے۔

(۶) "الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف "، " اذا تعارض مفسدتان" اور "روعی أعظمهما ضرراًبارتكاب أخفهما" (الأشباہ)، کا ذکر کیا ہے مولانا عابد الرحمٰن، عبدالحکیم قاسمی، عمر امین اور طارق انور صاحبان نے۔

(۷) حفظ نفس مقاصد شریعت سے ہے جس کی رعایت ضروری ہے، خورشید احمد اعظمی، اور مولانا محمد جمیل اختر نے قواعد الاحکام کی عبارت نقل کیا ہے: "لأن حفظ الحياةأعظم فی نظر الشارع من رعاية المحرمات "۔

پھر بطور استشہاد، کتب فقہیہ میں مذکور متعدد تفریعات کا بھی ذکر اکثر مقالہ نگار نے کیا ہے، مثلاً:

(۸)"ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة واساغة اللقمة بالخمر ،والتلفظ بكلمة الكفر للاكراه،وكذا اتلاف مال غيره" (الأشباہ والنظائر ۱۰۸)، مفتی محمد توقیر بدر، مفتی امتیاز، عبدالرزاق امروہہ، محمد ظفر عالم صاحبان۔

(۹)"الاستشفاء بالحرام جائز عند التيقن بحصول الشفاء فيه كتناول الميتة عند المخمصة ،والخمر عند العطش و اساغة اللقمة،وانما لا يباح بما لا يستيقن حصول الشفاء به" (بدائع الصنائع ۱/۶۱)، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، محمد انیس، اکمل یزدانی، رضوان الحسن صاحبان۔

(۱۰)"الاستشفاء بالمحرم انما لا يجوز اذا لم يعلم أن فيه شفاء،أما اذا علم أن فيه شفاء،وليس له دواء آخر فيجوز الاستشفاء به"(المحیط البرہانی) مولانا نثار احمد، مفتی جنید، اکرام الحق، ارشد علی رحمانی۔

(۱۱)"يجوز للعليل شرب الدم و البول و أكل الميتة للتداوی ،اذا أخبره طبيب مسلم أن شفائه فيه، ولم يجد فی المباح ما يقوم مقامه"(فتاویٰ عالمگیریہ ۵/۳۵۵)، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد فاروق، مولانا محمد ذکوان، ابوحماد، نثار احمد، محمد سلطان، مفتی جنید، نظام الدین، عبدالخالق ندوی، قمر الزماں، محمد انیس، محبوب فروغ، لطیف الرحمٰن، حبیب قاسمی، مغفور باندوی، اکمل یزدانی، اشتیاق احمد، جسیم الدین، مفتی امتیاز، امانت علی قاسمی، مفتی محمد عفان، عبدالرزاق امروہہ، محمد منت اللہ، عبدالشکور، محمد نصر اللہ، رضوان الحسن، محمد ظفر عالم، محمد عثمان، اعجاز الحسن، عبدالحکیم قاسمی، ابصار احمد ندوی، بدر مجیبی، ارشد علی، محمد رمضان علی فرقانی، محمد توقیر بدر اور خورشید احمد اعظمی۔

(۱۲)"لابأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء"(فتاوی عالمگیری ۵/۴۱۰)، مولانا اقبال ٹنکاروی، محمد ذکوان، ابوحماد، عبدالرشید قاسمی، فرید کاوی، مفتی جنید، خواجہ نظام الدین، ابوبکر، قمر الزماں، محمد انیس، محبوب فروغ، تاج الدین، شبیر یعقوب، حبیب قاسمی، محمد توقیر بدر، مفتی امتیاز، اکرام الحق، عبدالرزاق امروہہ، محمد عظمت اللہ، محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی، بدر احمد مجیبی، محمد عنایت اللہ، یوسف بن داؤد، محمد رمضان علی۔

(۱۳)" أدخل المرارة فی أصبعه للتداوی ،قال أبو حنيفة لايجوز وعند أبی يوسف يجوز و عليه الفتویٰ"(فتاوی عالمگیریہ ۵/۳۵۶)، مولانا شاہجہاں ندوی، فرید کاوی، محمد منت اللہ، رضوان الحسن۔

(۱۴) "أكل خرء الحمَام فی الدواء لا بأس به" (فتاوی عالمگیریہ ۵/۳۵۵) مولانا شاہجہاں ندوی، اعجاز الحسن، رضوان الحسن۔

(۱۵) "من أكره على شرب الخمر او اضطر اليها لعطش أو علاج أو لدفع خنق فشربها أو جهل فلم يدر أنها خمر فلا حد على أحد من هؤلاء "(المحلی لابن حزم)،مولانا محمد شاہجہاں ندوی، رضوان الحسن۔

(۱۶)"وأما التداوی بالنجاسات غير الخمر فهو جائز سواء فيه جميع النجاسات غير المسكر "(المجموع)مولانا محمد شاہجہاں ندوی، رضوان الحسن۔

(۱۷)"اذا اضطر الى شرب الدم أو البول أو غيرهما من النجاسات المائعة غير المسكر جاز له شربه بلا خلاف" (المجموع ۹/۵۱)مولانا طارق انور۔

(۱۸) "اختلف التداوی بالمحرم .....وقيل يرخص اذا علم فيه الشفا ء ولم يوجد دواء آخر ،كما رخص الخمر للعطشان وعليه الفتوى"(ردالمحتار مع الدر المختار ۱/۱۴۰)،مولانا عبدالحئ صاحب۔

مولانا محبوب فروغ صاحب نے، انسان کے سیال اور جامد اجزاء میں فرق کیا ہے، اور سیال اجزاء انسانی سے، عند الضرورۃ انتفاع کے جواز کی تصریحات فقہیہ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد رجیب نے بلڈ ڈونیشن و یکی پیڈیا کے حوالہ سے اور مولانا عثمان صاحب نے اخبارات میں ڈاکٹروں کے بیانات کے اعتبار سے بغیر کسی سبب کے بھی انسان کا اپنا خون نکالنا مفید لکھا ہے لکھتے ہیں: لہذا مجبور و مضطر کے لئے استعمال بھی جائز ہوگا، ناچیز عارض بھی اس جستجو میں رہا کہ کسی نص شرعی سے بلا سبب خون نکلوانے کا ثبوت مل جاتا تو بلڈ بینک کے قیام کے لئے مفید ہوتا، مگر شارحین حدیث نے احتجام کی بحث میں " عند الاحتیاج "کا ذکر کیا ہے(فتح الباری، ۱۰/۱۵۰، ۱۵۲)، حدیث نبوی ﷺ:"من احتجم بسبع عشرة وتسع عشرة واحدى وعشرين كان شفاء من داء"(ابوداؤد)، اس کے تحت ابن قیمؒ نے لکھا ہے:" ومحل اختيار هذه الأقات لها ما اذا كانت للاحتياط والتحرز عن الأذى وحفظ الصحة"، مگر ان کی یہ تشریح بھی اس پر دلالت نہیں کرتی کہ کوئی انسان بلا سبب اپنا خون نکلوائے۔

مفتی فیاض صاحب نے خیر خواہی، ہمدردی اور تعاون جن کی احادیث میں ترغیب آئی ہے اس کے مدنظر خون کے عطیہ کو جائز کہا ہے، اور وہبہ زحیلی اور شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی عبارت اور فتوی نقل کیا ہے۔

مولانا نثار احمد لکھتے ہیں:"الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة"(شرح المجلۃ)، لہذا ضرورت و حاجت، ہر دو صورت میں خون سے علاج درست ہوگا، یہی موقف مولانا محمد ذکوان صاحب کا بھی ہے۔

مولانا اکرام الحق صاحب نے انسانی جسم پر حقوق اللہ اور حقوق العبد سے متعلق گفتگو کیا ہے، اور شرح المجلہ سے "كل يتصرف فی ملكه كيف شاء"، نقل کر کے لکھتے ہیں: اس طویل گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے وجود پر

اختیار حاصل ہے، لہذا وہ نہ صرف اپنے خون کا عطیہ کرسکتا ہے، بلکہ وہ اسے فروخت بھی کرسکتا ہے، پھر تائید میں المغنی کی عبارت نقل کیا ہے:" **وسائر أجزاء الآدمي يجوز بيعها** " حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے قواعد الاحکام سے یہ عبارت نقل کیا ہے :"**وليس لأحدأن يتلف ذلك من نفسه ،لأن الحق في ذلك كله مشترك بينه و بين ربه**"، جو اس امر کے لئے صریح ہے کہ جن اشیاء میں حق، اللہ اور بندہ کے درمیان مشترک ہو، کسی کے لئے اس کا تلف کرنا جائز نہیں ہے، نیز المغنی کی مذکورہ عبارت مولانا محمد جمیل اختر صاحب نے بھی ذکر کیا ہے، اور مکمل عبارت یہ ہے: "**وسائر أجزاء الآدمي يجوز بيعها فانه يجوز بيع العبد و الأمةوانما حرم بيع الحر لأنه ليس بمملوك ، وحرم بيع العضو المقطوع لأنه لا نفع فيه**" (۳۶۴/۶)، جس سے واضح ہوتا ہے کہ، جب آزاد شخص کی بیع غیر مملوک ہونے کی وجہ سے جائز نہیں تو اس کے اجزاء کی بیع بھی جائز نہ ہو، اور احناف کے نزدیک تو بالکلیہ اجزاء انسانی کی بیع جائز نہیں، اور مرضعہ کی اجرت، عمل ارضاع کی اجرت ہوتی ہے دودھ کی قیمت نہیں ہوتی۔

مولانا جمیل اختر اور مولانا عابد الرحمٰن نے اس طبی ارتقاء کے دور میں انسانی اعضاء و اجزاء کے قابل انتفاع ہونے کے ساتھ عرف میں اپنے جزو سے افادہ کو باعث تکریم ہونے کے ناحیہ سے استدلال کیا ہے، کہ جن امور میں نص شرعی نے کوئی جہت متعین نہ کیا ہو اس میں عرف کا لحاظ ہوتا ہے، انیس احمد ندوی صاحب نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: "**قال الفقهاء أيضاً كل ما ورد به الشرع مطلقاً ،ولا ضابط له فيه ولا في اللغةيرجع فيه الى العرف**" مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی اجزاء سے زیر بحث انتفاع کے بارے میں نص موجود ہے :" **لعن الله الواصلة و المستوصلة**" جس کی شرح میں امام نووی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے: "**ولأنه يحرم الانتفاع بشعر الآدمي و سائر أجزائه لكرامته بل يدفن شعره و ظفره وسائر أجزائه** " خاص طور سے احناف، جن کے یہاں غیر انسان کے بال سے اس کے جواز کا قول کیا گیا ہے، جب کہ اس حدیث کا شان ورود ہی یہ ہے کہ ایک صحابیہ نے اپنی لڑکی کے بارے میں اس کے متعلق دریافت کیا تھا، جس کے بال مرض کی وجہ سے جھڑ گئے تھے، اور جب کہ بال بھی انسان کے ان اجزاء میں سے ہے جسمیں نمو اور اضافہ ہوتا رہتا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ نے اجازت مرحمت نہیں فرمائی، اور نبی ﷺ کے موئے مبارک سے انتفاع برائے صحت مریض، جیسا کے مولانا عبد الرشید صاحب نے لکھا ہے، تو یہ اس طور پر نہیں ہے کہ اس کو دوسرے انسان کے جسم کا جزو بنایا گیا، بلکہ یہ بطور تبرک ہے جو نبی ﷺ کی خصوصیت ہے، اسی لئے غالبا کسی اور کے بارے میں منقول نہیں ہے، جیسا کہ نبی ﷺ کے بول و دم مبارک کے پینے کا ذکر بھی ملتا ہے، اور اس کا علم بھی آپ ﷺ کو ہوا، آپ ﷺ نے نکیر بھی نہیں فرمائی، مگر اس بنا پر کسی نے انسان کے خون یا پیشاب کے استعمال کا قول نہیں کیا ہے، عورت کے دودھ سے استفادہ پر

قیاس اس حد تک توصحیح ہے، کہ وہ بھی بچہ کی حالت ضرورت میں ہی مباح ہے، اور اسی لئے اس کی خلقت بھی ہوئی ہے، مطلقا جزو انسانی سے استفادہ وانتفاع پر اس سے استدلال یا اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، بہر کیف جملہ دلائل وشواہد مذکورہ بالا سے بحالت اضطرار مریض کے لئے مذکورہ شرائط کے ساتھ انسان کا خون چڑھوانے کا جواز معلوم ہوتا ہے، اور التزامی طور پر خون دینے کا بھی جواز ملتا ہے، جب کہ خون دینے سے دینے والے کے جسم میں کوئی عیب اور ضرر نہیں پیدا ہوتا۔

غیر مسلم کو خون دینے کے بارے میں مفتی فرید، خواجہ نظام الدین، محمد ابو بکر، ابصار ندوی، بدر مجیبی، طارق انور صاحبان نے تحریر فرمایا ہے کہ حربی کو دینا جائز نہیں، جسیم الدین صاحب نے لکھا ہے بشرطیکہ معاندین اسلام میں سے نہ ہو، مولانا محمد مغفور نے لکھا ہے ایسے کافر کو دینا جائز ہے جس سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہ ہو، مفتی نصر اللہ صاحب نے بطور استشہاد فرمان الٰہی: " **لاتعاونوا علی الاثم و العدوان** " کا ذکر کیا ہے، جب کہ بیشتر مشائخ نے احترام انسانیت، حفظ نفس، اور تالیف قلب کے سبب، مطلقاً غیر مسلم مریض کو بھی خون کا عطیہ کرنا جائز لکھا ہے، بعض احباب نے غیر مسلم کو خون دینے کے جواز پر دلالت کے لئے کچھ نصوص کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً:

(۱) " **لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین** "

(۲) "**ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما وأسیراً** "(مولانا وجیہ اللہ احسن، فرید احمد)۔

(۳) "**ان لنا فی البھائم أجراً** " اور " **فی کل ذات کبد رطبۃ أجر** "(مولانا محمد فاروق دربھنگہ)۔

(۴) "**خیر الناس من ینفع الناس** "(مولانا محمد منت اللہ)۔

(۵) "**ولابأس بأن یستأجر المسلم الظئر الکافرۃ** "(مولانا محمد ظفر عالم)۔

مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ باستثناء حالت قتال، حسن اخلاق، انسانی ہمدردی، اور تالیف قلب کے مقصد سے جان بچانے کے لئے حربی اور غیر حربی مریض کی تفریق نہ کی جائے، قحط سے دوچار کفار مکہ کے لئے رسول اللہ ﷺ نے رسد روانہ کیا تھا۔

۲- اکیڈمی کی طرف سے قائم کردہ دوسرے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر معمولی حادثات میں خون کی بہت زیادہ ضرورت کو پوری کرنے کے لئے بلڈ بینک قائم ہیں جہاں رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیا جاتا ہے، اور بینک بھی عموماً مفت خون فراہم کرتے ہیں، قیمت نہیں لیتے، البتہ چاہتے ہیں کہ اس کے بدلہ میں متاثر شخص کے متعلقین بھی خون کا عطیہ کریں، جو دوسرے مریض کو کام آئے، کیا ایسے بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کر سکتے ہیں۔

اس سوال کے دو پہلو ہیں، (۱) ایسے بلڈ بینکوں میں ضرورت پیش آئے بغیر خون کا عطیہ کرنا (۲) ضرورت پیش آنے پر خون لینے کے لئے خون دینا۔

چنانچہ مقالہ نگار میں سے اکثر کے جواب سے پہلی صورت ہی ظاہر ہوتی ہے، آراء درج ذیل ہیں:

پیشگی ضرورت، اور تعاون علی البر کے مدنظر خون دینا جائز ہے، مولانا ابصار ندوی محبوب فروغ، ابوحماد، نثار احمد، عبدالخالق، محمد ابوبکر، وجیہ اللہ احسن، عبدالشکور، محمد نصر اللہ، قمر عالم ، مولانا عبدالرزاق بھوپال، عبدالرشید قاسمی، مظاہر حسین، محمد فاروق دربھنگہ، مفتی جنید، محمد منت اللہ، محمد فرقان، محمد احسن، فیاض احمد، محمد عمران، یوسف داؤد، عبدالرزاق امروہہ، عبدالحکیم، اشتیاق احمد، اکمل یزدانی اور مولانا محمد مغفور نے بھی تعبیر کے فرق سے اس مفہوم کی ادائیگی کیا ہے، کہ اضطراری حالت میں خون دینا جائز ہے، لہذا حالت اضطرار کا انتظار ضروری نہیں، خون کا عطیہ اور ہبہ جائز ہوگا، مستقبل کی ضرورت کو حال کے درجہ میں مان کر بلڈ بینک میں خون عطیہ کرنے کے جواز کا قول کرتے ہوئے مولانا شاہین جمالی صاحب لکھتے ہیں: بینک کی طرف سے متاثر شخص کے متعلقین سے عطیہ خون کی خواہش کرنا درست نہیں،

مولانا محمد ظفر عالم، خواجہ نظام الدین، اور طارق انور صاحب نے دلیل میں "**یجوز للمضطر التناول من الحرام .....وله التزود من المیتة**" کا ذکر کیا ہے، جبکہ احناف کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

محمد توقیر بدر صاحب نے بلڈ بینک کو بیت المال پر قیاس کرتے ہوئے عطیۂ خون کو وقف کی نظیر کہا ہے۔

" **من استطاع أن ینفع أخاه فلیفعل** " نیز "**اذا ثبت الشئ ثبت بجمیع لوازمه**"، مولانا محمد انیس ندوی، ریاض احمد، محمد آزاد بیگ، حبیب یوسف۔

محض انسانی خدمت کے جذبہ سے دینا جائز ہے، تاج الدین، رضا کارانہ طور پر کر سکتے ہیں، لطیف الرحمٰن، اور مولانا محمد عثمان اور رجیب قاسمی نے لکھا ہے کہ بلاسبب بھی خون نکالنا جائز ہے، لہذا اس کا بینک میں جمع کرنا بھی جائز ہے۔

سوال کے دوسرے پہلو یعنی ضرورت پیش آنے پر مطلوبہ گروپ کا خون لینے کے لئے خون دینا ضرورۃً جائز ہے۔

مولانا محمد فاروق، محمد ذکوان، محمد ارشاد، اقبال محمد، محمد جمیل اختر، محمد افضل، آفتاب غازی، اکرام الحق، محمد عفان یوسف داؤد، محمد توقیر، بدر مجیبی، ابصار احمد ندوی، اور خورشید اعظمی نے ضرورت در پیش ہونے پر ایسے بینکوں کو خون دینے کے جواز کا قول کیا ہے، مولانا محمد عثمان اور امانت علی صاحبان نے اسے ہبہ بالعوض کے طور پر جائز کہا ہے، مگر ظاہر ہے کہ خون نجس بھی ہے اور غیر مملوک بھی، لہذا اس کا دینا بدرجۂ مجبوری ہی جائز ہوگا، جیسا کہ مولانا عثمان صاحب نے لکھا ہے کہ اس صورت میں بینک کو خون دینا، اس مریض کو ہی خون دینے کے حکم میں ہے، "**ولا یصح تعویض مسلم من نصرانی عن هبته**

خمراً أو خنزيراً اذ لا يصح تمليكاً من المسلم كذا في المبسوط" (البحر ۷ ۴۹۸۳، الدر ۸ ۵۰۹)۔

مفتی امتیاز صاحب لکھتے ہیں: بلڈ بینکوں میں رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ کرنا قبل از وقت، بلاضرورت ہونے کی بنا پر ناجائز ہے، نیز مولانا نے قائم شدہ بلڈ بینکوں کی کچھ خرابیوں اور غلط استعمال (مثلاً خون کی خرید وفروخت، ضرورت مندوں کو پریشان کرنا وغیرہ) کا بھی ذکر کیا ہے، جو شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہیں، اور بدل کے طور پر انھوں نے مصنوعی خون کا بھی ذکر کیا ہے، لھذا انکے نزدیک بھی بوقت ضرورت ہی خون کا عطیہ جائز ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک تیسرا نظریہ ہے کہ خون دینا تو درست ہے، لیکن بینک کی شرط کو پورا کرنے کے لئے خون کا عطیہ درست نہیں، فرید احمد۔ بدل کے طور پر خون لینا درست نہیں، یہ خون کی خرید وفروخت ہے جو جائز نہیں مولانا محمد نعمت اللہ، عبدالمنان، عبدالحکیم، محمد عظمت اللہ، شاہین جمالی۔ مولانا محمد عنایت اللہ نے لکھا ہے: خون لینے کے لئے خون دینے پر مجبور کرنا ظلم اور زیادتی ہوگی، یہ تبادلہ شئ باشئ ہوگا، ہبہ یا عطیہ نہیں ہوگا، مولانا طارق انور نے بھی، اس کے عوض اور ثمن ہونے کی صورت کی بنا پر ناجائز لکھا ہے۔

جواب کی مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہورہا ہے کہ مذکورہ صورت میں اکثر مقالہ نگار کے نزدیک بینک کو خون دینا درست ہے، خواہ اس نقطۂ نظر سے کہ بینک سے خون لینے کی ضرورت درپیش ہے، یا اس نقطۂ نظر سے کہ بلڈ بینک میں تبرعاً خون جمع کرنا جائز ہے، البتہ بعض مشائخ نے خون لینے کے لئے خون دینے کو شرط یا بدل یا ثمن اور صورت بیع ہونے کے پیش نظر ناجائز قرار دیا ہے، موقف بالکل بجا ہے مگر چونکہ بصورت اضطرار، محرمات محتاج الیھا کے استعمال کی گنجائش مشروع ہے، نیز "الاشباہ" کی عبارت ہے: "**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**"، لہذا اس پس منظر میں کہ مریض ضرورت مند ہے، بروقت اس کو بینک کے علاوہ بلاعوض خون نہیں مل پارہا ہے اور کوئی شخص اپنا خون بینک کو دے کر اس کے لئے خون فراہم کررہا ہے، جواز کا قول کیا جائے، تو اسکی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ اکیڈمی کی طرف سے تیسرا سوال ہے: "خدمت خلق کی مختلف تنظیمیں وقتاً فوقتاً بلڈ کیمپ قائم کرتی ہیں تاکہ ایمرجنسی حالات کے لئے خون کا عطیہ حاصل کیا جائے، اور اسے بلڈ بینک میں محفوظ کرادیتی ہیں، آجکل مسلم تنظیمیں بھی ایسے کیمپ قائم کرتی ہیں خاص طور پر بڑے شہروں میں رسول اللہ ﷺ کی تاریخ ولادت میں ایسے کیمپ لگا کرتے ہیں، اور برادران وطن پر اس کا اچھا اثر مرتب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس صرف لینے والا ہاتھ نہیں ہے، دینے والا ہاتھ بھی ہے، تو کیا مسلمانوں کے لئے ایسے رضا کارانہ بلڈ بینک کا قائم کرنا جائز ہوگا؟"

جواب میں آراء کی تفصیل درج ذیل ہے:

(الف) مسلمانوں کیلئے بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے:

انسانی جان کو بچانے کی تدبیر ہے، اور حالت اضطرار میں خون کا استعمال جائز ہے، مولانا شاہجہاں ندوی، محمد عظمت اللہ، عبدالرشید قاسمی، نثار احمد، محمد سلطان، فیاض احمد اور مولانا محمد مغفور، مولانا رضوان الحسن، طارق انور اور مولانا قمر عالم، مولانا بدر مجیبی اور محمد رمضان علی صاحبان نے بطور استشہاد زمانۂ قحط کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے غلہ محفوظ رکھنے کا ذکر کیا ہے۔

"الضرورات تبيح المحظورات"، اور "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" کے تحت جائز ہے، مولانا محمد جمیل اختر، ابوحماد، فرید احمد، مظاہر حسین، عبد الخالق، محبوب فروغ، محمد ابوبکر، محمد افضل، جسیم الدین، عبد الحکیم، آفتاب غازی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی نے اس کو طبی ضرورت قرار دیتے ہوئے مذکورہ قواعد سے استدلال کیا ہے، جب کہ انھوں نے "الموسوعۃ" سے یہ عبارت بھی نقل کیا ہے کہ: "ويشترط للأخذ لمقتضى الضرورة أن تكون الضرورة قائمة لا منتظرة، (الى قوله) قال الشيخ عميرة: لو كانت الحاجة غير ناجزة فهل يجوز الأخذ لما عساه يطرأ؟ الظاهر لا."، جس کا ظاہر عدم جواز پر دلالت کرتا ہے۔

"الأمور بمقاصدها"، نیز "لما غلب وقوع هذه المفسدة جعل الشرع المتوقع كالواقع" (اکرام الحق، عمرامین، عابدالرحمٰن)۔

"مالا يتم الواجب الا به فهو واجب" وجیہ اللہ احسن، مولانا محمد ذکوان صاحب نے "ذریعۂ حرام بھی حرام ہے وعکسہ" سے تعبیر کیا ہے، مولانا شاہین جمالی صاحب نے لکھا ہے کہ خون دینا جائز ہے تو اس کی حفاظت کا بندوبست بھی جائز ہوگا، مگر اس قاعدہ سے خون چڑھانا بوقت ضرورت جائز ہے، لہذا خون دینا بھی بوقت ضرورت ہی جائز ہونا چاہئے۔

محض انسانی خدمت کے جذبہ سے جائز ہے، سید تاج الدین، رضا کارانہ طور پر کرسکتے ہیں لطیف الرحمٰن "في كل كبد رطبة أجر" (محمد نصر اللہ، بشرطیکہ خون کی خرید وفروخت نہ کرے، مولانا محمد نعمت اللہ، ابصار احمد، عبد المنان صاحبان)۔

معاشرتی وعرفی مفاد نیز "اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه" مولانا اقبال محمد، محمد انیس ندوی، امانت علی، اشتیاق احمد، محمد آزاد بیگ، عبدالحکیم اور ارشد علی رحمانی، مگر شاید اس قاعدہ سے قیام بینک کے جواز کے لئے استدلال تام نہیں ہوتا، کیونکہ ثبوت شئ خون چڑھانے کا جواز ہے، اور اس کے لوازمات سے بوقت اضطرار خون دینا ہے، اندیشۂ وامکان اضطرار اس کے لوازمات سے نہیں ہے، کہ اس کے مدنظر خون محفوظ رکھنے کے لئے بینک قائم کیا جائے، مولانا حبیب یوسف اور مفتی

جنید صاحبان نے اس کی بھی صراحت کیا ہے کہ کیمپ کیلئے کسی متعینہ تاریخ کا اہتمام نہ کیا جائے۔

"له أن يتزود منه أى المحرَّم ان خاف الحاجة" (خواجہ نظام الدین، مولانا طارق انور)، "يجوز له أن يتزود منها حيث غلب على ظنه عدم وجود شئ مما يقدم على أكل الميتة فى مدة سفره" (مولانا محمد عمران، وجیہ اللہ احسن)۔

بیت المال پر قیاس کر کے جائز ہے (مولانا محمد توقیر)۔

مولانا محمد عنایت اللہ نے جائز لکھا ہے مگر دلیل میں "الضرورات تبيح المحظورات أى أن الأشياء الممنوعة تعامل كالأشياء المباحة وقت الضرورة" کا ذکر کیا ہے، جس سے بوقت ضرورت مباح ہونا معلوم ہوتا ہے۔

"وان أكره بملجئ (بقتل أو قطع عضو) أو ضرب مبرح حل الفعل بل فرض" (مولانا اکمل یزدانی) ظاہر ہے کہ یہ بھی حالت اضطرار سے ہی متعلق ہے۔

ان کے علاوہ مولانا عبدالرزاق امروہہ، محمد منت اللہ، محمد فرقان، عبدالشکور، محمد احسن، محمد ظفر عالم، عبدالمنان، محمد عظمت اللہ اور مولانا عبدالرزاق بھوپال، صاحبان نے بھی مسلمانوں کے لئے بلڈ بینک قائم کرنے کو جائز کہا ہے۔

(ب) بلڈ بینک قائم کرنا جائز نہیں:

مولانا عبدالحیٔ، مفتی محمد عفان، مفتی امتیاز، مولانا محمد فاروق کشمیری، مولانا محمد ریاض اور مولانا محمد قمر الزماں صاحب نے قبل از وقت بلاضرورت ہونے کی وجہ سے عام حالات میں محض امکانی موہوم ضرورتوں کے لئے مسلمانوں کے رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنے کو ناجائز کہا ہے، مولانا محمد عفان صاحب نے لکھا ہے: خون کی بیع کے رواج کا اندیشہ ہے، نشہ کے عادی لوگوں کی برائیوں میں اضافہ کا خطرہ ہے، مولانا محمد ارشاد،، یوسف داؤد اور خورشید احمد نے "ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها" کے پیش نظر عدم جواز کا قول کیا ہے، ہاں ہنگامی حادثات کی صورت میں ہنگامی مسلم بلڈ بینک کا قیام جائز ہوگا، جیسا کہ مولانا امتیاز صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

۴۔ اکیڈمی کی طرف سے چوتھا سوال یہ ہے کہ "اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو، لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ہی ملتا ہو، اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو تو اس کا خون دینا واجب ہوگا یا مستحب یا صرف جائز؟"

اس کے جواب میں مقالہ نگار مشائخ کی طرف سے دو رائیں ظہور میں آئیں:

(الف) اس شخص پر خون دینا واجب ہے:

"ومن أحيا ها فكأنما أحى الناس جميعا "، مولانا شاہجہاں ندوی، مظاہر حسین، عبد الخالق، محمد ابوبکر، اکرام الحق، رضوان الحسن، ابصار احمد ندوی، مولانا محمد جمیل اختر صاحب نے مزید یہ بھی لکھا ہے: "لأن حفظ الحياة أعظم فى نظر الشارع من رعاية الحرمات "، اور مولانا محمد سلطان صاحب نے اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: "اذا تعارضت مفسدتان روعى أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما "

"ومن سقى شربة من الماء حيث لا يوجد فكانما أحي نفساً" (ابن ماجہ ۲۴۷۴) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد)۔

"صيانة النفس عن الهلا ک فر ض بقد ر الامكان "(البنایہ شرح الہدایہ ۱۳/ ۶۶) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

"انقاذ المسلم من الهلاک فرض كفاية "(مولانا وجیہ اللہ احسن)۔

جان بچانا ضروری ہے، اس لئے فرض عین ہے (مولانا ابوحماد، مولانا محمد سلطان، مولانا فرید احمد، مولانا محمد قمر الزماں، مولانا عبد الشکور، مولانا محمد احسن، مولانا محمد عظمت اللہ، مولانا محمد نصر اللہ، مولانا ابصار احمد)۔

" يجب اغاثة المضطر بانقاذه من كل ما يعرضه للهلاک من غرق أو حرق"(مولانا محمد عثمان)۔

"وينبغى أن يكون واجباً عند خوف الهلاک احياء للنفس "(البحر ۳/ ۲۲۳) (مولانا محمد آزاد بیگ)۔

"الا اذا لم يقبل الصبى غير ثدى أمه أو كان الأب عاجزاعن الاستيجار ولم يوجد له ظئر فحينئذ يجب على الأم ارضاعه" مولانا محمد فاروق دربھنگوی، محبوب فروغ، سید تاج الدین، مولانا یوسف داؤد نے اسی کے ہم معنی مجمع الانہر سے نقل کیا ہے۔

"وفى البزازية : خاف الموت جوعا، و مع رفيقه طعام ، أخذ بالقيمة منه قدر ما يسد جوعته ، وكذا يأخذ قدر ما يد فع العطش ،فان امتنع قاتله بلا سلاح "(شامی) (مولانا عابد الرحمٰن اور مفتی ابوحماد صاحبان)۔

"مالا يتم الواجب الا به فهو واجب " (روضۃ الناظر) (مولانا محمد مغفور، محمد فرقان)۔

"يوثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة" (مولانا اقبال محمد، خواجہ نظام الدین، محمد عنایت اللہ)۔

"أطعموا الجائع وعودوا المريض و فكوا العانى "(ابوداؤد)، مولانا محبوب فروغ، لکھتے ہیں: شارحین نے اس کو اضطراری حالت پر محمول کیا ہے، نیز حکم اطعام کو واجب قرار دیا ہے۔

"المحتاج اذا عجز عن الخروج يفترض على كل من يعلم حاله أن يطعم مقدار ما يتقوى به على الخروج و أداء العبادات "(عالمگیریہ)(مولانا محبوب فروغ)۔

واضح رہے کہ یہ وجوب کا قول اسی صورت میں ہے جب کہ اس خون دینے والے شخص کو خون دینے سے ضرر لاحق نہ ہوجیسا کہ مقالات سے ظاہر ہے۔

(ب)اس شخص پر خون دینا واجب نہیں مستحب ہے:

مولانا محمد فاروق، جسیم الدین، امانت علی، محمد ریاض، عبد الرزاق، ارشد علی، محمد عفان، عبد المنان، محمد نعمت اللہ، مولانا عبدالرزاق امروہہ، مولانا عبدالحکیم، مولانا ابصار احمد، مولانا ارشد علی رحمانی، مولانا قمر عالم اور مولانا عبدالحیٔ صاحبان نے مذکورہ صورت میں اس گروپ کے حامل شخص پر خون دینا مستحب قرار دیا ہے، مولانا نثار احمد، مولانا محمد افضل، مولانا محمد فاروق کشمیری اور مولانا امتیاز احمد صاحبان نے لکھا ہے: کیونکہ یہ خیر خواہی کی قبیل سے ہے، تعاون علی البر ہے، مولانا لطیف الرحمٰن اور مولانا شاہین جمالی صاحبان نے محض ایک عطیہ اور تبرع ہونے کے سبب غیر واجب قرار دیا ہے، اور مولانا محمد ذکوان، مولانا محمد انیس اور مولانا محمد ارشاد احمد نے اخلاقی اعتبار سے مستحب قرار دیا ہے، مولانا اشتیاق احمد صاحب نے جائز کہا ہے، کیونکہ واجب قرار دیا جائے تو وہ شخص حرج میں پڑسکتا ہے۔

مولانا عبدالرشید قاسمی اور مولانا بدر مجیبی ندوی صاحب نے اس لئے مستحب کہا ہے کہ نفس علاج ہی واجب نہیں ہے۔

مولانا یوسف حبیب اور مفتی جنید صاحبان نے لکھا ہے، نہ یہ مال متقوم ہے، نہ کھانے پینے کی اشیاء کی طرح ہے کہ مضطر کے لئے زبردستی لینے کی اجازت ہو۔

مولانا عبدالرزاق امروہہ نے لکھا ہے: محض جائز ہی ہے واجب نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالی نے اس کو دوسرے کی جان بچانے کے لئے مکلّف نہیں بنایا ہے۔

مولانا محمد ظفر عالم صاحب نے مستحب کی دلیل میں " يستعجل شفاؤك ،فيه وجهان "نیز واقعۂ عرنیین ،کا ذکر کیا ہے۔

مولانا عبدالرزاق صاحب بھوپالی لکھتے ہیں: صاحب خون کی صوابدید پر موقوف ہے، اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ اس شخص کے خون دینے کے بعد وہ شخص بچ جائے گا، آگے لکھتے ہیں: اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر ایک شخص مرنے کے قریب ہے اور اس کو کہا جائے کے تو کسی دوسرے زندہ شخص کا گوشت کھالے، یا

خود اپنے بدن کا گوشت کاٹ کر کھالے تو اس کو یہ جائز نہیں کہ وہ ایسا کرے، بس اس طرح اگر اپنی مرضی سے خون عطیہ کردے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے ساتھ زبردستی نہ کی جائے۔

اس بارے میں عرض یہ ہے کہ فقہاء نے طب کے باب میں غلبۂ ظن کی بنا پر ہی تداوی بالمحرمات کی اجازت دی ہے ، نیز گوشت اور خون میں فرق ہے، فقہاء احناف کے نزدیک مضطر کے لئے کسی انسان کے گوشت کھانے کی اجازت نہیں ہے، مگر اس حالت میں انسان کا خون چڑھانے کی اجازت مفتیان کرام نے دی ہے، مولانا محمد عثمان، مفتی فرید اور مولانا وجیہ اللہ احسن صاحب نے اپنے مقالہ میں ''الجامع لأحکام القرآن للقرطبی'' سے یہ عبارت نقل کی ہے: ''**ولا خلاف بين أهل العلم متأخريهم و متقدميهم فی وجوب رد مهجة المسلم عند خوف الذهاب و التلف بالشیٔ الذی لا مضرة فيه علی صاحبه** ''، مصنف علیہ الرحمۃ نے اس سے پہلے یہ بھی ذکر کیا ہے: ''**وذلک عند أهل العلم اذا لم يكن هناک الا واحد لا غير ؛فحينئذ يتعين عليه الفرض ،فان كانوا كثيراً أو جماعة و عددا، كان ذلک عليهم فرضا علی الكفاية،والماء فی ذلک وغيره مما يرد نفس المسلم و يمسكهاسواء**''(۲۲۶/۲)۔

لھذا ان فقہی عبارات کی روشنی میں راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو، اور اس کے خون کے گروپ کا حامل موقع پر ایک ہی شخص موجود ہے، جسے بقدر ضرورت اپنا خون دینے سے کوئی معتد بہ ضرر نہیں ہوگا، تو اس پر اپنا خون دے کر اس مضطر کی جان بچانے کی کوشش کرنا واجب ہوگا۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

(سوال نمبر ۵)

مفتی رجیب احمد☆

اسلامک فقہ اکیڈمی کے چوبیسواں فقہی سمینار میں زیر بحث موضوع ''اعضاء انسانی کا عطیہ'' کے مسئلے پر سوال نمبر ۵ ''عطیہ جگر'' کا عرض مسئلہ کی ذمہ داری احقر کو دی گئی ہے۔ فقہ اکیڈمی کے توسط سے کل ۷۰ مقالات موصول ہوئے۔

سوال نمبر (۵) کا تجزیہ کرنے سے یہاں دو مسئلے سامنے آتے ہیں جن پر مقالہ نگار حضرات نے اپنی اپنی رائیں تحریر کی ہیں:

(۱) مردہ انسان کے جگر کا عطیہ کسی مضطر کے لئے۔ (۲) زندہ انسان کے جگر کا عطیہ۔

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس میں علماء کرام کے دو رائے ہیں: (الف) مطلقاً عدم جواز کا۔ (ب) مشروط جواز کا۔

عدم جواز کے قائلین مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی عبدالحکیم قاسمی، مفتی یوسف بن داؤد، مفتی جسیم الدین قاسمی، مولانا فاروق بن عبداللہ کرشن پوری، مفتی محمد عظمت اللہ ہدایۃ اللہ میر رحیمی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مفتی لطیف الرحمٰن، مولانا عبدالخالق ندوی، مولانا سید تاج الدین، مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا محمد نعمت اللہ قاسمی، مفتی محمد سلطان کشمیری، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا محمد ذکوان بن مولانا عمران، خواجہ نظام الدین یوسفی، مفتی افتخار ولنوی، مفتی عبدالمنان، مولانا عنایت اللہ میر رحیمی، مفتی محمد ارشاد پالن پوری، مولانا عبدالحی مفتاحی، مفتی عبدالرزاق خاں صاحب، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی فرید احمد بن رشید کاوی، مولانا وجیہ اللہ احسن، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی۔

☆ جامعہ کوثریہ، آلوا، کیرالہ۔

عدم جواز کے قائلین کے دلائل:

اکثر مقالہ نگار حضرات نے مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے۔

(الف) ابوداؤد کی روایت ہے: "کسر عظم المیت ککسر عظم الحی" (ابوداؤد: ۵۵۸)۔

(ب) اعلاء السنن میں ابن عباسؓ سے منقول ہے: "ان المشرکین أرادوا أن یشتروا جسد رجل من المشرکین فأبی النبیؐ أن یبیعه قال ابن هشام: بلغنا أنهم بذلوا فیه عشرة آلافٍ" (اعلاء السنن، ج ۴/۱۳۰) اس روایت کو مفتی فرید احمد بن رشید کاوی نے اپنے مقالہ میں بطور استدلال پیش کیا ہے۔

مفتی جسیم الدین قاسمی نے "لعن الله الواصلة والمستوصلة" سے بھی استشہاد کیا ہے اور موت کے بعد اعضاء کی منتقلی وعطیہ اعضاء کو مثلہ میں شمار کیا ہے اور حرمت مثلہ کی حدیث پیش کی ہے۔

عدم جواز کے اکثر حضرات نے کتب فقہیہ وشروح احادیث کی عبارتوں کو بھی بطور استدلال پیش کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) "کسرعظم المیت ککسرعظم الحی" کے حدیث کے تحت مرقات کے حوالہ سے اس کی تشریحی عبارتیں پیش کی ہیں: "قوله: ککسر الحی یعنی فی الاثم کمافی روایة قال الطیبی فیه اشارة الی أنه لایهان میتاً کما لایهان حیاء، قال ابن مالک: الی أن المیت یتألم وقال ابن حجر: ومن لازمه أنه یستلذّ بما یستلذّ به الحی وعن ابن مسعود قال: أذی المومن فی موته کأذاه فی حیاته" (مرقات ۴/۱۹۵)۔

(ب) "والآدمی محترم بعدموته علی ماکان علیه فی حیاته حکماً، یحرم التداوی بشیئ من الآدمی الحیٔ اکراماً له فکذلک لایجوز التداوی بعظم المیت قال صلی الله علیه وسلم: کسرعظم المیت ککسر عظم الحی" (شرح الکبیر ۱/۶۹)۔

(د) "مضطرلم یجد میتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع یدی وکلها أو قال: اقطع قطعة منی وکلها لایسعه أن یفعل ذلک ولایصح أمره کما لایسعه للمضطر أن یقطع قطعة من لحم نفسه فیاکل" (تاتارخانیہ ۳/۴۰۴)۔

مولانا محمد فاروق کرشن پوری، مفتی اعجاز الحسن بانڈے قاسمی نے "شعرالانسان والانتفاع به أی لم یجز بیعه والانتفاع به لأن الآدمی مکرم غیرمبتذل فلا یجوز أن یکون شیئ من أجزائه مهاناً مبتذلاً" (فتح القدیر ۶/۳۹۰) سے استدلال کرتے ہوئے عدم جواز کو ترجیح دی ہے، اسی طرح مفتی عمر امین الہی نے "ان حرمة الحی

آکد من حرمة المیت"(المجموع:۹/۴۲) سے بھی استدلال کیا ہے۔

عدم جواز کے قائین میں سے اکثر حضرات نے ان نصوص کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے نقطۂ نظر سے استفادہ کرتے ہوئے چند عقلی اور نظری دلائل بھی قائم کئے ہیں۔

چنانچہ مولانا محمد عظمت اللہ ہدایت اللہ میر رحیمی نے اپنے مقالہ میں رقم کیا ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ طریقہ علاج پایا گیا تو اس کا ایک نقد نتیجہ یہ ہوگا کہ غریب انسان کے اعضاء بکاؤ مال کی طرح بازار میں بکا کریں گے اور اس کام کے لئے بہت سے انسانوں کے قتل کا ایک بازار گرم ہو جائے گا۔ یہی رائے مولانا نعمت اللہ قاسمی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری کی بھی ہے۔ آخر الذکر نے اپنے دار الافتاء کا ایک استفتاء بھی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے جس میں ایک شخص نے مال کے خاطر اپنے ایک عضو کو پیش کیا ہے اور اس مال کے مصرف کے بارے میں استفتاء کیا ہے، نیز مولانا سید تاج الدین، مفتی امتیاز ولنوی نے سدًّ اللذرائع کے طور پر بھی منع کیا ہے اسی طرح مفتی ارشاد پالنپوری، مولانا آزاد بیگ قاسمی نے ایک زندہ شخص کے جگر کو عطیہ کرنا کسی مضطر کے لئے مفضی الی الموت ہونے کی بنا پر حرام قرار دیا ہے جب کہ مردہ شخص کے بارے میں صراحۃ کوئی حکم بیان نہیں کیا ہے، البتہ عدم جواز کے دلائل کو نمبر وار لکھ کر اس کا تجزیہ کرنے کے بعد خلاصہ کے طور پر لکھا ہے کہ جسم انسانی میں حق اللہ اور حق العبد دونوں شامل ہیں اور کل جسم میں یقیناً حق اللہ غالب ہے جب کہ اطراف میں بعض صورتوں میں حق العبد مقدم ہے اور بعض صورتوں میں حق اللہ مقدم ہے، نیز مولانا خورشید احمد اعظمی نے بھی طرفین کے دلائل پر تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے اور حرمت کو ہی ترجیح دی ہے۔

اسی طرح مولانا قمر الزماں ندوی اور مفتی محمد عفان منصور پوری نے اپنے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ انسان کا اپنے اعضاء کو رضا کارانہ طور پر یا بالقیمت کسی دوسرے کو دینا یہ نہ تو اسلامی شریعت کے مطابق ہے نہ دیگر مذاہب میں اس کی اجازت ہے، اور عام حکومتوں کے قوانین میں بھی اس کی گنجائش نہیں، اس لیے کسی زندہ انسان کا کوئی عضو کاٹ کر دوسرے انسان میں لگا دینا اس کی رضامندی سے بھی جائز نہیں، اسی طرح مردہ انسان کے عضو کو کاٹ چھانٹ کرنا بھی ناجائز ہے، اس میں رضامندی اور وصیت سے بھی کام نہیں چل سکتا ہے، تقریباً یہی بات مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی نے بھی ذکر کی ہے۔ اسی طرح مفتی جنید بن محمد پالنپوری اور مولانا حبیب بن یوسف قاسمی نے فقہ اکیڈمی انڈیا کے دوسرے فقہی سمینار دہلی منعقدہ ۱، ۲، ۳/اپریل ۱۹۸۹ء کے تجاویز کی آخری قرارداد سے بھی استدلال کیا ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوندکاری کے لئے استعمال کئے جائیں جس کو عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے تو ازروئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جا سکتا ہے اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابل اعتبار نہیں ہے۔

مولانا عبدالرزاق قاسمی امروہوی نے فریقین کے دلائل سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے وجوہ ترجیح کے طور پر بیان کیا ہے کہ جواز پر نہ تو کوئی نص صریح ہے اور نہ ہی ایسے تداوی کے لئے جس سے اہانت انسانیت لازم آتا ہے،ہم مکلّف نہیں ہیں، کیونکہ اعضاء اللہ کی امانت ہیں جب کہ علاج کے لئے دوسرے مصنوعی اعضاء کا دروازہ کھلا ہوا ہے،تقریباً یہی بات مولانا مفتی عفان منصور پوری نے بھی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ضرورت کے دائرے کو ضرورت سے زیادہ وسیع کر کے اس کی اجازت دیدی گئی تو انسانی لاش کے ساتھ بڑا ناروا سلوک ہونے لگے گا۔

مولانا ابصار احمد ندوی و مولانا عنایت اللہ میر رحیمی نے لکھا ہے کہ ''**یعذب اللحم متصلاً بالروح والروح متصلاً بالجسد**'' کی رو سے حیات برزخی کو جسم سے متصل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نقل اعضاء کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔اسی طرح مولانا عبدالخالق ندوی رقمطراز ہیں کہ جہاں جہاں شریعت نے حالت اضطرار میں مردار کھا کر جان بچانے کی اجازت دی ہے وہاں مردہ انسان مراد نہیں ہے بلکہ غیر انسانی میتہ مراد ہے،لہٰذا اس سے استدلال کر کے مردہ انسان کے اعضاء کی پیوندکاری سے علاج کی ہرگز گنجائش نہیں نکل سکتی۔مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے جگر کو زندگی میں اعضاء رئیسہ میں شمار کیا ہے جس کا نقل مفضی الی الموت ہوگا،اور فتاویٰ رحیمیہ کی بنیاد پر بعد الموت وصیت کو باطل قرار دیا ہے، کیونکہ موصیٰ لہ کے لئے فقراء و مساکین یا معین شخص ہونا ضروری ہے۔خواجہ نظام الدین یوسفی،مولانا وجیہ اللہ احسن نے لکھا ہے کہ زندگی میں زندہ انسان کے اعضاء کی منتقلی قتل نفس کے مترادف ہے اور بالکلیہ موت میں جگر کارآمد نہیں رہتا، البتہ دماغی موت کی حالت میں منتقلی کا عمل ممکن ہے،لیکن شریعت کی رو سے دماغی موت سے موت کا تحقق نہیں ہوتا، نیز معاصر اطباء کا بھی اس کے مردہ ہونے میں اختلاف ہے،لہٰذا جائز نہ ہوگا۔

مولانا مفتی عفان منصور پوری نے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ ایک انسان کی صحت یابی کے لئے دوسرے کی صحت سے کھیلا جائے، یہ کیسی دانش مندی ہوگی، اور یہ کہنا کہ عورت کا پیٹ چاک کرنے کی بعض اوقات فقہاء نے اجازت دی ہے وہ اس وجہ سے کہ جب تک بچہ عورت کے پیٹ میں ہے وہ اس کا جزء بدن ہے،لہٰذا اس مسئلہ خاص کو اس پر قیاس کرنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا۔

جن حضرات نے اسکو جائز قرار دیا ہے،ان کی آراء حسب ذیل ہیں:

قائلین جواز کے اسماء گرامی ان کی رائیں اور دلائل:

مجوزین حضرات کے اقوال پر غور کرنے سے مسئلہ کے تین پہلو نظر آتے ہیں:

(۱) مردہ انسان کا جگر کسی متعین شخص کو یا عضو کو محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دینا جائز ہے۔

(۲) مردہ انسان کا جگر کسی متعین شخص کو عطیہ کرنا جائز ہے، طبی ادارہ یا بنک کو نہیں۔

(۳) مردہ اور زندہ دونوں کا جگر کسی متعین شخص کو دینا جائز ہے۔

پہلے نقطہ نظر کے قائلین کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی ابوحماد غلام رسول منظور قاسمی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی نثار احمد کودھروی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مفتی ابوبکر قاسمی، مفتی شبیر یعقوب دیولوی، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی اکمل یزدانی قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی عابدالرحمٰن بجنوری، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد منت اللہ قاسمی، مولانا محمد فرقان فلاحی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا فیاض احمد محمود برمارے حسینی، مولانا محمد عمران بن حنیف، مفتی محمد نصر اللہ ندوی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا طارق قاسمی، مفتی محمد قمر عالم قاسمی، مفتی آفتاب عالم غازی، مفتی عمر امین الٰہی، مفتی محمد رمضان علی فرقانی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا ارشد علی رحمانی۔

جہاں تک دلائل کا تعلق ہے تو اکثر مقالہ نگار حضرات نے **"الضرورات تبيح المحظورات، والحاجة قدتنزّل منزلة الضرورة عامة كانت أوخاصة، والمشقة تجلب التيسير"** کے فقہی اصول وقواعد سے استدلال کیا ہے۔

نیز مولانا بدر احمد مجیبی نے لکھا ہے: **"والأصل في هذه المسألة أن من ابتلى ببليتين وهما مساويتين يأخذ بأيهما شاء وان اختلفا يختار أهونهما، لأن مباشرة الحرام لاتجوز الا للضرورة ولاضرورة في حق الزيادة"** (تبیین الحقائق باب شروط الصلاۃ) اسی طرح سے اکثر مقالہ نگار حضرات نے احناف وشوافع کے کتب فقہیہ کے حوالے بھی ذکر کئے ہیں۔

"حامل ماتت فاضطرب في بطنها ولدفان كان غالب الظن أنه ولدحي وهوفي مدة يعيش غالباً فانه يشق بطنها، لأن فيه احياء الآدمي بترك تعظيم الآدمي وترك التعظيم أهون من مباشرة سبب الموت" (تحفۃ الفقہاء ۳/۳۴۵-المحیط البرہانی ۵/۲۵۲)۔

ملاحظہ ہو مقالہ مولانا بدر احمد مجیبی ومفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی نثار احمد کودھروی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی۔

اسی طرح سے مقالہ نگار حضرات نے اس عبارت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں اضطرار کے وقت حرام اشیاء کا

تناول یا حرام اشیاء سے علاج کا جواز بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ مولانا اعجاز الحسن باندے نے لکھا ہے کہ "أكل خرء الحمام فى الدواء لابأس به" (فتاویٰ ہندیہ ۵/۳۵۵)، اسی طرح مولانا ارشد علی رحمانی نے لکھا ہے: "يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوى اذا أخبره طبيب مسلم" (فتاویٰ ہندیہ ۵/۲۵۵)۔

اسی طرح شوافع کی کتابوں میں ایک مسئلہ ہے مضطر کا میت کو کھانے کا اس سے بھی بعض حضرات نے استدلال کیا ہے۔ جیسا کہ مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی نے لکھا ہے: "أجاز الشافعية للمضطر أكل آدمى ميت اذا لم يجد ميتة غيره لأن حرمة الحى أعظم من حرمة الميت" (الفقہ الاسلامی وأدلتہ)، نیز مولانا طارق انور قاسمی اور راقم الحروف نے بھی کتب شافعیہ سے استدلال کیا ہے، "مغنی المحتاج ۱/۱۹۱، حاشیۃ الشروانی ۲/۱۲۵" میں مذکور ہے۔ "انه لولم يجدبما يصلح جازبعظم الآدمى" نیز مفتی عابد الرحمٰن بجنوری نے لکھا ہے: "وقال الشافعى وبعض الحنفية يباح وهوالأولىٰ لأن حرمة الحى أعظم" (المغنی)۔

نیز چند مقالہ نگار حضرات نے معاصر علماء کرام کے اعضاء کی پیوندکاری سے متعلق جو تحقیقات ہے اس سے بھی استدلال کیا ہے، چنانچہ مولانا مفتی عبد الرشید قاسمی نے "الفقہ الاسلامی" کی عبارت بھی پیش کی ہے: "يجوز عندالجمهور نقل بعض أعضاء الانسان لآخر كالقلب والعين والكلية لآن الحى أفضل من الميت" (الفقہ الاسلامی)۔

جواز کے قائلین حضرات جن کا تفصیلی ذکر ابھی گزرا ہے انہوں نے قرآن وحدیث وآثار واقوال ائمہ وقواعد فقہیہ سے استدلال کرنے کے بعد عدم جواز کے قائلین کے قائم کردہ دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ عقلی اور نظری دلائل بھی قائم کئے ہیں۔ چنانچہ مفتی ارشد علی رحمانی نے "كسرعظم الميت" والی حدیث کو اس کے راوی سعد بن سعید الانصاری کو بقول ابن حزم ضعیف لکھا ہے، علاوہ ازیں اس کو عام حالات پر محمول کیا ہے، اسی طرح مفتی توقیر بدر قاسمی، مفتی غلام رسول منظور قاسمی لکھتے ہیں کہ اہانت یا احترام انسانیت کی رکاوٹ کے نظریہ کو آج کی جدید میڈیکل کی ترقی نے تبدیل کردیا ہے کیونکہ وہ عرف پر مبنی ہے اور عرف بدلتا رہتا ہے، مولانا مفتی عمر امین الٰہی نے لکھا ہے کہ پیوندکاری کا معاملہ مثلہ کے دائرہ میں نہیں آتا ہے، کیونکہ مثلہ حسد اور جنگی انتقام گیری کی بنیاد پر ہوتا ہے چنانچہ قصاص کو یا خود اپنے آپریشن کو کوئی شخص مثلہ قرار نہیں دیتا، اسی طرح جب خون کا عطیہ کرنا جائز ہوگا تو پھر دیگر اعضاء کا عطیہ کیونکر درست نہ ہوگا؟

دماغی موت کے بعد جگر کا عطیہ کرنا کسی متعین مضطر شخص کے لئے یا کسی ایسے طبی ادارہ کو دینا جو مضطر شخص کے لئے فراہم کرتا ہو جائز ہے، کیونکہ زندہ انسانوں کا قدر واحترام بہر حال مردہ کے اعضاء سے زیادہ ہے، مذکورہ رائے کا اظہار مفتی محمد منت اللہ قاسمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عابد الرحمٰن بجنوری، مولانا رمضان علی فرقانی، مولانا طارق انور قاسمی کیرلا، مفتی محمد احسن عبد الحق ندوی، مفتی عبد الرشید قاسمی، مولانا فرقان علی فلاحی، مولانا قمر عالم قاسمی نے کیا ہے۔

مؤخرالذکر نے بینک کے قابل اعتماد ہونے کی بھی شرط لگائی ہے، اسی طرح مفتی اکمل یزدانی قاسمی نے مخصوص حالات میں جواز اور عمومی حالات میں عدم جواز کی رائے اختیار کی ہے، اسی طرح مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی لکھتے ہیں کہ عام حالات میں عطیہ کرنا جائز ہے اور بعض ناگہانی حالات میں واجب ہے، اسی طرح طبی ادارہ کو بھی دینا درست ہوگا اور تبرعانہ ملنے پر خریدنا بھی درست ہوگا، البتہ بیچنا ممنوع قرار دیجائے گا۔ الضرورات تبیح المحظورات کی بنا پر۔

نیز مولانا فرقانی فلاحی لکھتے ہیں کہ میت کے اعضاء کو وفات کے فوراً بعد اس کا عطیہ کرنا اور بینک کو دینا جائز ہے، کیونکہ امور شریعت اسلامیہ متوقعہ کو امور واقعہ کا درجہ دیتی ہے "جعل الشرع المتوقع کالواقع" (قواعد الاحکام فی مصالح الانام، ۱/۱۸۷) مفتی شبیر یعقوب دیولوی نے غیر مسلم کے اعضاء کو بینک میں محفوظ رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر:

کسی مردہ شخص کا کسی مضطر کے لئے عطیہ جائز ہے، لیکن بینک کے لئے نہیں، اس کے قائلین مندرجہ ذیل حضرات ہیں: مولانا افضل حسین قاسمی، مولانا محمد انیس ندوی، مفتی اعجاز الحسن بانڈے قاسمی، مفتی نثار احمد کودھروی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی اکرام الحق ربانی ندوی، راقم الحروف، مولانا عثمان غنی بستوی، مؤخرالذکر لکھتے ہیں کہ زندگی میں جائز نہیں کیونکہ یہ نعمت کی ناشکری، تغییر خلق اللہ اور اخلال نفس میں داخل ہے، البتہ متعین شخص کے لئے بعد از اجازت یا ورثاء کی رضامندی پر جائز ہوگا لیکن بینک میں دینا حد درجہ تذلیل وتوہین ہے، اسی طرح مفتی توقیر بدر قاسمی، مفتی محمد فاروق دربھنگوی، مولانا عبدالشکور قاسمی مہاراشٹر، مولانا اکرام الحق ربانی ندوی، مفتی عمر امین الٰہی کی رائے یہ ہے کہ مردہ انسان کا عطیہ کرنا ایک مضطر شخص کے لئے ایک ضرورت ہے اور "الضرورات تتقدر بقدرها" فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے، بنابریں بینک قائم کرنا اس ضرورت کے تحت نہیں آتا ہے لہٰذا یہ جائز نہیں ہوگا۔

مولانا جمیل اختر جلیلی نے لکھا ہے کہ عطیہ کی گنجائش ایک ضرورت کی بنیاد پر ہے جو عطیہ کنندہ کی تعیین کی صورت میں پائی جاتی ہے اور بینک کو دینے میں عدم تعیین کی وجہ سے ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، پس جائز نہ ہوگا۔ جبکہ مفتی محمد ظفر عالم ندوی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مولانا نصراللہ ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی غلام رسول منظور قاسمی، مفتی ابوبکر قاسمی نے چند شرائط کے ساتھ متعین شخص کے لئے جائز مانا ہے، لیکن بینک یا طبی ادارہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

مفتی غلام رسول منظور قاسمی نے زندگی میں اس کی اجازت اور موت کے بعد ورثاء کی اجازت یا امیر المسلمین کی اجازت کو معتبر مانا ہے جب کہ مفتی ابوبکر قاسمی نے امیر کے بجائے حکومت وقت کی اجازت کو معتبر مانا ہے، مولانا آفتاب غازی نے سات شرائط کا ذکر کیا ہے۔ مذکورہ شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی لگائی ہے کہ عطیہ کنندہ شرعاً قتل کا مستحق مجرم نہ

ہو کہ اس کی زندگی کو بڑھانا جائز نہ ہوگا۔

اہل جواز اور عدم جواز حضرات کی رائیں اور ان کے دلائل پر غور کرنے سے خلاصہ بحث یہ نکلتا ہے کہ اہل جواز کی رائے ہی راجح معلوم ہوتی ہے۔ احقر کی رائے بھی یہی ہے کیونکہ یہ ایک غیر منصوص مسئلہ ہے نیز قدیم وجدید فقہاء کے درمیان مختلف فیہ بھی رہا ہے، چنانچہ ایک مضطر کے لئے انسانی میت کے جسم کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر جان بچانا فقہاء احناف کی معتبر کتابوں میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، مسئلہ ہذا کو ہی فقہاء شوافع نے جائز قرار دیا ہے، جب کہ وہ میت نبی نہ ہو تو کیوں نہ ہم اعضاء وجگر کے عطیہ کے مسئلہ پر ترقی یافتہ طب کی دنیا پر نظر رکھتے ہوئے مسلک شوافع کے جواز کے پہلو کو اپنائیں، عرف وعادت کا خیال کرتے ہوئے متاخرین فقہاء کرام نے ایک مسلک کو چھوڑ کر دوسرے مسلک پر فتویٰ دیا ہے جس کی بے شمار مثالیں ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔

آخری بات:

ایک قابل غور پہلو یہاں یہ ہے کہ کیا ایک زندہ انسان کا اپنی زندگی میں اپنا جگر کسی مضطر کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

اس پہلو کو ہمارے تمام ہی مقالہ نگار نے بلکہ خود اکیڈمی نے بھی اپنے سوال میں صرف نظر کر دیا ہے، حالانکہ یہ ایک وقوع پذیر پیش آمدہ مسئلہ ہے کہ ایک زندہ شخص کا جگر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر کے دوسرے مضطر شخص کو لگایا جاتا ہے اور ایسا ممکن ہے اور طب کی دنیا میں ہوتا ہے اور ہو بھی رہا ہے، اس کے کامیاب آپریشن اور پیوندکاری خود ہمارے ہندوستان میں کئی جگہ ہوا اور ہو رہا ہے جس کی پوری تفصیل راقم الحروف نے اخباری شواہد وطبی رپورٹ کے ساتھ اپنے مقالہ میں رقم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماہرین کا کہنا ہے کہ جگر کا ۷۰ فیصد حصہ منتقل کیا جاسکتا ہے اور چار چھ ہفتے میں دونوں کا جگر اپنی اصلی حجم میں لوٹ آتا ہے اور پہلے کی طرح کام کرنے لگتا ہے اور اس آپریشن سے عطیہ کنند وعطیہ کنندہ میں کامیابی ظن غالب اور طبی رپورٹ کے مطابق سو فیصدی ہے جس کی تفصیلی رپورٹ راقم الحروف نے اپنے مقالہ کے ساتھ پیش کیا ہے، اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے چند مقالہ نگار حضرات جیسے مفتی غلام رسول منظور قاسمی، مفتی ارشد علی رحمانی، مفتی رضوان الحسن مظاہری جنہوں نے زندگی میں اعضاء غیر رئیسہ میں منتقلی کو جائز قرار دیا ہے تاکہ عطیہ کنند کو کوئی نقصان ہو، لہذا جگر کو بھی اعضاء غیر رئیسہ میں شمار کرنے میں جواز کا پہلو نظر آتا ہے۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

(سوال نمبر ۶، ۷)

مولانا محمد ظفر عالم ندوی ☆

"نحمده ونصلی علی رسوله الكريم امابعد! "إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وماأهلّ به لغير الله فمن اضطر غير باغ ولاعاد فلا اثم عليه" (سورۂ بقرہ: ۱۷۳)۔

حضرات! اعضاء انسانی سے متعلق سوالنامہ کے سوال نمبر ۶ اور ۷ کے جوابات کا عرض مسئلہ راقم کے ذمہ کیا گیا ہے، تقریباً ۷۲ اصحاب فقہ وفتاویٰ کے مقالات ہمیں موصول ہوئے ہیں جن کی آراء، دلائل اور بحثیں اس اہم نشست میں ان شاء اللہ پیش ہوں گی لیکن اس سے قبل سوالات ذہن میں تازہ کرلئے جائیں تاکہ جوابات کے انطباق میں سہولت ہو۔

۶، ۷- بینائی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اسی لئے قرآن مجید میں بطور احسان کے قوت بصارت کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے، نابینا ہونے کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ابھی تک کی تحقیق کے مطابق اس کا علاج نہیں ہوسکتا، لیکن بعض صورتوں میں اس کا علاج ممکن ہے کہ ایک انسان کی آنکھ کے قرینہ کی اس نابینا کے حلقہ چشم میں پیوندکاری کردی جائے! اس طرح اس کو بینائی حاصل ہوسکتی ہے، ایک زندہ شخص کی آنکھ سے بھی اسے حاصل کیا جاسکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی چند گھنٹے کے اندر مردہ سے قرینہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

الف: سوال یہ ہے کہ اگر کوئی زندہ شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی آنکھ کا قرینہ عطیہ کرے اور سوچے کہ میرا کام تو ایک آنکھ سے چل سکتا ہے اس سے ہمارے دوسرے بھائی کی آنکھیں بھی روشن ہوجائیں گی تو کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟

ب: کیا کسی شخص سے قرینہ اس کی موت کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے تاکہ کسی متعین شخص کو بینائی فراہم کیا جاسکے؟

ج: آج کل اس مقصد کے لئے آئی بینک بھی قائم ہیں جس میں رضاکارانہ طور پر آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے اور جس کو ضرورت درپیش ہو آئندہ اس کے حق میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، کیا ایسے بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا

☆ استاد کلیۃ الشریعۃ واصول الدین، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

عطیہ دیا جاسکتا ہے؟

۷۔ پانچویں اور چھٹے سوال میں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ اگر مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ حاصل کرنی جائز ہوتو اس سلسلہ میں کس کی اجازت معتبر ہوگی خود اس شخص یا اس کے ورثہ کی یا دونوں کی؟

یعنی مردہ کی وصیت کافی ہوگی یا صرف ورثہ کی اجازت دینا کافی ہوگا یا مردہ کی وصیت کے ساتھ ساتھ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف سے آمادگی بھی ضروری ہوگی؟

حضرات! تمام مقالوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ سوال ۶ کے تمام اجزاء اسی طرح سوال ۷ کے جوابات میں تین طرح کی آراء سامنے آئی ہیں:

(۱) تمام شقوں میں عدم جواز (۲) تمام شقوں میں جواز (۳) کسی شق میں جواز اور کسی میں عدم جواز، تمام مقالات میں جو بھی آراء پیش ہوئی ہیں ان کے دلائل میں کافی حد تک یکسانیت ہے، ان دلائل کو ہم اجمالی طور پر پیش کریں گے، پہلے آراء ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) پہلی رائے:

عدم جواز کے قائلین درج ذیل حضرات ہیں:

مفتی عبدالرزاق قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی فرید احمد بن رشید کاوی، مفتی لطف الرحمان فلاحی، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی سید تاج الدین، مولانا عبدالحئ مفتاحی، مفتی امتیاز ولنوی گجرات، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مفتی یوسف بن داؤد ایلوی، مفتی عبدالرزاق خان، مولانا عبدالحکیم قاسمی، مفتی عبدالمنان، مولانا عظمت اللہ ہدایت اللہ رحیمی، مفتی ابصار احمد ندوی، مولانا محمد عنایت اللہ میر رحیمی کشمیری، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مولانا فاروق بن عبداللہ، مولانا محمد ذکوان بن عمران، مفتی جنید بن محمد پالن پوری، مولانا عبدالخالق ندوی رامپوری۔

عدم جواز کے قائلین نے عام طور پر درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

(۱) ''ولقد کرمنا بنی آدم وحملنا ہ فی البر والبحر ورزقنا ھم من الطیبات وفضلنا ھم علی کثیر ممّن خلق تفضیلا'' (سورۃ الاسراء/۷۰)۔

(۲) ''إنّ السمع والبصروالفؤاد کل اولئک کان عنه مسؤلا'' (سورۂ بنی اسرائیل/۳۶)۔

(۳) ''قل اللھم مالک الملک تؤتی المُلک مَنْ تشاء وتنزع الملک ممن تشاء'' (سورۂ آل

عمران/۲۶)۔

(۴)"لا تلقوا بأيديكم إلىٰ التهلكة...."الآية (بقرة/۱۹۵)۔

(۵)" ولا تقتلوا أنفسكم إنَّ اللّٰهَ كان بكم رحيماً" (سورۂ نساء/۲۹)۔

(۶)"ولآمرنّهم فليغيرنَّ خَلْقَ اللّٰه...."الآية.

(۱)"الذين يخنق نفسه يخنقها فى النار والذى يطعنها يطعنها فى النار"(بخاری کتاب الجنائز)۔

(۲)"وقال عليه الصلوة والسلام "لعن اللّٰه الواصلة والمستوصلة"(مسلم)۔

(۳)"لعن اللّٰه الواشمات والمتمصمات والمتفلجات للحسن المتغيرات خلق اللّٰه"

(۴)"لماهاجر النبى صلى الله عليه وسلم إلىٰ المدينة هاجر اليه الطفيل بن عمر والدوسى وجهاجر معهرجل من قومه فاجتووا المدينة فمرض فجزع فأخذه مشاقص له فقطع بها براجمه فشخبت يداه حتى مات فرآه الطفيل بن عمرو فى منامه فراه وهيئته، حسنة وراه مخطيا يديه فقال له ماصنع بكک ربک فقال غفرلى بهجرتى إلىٰ نبيّه فقال له مالى أراک مخطيا يديک؟؟ قال لى لن نصلح منک ماأفسدت الخ"(مسلم ج:۱/۷۴)۔

(۵)"كسر عظم الميت ككسره حيّا"(شرح سیر الکبیر ۱/۸۹،الموطأ ص:۶۰)۔

(۶)"قال فى درالمختار(ص۴۸۸)وإن قال له آخر إقطع يدى وكلها لا يحل لأن لحم الانسان لا يباح فى الاضطرار وقال فى البحر ولا يأكل لمضطر طعام مضطر آخر وينشأ من بدنه، وقال فى البدائع،أمّا نوع الذين لا يباح ولا يرخص بالاكراه اصلا فهو قتل المسلم بغير حق سواء كان الاكراه نا قصا أوتامّاً وكذا قطع عضو"(ص/۱۸)۔

(۷)"وقال الإمام النووى "ولا يجوز أن يقطع من معصوم غيره بلا خلاف،وليس للغير أن يقطع من أعضائه شيئا ليد فعه إلىٰ المضطر بلا خلاف صرح به إمام الحرمين والأصحاب ، وقال صاحب مغنى المحتاج"ويحرم جزء ماعلى شخص قطعه أى بعض نفسه لغيره من المضطرين لأن قطعه لغيره ليس فيه قطع البعض لا ستبقاء الكل،كما يحرم على مضطر أيضا أن يقطعه لنفسه قطعه من حيوان معصوم"(کلھاماٴخوذۃ من أحکام الجراحۃ الطبیۃ ۳۶۶-۳۷۰)۔

(۷)"لا يجوز بيع شعور الانسان ولا الإنتفاع بها لأن الأدمى مكرم لا مبتذل فلا يجوز أن يكون شيئً من أجزائه مهانا ولا مبذلاً" (ھدایہ کتاب البیع)۔

(۹)”یحرم نقل عضومن إنسان حتی یعطل زوالہ ووظیفۃ أساسیہ فی حیاتہ وإن لم تتوقف سلامۃ أصل الحیاۃ علیھا کنقل قرنیۃ العینین کلتیھما“(موسوعۃ الفقہ الاسلامی)۔

(۱۰)”کون الموصی بہ قابلا للتملیک بعد موت الموصی بعقد من العقود مالا أو نفعاً“ (درمختار مع شامی، ج:۱۰/۳۳۸)۔

(۱۱) ”والآدمی محترم بعد موتہ علی ماکان فی حیاتہ فکما لایجور التداوی بشیئٍ من الآدمی الحی إکراماً لہ فکذالک لا یجوز التداوی بعظم المیتۃ“ (شرح الکبیر،۱/۹۲)۔

ان فقہی نصوص کے علاوہ اور بھی عقلی دلائل دیئے گئے ہیں۔

دوسری رائے:

دوسری رائے جواز کی ہے جس کے قائلین درج ذیل حضرات ہیں:

مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی حماد غلام رسول قاسمی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی نثار احمد گودھری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی، مفتی فرید احمد بن رشید احمد، مفتی شبیر یعقوب، مولانا توقیر بدر قاسمی، مولانا مفتی جسیم الدین قاسمی، مفتی اکرام الحق ربانی ندوی، مفتی منت اللہ قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی فیاض احمد محمود حسینی شافعی، مولانا قمر عالم قاسمی، مولانا ارشد علی رحمانی۔

مولانا شاہجہاں ندوی نے شق ’’ج‘‘ میں یہ صراحت کی ہے کہ زندہ شخص آئی بینک کو اپنی آنکھ کا عطیہ نہیں دے سکتا ہے، البتہ مردہ شخص آئی بینک کو اپنی آنکھ کا عطیہ دے سکتا ہے بشرطیکہ گمان غالب ہو کہ پیوندکاری کامیاب رہے گی اور دوسرا متبادل نہ ہو، جواب (۷) میں لکھا ہے کہ مردہ کی وصیت بھی ضروری ہے اور مرنے کے بعد ان کے ورثہ کی طرف سے رضامندی بھی ضروری ہے۔

مفتی ابوحماد غلام رسول قاسمی نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے، البتہ جزء ’’ج‘‘ میں یہ صراحت کی ہے کہ آئی بینک کے لئے زندہ یا مردہ انسان کے آنکھوں کا قرنیہ لینا یا مردہ انسان کی آنکھوں کا عطیہ کرنا جائز نہ ہوگا۔

مفتی جمیل اختر جلیلی یہ کہتے ہیں کہ زندہ شخص کی طرف سے اپنے بھائی کو آنکھ کا قرنیہ بطور امداد عطیہ کرنا درست ہے اسی طرح متعیں مریض کی جان بچانے کیلئے اپنی موت کے بعد قرینہ دینے کی وصیت کی جاسکتی ہے لیکن آئی بینک میں آنکھ کا قرنیہ جمع کرنا درست نہیں ہے، نہ زندہ کے لئے اور نہ مردہ کیلئے۔

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی جواز کی رائے کے ساتھ اس شرط کا بھی اضافہ کرتے ہیں کہ آنکھ کا قرنیہ ہر کس وناکس کو

عطیہ کرنا مناسب نہیں بلکہ ایسے شخص کو عطیہ کیا جاسکتا ہے جس کے اندھا ہونے سے بہت نقصان ہو۔

جواز کے قائلین کے پیش نظر درج ذیل شرائط بھی ہیں۔

(۱) ماہر اطباء کو گمان ہو کہ مریض کی جان بچ جائے (۲) کوئی دوسرا متبادل نہ ہو (۳) صاحب عضو کو ضرر شدید لاحق نہ ہو (۴) جس عضو پر زندگی کا دارمدار ہو وہ قابل عطیہ نہیں جیسے دل وغیرہ (۵) عضو کی منتقلی کی وجہ سے معطی کا چہرہ بدنما نہ ہو (۶) جسمانی عمل معطل نہ ہو (۷) ماہر اطباء کو پیوندکاری کی پر گمان غالب ہو (۸) بلا قیمت عطیہ ہو۔

تیسری رائے:

یعنی بعض شقوں میں عدم جواز کی رائے ہے اور بعض میں جواز کی اس رائے کے حاملین درج ذیل حضرات ہیں:

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی، مولانا نعمت اللہ قاسمی، مفتی ابوبکر قاسمی، مفتی عمران امین الہی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کیرالا، مولانا مغفور باندوی، مفتی اکمل یزدانی، مولانا محمد انیس، قاضی محمد ریاض امان قاسمی، مولانا فرقان فلاحی، مفتی نصر اللہ ندوی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا طارق احمد قاسمی، مولانا آفتاب احمد غازی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا افضل حسین قاسمی، مفتی اقبال بن احمد ٹنکاروی، مولانا محمد فاروق، مفتی رجیب کیرالا، مفتی عابد الرحمٰن بجنوری۔

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی نے آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرنے کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقہائے کرام کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ شخص کسی کو اپنا عضو نہیں دے سکتا ہے اور نہ کوئی مضطر شخص کسی زندہ انسان کا عضو استعمال کرسکتا ہے اگرچہ صاحب عضو اس کی اجازت دے، مردہ انسان کے قرینہ کے عطیہ کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ وفات کے بعد کسی کی آنکھ کا قرینہ دوسرے ضرورتمند کو دیا جاسکتا ہے البتہ خود زندگی میں ان کی طرف سے اجازت دی گئی ہو اور ورثہ بھی اس کے لئے تیار ہوں، آئی بینک کے قیام کے سلسلے میں یہ رائے دی ہے کہ رضا کارانہ طور پر مردے کی آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے، لیکن ایسی جگہ آنکھ دینا جہاں اس کا کاروبار ہوتا ہو جائز نہیں ہے، یہی نقطہ نظر مفتی ابوبکر قاسمی، مفتی عمران امین الہی، مفتی عابد الرحمٰن بجنوری مفتی مغفور باندوی، مولانا انیس، مفتی اکمل یزدانی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا محمد طارق انور قاسمی، مفتی رضوان الحسن مظاہری اور مولانا فرقان فلاحی کی بھی ہے۔

ان تمام حضرات نے مردے کی آنکھ کا عطیہ کے جواز میں جو شرائط لگائیں ہیں ان میں تمام لوگوں نے مجموعی طور پر خود میت کی اجازت اور ورثہ کی رضامندی کو ضروری قرار دیا ہے، مولانا نعمت اللہ قاسمی کی رائے یہ ہے کہ زندہ شخص کی آنکھ کا قرینہ دینا اور اس کے لئے آئی بینک قائم کرنا جائز ہے لیکن مردہ کی آنکھ کا قرینہ نہیں دیا جاسکتا، یہی رائے قاضی محمد ریاض امان قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی کی بھی ہے، مولانا نصر اللہ ندوی نے کہا ہے کہ زندہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرنا ناجائز ہے الا یہ

کہ آنکھ نکل کر باہر آجائے اور آئی بینک میں میت کی آنکھ کا عطیہ صدقہ جاریہ کے حکم میں ہوگا۔

مولانا آفتاب عالم غازی زندہ شخص کے قرنیہ کے عطیہ کا جواز اس صورت میں بتایا ہے جب کہ آنکھ کسی مرض یا حادثے کی بناء پر جسم سے الگ ہوگئی ہو۔

جواز کے حاملین نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں۔

(۱) "من احیاها فكأنما أحياالناس جميعا" (المائدہ/۳۲)۔

(۲) "فمن اضطر غير با غ ولا عاد فلا إثم عليه" (البقرہ/۱۷۳)۔

(۳) "من استطا ع منكم أن ينفع أخاه فليفعل" (الحدیث مسلم/۲۱۹۹)۔

(۴) "والله فى عون العبد ماكان العبد فى عون أخيه" (الحدیث مسلم/۲۶۹۹)۔

(۵) "لأن الاطراف يسلک مسلک الأموال وليس لها التعظيم كتعظيم النفوس" (فتح القدیر کتاب الحدیات ۴۱۱)۔

(۶) "إذا أاراد الرجل أن يقطع اصبعازائدة أوشيئا آخر قال نصير رحمه الله۔إن كان الغالب على من قطع مثل ذالک الهلاک فانه لا يفعل ، وإن كان الغالب هوالنجاة فهو فى سعة من ذلک" (عالمگیری کراھیۃ باب ۲۱)۔

(۷) "ولو قال اقطع يدى فقطع لا شئي عليه بالإجما ع لأن الأطراف يسلک بها مسلک الأموال وعصمة الأموال تثبت حقاله وكانت محتملة للسقوط بالإباحة والإذن كما قال اتلف مالى فأتلفه" (بدائع ج ۷/ص ۲۳۶)۔

(۸) "أن النكول بذل عند ابى حنيفة رحمة الله والطرف يحمل البذل والاباحة فى الجملة فان من وقعت فى يده آكلة والعياذبالله تعالىٰ فأمر غيره بقطعها يباح له قطعها صيانة للنفس، وبه تبين أن الطرف يسلک مسلک الأموال أنه خلق وقاية للنفس كالمال" (بدائع، کتاب الدعوی)۔

(۹) "والذى رعف فلا يرقادمه فأدار ان يكتب بدمه على جبهته شيئا من القرآن قال أبوبكر يجوز وقيل له: لو كتب له بالبول قال: لوكان به شفاءً لابأس به قيل لو كتب على جلد ميتة قال: إن كان منه شفاء جاز" (خلاصۃ الفتاوی، ۴/۳۶۱)۔

(۱۰) "ولأبى حنيفةؒ أن الأطراف يسلک بها مسلک الأموال فيجرى فيها البذل بخلاف

اذا نفس فانه لو قال اقطع یدی فقطعها لایجب الضمان، وهٰذا اعمال للبذل الّا أنّه لا یباح لعدم الفائدة، وهٰذاالبذل مفید لادفاع الخصومة به فصار کقع الید للآکلة وقلع السّنّ للوجع" (ھدایۃ کتاب الدعوی،البحرالرائق)۔

(۱۱) "الضرورات تبیح المحظورات".

(۱۲) "الحاجه تنزل منزلة الضرورة عامة کانت أوخصة"۔

(۱۳) "المشقة تجلب التیسیر".

(۱۴) "یجوز نقل عضومن المیت الیٰ حیّ تتوقف حیاته علی ذالک العضوبشرط أن یأذن المیت قبل موته أو ورثته بعد موته"(موسوعۃ الفقہ الاسلامی)۔

(۱۵) "اذا تأکد الطبیب المسلم الثقة العدل أن الذی یوخذ قلبه أوعینه سیموت حتما، جازنقل القلب أوالعین وزرعه لآخر مضطرالیه، لأن الحی افضل من المیت، ورعایة للمصالح أمر مطلوب شرعا، وتحقیق النفع للآخرین مندوب إلیه فی الاسلام ،والضرورات تبیح المحظورات، لأنه یترتب علی النقل انقاد مریض بالقلب أوإعادة البصر لإنسان وتوفیر الحیاة أوالبصر نعمة عظمی مطلوب شرعاً"(الفقہ الإسلامی وادلتہ ۹/۴۴۰)۔

تجزیہ:

آنکھ کے قرینہ سے متعلق مقالہ نگار حضرات کی آراء اور دلائل کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ جن حضرات نے قرینہ کی منتقلی میں عدم جواز کی رائے کو ترجیح دی ہے انہوں نے ان نصوص اور فقہی تصریحات کو بنیاد بنایا ہے جن سے انسانی اعضاء کی منتقلی اور پیوندکاری کی ممانعت معلوم ہوتی ہے اور ان تمام دلائل کی بنیادی روح یہی ہے کہ اس عمل منتقلی یا پیوندکاری سے یا تو انسان کی ہلاکت ہوگی یا اذیت واہانت یا بدنمائی یا بغیر ملک کے تصرف۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان نصوص اور دلائل کا تعلق جمیع اجزاء انسانی سے ہے جن میں دل ودماغ ہے اور جگر بھی، دونوں آنکھیں بھی ہیں اور دونوں ہاتھ و پاؤں بھی، زندہ انسان کے اعضاء میں بعض وہ ہیں جن کی منتقلی سے خواص شخص کی زندگی ہلاکت سے دوچار ہوگی جیسے دل، دماغ اور جگر کی منتقلی، بعض وہ ہیں جن کی منتقلی سے اگرچہ زندگی باقی رہے گی لیکن زندگی کی اصل کارکردگی بے کار ہوجائے گی جیسے ہاتھ و پاؤں کی منتقلی، اور بعض وہ اعضاء ہیں جن کی منتقلی سے اصل زندگی بھی باقی رہ سکتی ہے اور وظیفہ حیات بھی انجام پاسکتا ہے لیکن زندگی میں کمی اور نقص ضرور رہے گا۔ ایک آنکھ یا اس کے قرینہ کی منتقلی اسی

زمرہ میں آئے گی۔لیکن مردہ انسان کے اعضاء یا آنکھ کا قرینہ منتقل کرنے میں حیات انسانی سے متعلق کوئی کمی سامنے نہیں آئے گی۔

موجودہ ترقی یافتہ میڈیکل سائنس کے دور میں اعضاء کی منتقلی اور پیوندکاری میں جو پیش رفت ہوئی ہے اور اسکے جو نتائج سامنے آرہے ہیں ان سے یقینی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اب عادۃً ہلاکت، بدنمائی یا اذیت کا کوئی تصور باقی نہیں رہا اور نہ اہانت کی کوئی وجہ رہی بلکہ دوسرے ضرورتمند انسان کو یہ اعضاء عطیہ کرنے سے اکرام انسانیت کا پہلو جھلکتا نظر آتا ہے،آج جدید میڈیکل سائنس نے جو سہولیات فراہم کی ہیں ان سے اگر استفادہ کیا جائے تو بلاشبہ انسان دوستی، باہمی ہمدردی، ایثار وقربانی اور خدمت آدمیت جیسی نعمتوں سے دنیائے انسانیت بہرہ ور ہوسکتی ہے۔

جن حضرات نے جواز کا قول اختیار کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اسی پہلو کو سامنے رکھا ہے اس پہلو کو اختیار کرنے میں ذہنوں میں یہ تشویش پیدا ہوسکتی ہے کہ ان نصوص کو کیسے نظر انداز کیا جائے جن سے ممانعت کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ناچیز یہ محسوس کرتا ہے کہ ان نصوص کی توجیہات تفصیل کے ساتھ پیش کی جانی چاہئیں لیکن ارباب فقہ وفتاوی اور نصوص پر نظر رکھنے والے اس عظیم مجمع میں تفصیلات کے بجائے اشارات کافی ہوں گے۔

حضرات! ان نصوص میں آیات قرآنی ’’ولا تلقوا بأیدیکم إلیٰ التھلکۃ۔ولا تقتلوا أنفسکم‘‘ کا انطباق فی زماننا آنکھ کے قرینہ کی منتقلی پر محل نظر ہے کیونکہ موجودہ نظام سرجری نے منتقلی کے قابل اعضاء کی پیوندکاری میں ایسی حیرت انگریز کامیابیاں حاصل کی ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہلاکت کا اندیشہ نہیں رہا۔اگر کسی درجہ میں یہ اندیشہ بھی ہو تو زندہ انسان کے متعلق تو ہوسکتا ہے مردوں کے بارے میں یہ بحث ہی نہیں ہوسکتی، بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ ضرورتمند انسان کی اگر ضرورت پوری نہ کی جائے اور اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو ان کو ہلاکت سے بچانا ضروری ہوجائے گا۔

جہاں تک ’’ولقد کرمنا بنی آدم‘‘ والی آیت ہے اس سے زیر بحث مسئلہ میں عدم جواز کا پہلو بھی واضح نہیں ہوتا بلکہ کرامت انسانی کا پہلو واضح ہوتا ہے اور یہ کسی ضرورتمند انسان کو ایثار وہمدردی کے تحت کسی دوسرے انسان کا قابل منتقلی عضو دیکر بھی حاصل ہوجاتا ہے اور مردہ انسان کا عضو منتقل کرنے میں خود مردہ کی حسی اور معنوی دونوں طرح سے تکریم ہوتی ہے، حسًّا اس طرح کہ مردہ کے اعضاء مٹی میں ملکر بے سود ہوجائیں گے اگر یہ کسی زندہ انسان کو دیدئے جائیں تو کارآمد ہوجائے اور ان اعضاء سے بہت سے خیر کے کام وجود میں آتے رہیں گے اور معنوی تکریم یہ ہے کہ اس سے مردہ کو عطیہ کرنے کی وجہ سے اجر وثواب ملتا رہے گا۔اعضاء کی منتقلی کے عدم جواز پر جو روایتیں پیش کی گئی ہیں ان میں دلیل کے اعتبار سے سب سے قوی دلیل حضرت جابرؓ والی روایت ہے جو صحیح مسلم میں ہے۔

”لماهاجر النبی صلی الله علیه وسلم إلیٰ المدینة هاجر الیه الطفیل بن عمرو وهاجر معه رجل من قومه فاجتووا المدینة فمرض فجزِعَ فأخذ مشاقص له فقطع براجمه فخشبت یداه حتی مات“(الحدیث)۔

اس حدیث میں نقص عضو کو باعث عقاب سمجھا گیا ہے،لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص مذکور نے آلام وشدائد سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے قطع براجم کا اقدام کیا تھا یہ ایسی مصلحت تھی جو ضرورت کے درجہ کی نہیں تھی بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ حاجت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔نقل قرینہ کی مصلحت حاجت کے درجہ کی چیز نہیں بلکہ ضرورت کے درجہ میں ہے اسلئے اس روایت سے ممانعت پر استدلال محل نظر ہے بلکہ اگر ضرورت اور رخصت پر نظر کی جائے تو اس سے جواز کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

دوسری روایت جو حضرت اسماءؓ کی ہے جس میں وصل الشعر (بال جوڑنے) کی ممانعت آئی ہے اس میں بھی کمالیات کی مصلحت پائی جاتی ہے، حالانکہ نقل عضو کا معاملہ ضرورت کی مصلحت پر مبنی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس روایت میں ممانعت کی وجہ غش اور تلبیس ہے، جب کہ نقل عضو میں دفع مفاسد ہے، تیسری روایت جو مثلہ سے متعلق ہے، اس میں ممانعت کی علت واضح ہے کہ اس میں مریض کی ہلاکت کا اندیشہ بھی ہے اور جسم انسانی کی بدنمائی بھی،لیکن جب ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو اور اس سے کوئی بڑی مصلحت حاصل ہو تو صرف بدنمائی کے مفسدہ کو گوارہ کیا جاسکتا ہے،جیسا کہ قواعد فقہیہ سے اس کی گنجائش واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔چوتھی روایت جو میت کی ہڈی توڑنے کی ممانعت سے متعلق ہے،اس حدیث سے جو زیر بحث مسئلہ میں نقل عضو کے عدم جواز پر استدلال ناقابل فہم ہے کیونکہ موجودہ طبی سہولیات اور ماہر اطباء کی موجودگی میں اعضاء کو توڑنا نہیں ہوتا بلکہ محفوظ طریقہ سے اس کی منتقلی ہوتی ہے، اسی طرح دیگر اور دلائل پر غور کیا جاسکتا ہے۔ان مختصر توجیہات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نقل اعضاء انسانی یا قرنیہ کی ممانعت پر جو نصوص پیش کی گئی ہیں وہ اپنے مستدلات پر صریح اور واضح نہیں ہیں۔

اس کے برعکس جواز پر جو نصوص ودلائل پیش کی گئی ہیں وہ کافی حد تک جواز کے تقاضوں اور مصالح کو پوری کرتی ہیں کیوں کہ جن حضرات نے جواز کے پہلو کو ترجیح دی ہے انہوں نے ضرورت کے وجود اور ہلاکت وضرر سے تحفظ جیسی شرائط کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ بات فقہاء اور اہل علم وتحقیق کے نزدیک مسلم ہے بلکہ خود نصوص دال ہیں کہ ممنوع اور محظور مقام میں بھی بربنائے ضرورت اباحت حاصل ہوتی ہے، مثلاً آیت کریمہ: ”انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وماأهل به لغیر الله“. میں حرام کردہ اشیاء کے بعد فوراً اسی آیت میں یہ صراحت بھی موجود ہے ”فمن اضطر غیر باغ ولاعاد فلااثم

علیه" (بقرہ:۱۷۲)،اسی طرح دوسری آیت میں محرم اشیاء کے ذکر کے بعد یہ اباحت بھی موجود ہے"**فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فان الله غفور رحیم**" (مائدہ:۳)،اسی لئے فقہاء کرام نے اس طرح کے نصوص کوسامنے رکھتے ہوئے: "**الضرورات تبیح المحظورات**" کا قاعدہ مرتب فرمایااور بے شمار جزئیات میں اس کوملحوظ رکھاہے۔

اصحاب فقہ وفتاویٰ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ احکام کے مدارج ہیں جن کالحاظ بھی فن کے ماہرین کے لئے ضروری ہے۔نقل اعضاء انسانی کی ممانعت سے متعلق جونصوص اورتصریحات ہیں وہ عزیمت کا درجہ رکھتی ہیں۔ زیر بحث مسائل رخصت کے دائرہ میں آتے ہیں اسی لئے جواز کی شرائط میں ضرورت کی قیدلگائی گئی ہےاوراس پہلو پر جونصوص ہیں وہ نظرانداز نہیں کی جاسکتی ہیں۔عصرحاضر کے مشہورفقیہ شیخ وہبہ الزحیلی ، شیخ ابراہیم الیعقوبی مرحوم، شیخ جادالحق شیخ الازہراورعرب علماء کی ایک معتدبہ تعداداسی نظریہ کی حامل نظرآتی ہے،ممالک عربیہ کی فقہی اکیڈمیوں،تحقیقی اداروں اوراہم ومستنددارالافتاء سے یہی فیصلےاورفتاویٰ شائع ہوئے ہیں ناچیز نے اپنے مقالہ میں مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کی تجاویز وفیصلے(۱۴۰۸ھ) درج کئے ہیں،جن میں تجویزنمبر ۳،اورتجویزنمبر۶ زیربحث سوال نمبر۷ سے متعلق ہیں،اس مجلس میں میں ان دونوں تجاویز کی عبارتیں نقل کرنا مفیدسمجھتاہوں:

تجویزنمبر۳:"**تجوز الاستفادة من جزء من العضو الذی استؤصل من الجسم لعلة مرضية لشخص آخر كأخذ قرنية العين لانسان ما، عنداستئصال العين لعلة مرضية**".

تجویزنمبر۶:"**يجوز نقل عضو من ميت الى حی تتوقف حياته، علی ذلک العضو، او تتوقف سلامة وظيفة أساسية فيه علی ذلک، بشرط أن يأذن الميت أو ورثته بعدموته او بشرط موافقة ولی أمر المسلمين، ان كان المتوفی مجهول الهيوية أو لاورثة له**".

ترجیح وتجویز:

مذکورہ تمام توجیہات اورتفصیلات کی روشنی میں سوالنامہ کے سوال نمبر۶ اورنمبر۷ کے بارے میں ناچیز درج ذیل نتیجہ پر پہنچتاہے:

الف:کسی زندہ انسان کی ایک آنکھ کاقرینہ دوسرے ضرورتمند نابینا انسان کوبطورعطیہ بربنائے ضرورت دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ عطیہ کرنے والااس پرراضی ہواوراسے کوئی قابل لحاظ نقصان نہ ہواورنہ ہلاکت اورضررشدید کااندیشہ ہو، نیز محفوظ طریقے پرماہرطبیب کی نگرانی میں عمل تبدیلی اورپیوندکاری انجام دیاجارہاہواوریہ عطیہ دیئے جانے والےشخص کے لیے مفیداورکارآمدبھی ہو۔

ب: مردہ شخص کی دونوں آنکھیں یا ان کا قرنیہ ضرورتمند زندہ نابینا انسان کو دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس نے زندگی میں عطیہ کرنے کی وصیت کردی ہو اور ورثہ بھی اس کے لیے راضی ہوں۔

ج: انسانی ضرورت کے پیش نظر محض خدمت اور ایثار کے جذبہ سے عطیہ کی جانے والی آنکھوں اور ان کے قرنیہ کے لیے آئی بینک کا قیام درست ہوگا، اور شرائط جواز کا لحاظ کرتے ہوئے رضا کارانہ آئی بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ کیا جاسکتا ہے۔

ناچیز اپنی ان تجاویز کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہے اور اتنی طویل گفتگو کی سمع خراشی پر شرکاء سیمنار کا شکریہ ادا کرتا ہے اور حق تعالیٰ سے حق وصواب کی دعاء کرتا ہے۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ
(سوال نمبر ۸،۹)

مفتی عبدالرزاق قاسمی☆

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد: چوبیسویں فقہی سیمنار میں زیر بحث موضوع ''اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ'' کے سوال نمبر ۸ اور ۹ پر عرض مسئلہ کے لیے اکیڈمی کی جانب احقر کے پاس کل (۷۱) مقالات بھیجے گئے، جن میں سے بعض مقالات تو نہایت ہی مختصر تھے کہ دلائل سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا گیا؛ لیکن اکثر مقالات جامع اور مفصل تھے، جن دوسوالوں کا عرض آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، ان میں سے پہلا سوال دودھ بینک سے متعلق تھا اور دوسرا سوال مادۂ منویہ بینک کے تعلق سے تھا، پہلا سوال چار اجزاء پر مشتمل ہے: ۱۔ دودھ بینک کا قیام، ۲۔ دودھ بینک کو دودھ فروخت کرنا، ۳۔ دودھ بینک کو دودھ کا عطیہ دینا، ۴۔ بینک سے لیے ہوئے دودھ سے حرمت رضاعت۔

دودھ بینک کا قیام:

اس جزء کے جواب میں (۵۶) اہل علم کی رائے تو یہ ہے کہ دودھ بینک کا قیام شرعی نقطۂ نظر سے ناجائز ہے، جب کہ (۱۳) حضرات کا موقف جواز کا ہے اور تین حضرات نے مذکورہ بالا چاروں اجزاء میں سے کسی کا بھی جواب نہیں دیا ہے۔

دودھ بینک کے قیام کے جواز کا موقف رکھنے والے حضرات علماء کرام کے اسماء گرامی اور ادلہ حسب ذیل ہیں:

مولانا محمد ذکوان صاحب چھاپی گجرات، مولانا محمد سلطان صاحب کشمیر، مولانا محبوب فروغ احمد کیرالا، مولانا حبیب احمد ممبئی، مولانا آزاد بیگ ممبئی، مولانا محمد اکمل یزدانی بھوپال، مولانا قاضی ریاض ارمان صاحب یمنا نگر، مولانا احسن عبدالحق ندوی رائے بریلی، مولانا ظفر عالم صاحب ندوی لکھنوی، مولانا آفتاب عالم صاحب دربھنگہ، مولانا خورشید احمد صاحب اعظمی مئو، مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی صاحب میرٹھ۔

ان حضرات نے دودھ بینک کے قیام کے جواز پر اس سے استدلال کیا ہے کہ جس طریقہ سے کوئی عورت اپنے بچے

☆ امروہہ، مغربی اتر پردیش۔

کو دودھ پلا سکتی ہے، اسی طریقہ سے کسی غیر کے بچے کو بھی دودھ پلا سکتی ہے اور اگر کوئی بچہ شدید ضرورت مند ہو اور ہلاکت تک نوبت پہنچنے والی ہو تو ایسی صورت میں دودھ پلانا واجب ہو جاتا ہے، البحر الرائق میں ہے: ''**و في الخانية من الحظر والإباحة امرأة ترضع صبيا من غير اذن زوجها يكره لها ذلك إلا إذا خافت هلاك الرضيع فحينئذٍ لا بأس به الخ و ينبغي أن يكون و اجباً عليها عند خوف الهلاك إحياءً للنفس** ''(البحر الرائق ۲۳۸/۳)۔

حضرات فقہاء کرام نے بلا ضرورت دوسرے بچوں کو دودھ پلانے سے از راہ احتیاط منع فرمایا ہے اور پلانے کی صورت میں اس کو یادداشت کے طور پر لکھنے اور محفوظ کرنے کو فرمایا ہے: ''**والواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة و إن فعلن ذلك يحفظن أو يكتبن**'' (عالمگیری ۳۴۵/۱)، جب عورت کو دوسرے بچوں کو دودھ پلانا جائز اور بعض صورتوں میں واجب ہو جاتا ہے تو بغرض ضرورت اور بقدر ضرورت اس کو مہیا رکھنے کی گنجائش رہے گی اس مہیا رکھنے اور ضرورۃً دودھ کو محفوظ رکھنے کا دوسرا نام دودھ بینک کا قیام ہے۔

نیز دور حاضر میں دودھ پلانے والی عورتوں کا ملنا بہت مشکل ہے، پھر بہت سی خواتین کو دودھ اترتا ہی نہیں، بعض عورتوں کو ڈاکٹر اس کی شدید بیماری کی وجہ سے دودھ پلانے سے منع کر دیتے ہیں اور بچہ باہر کا دودھ ہضم نہیں کر پاتا لہٰذا ضرورت بھی ہے تو ایسی حالت میں دودھ بینک کا قیام چند شرطوں کے ساتھ جائز ہونا چاہیے: ۱۔عورت اپنا دودھ بینک میں بطور ہبہ جمع کرے۔ ۲۔عورت کا دودھ اس کے نام مع ولدیت، مکمل پتہ اور فوٹو کاپی کے ساتھ رکھا جائے تاکہ رضاعی رشتوں کی تمیز ممکن رہے۔ ۳۔بینک بھی اس دودھ کو مفت دے، کیوں کہ فروخت جائز نہ ہوگا، اور جب کسی بچہ کو دودھ دیا جائے تو بچہ کے والدین اور جس عورت کا دودھ ہے ان کا باہم بالمشافہ مکمل تعارف کرایا جائے تاکہ مستقبل میں بچہ کو کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ان شرائط کے ساتھ دودھ بینک کا قائم کرنا درست ہوگا لیکن کیا ان شرائط پر عمل ممکن ہے؟ یہ بات قابل غور ہے۔

اس کے علاوہ ان حضرات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان بینکوں میں جو انسانی دودھ ہوتے ہے اس میں بچے کے لیے مناسب غذا ہوتی ہے، پروٹین اور چکنائی بہت مناسب مقدار میں ہوتی ہے، بینکوں میں محفوظ دودھ کے اندر انٹی بوڈی اور بیماریوں سے حفاظت کا مادہ بھی ہوتا ہے، جس سے بچہ کے قویٰ اور اعضاء مضبوط ہوتے ہیں، لہٰذا ان فوائد کے پیش نظر دودھ بینکوں کا قیام جائز ہونا چاہیے۔یعنی دودھ بینکوں کی ضرورت بھی ہے اور اس کے فوائد بھی ہیں۔

دوسری طرف جو مقالہ نگار حضرات دودھ بینکوں کے قیام کی اجازت نہیں دیتے ان کے پیش نظر دودھ بینکوں کے قیام سے پیدا ہونے والے نقصانات ہیں اور یہ نقصانات بھی ایک قسم کے نہیں بلکہ دینی، اخلاقی، طبی اور معاشرتی ہر طرح کے ہیں۔

دینی نقصانات:

متعدد عورتوں کے دودھ کو جمع کرکے ایک ساتھ ملا دیا جاتا ہے جس سے پتہ نہیں چلتا کہ کس بچے نے کس عورت کا دودھ پیا ہے اور رشتۂ رضاعت مجہول ہوجاتا ہے اور اس میں کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ہی عورت کا دودھ متعدد بچوں نے پیا ہو اور وہ آپس میں بھائی بہن ہوں، لیکن معلوم نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے شادی کرلیں جو شرعی اعتبار سے حرام ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''**یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب**'' (بخاری، حدیث/ ۲۵۰۲، مسلم حدیث/ ۱۴۴۵)، دودھ بینکوں کا قیام درحقیقت اعلیٰ اور افضل کو چھوڑ کر ادنی کو اختیار کرنا ہے، جب مرضعہ خواتین ہیں تو ان کو چھوڑ کر بینکوں کا سہارا لینا بے سود ہے؛ یہ تو ایسے ہی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل نے من وسلوی کو چھوڑ کر پیاز اور لہسن وغیرہ کو طلب کیا۔

صحتی نقصان:

بینکوں میں جو دودھ جمع ہوتا ہے اس میں بسا اوقات وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مادے تحلیل ہوجاتے ہیں جو انسانی دودھ میں ہوتے ہیں، جس کی بناء پر یہ دودھ بچوں کی صحت کے لیے انتہائی نقصان دے ثابت ہوتا ہے، اگرچہ یہ اندیشہ بلڈ بینکوں میں بھی ہوتا ہے مگر اس میں اتنا نہیں ہے۔ نیز عورت جب مشین سے اپنی پستانوں کا دودھ نکالتی ہے تو یہ ایک غیر فطری طریقہ کو اختیار کرنا بھی ہے اور عورت کے لیے نقصان دہ ہے، جب کہ اگر بچہ اس کی پستان سے دودھ پیتا ہے تو وہ عورت کے لیے مفید ہے۔

اخلاقی نقصانات:

دودھ پلانے کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک مقصد ماں اور بچے کے درمیان تعلق اور محبت کا پیدا کرنا بھی ہے اور یہ فطری محبت جو رضاعت سے ثابت ہوتی ہے، دودھ بینکوں کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہی ہوتا ہے جس کا اثر بچہ کے اوپر پڑتا ہے۔ پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ دودھ کا محتاج ہوتا ہے اور اس کی والدہ دنیا کے مال کے حصول کے لالچ میں اپنا دودھ بینک کو فروخت کردیتی ہے اور اپنے بچہ کو مصنوعی دودھ پلاتی ہے کیونکہ بینکوں کی طرف سے اس دودھ پر عورت کو بھاری معاوضہ مل جاتا ہے جو وہ بینک کو دیتی ہے، اس صورت میں بچے اپنے فطری حق سے محروم رہ جاتے ہیں جو ان کا ان کی ماؤں کے اوپر ہوتا ہے۔

سنن بیہقی کبریٰ میں ایک مرفوع روایت ہے: ''**نهى رسول الله ﷺ ان تسرضع الحمقاء فان اللبن يشبه**'' (سنن کبری بیہقی ۷/ ۶۵ حدیث/ ۱۵۶۸۲)، اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ان خواتین کے دودھ سے منع فرمایا ہے

جو کم عقل ہوں، اب بینک جو دودھ جمع کرتا ہے وہ ایک عورت کا تو ہوتا نہیں، نامعلوم کن کن متعدد عورتوں کا ہوتا ہے، ان میں کون عقل مند ہے اور کون نہیں۔ نیز اس حدیث میں یہ بھی بیان کر دیا گیا کہ دودھ میں مشابہت ہوتی ہے یعنی دودھ کا اثر بچہ پر پڑتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ: ''فلا تسق من يهودية ولا نصرانية ولا زانية'' (منار السبیل ۲/۲۹۲ طبع بیروت)۔

طبی نقصانات:

نیز جب ایک عورت مستقل کسی بینک کو دودھ فروخت کرنے کی عادی ہوجاتی ہے تو خود اس عورت کی صحت بے حد متاثر ہوجاتی ہے اور آج کل تو جدید سائنس کی روشنی میں طبی نقطۂ نظر سے یہ بات طے ہوچکی ہے کہ مصنوعی رضاعت سے عورت میں فطری رضاعت کے ذریعہ آنے والی کمی کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ کمی واقع ہوتی ہے۔

جب بچہ عورت کی پستان کو چوستا ہے کہ ایک ''ہرمون اکسیر توسین'' نکلتا ہے جس کی وجہ سے ولادت کے بعد عورت کا رحم سکڑ کر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے جو عورت کی صحت کی علامت ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ترین ہے کہ جب عورت بچے کو سینے سے لگا کر دودھ پلاتی ہے تو اس کو ایک فطری سکون حاصل ہوتا ہے جو مصنوعی رضاعت سے ہرگز حاصل نہیں ہوتا ہے۔

اسی طرح جب بچہ عورت کی پستان کو اپنے منہ میں لے کر چوستا ہے تو بچہ ان جراثیم اور میکروبات (Germs Microbes) سے محفوظ ہوجاتا ہے جو اس کے جسم میں ہوتے ہیں۔ عورت کا بچہ کو دودھ نہ پلانا پستان سے دودھ کے کم اترنے کا سبب بن جاتا ہے جب کہ بچہ جب پستان سے دودھ پیتا ہے تو ''ہرمون برولاکتین (Prolactin)'' باہر نکلتا ہے جس کے نتیجہ میں دودھ زیادہ اترتا ہے۔

اہانت انسان:

دودھ بینک قائم کر کے، ان میں عورتوں کے دودھ کو جمع کرنا فطرت اور تکریم انسانیت کے خلاف ورزی بھی ہے اللہ تعالیٰ نے انسان (خواہ مرد ہو یا عورت) کو معزز و مکرم بنایا ہے اور اس کے لیے ایک نظام حیات مقرر کیا ہے۔ اب اگر دودھ بینک قائم ہوں گے تو عورتوں کی حیثیت ایک بکاؤ مال کی سی ہوجائے گی یا ایک گائے، بکری اور بھینس جیسی حیثیت ہوگی جس میں اس معزز و مکرم انسان کی اہانت لازم آتی ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ دودھ بینک کے قائم کرنے میں دینی، اجتماعی، طبی اور اخلاقی ہر طرح کے نقصانات ہیں جس کے پیش نظر ہمیں مغرب کی اندھی تقلید کرتے ہوئے جواز کی بات نہیں کہنی چاہیے؛ کیا ضروری ہے کہ ہر چیز میں مغرب کی پیروی

کی جائے، اصل ہمارے لیے دین اسلام ہے۔

اس نظریہ کے حامل مقالہ نگار کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مولانا فاروق صاحب گجرات، مفتی محمد اقبال صاحب بھروچ، مفتی ابوحماد غلام رسول، مفتی محمد ارشاد، مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی نثار احمد گودھرا، مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی فرید احمد، جموسر، مولانا مظاہر حسین عماد کیرالا، مولانا محمد فاروق صاحب دربھنگہ، خواجہ نظام الدین یوسفی، مولانا عبدالخالق ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا قمرالزماں پرتاپ گڑھی، مولانا افضل حسین قاسمی، مولانا محمد انیس ندوی، مولانا تاج الدین رشادی میسور، مولانا لطیف الرحمٰن ممبئی، مفتی شبیر احمد صاحب بھروچ، مولانا مغفور صاحب باندا، مولانا توقیر بدر بہار، مولانا اشتیاق صاحب مئو، مولانا عبدالحئی صاحب مفتاحی، مولانا عابدالرحمٰن بجور، مولانا فرید احمد بھروچ، مفتی جسیم الدین ممبئی، مفتی امتیاز احمد بھروچ، مولانا اکرام الحق صاحب دھنباد، مفتی عفان صاحب منصور پوری، مولانا منت اللہ صاحب قاسمی، مولانا فرقان فلاحی حیدرآباد، مولانا رجیب قاسمی، مولانا وجیہ اللہ احسن، مولانا عبدالشکور صاحب، مولانا فیاض احمد کرناٹک، مولانا محمد یوسف صاحب کنتھاریا، مفتی نصراللہ لکھنوی، مفتی رضوان الحسن مہاراشٹر، مولانا طارق انور کیرالا، قمر عالم، مفتی عثمان غنی گرینی، مفتی عبدالرحمٰن بھوپال، مولانا عبدالحکیم قاسمی، مفتی انصار احمد ندوی، مفتی عمر امین کشمیر، مولانا رمضان علی پٹنہ، مولانا نعمت اللہ بہار، مولانا بدر احمد مجتبیٰ پٹنہ، مولانا ارشد علی رحمانی، مولانا عنایت اللہ میر کشمیر اور راقم الحروف۔

اسی سوال نمبر ۸ سے متعلق دوسرا جزء یہ تھا کہ کوئی عورت ان بینکوں کے ہاتھوں اپنے دودھ کو فروخت کرسکتی ہے؟

اس سلسلہ میں صرف دو مقالہ نگار حضرات کی رائے جواز کی ہے اور دلیل ان کے پیش نظر یہ ہے: کہ جس طرح دایہ کو اجرت دی جاتی ہے، تو اسی طرح عورت اپنے دودھ کا عوض بینک سے لے سکتی ہے، نیز حضرت امام شافعیؒ عورت کے دودھ کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں، لہٰذا ضرورت میں ان کے مسلک کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ اسلاف سے مفقود الخبر وغیرہ کے بارے میں ثابت ہے (از مقالہ مولانا سلطان صاحب وقاضی ریاض ارمان صاحب)۔

ان دونوں حضرات کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے دودھ کو بینک کے ہاتھ فروخت کرے، احناف کا اصل مذہب یہی ہے، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: ''**ولا ينعقد بيع لبن المرأة عندنا**'' (بدائع ۱۴۵/۵)، اور عدم جواز کی عقلی دلیل یہ ہے کہ شرعی طور پر ہر حال میں عورت کے دودھ سے انتفاع مباح نہیں ہے بلکہ بچہ کو غذا دینے کی ضرورت کی بناء پر اس سے فائدہ اُٹھانا مباح ہے اور جس چیز سے شرعی طور پر ضرورت کی حالت کے سوا فائدہ اُٹھانا حرام ہو وہ مال نہیں ہوتا ہے اور لوگ اسے مال نہیں سمجھتے ہیں اور کسی بازار میں فروخت نہیں ہوتا ہے جس سے پتہ

چلتا ہے کہ وہ مال نہیں ہے، لہٰذا اس کی خرید وفروخت جائز نہیں (از مقالہ ڈاکٹر شاہ جہاں صاحب ندوی)۔

تیسرے اس لیے بھی کہ وہ انسان کا جزء ہے اور انسان اپنے تمام اجزاء سمیت محترم ومکرم ہے اور تکریم واحترام کے باب سے یہ نہیں ہے کہ اس کی خرید وفروخت کی جائے، اگر اس کی اجازت دے دی جائے گی تو عورتوں کی حیثیت ایک بگاؤ مال کی سی ہوجائے گی یا ایک گائے، بکری اور بھینس جیسی حیثیت ہوگی جس میں اس کی اہانت ہے۔

رہا مسئلہ یہ کہ دایہ کو پیسہ دودھ ہی کے عوض تو ملتا ہے، لہٰذا اس کو بینک سے پیسہ لے کر دودھ دینے میں کیا حرج ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دایہ کو پیسہ دودھ کے عوض نہیں ملتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک مدت کے لیے جو اجارہ کا معاملہ ہوا ہے اس کے عوض پیسہ ملتا ہے، جیسا کہ مزدور کو ملتا ہے اس کی وضاحت فتح القدیر کی عبارت سے ہوتی ہے: ''**قال محمد بن الحسن: جواز إجارة الظئر دليل على فساد لبنها لأنه لما جازت الإجارة ثبت أن سبيله سبيل المنافع و ليس سبيله سبيل الأموال؛ لأنه لو كان مالا لم تجز الإجارة**'' (فتح القدیر ۶/ ۴۲۴)، اور اپنے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کی طرف اس وقت رجوع کیا جاتا ہے جبکہ ضرورت شدید ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے۔

اس سوال کی ایک شق یہ بھی ہے کہ اگر کوئی عورت بغیر کسی عوض کے بطور عطیہ کے اپنا دودھ دینا چاہے تو کیا حکم ہوگا؟

اس سلسلہ میں جو مقالہ نگار حضرات عورت کے دودھ کو فروخت کرنے کی اجازت دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بطور ہبہ کے دینا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ لیکن جن مقالہ نگار حضرات کی رائے عدم جواز کی ہے ان کے پیش نظر دودھ بینک کے قیام میں جو مفاسد ہیں وہ سب بلا قیمت دودھ جمع کرنے میں بھی لازم آتے ہیں اس لیے دودھ بینک کو نہ بالعوض دودھ دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بلاعوض، جیسا کہ قاعدہ ہے: ''**درء المفاسد مقدم على جلب المصالح**'' نیز بینک میں اگر کوئی عورت رضاکارانہ طور پر بھی دودھ جمع کرتی ہے تو بھی اس سے اختلاط نسل لازم آتا ہے اور قاعدہ ہے: ''**ما لايتم ترك الحرام إلا به فتركه واجب و فعله محرم**''۔

سوال نمبر ۸ کی آخری شق یہ تھی کہ کیا بینک کے دودھ سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی؟

اس سلسلہ میں اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے تو یہی ہے کہ اس دودھ سے حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی۔ حضرات فقہاء کے اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ مذاہب اربعہ کے فقہاء سے یہ صراحت منقول ہے کہ اگر عورت کی پستان سے دودھ نکال کر بچے کے منھ میں یا ناک میں ٹپکایا تو اس سے اسی طرح حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی جس طرح پستان سے منہ لگا کر پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے؛ اس لیے کہ تحریم کے لیے جو چیز مؤثر ہے وہ دودھ سے غذا کا

حاصل ہونا، گوشت کا بڑھنا، ہڈیوں کا مضبوط ہونا اور بھوک کا ختم ہونا ہے اور یہ سب چیزیں سعوط اور وجور (منہ سے دودھ ٹپکانا، ناک سے ٹپکانا) سے بھی حاصل ہوجاتی ہیں؛ لہٰذا اس سے حرمت ثابت ہوجائے گی۔حدیث شریف میں ہے:''**لا رضاع إلا ماشد العظم و أنبت اللحم**''(سنن ابوداؤد حدیث/ ۲۰۵۹)، دوسری حدیث میں ہے:''**لا یحرم من الرضاع إلا ما أنبت اللحم و آنشز العظم**''(سنن ابوداؤد حدیث ۲۰۶۰)،تیسری حدیث میں ہے:''**فانما الرضاعة من المجاعه**''(سنن ابوداؤد حدیث ۲۰۵۸)،مبسوط میں ہے:''**والسعوط والوجور یثبت الحرمة لأنه مما یتغذی به الصبی، فان السعوط یصل الی الدماغ فیتقوی به والوجور یصل الی الجوف**''(المبسوط للسرخسی ۵/ ۱۳۴)۔

اسی طرح کی عبارت مجمع الانہر (۱/ ۳۷۸) اور بدائع الصنائع (۴/ ۹) میں بھی ہے،فقہ حنفی کے علاوہ دیگر فقہاء کی عبارتوں سے بھی یہی ثابت ہوتا۔

''**یشترط أن یصل اللبن الی المعدة بارتضاع أو ایجار أو إسعاط و إن کان الطفل نائما؛ لأن المؤثر فی التحریم هو حصول الغذاء باللبن وإنبات اللحم وإنشاز العظم وسد المجاعة لتتحقق الجزئیة ولا یحصل ذلک إلا بما وصل الی المعدة**''(الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۲/ ۲۴۵)۔

اور جن لوگوں نے دودھ کو خون کے اوپر قیاس کر کے یہ کہہ دیا کہ جس طرح خون سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی تو اس طرح بینک کے دودھ سے بھی حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، یہ قیاس مع الفارق ہے،اس لیے کہ دودھ سے رضاعت کا ثابت ہونا منصوص ہے، نہ کہ خون سے،لہٰذا منصوص کو غیر منصوص پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے: نیز دودھ تو غذا ہی کے لیے بنایا گیا ہے جب کہ خون میں تغذی نہیں ہے بلکہ وہ تو بطور دواء کے چڑھایا جاتا ہے دودھ پاک ہے اور خون ناپاک ہے پاک کو ناپاک پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔مفتی محمد عثمان صاحب گرینی نے یہاں پر مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کا فیصلہ بھی نقل کیا ہے جس میں دودھ بینک کے قیام کو مذکورہ بالا مفاسد کے پیش نظر ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

راقم السطور کی رائے بھی یہی ہے کہ بینک کے دودھ سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی۔

البتہ مولانا محمد سلطان صاحب کشمیر،مفتی محمد ذکوان صاحب چھاپی گجرات،مولانا فرید احمد صاحب جموسر،مولانا محبوب فروغ صاحب اور مفتی اکمل صاحب یزدانی کا خیال اس بارے میں یہ ہے کہ جب تک رضاعت کا تیقن نہ ہو اس وقت تک حرمت کا ثبوت نہیں ہوتا۔لہٰذا دودھ بینکنگ کے مسئلہ میں دودھ کی عطیہ دھندہ عورتوں کے دودھ کو دوسرے دودھ میں خلط ملط نہیں کیا جاتا ہو اور عطیہ دھندہ خاتون کا علم ہو جس بچہ کو دیا جا رہا ہے اس کا بھی علم ہو تو رضاعت ثابت ہوگی،مگر علم نہ ہو یا دودھ خلط ملط کر دیا گیا ہو اور عطیہ دھندہ عورتوں کا کچھ پتہ بھی نہیں ہے اور عام طور پر دودھ بینکوں میں ہوتا بھی ایسا ہی ہے،تو

اس دودھ سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔ محض شبہ سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوا کرتی ہے۔ درمختار میں ہے:
"ولو أرضعها أكثر أهل قرية ثم لم يدر من أرضعها فأراد أحدهم تزوجها إن لم تظهر علامة ولم يشهد بذلك جاز" (درمختار ۳/۲۱۳)، "و في الخانية: صغيرٌ و صغيرة بينهما شبهة الرضاع ولا يعلم ذلك حقيقة قالو: لا بأس بالنكاح بينهما إذا لم يخبر بذلك أحد، فإن أخبر به عدل ثقة يأخذ بقوله ولا يجوز النكاح بيهنما" (الاشباہ لابن نجیم ۳/۲۱۳)، اس طرح کی بات ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی صاحب نے بھی لکھی ہے۔

۹- منی بینک قائم کرنا، کسی مرد یا خاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورت مند مرد یا خاتون کو مادہ منویہ کا فروخت کرنا یا ہدیہ کے طور پر دینا کیسا ہے؟

تو اس سلسلہ میں تقریباً سبھی مقالہ نگار حضرات عدم جواز کے قائل ہیں، ان حضرات کی تحریروں کا خلاصہ یہ ہے کہ مادۂ منویہ بینک متعدد مفاسد اور خرابیوں پر مشتمل ہیں، اس لیے ان کے جواز کی گنجائش نہیں۔ ان میں سے چند مفاسد حسب ذیل ہیں:

(۱) اخلاط نسب، اس لیے کہ جب ایک شخص کا مادۂ منویہ یا عورت کے بیضے بینک میں جمع کر دئے جاتے ہیں تو بینک ان کو مخلوط کر دیتا ہے، پھر بسا اوقات ایک شخص کے مادۂ منویہ کو اجنبیہ عورت کے بیضہ کے ساتھ مخلوط کر کے پرورش کی جاتی ہے، جو شرعاً حرام ہے اور زنا کے مرادف ہے۔

(۲) ان بینکوں میں بانجھ افراد کے ہاتھوں مادۂ منویہ یا عورت کے بیضے کو فروخت بھی کیا جاتا ہے۔

(۳) ان بینکوں کی نحوست یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے بہت سے ایسے بچوں کا ظہور ہوتا ہے جن کے ماں باپ کی معرفت بھی نہیں ہوتی اور وہ غیر ثابت النسب ہوتے ہیں۔

(۴) زوجیت کے تعلقات کا ختم کرنا بھی لازم آتا ہے، اور اس کے بجائے استمناء بالید والا حرام عمل ہوتا ہے۔

(۵) اس سے بہت سے موروثی امراض بھی پیدا ہوتے ہیں۔

(۶) کبھی کبھی ایک انسان کی منی کو اس کی وفات کے بعد استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص نے اپنا مادۂ منویہ بینک کو دیا اور بینک نے اس کو محفوظ کر کے رکھ لیا اور پھر اس شخص کا انتقال ہو گیا اور اس مادۂ منویہ کو کسی عورت کو یا خود اس مرنے والے کی بیوی کو دے دیا جاتا ہے اور وہ اپنے رحم میں رکھ کر مصنوعی بارآوری کرتی ہے جو شرعاً حرام ہے۔

(۷) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت بینک سے مادۂ منویہ لیتی ہے اور اپنے رحم میں انجکٹ کرا لیتی ہے، حالانکہ یہ مادہ منویہ اس کے کسی محرم مثلاً باپ بھائی یا بیٹے کا بھی ہوتا ہے۔

(۸) یہ بینک کبھی کسی عورت کے رحم کو کرائے پر بھی لیتے ہیں اور جن عورتوں میں بیضے تو ہوتے ہیں لیکن رحم قابل حمل نہیں ہوتا تو ان کے بیضے لے کر اور شوہر کا مادہ لے کر اس تیسری عورت کے رحم میں بارآوری کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ایسی عورتوں کو بھاری معاوضہ بھی دیا جاتا ہے اور اس سے رشتۂ ازدواجیت متاثر ہوتا ہے اور خاندانی نظام پر بھی برے اثرات پڑتے ہیں۔

(۹) ان بینکوں کی وجہ سے زنا کاری بھی بڑھتی ہے اس لیے کہ ایک زنا سے حاملہ ہو کر یہ کہہ سکتی ہے کہ اس نے بینک سے اپنے شوہر کا محفوظ مادۂ منویہ لیا ہے۔

لیکن راقم الحروف اور بعض مقالہ نگار حضرات کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اگر ان بینکوں کے قیام سے مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی خرابی لازم آتی ہے تو ان بینکوں کا قیام ممنوع ہوگا اور اگر ان بینکوں کے قیام کا مقصد صرف اور صرف یہ ہو کہ جو شادی شدہ عورت رحم کی کسی کمزوری کی وجہ سے حاملہ نہیں سکتی تو اس کے بیضے لے کر اور اس کے شوہر کے مادہ کو لے کر ایک ٹیسٹ ٹیوب میں خارجی بارآوری کر کے پھر اس انڈے والی بیوی کے رحم میں داخل کر دیا جاتا ہے اور یہ عمل شوہر کی موجودگی میں تمام شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے کیا جائے تو اس کے لیے ایسے بینکوں کو قائم کرنا شرعاً درست معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

تعارف موضوع

انسانی اعضاء واجزاء کا عطیہ-میڈیکل سائنس کے نقطۂ نظر سے

پروفیسر سید مسعود احمد☆

بنی نوع انسان اس دنیا کی مخلوقات میں خصوصی شرافت وکرامت کا مقام رکھتا ہے جس کی بنیادی وجہ اس کی فطرت میں ودیعت اخلاقی حس اور عقلی صلاحیت کا وجود ہے۔ اسی عقلی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اس نے مشاہدۂ فطرت، نیز تجربہ وتجزیہ کے ذریعہ آفاق وانفس کے مادی پہلوؤں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اپنی شرافت کا ثبوت، ایثار، ہمدردی، خدمت خلق اور محبت وغیرہ اخلاقی اقدار کی ادائیگی کے ذریعہ فراہم کیا۔ علاوہ بریں ہر انسان اس کائنات میں روز اول سے ہی دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے، اس کی ولادت سے بھی قبل اس کی ماں اپنا خون جلا کر اس کی زندگی کو قائم رکھنے میں اس کی بھر پور مدد کرتی ہے، چنانچہ مادی طور پر بھی اس وقت اس کی شریانوں میں کسی قدر ماں کا خون گردش کرتا ہے جس سے اس کی ساری غذائی اور حیاتیاتی احتیاجات پوری ہوتی ہیں، یہ پہلا اور مخصوص ناگزیر عطیۂ خون (Blood transfusion) ہے جس کو خود خالقِ فطرت ایک مکمل وصحت مند انسانی فرد سے لے کر ایک محتاج ومعذور ننھی منی جان کو دلواتا ہے اور یہ عمل مہینوں اور مسلسل چلتا ہے۔ اس کے بعد دودھ کے عطیہ کا نمبر آتا ہے جو ولادت کے بعد تقریباً دو سال تک روزانہ اسی معطی کے ذریعہ براہ راست محتاج کے منہ میں پہنچوایا جاتا ہے۔ ادھر باپ، بھائی بہن وغیرہ اپنا پسینہ بہا کر اس کی ہر ممکن خدمت کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کی خدمت ومدد کا ہر گھڑی محتاج ہے۔ جب وہ سنِ شعور وبلوغ کو پہنچ جاتا ہے تب بھی اس کی مختلف حالتیں اور کیفیات ہوتی ہیں، اگر وہ اکثر وبیش تر تندرست رہتا ہے تو بعض اوقات بیمار بھی پڑ جاتا ہے یا کسی حادثہ کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اکثر وبیش تر لوگ صحیح وسالم وتندرست ہوتے ہیں تو بعض لوگ دائمی مریض ومعذور بھی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ انسانی عقل واخلاق کا یہ بھی تقاضا ہے کہ وہ اس حالتِ بیماری ومعذوری میں اجتماعی طور پر نپٹنے کی کوشش کرے تاکہ ایک ہی شخص پر سارا بوجھ نہ پڑ جائے بلکہ دوسرے لوگ بھی اپنی بساط واستطاعت کے بقدر اس کی مدد کریں۔ اس تناظر میں دیکھیں تو بعض انسان بعض اوقات بالکل مجبور محض ہو جاتے ہیں اور ان کے پاس کوئی دوسرا چارۂ کار نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ وہ دوسری جان کی

☆ ڈپارٹمنٹ آف بایوکیمسٹری، فیکلٹی آف لائف سائنسیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خدمت و مدد کریں، مثلاً ماں کے پیٹ میں پرورش پاتا بچہ اگر اپنی ماں کی ناگزیر مدد کا محتاج ہے تو ماں بھی اس بوجھ کو طوعاً وکرہاً برداشت کرتی ہے ورنہ خود اس کی صحت وزندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ مزید برآں بعض اوقات کسی شخص میں خدمت و مدد کا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ انسان اپنے جسم وصحت کی قربانی دے کر بھی بخوشی ضرورت مند کی مدد کرتا ہے، مثلاً ماں اپنے بچہ کو دو سال تک دودھ پلاتی ہے۔ اسی طرح باپ اور بھائی بہن فطری جذبۂ محبت کے بقدر اس کی زندگی میں وقت ضرورت اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس بدلہ میں سکون، راحت، مسرت یا لذت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ ہاں اس میں خونی، رضاعی اور نسبی رشتوں کا عنصر بھی شامل ہوجاتا ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اب ہم خون کے عطیہ کے تعلق سے مندرجہ ذیل پہلوؤں کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔ اولاً یہ کہ خون کی ہمارے جسم میں سائنسی اعتبار سے نوعیت کیا ہے؟ ثانیاً کیا خون دینے سے ہمارے جسم میں کوئی دائمی نقص پیدا ہوسکتا ہے یا کوئی دائمی کمزوری یا بیماری لاحق ہوسکتی ہے۔ ثالثاً کیا خون چڑھانے کی حیثیت ایک دوا کی سی ہے۔ رابعاً کیا خون دوا کی طرح بازار میں دستیاب ہے۔ خامساً کیا مصنوعی طور پر خون بنایا جاسکتا ہے۔ سادساً کیمیاوی طور پر خون سے متعلق کیا چیزیں ڈاکٹر عموماً تجویز کرتے ہیں اور وہ کیسے حاصل کی جاتی ہیں۔ سابعاً خون کی خلیاتی اور مرکباتی ساخت کیا ہے۔ ثامناً کیا ہر انسان کا خون کیمیاوی طور پر ایک جیسا ہوتا ہے یا اس میں کسی قسم کی تقسیم وتفریق ممکن ہے۔

میڈیکل سائنس کے مطابق خون ایک سیّال عضو بدن (Fluid tissue of the body) ہے جس میں تین بڑے قسم کے خلیات یعنی سرخ خلیات (Erythrocytes)، سفید خلیات (Leukocytes) اور خون جمانے میں مدد فراہم کرنے والے خلیات (Platelets) ہوتے ہیں۔ سفید خلیات کی مزید ذیلی اقسام ہیں جن کے Lymphocytes, Neutrophils, Basophils, Eosinophils وغیرہ نام دیے گئے ہیں۔ ان خلیات کے علاوہ رقیق وسیال مادہ سیرم (Serum) اور پلازمہ (Plasma) کہلاتا ہے جس میں متعدد اقسام کی پروٹین مستقل طور سے پائی جاتی ہیں جن میں البومنز (Albumins) اور گلابلنز (Globulins) کے علاوہ خون کو باہر نکلنے پر جم جانے (تاکہ خون بھی بند ہوجائے اور باہر سے جراثیم بھی نہ آسکیں) اور شریانوں میں تھکّہ (Clot) بننے سے روکنے والی مختلف پروٹین ہوتی ہیں تاکہ شریانوں میں خون جم کر آکسیجن کا راستہ نہ روک دے بالفاظ دیگر ان دونوں امور میں توازن قایم رکھنے والی پروٹین بھی ہوتی ہیں۔ ان پروٹین کے علاوہ مختلف غذائی اجزا کو لے کر جانے والی پروٹین مثلاً لائپو پروٹین وغیرہ ہوتی ہیں، نیز خون میں ہارمون و دیگر کیمیکل بھی ہوتے ہیں جو انسانی مزاج اور افعالِ اعضاء اور استحالۂ غذا میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ خون کے سرخ ذرات کا بنیادی کام آکسیجن اور کاربن ڈائی اکسائڈ کا ٹرانسپورٹ ہے۔ یہ سرخ ذرات پھیپھڑوں میں

باہر سے آئی ہوئی آکسیجن کو جسم کے ہر حصہ تک پہنچانے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو جسم کے تمام حصوں سے پھیپھڑوں تک لاکر باہر نکالنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ سفید خلیات جراثیمی امراض کے خلاف لڑنے والے سپاہی ہیں۔ پلیٹ لیٹس (Platelets) کا کام یہ ہے کہ کہیں پر بھی خون لیجانے والی پتلی سے پتلی نالیاں اگر کریک ہوجائیں یا کسی جراثیمی یا کیمیاوی سمیات وزہر (Poison/ toxin) سے کہیں خون رسنے لگے تو یہ پلیٹ لیٹس فوراً اس خونی رساؤ کو بند کردیتی ہیں، ڈینگو اور ایبولا وائرسوں سے اسی قسم کا رساؤ شروع ہوجاتا ہے جس کے لیے پلیٹ لیٹس باہر سے دی جاتی ہیں تاکہ ان کی کمی نہ رہے اور رساؤ بھی بند ہوجائے۔ البومنز مخصوص چیزیں لے جانے والے 'قلی' ہیں۔ یہ دواؤں کو بھی گویا اپنے قبضہ میں کر کے ان کو رفتہ رفتہ ریلیز (Release) کرتے ہیں تاکہ مریض کو دوا کا شاک نہ لگ جائے۔ گلابلنز (Globulins) جسم میں قوت مدافعت پیدا کرنے والے کارندے ہیں اور سفید خلیات کے ساتھ مل کر اور علیحدہ سے یعنی متحدہ اور متوازی دونوں محاذ قایم کرتے ہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ خون میڈیکل سائنس کی رو سے ایک سیال عضو جسم (Fluid tissue of the body) ہے اور دوسرے تمام اعضاء کی بہ نسبت سب سے پہلے اپنی کمی کو پورا کرسکتا ہے چنانچہ اگر حادثاتی طور پر خون ایک دو بوتل کے بقدر ضائع ہوجائے تو پہلے تو تلّی (Spleen) میں محفوظ شدہ خون ریلیز ہوکر فوراً ہی اس کمی کو پورا کردیتا ہے۔ دوسری طرف خون جسم میں سب سے زیادہ تیز نشوونما پانے والا عضو بدن ہے، لہٰذا مرض سے شفایابی کے بعد بہت جلد نیا خون بن جاتا ہے۔ بعض اوقات خون کے نکل جانے سے طبی فائدہ بھی ہوسکتا ہے خصوصاً جب کہ خون میں فاسد مادے جمع ہوجائیں مثلاً چربی کے اجزا خون میں زیادہ ہوجائیں یا کسی کو سانپ کاٹ لے اور اس کا زہر خون میں چلا جائے۔ لیکن آج کل خون نکالنے کے بجائے ان تکالیف کو رفع کرنے کا دواؤں سے علاج کیا جاتا ہے۔ صحت مند و بالغ انسانی جسم میں چار سے چھ لیٹر خون ہوتا ہے اور اگر کسی وجہ سے ایک تہائی یا اس سے زیادہ خون جسم سے نکل جائے تو اس شخص کی جان کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور مریض کی جان بچانے کے لیے فوراً اسی گروپ کا خون چڑھانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح بلڈ کینسر (Blood Cancer) میں مریض اپنا صحت مند خون بنانے کے قابل نہیں ہوتا اس لیے اس مریض کو بھی باہر سے اس کے گروپ کا خون دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ علاوہ بریں ہر ایک بڑے سرجکل آپریشن میں کافی خون ضائع (Excessive blood loss) ہوسکتا ہے، لہٰذا اگر آپریشن کے دوران کافی خون نکل جائے تو بھی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میچنگ گروپ کے خون کو اسی وقت دینا ضروری ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ ہر شخص کے خون کا اپنا گروپ ہوتا ہے اسی گروپ کا خون اس شخص کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اگر

غلطی سے کسی دوسرے گروپ کا خون داخل کر دیا جائے تو اس سے ری ایکشن (Reaction) ہو کر اس شخص کی موت ہو سکتی ہے۔ انسانی خون کے اب تک تینتیس (۳۳) گروپ سسٹم میڈیکل سائنٹسٹ کو معلوم ہیں جن میں دو بڑے گروپ سسٹم ABO اور RH سے عوام بھی واقف ہیں۔ ان دو گروپ سسٹمز کی بنیاد پر کوئی شخص ,AB,B,A یا O کے ساتھ Rh منفی یا مثبت (Positive or negative) ہوتا ہے لہٰذا A منفی گروپ والے شخص کے لیے A منفی گروپ کا خون ہی کار آمد ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس میں باقی ماندہ اکتیس (۳۱) گروپ سسٹم سے مزید خطرہ لاحق نہ ہو۔ اتنے زیادہ ٹیسٹوں سے بچنے کے لیے مریض کے خون کو لے کر ایک ہنگامی ٹیسٹ کیا جاتا ہے جس کو کراس میچنگ (Cross matching) کہتے ہیں لہٰذا A^- مریض کے خون کو بلڈ بینک کے A^- خون سے کراس میچنگ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ وہ ری ایکشن تو نہیں دکھا رہا اگر ری ایکشن نہیں ہوئی تو وہ خون اس مریض کے لیے o.k. (اجازت یافتہ) ہو جاتا ہے ورنہ اکتیسوں (۳۱) ٹیسٹ کر کے اس کا بلڈ گروپ پروفائل نکالا جاتا ہے۔ اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہم اپنے کسی عزیز وقریب کو اپنی خواہش کے مطابق خون دینا بھی چاہیں تو بھی ضروری نہیں کہ ہمارا خون اس عزیز کے خون سے میچ کر ہی جائے لہٰذا ہماری خواہش کا احترام اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگا کہ دونوں خون آپس میں میچ کر جائیں اور بلڈ بینک کے کارندے بھی تعاون کریں ورنہ ہمارا خون بلڈ بینک لے تو لے گا مگر استعمال ہماری خواہش کے برخلاف کہیں بھی کر لے گا۔ لہٰذا خون لینے اور دینے کے معاملہ میں مذہب و رشتہ داری یا اپنی کسی اور خواہش کی شرط لگانا اور اس پر درحقیقت عمل درآمد ہونا اس عملی دنیا میں ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے اور ہم کو یہی سمجھ کر چلنا چاہیے کہ غالباً ہماری خواہش کے مطابق عمل نہ ہو سکے گا۔

اب ہم اپنا دوسرا سوال لیتے ہیں کہ آیا خون دینے سے معطی (Donor) کے جسم میں کوئی دائمی نقص یا کسی بیماری کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ ایک تندرست شخص اگر ایک بار میں ایک یونٹ (ایک بوتل یا چار سو ملی لیٹر) خون نکلوا دیتا ہے تو اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا بلکہ اگر وہ صحت مند ہو تو کچھ روز کا وقفہ دے کر کئی بار بھی اپنی خوشی سے خون کا عطیہ دے دے تو بھی اس کی صحت برقرار رہتی ہے اور اس کے جسم میں کسی دائمی نقص یا بیماری کا خطرہ کئی بار خون دینے سے بھی پیدا نہیں ہوتا۔

اب تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا خون کے عطیہ کی حیثیت حصول کنندہ مریض کے لیے دوا کی سی ہے، اس کا جواب یہی ہے کہ ہاں اس خون کی حیثیت اس مریض کے لیے نہ صرف دوا کی ہے بلکہ ایسی دوا جس کا متبادل ابھی تک موجود و معلوم نہیں ہے یا متبادل اتنا مہنگا ہے کہ عام آدمی اس کو خرید نہیں سکتا، نیز انسانی خون کی تمام خصوصیات مصنوعی خون میں موجود ہونے کی خواہش ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔

چوتھے سوال کے تعلق سے کہ کیا انسانی خون دوا کی طرح بازار میں دستیاب ہے اس کا جواب ہاں میں ہے، البتہ یہ خون خاص جگہوں پر یعنی بلڈ بینکس میں ملتا ہے یا بلڈ بینکس سے لائسنس شدہ خاص میڈیکل شاپ پر ملتا ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیمیاوی طور پر خون سے متعلق کیا کیا چیزیں ڈاکٹر صاحبان عموماً تجویز کرتے ہیں اور وہ کیسے حاصل کی جاتی ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسانی امراض میں خون کے اجزاء کا تین طرح سے استعمال کیا جاتا ہے یا تو مکمل خون کے عطیہ سے کسی مرض کا ازالہ ہوسکتا ہے مثلاً بلڈ کینسر کے مریض کو مکمل خون کے ذریعہ یا پنڈلی کی ہڈی کے گودے کے ذریعہ (جن میں خون کے اسٹم سیل ہوتے ہیں) علاج ممکن ہے۔ ڈینگو کے مریض کو یا ان مریضوں کو جن میں پلیٹ لیٹس کی کمی ہوگئی ہو تو ان کو اس جزو (Component) خون کے دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور جن مریضوں میں قوت مدافعت (Immunity) کی سکت باقی نہ ہو، یا جو سانپ یا زہریلے کیڑے کے زہر کے تریاق کے لیے Antiserum کے ضرورت مند ہوں تو یہ جزو کسی جانور کے خون میں بہت کم مقدار میں وہی زہر داخل کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے جانور گھوڑے، بھیڑ یا سور وغیرہ ہوتے ہیں۔ جس کسی شخص کا خون پتلا ہو جاتا ہے اس کو انسانی سیرم البومن، انسانی خون کے ایک جز کی حیثیت سے لے کر اس کے خون میں داخل کی جاتی ہے اس کے علاوہ بعض دوسرے اجزائے خون کی بھی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ذیابطیس کے پرانے مریض کو انسانی انسولن انجکشن کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ انسولن انسانی خون میں گردش کرنے والا ایک جز ہے اور ایک پروٹین ہے مگر اب یہ انسانوں کے بجائے مصنوعی طور پر تیار شدہ انسانی انسولن بازار میں دستیاب ہے۔ آج سے چالیس سال قبل تک گھوڑوں کے خون میں پائی جانے والی انسولن ہی ایسے پرانے ذیابطیس کے مریضوں کو دی جاتی تھی۔ آج کل ایبولا کے علاج کے لیے بعض ایسے اشخاص سے حاصل شدہ ایبولا وائرس اینٹی سیرم (Ebola virus human anti serum) کی بطور دوا یا بطور ٹیکہ ان مریضوں کو دینے کی بات چل رہی ہے جو کمزور ہونے کی وجہ سے اس وائرس سے لڑنے کی سکت نہیں رکھتے یا ذی حیثیت ہونے کی وجہ سے یہ اینٹی سیرم خرید سکتے ہیں تا کہ اندرونی اور بیرونی دونوں طرف سے قوت مدافعت پیدا ہو کر ان مریضوں میں اس مرض سے شفایابی میں مزید سہولت فراہم کی جا سکے۔

خون کے عطیہ پر گزارشات کے بعد انسانی جگر کے عطیہ اور اس کی دوسرے انسانوں میں پیوندکاری کے تعلق سے چند اہم حقائق مندرجہ ذیل سطور میں پیش کیے جائیں گے۔

انسانی جسم میں بعض اعضا جوڑوں (Pairs) کی شکل میں پائے جاتے ہیں مثلاً آنکھیں، کان، ہاتھ، پیر، گردے، پھیپھڑے وغیرہ تو بعض اعضاءِ انسانی جسم میں ایک ایک عدد (Single) ہی پائے جاتے ہیں۔ ان میں دل، جگر، مثانہ وغیرہ عضو واحد کے طور پر جسم میں اپنے مخصوص افعال انجام دیتے ہیں۔ سوالنامہ سے ایسا محسوس ہوا کہ چونکہ جگر انسانی

جسم میں صرف ایک عدد ہوتا ہے لہٰذا اس کے عطیہ کا زندہ شخص سے لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا چنانچہ کسی مردہ شخص کا جگر لے کر مریض کے جسم میں اس کی پیوندکاری پر ہی سوالنامہ میں سوالوں کا زور (Thrust) ہے جب کہ آج کل زندہ لوگوں سے جگر کا کچھ ٹکڑا لے کر ایسے مریضوں میں جگر کا ٹرانس پلانٹیشن کیا جانے لگا ہے جن کا جگر فیل ہو چکا ہے۔ اور جگر کے اسٹیم سیل (Lives stem cells) کے ذریعہ بھی فعل جگر کا مسئلہ کچھ نہ کچھ حد تک حل ہونے کے امکانات روشن ہوئے ہیں اور یہ اسٹیم سیل خود مریض سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور کسی دوسرے زندہ ڈونر سے بھی۔ جگر کی اس پیوندکاری (ٹرانس پلانٹیشن) کے لیے بھی گروپ میچنگ کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ گروپ میچنگ خون کی میچنگ سے آگے کی چیز ہے جس کو ہسٹو کمپیٹیبلٹی (Histocompatibility) کہتے ہیں اور اس کی تقسیم کاری ایم-ایچ سی کلاس پر منحصر ہے۔ دوسری اہم بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ نہ صرف کسی حادثہ کے شکار ہو کر وفات شدہ لوگوں کا یا عام وفات شدہ لوگوں کا صحت مند جگر مریض کے جسم میں جگر کی پیوندکاری میں استعمال ہو سکتا ہے (بشرطیکہ فوراً محفوظ کر لیا گیا ہو) بلکہ زندہ لوگوں کا ایک تہائی جگر بیک وقت دو بچوں کے کام بھی آ سکتا ہے۔ اس کیس میں ڈونر اور وصول کرنے والے (Recipients) دو یا تین لوگوں کا ایک ہی وقت میں آپریشن کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ خون کے عطیہ کے علی الرغم جگر کے عطیہ میں معطی (Donor) کو آپریشن کی تکلیف، اس کے بعد کئی مہینوں تک مختلف طبی تکالیف، دواؤں کے نتیجہ میں اور نئے امراض کے اندیشے، اور جان جانے کا خطرہ قائم رہتا ہے۔ مگر اپنے چہیتوں اور لاڈلوں کی جان بچانے کی خاطر آج کل بعض ماں، باپ، بھائی، بہن ان تمام تکالیف کو انگیز کر رہے ہیں۔ ایک اور مسئلہ بھی اہم ہے کہ اس پیوندکاری میں کم از کم تیس، چالیس لاکھ روپوں کا خرچہ آتا ہے جب کہ مُردوں سے حاصل شدہ جگر کی پیوندکاری کا خرچہ بھی پندرہ بیس لاکھ سے کم کا نہیں ہوتا۔ اس پیوندکاری کا ایک اور نقص یہ ہے کہ پیوند شدہ جگر کو تمام تر میچنگ کے باوجود وصول کنندہ کا جسم رجیکٹ کر سکتا ہے بلکہ دوسرے اعضاء کی پیوندکاری کے برخلاف جگر کی پیوندکاری میں خود پیوند شدہ جگر کا وصول کنندہ سے تعاون کرنا بہت بڑا طبی مسئلہ ہے جس سے بچنے کے لیے بہت سی ایسی قوی دوائیں دی جاتی ہیں کہ جس سے انسان کی قوت مدافعت ٹھنڈی پڑ جائے مگر ان سے جراثیمی امراض کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے جگر کے وصول کرنے والے شخص کو خصوصی احتیاط رکھنی ہوتی ہے۔ لہٰذا جگر کی پیوندکاری کے ضمن میں ان تمام پہلوؤں کی روشنی میں اسلامی رائے بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زندہ شخص کے جگر سے وصول کنندہ کو رجیکشن کا خطرہ قدرے کم رہتا ہے اور اس امر کا تعلق بھی جگر کے فعل اور اس کے خلیات کی زندگی سے جڑا ہوا ہے لہٰذا چاہے مذہبی نقطۂ نظر سے ڈونر کی موت ہو چکی ہو مگر میڈیکل سائنس کے نقطۂ نظر سے جگر کی موت سے پہلے پہلے ہی اس کی دوسرے شخص میں پیوندکاری کامیاب ہوگی ورنہ پیوند شدہ مردہ عضو رجیکٹ ہو جائے گا بالفاظ دیگر ڈونر شخص زندہ ہو یا مردہ میڈیکل

سائنس کی رو سے پیوند کاری کے لیے لیا جانے والا جگر ہر حال میں زندہ (Viable & Functional) ہی ہونا چاہیے یا یوں کہیں کہ پیوند کاری کے وقت تک وہ جگر زندہ بھی تھا اور ڈونر کے جسم کا ایک حصہ بھی تھا، لہٰذا پیوند کاری کے بعد جب وصول کنندہ اور یہ جگر دونوں ایک دوسرے کو تعاون کرتے ہیں تو رجیکشن نہیں ہوتا اور اس جگر کی زندگی دوسرے شخص سے وابستہ ہوجاتی ہے ورنہ باوجود ساری محنت کے وہ غیریت باقی رہتی ہے اور بعد میں بھی پیوند شدہ جگر رجیکٹ کر دیا جاتا ہے۔

جگر کی پیوند کاری اور گردے کے پیوند کاری میں ضرورت اور ناگزیریت کے پہلو سے ایک فرق یہ بھی پایا جاتا ہے کہ گردوں کے فعل کے فیل ہوجانے پر گردوں کی تبدیلی کے علاوہ ڈائیلسس (Dialysis) سے انسان سالوں زندہ رہ سکتا ہے مگر جگر کے فعل کو درست کرنے کے لیے ڈائیلسس (Dialysis) جیسی کوئی تکنیک میڈیکل سائنس میں موجود نہیں ہے اور ایمرجنسی بھی شدید ہے، لہٰذا جگر کے کیس میں گردوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

آنکھ کے عطیہ کے تعلق سے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زندہ اور مردہ دونوں قسم کے اشخاص سے حاصل شدہ قرنیوں (Cornea) کی پیوند کاری سے بعض نابیناؤں کی بینائی بے شک بحال ہوسکتی ہے اور یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں دی ہیں حالانکہ وہ ایک آنکھ کے بغیر بھی سب کچھ دیکھ سکتا ہے، البتہ جگر اور گردوں کے عطیہ کے برخلاف آنکھ کا قرنیہ دینے پر دائمی عیب اور مثلہ دونوں کے اطلاق کی بحث کی گنجائش ہے یعنی مردہ ڈونر کے مثلہ کی بحث اور زندہ ڈونر میں دائمی عیب کی بحث نیز تغیر فی خلق اللہ کی بحث جگر اور گردوں کے عطیہ کی بہ نسبت زیادہ برمحل (Relevant) معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اب سرجری کے ذریعہ اس عیب کو چھپایا جاسکتا ہے اور مثلہ میں جذبۂ انتقام اس کی حرمت کو بنیاد فراہم کرتا ہے جب کہ یہاں جذبۂ ایثار و ترحم کا پہلو غالب و نمایاں ہے۔ تغیر فی خلق اللہ کا تو گردوں کے جگر کے اور قرنیہ کے سبھی کے عطیہ کے لیے سرجری کراتے وقت مسئلہ پیدا ہوتا ہے البتہ جگر بعد میں نارمل حالت اختیار کرلیتا ہے جب کہ گردے اور قرنیہ میں تغیر و تبدیلی دائمی ہوجاتی ہے۔ نیز وہ تغیر شرکیہ شگون پر مبنی ہے جب کہ یہاں شگون و شرک کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مزید برآں جگر اور گردوں کی پیوند کاری کے پیچھے مریض کی موت و زیست کا اور اس کی جان بچانے کا مسئلہ ہے تو قرنیہ کے عطیہ میں مریض کی دنیا تاریک سے روشن ہونے کا معاملہ تو بے شک ہے لیکن اگر اسے قرنیہ نہ ملے تو اس شخص کے مرنے کا خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ مزید برآں قرنیہ کی ایمرجنسی گردوں اور جگر کی بہ نسبت بہت کم ہے، کیونکہ دنیا کے تمام قرنیہ بنکوں میں وافر مقدار میں قرنیے موجود ہیں اور ایک قرنیہ سے ایک سے زیادہ لوگوں کو بینائی بھی مل سکتی ہے لہٰذا ایک زندہ شخص کے قرنیہ کا عطیہ عموماً دوسرے شخص کی جان بچانے کے لیے نہیں دیا جاتا ہے اور نہ اس میں کسی ایمرجنسی اور قرنیوں کی نایابی کا مسئلہ ہے۔ قرنیہ کی پیوند کاری میں بھی کئی لاکھ روپے کا بل آتا ہے۔

جہاں تک دودھ کا تعلق ہے یہاں یہ عرض کر دیا جائے کہ سائنس کی رو سے دودھ انسانی عضو نہیں ہے کیونکہ دودھ میں انسانی خلیات نہیں پائے جاتے مگر یہ نوزائیدہ بچہ کے غذائی انتظام کا قدرتی وسیلہ ہے اور اس کے لیے ایک مکمل ومتوازن غذا۔ حالانکہ انسانی دودھ جانوروں کے دودھ کی بہ نسبت انسانی بچہ کے لیے زیادہ بہتر اور موزوں مانا جاتا ہے، لیکن عام طور سے بازار میں دستیاب فارمولا بھی بچہ کی صحت پر کوئی مضر اثر نہیں ڈالتا سوائے چند ایسے بچوں کے جو اس دودھ کو صحیح طور سے ہضم نہیں کر سکتے وہاں ان بچوں کی ماں کو دودھ پلانا ہے اور ایسا مسئلہ کم ہی سامنے آتا ہے کہ کسی ایسے بچہ کی ماں بھی نہ ہو اور ماں کا دودھ بھی کسی وجہ سے اس قابل نہ ہو۔

یہاں رضاعت کے مسئلہ کو میڈیکل سائنس کی روشنی میں اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ رضاعی ماں جب بچہ کو دودھ پلانے کے لیے اپنی چھاتی پیش کرتی ہے تو دودھ کے ساتھ اپنی مامتا کے جذبات بھی بچہ پر انڈیل دیتی ہے، کیونکہ وہ شعوری طور پر جانتی ہے کہ میں کس بچہ کو اپنا دودھ پلا رہی ہوں اور بچہ شعوری طور پر تو اس کا ویسا ادراک نہیں رکھتا جیسا سنِ بلوغ کے بعد وہ اس عمل کو سمجھتا مگر بچپن سے ہی اس کے لاشعور میں یہ حقیقت راسخ ہوجاتی ہے کہ یہ میری رضاعی ماں ہے جو بعد میں شعوری طور پر مزید مستحکم ہوتی جاتی ہے، اس طرح وہ رضاعی ماں سے ایثار ومحبت، ہمدردی اور خدمت خلق کا پہلا درس لیتا ہے۔ کوئی بھی ماں جب محبت بھری نظروں سے بچہ کو دیکھتی ہے اور اس کے بعد اپنا دودھ پلاتی ہے تو اس دودھ میں بعض ہارمون منتقل ہوجاتے ہیں جن کا بچہ پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ میڈیکل سائنس کے نقطۂ نظر سے ماں کے دودھ میں امراض سے لڑنے والے اجزا موجود ہوتے ہیں لیکن میڈیکل سائنس کوئی بات بچہ کے اخلاقی وروحانی نشو ونما کے تعلق سے نہیں بتاتی کیونکہ یہ اس کا دائرہ کار نہیں ہے۔ البتہ وہ اس امر کا انکار بھی نہیں کرسکتی کہ جب ایک ماں بچہ کو اپنا دودھ پلاتی ہے تو اس سے بچہ کا مادی، نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی نشو ونما ہوتا ہے اور اس دودھ پلانے کے طریقہ اور تکنیک میں اور دودھ کے مادی اجزا میں کوئی لطیف فرق یا تبدیلی بچہ کی زندگی پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ دودھ بینک میں اسلامی قانون رضاعت کی نزاکتوں کے بقدر احتیاط ممکن نہیں کہ اس کے لیے ہر عورت کا نام مکمل پتہ اور ہر بچہ کا نام اور مکمل پتہ نوٹ کرنا اور محفوظ رکھنا ہے اور یہ معاملہ ایک دوبار کا نہیں بلکہ مہینوں کا ہے اور کسی ایک بچہ کو کسی ایک عورت ہی کا دودھ ملے یہ عملاً ناممکن ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کا دائیوں کا نظام ہر طریقہ سے بہتر ہے اور فی زماننا اس کو رائج (Revive) کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ اس طریقہ میں کرنا یہ ہے کہ اولاً عورت جو کسی بچہ کو دودھ پلانے کے لیے تیار ہو وہ خود آ کر اس بچہ کو دودھ پلا جایا کرے یا بچہ کا کوئی بڑا اس بچہ کو ایک عورت کے گھر یا کسی خاص مقام پر لے جا کر روزانہ دودھ پلوا دیا کرے۔ ثانیاً - اس رضاعت کا مکمل ریکارڈ فریقین کے پاس محفوظ کرایا جائے اور ثالثاً - دودھ کو مشینی شکل میں نکالنے کے بجائے قدرتی طریقہ سے پلایا جائے۔ علاوہ

بریں رضاعی ماں صحت مند بھی ہو اس کا اپنا شیر خوار بچہ بھی ہو اور وہ کوئی نشہ آور چیز یا کوئی دوسری ادویہ استعمال نہ کر رہی ہو اور وہ کسی ایسے مرض کی شکار بھی نہ ہو جس کے مہلک وموذی اثرات اس کے دودھ میں پہنچ سکتے ہوں۔ دودھ بینکوں میں آج کل میڈیکل نقطۂ نظر سے ان آخری شرائط کا لحاظ رکھا جاتا ہے مگر ابتدائی تین باتوں پر ان کی توجہ نہیں ہے جو اسلامی قانون رضاعت میں زیادہ اہم ہیں۔

جہاں تک مادہ منویہ کا معاملہ ہے اس میں مرد کی تولیدی صلاحیت ہی اس سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس مرد کی خصوصیات بھی اگلی نسل میں اس کے اپنے مادہ منویہ ہی سے منتقل ہوتی ہیں، لہٰذا کسی مرد کا نطفہ اس دنیا میں اور اگلی نسل میں اس کی خصوصیات وشناخت کو قایم رکھنے کا مادی ذریعہ ہوتا ہے اور اگلی نسل کا ہر کوئی فرد اس دنیا میں پرورش پانے کے لیے خصوصی کفالت کا محتاج ہوتا ہے جس کا نصف حصہ (share) جبری طور پر مشیت ایزدی اس کی ماں سے ادا کروالیتی ہے یعنی ماں پیٹ میں نو ماہ اپنے بچہ کی پرورش کرتی ہے اور پھر دودھ پلا کر اپنا قدرتی، اخلاقی وقانونی حق ادا کرتی ہے۔مگر شریعت اسلامی بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اس بچہ کی کفالت کی باقی ماندہ تمام تر ذمہ داری اس کے باپ پر ڈالتے ہیں۔اسپرم بینک کے قیام سے کفالت کا یہ نظام خود بخود کمزور پڑ جاتا اور اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ نیز بچہ کا حیاتیاتی باپ اس ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاتا ہے بلکہ آج کے سرمایہ دارانہ نظام میں الٹا اپنے مادہ منویہ کی قیمت بھی لے سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر عورت کے بیضہ میں جو اس کی شناخت وخصوصیات موجود ہوتی ہیں وہ اگلی نسل میں پچاس فیصد منتقل ہوتی ہیں، اس کی ذمہ داری سے تو قدرتی طور پر حمل، وضع حمل اور رضاعت کی مشقتوں کے ذریعہ اپنا فریضہ طوعاً وکرہاً ایک عورت ادا کر دیتی ہے مگر ایک مرد اپنا مادہ منویہ دے کر بظاہر ایک دوسرے ضرورت مند جوڑے (Couple) پر احسان کرتا ہے یا رقم لے کر بھی اپنی اگلی نسل کی کفالت سے اس نظام کی کمزوری اور نقص سے فائدہ اٹھا کر بچا رہتا ہے جب کہ اسلامی نظام شریعت میں اس پر دوہری ذمہ داری تھی بلکہ تہری ذمہ داری یعنی اولاً وہ اپنے بچہ کی کفالت کا ذمہ دار تھا، یہاں تک کہ دودھ پلانے کی اجرت بھی وہی ادا کرتا، ثانیاً وہ اپنی بیوی کی پوری کفالت بھی کرتا اور ثالثاً وہ بیوی کا مہر بھی ادا کرتا۔

اسلام میں بچہ کے والد کی شناخت قایم رکھنا سب سے مقدم ہے حالانکہ وہ اولاد دونوں کی ہے۔اور یہ مسئلہ نکاح کے بغیر حل ہونا تقریباً ناممکن سا ہے۔ حصارِ نکاح کے باہر اولاد ولد الزنا مانی جاتی ہے جب کہ نکاح اسلام میں عورت کی طرف سے اس عہد اور سندِ عصمت سے عبارت ہے جس میں وہ اپنے شوہر کو اس کی اولاد کے خالص (Pure) اُسی کے نطفہ سے ہونے کا عہد باندھ کر اس کا زندگی بھر ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مرد کے برخلاف عورت کی اپنی اولاد ہونے کے ثبوت کے لیے تو قدرتی طور پر متعدد قرائن ہوتے ہیں کیونکہ حمل اور وضع حمل کی جسمانی ہیئتوں ومشقتوں کو ایک دو دن نہیں بلکہ نو مہینے تک ظاہر

ہونا ہے اور وضع حمل کے وقت خاص طور سے اس کی اگلی نسل کی شناخت کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے مگر کسی بچہ کا حیاتیاتی باپ کون ہے وہ ماں کی گواہی اور اس کی عصمت ہی سے مشروط ہے۔ جب کہ آج کل نظامِ عوضی (Surrogacy) نے ماں کی طرف سے اولاد کی اصل ونسبت کو بھی شک کے دائرہ میں ڈال دیا ہے اور ایک نیا مسئلہ قانونی اور حیاتیاتی ماں کا اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اسلام میں اسی لیے نطفۂ امشاج کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کے حیاتیاتی والد کی شناخت قایم نہ رہے تو بھی مسئلہ ہے اور اگر قانونی اور حیاتیاتی ماں کی شناخت میں بھی کوئی رکاوٹ یا مشکل درپیش ہو جائے تو بھی مسئلہ ہے۔

اب تیسرا مسئلہ اس عورت کا ہے جس کے رحم میں کسی دوسری عورت کے بارآور شدہ بیضہ سے ایک جنین (Foetus) پرورش پا کر وضع حمل ہوتا ہے۔ یہ عورت جدید اصطلاح میں قائم مقام یا عوضی ماں (Surrogate Mother) کہلاتی ہے یہ عورت دوران حمل اپنے خون سے اس بچہ کو پروش کرتی ہے اور پھر وضع حمل اور رضاعت کے مسائل ہیں۔ جب اسلام رشتۂ رضاعت تک کو محترم تسلیم کرتا ہے تو قائم مقام ماں (Surrogate Mother) تو رضاعی ماں سے زیادہ رشتہ احترام کی اور مراعات کی حقدار ہے۔ اب رہا رحم کو کرایہ پر اٹھانے کا معاملہ تو یہ دودھ کو اجرت پر پلانے پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور کم از کم غیر معمولی حالات میں اس کی گنجائش سے انکار ممکن نہیں۔ میڈیکل سائنس کی روشنی میں اس عوضی ماں (Surrogate Mother) کا اس کے رحم میں پرورش پاتے ہوئے بچہ پر اثر پڑنے کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔ بچہ پر اس ماں کے ایام حمل اور رضاعت کے دوران جسمانی صحت اور دماغی ونفسیاتی حالت کا اثر پڑتا ہے مزید برآں اس بچہ پر ان جراثیم کا اثر بھی پڑ سکتا ہے جو قائم مقام ماں (Surrogate Mother) کے خون ودودھ میں موجود ہوتے ہیں مثلاً ہپاٹائٹس، ایڈز اور سفلس کے جراثیم، البتہ اس عورت کے موروثی یا پیدائشی امراض (Genetic and congenital dliseases) کا اس بچہ میں منتقل ہونے کا کوئی چانس نہیں ہے۔ وہ بچہ اپنے حیاتیاتی ماں اور باپ اور ان کے آباء واجداد ہی کی خامیاں وخوبیاں اور موروثی امراض اور موروثی طاقت (Strength) لے کر اس دنیا میں آئے گا ہاں البتہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا کہ بچہ کی حاملہ والدہ کے ذہنی تناؤ اور بعض دواؤں اور نشہ آور چیزوں کا اثر اس کی مجموعی (Overall) نشو ونما پر پڑتا ہے اور ایام حمل میں ڈاکٹر جو احتیاطی تدابیر بتاتے ہیں وہ اس ماں کو بھی بحسن وخوبی ادا کرنا ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسی مرد کا مادہ منویہ اس کی اپنی منکوحہ کے علاوہ کسی ضرورت مند جوڑے کی اولاد کے حصول کے لیے عطیہ کرنے میں کیا قباحتیں ہیں، خصوصاً جب کہ اسلام میں متبنّٰی کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی اور نہ اس کو وراثت میں حق ملتا ہے۔ ایسی حالت میں مادۂ منویہ کے عطیہ (Sperm donation) کے لین دین کو پسندیدہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ بعض مردوں کے مادۂ منویہ میں مادۂ تولید کی کثافت و گنتی (Sperm count) بہت کم ہوسکتی ہے، البتہ مادۂ منویہ کو گاڑھا کرنے کی طبی اور میکینکل ترکیبیں بہت حد تک کارگر ہوسکتی ہیں۔ البتہ اگر ان کوششوں کے باوجود بیضہ کی بارآوری میں کامیابی نہ مل سکے تو ہمارے نزدیک مادۂ تولید/ مادۂ منویہ کا معطی، ضرورت مند جوڑے کی اولاد کے حصول میں کوئی طبی مدد برائے نام ہی کرسکتا ہے۔ ہاں البتہ عورت کا بیضہ ضرور بارآور ہوجائے گا جس میں صحت مند مادۂ تولید ہی اغلباً اس بیضہ کو بارآور کردے گا لہٰذا نوزائدہ بچہ کا حیاتیاتی والد ستر تا پچانوے فیصد معطی (Sperm Donor) ہوگا اور قانونی باپ محض نام کا والد ہوگا حقیقی والد نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے ہی نطفہ سے اولاد ہونے پر اصرار کرے تو پہلے تو یہ جانچ کی جائے کہ بیضۂ عورت کس مرد کے نطفہ سے بارآور ہوا۔ اور ڈاکٹروں کی سنجیدہ اور بار بار کوشش (Hit & trial) سے اس باب میں کامیابی کی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ بچہ والد اور والدہ دونوں کی طرف سے ان کی اصلی حیاتیاتی اولاد ہو۔ اس سلسلہ میں جینیٹک فنگر پرنٹنگ کے بغیر محض خون کے گروپ کی بنیاد پر بچہ کے باپ کی شناخت قابل تسلیم نہیں ہونی چاہیے۔

یہاں ہم سوالنامہ سے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہوئے یہ بھی بتادیں کہ بے شک عورتوں میں بہت تیزی سے عمر کے ساتھ تولیدی صلاحیت معدوم ہوتی جاتی ہے جب کہ ماحول اور لائف اسٹائل بھی قوت تولید پر کسی نہ کسی حد تک ضرور اثر ڈالتے ہیں البتہ مردوں میں پینتالیس سال کی عمر تک قوت تولید میں کوئی نمایاں کمی نہیں آتی مگر کھانے پینے کی بداحتیاطی، آلودگی، ذہنی تناؤ، موٹاپا، ذیابیطس کا شکار ہوجانا اور بعض بلڈ پریشر کی دواؤں نیز نشہ آور یا دیگر ادویہ کے اثر سے قوت تولید کافی متاثر ہوسکتی ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ عام نوجوان مرد و عورت عموماً اور اولاد کے خواہش مند جوڑے خصوصاً اولاد کے معاملہ میں کسی قسم کی تاخیر نہ کریں۔

اب رہا کسی شخص کی بیوی میں بانجھ پن سے نپٹنے کا مسئلہ تو اس کے لیے جدید طریقے کافی حوصلہ افزا نتائج فراہم کررہے ہیں۔ لیکن اگر تمام جدید تکنیک و علاج کے باوجود کامیابی نہیں ملتی ہے اور اس کی وجہ ڈاکٹروں کے نزدیک صرف بیوی کے بیضہ میں قوتِ تولید کا فقدان ہی ہے تو اسلام میں اس کا سیدھا سادہ جواب یہی ہے کہ مرد کو اولاد کے حصول کے لیے دوسری شادی کرلینے ہی میں بہتری ہے اور وہ پہلی بیوی کو طلاق دیے بغیر اور اس سے محبت کم کیے بغیر بھی صاحبِ اولاد ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شادی شدہ مرد اپنی بانجھ بیوی ہی کو اپنے گھر میں رکھتے ہوئے اور دوسری شادی کیے بغیر ہی صاحبِ اولاد ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے تہذیب جدید نے ایک راستہ اور کھول دیا ہے اور وہ ہے کسی دوسری عورت کے بیضہ کا عطیہ لے کر اس شخص کے مادہ منویہ سے ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری اور اس بارآور شدہ بیضۂ غیر منکوحہ کا اپنی منکوحہ بیوی کے رحم میں امپلانٹ (Implant) کرانا اور اس طرح اپنی بیوی کو حمل، ولادت اور رضاعت کے مراحل سے گزروانا۔ اس طریقہ سے ہونے والی

اولاد اس مرد کی ہے تو بے شک وہ حیاتیاتی اور قانونی اولاد ہوگی البتہ اس مرد کی منکوحہ بیوی کی وہ صرف خونی، رحمی اور رضاعی رشتوں سے تو اس کی اولاد ہوگی مگر وہ اس کی حیاتیاتی اولاد نہیں ہوگی۔ لہٰذا احقر کے قیاس کے مطابق یہ اولاد اس مرد کے ترکہ کی وارث تو ہوگی مگر اس منکوحہ بانجھ عورت کے ترکہ کی وارث نہیں ہوگی ہاں بے شک قانونِ وصیت وہبہ کی بنیاد پر وہ جو کچھ چاہے اس اولاد کے نام کر سکتی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ علماء کرام، نسب و نطفہ، جنسی عمل، عصمت و آبرو، شرم گاہ اور رحم اور اولاد وغیرہ سبھی اصطلاحوں کی بدلتے زمانہ و حالات میں تعریفات وضع اور متعین کریں۔ ساتھ ہی ساتھ معاشرہ میں تعدد ازدواج کی اسلامی اجازت جو عدل سے مشروط ہے، اس کے لیے بھی ذہن سازی کریں اور زن وشو کے رشتوں کو مزید مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کے تئیں وفاداری کی تربیت دیں۔ یہ ماضی کی داستان نہیں بلکہ بلادِ عرب میں تو آج بھی کئی بیویاں بہ یک وقت خوش وخرم زندگی گزارتی ہیں۔

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا اپنے مادہ منویہ یا بیضہ کو محفوظ کر لینے کی گنجائش ہے تو ہمارے نزدیک اس کا جواب ہاں میں ہے بلکہ مندرجہ بالا ساری بحث میں جو قباحتیں پائی جاتی ہیں وہ یہاں ختم ہو جاتی ہیں، لیکن کسی شخص کا مادہ تولید یا بیضہ قیمتاً یا ہدیتاً دینا یعنی اس کی تجارت کرنا اخلاق و قانونِ اسلامی سے مغایر معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور سوال تشنۂ جواب ہے کہ عام حالات میں کوئی شخص اپنا مادۂ تولید یا بیضہ کیوں محفوظ کرانا چاہتا ہے کیا اس کو متعدد اولاد اور بڑھاپے کی اولاد کی خواہش ہے اس کا جواب آج کل نفی میں ہی ہوگا تو پھر وہ اپنی اولاد کو مؤخر کیوں کرنا چاہتے ہیں اس کا تشفی بخش جواب کسی کے پاس نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم نے مغرب کی غیر اسلامی طرز زندگی ہی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا شروع کر دیا ہے اور ہم اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کاش ہمیں اس کا بھی شعور ہوتا، ہمیں اس سے انکار نہیں کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو ڈاکٹر یہ صلاح دے کہ اس مرض میں یا اس آپریشن کے بعد اندیشہ ہے کہ تولیدی قوت ختم ہو جائے لہٰذا مادہ تولید کو محفوظ کرا دیں تو ہمارے نزدیک ایسا کرنا جائز ہو سکتا ہے کیونکہ اسلام میں اولاد کی خواہش اور زیادتی پسندیدہ ہے۔ **اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه۔**

☆☆☆

سائنسدانوں نے مصنوعی خون تیار کرلیا

اب اسے صنعتی سطح پر بھی تیار کیا جاسکتا ہے، اور خون کی بے حد سپلائی ہوگی

سائنسدانوں نے انسانی خون پیدا کرنے کا طریقہ دریافت کرلیا ہے اور یہ اب صنعتی سطح پر بھی تیار کیا جائے گا، ایڈبرگ یونیورسٹی کے پروفیسر مارک ٹرنر کے اس پروگرام کے تحت ویلکم ٹرسٹ کے تعاون سے یہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اس طریقہ کے تحت سائنسدانوں کو امید ہے کہ وہ او(O) قسم کے خون کے سرخ خلئے بے حد وحساب مقدار میں فراہم کرسکیں گے، جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہوں گے اور انہیں مریض کے جسم میں پہنچایا جاسکے گا، کسی زخم یا سرجری کے بعد خون کے ضائع ہونے کے صورت میں خون انسانی جسم میں پہنچایا جاتا ہے تاکہ خون کی کمی کو فی الفور دور کیا جاسکے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ کی رپورٹ کے مطابق ہر سال ۵۰ لاکھ امریکیوں کے جسم میں خون پہنچانے کی ضرورت پیش آتی ہے، پلوری پوٹم اسٹیم خلیوں کے ذریعہ، عمومی خلئے انسانی جسم سے نکل جاتے ہیں اور پھر اسٹیم خلیوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں، پروفیسر ٹرنر اور ان کی ٹیم او(O) قسم کے سرخ خون کے خلئے تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے، اس تکنیک کو پہلی بار زندہ انسانی جسم میں استعمال کرکے اس کی جانچ کی جائے گی، یہ تجربہ ۲۰۱۶ء یا ۲۰۱۷ء میں کیا جائے گا، سائنسداں یہ تجربہ ایسے مریضوں پر کریں گے جو تھیلاسیما (خون کی ایک بیماری جس میں مریض کے بدن میں بار بار خون چڑھانے کی ضرورت پیش آتی ہے) میں مبتلا ہیں۔

اگرچہ کئی اور جگہ بھی ایسے متعدد تجربات کئے جاچکے ہیں لیکن یہ پہلی بار ہے جب ایسا خون اس مناسب مقدار میں بحفاظت تیار کیا گیا جسے انسانی جسم میں پہنچایا جاسکتا ہے، سائنسداں پروفیسر ٹرنر نے جریدہ ٹیلی گراف کو بتایا۔

خون کی آٹھ مختلف اقسام ہوتی ہیں ان میں سے چار اہم ہیں۔ امریکن ریڈ کراس کے مطابق خون کی اقسام کی تعین ان میں بعض اینٹی جنس کی موجودگی کی بنیاد پر کی جاتی ہے، کیونکہ یہ مادہ جسم میں بیرونی مادہ ہوتا ہے، اس لئے جسم اس سے حفاظت کے لئے حرکت کرتا ہے، یہ بات بھی اہم ہے کہ جو لوگ بیرونی خون اپنے جسم میں داخل کرواتے ہیں ان کے خون کی قسم (نوع) خون کا عطیہ دینے والے شخص کے خون کے مطابق ہونی چاہئے۔

خون کے جو اہم گروپ ہیں ان میں گروپ اے (A) گروپ (B) گروپ (AB) اور گروپ (O)، مؤخر الذکر گروپ کے پلازمہ میں A اور B گروپ کے اجزاء ہوتے ہیں لیکن خون کے سرخ خلیوں میں B،A، اینٹی جنس نہیں ہوتے اور گروپ O خون والے عطیہ دہندگان کسی کو بھی خون کا عطیہ دے سکتے ہیں لیکن گروپ A قسم کا خون والے صرف گروپ A یا گروپ AB والے مریض کو ہی اپنا خون دے سکتے ہیں۔

خون کے گروپ کی تعیین منفی اور مثبت علامتوں سے بھی کی جاتی ہے جو آر ایچ فیکٹر کے ذریعہ ہوتی ہے، جو ایک تیسرا اینٹی جنس ہے، آبادی کے تقریباً ۴۰ فیصد افراد خون کے O گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ بڑا عام گروپ ہے۔

ہپی ٹائٹس بی اور HIV بیماریوں کے سبب پہلے خون منتقل کرنا کافی خطرناک تھا اب خون کا عطیہ حاصل کرنے والے بنک عطیہ دینے والوں کے خون کی ان بیماریوں کے بارے میں اچھی طرح جانچ کر لیتے ہیں، اب خون کے بینکوں کے پاس انگلینڈ میں وافر مقدار میں خون موجود ہے اور اسے بحفاظت مریض کے جسم میں منتقل کیا جاتا ہے، تاہم ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ء کے ہپی ٹائی ٹس بی اور HIV کے بعض اثرات اب بھی خون کی منتقلی میں پیچیدگی پیدا کرتے ہیں، پروفیسر ٹرنر نے یہ بات جریدہ ٹیلی گراف کو بتائی، گذشتہ سال ٹرانسلوانین یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے مصنوعی خون تیار کیا تھا اور چوہوں پر اس کی کامیاب جانچ بھی کی تھی، لیکن پروفیسر راڈ وسلیغ اور ان کی ٹیم جو بیبس بولیائی یونیورسٹی رومانیہ سے تعلق رکھتے تھے وہ ذرائع اور وسائل کی کمی کے باعث انسانوں پر اس کا تجربہ نہیں کر سکے انسانوں پر تجربہ کرنا بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے جس میں بڑے پیچیدہ لائسنس کی ضرورت پڑتی ہے اور ان میں بہت خطرہ بھی ہوتا ہے، پروفیسر سلیغ نے بتایا۔

اسی طرح متبادل خون بھی اسٹیم خلیوں سے ہونا چاہئے جیسا کہ پروفیسر ٹرنر کے پروجیکٹ کے تحت تیار کیا گیا ہے، رابرٹ لانزا چیف سائنٹفک آفسر ادارہ ایڈوانس سیل ٹیکنالوجی نے گروپ O خون کی بڑی مقدار میں فراہمی کی کوشش کی تھی۔ ۲۰۰۸ء میں کمپنی نے کہا تھا کہ اس کے پاس ۱۰ ملین سرخ خون کے خلئے موجود ہیں جو انسانی جنین کے اسٹیم خلیوں سے حاصل کئے گئے ہیں اگر چہ انسانی جسم میں خون منتقل کرنے کے لئے اسے کئی کھرب خلیوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں مقصد ریڈ کراس کو اس کام سے خارج کرنا نہیں ہے، پروفیسر لانزا نے جریدہ پاپولر میگزین کو بتایا کہ عطیہ کردہ خون گویا دفاع کی پہلی صف ہیں لیکن اس ٹکنالوجی سے آپ کو ایک حفاظت کا دائرہ مل جائے گا، اب یہ سائنسداں پروفیسر لائنزا ہوں، پروفیسر ٹرنر یا کوئی دوسرا سائنسداں اب یہ محض تھوڑے وقت کی بات ہے سائنسداں مصنوعی خون کو انسانی جسم میں کامیابی کے ساتھ منتقل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

☆☆☆

تیسرا باب

تفصیلی مقالات

اجزاءواعضاءانسانی کا عطیہ

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی☆

مختلف دواؤں کے ذریعہ بیماریوں کا علاج زمانہ قدیم سے بنی نوع انسان کا طریقہ کار رہا ہے۔قدیم زمانے میں بعض بناتات سے علاج کیا جاتا تھا،اسی طرح بعض جمادات سے بھی علاج ہوا کرتا تھا۔آج بھی بے شمار نباتات، جڑی بوٹیاں وغیرہ دواؤں میں استعمال ہوتی ہیں اور ان سے مختلف امراض کی دوائیں بنائی جاتی ہیں،بعض حیوان کے اجزاء بھی دواء کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں،شہد کا شفاء ہونا خود قرآن کریم میں مذکور ہے۔حدیث میں اونٹنی کے دودھ اور اس کے پیشاب سے بھی علاج کا ذکر ملتا ہے،البتہ موجودہ دور سے پہلے انسانی اجزاء سے علاج کا ذکر عام طور سے نہیں ملتا۔ایک انسان کا خون دوسرے ضرورت مند انسان کو چڑھانا،ایک شخص کے کسی عضو کی دوسرے انسان کے جسم میں پیوند کاری مثلاً گردہ،آنکھ،جگر وغیرہ کی پیوند کاری۔یہ اس سائنسی ترقی کے دور کی چیزیں ہیں، پہلے زمانے میں ان کا تصور بھی نہیں تھا۔اسی سلسلے میں چند سوالات کے جواب ذیل میں تحریر کئے جارہے ہیں۔

۱-　یہ بات معلوم ہے کہ ضرورت کے وقت ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں داخل کیا جاسکتا ہے،اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔اگرچہ خون ناپاک ہوتا ہے جس کا استعمال حرام ہے، نیز خون انسانی جزء بھی ہے جزء انسانی سے فائدہ اٹھانے سے فقہاء کرام منع کرتے ہیں۔اس لئے یہاں پر دو مسئلے ہیں تداوی بالحرام اور انتفاع بجزء الآدمی۔ذیل میں ان دونوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے۔

حدیث میں حرام چیز سے علاج کرنے کی ممانعت ملتی ہے،حضرت ابوالدرداءرضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”إن الله عزوجل أنزل الداء والدواء وجعل لكل داءٍ دواءً فتداووا ولا تداووا بحرام“ (سنن أبی داؤد، کتاب الطب، السنن الکبری للبیہقی)۔

☆　المعہد العالی، پھلواری شریف، پٹنہ۔

(اللہ تعالی نے بیماری اور دوا دونوں نازل کی ہے، ہر بیماری کے لئے دواء بنائی ہے،توتم لوگ دوا سے علاج کرواور حرام چیز سے علاج نہ کرو)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:"**نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الدواء الخبيث**"(السنن الکبری للبیہقی)(حضورﷺ نے خبیث دوا سے منع فرمایا)۔

لیکن محدثین تحریر کرتے ہیں کہ جب ضرورت نہ ہواور اس مرض کی دوسری دوائیں موجود ہوں توحرام چیزوں سے علاج جائزنہیں ہے،البتہ جب شدید ضرورت ہواور کوئی دوسرا ذریعۂ علاج نہ ہوتوحرام اشیاء سے بھی علاج جائز ہے۔اس کی دلیل حدیث عرینہ میں ملتی ہے جس میں حضور نے کچھ مریضوں کواونٹنی کے پیشاب پینے کاحکم دیا تھا۔امام بیہقی لکھتے ہیں:

"**وهذان الحديثان وإن صحا فمحمولان على النهى عن التداوى بالمسكرأوعلى التداوى بكل حرام فى غير حال الضرورة ليكون جمعاً بينهما وبين حديث العرنيين**"(السنن الکبری للبیہقی ۵/۱۰)۔

(یہ دونوں حدیثیں اگرصحیح ہوں تو نشہ آور چیز سے علاج کی ممانعت پر یا بلاضرورت ہرحرام چیز سے علاج کی ممانعت پرمحمول ہوں گی تاکہ ان دونوں حدیثوں اورقبیلہ عرینہ والی حدیث کے درمیان جمع ومطابقت ہوسکے)۔

امام بغوی تحریر کرتے ہیں:

"**واختلف أهل العلم فى التداوى بالشيىء النجس فأباح كثير منهم تناول الشيىء النجس للتداوى إلا الخمرل،أن النبي ﷺأباح للرهط العرنيين شرب أبوال الإبل، وحرم أكثر أهل العلم تناول الخمرللتداوى لقول النبى ﷺ: "إنها ليست بدواءٍ ولكنها داء**"(شرح السنۃ ۱۲/۴۰)۔

(نجس چیز سے علاج کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔بہت سارے لوگوں نے علاج کے لئے نجس چیز استعمال کرنے کوجائزقرار دیا ہے سوائے شراب کے،کیونکہ حضرت رسول اللہﷺ نے عرینہ والوں کواونٹ کے پیشاب پینے کی اجازت دی تھی اوراکثراہل علم نے علاج کے لئے شراب کے استعمال کوحرام کہا ہے حضورﷺ کے اس قول کی وجہ سے کہ شراب دواءنہیں ہے بلکہ بیماری ہے)۔

فقہاءکرام بھی ضرورت کے وقت حرام اشیاء سے علاج کی اجازت دیتے ہیں۔

"**ووقع الاختلاف بين مشائخنا فى التداوى بالمحرم ففى النهاية عن الذخيرة :الاستشفاء بالحرام يجوز إذا علم أن فيه شفاءً ولم يعلم دواء آخر، وفى فتاوى قاضى خان معزياً إلى نصر بن سلام معنى قوله عليه السلام : " إن الله لم يجعل شفاء كم فيما حرم عليكم "إنما قال ذلک فى الأشياء التى لايكون**

فیها شفاء، فأما إذاکان فیه شفاء فلا بأس به، ألا تری أن العطشان یحل له شرب الخمر للضرورة"(البحرالرائق ۱ر۳۴۷)۔

(حرام چیزوں سے علاج (کے جواز) کے بارے میں ہمارے مشائخ میں اختلاف ہے۔ نہایہ میں ذخیرہ سے منقول ہے کہ حرام چیز سے شفاء حاصل کرنا اس وقت جائز ہے جب یہ معلوم ہو کہ اس میں شفاء ہے اور اس کی کوئی دوسری دواء معلوم نہ ہو، اور فتاوی قاضی خاں میں حدیث: (یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے) اللہ تعالی نے تم پر جو چیز حرام کی ہے ان میں شفاء نہیں رکھی ہے۔ اس کے معنی امام نصر بن سلامؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ یہ ان چیزوں کے بارے میں ہے جن میں شفاء نہیں ہے، البتہ جن چیزوں میں شفاء ہے تو ان (سے علاج کرانے) میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دیکھ لیجئے کہ پیاسے شخص (پیاس سے جس کی جان جانے کا اندیشہ ہو) کے لئے ضرورت کی وجہ سے (جان بچانے کے لئے) شراب پینے کی اجازت ہے)۔

"**واختلف فی التداوی بالمحرم وظاهر المذهب المنع کما فی رضاع البحر، ولکن نقل المصنف ثمة وهنا عن الحاوی: وقیل یرخص إذا علم فیه الشفاء ولم یعلم دواء آخرکما رخص الخمر للعطشان وعلیه الفتوی**"(الدرالمختار، کتاب الطھارۃ)۔

(حرام چیز سے علاج کرانے میں اختلاف ہے۔ ظاہر مذہب عدم جواز کا ہے، جیسا کہ بحر کی کتاب الرضاع میں ہے، لیکن مصنف نے وہاں اور یہاں بھی حاوی سے نقل کیا ہے کہ ایک قول میں اس کی اجازت ہے جب اس میں شفاء کا علم ہو اور کوئی دوسری دواء معلوم نہ ہو۔ جیسا کہ پیاسے کو شراب پینے کی رخصت دی گئی ہے اور اسی پر فتوی ہے)۔

الغرض کسی حرام چیز کے بارے میں جب معلوم ہو کہ اس کے استعمال سے بیماری میں شفاء حاصل ہوگی اور اس مرض کی اس کے سوا کوئی دوسری دواء نہیں ہے تو اس سے علاج جائز ہے۔

دوسرا مسئلہ جزء انسانی سے انتفاع کا ہے۔ فقہاء کرام تحریر فرماتے ہیں کہ انسانی اجزاء سے انتفاع اور علاج کے لئے ان کا استعمال جائز نہیں ہے۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔

"**الانتفاع بأجزاء الأدمی لم یجز**"(ہندیہ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات ۵ر۳۵۴)(آدمی کے اجزاء سے انتفاع جائز نہیں ہے)۔

اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ انسانی تکریم کے خلاف ہے کہ اس کے جزء بدن کو مبتذل کیا جائے۔ انسانی جسم کا احترام ضروری ہے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ یہ اس کی تکریم واحترام کے منافی ہے کہ اس کے جسم کے حصوں یا کسی جزء کو دوسرا شخص استعمال کرکے پامال کرے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

”حرمة الانتفاع بأجزاء الأدمی لكرامته“(ہدایہ) (آدمی کی تکریم واحترام کی وجہ سے اس کے اجزاء سے انتفاع حرام ہے)۔

علامہ اکمل بابرتی صاحب عنایہ اس پر فرماتے ہیں:

”لئلا يتجاسرالناس علی من كرمه الله بابتذال أجزائه“(عنایہ ۱/۱۲۸) (تاکہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قابل تکریم بنایا ہے لوگ اس کے اجزاء کو مبتذل کرنے کی جرأت نہ کریں)۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

” أما جلد الآدمی فليس فيه إلا كرامته وهو ماذكره بقوله ”حرمة الانتفاع بأجزاء الأدمی لكرامته “ ولايخفی أن هذا مقام آخرغيرطهارته بالدباغة وعدمها، فلذا صرح فی العناية بأنه إذا دبغ جلد الآدمی طهر، ولكن لايجوز الانتفاع به كسائر أجزائه“(فتح القدیر، فصل فی الغسل ۱/۹۳)۔

(آدمی کی جلد (سے انتفاع کی حرمت) میں صرف اس کی کرامت (کا اثر) ہے۔ مصنف نے اپنے اس قول سے اس کا ذکر کیا ہے کہ ”آدمی کے احترام کی وجہ سے اس کے اجزاء سے انتفاع حرام ہے۔“ یہ مخفی نہ رہے کہ یہ دباغت کے ذریعہ طہارت یا عدم طہارت کے علاوہ دوسری بحث ہے، اسی لئے عنایہ میں صراحت کی ہے کہ جب آدمی کی جلد کو دباغت دیدی جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے۔ لیکن انسان کے دوسرے اجزاء کی طرح اس سے بھی انتفاع جائز نہیں ہے)۔

مگر بعض مسائل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شدید ضرورت کے وقت جب علاج کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو تو بعض انسانی اجزاء سے انتفاع اور علاج کی اجازت ہے۔

اس سلسلے میں پہلی چیز یہ ہے کہ ضرورت کی بناء پر عورتوں کا چھوٹے بچے کو شیر خوارگی کی عمر میں دودھ پلانا جائز ہے جب کہ دودھ انسانی جسم کا جزء ہوتا ہے۔ اس کے جواز پر تو سب کا اتفاق ہے خواہ اپنے بچے کو دودھ پلائے یا دوسرے کے بچے کو، قرآن اور حدیث میں اس کی اجازت موجود ہے۔ فقہ کی کتابوں میں اس کے احکام کے بیان کے لئے ایک پورا باب ہی ”باب الرضاع“ کے نام سے ملتا ہے، البتہ مدت رضاعت تک ہی دودھ پلانے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے ممانعت ہے۔

کتب فقہ میں رضاعت کے علاوہ بعض دوسرے مسائل بھی ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام نے ضرورت کے وقت انسانی اجزاء کے ذریعہ علاج کی اجازت دی ہے۔ مثلاً اطباء آنکھوں کے درد کے لئے عورت کے دودھ کو مفید بتاتے ہیں، اس لئے بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے کہ آنکھ کی تکلیف میں مبتلا شخص اپنی آنکھ میں عورت کا دودھ ڈال سکتا ہے اگر یہ معلوم ہو کہ اس سے تکلیف ختم ہوجائے گی۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

"وهل يباح الإرضاع بعد المدة قيل: لا، لأنه جزء الآدمي، فلايباح الانتفاع به إلا للضرورة وقداندفعت، وعلى هذا لايجوز الانتفاع به للتداوي، وأهل الطب يثبتون للبن البنت أي الذي نزل بسبب بنت مرضعة نفعاً لوجع العين، واختلف المشائخ فيه قيل: لايجوز، وقيل: يجوز إذا علم أنه يزول به الرمد،ولايخفى أن حقيقة العلم متعذرة، فالمراد إذا غلب على الظن، وإلا فهو معنى المنع" (فتح القدیر، کتاب الرضاع)۔

(کیامدت رضاعت کے بعد دودھ پلانا جائز ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ آدمی کا جزء ہے،اس سے بلاضرورت انتفاع جائز نہیں ہے اور (یہاں) ضرورت پوری ہوچکی ہے۔اسی بنیاد پرعلاج کے لئے بھی اس کا استعمال جائز نہیں ہے، اطباء مرضعہ کی بیٹی کی وجہ سے آئے دودھ کو آنکھ کی تکلیف میں مفید مانتے ہیں، مشائخ کا اس میں اختلاف ہے،ایک قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے۔ایک قول یہ ہے کہ جب معلوم ہو کہ آنکھ کی تکلیف اس سے دور ہوجاتی ہے تو جائز ہے، یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کا یقینی علم تو متعذر رہے اس لئے اس سے مرادظن غالب ہے، ورنہ (یقینی علم نہ ہونے کہ وجہ سے) وہ منع ہی ہوگا)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے کہ امراض میں بطور دوا عورت کے دودھ کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔یعنی علاج کے لئے ناک میں بھی ڈالا جاسکتا ہے اور پیا بھی جاسکتا ہے۔

"ولابأس بان يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء" (ھندیۃ۵/۳۵۵)۔

(دوا کے طور پر عورت کا دودھ ناک سے مرد کو دیا جاسکتا ہے۔دوا کے لئے مرد اس کو پی بھی سکتا ہے)۔

علامہ شامی نہایہ اور تہذیب سے نقل کرتے ہیں کہ بیمار شخص کے لئے بطور دوا خون، پیشاب اور مردار کا استعمال جائز ہے جب کسی مسلم طبیب نے بتایا ہو کہ اس میں شفاء ہے اور اس کی کوئی دوسری مباح دوا نہ ہو۔

قال في النهاية: "وفي التهذيب: يجوز للعليل شرب البول والدم والميتة للتداوي إذا أخبره طبيب مسلم أن فيه شفاء ه، ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه" (ردالمحتار، مطلب فی التداوی بالمحرم)۔

(نہایہ میں ہے کہ تہذیب میں ہے: بیمار کے لئے پیشاب پینا اور خون پینا اور میتہ کھانا علاج کے لئے جائز ہے جب اس کو کسی مسلم طبیب نے خبر دی ہو کہ اس میں اس کی شفاء ہے اور کوئی مباح دوا اس کے قائم مقام نہیں پاتا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شدید ضرورت کے وقت انسانی اجزاء کا استعمال اور اس سے علاج کرانا جائز ہے جب طبیب حاذق نے اس سے علاج میں شفاء کی نشاندہی کی ہو اور اس سے سوا کوئی دوسرا ذریعۂ علاج نہ ہو۔

اس لئے خون کے نجس اور جزء انسانی ہونے کے باوجود ضرورت کی وجہ سے خون چڑھانا بھی جائز ہے، کیونکہ معلوم ہے کہ اس کا کوئی دوسرا بدل نہیں ہے اور اس کی وجہ سے مرض سے شفاء یابی ہوجاتی ہے۔

یہاں پر سوال ہے کہ دوسرے شخص کو خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ضرورت کے وقت خون کا عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جہاں تک کسی ضرورت مند مریض کو خون دینے کا تعلق ہے تو اس میں حجامت یعنی فصد کھلوانے کے حکم سے بھی استیناس کیا جاسکتا ہے۔ حجامت یعنی فصد کھلوانے کی اجازت ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی خون نکلوایا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے۔

"**عن ابن عباس أن النبی ﷺ احتجم وأعطی الحجام أجره واستعط**" (صحیح مسلم، باب لکل داء دواء)۔

(حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فصد کھلوایا اور فصد کھولنے والے کو اس کی اجرت دی اور ناک میں دوا ڈالی)۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**إن کان فی شیء من أدویتکم خیر ففی شرطة محجم أو شربة من عسل أو لذعة بنار**" (صحیح مسلم، باب لکل داء دواء) (اگر تم لوگوں کی دواؤں میں سے کسی میں خیر ہو تو پچھنا لگانے میں یا شہد پینے میں یا آگ سے داغنے میں ہوگی)۔

حجامت میں اپنی ضرورت کی وجہ سے جسم سے خون نکلوایا جاتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص دوسرے شخص کی ضرورت کی بناء پر اس کو اپنا خون دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔ خون ایسی چیز ہے جس کو ایک خاص مقدار میں نکلوانے کے بعد کچھ دنوں میں جسم اس مقدار میں خون تیار کرلیتا ہے جس سے جسم میں اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے، اس لئے خون نکلوانے سے جسمانی اعتبار سے انسان کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، اس لئے اس کو دودھ پر قیاس کرنا بھی درست ہے کہ جس طرح ضرورت کے وقت دودھ پلانے کی اجازت ہے یا دواء کے طور پر دودھ کا استعمال جائز ہے، اسی طرح کسی ضرورت مند مریض کو جس کے جسم میں خون کی کمی ہوگئی ہے خون دینا بھی جائز ہوگا۔

اب سوال ہے کہ کسی غیر مسلم کو خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جب کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سے خون کا عطیہ لے سکتا ہے تو اس کو خون کا عطیہ دے بھی سکتا ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کفر وشرک کی خرابی وخباثت کا تعلق کافر کے عقیدہ سے ہوتا ہے نہ کہ کافر کے جسمانی اجزاء سے۔ بعض انبیاء علیہم السلام نے بچپن میں کافر عورتوں سے دودھ پیا ہے، فقہاء کرام بھی اس کی اجازت دیتے ہیں کہ مسلم بچے کو دودھ پلانے کے لئے کسی کافر عورت کو اجارہ پر لیا جائے۔ مبسوط میں ہے:

"ولابأس بأن يستأجر المسلم الظئر الكافرة أوالتي قد ولدت من الفجور لأن خبث الكفر في اعتقادها دون لبنها، والأنبياء عليهم السلام والرسل صلوات الله عليهم فيهم من أرضع بلبن الكوافر، وكذلك فجورها لا يؤثر في لبنها" (مبسوط ۱۵/۲۳۱ باب اجارۃ الظئر)۔

(مسلمان شخص کافرہ یا فاجرہ دودھ پلانے والی کو اجرت پر لے سکتا ہے۔اس لئے کہ کفر کی خباثت اس کے اعتقاد میں ہے اس کے دودھ میں نہیں ہے۔انبیاء علیہم السلام میں سے بعض نے (بچپن میں) کافر عورتوں کا دودھ پیا ہے۔اسی طرح اس کا فجور بھی اس کے دودھ میں اثر انداز نہیں ہوتا ہے)۔

ویسے بھی اللہ تعالی نے غیر محارب کفار سے صلہ وحسن سلوک کرنے سے منع نہیں فرمایا ہے بلکہ اس کی اجازت دی ہے۔

"لاينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (ممتحنہ ۸) (اللہ تعالی تم کو ان لوگوں سے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، حسن سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے منع نہیں فرماتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالی انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

جب کسی کافر عورت کا دودھ پینا جائز ہے تو کسی کافر سے خون لینا بھی جائز ہوگا کیونکہ کفر اور فسق وفجور کی خباثت اس کے جسمانی اجزاء میں نہیں ہوتی ہے، اس کے عقیدے میں ہوتی ہے۔اسی طرح کسی کافر کو خون دینا بھی درست اور جائز ہوگا۔ کیونکہ یہ کسی غیر محارب کافر کے ساتھ حسن سلوک ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

۲- بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟

بلڈ بینک کا قیام اچھے مقاصد کے لئے ہوتا ہے کہ اگر کوئی آفت ناگہانی پیش آجائے یا کوئی غیر معمولی حادثہ ہوجائے جس میں بہت سارے مجروح لوگوں کو خون چڑھانے کی ضرورت ہوجاتی ہے تو اس وقت بلڈ بینک میں وافر مقدار میں خون موجود رہے اور سب کو خون فراہم کیا جا سکے۔اسی طرح کسی مریض کو کسی خاص گروپ کا خون چاہئے جو وقت پر جلدی دستیاب نہیں ہوتا ہے تو بلڈ بینک سے اس گروپ کا خون وہ لے سکتا ہے۔اس کو اس گروپ کے خون کے لئے اشخاص کو تلاش کرنے اور ان سے درخواست کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ایسے بلڈ بینک میں جس سے ضرورت مندوں کو خون دیا جاتا ہو اپنا خون عطیہ کرنا تاکہ ضرورت کے وقت کسی مریض کو وہ خون دیا جا سکے جائز ودرست ہوگا۔ کیونکہ اس میں بھی کسی کی جان بچانے کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔اس میں خون

دیتے وقت بظاہر کوئی متعین ضرورت مند مریض سامنے نہیں ہوتا ہے مگر اس کا ظن غالب ہوتا ہے کہ جو خون دیا جارہا ہے وہ کسی ضرورت مند مریض کو ہی دیا جائے گا۔

۳-مسلمانوں کے لئے ایسے رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مستقبل کی ضروریات کے لئے پہلے سے تیاری کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ظاہر ہے۔انہوں نے مصر میں حکومت کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہو کر مستقبل میں آنے والی قحط سالی کے مقابلہ کے لئے کئی سال قبل سے تیاری کر لی تھی۔قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔امام بغوی فرماتے ہیں:

"فلما اطمئن يوسف في ملكه دبر في جمع الطعام بأحسن التدبير، وبنى الحصون والبيوت الكثيرة، وجمع فيها الطعام للسنين المجدبة، وأنفق بالمعروف حتى خلت السنون المخصبة، ودخلت السنون المجدبة بهول لم يعهد الناس مثله" (معالم التنزیل للبغوی،تفسیر سورہ یوسف)۔

(جب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے ملک میں مطمئن ہو گئے تو انہوں نے بہترین طریقہ سے غلہ جمع کیا اور قلعے اور بہت سارے گھر بنائے۔ان میں قحط کے سالوں کے لئے غلہ جمع کرلیا اور مناسب طریقے سے خرچ کیا یہاں تک کہ شاداب سال گزر گئے اور قحط زدہ سال لوگوں کے تصور سے زیادہ ہولناکی کے ساتھ آ گئے)۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے قحط سالی سے قبل زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے کا حکم دیا تھا اور ضرورت کے مطابق خرچ کے بعد باقی اناج جمع کرا کے رکھ دیا تھا تاکہ سات سالہ شدید قحط سالی کے دور میں وہی اناج عوام الناس کو کام آئے اور اس کے لئے اس وقت جو بہترین تدبیر ہوسکتی تھی وہ کی تھی۔یہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات کے مقابلہ کی تیاری تھی۔

اسی طرح مسلمان مستقبل میں پیش آنے والے اس طرح کے واقعات کے لئے جن میں خون کی ضرورت پڑے گی اگر پہلے سے تیاری کرلیں اور بلڈ بینک قائم کر کے اس میں خون جمع رکھیں تو اس میں عدم جواز کی کوئی بات نہیں ہے۔یہ شرعی اعتبار سے جائز اور درست ہے۔اس سے ضرورت مند مریضوں کی ضرورت پوری ہوگی اور دنیا کے سامنے ایک اچھا پیغام جائے گا کہ مسلم تنظیموں کی طرف سے بھی عوامی خدمات کے لئے کام کئے جارہے ہیں۔جب مسلمان خود یہ کام کریں گے تو عطیہ کی بنیاد پر یہ کام ہوگا۔لوگوں سے خون کا عطیہ لیں گے اور مریضوں کو خون عطیہ کریں گے۔اس میں خون کی خرید وفروخت نہیں ہوگی۔

۴- ایسی صورت میں کہ جب کسی مریض کو کسی خاص گروپ کے خون کی شدید ضرورت ہو اور وہ خون عام طور سے

دستیاب نہیں ہے، البتہ ایک شخص کے خون کا وہی گروپ ہے اور وہ دینے پر قادر بھی ہے اور اس کو بظاہر اس سے کوئی ضرر پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں ہے تو اس شخص کے لئے اس مریض کو اپنا خون دینا مستحب کے درجہ میں ہوگا۔ واجب نہیں ہوگا۔ عدم وجوب دو وجہوں سے ہے:

(الف) کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد منقول ہے: **"من استطاع منكم أن ينفع أخاه فلينفعه"** (صحیح مسلم، باب استحباب الرقیۃ) (تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچانے پر قادر ہو اس کو چاہئے کہ اپنے بھائی کو فائدہ پہنچائے)۔

اس حدیث سے دوسرے کو فائدہ پہنچا کر اس کی مدد کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ وجوب ثابت نہیں ہوتا ہے کیونکہ آپ کا یہ ارشاد رقیہ (جھاڑ پھونک) سے متعلق ایک سوال کے جواب میں تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رقیہ سے منع فرمایا تھا۔ عمرو بن حزمؓ کے خاندان کے لوگ آئے، انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگوں کے پاس ایک رقیہ ہے جس سے ہم لوگ بچھو کا جھاڑ کرتے ہیں، مگر آپ نے رقیہ سے منع فرمادیا ہے۔ ان لوگوں نے وہ رقیہ آپ کو پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچانے پر قادر ہو اس کو چاہئے کہ اپنے بھائی کو فائدہ پہنچائے (مسلم، باب استحباب الرقیۃ)۔

یہ ارشاد نبوی ﷺ رقیہ کے بارے میں تھا اور رقیہ کرنا کسی کے نزدیک واجب نہیں ہے، البتہ جائز ہے۔ اس لئے دوسرے کے علاج کے لئے اس کو خون دینا اس حدیث کے اعتبار سے بھی جائز یا زیادہ سے زیادہ مستحب ہوگا، واجب نہیں ہوگا۔

(ب) مریض شخص کو خود اپنے مرض کا علاج کرانا بھی واجب نہیں ہے، جائز یا مستحب ہے۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بیماری میں قدرت کے باوجود اپنا علاج نہیں کراتا یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہوجاتی ہے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا، اگر علاج کرانا واجب ہوتا تو وہ ترک واجب پر گنہگار ہوتا۔ اس کا گنہگار نہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ بیماری کا علاج واجب نہیں ہے۔

"ومن امتنع من التداوی حتی مات لایأثم لأنه لا يقين بأن هذا الدواء يشفيه ولعله يصح من غير علاج" (الاختیار شرح المختار ۱۸۶/۴) (جس نے علاج نہیں کرایا یہاں تک کہ اس کی موت ہوگئی تو وہ گنہگار نہیں ہوگا، کیونکہ یہ یقینی بات نہیں ہے کہ اسی دوا سے شفاء ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بغیر علاج کے صحت مند ہوجائے)۔

"ولاجناح علی من تداوی إذا كان يری أن الشافی هوالله دون الدواء ... ولوأخبره طبيب

بالدواء فلم يتداوَ حتى مات لا يأثم" (تبیین الحقائق ۶/۳۳) (جس نے علاج کیا اس پر کوئی حرج نہیں ہے جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ شفاء دینے والی ذات اللہ کی ہے نہ کہ دوا۔ . .اگر کوئی طبیب کسی (مریض) کو کسی دوا کے بارے میں بتائے، وہ اس سے علاج نہ کرے یہاں تک کہ اس کی موت ہوجائے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا)۔

اس میں اصولی بات یہ ہے کہ ضرر و بیماری کو دور کرنے والی چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں: (۱) جو قطعی ہیں یعنی یقینی طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استعمال سے وہ ضرر دور ہوجائے گا، جیسے پانی سے پیاس دور ہوجائے گی۔ کھانے سے بھوک ختم ہوجائے گی۔ یہ یقینی ہیں، (۲) جو قطعی تو نہیں ہیں لیکن ظنی ہیں۔ یعنی ظن غالب ہوتا ہے کہ ان کے استعمال سے وہ ضرر دور ہوجائے گا۔ جیسے فصد کھلوانا اور تمام علاج اور دوائیں جن سے مرض کے ختم ہوجانے کا ظن غالب ہوتا ہے۔ یہ ظنی ہیں، (۳) جو محض موہوم ہیں۔ جیسے رقیہ یعنی جھاڑ پھونک۔ ان میں پہلی قسم جو قطعی ہیں ان کو ضرورت کے وقت استعمال کرنا واجب ہے اور ترک کردینا حرام ہے۔ دوسری قسم جو ظنی ہیں ان کا ضرورت کے وقت استعمال واجب نہیں ہے اور نہ ترک حرام ہے، بلکہ استعمال کرنا افضل اور بہتر ہے۔ تیسری قسم جو موہوم ہے اس کا استعمال جائز اور ترک افضل ہے (ھندیۃ، کتاب الکراھیۃ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مریض کو خود اپنا علاج کرانا واجب نہیں ہے، مستحب اور بہتر ہے۔ لہذا جب اپنا علاج واجب نہیں ہے تو دوسرے کا علاج کرانا کیسے واجب ہوگا۔ اس لئے ایسے شخص پر مریض کو خون دینا واجب نہیں ہے، البتہ مستحب ہے۔

۵- اصل موت دل و دماغ کی موت ہے۔ مگر اس کے بعد بھی انسان کے اعضاء میں حرارت اور حیات کے آثار کچھ وقفہ تک باقی رہتے ہیں۔ دل و دماغ کی موت کے بعد دوبارہ حیات نہیں آتی اور اعضاء بھی آہستہ آہستہ اس کے بعد موت سے ہمکنار ہوجاتے ہیں، اس لئے دل و دماغ کی موت کے بعد وفات یافتہ شخص کے کسی عضو کو علیحدہ کر کے کسی خاص ضرورت مند مریض کو دیا جاسکتا ہے یا کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دیا جاسکتا ہے تاکہ اس سے کسی مریض انسان کی جان بچائی جاسکے۔

کسی ضرورت مند شخص کے علاج کے لئے کسی انسان کی موت کے بعد اس کے کسی عضو کو نکالنا درست ہے، کیونکہ انسانی جزء سے انتفاع کی ممانعت اس کے نجس ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی کرامت کی وجہ سے ہے، انسان کا احترام ضروری ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**ولقد كرمنا بني آدم، وحملناهم في البر والبحر، ورزقناهم من الطيبات، وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلاً**" (اسراء: ۷۰) (ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا اور ان کو خشکی اور تری

میں سواری دی اوران کو پاکیزہ رزق عطا کئے اور بہت ساری مخلوقات پر ان کو فضیلت دی)۔

اس پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا کوئی انسان اپنے جسم کا کوئی حصہ اپنی زندگی میں کسی دوسرے انسان کو دے سکتا ہے یا مرنے کے بعد دینے کی وصیت کرسکتا ہے؟

انسانی جسم کے کسی حصے سے انتفاع یا اس کے استعمال کو فقہاء کرام ناجائز بتاتے ہیں۔یعنی ایک انسان دوسرے انسان کے جسم کے کسی حصے کو استعمال نہیں کرسکتا ہے،لیکن اوپر سوال نمبر(۱) کے جواب میں وضاحت سے یہ بات پیش کردی گئی ہے کہ فقہاء کرام شدید ضرورت کے وقت اس کی اجازت دیتے ہیں۔اس کے لئے فقہ کی کتابوں کے حوالوں بھی پیش کئے گئے ہیں۔

یہاں پر سوال یہ ہے کہ ایک زندہ انسان کی زندگی بچانا زیادہ اہم ہے یا کسی مردہ شخص کی لاش کا احترام زیادہ اہم ہے؟ وفات یافتہ شخص کی لاش کی تکریم میں زندہ انسان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے اور اس کی زندگی بچانے میں وفات یافتہ کی لاش کی تکریم کے منافی عمل ہوتا ہے۔دونوں طرف خرابی ہے۔اس میں کس کو ترجیح دیا جائے،کیا ایک وفات یافتہ انسان کی لاش کی تکریم کے لئے ایک زندہ انسان کو موت کے منہ میں جانے دیا جائے؟ کیا ایک زندہ انسان کی داؤ پر لگی ہوئی زندگی کو بچانے کے لئے ایک وفات یافتہ انسان کے جسم کے کسی حصے سے پیوندکاری نہیں کی جاسکتی؟

فقہی قاعدے کی رو سے اگر دو ضرر پائے جارہے ہیں تو ان میں جو زیادہ اہم اور شدید ہے اس کو دور کیا جائے گا اور دوسرے کو جو کم اہم ہے برداشت کرلیا جائے گا۔

”إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضرراً باتکاب أخفهما“(الأشباہ للسیوطی والاشباہ لابن نجیم)

(دوخرابیاں جب آمنے سامنے ہوں (اوران میں سے کسی ایک کو ہی دور کیا جاسکتا ہے) تو ان میں سے جو زیادہ بڑی خرابی ہے اس کو دور کیا جائے گا اور کم درجہ کی خرابی کو برداشت کیا جائے گا)۔

”لو کان أحدهما أعظم ضرراً من الآخر فإن الأشد یزال بالأخف“(الأشباہ والنظائر لابن نجیم المصری)۔

(اگران دونوں میں سے ایک میں دوسرے سے زیادہ ضرر ہے تو کم ضرر والے کو برداشت کر کے زیادہ ضرر والے کو دور کیا جائے گا)۔

فقہ کے اس قاعدے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فقہاء کرام کے نزدیک شرعی اعتبار سے یہی حکم ہے کہ جب دو خرابیاں آمنے سامنے ہوں اوران میں سے کسی ایک کو ہی دور کیا جاسکتا ہے تو زیادہ خرابی والے کو دور کیا جائے گا اور کم خرابی والے کو برداشت کرلیا جائے گا،اس کی بہت ساری مثالیں قواعد فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔علامہ زیلعی اس کی وضاحت اس

طرح کرتے ہیں:

"ثم الأصل فی جنس هذه المسئلة أن من ابتلی ببلیتین وهما متساویتان یأخذ بأیهما شاء، وإن اختلفا یختار أهونهما، لأن مباشرة الحرام لاتجوز إلا للضرورة، ولاضرورة فی حق الزیادة" (تبیین الحقائق للزیلعی، باب شروط الصلاۃ)۔

(اس جیسے مسائل میں اصول یہ ہے کہ جو شخص دو مشقتوں میں مبتلا ہوجائے (کہ ان میں سے ایک کو کرنا ضروری ہو) اور وہ دونوں برابر درجہ کی ہوں تو ان میں سے جس کو چاہے کرے۔ اور اگر درجہ میں فرق ہے (کہ ایک زیادہ بڑی مشقت ہے اور دوسری کم درجہ کی) تو ان میں سے کم درجہ والی کو اختیار کرے گا، کیونکہ حرام کا ارتکاب بغیر ضرورت کے جائز نہیں ہے اور زیادہ کی ضرورت نہیں پائی جارہی ہے)۔

اب دیکھیں کہ زیر بحث مسئلہ میں یہ بات یقینی ہے کہ زندہ انسان کی زندگی کو بچانا وفات یافتہ انسان کی لاش کی تکریم سے زیادہ ضروری ہے، کیونکہ انسانی زندگی کو بچانے کے لئے مردہ کھانے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ زبان پر کلمہ کفر ادا کرنے کی بھی اجازت دیدی گئی ہے۔ حرام چیزوں سے علاج کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ انسانی اجزاء سے علاج کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔ دوسری طرف کسی کی زندگی نہیں جارہی ہے بلکہ وہ تو پہلے سے ہی وفات پاچکا ہے، صرف اس کی لاش کے بعض عضو سے فائدہ اٹھانے کی بات ہے۔ اگرچہ یہ بھی تکریم انسانی کے خلاف ہے مگر انسانی زندگی کی حفاظت اس سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، اس سلسلے میں فقہ کی کتابوں سے دو مسئلے پیش کئے جارہے ہیں، جن سے واضح ہوجاتا ہے کہ فقہاء کرام کے نزدیک بھی انسانی زندگی کی حفاظت وفات یافتہ کی لاش کے احترام سے زیادہ ضروری ہے۔

(الف) کوئی بچہ ماں کے پیٹ میں اس طرح ہو کہ اس کی ولادت دشوار ہوجائے، اگر بچہ کو کاٹ کر نہ نکالا جائے تو ماں کی ہلاکت یقینی ہو تو ایسی صورت میں اگر بچہ ماں کے پیٹ میں مرچکا ہے تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے نکالنا جائز ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کو ٹکڑے کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک انسان کو بچانے کے لئے دوسرے انسان کا قتل ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ محیط برہانی میں ہے:

"ولواعترض الولد فی بطن حامل، ولم یوجد سبیل إلی استخراج ذلک إلابقطع الولد إرباً إرباً، ولو لم یفعل ذلک یخاف الهلاک علی الأم، فإن کان الولد میتاً فی البطن فلابأس به، وإن کان حیاً لا معنی لجواز القطع،لأن هذا قتل النفس لصیانة نفس آخر،والشرع لم یرد بمثله" (المحیط البرهانی ۵/۲۵۲)۔

علامہ موصلیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"امرأة حامل اعترض الولد فی بطنها، ولایمکن استخراجه إلا بأن يقطع، ويخاف على الأم، إن كان ميتاً لابأس به، وإن كان حياً لايجوز"(الاختیار شرح المختار للموصلی، کتاب الکراھیۃ ۱۷۹/۴)۔

اس مسئلہ میں کہ جب بچہ کی موت ماں کے پیٹ میں ہوچکی ہو واضح طور سے فقہاء کرام نے ماں کی جان بچانے کے لئے بچہ کے اعضاء کو کاٹنے کی اجازت دی ہے، یعنی زندہ انسان کی زندگی بچانے کو ترجیح دی گئی۔ اس کے لئے مردے کی عدم تکریم کو بھی برداشت کرلیا گیا ہے۔

(ب) کسی حاملہ عورت کا انتقال ہوجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ موجود ہو تو اس صورت میں فقہاء کرام کہتے ہیں کہ اگر غالب گمان ہو کہ بچہ پیٹ میں زندہ ہے تو اس وفات یافتہ عورت کا پیٹ چاک کرکے اس میں سے بچہ کو نکال لیا جائے گا، اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ زندہ بچہ کی ہلاکت سے مردہ ماں کا پیٹ چاک کرنا اھون ہے اور یہ ایک محترم جان کو زندہ رکھنے کی کوشش ہے۔ علامہ کاسانی تحریر کرتے ہیں:

"حامل ماتت فاضطرب فی بطنها ولد فإن كان فی أكبر الرأی أنه حيی يشق بطنها لأنا ابتلينا ببليتين فنختار أهونهما، وشق بطن الأم الميتة أهون من إهلاک الولد الحيی"(بدائع الصنائع للکاسانی، کتاب الاستحسان)۔

علامہ موصلیؒ لکھتے ہیں:

"امرأة ماتت وهی حامل فاضطرب الولد فی بطنها، فإن كان أكبرالرأی أنه حيی يشق بطنها من الجانب الأيسر، لأنه تسبيب إلى إحياء نفس محترمة"(الاختیار شرح المختار للموصلی، کتاب الکراھیۃ ۱۷۹/۴)۔

اس مسئلہ کی علت جو بیان کی گئی ہے کہ "شق بطن الأم الميتة أهون من إهلاک الولد الحيی" (مردہ ماں کے پیٹ کو چاک کرنا زندہ بچہ کو ہلاک کرنے سے اھون ہے)، یا "ترک التعظيم أهون من مباشرة سبب الموت" (میت کی تکریم نہ کرنا ہلاکت میں ڈالنے سے اھون ہے) اس سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ تکریم میت پر زندہ کی جان بچانے کو ترجیح دی گئی ہے۔

اس لئے اس مسئلہ میں بھی کہ جب کوئی شخص وصیت کرجائے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو کسی ضرورت مند کو دیدیا جائے تو اس کی وفات کے بعد وہ عضو نکال کر کسی ضرورت مند کو دیا جاسکتا ہے۔ یا کسی طبی ادارہ کو دیدیا جائے جہاں اس کو محفوظ رکھا جائے اور بعد میں کسی ضرورت مند انسان کے جسم میں اس کی پیوندکاری ہوسکے۔

لیکن یہ اسی صورت میں درست ہوگا جب اس نے خود اس کی وصیت کی ہو اور اس کے وارثین بھی اس پر تیار ہوں۔ اگر اس کی قید نہیں لگائی جائے گی تو اسپتالوں میں انسانی لاشوں کے اعضاء لوگ کاٹ کاٹ کر فروخت کرنا شروع کر دیں گے اور انسانی اعضاء کی عام خرید وفروخت ہونے لگے گی اور اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکے گی۔

۶- (الف) انسانی جسم کے تمام اعضاء اللہ تعالی کے بنائے ہوئے ہیں، اس خالق علیم وخبیر نے انسان کے جسم کا کوئی عضو بیکار نہیں پیدا کیا ہے، ہر عضو کارآمد ہے اور وہ اس کی ضرورت کے لئے ہے۔ ہر عضو کی تخلیق میں الٰہی مصلحت کارفرما ہے، جو اعضاء ایک سے زائد ہیں ان کی تخلیق میں یہی مصلحت نظر آتی ہے کہ اگر ان میں سے ایک میں خرابی پیدا ہو جائے تو دوسرا عضو اس کی جگہ پر کام کرے تا کہ انسان اس عضو کی منفعت سے مکمل طور سے محروم نہ ہو جائے۔ اسی طرح انسان کی دونوں آنکھیں بھی اس کی ضرورت کے لئے ہیں، فاضل نہیں ہیں کہ ان میں سے ایک کسی کو دیدی جائے۔ کیونکہ عمر آنے پر عام طور سے انسان کو آنکھوں کی پریشانی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک آنکھ کسی کو دیدینے پر یہ پریشانی بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

فقہاء کرام کی تصریحات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندہ شخص کسی کو اپنا عضو نہیں دے سکتا اور نہ کوئی مضطر شخص کسی زندہ انسان کا عضو استعمال کر سکتا ہے اگرچہ صاحب عضو اس کو اس کی اجازت دیدے۔

"مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع يدی وکلها أو قال: اقطع منی قطعة فکلها لا يسعه أن يفعل ذلک ولا يصح أمره به کما لايسع للمضطر أن يقطع قطعة من لحم نفسه فيا کل" (فتاوی قاضی خاں ۳/ ۷ ۴۰)۔

(ایک مضطر شخص کو میتہ بھی نہیں ملا اور اس کو ہلاکت کا اندیشہ ہے، ایک شخص نے اس سے کہا کہ میرا ہاتھ کاٹ کر کھالو یا یہ کہا کہ اس میں سے کچھ کاٹ لو اور کھالو تو وہ ایسا نہیں کر سکتا ہے۔ اس چیز کا حکم دینا بھی صحیح نہیں ہے جیسے مضطر کو اپنے گوشت کے ٹکرے کاٹ کر کھانے کی اجازت نہیں ہے)۔

اس لئے زندگی میں ہی اپنی ایک آنکھ کسی کو دیدینے کا اختیار آدمی کو نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے دونوں آنکھ اس کی ضرورت کے لئے بنایا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے میں ضرر شدید لاحق ہونے کا اندیشہ ہے۔

ب- آنکھ اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے، جو اس سے محروم ہو جاتا ہے اس کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے اور انسان بیکار محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ دنیا کی مصروفیات تو درکنار اللہ تعالی کی عبادت بھی صحیح طور سے انجام دینا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے، کسی آنکھوں سے معذور شخص کو اگر کسی دوسرے انسان کی وفات کے بعد اس کی آنکھ کا قرنیہ لگا دیا جائے تو اس کی دنیا روشن ہو جائے گی۔ دین ودنیا کے تمام کام کے لائق وہ ہو جائے گا، البتہ اس میں جزء انسانی کے استعمال کا مسئلہ ہے مگر اس کے

بارے میں وضاحت کی جاچکی ہے کہ ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہے، آنکھوں سے معذور شخص کی شدید ضرورت دور کرنا تکریم میت سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔اس لئے وفات کے بعد کسی آنکھ کا قرنیہ دوسرے ضرورتمند کو دیا جاسکتا ہے، اس میں بھی وہی شرط ہے کہ اس شخص نے زندگی میں اس کی اجازت دی ہو اور اس کے ورثہ بھی دینے کے لئے تیار ہوں۔

ج- آنکھ کی بینکنگ کی اجازت ہونی چاہئے تا کہ ضرورت کے وقت کسی نابینا آنکھوں سے معذور شخص کو آسانی سے اس کی فراہمی ممکن ہو سکے، وفات یافتہ شخص کی آنکھ ایسے بینک میں عطیہ کی جاسکتی ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ کوئی نابینا ضرورت مند انسان وہاں سے لے کر اس کا قرنیہ اپنی آنکھ میں لگوا سکتا ہے، لیکن ایسی جگہ آنکھ دینا جہاں اس کا کاروبار ہوتا ہو جائز نہیں ہے، عطیہ کے طور پر کسی آئی بینک میں دینا درست ہے اور وہاں سے بھی بطور عطیہ ہی کسی معذور کو دیا جائے۔

۷- کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے جسم کا کوئی عضو کسی دوسرے ضرورت مند کو دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس نے زندگی میں اپنی مرضی سے اس کی وصیت کی ہو کہ اس کی آنکھ یا اس کا جگر کسی ضرورت مند مریض کو دیدیا جائے یا کسی طبی ادارہ میں رکھوا دیا جائے تا کہ وہاں سے کسی ضرورت مند کو مل جائے۔صاحب عضو کی وصیت اس لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنے جسم پر اختیار حاصل ہوتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی وفات کے بعد اس کے وارثین بھی اس پر آمادہ ہوں کیونکہ اس شخص کی وفات کے بعد اس کی تکفین، نماز اور تدفین کے تمام کام وارثین کے ذمہ رہتے ہیں، اس لئے ان کی اجازت بھی ضروری ہے۔اگر صاحب عضو کی وصیت اور وارثین کی اجازت کو لازم نہ قرار دیا جائے تو اعضاء کی خرید وفروخت کا کاروبار شروع ہو جائے گا جو شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز وحرام ہے۔کیونکہ اعضاء کی پیوندکاری کی اجازت شدید ضرورت کی وجہ سے دی گئی ہے، بلاضرورت اس کی اجازت نہیں ہے ورنہ انسانی اعضاء کی عام تجارت ہونے لگے گی جو انتہائی قبیح ہے۔

۸- اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا یہ مسئلہ ضرورت کے تحت آتا ہے؟ کیا چھوٹے بچوں کے لئے دودھ بینک قائم کرنا ان کی ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر ان کی پرورش نہیں ہو سکتی ہو؟ چھوٹے بچوں کے لئے عورتوں کا دودھ یقیناً بہت نفع بخش ہے اور ان کی صحت کے لئے مفید ہے مگر ان کی پرورش کے لئے یہی ایک ذریعہ نہیں ہے، مشرقی ممالک میں تو ان کی مائیں ان کو اپنا دودھ پلاتی ہیں۔اس کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی ہیں، ہر طرح کے دودھ کے ڈبے ملتے ہیں جن سے ان کی پرورش بآسانی ہو سکتی ہے بلکہ ہو رہی ہے۔مغربی ممالک میں عام طور سے بچوں کی پرورش ان ہی ڈبوں کے دودھ سے ہوتی ہے۔اس لئے یہ کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے جس کے لئے حرام چیزوں کا ارتکاب کیا جائے، یا اس کو حقیقی ضرورت سمجھ کر حرام چیزوں کو جائز قرار دیا جائے۔

دودھ بینک قائم کرنے میں متعدد قسم کی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ان پر غور کرلیا جائے تو اس کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان ہوجائے گا۔ذیل میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے۔

الف- پہلی خرابی تو یہ نظر آتی ہے کہ کسی عورت کا برتن میں اپنا دودھ نکال کر بینک میں بھجوانا یہ تو خود عورتوں کی شرم وحیا کے منافی ہے، البتہ مغربی ممالک کے دانشوروں کو اس لئے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ ان کے یہاں شرم وحیا نام کی چیز ہی باقی نہیں رہی اور اس کا تصور ہی ختم ہوگیا ہے۔اگر عورتوں کو خود سے اپنا دودھ نکالنا مشکل ہو تو دوسروں سے نکلوانا یہ اس سے بڑی بے حیائی اور بے شرمی ہے، اس میں بے ستری بھی ہے جو شرعاً ناجائز وحرام ہے، یہ اس صورت میں ہے جب دودھ بلا قیمت بینک میں دیا جائے اور بینک سے بھی دودھ بلا قیمت ضرورت مند بچوں کو دیا جائے۔مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔

ب- دوسری خرابی یہ ہے کہ جس طرح سے بھی ہو دودھ نکال کر قیمت سے بینک میں دیا جائے تو اس میں دودھ کی خرید وفروخت ہوتی ہے جو جائز نہیں ہے، کیونکہ انسان قابل تکریم ہے اور دودھ بھی اس کا ایک جزء ہے، اس لئے وہ بھی قابل تکریم ہے، کسی چیز کی تجارت اس کی تکریم واحترام کے منافی ہوتی ہے، اس لئے دودھ کی تجارت یعنی اس کی خرید وفروخت بھی تکریم انسانیت کے منافی ہے، شریعت نے ضرورت کی وجہ سے چھوٹے بچوں کے لئے انسانی دودھ کے استعمال کو تو جائز قرار دیا ہے بلکہ ان کو دودھ پلانے کا حکم دیا ہے مگر تکریم انسانیت کے منافی ہونے کی وجہ سے دودھ کی تجارت کو فقہاء کرام ناجائز قرار دیتے ہیں۔

''**لم يجز بيع لبن المرأة لأنه جزء الآدمي وهو بجميع أجزائه مكرم عن الابتذال بالبيع**''(البحر الرائق ۸۱/۶)(عورت کے دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے کیونکہ دودھ آدمی کا جزء ہے اور آدمی اپنے تمام اجزاء کے ساتھ قابل تکریم ہے اس سے کہ اس (کے اجزاء) کو تجارت میں مبتذل کیا جائے)۔

ج- تیسری خرابی یہ ہے کہ شریعت نے ضرورت کی وجہ سے مدت رضاعت میں بچوں کو انسانی دودھ پلانے کا حکم دیا ہے، مگر اس کے ساتھ حرمت رضاعت کا مسئلہ بھی شامل کیا ہے کہ جو بچہ جس عورت کا دودھ پی لے گا اس سے اس کا رشتۂ رضاعت ثابت ہوجائے گا۔وہ عورت اس کی رضاعی ماں، اس کا شوہر اس کا رضاعی باپ، اور اس کی اولاد اس کے رضاعی بھائی بہن ہوجائیں گے۔نکاح کے مسائل میں ان کی وہی حیثیت ہوگی جو نسبی رشتہ داروں کی ہوتی ہے۔

''**وأمهاتكم اللاتي أرضعنكم وأخواتكم من الرضاعة**'' (نساء ۲۳)(اور (محرمات میں) تمہاری وہ مائیں ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں ہیں)۔

''**يحرم من الرضاعة مايحرم من النسب**'' (صحیح مسلم، الرضاع)(رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہیں)۔

رشتۂ رضاعت جس طرح عورت کی چھاتی سے دودھ پینے سے ہوتا ہے اسی طرح برتن میں دودھ نکال کر پلانے سے بھی ہوتا ہے۔ دودھ بچے کے پیٹ میں جائے خواہ چھاتی میں منہ لگا کر پینے سے جائے یا برتن سے دودھ اس کے حلق میں ڈالنے سے جائے یا دودھ ناک کے ذریعہ جائے تمام صورتوں میں حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے۔

"فشمل ما إذا حلبت لبنها في قارورة فإن الحرمة تثبت بإيجارهذا اللبن صبيا . . . فلا فرق بين المص والصب والسعوط والوجور كما في الخانية"(البحرالرائق، کتاب الرضاع)(رضاعت کا حکم اس صورت کو بھی شامل ہے جب کسی عورت نے اپنا دودھ کسی شیشہ میں ڈالا۔ اس دودھ کے بچے کے حلق میں جانے سے بھی حرمت ثابت ہوجائے گی۔ .(چھاتی میں) منہ لگا کر پینے میں اور منہ میں ڈالنے میں اور ناک سے پلانے میں اور حلق میں ڈالنے میں کوئی فرق نہیں ہے)، یعنی مذکورہ تمام صورتوں میں حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی)۔

لہذا دودھ بینک کے قیام میں حرمت رضاعت کے شرعی حکم پر عمل دشوار ہوجائے گا۔ بچہ نے کن عورتوں کا دودھ پیا ہے جن سے حرمت رضاعت ثابت ہوئی ہے اس کا معلوم کرنا بہت مشکل ہوگا۔ ایسی کوئی صورت عملی اعتبار سے تقریباً ناممکن ہے کہ بینک میں اس کا ریکارڈ رکھا جائے کہ کن عورتوں کا دودھ وہاں آتا ہے اور کن بچوں کو کن عورتوں کا دودھ دیا گیا ہے اور یہ ریکارڈ ۲۵، ۳۰ سال بعد تک جب ان بچوں کی شادی کی عمر ہوجائے محفوظ رہے۔

ان تمام خرابیوں کے پیش نظر دودھ بینک کا قیام شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے اور اس کی ایسی کوئی حقیقی ضرورت بھی نظر نہیں آتی ہے جس کی وجہ سے اس کی اجازت دی جائے۔ ملازمت کی وجہ سے خواتین کی تن آسانی اور فیشن پرستی کے نتیجہ میں یہ تصور پیدا ہوا ہے۔ بچوں کو دودھ پلانے کے بارے میں اسلامی تعلیمات یہی ہیں کہ ماں خود اپنے بچے کو دودھ پلائے اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہو پائے تو باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اجرت پر ایسی عورتوں سے بچہ کو دودھ پلوائے جن سے وہ واقف ہو تاکہ بعد میں رضاعت کے احکام ان سے متعلق ہوں۔ اسی لئے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ عورتیں بغیر ضرورت ہر بچے کو دودھ نہ پلائیں اور جب کسی بچے کو دودھ پلائیں تو اس کو یاد رکھیں اور اس کو لکھ کر محفوظ کرلیں، نیز لوگوں کو بھی بتادیں۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ حرمت رضاعت کے احکام اس سے متعلق ہوتے ہیں۔

"والواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة، وإذا أرضعن فليحفظن ذلك ويشهرنه ويكتبنه احتياطاً"(فتح القدیر، کتاب الرضاع)۔

"وفي الولوالجية: والواجب على النساء أن لايرضعن كل صبي من غير ضرورة فإذا فعلن فليحفظن أو ليكتبن"(البحرالرائق، کتاب الرضاع)۔

(عورتوں پر لازم ہے کہ بلاضرورت ہر بچے کو دودھ نہ پلائیں اور جب کسی بچہ کو دودھ پلائیں تو اس کو یاد رکھ لیں اور اس کو لکھ لیں)۔

الغرض دودھ بینک کا قیام کسی حقیقی ضرورت پر مبنی نہیں ہے اور یہ اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ بھی نہیں ہے۔اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہئے۔

اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی بچے کو دودھ بینک سے دودھ لے کر استعمال کرایا گیا اور بعد میں علم نہ ہوسکا کہ کن عورتوں کا دودھ اس کو دیا گیا ہے تو حرمت رضاعت کا کیا حکم ہوگا اور اس کی شادی اس علاقے میں ہوسکے گی یا نہیں جہاں کی عورتوں کے دودھ اس بینک میں جاتے تھے؟

یہ رضاعت کا مسئلہ ہے جس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ شادی کے سلسلے میں رضاعی رشتوں اور نسبی رشتوں میں فرق نہیں ہے۔نسبی رشتہ داروں کی طرح رضاعی رشتہ داروں سے بھی شادی حرام ہے۔اس احتیاط سے متعلق فقہاء کرام کی تصریحات پیش کی جاچکی ہیں۔

اس صورت میں کہ جب کسی طرح یہ معلوم ہی نہ ہوسکے کہ دودھ بینک میں کن عورتوں کا دودھ آتا تھا اور اس بچے نے ان میں سے کس کس عورت کا دودھ استعمال کیا ہے تو کسی متعین عورت سے حرمت رضاعت ثابت ہونے میں شک پیدا ہوجاتا ہے،اس صورت میں فقہاء لکھتے ہیں کہ جب شک پایا جارہا ہے تو کسی سے بھی حرمت رضاعت نہیں ہوگی اور اس کی شادی اس علاقے میں درست ہوگی۔

"أما لوشک فیه بأن أدخلت الحلمة فی فم الصغیروشکت فی الارتضاع لاتثبت الحرمة بالشک وهو کما لو علم أن صبیة أرضعتها امرأة من قریة ولا یدری من هی فتزوجها رجل من أهل تلک القریة صح، لأنه لم یتحقق المانع من خصوصیة امرأة" (فتح القدیر،کتاب الرضاع)۔

(اگر اس میں شک ہوجائے اس طور پر کہ کسی عورت نے اپنی چھاتی بچہ کے منہ میں دی مگر اس کو بچہ کے دودھ پینے میں شک ہو تو شک سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، جیسے اگر یہ بات معلوم ہے کہ ایک بچی ہے جس کو گاؤں کی کسی عورت نے دودھ پلایا ہے مگر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کون عورت ہے،اسی گاؤں کے ایک شخص نے اس سے نکاح کرلیا تو یہ نکاح صحیح ہوگا، کیونکہ خاص عورت سے متعلق مانع موجود نہیں ہے (یعنی جس عورت نے دودھ پلایا ہے اس کی تعیین نہیں ہو پائی ہے،اس لئے حرمت ثابت نہیں ہوگی)۔

"فلو التقم الحلمة ولم یدر أدخل اللبن فی حلقه أم لا لم یحرم،لأن فی المانع

شکا۔ولوالجية۔ولو أرضعها أكثر أهل قرية ثم لم يدر من أرضعها فأراد أحدهم تزوجها ،إن لم تظهرعلامة ولم يشهد بذلك جاز ۔خانية"(الدرالمختار مع الرد باب الرضاع ۴/ ۴۰۲)۔

(اگر چھاتی منہ میں گئی مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ دودھ حلق میں گیا یا نہیں؟ تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ مانع (یعنی دودھ کے حلق میں جانے) میں شک ہے۔ ولوالجیہ ۔اگر بچی کو گاؤں کی اکثر عورتوں نے دودھ پلایا پھر بعد میں تحقیق نہیں ہو پارہی ہے کہ کس نے دودھ پلایا ہے اور وہاں کا کوئی شخص اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔تو اگر کوئی علامت ظاہر نہیں ہے اور نہ کوئی گواہی ہے تو شادی جائز ہے۔خانیہ)۔

لیکن یہ عام حکم نہیں ہے کہ اس کی بناء پر دودھ بینک کی اجازت دیدی جائے اور حرمت رضاعت کا حکم اٹھا دیا جائے، یہ حکم مجبوری میں دیا گیا ہے کہ جب یہ معلوم نہیں ہو پارہا ہے کہ کس عورت کا دودھ اس نے پیا ہے اور اس علاقے کی ہر عورت کے بارے میں شک ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کا دودھ پیا ہو تو اصلاً قاعدہ "**الأصل فی الأبضاع التحریم**" کے مطابق اس علاقے میں اس کا نکاح ممنوع ہونا چاہئے تھا، کیونکہ جب کسی عورت میں حلت اور حرمت دونوں پہلو موجود ہوں تو حرمت کو ترجیح ہوتی ہے۔امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

"**الأصل فی الأبضاع التحریم، فإذا تقابل فی المرأة حل وحرمة غلبت الحرمة**"(الاشباہ للسیوطی، و کذافی الأشباہ لابن نجیم المصری)۔

امام سیوطیؒ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"**ولهذا امتنع الاجتهاد فیما إذا اختلطت محرمة بنسوة قرية محصورات، لأنه ليس أصلهن الإباحة حتی يتأيد الاجتهاد باستصحابه، وإنما جاز النكاح فی صورة غير المحصورات رخصة من الله كما صرح به الخطابی لئلا ينسد باب النكاح عليه**"(الاشباہ للسیوطی)۔

چونکہ اس کو نکاح کرنے کی ممانعت کردینا شریعت کے مقصد کے خلاف ہے، اس لئے مجبوری میں شک کا فائدہ دیتے ہوئے اس کو اس علاقے میں نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔

"**فی فتاوی قاضی خان: صبية أرضعها قوم كثير من أهل القرية أقلهم أو أكثرهم، لايدری من أرضعها وأراد واحد من أهل تلك القرية أن يتزوجها، قال أبوالقاسم الصفار: إذالم تظهر له علامة ولايشهد أحد له بذلك يجوز نكاحها، وهذا من باب الرخصة كيلا ينسد باب النكاح**" (الاشباہ لابن نجیم المصری ۶۷)۔

(فتاوی قاضی خاں میں ہے: ایک بچی ہے جس کو گاؤں کی بہت سی عورتوں نے دودھ پلایا ہے۔ (بعد میں) معلوم نہیں ہو پا رہا ہے کہ کس نے دودھ پلایا ہے اور اس گاؤں کا ایک شخص اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو امام ابوالقاسم الصفار فرماتے ہیں کہ جب کوئی علامت ظاہر نہ ہو اور کوئی گواہی نہ دے تو اس سے نکاح جائز ہے۔ یہ رخصت کے باب سے ہے تاکہ نکاح کا دروازہ بند نہ ہو جائے)۔

۹- اسلام نے نکاح کی ترغیب دی ہے اور زنا کو حرام قرار دیا ہے۔ بغیر نکاح کے جنسی لذت اٹھانا تمام مذاہب میں انتہائی معیوب اور برا عمل مانا گیا ہے، اس لئے وقت پر اولاد کی شادی کرا دینا والدین کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وأنكحوا الأيامى منكم والصالحين من عبادكم وإمائكم إن يكونوا فقراء يغنهم الله من فضله" (نور ۳۲) (اپنے میں سے بے شوہر والیوں کی اور غلاموں اور باندیوں میں سے جو صالح ہوں ان کی شادی کر دو، اگر یہ تنگدست ہیں تو اللہ تعالی اپنے فضل سے ان کو مالدار کر دے گا)۔

اس سوال کے کئی اجزاء ہیں: مادۂ تولید جمع کر کے رکھنے کے لئے بینک قائم کرنا۔ اس میں مردوں کا مادۂ تولید عطیہ کے طور پر یا قیمت سے دینا۔ وہاں سے بلاعوض یا بالعوض وہ مادۂ تولید عورتوں کا حاصل کر کے استعمال کرنا۔

کیا ایک فرد کا دوسرے کو مادۂ منویہ رحم میں استعمال کے لئے دینا شرعاً جائز ہوسکتا ہے؟ اسی طرح کیا دوسرے فرد کا اس کو لے کر اس جگہ استعمال کرنا جائز ہوسکتا ہے؟ اگر ان کا جواز ہوگا تو ان کے لئے بینک قائم کرنا بھی درست ہوسکتا ہے اور اگر یہ ناجائز اور حرام ہیں تو ان کے لئے بینک کا قیام بھی شرعاً ناجائز اور حرام ہوگا۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا من فروجهم، ذلك أزكى لكم إن الله خبير بما يصنعون، وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهم ويحفظن من فروجهن" (سورۂ نور: ۳۰، ۳۱) (مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ بات ہے، جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ تعالی اس سے واقف ہے۔ مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں)۔

مسلمان مردوں اور عورتوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں کہ اس پر دوسروں کی نظر نہ پڑ سکیں اور حرام کے ارتکاب سے بچیں۔ سورہ مؤمنون میں ارشاد ہے:

''**والذین هم لفروجهم حافظون، إلا علی أزواجهم أوماملکت أیمانهم فإنهم غیر ملومین، فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک هم العادون**''(مومنون ۵،۶،۷)(اوروہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور باندیوں پر۔تو وہ لوگ اس پر قابل ملامت نہیں ہیں۔جس نے اس (بیوی اور باندی) سے آگے ایسا کام کیا تو وہ ظالم ہیں)۔

امام بغوی اس آیت کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں:

''**یعنی یحفظ فرجه إلا من امرأته أو أمته فإنه لایلام علی ذلک ... فمن ابتغی وراء ذلک أی التمس وطلب سوی الأزواج والولائد المملوکة فأولئک هم العادون، الظالمون المتجاوزون من الحلال إلی الحرام۔وفیه دلیل علی أن الاستمناء بالید حرام وهو قول اکثر العماء**''(معالم التنزیل للبغوی ۵/۴۱۰)(یعنی وہ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے سوائے بیوی اور باندی کے تو وہ قابل ملامت نہیں ہے۔ . . جس نے بیوی اور باندی سے آگے طلب کیا تو وہ ظالم ہیں،حلال سے حرام کی طرف جانے والے ہیں۔اس میں اس پر دلیل ہے کہ استمناء بید حرام ہے جیسا کہ اکثر علماء کا قول ہے)۔

اس آیت کریمہ میں اپنی بیوی اور اپنی باندی کے سوا کسی دوسرے سے جنسی تعلق قائم کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کو سرکشی اور ظلم کرنے والا بتایا گیا ہے،اس کے ساتھ اس سے استمناء بید کی بھی حرمت ثابت ہوتی ہے۔

یہ بات تو درست ہے کہ اس طرح ایک فرد کا اپنا مادۂ منویہ نکال کر دوسرے کو دینا اور دوسرے کا اس کو اپنے فرج میں استعمال کرنا زنا نہیں ہے کیونکہ اس پر زنا کی تعریف صادق نہیں آتی،اس لئے ایسا کرنے والے پر شرعی حد بھی جاری نہیں ہوگی،لیکن اس کے حرام ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے،کیونکہ مذکورہ دونوں صورتوں کے سوا کسی اور صورت میں مادہ منویہ نکالنے کو ظلم وسرکشی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی لئے استمناء بالید کی حرمت اس سے ثابت ہوتی ہے۔

امام ابوالبرکات نسفیؒ فرماتے ہیں:

''**فمن ابتغی وراء ذلک۔ طلب قضاء شهوة من غیر هذین۔ فاولئک هم العادون۔الکاملون فی العدوان، وفیه دلیل تحریم المتعة والاستمتاع بالکف لإرادة الشهوة**''(مدارک التنزیل تفسیر سورہ مومنون)۔

(''**فمن ابتغی وراء ذلک**''، ان دونوں کے سوا قضاء شہوت چاہی تو ''**فاولئک هم العادون**'' وہ لوگ سرکشی میں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔اس میں متعہ اور ارادۂ شہوت سے استمتاع بید کی حرمت کی دلیل ہے)۔

علامہ آلوسی استمناء بالید کے بارے لکھتے ہیں:''**فجمهور الأئمة علی تحریمه وهو عندهم داخل فیما**

وراء ذلک''(روح المعانی۹؍۲۱۳)(جمہور ائمہ اس کی تحریم کے قائل ہیں۔اور یہ ان کے نزدیک ''وراء ذلک'' کے حکم میں شامل ہے)۔

اس لئے بیوی یا باندی سے ہمبستری کے سوا کسی بھی صورت میں مادہ منویہ نکالنا حرام ہے،اسی طرح شوہر یا آقا کے سوا کسی دوسرے کا مادۂ منویہ اپنے فرج میں جانے دینا عورتوں کے لئے حرام ہے، کیونکہ یہ بھی شرمگاہ کی حفاظت کے منافی ہے جس کا ان کو حکم دیا گیا ہے، مادہ منویہ کی خرید وفروخت بھی حرام ہے کیونکہ یہ انسانی جزء ہے جس کی تجارت حرام ہے۔

جب اس مقصد سے مادۂ منویہ نکالنا اور کسی دوسرے کو فرج میں استعمال کے لئے دینا اور عورت کا اس کو فرج میں لے جانا سب حرام ہے تو اس مقصد کے لئے بینک قائم کرنا اور اس میں رکھوانا بھی حرام ہوگا۔

اس میں بہت سارے مفاسد اور خرابیاں ہیں،اس میں بے شرمی و بے حیائی ہے، استمناء بالید کا ارتکاب ہے جو حرام ہے، دوسرے کو اپنا مادہ منویہ شرمگاہ میں استعمال کے لئے دینا ہے یہ بھی حرام ہے،عورت کا اپنی شرمگاہ میں دوسرے کا مادہ منویہ ڈالنا ہے یہ بھی حرام ہے، مادہ منویہ کی خرید وفروخت ہے یہ بھی حرام ہے، یک بہت بڑا مسئلہ نسب کی شناخت کا بھی ہے کہ جس کے مادہ منویہ سے استقرار حمل ہو رہا ہے اس کا پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ کون ہے۔

الغرض بہت سارے مفاسد کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے مادہ تولید کا بینک قائم کرنا اور اس میں مادہ تولید دینا اور وہاں سے اس کو حاصل کر کے استعمال کرنا یہ سب ناجائز وحرام ہیں۔

☆☆☆

اعضاء واجزاءِ انسانی کا عطیہ اور اس کے احکام

مولانا اقبال بن محمد ٹنکاروی ☆

جہاں جدید سائنسی ترقی نے بہت سی تحقیقات پیش کی ہیں، وہیں اس نے طب میں بھی تحقیقات وترقی کی ہے، ایک مدت سے بلڈ ٹرانسفر کی تحقیق بھی ہوئی اور اس سے علاج کامیاب بھی ہوا، اس علاج کی حقیقت یہ ہے کہ کسی مریض کو کسی عارضہ کی وجہ سے بے حد نقاہت لاحق ہوجاتی ہے اور اگر فوری تدارک نہ کیا جائے تو مریض کی زندگی کی امید باقی نہ رہے، مثلاً کوئی زخم لگا اور کثرت سے خون خارج ہوگیا یا کسی بیماری کی وجہ سے بہت ہی کمزوری بدن میں آگئی تو اس ضرورت میں ڈاکٹر کسی صحیح سالم انسان کا خون نکال کر لازمی مراحل سے گذرتے ہوئے مریض کے بدن میں بذریعۂ انجکشن اس کی رگوں میں داخل کرتا ہے؛ تاکہ مریض کی حالت سنبھل جائے، آج کل اس ضرورت کے لئے بلڈ بینک بھی قائم ہیں، البتہ جس آدمی کا خون لیا جائے اگر مریض کے خون کے اجزاء سے ملتا جلتا ہو یعنی ایک گروپ ہو تو دینے والے کا خون مریض کے کام آسکتا ہے، یہ علاج ایک طرح انتفاع بجزء الآدمی میں داخل ہوجاتا ہے تو دوسری طرف کسی مریض کو خون کی اشد ضرورت ہے، اگر اسے خون دیا جائے تو اس کی مدد ہوجاتی ہے، اگر پہلی صورت کو ترجیح دی جائے تو اس کے لئے عدم جواز ہی کا حکم ہوگا اور اگر دوسری صورت پر توجہ کی جائے تو یہ عمدہ اور لائق ستائش عمل ہے، اس لئے دونوں پہلو پر نظر رکھنا ضروری ہوگا۔

خون کی حرمت کے اسباب:

یہ ملحوظ رہے کہ خون حرام ہے اور اس کی حرمت کے لئے دو دو سبب جمع ہوگئے ہیں، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: تحقیق اس مسئلہ کی یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا دو وجوہ سے حرام ہو، اول اس لئے کہ اعضائے انسانی کا احترام واجب ہے اور یہ اس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے، اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے (معارف القرآن: سورۂ بقرہ، آیت نمبر: ۱۷۳، ص: ۳۶۳، ج: ۱، ط: ربانی بک ڈپو دہلی)۔

☆ دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات۔

چنانچہ اس کی حرمت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:"إنما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل به لغیر الله"(البقرہ: ۳) ،''حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل لغیر الله به''(المائدہ:۳)،لہذا خون پر''تداوی بالمحرم'' کا حکم ہوگا۔

لیکن حدیث اور کتب فقہ میں کچھ ایسے نظائر ملتے ہیں جس میں حرام اشیاء کے استعمال کا جواز بوقت ضرورت شدیدہ ازراہ علاج جائز معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ واقعۂ عرنیین مشہور ہے، جس میں حضور ﷺ نے اصحاب عرینہ کا علاج اونٹوں کے پیشاب پینے کو تجویز فرمایا، حالانکہ پیشاب ناپاک ہے (بخاری: کتاب الحدود، باب سمر النبی ﷺ اعین المحاربین، رقم الحدیث: ۶۸۰۵،ص: ۸۳۰، ۸۳۱، ط: مکتبہ اولاد الشیخ للتراث)۔

ایسے ہی حضرت عرفجہؓ کو سونے کا ناک بنانے کا حکم دیا تھا، حالانکہ سونے کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے؛ بلکہ مردوں کے لئے اس کے استعمال کے باب میں شدید ممانعت روایتوں میں مذکور ہے، لیکن حضرت عرفجہؓ کو اضطراری حالت کی وجہ سے اس کا حکم دیا گیا (نسائی: کتاب الزینة، باب من اصیب انفه هل یتخذ انفا من ذهب، رقم الحدیث: ۵۱۷۱، ۵۱۷۲،ص: ۱۷۲، ج: ۸، ط: دار الفکر بیروت لبنان)۔

بلکہ اوپر جو آیات حرمت دم، میتہ ولحم خنزیر کی پیش کی گئی، اسی آیات میں اضطراری حالت میں ان چیزوں کے استعمال کا استثنائی حکم بھی ذکر کیا، چنانچہ فرمایا:"فمن اضطر غیر باغ ولاعاد فلا اثم علیه ،فان الله غفور رحیم" (المائدہ: ۱۷۳)،''فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فان الله غفور رحیم''(المائدہ: ۳)،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اضطراری حالت اور عام معالجات میں شریعت میں دی ہوئیں سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، البتہ تداوی بالمحرم میں اگر شرعی یا معالجتی کچھ شرطیں ہوں تو اس کا پاس ولحاظ بھی ضروری ہے۔

اضطراری حالت کب ہوگی؟

مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظن غالب ہو (معارف القرآن: البقرہ، آیت نمبر: ۱۷۳،ص: ۳۶۵، ج: ۱، ط: بابی بک ڈپو دہلی)۔

مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ فرماتے ہیں: اضطرار وا کراہ وضرورت اور حرج وغیرہ ہر ایک الگ الگ مفاہیم رکھتے ہیں اور ہر ایک کے الگ الگ حدود واحکام ہیں، احقر ہر ایک کے مفاہیم شرعیہ اور اس کے حدود واحکام کو اجمالاً عرض کرتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے محرمات منصوصہ بہ نص قطعی میں گنجائش کے لئے ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے: ”**وقد فصل لکم ماحرم علیکم إلا ما اضطررتم الیه، وان کثیرا لیضلون بأهوائهم بغیر علم إن ربک هو أعلم بالمعتدین**“ (پارہ:۸، ع:۱)

اس ضابطہ میں محض اضطرار کو مستثنیٰ فرمایا ہے، پھر ساتھ ہی تنبیہ بھی فرمادی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اضطرار کے مستثنیٰ ہونے کی کچھ قیود وشرائط بھی ہیں، اگر ان کا لحاظ نہ کیا گیا تو گمراہی میں مبتلا ہوجائے گا، پھر ان قیود کو دوسری آیت کریمہ میں واضح فرمایا ہے، ان میں سے ایک کے اندر ”**غیر متناجف لاثم (ای غیر متجاوز عن الحدود الشرعیه)**“ کی قید ہے، اور دوسری آیت کریمہ: ”**غیر باغ ولا عاد(ای غیر قاصد للخروج عن الحدود الشرعیة والامر للخروج عن الحدود الشرعیة**“ کی قید ہے۔

پھر اس ضابطہ کی تفصیل وتشریح کتب احادیث، فقہ واصول فقہ میں ہے، جس کے تحت استثناء کی مندرجہ ذیل صورتیں نکلتی ہیں:

(۱) مخمصہ: بھوک، پیاس کی پریشانی سے جاں بہ لب ہوجائے، جان بچانے کی کوئی صورت بظاہر نہ رہے، اسی کو ”**فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم**“ میں فرمایا گیا، یہ اضطرار کی انتہائی شدید صورت ہے۔

(۲) جان کے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا یا ناقابل تحمل جسمانی تکلیف (مثلاً بصورت زدوکوب) یا حبس مدید (طویل قید) کا یا شدید مالی نقصان کا جو ناقابل تلافی ہو، ایسا خطرہ ہوجائے کہ اسباب کے تحت اس سے بچنے کی کوئی تدبیر نظر نہ آئے۔

اگر یہ صورت کسی دشمن یا ظالم کے جبر واکراہ کرنے سے ہو تو اس کو اکراہ ملجی اور جبر تام کہتے ہیں، اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے: ”**ان اللہ تجاوز عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرهوا علیه**“ (مشکوۃ شریف:۵۸۴) ”**وفی شرحه ای ماطلب منهم من المعاصی علی وجه الاکراه** اور اس کے بارے میں فقہ میں ہے: **وان اکرهه بقتل ملجی اوقطع عضو اوضرب حل الفعل**“ (درالمختار)۔

اسی طرح کی اور بھی تفصیلات فقہ کی کتاب الاکراہ میں مذکور ہیں۔

(۳) یہی صورتیں اگر کسی مکرہ یا جابر کے اکراہ کرنے کے بغیر خود بخود پیدا ہوجائیں اور ان کے زائل کرنے اور مرتفع کرنے کے اسباب اختیار میں نہ رہیں تو اس کو ضرورت کہتے ہیں، اور اسی کے بارے میں فقہاء کرام ”**الضرورات تبیح المحظورات**“ فرماتے ہیں۔

(۴) جان کے یا کسی عضو کے تلف ہوجانے کا خطرہ تو نہ ہو؛لیکن نا قابل تحمل جسمانی تکلیف یا نا قابل تلافی مالی نقصان کا ایسا خطرہ ہوجس کا ازالہ اسباب کے تحت قدرت میں نہ ہو۔

یہ صورت اگر کسی ظالم وجابر یا دشمن کے جبر واکراہ سے پیدا ہوگئی ہوتو اس کو اکراہ غیر ملجی کہتے ہیں، ایسے ہی مواقع کے لئے فقہاء نے ''**الضرر یزال**'' فرمایا ہے۔

(۵) اگر یہی چار نمبر کی صورتیں خود بخود اپنے حالات کے تحت پیش آجائیں تو اس کو حاجت یا احتیاج کہتے ہیں، اور ایسے مواقع کے بارے میں فقہائے کرام ''**ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**'' فرماتے ہیں۔

یہ پانچوں صورتیں درجہ بدرجہ اضطرار کی ہیں، ان میں مخمصہ واکراہ کی صورتوں کے علاوہ اور صورتوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ وہ صورت زندگی کے جس شعبہ ونوع سے متعلق ہو مثلاً معاشیات، اقتصادیات، معاشرہ، تمدن، صحت، مرض، معالجہ وغیرہ جس شعبہ ونوع سے تعلق ہو، جب تک اس شعبہ کا ماہر وحاذق واقف کار مسلمان جو دیانت وباشرع بھی ہو یہ حکم نہ لگادے کہ واقعی اضطرار متحقق ہوگیا ہے یا مبتلی بہ کا بار بار کا خود تجربہ صحیحہ اس پر شاہد نہ بن جائے، اس وقت تک اس میں حرمت منصوصہ کے خلاف کرنے یا اس کے استعمال کرنے کی شرعاً گنجائش نہ ہوگی اور ہر شخص کی رائے کا اعتبار نہ ہوگا، ہاں اگر اضطرار ومجبوری کا تحقق ظاہر ونمایاں ہوجائے تو اس خاص صورت میں بغیر ان شرائط وقیود کے بھی وسعت وگنجائش ہوجائے گی، لقوله تعالیٰ: ''**لایکلف الله نفسا إلا وسعها**''. **وقوله تعالیٰ**: ''**ولاتلقوا بایدیکم الی التهلکة وغیرهما**''.

ان اضطرار خمسہ کے علاوہ کچھ اور بھی توسعات وگنجائشیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عنایت فرمائی ہیں، ان کی بناء بھی آیات ربانی ہی پر ہیں، مثلاً ''**یرید الله بکم الیسر ولایرید بکم العسر**''، اور **قوله تعالیٰ**: ''**وماجعل علیکم فی الدین من حرج**''، نیز **قوله تعالیٰ**: '' **وغیرهما من الآیات**''

ان آیات کریمہ سے بھی چند ضابطے نکلتے ہیں؛ جو کتب احادیث وفقہ میں مذکور ہیں:

(۱) جان یا عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ تو نہ ہو؛لیکن صرف جسمانی یا مالی نا قابل تحمل تلافی نقصان کا شدید خطرہ ہو، لیکن اس کا دفعیہ وازالہ بھی اسباب کے تحت قدرت واختیار میں ہو، اس کو مشقت کہتے ہیں، اور فقہاء کرام انہیں کے بارے میں ''**المشقة تجلب التیسیر**'' فرماتے ہیں۔

(۲) ان ہی صورتوں میں جب نا قابل تلافی نقصان کا شدید خطرہ تو نہ ہو؛مگر اس کا تحمل یا تلافی کرنا بیحد دشوار ہو، جس سے بے حد تنگی رہتی ہو، معاش، معاشرہ دشوار وتنگ تر بنا ہوا ہوتو اس کو حرج کہتے ہیں، اس کے بارے میں فقہاء کرام ''**الحرج مدفوع**''، فرماتے ہیں۔

خون کے علاوہ کسی اورعضوکی پیوندکاری میں ایک انسان کے کسی عضوکو دوسرے انسان کے ساتھ جوڑنے میں یااستعمال کرنے میں ان ساتوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت عموماً متحقق نہیں ہوتی، اگرکچھ تحقق ہوتا ہے توصرف عدم النفع کایاعدم استراحت کایابیش کلفت کاجوحسب منشاءراحت وآرام نہ پہونچنے سے پیش آتی ہے،اوران سب صورتوں میں محرمات شرعیہ کےارتکاب کی گنجائش نہیں ہوتی۔

لہذااس پیوندکاری یاایک شخص کےکسی عضوکودوسرےشخص کےکسی عضومیں جوڑنے یااستعمال کرنے میں قطعاً گنجائش نہ ہوگی (نظام الفتاوی: کتاب الحظر والاباحت، ج:۱،ص:۳۵۹-۳۶۲،ط:اسلامک فقہ اکیڈمی،انڈیا)۔

انتقال دم کےشرائط:

چوں کہ نقل دم کاجوازکاحکم استثنائی ہے،لہذااس میں شرعی اور(فن طب کےاعتبارسے) کچھ عرفی شرائط ہوں تواس کالحاظ ضروری ہوگا،اوراس میں منقول منہ الدم اورمنقول الیہ الدم دونوں کوکچھ شرطوں کالحاظ کرنا ضروری ہوگا،جودرج ذیل ہیں:

منقول منہ(متبرع)ایساشخص ہے کہ اگراس سےخون لیاجائےتووہ خودایسےضررمیں مبتلی ہوجائےجواسےموت تک پہنچادےیامستقبل میں ہلاکت کاباعث ہویاایسےمرض تک پہنچادےجس سےصحت یاب ہوناممکن ہی نہ ہو،یابہت ہی صعوبت اورمشقت کےساتھ ممکن ہو،ایسی صورتوں میں مذکورمنقول منہ کےلئےتبرع دم جائزنہیں ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں:”**ولاتقتلوا انفسکم ، ان اللّٰہ کان بکم رحیما**“(النساء:۲۹)۔

اپنےآپ کوہلاک کرنےاوردوسروں کوناحق قتل کرنےیعنی خودکشی اورقتل غیردونوں سےبچناہے،پھرکچھ افعال ایسے ہوتے ہیں جوانسان کوفی الفورختم کردےاورکچھ افعال ایسے ہوتے ہیں جوانسان کوتدریجی طورپرختم کردے،یہاں بھی اگر منقول منہ کی حالت خون دینے کےبعدفوری طورپریامستقبل میں ہلاکت کےقریب پہنچ سکتی ہےتواس کوخون دینے سے اجتناب ضروری ہوگا۔

حدیث مشہورہے:”**لاضرر ولاضرار**“(سنن ابن ماجہ: کتاب الاحکام،باب من بنی فی حقہ مایضر بجارہ،رقم الحدیث:۲۳۴۰، ۲۳۴۱،ص:۷۲،ج:۴،ط:دارالجیل بیروت)۔

جیسےآدمی کوغیرکوتکلیف وضررپہنچانےسےمنع کیاگیاہے،ایسےہی اپنےآپ کوضررپہنچانےسےبھی منع کیاگیاہے۔

نیز”**ولاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ**“(البقرہ:۱۹۵)میں اپنےآپ کوہلاکت میں ڈالنےسےانسان کوروکاگیا ہے،چاہےہلاکت فی الحال ہویافی المآل ہو؛کیوں کہ نہی عام ہے،لہذااگرکسی متبرع بالدم کےلئےخون دیناہلاکت

کا ذریعہ بن سکتا ہو تو اس کو چاہیے کہ اس تبرع سے بچے (فتاوی رحیمیہ: ۵/۴۵۱)۔

تبرع بالدم کی وجہ سے انسان کو اوپر ذکر کردہ ہلاکت یا دیر سے صحت یاب ہونے کا خطرہ تو نہ ہو؛ لیکن خون کا عطیہ کرنے کی صورت میں سخت ضعف وکمزوری پیدا ہوجانے کا امکان ہو تو اس وقت بھی "لاضرر ولاضرار" کے پیش نظر اس کے لئے خون کا عطیہ دینا جائز نہ ہوگا۔

اگر منقول منہ کو تبرع بالدم میں کوئی خطرہ نہیں ہے؛ لیکن دوسرے شخص کو خون کی سخت احتیاج وضرورت ہے، اگر اس شخص کو خون نہ دیا جائے تو موت یا ضرر کا خطرہ ہے، تو اس وقت خون کا عطیہ کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہوگا:

(۱) متبرع منقول منہ کا خون ایڈز جیسے امراض متعدیہ سے سالم ہو، ایسے ہی سرطان جیسے امراض مستوطنہ (دیر پا رہنے والے امراض) سے بھی خون سالم ہو۔

(۲) دونوں کے خون کے اجزاء (گروپ) ایک ہو۔

(۳) ماضی میں زمانہ فتوحات میں ہمارے کچھ حضرات فقہاء کا خیال یہ بھی تھا کہ منقول الیہ حربی یا علانیہ فرقہ پرست اور دشمن اسلام نہ ہو؛ کیوں کہ یہ معصوم الدم نہیں ہے، بلکہ واجب القتل ہے، لہذا خون دے کر اس کی حیات وبقاء کی زیادتی کے معاون نہ بنیں، ؛لیکن اب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری طرف سے غیر مسلم کو خون دیا جائے تو اس کے بہتر اثرات کی امید کی جاسکتی ہے، اور ہمارے اس تعاون سے عمدہ اخلاق کا اثر ضرور پڑے گا، اور ماضی میں اس کا اثر دیکھا بھی گیا ہے۔

(۴) خون کے علاوہ کوئی متبادل دوسری دوا نہ ہو، جس سے مریض کی جان بچ سکے، یا صحت یاب ہو سکے۔

(۵) کوئی ماہر طبیب خون کے استعمال کو ناگزیر قرار دے (کفایت المفتی: ۹/۱۱۳)۔

(۶) محض قوت یا جسمانی حسن میں اضافہ مقصود نہ ہو کہ یہ ضرورت کے درجہ کی چیز نہیں ہے (فتاوی رحیمیہ: ۵/۴۵۱، جواہر الفقہ: ۲/۳۸)۔

اس کا جواز کچھ فقہی قاعدوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دیا جاسکتا ہے، جیسے "**الضرورات تبیح المحذورات**"، تبرع بالدم محذور ہے؛ لیکن اس خون پر دوسرے آدمی کی حیات موقوف ہونے کی وجہ سے ضرورۃً اس کو مباح قرار دیا گیا ہے، اور چوں کہ منقول منہ کو تبرع بالدم میں کوئی تکلیف نہیں ہے، اور نہ دینے میں منقول الیہ الدم کو ضرر کا اندیشہ ہے تو لاضرر ولاضرار کے پیش نظر خون نہ دیکر دوسرے کو تکلیف وضرر میں نہ ڈالے اور اگر منقول منہ الدم کو معمولی سی تکلیف بھی ہو تو اس کو بھی برداشت کرلیا جائے؛ "**یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام**" (قواعد الفقہ: قاعدہ نمبر: ۱۷۰، ۳۹۸، ص:

۸۹،۱۳۹،ط: دارالفکر دیوبند)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں خون دینا اصلاً تو محذورات میں سے ہے، البتہ اضطراری حالت میں اوپر ذکر کردہ شرطوں کی رعایت کرتے ہوئے مسلم وغیر مسلم کو خون دینا چاہئے۔

۲، ۳- بلڈ بینک کا قیام اور خون جمع کرنے کے لئے کیمپ قائم کرنا:

آج کل ہر چھوٹے بڑے شہروں میں بلڈ بینک قائم ہیں، وہاں آدمی بوقت ضرورت خون لینے پہنچے، تو قیمت ادا کر کے خون وصول کرسکتا ہے، یہ خون کی بیع وشراء کی تو شرعاً اجازت نہ ہوگی؛ کیوں کہ علماء وفقہاء نے خون ٹرانسفر کی رخصت دی ہے، البتہ اس کی بیع وشراء کی گنجائش یا اجازت نہیں دی ہے۔

کبھی قدرتی یا انسان کے پیدا کردہ حادثات پیش آنے کی وجہ سے کئی لوگوں کی جانیں ہلاک ہوتی ہے، اور کئی لوگ زخمی ہوتے ہیں، تو ان زخمیوں کو خون کی فوری ضرورت ہوتی ہے؛ لیکن بروقت کثیر تعداد میں افراد ملنا مشکل ہوتا ہے جو مریضوں اور زخمیوں کو خون کا عطیہ کرے، اس فوری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بلڈ بینک قائم کئے گئے، ایسے ہی اچانک انسان جان لیوا مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اسے فوری طور پر خون کی ضرورت پڑسکتی ہے، اور اسے کوئی شخص خون دینے والا فوری طور پر نہیں ملتا ہے تو اس کی ضرورت وہ بلڈ بینک سے پوری کرتا ہے۔

اور کبھی افراد تو ملتے ہیں، لیکن ان کا گروپ مریض کے خون کے گروپ (اجزاء دم) سے مختلف ہوتا ہے، لہذا اسے بلڈ بینک میں مطلوب خون سے تبدیل کرنا پڑتا ہے، ایسے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بلڈ بینکوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ رقمطراز ہیں:

جب خون کے استعمال کی گو بدرجۂ مجبوری گنجائش ہوگی تو چوں کہ ایسی مجبوریاں اچانک بھی پیدا ہوجاتی ہیں، اور خون کی بہت زیادہ مقدار کی متقاضی ہوجاتی ہیں، جیسے ریل کے ایکسیڈنٹ کے موقع پر، یا جنگ یا محاربہ کے اندر بسا اوقات بیک وقت بہت زیادہ افراد زخمی ہوجاتے ہیں، اور ان کی جان بچانے کے لئے ان سب کو خون کا انجکشن دینا ضروری ہوجاتا ہے، اور پھر اس میں بھی مریض کے خون کا نمبر اور جو خون چڑھایا جاتا ہے اس خون کا نمبر بالکل یکساں ہونا ضروری ہوتا ہے، ورنہ بجائے نفع کے نقصان کا اندیشہ ہوجاتا ہے، اس لئے ان اچانک پیش آمدہ ضروریات کے لئے ہر نمبر کے خون کا فراہم رکھنا بھی ضروری ہوجاتا ہے، اور مقدار کی تعیین وتحدید معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں محفوظ رکھنا ضروری ہوگا اور اس کا ایک خزانہ بنانا بھی لازم ہوگا جس کو آج کل اصطلاح میں بینک کا نام دیا جاسکتا ہے، "**لأن الشئی اذا ثبت ثبت بجمیع لوازمه**"، لہذا اس فراہمی کے اور محفوظ رکھنے کے جو مناسب طریقے ہوں گے اور ان میں جو اخراجات درکار ہوں گے ان

سب کو بھی حدودِشرع میں رہتے ہوئے برداشت کرنا ہوگا (نظام الفتاوی: کتاب الحظر والاباحت ،ص:۳۵۶،ج:۱،ط:اسلامک فقہ اکیڈمی،انڈیا)۔

حضرت فقیہ الامتؒ فرماتے ہیں:

سوال: شرعاً ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں بطور علاج داخل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ ڈاکٹروں کی رائے میں مریض کی جان بچنا مشکل ہورہی ہو۔

الجواب: حامداً ومصلیاً: ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں داخل نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس میں جزءِ انسانی سے انتفاع لازم آتا ہے اور جزءِ انسانی سے انتفاع حرام ہے۔ "**قوله وان حرم استعماله ای استعمال جلده أو استعمال لآدمی بمعنی اجزائه وبه یظهر التفریع بعده**" (شامی، ۱/ ۱۸۸)، البتہ اگر اس کے بغیر جان بچنا دشوار ہو تو بقدرِ ضرورت اس کی اجازت ہوگی (فتاوی محمودیہ: باب الحظر والاباحت ،ص: ۴۳۲، ج: ۱۲، سوال نمبر: ۵۶۲، ط: مکتبہ محمودیہ میرٹھ)۔

ہاں بعض مرتبہ کسی آدمی کو مثلاً A کی ضرورت ہے، اور اس گروپ کا آدمی نہ مل سکا، کسی دوسرے گروپ کا خون ملا ہے تو اس کی تبدیلی کے لئے بھی بلڈ بینک میں خون دینا پڑتا ہے اس لئے اس صورت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

بعض حضرات اس لئے بلڈ بینک میں خون دیتے ہیں؛ تاکہ ان کو وہاں سے اس کے ایک فرد ہونے کا شناختی کارڈ ملے، تاکہ کسی وقت ان کے خاندان یا متعلقین میں سے کسی کو خون کی ضرورت پڑے تو اس کارڈ کی بناء پر خون آسانی سے دستیاب ہوسکے۔

بعض مواقع پر لوگوں کے جائز عرف وعادات کے مطابق چلنے میں فائدہ بھی ہوتا ہے اور یہ فائدہ اجتماعی طور پر تمام مسلمانوں کو ہوتا ہے، اس لئے ایسے کیمپ قائم کرنے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے جس میں مسلمان تنظیم کی طرف سے مسلمانوں کا خون جمع کیا جائے اور بلڈ بینکوں کو دیا جائے۔

البتہ منتظمین کی ان کیمپوں کے قیام سے کوئی خودغرضی یا مفاد پرستی وابستہ نہ ہو، تمام مسلمانوں کی بھلائی اور مستقبل میں مسلمانوں کو ضرورت پڑنے پر ان کو بلڈ بینکوں سے خون فراہم کروانا اور ان کا تعاون کرنا مقصد ہو، نیز ایسے کیمپوں سے مسلمانوں کے عمدہ اخلاق کا برادرانِ وطن پر اچھا اثر بھی پڑسکتا ہے، ایسے کیمپ قائم کرنے میں حرج معلوم نہیں ہوتا ہے، اس سلسلہ میں بلڈ بینک میں خون دینے کے تحت حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب کی عبارت گذر چکی ہے، اس سے بھی ایسے کیمپوں کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

اوپر خون کی خرید وفروخت کے بارے میں تو منع کیا گیا ہے، البتہ اس کی حفاظت کرنے، فلٹر کرنے اور دوسری ضروریات کے لئے جو اخراجات آتے ہوں؛ ان کو وصول کرنے کی گنجائش ہوگی۔

نادر گروپ کے حاملِ خون شخص پر دوسرے کو خون دینے کا حکم:

(۴) منقول منہ ومنقول الیہ الدم کے لئے جو شرائط اوپر ذکر کی گئی ہیں ان کا لحاظ کیا جائے یعنی منقول منہ کے لئے ہلاکت، شدید ضعف اور مرض کا خطرہ نہ ہو وغیرہ اور وہ خون دے تو اس کو کوئی تکلیف نہ ہوگی، اور اگر وہ نادر گروپ کے خون کا حامل ہے اور مریض کو سخت ضرورت ہے، اگر خون نہ ملے تو ہلاکت کا خطرہ ہے، تو اس گروپ کے حامل خون آدمی پر اخلاقی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس مریض کو خون دے کر ایثار سے کام لے، ایک مریض مؤمن بھائی کو اخوت ایمانی اور انسانیت کا ثبوت پیش کرے، اور "**یؤثرون علی أنفسهم ولو کان بهم خصاصة**" کا مصداق بنیں۔

۶،۵- جگر، قرنیہ اور دیگر اعضاءِ انسانی کا عطیہ اور اعضاء کی تبدیلی کی مختلف صورتیں:

مولانا بدرالحسن قاسمی صاحب لکھتے ہیں: آنکھیں، دل، گردے، جگر یا جسم کے دوسرے وہ حصے جو بیماری یا کسی حادثہ کا شکار ہوجانے کی وجہ سے کارآمد نہ رہے ہوں، ان کی جگہ پر سرجری کے ذریعہ انسانی یا حیوانی یا مصنوعی عضو لگانا؛ تاکہ مریض کی زندگی بچائی جاسکے یا اس کے ناکارہ عضو کی کارکردگی بحال کی جاسکے، اس مقصد کے لئے درج ذیل صورتیں استعمال میں لائی جاتی ہیں:

(۱) پلاسٹک یا کسی دھات سے تیارشدہ مصنوعی عضو کا استعمال، جیسے ٹوٹے ہوئے دانت یا کٹی ہوئی ناک کی جگہ پر سونے یا کسی دوسری دھات یا پتھر سے بنے ہوئے دانت یا ناک کا استعمال یا پھیپھڑے کی خرابی کو پلاسٹک وغیرہ کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش۔

(۲) ایسے حیوانات جن کی خلقت یا بعض اعضائے جسم، انسانی اعضاء سے مماثلت رکھتے ہیں، ان کے اجزائے جسم سے استفادہ اوران کے ذریعہ تلف شدہ اورناکارہ انسانی عضو کا کام لینے کی کوشش جیسے بندروغیرہ کے بارے میں بعض تجربات ڈاکٹروں نے کئے ہیں۔

(۳) خودمریض کے اپنے جسم کے کسی حصہ کی کھال، یا گوشت کا دوسرے حصہ کی خرابی دور کرنے کے لئے استعمال، جیسے سرکی کھال کاٹ کراوپر کے ہونٹ میں پیدا ہوجانے والی خرابی دور کرنے کے لئے استعمال کی جائے یا ان کی کھال چہرے پر زخم وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی بدگمانی دور کرنے کے لئے استعمال کی جائے۔

(۴) دوسرے زندہ آدمی کا بطور عطیہ دیا ہوا یا خریدا ہوا کوئی عضو استعمال کیا جائے، جیسا کہ آج کل گردے کا چندہ اکٹھا کرنے کا عام رواج ہوگیا ہے، اور سرکاری طور پر بعض ملکوں میں میڈیکل اداروں کے ماتحت اسے قانونی طور پر جائز کرلیا گیا ہے، اور لوگ خوش دلی سے اس مہم میں حصہ لینے لگے ہیں۔

(۵) مردہ کے جسم سے حاصل شدہ کارآمد اجزاء آنکھ کی پتلی، پھیپھڑے، دل وغیرہ کا استعمال، اور عام طور پر یہی صورت زیادہ مروج اور مشہور ہے۔

شرعی نقطۂ نظر سے پہلی صورت میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی، علاج ومعالجہ کے ذریعہ بیماری دور کرنے کے سلسلہ میں شریعت میں جو عمومی احکامات ہیں ان سے اس صورت کا جواز خود بخود سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بھی علاج معالجہ کے جائز طریقوں ہی کا ایک حصہ ہے۔

دھاتوں میں سونے کا استعمال گو کہ مردوں کے لئے عام حالتوں میں ناجائز قرار دیا گیا ہے؛ لیکن ناک وغیرہ کے کٹ جانے کی صورت میں اگر سونے کے علاوہ کوئی دوسری چیز کارآمد نہ ہوسکتی ہو اور اس کے سڑنے یا بو پیدا ہوجانے کا امکان ہو تو سونے کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا مشہور واقعہ عرفجہ کی طرف شروع میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔

اس واقعہ سے بجا طور پر یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ اگر ناک کے علاوہ جسم کا کوئی دوسرا عضو جس پر زندگی موقوف ہو اور اس میں تبدیلی ناگزیر ہوجائے تو اس کے لئے سونا سمیت جس دھات سے بھی بنا ہوا عضو کارآمد ہوسکتا ہو اس کا لگانا بدرجۂ اولی جائز ہوگا، کیوں کہ محض چہرے کی بدنمائی دور کرنے کے مقابلہ میں جان کی حفاظت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اس لئے ناک پر دوسرے اعضاء کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

دوسری صورت جس میں حیوانات کے اعضاء استعمال کرنے پڑتے ہوں وہ بھی شرعی نقطۂ نظر سے ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے، تمام جانوروں کو خدا تعالیٰ نے انسان کی راحت رسانی کے لئے مسخر فرمایا ہے، البتہ یہ احتیاط ضروری ہوگی کہ جن جانوروں کو شریعت نے حرام کرنے کے ساتھ ان کے جسم کو نجس عین قرار دیا ہے ان کے اجزاء سے اجتناب کیا جائے، لیکن اگر انسان موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہو اور جان بچانے کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہ جائے کہ حرام وناپاک جانور کا کوئی عضو استعمال کیا جائے تو اضطرار کی حالت ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال بھی جائز ہوگا۔

قرآن کریم نے خود ہی اس کی وضاحت کردی ہے کہ **"وقد فصل لکم ما حرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ"** (الانعام:۱۱۹) (جو چیزیں تم پر حرام کی گئی ہیں وہ کھول کر بیان کردی گئی ہیں، مگر یہ کہ تم ان کے استعمال پر مجبور ہی ہوجاؤ)۔

جہاں تک تیسری صورت کا سوال ہے جس میں خود انسان کے اپنے جسم کے کسی حصہ کو کاٹ کر دوسرے حصہ میں علاج کی خاطر چسپاں کیا جاتا ہو تو اگر وہ واقعی ناگزیر ضرورت کے تحت ایسا کیا جائے اور اس کاٹ چھانٹ کے عمل سے غیر معمولی ضرر پہنچنے یا جان جانے کا احتمال بھی نہ ہو تو شرعاً درست ہوگا، مثلہ کے ذریعہ انسانی صورت بگاڑنے کی شریعت نے اجازت

نہیں دی ہے اور ناک کٹ جانے کی صورت میں پیدا ہونے والی بدنمائی دور کرنے کے لئے شریعت نے سونے کے استعمال کی اجازت دی ہے، اسی طرح انسانی جسم پر پیدا ہونے والے زخم کو چیر کر علاج کرنے، پچھنے لگوانے، گونگے اور بہرے وغیرہ کا آپریشن کے ذریعہ علاج جس طرح جائز ہے اور اس سے اللہ تعالی کی تخلیق میں تبدیلی لازم نہیں آتی، اسی طرح اگر ہونٹ کٹ جانے، یا چہرے کی کھال اور گوشت نکل جانے سے حد سے زیادہ بدنمائی یا تکلیف پیدا ہوگئی ہو تو اپنے ہی سر کی کھال یا ران کے گوشت سے اس نقص کو دور کرنا جائز ہوگا، بشرطیکہ دوا اور دوسری تدبیر اس کے لئے کارگر نہ ہو۔

کسی شخص کے ہاتھ یا پاؤں میں اگر پانچ کے بجائے چھ انگلیاں ہوں اور زائد انگلی اذیت کا باعث ہو تو فقہاء نے اس کو کاٹ کر علیحدہ کرنے کی اجازت دی ہے۔

اصول فقہ کے جو عمومی قواعد ہیں، ان میں ”**الضرر یزال**“ اور ”**لا ضرر ولا ضرار**“ جیسے عمومی قواعد سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

چوتھی صورت وہ تھی جس میں زندہ آدمی اپنا کوئی عضو دوسرے آدمی کی جان بچانے کی خاطر بطور عطیہ یا معاوضہ لے کر دے۔

شریعت میں دونوں جانوں کی حرمت یکساں ہے اور انسان کو خود اپنے ہاتھ پاؤں یا جسم کے کسی حصہ کو کاٹ کر فروخت کرنے یا بطور چندہ دینے کی اجازت نہیں دی گئی ہے، اس لئے کسی زندہ آدمی کے جسم سے ایسا کوئی عضو علیحدہ کرنا جس سے خود اس کی جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہو نہ تو وہ معاوضہ دے کر جائز ہوگا اور نہ بغیر معاوضہ کے، نہ خود اس کی اجازت سے اور نہ بغیر اس کی اجازت کے، کیوں کہ خود اسے بھی اپنے جسم پر ایسا تصرف کرنے کا حق شرعاً حاصل نہیں ہے، خود ایسا کرنا یا کرانا تو خودکشی کے مترادف ہے اور دوسرے کا اقدام قتل نفس کے حکم میں ہے اور دونوں ہی صورتیں حرام و ناجائز ہیں۔

البتہ بعض ایسے اعضاء جن کی قطع و برید سے خود اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا ہو اور نہ اسے کوئی غیر معمولی ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اس سے کسی دوسرے آدمی کی جان بچائی جاسکتی ہو، اصل قواعد کی رو سے گو کہ یہ بھی صحیح نہیں ہے؛ لیکن موجودہ زمانہ کے بعض اہل علم نے کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے اور اسی کے اساس پر بعض مسلم ممالک میں کلیہ (گردے) کے چندہ کا دروازہ کھولا گیا ہے، اس جواز میں دو پہلو سامنے رکھے گئے ہیں، ایک تو کسی انسان کی جان بچانے کی اہمیت، دوسرے ڈاکٹروں کی طرف سے مسلسل یقین دہانی کہ اس سے عطیہ دینے والے شخص کی جان یا صحت پر کوئی قابل ذکر منفی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے، اس صورت میں بھی جواز کی شکل صرف اس وقت ہے جب کہ عطیہ دینے والا شخص بغیر کسی دباؤ یا لالچ کے اپنی خوشی سے کسی دوسرے کی جان بچانے کے لئے اپنا ایسا عضو قربان کر رہا ہو، جس سے خود اس کی صحت

یا جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، نہ تو عمومی طور پر چندہ اکھٹا کرنا درست ہے اور نہ خرید وفروخت، چوں کہ جان بچانے کی مصلحت کسی ایک عضو کو اپنی مرضی سے تلف کرنے کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ تھی، اس لئے ضرورت کی حد تک ہی یہ جواز بھی محدود ہوگا، اگر مردہ حیوان کے اعضاء سے کام چل سکتا ہو یا مصنوعی عضو ہوسکتا ہے تو اس کی اجازت ہرگز نہ ہوگی، چوں کہ بعض صورتوں میں زندہ آدمی کا جگر ہی مثال کے طور پر کارگر ہوسکتا ہے، اس لئے یہ راہ کھولی گئی ہے، ورنہ آدمی خود اپنے اعضائے جسم کے بارے میں آزادانہ تصرف کرنے کا شرعاً مجاز نہیں ہے۔

آخری اور پانچویں صورت وہ ہے جس میں مردہ آدمی کے اعضاء سے کسی کی زندگی بچانے یا تکلیف دور کرنے کا کام لیا جائے، اور یہی صورت زیادہ پیش آنے والی ہے اور مدت سے فقہاء اور علماء دین کے درمیان بحث ونظر کا موضوع بھی یہی صورت رہی ہے۔

شریعت نے یوں تو مردہ لاش کا بھی وہی احترام باقی رکھا ہے جو زندہ کو حاصل ہے اور اس کی اہانت یا اس میں قطع وبرید کو بھی اسی طرح ناجائز قرار دیا ہے، جس طرح زندہ انسان کے جسم میں کاٹ چھانٹ کو، لیکن مصالح کے پیش نظر اور موجودہ سرجری میں غیر معمولی ترقی ہوجانے کے بعد اعضاء کی پیوندکاری کی افادیت تقریباً یقینی ہوجانے کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے، کیوں کہ کسی مردہ کی لاش سے آنکھ، دل یا پھیپھڑے کو کارآمد حالت میں نکال کر کسی دوسرے کے جسم میں لگانا اہانت کے لئے ہرگز نہیں ہوتا، بلکہ اس کے سڑگل جانے کے بجائے کسی ایسے آدمی کا جزو بدن بنا دینا جو اس کے بغیر اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا ہو زیادہ بہتر اور قرین مصلحت ہے، شرعی نقطۂ نظر سے جب کبھی بھی مصلحتوں اور مضرتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو اور مصلحت کا پہلو غالب نظر آئے تو اس کو ترجیح ہوگی، سوائے اس کے کہ کسی چیز کی حرمت صراحت کے ساتھ کتاب وسنت میں مذکور ہو تو وہاں مصلحت ومضرت سے قطع نظر شریعت کے حکم کی پیروی مطلوب ہوگی۔

یہ حکم صراحت کے ساتھ کتاب وسنت میں تو مذکور نہیں ہے، لیکن فقہاء نے بعض نظیریں ایسی ذکر کی ہیں، جن کو بنیاد بنا کر اس کے جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے۔

''المغنی'' میں مذکور ہے: اگر کوئی شخص کوئیں میں گر کر مر جائے اور لوگوں کو اس کنویں کے پانی کی ضرورت ہو تو لوہے کے کانٹے یا سلاخوں کے ذریعہ جس سے لاش کے پھٹ جانے کا امکان ہو اسے نکالا جاسکتا ہے وہ مزید فرماتے ہیں:

''لأن حرمة الحی وحفظ نفسه أولی من حفظ المیت عن المثلة، لأن زوال الدنیا أهون علی الله من قتل مسلم، ولأن المسلم لو بلع مال غیره شق بطنه لحفظ مال الحی ، وحفظ النفس اولی من حفظ المال ''

(زندہ کی حرمت اوراس کی جان بچانے کی مصلحت میت کومثلہ ہونے سے بچانے کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے، کیوں کہ پوری دنیا کاختم ہوجانا خدا کے نزدیک ایک مسلم کے قتل سے زیادہ اہون (کمتر) ہے، نیز اگرکوئی مسلمان شخص دوسرے کامال نگل کرمرجائے تو زندہ آدمی کے محض مال کی حفاظت کی خاطراس کا پیٹ چاک کیا جائے گا تو جان کی حفاظت تو مال کی حفاظت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ضروری ہے)۔

ابن قدامہ نے جس زوروقوت سے زندہ آدمی کی زندگی بچانے کی خاطر مردہ کی لاش کی اہانت کے پہلوکونظرانداز کرنے کا مسئلہ ذکرکیا ہے، اس سے مردہ کے جسم سے کارآمد اجزاءاس غرض سے الگ کرنے کا جواز بھی نکلتا ہے، تاکہ ان سے کسی کی جان بچائی جاسکے۔

شافعی فقیہ ومحدث امام نوویؒ فرماتے ہیں: ”**وان ماتت امرأة وفي جوفها جنين حي شق جوفها لانه استبقاء حي باتلاف جزء من الميت فاشبه اذا اضطر الى اكل جزء من الميت**“

(اوراگرکوئی عورت مرجائے اوراس کے پیٹ میں زندہ بچہ ہوتو (بچہ نکالنے کے لئے) اس کا پیٹ چاک کیا جائے گا؛ کیوں کہ اس میں میت کی لاش میں ذراسے تصرف سے ذی روح کی زندگی بچانی ہے تو یہ ایسا ہی ہوگیا کہ کوئی شخص اپنی جان بچانے کے لئے میت کے جسم کا کچھ حصہ کھانے پر مجبور ہوجائے)۔

فقہ مالکی کی مشہور کتاب ”شرح مختصرخلیل“ میں بھی اسی کے مشابہ مسئلہ مذکور ہے، شرح کے الفاظ ہیں: ”**يجوز شق بطن الميت اذا توفرت البينة وهي الشاهد اواليمين**“ (میت کا پیٹ چاک کرنا جائز ہوگا اگرشرعی طور پر پیٹ میں مال کا ہونا شاہد یا یمین کے ذریعہ ثابت ہوجائے)۔

فقہائے احناف بھی اس مسئلہ میں دوسروں سے الگ نہیں ہیں، علامہ ابن عابدین شامیؒ جن کی کتاب فتوی کامدار سمجھی جاتی ہے؛ فرماتے ہیں: ”**حامل ماتت وولدها حي يشق بطنها ويخرج ولدها. ولو بلع مال غيره ومات هل يشق ؟ قولان: والاولى نعم**“۔

(اگرکوئی حاملہ عورت مرجائے اوراس کا بچہ پیٹ میں زندہ ہوتو پیٹ چاک کرکے اس کے بچہ کونکال لیا جائے گا؛ لیکن اگرکسی نے دوسرے کامال نگل لیا ہواوراس کی موت ہوجائے تو کیا اس کا پیٹ بھی چاک کیا جائے گا؟ (تاکہ مال برآمد ہوسکے) اس کے بارے میں فقہاء کے دوقول ہیں اوران میں بہترقول یہی ہے کہ ہاں، اس صورت میں بھی پیٹ چاک کیا جائے گا)۔

یہ تمام فقہی نظائر اس کی تائید کرتے ہیں کہ زندہ آدمی کی جان بچانے کی خاطر میت کی لاش میں تصرف کیا جاسکتا ہے،

اس لئے پیوندکاری کی خاطر اگر میت کے ورثاء کی اجازت سے جسم کا کوئی کارآمد حصہ نکال لیا جائے تو مصلحت اور ضرورت کی بناء پر یہ جائز ہوگا، اسی طرح حادثہ وغیرہ کا شکار ہوجانے والے غیر معلوم اشخاص اور خاص طور پر غیر معلوم کی لاش سے کارآمد اجزاء علیحدہ کرلینا؛ تاکہ کسی کی جان بچائی جاسکے یا آنکھ وغیرہ سے معذور شخص کی اعانت کی جاسکے، از روئے شرع جائز ہوگا (عصر حاضر کے فقہی مسائل:ص:۸۶ تا ۱۰۰، ط: ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی)۔

اپنے اعضاء کے عطیہ کی وصیت کرنا:

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ فرماتے ہیں:

سوال: ایک شخص انتقال سے پہلے وصیت کرے کہ انتقال کے بعد میری آنکھیں ''آنکھوں کے بینک'' میں محفوظ کرادی جائیں اور پھر کسی ضرورت مند شخص کو دیدی جائیں، یا فلاں شخص کی آنکھ میں میری آنکھ لگادی جائے تو کیا یہ وصیت جائز ہے اور اس پر عمل ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: انسان اپنے بدن یا کسی عضو کا مالک نہیں ہے کہ اس میں جو چاہے آزادانہ تصرف کرسکے، ہدایہ آخرین میں ہے:''**لأنه لاولاية لهما على دمهما ولهذا لا يمكنان الإباحة فلا يستباح برضاهما**'' (ہکذا اپنے بدن یا کسی عضو) پر ولایت نہیں ہے، اس لئے کوئی شخص اس بات کا مالک نہیں ہے کہ اپنا خون (اسی طرح اپنا بدن یا کوئی عضو) کسی کے لئے مباح کردے، اگر کسی نے اپنی مرضی سے مباح بھی کردیا ہو تب بھی وہ خون (ہکذا عضو) مباح الاستعمال نہ ہوگا (ہدایہ آخرین،ص:۱۲۹، باب التحکیم، تحت قولہ ولا یجوز التحکیم فی الحدود والقصاص)۔

لہذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص جو وصیت کررہا ہے یہ وصیت ''**فيما لايملك**'' یعنی ایسی چیز کے متعلق ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے، اس لئے وصیت معتبر نہ ہوگی اور اسی طرح جس کے لئے (ادارہ ہو یا کوئی فرد) وصیت کی ہے اسے اس آنکھ کے مطالبہ کا حق حاصل نہ ہوگا، نیز اس میں اعضاء انسانی کی اہانت بھی ہے؛ حالانکہ انسان واجب التکریم ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ فرماتے ہیں:

کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ یہ وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد میرا جسم یا جسم کا فلاں عضو آنکھ، کان وغیرہ کچھ بھی فلاں شخص کو یا کسی ہسپتال کو بطور عطیہ یا بعوض قیمت دیدیا جائے، اگر وصیت کرے گا تو یہ وصیت منعقد و صحیح بھی نہ ہوگی اور اس کے مرنے کے بعد اس وصیت پر عمل کرنا بھی جائز نہ ہوگا، جو لوگ عمل کریں گے سخت گنہگار ہوں گے، اور یہ سب حکم ظاہر ہے، اس لئے کہ وصیت مملوکہ مال میں ہوتی ہے اور یہ جسم انسان کا مموک نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس کے

پاس محض بطور امانت ہے، بغیر حکم شرع وحکم خدا ایک انگلی بھی کاٹ ڈالنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ حرام وسخت گناہ ہے۔

یہ چیز بھی قطعاً ناجائز وحرام ہے،کوئی عضو خواہ مسلمان ہی کا ہو کٹ کر جسم سے الگ ہونے کے بعد جیفہ ومردار ہونے سے خارج نہیں ہوگا اور نہ وہ پاک وطاہر ہوگا،لہذا اتنا حصہ جسم مردار اور ناپاک ہی رہے گا اور وہ شخص کبھی نماز بھی نہ پڑھ سکے گا اور نہ کبھی طاہر ہی ہو سکے گا، ہاں اگر اضطراری صورت ایسی ہوجائے کہ احشاء جسم (اندرون جسم) میں مثلاً گردہ، پھیپھڑا، جگر، دل وغیرہ میں سے کوئی اس درجہ خراب ہوجائے کہ اس کو نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگانا ضروری ہوجائے اور ماہر معالجوں کے نزدیک جان بری کے لئے اور زندگی بچانے کے لئے اس عمل کے بغیر چارہ نہ رہے؛ بلکہ یہی عمل متعین ہوجائے اور صحت وبقاء زندگی کا گمان غالب حاصل رہے تو اس اضطرار کی حالت میں جان باقی رکھنے کے لئے اس عمل کے بقدر اضطرار گنجائش ہو سکے گی، پھر بھی یہ کوشش لازم وضروری رہے گی کہ بجائے انسانی عضو کے کسی جانور کا عضو اور وہ بھی ماکول اللحم جانور کے عضو سے کام چل سکے تو صرف اسی عضو سے کام لیا جائے (منتخبات نظام الفتاوی: کتاب الحظر والاباحت، ص:۳۸۸، ج:۳، ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی)۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ لدھیانوی رقم طراز ہیں:

صرف مضطر کی جان بچانے کے لئے مردہ انسان کا گوشت کھا سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مردہ کے کسی عضو کو علاج کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں، اگرچہ مریض کو ہلاکت کا خطرہ ہو، اسے اکل مضطر پر قیاس کرنا دو وجوہ سے صحیح نہیں ہے: (۱) اکل سے شبع وحیات متیقن ہے اور تداوی سے صحت متیقن نہیں، (۲) اکل کی صورت میں عضو ماکول بالکل ہلاک ولاشئی ہوجاتا ہے، جب کہ پیوند لگایا ہوا عضو باقی رہتا ہے۔

مضطر زندہ انسان کا گوشت اور خود اپنا کوئی عضو نہیں کھا سکتا، اس سے معلوم ہوا کہ آج کل مریض کے کسی حصہ سے گوشت اتار کر دوسری جگہ چڑھانے کا جو معمول ہے یہ ناجائز ہے، جب حالت اضطرار میں جان بچانے کے لئے اپنے یا دوسرے کے گوشت یا کھال کو کاٹ کر استعمال کرنا جائز نہیں تو تداوی کے لئے تو بدرجۂ اولی جائز نہ ہوگا (احسن الفتاوی: کتاب الحظر والاباحت، عنوان توقیع الاعیان علی حرمۃ ترقیع الانسان، ص:۲۷۲، ۲۷۳، ج:۸، ط: زکریا بک ڈپو، دیوبند)۔

مذکورہ بالا سطور میں متعدد علمائے ہندو پاک کے فتاوی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف بوقت ضرورت شدیدہ بقدر ضرورت خون تو دیا جا سکتا ہے، انسانِ حی ومیت کا کوئی عضو دینے کی قطعاً گنجائش نہ ہونی چاہئے، کیوں کہ حرمت وکرامت میں زندہ ومردہ دونوں برابر ہیں، لہذا اس مقصد کے لئے زندہ ومردہ میں کسی کا عضو استعمال نہیں کر سکتے اور اس پر دلیل یہ حدیث ہے: ''کسر عظم المیت ککسرہ حیا'' (مشکوۃ المصابیح: کتاب الجنائز، باب دفن المیت ص:۷۵۳، ج:۱، رقم الحدیث: ۱۷۱۴، ط: المکتب الاسلامی)۔

اس کے برخلاف آج کل کچھ علماء اور مسلم ملکوں نے اس کی گنجائش دی ہے۔

انہوں نے ایثار سے متعلق احادیث وآثار بھی مدنظر رکھے ہیں، اگرچہ اکثر آیات واحادیث میں کھانے پینے، برتنے کی چیزوں میں اور دیگر کچھ اموال میں ایثار کی ترغیب دی گئی ہے، جب کہ کچھ روایات جہاد سے متعلق ہے، ان میں سے ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے، جس میں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے اپنی ذات کو تیروں کے سامنے پیش کرنا اور حضور ﷺ کو اپنے پیچھے رکھتے ہوئے بچانے کی سعی کرنے کا ذکر ہے۔

حدیث میں حضرت ابوطلحہؓ کی طرف سے اپنی ذات پر نبی ﷺ کو ترجیح دینا واضح ہے، یعنی اپنی حیات پر حضور کی حیات اور دشمنان اسلام کے مکارہ وشدائد سے سلامتی وحفاظت کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا، جیسا کہ ان کے الفاظ ''نحری دون نحرک'' اس پر دلالت کررہے ہیں، یہ اگرچہ ایک ایسی ذات کے لئے ایثار ہے جو مؤمنین سے انتہائی درجہ کی محبت، شفقت اور تعلق رکھتی ہے، ایسے ہی نبی ﷺ کے دفاع میں اور آپ کی حفاظت کی غرض سے حضرت مصعب بن عمیر، علی بن ابی طالب، سعد بن ابی وقاص اور دیگر کئی حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے آپ کو آگے رکھا اور کئی حضرات مہاجرین وانصار شہید بھی ہوئے (صحیح البخاری: کتاب مناقب الانصار، باب مناقب ابی طلحہ، رقم الحدیث ۳۸۱۱، ص ۷۴۴ طبع مکتبہ اولاد الشیخ للتراث)۔

یہاں ایک جان کی حفاظت کے لئے دوسرے حضرات اپنے آپ کو مقدم کرتے ہیں، اور اپنے اوپر زخم لیتے ہیں، اسی طرح اگر کسی مسلمان کو آنکھوں کا قرنیہ مطلوب ہے یا جگر مطلوب ہے تو چاہے زندہ آدمی کے اعضاء نہ لیں کہ اسے ضرر لاحق ہو؛ لیکن مردہ انسان کے یہ اعضاء لے کر کسی کو فائدہ پہنچا دیا جائے تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

ھیئۃ کبار العلماء (مملکت سعودیہ عربیہ) نے مذکور الصدر روایت اور دیگر کئی روایات ذکر کرنے کے بعد درج ذیل رائے کو ترجیح دی:

''وبعد الدراسة والمناقشة، وتبادل وجهات النظر قرر المجلس بالأكثرية ما يلي:

أولا: جواز نقل قرنية عين من انسان بعد التأكد من موته وزرعها فى عين انسان مسلم مضطر إليها وغلب على الظن نجاح عملية زرعها ما لم يمنع أوليائه، وذلک بناءً على قاعدة: تحقيق أعلى المصلحتين، وارتكاب أخف الضررين، وايثار مصلحة الحى على مصلحة الميت فانه يرجى للحى الابصار بعد عدمه والانتفاع بذلک فى نفسه ونفع الامة به، ولا يفوت على الميت الذى اخذت قرنية عينه شيئى، فان عينه الى الدمار والتحول الى رفات، وليس فى اخذ قرنية عينه مثلة ظاهرة، فان عينه قد اغمضت، وطبق جفناها اعلاهما على الاسفل.

ثانیا: جواز نقل قرنیة سلیمة من عین قرر طبیاً نزعها من انسان، لتوقع خطر علیه من بقائها، وزرعها فی عین مسلم آخر مضطر الیها، فان نزعها انما کان محافظة علی صحة صاحبها اصالة، ولا ضرر یلحقه من نقلها الی غیره وفی زرعها فی عین آخر منفعة له، فکان ذلک مقتضی الشرع، وموجب الانسانیة" (ابحاث ھیئۃ کبار العلماء، نزع القرنیۃ من عین انسان، ص: ۷۳، ج: ۷، ط: رئاسۃ ادارۃ البحوث العلمیہ والافتاء، الریاض)۔

عصر حاضر کے طبی، سائنسی اور دیگر شعبہ جات سے پیدا شدہ جدید مسائل پر غور وخوض کے لئے قائم شدہ فقہ اکیڈمی جدہ نے اس بابت جو فیصلہ دیا ہے، وہ بھی ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے چوتھے سمینار منعقدہ جدہ، سعودی عرب مؤرخہ ۱۸-۲۳ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ مطابق ۶-۱۱/فروری ۱۹۸۸ء میں مذکور موضوع پر پیش کئے جانے والے فقہی اور طبی مقالات اور مباحثہ سے یہ بات سامنے آئی کہ سائنسی اور میڈیکل ترقی کے نتیجہ میں یہ موضوع ایک حقیقت بن چکا ہے، اور اس کے کچھ مفید نتائج کے ساتھ ساتھ بیشتر حالات میں انسانی شرف وکرامت کی پاسداری کرنے والے شرعی ضوابط واصول سے گریز کی وجہ سے نفسیاتی اور سماجی نقصانات بھی سامنے آرہے ہیں، دوسری جانب اسلامی شریعت کے مقاصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو فرد وجماعت کے ترجیحی مصالح کی تکمیل کرتے ہیں، اور باہمی تعاون وہمدردی اور ایثار کی دعوت دیتے ہیں۔

اصل موضوع بحث اور جواب طلب امور کی تحدید اور ان حالات، صورتوں اور قسموں کے انضباط -جن کے حسب حال علیحدہ علیحدہ احکام مرتب ہوں گے کے بعد اکیڈمی نے اس اجلاس میں درج ذیل امور طے کئے:

تعریف واقسام:

اول: یہاں عضو سے مراد انسان کے نسیجوں، خلیوں، خون وغیرہ میں سے کوئی بھی جزو ہے، جیسے آنکھ کا قرنیہ خواہ وہ جزو متصل ہو یا جسم انسانی سے علیحدہ۔

دوم: عضو انسانی سے انتفاع جو یہاں موضوع بحث ہے، اس سے مراد وہ استعمال ہے جس کی ضرورت استعمال کرنے والے کو اپنی اصل زندگی کی بقاء یا جسم کے کسی اہم وظیفے مثلاً نگاہ وغیرہ کی حفاظت کے لئے درپیش ہو اور استعمال کرنے والا شخص ایسی زندگی رکھتا ہو جو شرعاً قابل احترام ہے۔

سوم: اس استعمال کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱-کسی زندہ انسان کے عضو کو منتقل کرنا، ۲-کسی مردہ انسان کے عضو کو منتقل کرنا، ۳-جنین کے عضو کو منتقل کرنا۔

پہلی صورت: یعنی زندہ انسان کے عضو کو منتقل کرنا؛ درج ذیل طریقوں سے ہوسکتا ہے:

الف: کسی انسان کے ایک عضو کو لے کر اسی انسان کے جسم میں دوسرے مقام پر پیوند کاری کی جائے، جیسے کھال، پٹھوں، ہڈیوں، وریدوں اور خون وغیرہ کی جسم کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ کو منتقلی اور اس کی پیوند کاری۔

ب: کسی زندہ انسان کے عضو کی دوسرے انسان کے جسم میں پیوند کاری۔

اس صورت میں اس عضو کی دو میں سے کوئی ایک حیثیت ہوسکتی ہے، یا تو اس پر زندگی کا دارومدار ہوگا یا اس پر زندگی کا انحصار نہیں ہوگا۔

اگر اس پر زندگی کا انحصار ہے تو یا تو وہ تنہا ہو، یا جوڑا، تنہا کی مثال قلب اور جگر، اور جوڑے کی مثال گردہ اور پھیپھڑے ہیں۔

اگر اس پر زندگی کا انحصار نہیں ہو تو یا تو وہ جسم کا کوئی بنیادی کام انجام دیتا ہوگا یا نہیں، اور یا تو وہ خود بخود از سر نو تیار ہوتا رہتا ہوگا، جیسے خون یا ایسا نہیں ہوتا ہوگا اور یا تو نسب ووراثت اور عمومی شخصیت پر اس سے اثر پڑتا ہوگا، جیسے خصیہ، انڈادانی اور اعصابی نظام کے خلئے، یا اس کا ان میں سے کسی چیز پر اثر نہیں ہوگا۔

دوسری صورت: کسی مردہ انسان کے عضو کو منتقل کرنا:

یہ بات ملحوظ رہے کہ موت کی دو حالتیں ہوتی ہیں:

پہلی حالت: دماغی موت کہ سارے وظائف یکسر پورے طور پر بند ہو جائیں اور طبی لحاظ سے ان کی واپسی ممکن نہ ہو۔

دوسری حالت: قلب اور تنفس اس طرح پورے طور پر رک جائیں کہ طبی طور پر دوبارہ بحال ہونا ممکن نہ ہو۔

ان دونوں حالتوں میں اکیڈمی کے تیسرے سمینار کی قرارداد کی رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔

تیسری صورت: یعنی جنین کے عضو کو منتقل کرنا:

جنین سے استفادہ تین حالتوں میں ہوسکتا ہے:

۱- ایسے جنین جو خود بخود ساقط ہو گئے ہوں۔

۲- ایسے جنین جو کسی جرم یا طبی ضرورت کی بناء پر ساقط کئے گئے ہوں۔

۳- بچہ دانی سے باہر تیار شدہ لقیحے (بارآور شدہ نطفے)۔

شرعی احکام:

اول: کسی انسان کے جسم کا عضو اسی انسان کے جسم میں دوسری جگہ لگانا اس اطمینان کے بعد جائز ہوگا کہ پیوند کاری سے متوقع فائدہ اس پر مرتب ہونے والے نقصان سے زائد ہو، نیز اس کا مقصد کسی مفقود عضو کو وجود میں لانا یا اس کی شکل کو

بحال کرنا یا اس کے مقصود وظیفہ کو بحال کرنا یا کسی عیب کی اصلاح یا کسی ایسی بدصورتی کا ازالہ ہو جو اس شخص کے لئے نفسیاتی یا جسمانی اذیت کا سبب بنتی ہو۔

دوم: کسی انسان کا عضو (حصہ جسم) دوسرے انسان کے اندر منتقل کرنا ایسی صورت میں جائز ہوگا کہ وہ از خود تیار ہوتا رہتا ہو، جیسے خون اور جلد، اس شرط کے ساتھ کہ دینے والا کامل اہلیت رکھتا ہو اور معتبر شرعی شرائط ملحوظ رکھی گئی ہوں۔

سوم: ایسا عضو جو کسی مرض کی وجہ سے جسم سے نکال دیا گیا ہو اس کے کسی حصہ سے استفادہ دوسرے شخص کے لئے جائز ہے، مثلاً کسی مرض کی وجہ سے کسی شخص کی آنکھ نکال دی گئی ہو تو اس آنکھ کے قرنیہ (پتلی) سے استفادہ۔

چہارم: ایسا عضو جس پر زندگی کا دارومدار ہے جیسے قلب، اسے کسی زندہ انسان سے دوسرے انسان کے اندر منتقل کرنا حرام ہے۔

پنجم: کسی زندہ انسان کے ایسے عضو کا منتقل کرنا جس پر اگرچہ اصل زندگی کا دارومدار تو نہ ہو؛ لیکن اس کی عدم موجودگی سے زندگی کا ایک بنیادی وظیفہ موقوف ہو جاتا ہو، یہ جائز نہیں ہے، جیسے دونوں آنکھوں کے قرنیوں کو منتقل کرنا، اگر اس منتقلی سے کسی بنیادی وظیفہ کا ایک حصہ متأثر ہوتا ہو تو اس کا حکم قابل غور ہے، جیسا کہ آگے (دفعہ: ۸) میں آرہا ہے۔

ششم: کسی میت کا ایسا عضو کسی زندہ انسان کے اندر منتقل کرنا جائز ہے، جس عضو پر زندگی کی بقا یا کسی بنیادی وظیفہ کی سلامتی منحصر ہو، بشرطیکہ خود میت نے اپنی موت سے پہلے یا اس کی موت کے بعد اس کے ورثہ نے اور اگر میت کی شناخت نہ ہو یا لاوارث ہو تو مسلمانوں کے سربراہ نے اس کی اجازت دی ہو۔

ہفتم: یہ بات واضح رہے کہ جن صورتوں میں اعضاء کی منتقلی کے جواز پر اتفاق ہوا ہے، وہ اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ ان اعضاء کا حصول خرید وفروخت کے بغیر ہوا ہو، کیوں کہ کسی بھی حال میں اعضاء انسانی کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

البتہ استفادہ کرنے والے کا مطلوبہ عضو کے حصول کے لئے بوقت ضرورت یا اعزاز وانعام کے طور پر مال خرچ کرنا محل غور ہے۔

ہشتم: مذکورہ حالات اور صورتوں کے علاوہ تمام صورتیں جو اس موضوع سے تعلق رکھ سکتی ہیں وہ سب محل نظر ہیں، طبی تحقیقات اور شرعی احکام کی روشنی میں ان پر آئندہ سمینار میں غور وفکر کی ضرورت ہے (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے: چوتھا سمینار، قرارداد نمبر: ۲۶/ ۱/ ۴، عنوان مردہ یا زندہ انسان کے اعضاء کا دوسرے انسان کے لئے استعمال، ص: ۱۲۷-۱۳۰، ط: ایفا پبلیکیشنز)۔

(۷) اس کی وضاحت اوپر شرائط میں ذکر کی گئی ہے، دونوں کی اجازت ضروری ہونی چاہئے۔

(۸) میڈیکل سائنس کے میدان میں غیر معمولی ترقی ہونے کے باوجود جو طبی دنیا نومولود بچہ کے لئے ماں کے نیچرل دودھ کا ایسا بدل فراہم کرنے سے اب تک قاصر ہے، جو بچہ کی نشو ونما کے لئے درکار ان تمام ضروری عناصر پر مشتمل ہو جو قدرت نے ماں کے دودھ میں رکھے ہیں، بچہ کی جسمانی نشو ونما اور تقویت کے ساتھ اس کی عقلی ونفسیاتی سلامتی کے لئے خدا نے نیچرل انسانی دودھ میں بعض ایسی خاصیتیں رکھی ہیں، جو مصنوعی دودھ اور بچوں کے لئے دستیاب دوسری غذاؤں میں اب تک پیدا نہیں کی جاسکتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کے ماتحت عالمی صحت کے ادارے نے اطباء کی متفقہ قرارداد کے مطابق تمام دنیا کی ماؤں کو بچوں کی پرورش میں مصنوعی دودھ سے امکانی حد تک بچنے کی تلقین کی ہے، اور تمام طبی اداروں کو اس کی پابندی کرانے کا زور دیا ہے، چنانچہ جس طرح سگریٹ پر اس کے مضر صحت ہونے کا اعلان ہوتا ہے، اسی طرح مصنوعی دودھ کے ہر ڈبہ پر اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ بچہ کے لئے ماں کے دودھ کا کوئی بدل نہیں ہے۔

بعض حالتوں میں ماں اگر بچہ کو اپنی صحت کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اپنا دودھ نہ پلاسکتی ہو تو شریعت نے اس کے لئے ''رضاعت'' کا باب کھلا رکھا ہے، جس کی رو سے ایک عورت دوسرے کے بچہ کو معاوضہ لے کر یا بغیر معاوضہ اپنا دودھ پلاسکتی ہے، قدیم عرب معاشرہ میں ''رضاعت'' کا عام رواج تھا، خود رسول اللہ ﷺ بھی بچپن میں دودھ پینے کے لئے حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالے کئے گئے تھے، جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اسلام نے ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہونے کی حیثیت سے اسے باقی رکھا ہے اور اس کے لئے اصول وضوابط متعین کئے ہیں، اور دودھ پلانے والی عورت اور دودھ پینے والے بچے کے درمیان ایک مقدس رشتہ قائم کردیا ہے، اور دونوں کے لئے اس رشتہ کی ویسی ہی عظمت وحرمت قائم کردی ہے، جو حقیقی ماں اور اس کے بچہ کے درمیان ہوتی ہے، چنانچہ ازدواجی رشتہ رضاعی (دودھ پلانے والی) ماں اور دودھ شریک بہن بھائی سے بھی اسی طرح ناجائز قرار دیا گیا ہے، جس طرح حقیقی ماں اور حقیقی بھائی بہن وغیرہ سے ناجائز ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ''**وأمهاتكم اللاتی أرضعنكم واخواتكم من الرضاعة**'' (تمہارے لئے تمہاری وہ مائیں بھی (حرام کی گئیں) جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور وہ بہنیں بھی جو دودھ میں شریک رہی ہیں)۔

اور رسول اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: ''**یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب**'' (رواه الشیخان عن عائشة) (رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے ہوا کرتے ہیں)۔

چنانچہ دودھ پینے اور پلانے کے احکام اسلامی فقہ کا ایک اہم ترین باب شمار ہوتے ہیں، حقیقی ماں کے علاوہ کسی عورت کو رضاعی ماں بنانے سے جو پابندیاں لازم آتی ہیں، اور رضاعی ماں بچہ اور دودھ شریک بھائی بہنوں کے درمیان جو جسمانی

وجذباتی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے، اس کی اسلام نے بڑی اہمیت رکھی ہے، اور مسلمانوں نے ہمیشہ اس کے آداب وحقوق کی پوری رعایت کی ہے، شریعت کے بنیادی مقاصد میں جس طرح جان، انسانی عقل اور دین کی حفاظت ہے اسی طرح نسب کی حفاظت بھی ہے۔

موجودہ مغربی تہذیب کی بنیاد چوں کہ مادہ پرستی پر ہے، اس لئے اس میں اخلاقی اور روحانی قدروں کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے، چنانچہ قدرت نے علم وتحقیق کے میدان میں جن بلندیوں سے انسان کو نوازا ہے، اخلاقی حیثیت سے تہذیب کے دعویداروں نے اپنے آپ کو اسی قدر پستی میں ڈال لیا ہے، جس کی وجہ سے علم وتحقیق کا رخ بھی صحیح نہیں رہا اور وہ بھی معاشرہ میں بے حیائی، بداخلاقی، بے قیدی اور دوسرے مزمن امراض پھیلانے کا ذریعہ بن رہے ہیں، جس کی ایک سے ایک حیا سوز مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں، عورتوں کے دودھ اور انسانی مادۂ تولید کے بینک قائم کرنے کا تخیل اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود جو نتائج ان تجربات کے سامنے آرہے ہیں، ان سے آنکھیں بند کر لینا کسی طرح مناسب نہیں ہوگا، جب ہماری خواہش، ارادے اور پسند وناپسند سے قطع نظر دنیا میں کوئی چیز رائج ہوتی ہے، تو اس میں مسلمان بھی اسی طرح مبتلا ہوتے ہیں، جس طرح دوسری قوموں کے افراد، اس لئے اس کے بارے میں شرعی احکام کی وضاحت ضروری ہے؛ تاکہ لوگ حلال وحرام کی تمیز نہ کھو بیٹھیں۔

''انسانی دودھ کا بینک'' قائم کرنے کا تخیل چاہے جن مقاصد کے تحت سامنے آیا ہو، چنانچہ مغربی ممالک میں بعض رفاہی ادارے دودھ پینے والی عورتوں سے نادار بچوں کے نام پر دودھ کا چندہ اکٹھا کرتے ہیں، اور ان میں بعض کیمیائی تبدیلی کر کے اسٹاک کر لیتے ہیں اور اس دودھ سے ان بچوں کی پرورش کا کام لیا جاتا ہے جو ناقص الخلقت ہیں یا جن کا وزن کم ہو، یا ان میں اور کوئی ایسی خرابی ہو جس کی وجہ سے وہ مصنوعی دودھ کا تحمل نہ کر سکتے ہوں، یورپی ممالک میں اس کا تجربہ کیا گیا اور وہ چیز وجود میں آئی، جسے ''انسانی دودھ بینک'' کہا جاتا ہے۔

ظاہر نظر میں تو یہ ایک کارِ خیر معلوم ہوتا ہے جس سے مقصد بھی ایسے بچوں کی اعانت ہے جو کمزور اور ناتمام حالت میں پیدا ہوئے ہوں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اجازت ہوگی کہ عورتوں کا دودھ اکٹھا کر کے ''Milk Bank'' قائم کئے جائیں؟ اور اگر عطیہ سے وافر مقدار میں دودھ حاصل نہ ہو سکے تو اس کی خرید وفروخت بھی کی جائے اور معاوضہ دے کر دودھ اکٹھا کیا جائے؟ پھر جو بچے سیکڑوں انجان عورتوں کے مخلوط دودھ سے پرورش پائیں گے؛ کیا ان کے درمیان رضاعت کا رشتہ بھی قائم ہوگا؟ اگر ہوگا تو اس کا فیصلہ کس طرح ہو سکے گا؟ معاشرہ کی کونسی عورت کس کی رضاعی

ماں ہے اور کون سی رضاعی بہن؟ بچہ جس معاشرہ میں پلا اور بڑھا ہے بڑا ہونے کے بعد اسی معاشرہ کی کسی عورت کو کس طرح وہ اپنے لئے شریک حیات کے طور پر منتخب کر سکے گا جب کہ نہ تو دودھ دینے والیوں کا ریکارڈ ہو اور نہ پینے والے بچوں کا؟ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو پیدا ہوتے ہیں (عصر حاضر کے فقہی مسائل، ص:۹۶-۱۰۰، ط: ایفا پبلیکیشنز)۔

مادۂ منویہ بینک کا قیام:

اسلام نے نسب کی حفاظت اسی طرح ضروری قرار دی ہے، جس طرح جان کی حفاظت، لہٰذا انسانی مادۂ منویہ کا بے محل استعمال ناجائز اور سنگین جرم ہوگا، نئی نئی مشینیں ایجاد کی جائے یا اور کوئی اعلی طریقہ، اس فحاشی کی ظاہری صورت بدل سکتی ہے، حکم وہی باقی رکھا جائے گا جو ناجائز طور پر جسم سے لطف اندوزی کا ہے، یعنی زنا سے ہونے والی اولاد کے احکام، اگر چہ اس میں شبہ کی وجہ سے حد جاری نہ ہوگی، "**الحدود تدرأ بالشبهات**" (قواعد الفقہ: رقم القاعدہ، ۱۱۱ ص:۷۶، ط: دار الکتاب دیوبند)۔

لہذا کسی انسان کے مادۂ منویہ، جرثومے اور بیضوں کا استعمال اپنی منکوحہ یا باندی کو چھوڑ کر دوسری جگہ قطعاً جائز نہ ہونا چاہئے، اگر اس طرح کیا جائے تو کسی کا مادہ دوسرے غلط مقام پر رکھنا لازم آئے گا، اور اس انتقال مادہ کے بعد عورت سے اس کا شوہر جماع کرے تو دوسری خرابی بھی لازم آئے گی، جس کو حضور ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی: "**لایؤمن لامرئ یؤمن بالله والیوم الآخر ان یسقی ماء ہ زرع غیرہ**" (ابوداود: کتاب النکاح، باب فی وطئ السبایا، رقم الحدیث: ۲۱۵۷، ص: ۴۲۵، ج: ۲، ط: دار ابن حزم بیروت)۔

چوں کہ اس صورت میں جس کا مادہ ہے اسی سے یہ بچہ تولد پانے والا ہوگا، اس لئے دوسرے کا اس کو سیراب کرنا اشتباہ میں نہ ڈالے اس لئے روکا گیا، دوسری چیز یہ ہے کہ اس بچہ کی اصل اور جڑ اس عورت کو مانتے ہیں، جس کے بطن سے یہ بچہ متولد ہوا، تعبیرات قرآن وحدیث سے یہی مفہوم ہوتا ہے: "**وعلی المولود له رزقهن**"...اور دیگر آیات، اب اگر مادہ کسی اور کا ہو اور بطن کسی اور کا، تو اس وقت اس مادہ کے اعتبار سے ماں کوئی اور ہوگی، جب کہ جس نے بچہ جنا ہے وہ اس کی اصل ہے، اور یہی عرف ہے، اس اعتبار سے ماں یہ عورت ہوگی تو اس خرابی سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا۔

مذکور حدیث شریف کی روشنی میں علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: "**قال الشیخ: وهذا تشبیه علی معنی التقریب، وهو فی قوله: زرع غیره قطع اضافة ملک الزرع عن الساقی واثباته لرب الزرع، وهو الزارع، فقیاسه فی التشبیه به أن لایکون الولد لهما جمیعا وانما یکون لاحدهما**" (معالم السنن علی مختصر سنن ابی داود: کتاب النکاح، باب وطء السبایا، رقم الحدیث: ۲۰۷۱، ص: ۶۷، ج: ۳، ط: دار المعرفۃ بیروت)۔

اسی لئے عورت کو ختم عدت تک نکاح سے روکی گئی؛ تا کہ استبراء رحم ہو جائے اور کسی کے مادہ کے ساتھ دوسری کا مادہ

ملحق نہ ہوجائے ،اس کی حکمت ومصلحت بیان کرتے ہوئے مفتی سعید احمد صاحب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا ترجمہ اور وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: یہ بات جان لیں کہ عدت جاہلیت میں مانی ہوئی مشہور باتوں میں سے تھی،اور وہ ان چیزوں میں سے تھی کہ نہیں قریب تھے کہ لوگ اس کو چھوڑ دیں،اوراس میں بہت سی مصلحتیں تھیں۔(اس لئے شریعت نے اس کو برقرار رکھا)ان میں سے شوہر کے پانی سے عورت کی بچہ دانی کی براءت (پاک ہونے کو) پہچاننا ہے: تاکہ نسب خلط ملط نہ ہو،پس نسب ان چیزوں میں سے ایک ہے جن میں کنجوسی کی جاتی ہے،اور جس کو عقلمند ڈھونڈھتے ہیں،اور وہ نوع انسانی کی خصوصیات میں سے ہے،اوران چیزوں میں سے ہے جس کے ذریعہ انسان دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتے ہیں،اور استبراء کے مسائل میں وہی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہے (رحمۃ اللہ الواسعہ: کتاب النکاح والطلاق، باب عدت کا بیان ،ص:۱۷۰،ج:۵،ط: مکتبہ حجاز دیوبند)۔

اس قدر بڑی خرابی پیدا ہونے کی وجہ سے مادۂ منویہ بینک کا قیام یا کسی ضرورت مند انسان کو بیع کی شکل میں یا بطور ہدیہ مادہ دینا جائز نہ ہونا چاہئے۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

مولانا خورشید احمد اعظمی ☆

ا-مسلمان یا غیر مسلم کو خون کا عطیہ:

اللہ تعالی نے انسان کو مکرم ومحترم بنایا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**ولقد کرمنا بنی آدم**" (سورۂ اسراء)، اسی لئے ناحق کسی انسان کو ایذا پہنچانا، اس کی توہین کرنا، اس کے کسی عضو یا جسم کے کسی حصہ کو فروخت کرنا یا خریدنا، یا اس کے جسم کے کسی جز کو الگ کر کے اس سے استفادہ کرنا، اس اعزاز وتکریم کے منافی ہے، جو خالق نوع انسانی نے انسان کو بخشا ہے، حتی کہ اس کی موت کے بعد اس کے مردہ جسم کے ساتھ ایسا کوئی سلوک کرنا جو اس کی حیات میں اس کے ساتھ جائز نہیں، اس سے بھی ممانعت وارد ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "**کسر عظم المیت ککسر عظم الحی**" (سنن ابی داؤد) (مرے ہوئے کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کے مثل ہے)، کتب فقہیہ میں بھی انسان کی تعظیم وتکریم کی تلقین کی گئی ہے:

"**الآدمی مکرم شرعا، وإن کان کافرا، فإیراد العقد علیه، وابذاله به، والحاقه بالجمادات إذلال له**" (فتح القدیر، شامی) (آدمی شرعی طور پر معزز ہے اگر چہ وہ کافر ہو، لہذا اس پر عقد کا معاملہ کرنا، اور اس کے ذریعہ اس کا استعمال کرنا، اور اس کو جمادات سے ملحق کرنا اس کو ذلیل کرنا ہے)۔

"**الانتفاع بأجزاء الآدمی لم یجز**" (فتاوی عالمگیریہ، باب الکراہیۃ)۔

"**وحرمة الانتفاع بأجزاء الآدمی لکرامته**" (کتاب الہدایہ، کتاب الطہارۃ) (اور آدمی کے اجزاء سے انتفاع کی حرمت اس کے اعزاز واکرام کی وجہ سے ہے)۔

"**فکما یحرم التداوی بشئ من الآدمی الحی، اکراما له فکذلک لا یجوز التداوی بعظم المیت**" (شرح السیر الکبیر ۱/ ۱۲۸)، تو جیسا کہ زندہ آدمی کے کسی جز سے علاج کرنا حرام ہے ویسے ہی مردہ آدمی کی ہڈی سے علاج کرنا بھی حرام ہے، حتی کہ بچہ کو دودھ پلانا، جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے، اس کو بھی مدت رضاعت کے بعد غیر مباح

☆ محلہ رگھوناتھ پورہ، مئو (یوپی)۔

کہا گیا ہے،''**لم یبح الارضاع بعد مدته، لأنه جزء آدمي، والانتفاع به لغير ضرورة حرام**''(الدرالمختار،النکاح، باب الرضاع)(مدت رضاعت کے بعد دودھ پلانا مباح نہیں ہے، کیونکہ دودھ آدمی کا جز ہے، اور بغیر ضرورت اس سے انتفاع حرام ہے)۔

نیز خون نجس ہے، اس کا استعمال غذا کے طور پر حرام ہے، جیسا کہ آیت کریمہ:''**حرمت عليكم الميتة والدم......الآية**'' سے ظاہر ہے، اور اس کا استعمال دوا کے طور پر بھی حرام ہوگا، جیسا کہ حدیث رسول اللہ ﷺ:''**ان الله أنزل الداء والدواء، وجعل لكل داء دواء، فتداووا، ولاتداووا بالمحرم**''(سنن ابی داؤد ۳۸۷۴)، سے معلوم ہوا، خواہ یہ استعمال منہ کے ذریعہ ہو یا انجکشن کے ذریعہ یا کسی اور ذریعہ سے، لہذا بلاضرورت شدیدہ اپنا خون کسی کو عطیہ کرنا جائز نہیں ہے اور اگر ضرورت شدید ہے کسی کے جسم میں خون اتنا کم ہوگیا ہے کہ اس کی زندگی خطرہ میں ہے، اور خون دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، تو یہ حالت اضطرار کی ہوگی، جس میں زندگی بچانے کے لئے بقدر ضرورت حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت شریعت نے دے رکھی ہے، آیت کریمہ میں مذکور ہے:''**الا مااضطررتم اليه**''، نیز''**فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه**''، لہذا''**الضرورات تبيح المحظورات،الضرر يزال**''اور مقصد شریعت، حفظ النفس کے پیش نظر اس مریض کی زندگی بچانے کے لئے خون چڑھانا جائز ہوگا، اور ایسے شخص کے لئے جس کا خون نکالنے سے اسے ضرر لاحق نہ ہو اپنا خون مضطر مریض کو عطیہ کرنا جائز ہوگا، مریض خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، جیسا کہ بچہ کو مدت رضاعت میں دودھ پلانا کسی عورت کے لئے جائز ہے، قطع نظر اس سے کہ بچہ مسلم کا ہے یا غیر مسلم کا، اس لئے کہ احترام آدمیت میں تمام انسان برابر ہیں، الا یہ کہ کسی شرعی وجہ سے کوئی مباح الدم ہوجائے۔

اور اگر خون کا عطیہ کرنے والے کو اس کا خون نکالنے سے ضرر لاحق ہو، تو اپنے خون کا عطیہ اس کے لئے جائز نہیں ہوگا، کیونکہ''**الضرر لايزال بالضرر**''۔

ایسی صورت میں جبکہ مریض کی شفا کسی انسان کا خون چڑھانے پر ہی موقوف ہو تو اس کے لئے بطور دوا خون کے استعمال کی اجازت فقہاء اور مفتیان کرام کی تصریحات سے بھی ملتی ہے، فتاوی عالمگیری میں مذکور ہے:

''**يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوى إذا أخبر طبيب مسلم أن شفاءه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه وان قال الطبيب يتعجل شفاؤک فيه وجهان**''، مریض کے لئے بطور علاج پیشاب اور خون کا پینا اور مردار کھانا جائز ہوگا جبکہ کوئی مسلمان طبیب یہ بتلائے کہ اس کی شفا اس میں ہے اور کوئی مباح شئی گو اس کے قائم مقام ہو مہیا نہ ہو سکے، اور اگر طبیب یہ کہے کہ اس میں تمہاری شفا جلد ہوگی تو اس میں (جواز اور عدم جواز

کے)دوقول ہیں (۳۵۵/۵)۔

مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''موت اور ہلاکت سے بچانے کے لئے انسان کا خون بذریعہ انجکشن لے کر انجکشن کے ذریعہ مریض کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے، یہ بوقت اضطرار جائز ہے'' (فتاوی رحیمیہ ۲۶۲/۶)۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں: ''انسان کے خون کو دوا میں بھی استعمال کرنا جائز نہیں، اگر اضطراری کیفیت ہو کہ بغیر انسانی خون کے جان بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے، لیکن خون کی خرید وفروخت کا کاروبار جائز نہیں'' (فتاوی محمودیہ ۳۲۸/۱۸)۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں داخل نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس میں جزء انسانی سے انتفاع لازم آتا ہے، اور جزء انسانی سے انتفاع حرام ہے،'' **(قوله :وإن حرم استعماله):أی استعمال جلده أو استعمال الآدمی بمعنی أجزاء ه، وبه يظهر التفريع بعده''** (شامی ۱۸۸/۱ مکتبہ زکریا، ۳۵۷/۱)، البتہ اگر اس کے بغیر جان بچنا دشوار ہو تو بقدر ضرورت اس کی اجازت ہوگی (ص ۳۲۹)، ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: جب تک اضطرار کا درجہ نہ ہوجائے اس کی ہرگز اجازت نہیں (ص ۳۳۱)۔

خلاصہ کلام یہ کہ: ۱-خون انسان کا ہو یا غیر انسان کا، مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا نجس ہے اور اس کا استعمال کھانے، پینے یا دوا کے طور پر ضرورت شدیدہ یا مجبوری کے بغیر حرام ہے۔

۲-مسلمان کے لئے خون کی خرید وفروخت کرنا اور اس کی قیمت لینا جائز نہیں۔

دلائل:

۱-کتاب اللہ میں مذکور ہے: **''حرمت عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير......الآية''**۔

۲-خون انسان کا جزء ہے، اور انسان کو اللہ تعالی نے معزز ومکرم بنایا ہے، **''ولقد كرمنا بنی آدم''**، اور بوجہ اعزاز انسانی، انسان کے جزء سے انتفاع حرام ہے، **''الانتفاع بأجزاء الآدمی لم يجز قيل للنجاسة وقيل للكرامة، هو الصحيح''** (فتاوی عالمگیری ۳۵۴/۵)۔

۳-مجبوری اور اضطرار کی حالت میں بقدر ضرورت جیسے دیگر محرمات کا استعمال جائز ہے، کسی ماہر طبیب کی تشخیص پر جبکہ خون کا کوئی جائز بدل نہ ہو انسانی جان کو بچانے کے لئے مریض کو کسی آدمی کا خون چڑھانا جائز ہوگا۔

دلائل:

"الضرر يزال"، "الضرورات تبيح المحظورات"۔

"ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها بد ليل قوله تعالى:فمن اضطر غير با غ ولا عاد فلا اثم عليه"۔

کسی انسان کے لئے اپنے جسم کا خون کسی مریض کوعطیہ کرنا اسی صورت میں جائز ہوگا، جبکہ خون نکلوانے سے اس کو ضرر لاحق نہ ہو"الضرر لايزال بالضرر"(الاشباہ والنظائر)۔

۲-بوقت ضرورت خون بینک کوخون دینا:

بسا اوقات ایسی صورت پیش آتی ہے کہ بیک وقت بہت سارے زخمیوں کوخون کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، یا کسی مریض کوخون کی شدید ضرورت ہوتی ہے اورعین وقت پر اتنا زیادہ خون یا مریض کے گروپ کا خون فراہم نہیں ہو پاتا، لیکن کسی بلڈ بینک سے مطلوبہ خون اس طور پر ملتا ہے کہ اس کے بدلہ میں کسی بھی گروپ کا خون اس بینک کوعطیہ کیا جائے، تو ایسی صورت میں ضرورت پوری کرنے کے لئے اس بینک کوخون دے کر اس سے مطلوبہ خون لینا جائز ہوگا۔

۳-ضرورت کے بغیر خون کا عطیہ:

چونکہ انسان اپنے جسم اور روح کا مالک نہیں ہے، اس لئے کسی ضرورت شدیدہ کے پیش آئے بغیر اپنے جسم اور اس کے اعضاء کوضائع کرنے یا اس کا عطیہ کرنے کا اس کو استحقاق نہیں ہے، اس لئے قبل از وقت، اپنا خون بلڈ بینک کوعطیہ کرنا، جائز نہیں ہوگا، فقہاء اور مفتیان کرام نے خون کے عطیہ کی اجازت ضرورت شدیدہ کے پیش آنے پر ہی "اهون البليتين" کو اختیار کرتے ہوئے دیا ہے، کہ خون کا عطیہ فی نفسہ جائز نہیں ہے، مگر ایسی ضرورت کا پیش آجانا کہ اگر کسی مریض کوفوراً خون نہ دیا گیا، تو ایک انسان کی زندگی ضائع ہوجائے گی، یہ اس سے بڑا نقصان ہوگا، اس بڑے نقصان کوزائل کرنے کے لئے اس سے کمتر نقصان کو گوارا کیا جائے گا، لیکن بروقت اگر کوئی ضرر یا مفسدہ درپیش نہیں ہے تو محض اندیشہ اور امکان کے مدنظر کسی ضرر کا تحمل اور ممنوع کا ارتکاب درست نہیں ہوگا۔

"ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها"(الاشباہ والنظائر/۱۱۹)، لہذا ضرورت پیش آئے بغیر محض پیشگی ضرورت کے لئے محفوظ رکھنے کی غرض سے کسی بینک کوخون دینا جائز نہیں، اگرچہ خون انسان کے ان اجزاء میں سے ہے جن کا بدل پھر تیار ہوجاتا ہے، کیونکہ حرمت کا ایک سبب اجزاء انسانی کا اعزاز واحترام بھی ہے۔

۴-بوقت ضرورت صاحب استطاعت کے لئے خون دینے کا حکم:

اور ایسی صورت میں جبکہ کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت اور اضطراری حالت ہو، کہ اگر خون نہ چڑھایا گیا تو ہلاکت کا اندیشہ ہے، اور اس کا خون جس گروپ سے تعلق رکھتا ہے اس گروپ کا خون بمشکل دستیاب ہوتا ہے، اور اس گروپ کے خون کا حامل شخص موجود ہے، جسے بقدر ضرورت اپنا خون دینے میں کسی ضرر کا اندیشہ نہیں ہے تو اس شخص پر اس مریض کو خون دینا واجب ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”**من أجل ذلک کتبنا علی بنی اسرائیل من قتل نفسا بغیر نفس أو فساد فی الأرض فکأنما قتل الناس جمیعا، ومن أحیاها فکأنما أحیا الناس جمیعا**“، اور اسے خون دینے سے ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہو، تو اس پر خون کا عطیہ کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۵-انسانی جگر کا بطور علاج استعمال:

علاج کی ایک قسم اعضاء انسانی کی پیوندکاری ہے، جس کا عام تعارف تو موجودہ طبی ارتقاء کی دین ہے مگر اس پر عمل کی ابتدا اپنے وسائل اور امکانات کے لحاظ سے سولہویں صدی عیسوی سے بلکہ بعض اقوال کے مطابق قبل المیلاد سے بتائی جاتی ہے، اور اس سے مراد علاج کی یہ صورت ہے کہ جسم انسانی کے کسی مفقود یا مخدوش از کار رفتہ عضو کو اسی جیسے صحیح، تندرست عضو سے بدلنا، اس کی متعدد صورتیں ہیں:

۱-کسی انسان کے جسم کے کسی حصہ کو غیر انسان کے عضو سے بدلنا، اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جس جانور کا عضو کسی انسان کے جسم میں لگایا جائے، وہ حلال، مأکول اللحم ہو، اور شرعی طریقہ پر ذبح کیا گیا ہو، کیونکہ شرعی طریقہ پر ذبح ہونے کے بعد، اس جانور کے اجزاء پاک اور طاہر ہوتے ہیں، جانوروں کو اللہ تعالی انسان کے نفع کے لئے ہی پیدا کیا ہے، ارشاد ہے:”**ولهم فیها منافع ومشارب أفلا یشکرون**“(سورۂ یاسین:۷۳)(اور ان کے لئے ان چوپایوں میں منافع اور مشروبات ہیں، تو کیا وہ شکر ادا نہیں کریں گے)۔

اور اگر جانور مأکول اللحم ہو، مگر شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو، یا وہ جانور غیر مأکول اللحم ہو، تو بغیر حالت اضطرار، اسکے اعضاء کا استعمال کسی انسان کے جسم میں جائز نہ ہوگا، کیونکہ وہ جانور میت کے حکم میں ہے، جس کے اعضاء نجس اور غیر طاہر ہیں، اور مردار یا حرام کا استعمال حالت اضطرار میں بقدر ضرورت ہی جائز ہے، ”**حرمت علیکم المیتة......الآیة**“۔

۲-کسی انسان کے جسم کے کسی حصہ کی اسی کے جسم کے کسی حصہ سے اصلاح کرنا، یہ صورت جائز ہے، کیونکہ اس

میں آدمی کا خود اپنے جزو سے ہی انتفاع ہے، اور اسی کی اصلاح کے لئے اس کے ایک حصہ کو فاسد کرنا ہے۔

۳-کسی انسان کے کسی عضو کو دوسرے زندہ انسان کے عضو سے بدلنا۔

۴-کسی انسان کے کسی عضو کو دوسرے مردہ انسان کے عضو سے بدلنا۔

تیسری اور چوتھی صورت جس میں کسی دوسرے انسان کے کسی عضو کو استعمال کیا جاتا ہے، اس کو مفتیان کرام نے غیر درست اور ناجائز لکھا ہے، حضرت مفتی عبدالرحیم صاحبؒ، گردہ سے متعلق ایک استفتاء جس میں والدہ اپنے بیٹے کو گردہ دینے کے لئے تیار ہے، اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ''کسی زندہ یا مردہ انسان کا گردہ آپریشن کر کے نکال کر، دوسرے انسان کے جسم میں لگانا جائز نہیں، ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: ''**الضرر لایزال بالضرر**'' (آگے لکھتے ہیں) آج کل کی تحقیق کے اعتبار سے نفع ہوتا ہو تو اس سے انکار نہیں مگر ''**اثمهما اكبر من نفعهما**'' کے اصول پر ناجائز ہی ہوگا، نیز اس طریقہ میں انسانیت کی توہین بھی ہے، اگر یہ طریقہ چل پڑا تو انسانی اعضاء بکری کا مال بن جائیں گے'' (فتاوی رحیمیہ ۶/۲۸۵)۔

حضرت مفتی محمود صاحبؒ دل سے متعلق ایک استفتاء میں استعمال کو ناجائز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: آج اس کے دل پر زید کی زندگی کو منحصر کر دیا گیا ہے، کل کو کہا جائے گا کہ اس کے گوشت کھانے پر زندگی موقوف ہے، لہذا اس کا گوشت ڈبہ میں بند کر کے ہسپتال میں محفوظ رکھا جائے، انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے، اس کا حال بھی گائے بکری کی طرح ہو ''**ثم رددناه اسفل سافلين**'' کا ایک نمونہ بن جائے گا (فتاوی محمودیہ ۱۸/۳۳۵)۔

ایک دوسرے استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: کسی فوت شدہ انسان کا جگر، آنکھ، دل وغیرہ دوسرے انسان کے جسم میں نہیں لگا سکتے، اگر کوئی آدمی ایسی وصیت کرتا ہے، جیسا کہ سوال میں درج ہے، تو یہ وصیت کرنا جائز نہیں، اور وہ ناقابل نفاذ ہے، ''**أحدهما أن يوصى بما هو معصية عندنا وعندهم(الذميين)، كالوصية للمغنيات والنائحات فهذا لايصح اجماعا**'' (مجمع الانہر ۲/۶۷۱، فتاوی محمودیہ ۱۸/۳۳۶)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ہاں اگر اضطراری صورت ایسی ہو جائے کہ احشاء جسم (اندورن جسم) میں مثلاً گردہ، پھیپھڑا، جگر، دل وغیرہ میں سے کوئی عضو اس درجہ خراب ہو جائے کہ اس کو نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگانا ضروری نہ ہو جائے اور ماہر معالجوں کے نزدیک جانبری کے لئے اور زندگی بچانے کے لئے اس عمل کے بغیر چارہ نہ رہے یا یہ کہ یہی عمل متعین ہو جائے اور صحت و بقاء زندگی کا گمان غالب حاصل رہے تو اضطرار کی حالت میں جان باقی رکھنے کے لئے اس عمل کے بقدر اضطرار کی گنجائش ہو سکے گی، پھر بھی یہ کوشش لازم و ضروری رہے گی کہ بجائے انسانی عضو کے کسی جانور کا عضو اور وہ بھی ماکول اللحم جانور کے عضو سے کام چل سکے تو صرف اسی عضو سے کام لیا جائے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/۳۸۸)۔

٦-آنکھ کا عطیہ:

الف-بینائی بے شک اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، اور اس کے سلب ہونے پر اللہ نے ثواب عظیم کا وعدہ کیا ہے،"**ومن سلبت کریمتیه أثبته علیهما الجنة**"(مشکوۃ ص ۳۶، بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان)،لیکن یہ انسان کے ان اعضاء میں سے نہیں ہے، جن پر انسان کی زندگی کا مدار ہے کہ بغیر اس کے انسان زندہ نہیں رہ پائے گا، اس لئے یہاں تو اضطرار کی حالت بھی نہیں پائی جارہی ہے کہ اس کے لئے کسی حرام کا ارتکاب کیا جائے، اور جبکہ کسی زندہ شخص کی آنکھ نکالنے میں اس کے اندر عیب پیدا ہورہا ہے، اس لئے آنکھ کا عطیہ بھی جائز نہیں،"**الضرر لایزال بالضرر**"۔

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب رفع اللہ درجاتہ، ایک فتوی میں لکھتے ہیں:"موت اور ہلاکت سے بچانے کے لئے انسان کا خون بذریعہ انجکشن لے کر انجکشن کے ذریعہ مریض کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے، یہ بوقت اضطرار جائز ہے، آنکھ کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں...... (آگے لکھتے ہیں) بخلاف آنکھ نکالنے کے، کہ آنکھ نکالنے سے ظاہری عیب بھی پیدا ہوتا ہے، اور آنکھ نکالنا مثلہ بھی ہے، اور مثلہ حرام ہے، لہذا زندگی میں یا موت کے بعد بطور ہبہ یا بیع کسی کو اپنی آنکھ دینا یا وصیت کرنا اور مریض کا اسے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، نفع سے انکار نہیں، لیکن قولہ تعالی"**واثمهما أکبر من نفعهما**"حرام ہی ہوگا کہ نقصان نفع سے زیادہ ہے، اور اس طریقہ میں انسانیت کی توہین بھی ہے(فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۶۲)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے ایک فتوی میں تحریر فرمایا ہے: کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ یہ وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد میرا جسم یا جسم کا فلاں عضو آنکھ، کان وغیرہ کچھ بھی فلاں شخص کو یا کسی اسپتال کو بطور عطیہ یا بعوض دے دیا جائے، اگر وصیت کردے گا تو وصیت منعقد وصحیح بھی نہ ہوگی، اور اس کے مرنے کے بعد اس وصیت پر عمل کرنا بھی جائز نہ ہوگا، جو لوگ عمل کریں گے سخت گنہگار ہوں گے، اور یہ سب حکم ظاہر ہے، اس لئے کہ وصیت مملوک مال میں ہوتی ہے، اور یہ جسم انسان کا مملوک نہیں ہے، بلکہ اللہ کی ملک ہے، اور اس کے پاس محض بطور امانت کے ہے، بغیر حکم شرع وحکم خدا ایک انگلی بھی کاٹ ڈالنا جائز نہیں ہے، بلکہ حرام اور سخت گناہ ہے(منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۳۸۸)، حضرت مفتی محمود صاحب کا فتوی، عدم جواز کا مجمع الانہر کے حوالہ سے اوپر گذر چکا ہے(فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۳۳۶)۔

ب-اور کسی مردہ کی آنکھ نکالنا بھی جائز نہیں ہوگا۔

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحبؒ نے ایک فتوی میں تحریر فرمایا ہے:"آنکھ کی بینائی کے لئے کسی دوسرے زندہ یا مردہ انسان کی آنکھ کا استعمال شرعا درست نہیں کہ اجزاء انسانی کی تکریم وتعظیم کے منافی ہے،"**الانتفاع بأجزاء الآدمی لم یجز ......الخ**"(فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۸۵)۔

ج- آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کے کسی حصہ کا عطیہ یا ہبہ کرے، اس لئے نہ کسی متعین فرد کو اپنی آنکھ دے سکتا ہے اور نہ کسی ادارہ یا بینک کو عطیہ کرسکتا ہے، دلائل اوپر مذکور ہو چکے۔

۷- جسم کے کسی عضو کی وصیت کرنا نہ کسی انسان کے لئے خود جائز ہے اور نہ اس کے ورثہ کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مورث کے جسم کا کوئی عضو دوسرے کو عطیہ کریں، کیونکہ اس میں انسانیت کی توہین ہے اور غیر ملک میں تصرف ہے۔

۸- دودھ بینک کا حکم:

نومولود بچہ کی غذا دودھ ہی ہے جس سے بچہ کی نشو ونما اور پرورش ہوتی ہے، اسی لئے شریعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ ایک مخصوص مدت تک ماں بچہ کو خود اپنا دودھ پلائے، ''والوالدات یرضعن أولادهن حولین کاملین'' (بقرہ: ۲۳۳)، یا پھر باپ اس بچہ کے لئے کسی دودھ پلانے والی عورت کا نظم کرے، جیسا کہ عرب میں اس کا رواج رہا ہے، اور خود رسول اللہ ﷺ کو ان کی ماں کے علاوہ دیگر عورتوں نے اپنا دودھ پلایا ہے، اور شریعت میں اس کی اجازت بھی ہے: ''وإن أردتم أن تسترضعوا أولادكم فلا جناح عليكم إذا سلمتم ما أتيتم بالمعروف''، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دودھ پلانے کے عمل پر اجرت لینا بھی جائز ہے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ بذریعہ ثدی مباشرۃ دودھ پلایا جائے، جیسا کہ حضرت سالم مولی حذیفہؓ کے واقعہ سے ظاہر ہے، اگرچہ مدت رضاعت کے بعد رضاعت کا حکم ان کے لئے خاص ہے، اس لئے یہ جائز ہے کہ کوئی عورت اپنا دودھ کسی دودھ بینک کو عطیہ کردے، اور اس سے ضرورت مند مستحق بچے فائدہ اٹھاسکیں، البتہ اس دودھ کی بیع کرنا، اور قیمت کے عوض میں دینا جائز نہیں ہونا چاہئے، بلا معاملہ بیع کے اگر کچھ ملتا ہے تو اس کے لینے میں حرج بھی نہیں ہوگا۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے ایک استفتاء کے جواب میں لکھا ہے: ڈھائی سال سے کم عمر بچہ کو کسی عورت کا بھی دودھ ہو پلانا جائز ہے، اور یہ الگ بات ہے کہ مسلمان ودیندار عورت کا دودھ پلانا بہتر ہے، باقی جواز میں کوئی کلام نہیں، اس لئے بغیر ضرورت اور بقدر ضرورت اس کا مہیا رکھنے کی گنجائش ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۴۰۳)۔

اور مدت رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پینے سے چونکہ احکام رضاعت عائد ہوتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص دودھ بینک قائم کرتا ہے تو اس کو یہ بھی اہتمام والتزام کرنا ہوگا کہ ہر عورت کے دودھ، اور اس کو پینے والے بچہ کا ریکارڈ بھی رکھے اور اس سے اس بچہ کے اولیاء کو واقف کرائے، اور اگر یہ نظم نہیں کرسکتا تو پھر اس کے لئے دودھ بینک قائم کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۹- مادہ منویہ کے بینک اور اس کی فراہمی کا حکم:

اللہ تعالی نے انسان کو دو صنف، مذکر ومؤنث میں اپنی مصلحت سے پیدا کیا ہے، اور پھر دونوں کے لئے مخصوص وظیفے اور ذمہ داریاں مقرر کی ہیں، مردوں کو عورتوں کی دیکھ بھال کرنے والا اور ان کے نفقات کا ذمہ دار بنایا ہے: "**الرجال قوامون علی النساء**"، اور عورتوں کو مردوں کے لئے تسکین کا سامان بنایا ہے کہ جائز طور پر ایک دوسرے سے سکون حاصل کرسکیں، اس لئے یہ ماحول بنانا کہ عورت بھی مرد کی طرح ملازمت کرے اور اپنے نفقہ کے لئے بھاگ دوڑ کرے فطرت سے بغاوت اور مردوں کا نعرہ مساوات کے پیچھے عورتوں کی ذمہ داریاں اٹھانے سے راہ فرار اختیار کرنا ہے، شادی کے قابل ہوجانے کے بعد نکاح میں تاخیر، اور اس کے نتیجہ میں زنا کی کثرت ورواج، رب العالمین کے غضب کا باعث، اور مصائب و امراض کو دعوت دینا ہے، اس لئے پورے انسانی معاشرہ کو اور خاص طور سے مسلمانوں کو اس سے بچنا اور احتراز کرنا لازم ہے۔

جس طرح سے ہر حیوان کو نر و مادہ اس لئے بنایا ہے تاکہ ان کی نسل باقی رہے ایسے ہی نسل انسانی کی بقا کے لئے انسانوں کو بھی مذکر ومؤنث دو صنف میں پیدا کیا ہے، البتہ انسان کو معزز ومکرم بنایا ہے، اس لئے اسے یہ اجازت نہیں کہ یہ جانوروں کی طرح آزادانہ ہر کس وناکس سے اپنے تعلقات قائم کرے، اور اپنے معزز نطفہ کو کسی بھی عورت کے رحم میں ودیعت رکھے، اور پھر اس سے جو اولاد پیدا ہو، وہ بے حیثیت، اور باعث شرم وعار ہو، اس لئے انسانوں میں نکاح کو مشروع فرمایا، اور جو آدمی اپنے اعزاز کے لباس سے ننگا اور عاری ہوکر جانوروں کی روش اختیار کرے اس کو سخت سزا کا مستحق قرار دیا "**ولاتقربوا الزنا، انه كان فاحشة وساء سبيلا**"۔

نیز اولاد کا ہونا بھی محض اللہ کی مشیت اور تقدیر سے مربوط ہے، اللہ جسے چاہتا ہے اولاد دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے صرف لڑکے دیا ہے اور جسے چاہتا ہے صرف لڑکیاں دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے دونوں سے نوازتا ہے، لہذا غیر شرعی اور غلط طریقہ سے حصول اولاد کی کوشش گناہ ومعصیت اور اللہ تعالی کی ناراضگی کا سبب ہے، اور اس کی وجہ انسانی معاشرہ میں خطرناک قسم کے امراض وجود میں آتے ہیں، حدیث میں وارد ہے:

"**لم تظهر الفاحشة فى قوم قط حتى يعلنوا بها، الافشافيهم الطاعون والأوجاع التى لم تكن مضت فى اسلافهم الذين مضوا**" (سنن ابن ماجہ ۲/۱۳۳۳ کتاب الفتن باب العقوبات) نہیں وجود میں آتا ہے زنا کسی قوم میں یہاں تک کہ لوگ اسے علی الاعلان کرنے لگتے ہیں، مگر پھیلتا ہے ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں جو نہیں گزریں ان کے پہلے کے لوگوں میں جو گزر گئے)۔

لہذا کسی انسان کا اپنے مادہ منویہ کو فروخت کرنا، یا بلاعوض ہی سہی کسی ادارہ کے توسط سے یا براہ راست کسی اجنبی

عورت کے رحم میں پہنچانا، یا کسی عورت کا کسی اجنبی مرد کے مادہ منویہ کو اپنے رحم میں داخل کرنا ویسا ہی حرام ہے جیسا کہ کسی اجنبی سے جنسی تعلق قائم کرنا، انسانوں کے اپنے ہاتھوں، معاشرہ کو خراب کرنے کی وجہ سے اس کے تقاضوں کو مجبوری اور ضرورت نہیں قرار دیا جائے گا، بلکہ ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی، اوران کو شریعت کا تابع بنایا جائے گا۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ اس سوال کے جواب میں کہ شوہر کے مادہ منویہ کو اس کی بیوی کے رحم میں بذریعہ انجکشن پہنچایا جائے، جس سے وہ حاملہ ہو، لکھتے ہیں: "یہ طریقہ طبائع سلیمہ کے خلاف، مزاج شرع وشارع علیہ السلام کے خلاف انتہائی بے شرمی پر مشتمل ہے، اور "**الحیاء شعبة من الایمان**" کے بھی خلاف ہے، اس لئے اس کو اپنانا انتہائی بے حمیتی اور حدود شرع سے تجاوز اور بے شرمی ہوگی، اور شرعا اضطرار ہے نہیں، اس لئے اجازت نہیں ہوگی۔

اور اس سوال کے جواب میں کہ" قائم مقام ماں' جس کی صورت یہ ہے کہ مرد کا مادہ لے کر بجائے بیوی کے کسی اجنبی عورت کو بطور اجیر حاصل کر کے رحم میں انجکشن سے پہنچایا جاتا ہے، وہ عورت حاملہ ہوجاتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے؟ لکھتے ہیں: وہ اجنبیہ عورت جس کے رحم میں انجکشن سے شوہر کے علاوہ کسی مرد کا مادہ منویہ پہنچایا گیا ہو، وہ عورت عقل سلیم کے نزدیک مزنیہ اور طوائف سے بھی زیادہ فاحشہ قرار پائے گی، اور اس کی شناعت عقل سلیم کے نزدیک زنا ولواطت سے بھی زیادہ قبیح ومذموم ہوگی، اور صورت اضطرار کی ہے نہیں اس لئے اس کی بھی اجازت ہرگز نہ ہوگی (منتخبات نظام الفتاوی ۳/۳۰۹)۔

لہذا مادہ منویہ بینک کا قائم کرنا، کسی مرد یا خاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورتمند مرد یا خاتون کو مادہ منویہ کا فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا، جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ جزء انسان کی بیع درست نہیں، اور یہ ضرورت اضطرار کے درجہ کی نہیں ہے، اور نہ اس پر حیات انسانی کا انحصار ہے، کہ اس کو خون پر قیاس کرتے ہوئے جائز کہا جائے، لہذا یہ طریقہ شرعا جائز نہیں۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی☆

تمہید:

اللہ تعالی نے انسان کو مکرم اور معزز بنا کر پیدا کیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:"**ولقد كرمنا بني آدم وحملنهم في البر والبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا**"(سورۂ اسراء:۷۰)(اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی، اوران کو پاکیزہ چیزوں کی روزی دی، اوران کو اپنی بہت سی مخلوقات پر کھلی فضیلت دی)۔

اس لئے اصل یہ ہے کہ انسان متاع خرید وفروخت نہ بنے، رہا کسی زمانہ میں غلام و باندی کی خرید وفروخت کا رواج، تو وہ خلاف اصل تھا، جسے اسلام نے بہ تدریج ختم کرنا چاہا۔

اور حدیث پاک کی رو سے ظاہر ہے کہ انسانی کرامت میں زندہ ومردہ دونوں برابر ہیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:"**كسر عظم الميت ككسره حيا**"(سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۳۲۰۷، صحیح ابن حبان حدیث نمبر ۳۱۶۷، اور اس کی سند صحیح ہے)(مردہ کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندہ ہونے کی حالت میں اس کی ہڈی کو توڑنا)۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالی نے اس دنیا کا نظام امتحان پر رکھا ہے، چنانچہ ایک انسان معاشی مشکلات اور جانی و مالی مصیبتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:"**وبشر الصابرين الذين إذا أصابتهم مصيبة، قالوا إنا لله وإنا إليه راجعون**"(سورۂ بقرہ:۱۵۵-۱۵۶)(اوران ثابت قدموں کو خوش خبری سنادو، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ کہتے ہیں کے بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں، اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔

☆ عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، مالاپورم، کیرالا۔

اور یہ بھی مسلم حقیقت ہے کہ ہر ایک آدمی کی موت کا وقت مقرر ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "**لکل أمة أجل إذا جاء أجلهم فلا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون**" (یونس:۴۹) (ہر امت کے لئے ایک وقت مقرر ہے، جب ان کا وقت آ جاتا ہے، تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے نہ آگے)۔

ان تمام حقائق کے باوجود اللہ تعالی نے اس مادی دنیا میں مادی اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اور ان ہی مادی اسباب میں علاج ومعالجہ بھی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو ضرورت شدیدہ کی بناء پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے، بہتا ہوا خون اگر چہ نجس وناپاک ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "**إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير ومآ أهل به لغير الله......**" (سورۂ بقرہ: ۱۷۳) (اس نے تو بس تمہارے لئے مردار، خون، سور کا گوشت، اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کو حرام ٹھہرایا ہے)، نیز فرمان الہی ہے: "**قل لآ أجد في ما أوحي إلى محرما على طاعم يطعمه إلا أن يكون ميتة أو دما مسفوحا أو لحم خنزير، فإنه رجس أو فسقا أهل لغير الله به......**" (الأنعام:۱۴۵) (کہہ دو، میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا، بجز اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں، یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا ہو)۔

لیکن حلال متبادل نہ ہونے اور قابل اعتماد ماہر طبیب کی یقین دہانی کی صورت میں ناپاک وحرام اشیاء سے علاج کی اباحت ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ رقم طراز ہیں: "**والاستشفاء بالحرام جائز عند التيقن، بحصول الشفاء فيه، كتناول الميتة عند المخمصة والخمر، عند العطش، وإساغة اللقمة، وإنما لايباح بمالا يستيقن حصول الشفاء به**" (بدائع الصنائع ۱/۶۱)۔

(حرام شے کو دوا کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے، جبکہ اس سے شفایابی کا یقین ہو، جیسے بھوک کی شدت کے وقت مردار کھانا، اور پیاس کی شدت اور لقمہ کو حلق سے اتارنے کے وقت شراب پینا مباح ہے، صرف ان حرام اشیاء کا بہ طور علاج استعمال کرنا مباح نہیں جن سے شفایابی کا یقین نہ ہو)۔

اور ہندیہ میں ہے: "**يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوي، إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه، ولم يجد في المباح ما يقوم مقامه وإن قال الطبيب: يتعجل شفائک، ففيه وجهان**" (عالمگیری ۵/۳۵۵) (علاج کے طور پر ایک بیمار کے لئے خون اور پیشاب پینا، اور مردار کھانا جائز ہے، بشرطیکہ کوئی

مسلمان طبیب بتائے کہ اس کی شفا اس میں ہے، اور مباح اشیاء میں کوئی ایسی شے نہ ملے جو اس کی جگہ لے سکے، اور اگر طبیب کہے کہ اس کے ذریعہ جلد شفا حاصل ہوگی، تو اس سلسلہ میں دو قول ہیں)۔

اور ''الخلاصۃ'' کے حوالہ سے ''ہندیہ'' میں ہے:''**أدخل المرارة في أصبعه للتداوي، قال أبو حنيفة: لايجوز، وعند أبي يوسف يجوز، وعليه الفتوى**''(عالمگیری ۳۶۵/۵)(بطور علاج اپنی انگلی میں پت داخل کرے، تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: یہ جائز نہیں، اور امام ابو یوسف کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے، اسی پر فتوی ہے)۔

اور ہندیہ میں فتاوی بزازیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:''**أكل خرء الحمام في الدواء لا بأس به**''(عالمگیری ۳۵۵/۵)(دوا میں کبوتر کی بیٹ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اور ظاہریہ کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ ابن حزم ظاہریؒ تحریر فرماتے ہیں:''**من أكره على شرب الخمر، أو اضطر إليها لعطش أو علاج، أو لدفع خنق، فشربها، أو جهلها، فلم يدر أنها خمر، فلاحد على أحد من هؤلاء**''(ابن حزم، المحلی ۳۷۶/۱۲، بیروت، دارالفکر)(جو شراب کے پینے پر مجبور کردیا جائے، یا سخت پیاس یا علاج یا گلے کی پھانس دور کرنے کے لئے مجبور ہوجائے اور شراب پی لے یا ناواقفیت میں پی لے تو ان میں سے کسی پر حد جاری نہیں ہوگی)۔

اور عطاء بن ابی رباح کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ حضرت ابن جریجؒ کہتے ہیں:''**سمعت عطاء يسأله إنسان نعت له أن يشترط على كبده، فيشرب ذلك الدم، من وجع كان به ''فرخص له فيه'' قلت له: حرمه الله تعالى؟ قال: ''ضرورة''، قلت له: إنه لو يعلم أن في ذلك شفاء ولكن لا يعلم، وذكرت له ألبان الأتن عند ذلك، فرخص فيه أن يشرب دواء**''(مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر: ۱۷۱۲۴)(میں نے حضرت عطاء کو فرماتے ہوئے سنا، اس حال میں کہ ان سے ایک ایسا شخص پوچھ رہا تھا جس کے حق میں یہ تجویز کی گئی ہے کہ وہ اپنے جگر کا خون نکالے اور اسے پیئے، اس درد کی وجہ سے جس میں وہ مبتلا تھا، تو انہوں نے اسے اس کی اجازت دی، (اس پر میں نے بہ طور حیرت کہا کہ اللہ تعالی نے تو اسے حرام ٹھہرایا ہے؟) تو ان کا جواب تھا کہ رخصت مجبوری کی بنا پر ہے (اس جواب کو سن کر میں نے ان سے کہا کہ یہ گنجائش اس کے لئے اس وقت ہوتی جبکہ اسے اس میں شفایابی کا یقین ہوتا، لیکن اسے اس کا یقین نہیں) اور اس موقع سے میں نے ان سے گدھی کے دودھ کا حکم پوچھا، تو انہوں نے دوا کے طور پر پینے کی اجازت دی)۔

لیکن ابن جریجؒ کا اعتراض قوی نہیں ہے، اس لئے کہ دنیوی معاملات میں غلبہ ظن کو یقین کا درجہ حاصل ہے، لہذا اگر ماہر طبیب کو گمان غالب ہے کہ نجس شے کے علاوہ اس مرض کی کوئی دوا نہیں تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

دیگر دبستان فقہ:

شافعیہ کے نزدیک شراب کے علاوہ تمام ناپاک اور حرام اشیاء سے علاج کرنا درست ہے، چنانچہ امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں: "**وأما التداوي بالنجاسات غير الخمر فهو جائز، سواء فيه جميع النجاسات غير المسكر، هذا هو المذهب، والمنصوص، وبه قطع الجمهور**" (المجموع ۹/۵۰) (بہر حال شراب کے علاوہ دیگر نجاسات سے علاج کرنا، تو یہ جائز ہے، اس سلسلہ میں غیر نشہ آور تمام نجاستیں برابر ہیں، یہی مذہب ہے، اور یہی امام کی صراحت ہے، اور جمہور شافعیہ نے اسے ہی قطعی طور پر بیان کیا ہے)۔

خیال رہے کہ شافعیہ شراب سے علاج طارق بن سوید جعفیؓ کی حدیث کی وجہ سے منع کرتے ہیں، جس کے الفاظ ہیں: "**سأل النبي ﷺ عن الخمر، فنهاه أو كره –أن يصنعها، فقال: إنما أصنعها للدواء، فقال: إنه ليس بدواء، ولكنه داء**" (مسلم حدیث نمبر ۱۹۸۴، مسند احمد حدیث نمبر ۱۸۷۸۷) (انہوں نے نبی کریم ﷺ سے شراب کے بارے میں دریافت کیا، سو آپ ﷺ نے اسے بنانے سے منع فرمایا، یا ناپسند کیا، تب انہوں نے یہ وجہ بیان کی کہ میں تو اسے دوا کے لئے بناتا ہوں، اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ دوا نہیں ہے، بلکہ بیماری ہے)۔

البتہ جمہور اس حدیث کو حالت اختیار اور حلال متبادل کے فراہم ہونے پر محمول کرتے ہیں۔

جبکہ مالکیہ کے نزدیک حرام اشیاء کا بہ طور علاج استعمال کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ ابن العربی مالکی رقم طراز ہیں: "**لا يتداوى بها بحال ولا بالخنزير**" (الجامع لأحکام القرآن ۲/۲۳۱ طبع قاہرہ، دار الکتب المصریہ ۱۹۶۴ء) (ان حرام اشیاء کا کسی حال میں بہ طور علاج استعمال درست نہیں ہے، اور نہ ہی خنزیر سے علاج درست ہے)، ان کی دلیل حضرت ابودرداءؓ کی حدیث ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "**إن الله أنزل الداء والدواء وجعل لكل داء دواء، فتداووا، ولا تداووا بحرام**" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۳۸۷۴، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (اللہ تعالی نے بیماری اور دوا دونوں نازل فرمائی، اور ہر بیماری کی دوا رکھی ہے، لہذا علاج کرو، اور حرام شی سے علاج نہ کرو)۔

اور دوسری دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے: "**نهى رسول الله ﷺ عن الدواء الخبيث**" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۳۸۷۰، اور اس کی سند صحیح ہے) (نبی کریم ﷺ نے ناپاک ونجس دوا سے منع فرمایا)۔

قول راجح: جمہور کا مسلک راجح ہے، اور یہ ساری احادیث حالت اختیار اور حلال متبادل کے فراہم ہونے پر محمول ہیں، کیونکہ مجبوری کی حالت میں یہ چیزیں حرام نہیں رہتی ہیں، جس طرح مردار مجبور شخص کے لئے حلال ہوجاتا ہے، اسی طرح حلال دوا نہ ہونے کی صورت میں ناپاک اور حرام شے سے علاج درست ہے۔

۲- بلڈ بینک کا قیام ایک انسانی فلاحی عمدہ اقدام، انتہائی کار خیر اور عظیم الشان ثواب کا باعث ہے، اس لئے کہ وہ اس مریض کی جان بچانے کا ذریعہ ہے جس کے بارے میں ماہرین طب کا گمان غالب ہے کہ اگر اسے خون نہ چڑھایا جائے، تو اس کی جان بچنی ناممکن ہے، اور چونکہ خون کے بھی گروپ ہیں، اور کسی مریض کو اس سے ہم آہنگ خون ہی چڑھایا جاسکتا ہے، لہذا اس مقصد سے بلڈ بینک قائم کرنا درست ہے تاکہ مریض کے لئے فوری طور پر اس کے گروپ کا خون مہیا ہو۔

اور یہ بات پہلے گزری ہے کہ بہتے ہوئے خون کا استعمال ایک مسلمان پر حرام ہے، لیکن حلال متبادل نہ ہونے کی صورت میں علاج کی مجبوری کے پیش نظر دوسرے کے خون کا استعمال درست ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: ''**وقد فصل لکم ما حرم علیکم إلا ما اضطررتم إلیه**'' (سورۂ انعام:۱۱۹) (جبکہ اس نے تفصیل سے بیان کردی ہیں، وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں، اس استثناء کے ساتھ جس کے لئے تم مجبور ہو جاؤ)۔

اس لئے ایسے بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ دے سکتے ہیں کیونکہ یہ انسانی جان بچانے کا ذریعہ ہے، اور ایک انسانی جان بچانا ساری انسانیت کی جان بچانے کے درجہ میں ہے، البتہ یہ شرط ہے کہ خون کا عطیہ دینے والے کو عطیہ دینے کی صورت میں کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو۔

۳- یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ بہتا ہوا خون نجس اور حرام ہے، چنانچہ امام قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد (م:۶۷۱ھ) رقم طراز ہیں: ''**اتفق العلماء علی أن الدم حرام نجس لا یؤکل ، ولا ینتفع به**'' (الجامع لأحکام القرآن ۲۲۱/۲، طبع قاہرہ دارالکتب المصریہ ۱۹۶۴ء) (اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خون حرام اور ناپاک ہے، اسے کھایا نہیں جائے گا، اور نہ ہی اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا)۔

البتہ اضطرار اور مجبوری کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے، لہذا اگر کسی مریض کی جان یا مرض سے شفایابی خون کے بغیر ممکن ہی نہ ہو، تو اس کے لئے خون سے فائدہ اٹھانا درست اور جائز ہے۔

اور جیسا کہ گزرا ہے کہ خون کے مختلف گروپ ہوتے ہیں، اور غیر معمولی حادثات میں خون کی بڑی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے، لہذا مجبور مریض کی مدد کی نیت سے رضا کارانہ بلڈ کیمپ قائم کر کے خون کا عطیہ حاصل کرنا، اور اسے بلڈ بینک میں محفوظ کرا دینا، یا خود ہی رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا سب جائز ہے، کیونکہ مجبوری کی حالت میں حرام کی حرمت زائل ہو جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**وقد فصل لکم ما حرم علیکم إلا ما اضطررتم إلیه**'' (سورۂ أنعام:۱۱۹) (جبکہ اس نے تفصیل سے بیان کردی ہیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں، اس استثناء کے ساتھ جس کے لئے تم مجبور ہو جاؤ)۔

اور'' درمختار'' میں ہے:''**وإن أكره بملجئي(بقتل أو قطع) عضو، أو ضرب مبرح، حل الفعل، بل فرض، فإن صبر فقتل أثم**''(الدرالمختار مع ردالمختار، کتاب الإکراہ۶/۱۳۵،طبع دوم، بیروت دارالفکر)(اور اگر مردار یا خون یا خنزیر کھانے، یا شراب پینے پر قتل یا عضو کے کاٹنے یا دردناک مار کے ذریعہ مجبور کردیا جائے،تو ذکر کردہ چیزوں کا کھانا یا پینا حلال بلکہ فرض ہوجاتا ہے،سو اگر صبر کرے اور نہ کھائے نہ پئے،اور قتل کردیا جائے تو گنہگار ہوگا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اضطرار کی حالت میں حرمت زائل ہوجاتی ہے، اور ردالمختار میں ہے:''**يجوز للعليل شرب البول والدم والميتة للتداوي، إذا أخبره طبيب مسلم أن فيه شفاءه، ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه، وإن قال الطبيب:يتعجل شفاؤک به، فيه وجهان**''(ردالمختار، کتاب البیع، مطلب في التداوي بالمحرم۵/۲۲۸)(علاج کے طور پر ایک بیمار کے لئے خون اور پیشاب پینا،اور مردار کھانا جائز ہے، بشرطیکہ کوئی مسلمان طبیب بتائے کہ اس کی شفا اس میں ہے، اور مباح اشیاء میں کوئی ایسی شے نہ ملے جو اس کی جگہ لے سکے،اور اگر طبیب کہے کہ اس کے ذریعہ جلد شفا حاصل ہوگی،تو اس سلسلہ میں دو قول ہیں)۔

اس سے پتہ چلا کہ مجبور مریض کی مدد کے لئے رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا مباح ہے،اس لئے کہ یہ انسانی جان کو بچانے کی تدبیر ہے اور ایک انسانی جان کو بچانا سارے انسان کو بچانا ہے، نیز اس میں اچھے عمل میں تعاون ہے کیونکہ مجبوری کی حالت میں علاج کے طور پر خون پینا مباح ہے،لہذا اس عمل میں مدد کرنا بھی مباح ہوگا۔

۴- علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں: ''**بخلاف التداوي ولو بغير محرم، فإنه لو تركه حتى مات، لا يأثم، كما نصوا عليه؟لأنه مظنون**''(ردالمختار، کتاب الحظر،فصل في البیع ۶/۳۸۹)(برخلاف علاج ومعالجہ کے،خواہ حرام چیز سے نہ ہو، کہ اگر اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ مرجائے تو گنہگار نہ ہوگا،جیسا کہ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے،اس لئے کہ علاج ظنی چیز ہے)۔

جمہو اہل علم اسی بات کے قائل ہیں کہ علاج مباح ہے کیونکہ شفایابی یقینی نہیں ہے، چنانچہ ابن تیمیہؒ رقم طراز ہیں:''**وأما التداوي فليس بواجب عندجماهير الأئمة، وإنما أوجبه طائفة قليلة، كما قاله بعض أصحاب الشافعي وأحمد**''(الفتاوی الکبری ۳/۷)۔

(رہا علاج تو وہ جمہور ائمہ کے نزدیک واجب نہیں ہے،محض ایک قلیل جماعت نے اسے واجب قرار دیا ہے،جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد کے بعض متبعین بھی اسی کے قائل ہیں)۔

جبکہ امام نوویؒ علاج کے مستحب ہونے کے قائل ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:''**وفي هذا الحديث إشارة إلى**

استحباب الدواء، وهو مذهب أصحابنا وجمهور السلف وعامة الخلف"(شرح النووی علی صحیح مسلم ۱۴/۱۹۱،طبع دوم دارالإحیاء، ۱۳۹۲ھ)(اوراس حدیث میں علاج کے مستحب ہونے کی طرف اشارہ ہے،اوریہی ہمارے علماء شوافع ، جمہور سلف اوراکثر علماء متاخرین کا مذہب ہے)۔

اورامام قرطبیؒ اللہ تعالی کے ارشاد "**فيه شفاء للناس**"(سورۂ نحل:۶۹)(اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے) کے تحت فرماتے ہیں:"**في قوله تعالى: فيه شفاء للناس، دليل على جواز التعالج بشرب الدواء وغير ذلك، خلافا لمن كره ذلك من جلة العلماء، وهو يرد على الصوفية الذين يزعمون أن الولاية لا تتم إلا إذا رضي بجميع ما نزل به من البلاء، ولا يجوز له مداواة، ولا معنى لمن أنكر ذلك**"(تفسیر القرطبی ۱۰/۱۳۸)(اللہ تعالی کے فرمان: اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے،دواوغیرہ پینے کے ذریعہ علاج کے جائز ہونے کی دلیل ہے،جلیل القدر علماء میں سے ان لوگوں کے برخلاف جنہوں نے اسے مکروہ قراردیا ہے،اوراس میں ان صوفیہ کی تردید ہے، جن کا خیال ہے کہ کامل درجہ میں ولایت اس وقت حاصل ہوگی جبکہ تمام نازل ہونے والی مصیبت پر بندہ راضی رہے،اوراس کے لئے علاج جائز نہیں،اورجنہوں نے علاج کا انکارکیا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں)۔

خودامام غزالیؒ نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو کہتے ہیں کہ "**ترک التداوي أفضل بكل حال**"(غزالی،إحیاء علوم الدین،کتاب التوحید والتوکل ۴/۲۹۰بیروت دارالمعرفۃ)(ہرحالت میں علاج کا ترک کرنا افضل ہے)۔

بلاشبہ آپ ﷺ نے بدوؤں کے جواب میں فرمایا:"**تداؤوا؛فإن الله عز و جل لم يضع داء إلا وضع له دواء، غير داء واحد: الهرم**"(سنن ابی داؤد،حدیث نمبر۳۸۵۵،سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۰۳۸،اوراس کی سند صحیح ہے)(علاج کرو، کیونکہ اللہ تعالی نے ہر بیماری کی دوا رکھی ہے سوائے ایک بیماری یعنی بڑھاپے کے)۔

لیکن علماء نے اس امرکوبھی اباحت پرمحمول کیا ہے، چنانچہ ''فتح الودود'' کے حوالہ سے ''عون المعبود'' کے مؤلف رقم طراز ہیں:

"**الظاهر أن الأمر للإباحة والرخصة، وهوالذي يقتضيه المقام، فإن السؤال كان عن الإباحة قطعا، فالمتبادر في جوابه أنه بيان للإباحة**"(عظیم آبادی،عون المعبود ۱۰/۲۵۲،طبع دوم بیروت،العلمیہ ۱۴۱۵ھ)(بہ ظاہرامر اباحت اوررخصت کے لئے ہے،اورمحل کا بھی یہی تقاضا ہے، کیونکہ قطعی طور سے سوال اباحت کے سلسلہ میں تھا،تواس کے جواب میں متبادر یہی ہے کہ وہ اباحت کا بیان ہے)۔

قول راجح:

دنیاوی معاملات کا دارو مدار گمان غالب پر ہے، اور بہت سی دواؤں کا مفید ہونا بار بار کے تجربہ سے ثابت ہے، لہذا اللہ تعالی کی تکوینی سنت کے مطابق متعین بیماری میں متعین دوا کے شفا کا سبب بننے کا گمان غالب ہے، اس لئے اس طرح کی مفید دوا کے ذریعہ علاج واجب ہے، چنانچہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں: "**وأمره عليه السلام بالتداوي نهي عن تركه**" (ابن حزم المحلی ۶/۹۶) (نبی کریم ﷺ کا علاج کا حکم دینا، علاج ترک کرنے سے منع فرمانا ہے)۔

اس تفصیل کے بعد سوال کا جواب درج ذیل ہے:

جب کسی قابل اعتماد ماہر ڈاکٹر کو گمان غالب ہو کہ مریض کی جان بچنے کی صورت اسے خون چڑھانا ہے، لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ملتا ہو، اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو، تو اس کا خون دینا واجب ہے بشرطیکہ اسے خون دینے کی صورت میں کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱-"**ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (مائدہ: ۳۲) (اور جس نے انسانی جان کو بچایا، تو گویا اس نے سارے انسانوں کو بچایا)، اس آیت سے واضح ہے کہ انسانی جان کو حتی الوسع بچانا واجب ہے)۔

۲-حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "**ومن سقى شربة من الماء حيث لا يوجد، فكأنما أحيا نفسا، ومن أحياها، فكأنما أحيا الناس جميعا**" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۴۷۴، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے، اور دیکھئے: تفسیر قرطبی ۲۰/۲۱۵) (اور جس جگہ پانی موجود نہ ہو، وہاں جو ایک گھونٹ پانی پلائے، تو گویا اس نے انسانی جان کو بچایا اور جو انسانی جان کو بچائے تو گویا اس نے سارے انسان کو بچایا)۔

اس حدیث سے بھی پتہ چلا کہ انسانی جان کو بچانا واجب ہے۔

۳-اور فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ حتی الوسع انسانی جان کو بچانا فرض ہے، چنانچہ امام بدر الدین عینیؒ (م: ۸۵۵ھ) تحریر فرماتے ہیں: "**صيانة النفس عن الهلاک فرض بقدر الإمكان**" (عینی، البنایۃ شرح الہدایۃ ۱۳/۶۶ طبع اول بیروت، العلمیہ ۲۰۰۰ء) (انسانی نفس کو بقدر امکان ہلاکت سے بچانا فرض ہے)۔

مزید لکھتے ہیں: "**وهذا؛ لأن إحياء النفس فرض على الإنسان ما أمكن**" (مرجع سابق ۱۳/۶۶) (اور یہ حکم اس لئے ہے کہ حتی الوسع انسان پر نفس کو بچانا فرض ہے)۔

۴-جس طرح عہدہ قضا قبول کرنا متعین ہونے کی صورت میں فرض ہو جاتا ہے، اسی طرح متعین ہونے کی صورت میں خون دینا فرض ہوگا، جیسا کہ عام طور سے فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ متعین ہونے کی صورت میں عہدہ قضا

قبول کرنا فرض ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ ''الاختیار'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''**من تعین له یفترض علیه**'' (ردالمحتار ۵/۳۶۸) (عہدہ قضا کے لئے جو متعین ہوجائے، تو اس پر اس کا قبول کرنا فرض ہوجاتا ہے)، اور عالمگیری میں ہے: ''**إلا إذا لم یکن غیره یصلح للقضاء فإنه یفترض علیه**'' (ہندیہ ۳/۳۱۱) (مگر جبکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا عہدہ قضا کے لائق نہ ہو، تو عہدہ قضا کو قبول کرنا اس پر فرض ہوجاتا ہے)۔

۵-فرض کفایہ کا مطلب ہی یہی ہے کہ اسے کفایت کرنے والے طریقہ پر جو انجام دے دے، تو وہ ساقط ہوجائے، اور اگر اس کو انجام دینے والا ایک ہی شخص ہو تو وہ اس پر فرض عین کے درجہ میں ہوجاتا ہے، جیسا کہ علامہ شامی رقم طراز ہیں: ''**فرض الکفایة ما یکفي فیه إقامة البعض عن الکل؛لأن المقصود حصوله في نفسه من مجموع المکلفین**'' (ردالمحتار ۴/۱۲۳) (فرض کفایہ وہ ہے جس میں کل کی طرف سے بعض کو قائم کرنا صحیح ہو، اس لئے کہ مقصود تمام مکلفین کی جانب سے بعینہ اس شي کا وجود میں آنا ہے)۔

۵- عام طور سے قدیم فقہاء نے انسانی اجزاء سے فائدہ اٹھانے کو ممنوع قرار دیا ہے، کیونکہ یہ اس کے مکرم و محترم ہونے کی شان کے خلاف ہے، جبکہ اللہ تعالی نے انسان کو مکرم بنا کر پیدا کیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''**ولقد کرمنا بني آدم**'' (اسراء:۷۰) (اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی)، چنانچہ علامہ مرغینانیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''**ولا یجوز بیع شعور الإنسان ولا الانتفاع بها؛ لأن الآدمي مکرم لا مبتذل، فلا یجوز أن یکون شيء من أجزائه مهانا و مبتذلا**'' (الہدایہ مع العنایہ کتاب البیوع ۶/۴۲۵، ۴۲۶، بیروت، دارالفکر) (انسان کے بال کی خرید وفروخت اور ان سے انتفاع جائز نہیں، اس لئے کہ آدمی قابل اعزاز ہے، نہ کہ قابل صرف شئ، لہذا جائز نہیں ہے کہ اس کے اجزاء میں سے کسی بھی جزء کو ذلیل وخوار کیا جائے اور اسے استعمال میں لایا جائے)۔

اور علامہ شیخی زادہ (م:۱۰۷۸ھ) تحریر فرماتے ہیں: ''**ولا یجوز بیع شعر الآدمي ولا الانتفاع به، ولا بشيء من أجزائه؛لأن الآدمی مکرم غیر مبتذل، فلا یجوز أن یکون شي من أجزائه مهانا مبتذلا**'' (مجمع الأنهر في شرح ملتقی الأبحر، کتاب البیوع ۲/۵۹، بیروت، دارالاحیاء) (آدمی کے بال کی خرید وفروخت اور اس بال سے اور اس کیا جزاء میں سے کسی بھی جزء سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ آدمی قابل تکریم واعزاز ہے، نہ کہ قابل استعمال شے، لہذا جائز نہیں ہے کہ اس کے اجزاء میں سے کسی بھی جزء کو ذلیل وخوار کیا جائے، اور صرف واستعمال میں لایا جائے)۔

اور علامہ بابرتی (م:۷۸۶ھ) لکھتے ہیں: ''**ثم إن عدم جوازهما لیس للنجاسة علی الصحیح**'' (العنایۃ ۶/۴۲۶) (پھر خرید وفروخت اور انتفاع کا عدم جواز صحیح قول کے مطابق نجاست کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ

کرامت انسانی کی وجہ سے ہے)،اور علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں:"**والأدمي مکرم شرعا، وإن کان کافرا، فإیراد العقد علیه وابتذاله به وإلحاقه بالجمادات إذلال له، أي: وهو غیر جائز، وبعضه في حکمه، وصرح في "فتح القدیر" ببطلانه**"(ردالمحتار، کتاب البیوع ۵/۵۸)(اور آدمی شرعی اعتبار سے قابل اعزاز ہے،خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو،لہذا اسے محل بیع بنانے،اور اس کے ذریعہ اسے قابل استعمال بنانے اور اسے جمادات کے ساتھ ملانے میں اس کی تذلیل ہے،اور ذلیل کرنا جائز نہیں ہے،اور اس کے اجزاء اس کی ذات کے حکم میں ہیں،اور فتح القدیر میں آدمی کی بیع کے باطل ہونے کی صراحت ہے)۔

البتہ ان فقہی نظائر کے ساتھ ایسی نظیریں بھی ہیں جن میں آدمی کی تکریم اور اعزاز کے تقاضوں کو دوسرے آدمی کی زندگی بچانے کی خاطر ترک کردیا گیا ہے، چنانچہ یہ فقہی جزئیہ بہت مشہور ہے کہ حاملہ خاتون کا انتقال ہوجائے،اور اس کے پیٹ میں بچہ کے زندہ ہونے کا گمان غالب ہو،تو اس حاملہ خاتون کے پیٹ کو چاک کر کے اس بچہ کو نکال لیا جائے گا، چنانچہ علامہ زین الدین حنفی رازی (م:۶۶۶ھ) رقم طراز ہیں:

"**حامل ماتت، فتحرک في بطنها الولد، فإن غلب علی الظن حیاته وبقاؤه، یشق بطنها من الجانب الأیسر ویخرج**"(تحفۃ الملوک ص۲۳۹،بیروت،دارالبشائر طبع اول،۱۴۱۷ھ)(اگر کوئی حاملہ خاتون انتقال کرجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کرتا ہو،تو اگر گمان غالب یہ ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے اور آئندہ زندہ رہ سکتا ہے(یعنی اتنی مدت کا ہو جس میں عام طور پر بچہ زندہ رہ جاتا ہے) تو بائیں جانب سے اس خاتون کے پیٹ کو چاک کر کے بچہ کو نکال لیا جائے)،اور علامہ ابن نجیم مصری (م:۹۷۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:"**أمرأة حامل ماتت، فاضطرب الولد في بطنها، فإن کان أکبر رأیه أنه حي، یشق بطنها لأن ذلک تسبب في إحیاء نفس محترمة بترک تعظیم المیت، فالإحیاء أولی**"(البحرالرائق ۸/۲۳۳)(اگر کوئی حاملہ خاتون مرجائے،اور اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کرتا ہو،تو اگر گمان غالب ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے،تو اس کا پیٹ چاک کر کے اسے نکال لیا جائے،اس لئے کہ اسمیں میت کی تعظیم کو قابل حرمت زندہ نفس کو بچانے کا سبب بننے کی خاطر ترک کرنا ہے،لہذا زندہ کو بچانا راجح ہے)۔

اور علامہ سمرقندی (م:۵۴۰ھ) نے حاملہ خاتون کے پیٹ کو چاک کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے:"**لأن فیه إحیاء الآدمي بترک تعظیم الآدمي، وترک التعظیم أهون من مباشرة سبب الموت**"(تحفۃ الفقہاء ۳/۳۴۵، طبع دوم بیروت العلمیہ ۱۴۱۴ھ)(چاک کرنے کا جواز اس لئے ہے کہ اس کے اندر ایک آدمی کی تعظیم کو ترک کر کے ایک دوسرے آدمی کی جان بچانا ہے،اور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کی بہ نسبت آدمی کی تعظیم کو چھوڑ دینا زیادہ آسان ہے)۔

اسی طرح بعض فقہاء نے ایک شخص کے مالی حق کے تحفظ کی خاطر مردہ کے پیٹ کو چاک کرنے کی اجازت دی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ رقم طراز ہیں:

”وعن محمد: رجل ابتلع درة أو دنانير لآخر، فمات المبتلع، ولم يترک مالا، فعليه القيمة، ولا يشق بطنه؛لأنه لا يجوز إبطال حرمة الميت لأجل الأموال، ولا كذلک المسألة المتقدمة، ونقل الجرجانی شق بطنه للحال؛لأن حق الآدمي مقدم على حق الله تعالى، إن كان حرمة الميت حقا لله تعالى، وإن كان حق الميت، فحق الآدمي الحي مقدم على حق الميت، لاحتياج الحي إلى حقه“(البحر الرائق ۸ / ۲۳۳) (اور امام محمد سے منقول ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے موتی یا اشرفی کو نگل لیا اور نگلنے والے کی موت ہوگئی، اور اس نے مال نہیں چھوڑا ہے، تو اس کے ذمہ قیمت لازم ہوگی، اور اس کے پیٹ کو چاک نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ میت کی حرمت مال کی خاطر باطل کرنا جائز نہیں، اور پیچھے گزرا ہوا جنین کی حفاظت کا مسئلہ اس سے مختلف ہے، اور جرجانی نے نقل کیا ہے کہ فوراً اس کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا، اس لئے کہ یہ آدمی کا حق اللہ تعالی کے حق پر مقدم ہے، اگر میت کی حرمت اللہ تعالی کا حق ہو، اور اگر میت کا حق ہو، تو زندہ آدمی کا حق مردہ کے حق پر مقدم ہے، کیونکہ زندہ کو اپنے حق کی ضرورت ہے)۔

دیگر دبستان فقہ:

یہی حکم شافعیہ کے نزدیک ہے، چنانچہ امام غزالی (م: ۵۰۵ھ) تحریر فرماتے ہیں: ”كما لو ابتلع لؤلؤة، فإنه يشق بطنه لأجل ملک الغير“ (الوسيط في المذهب ۲ / ۳۹۱، طبع اول قاہرہ، دار الاسلام ۱۴۱۷ھ، نیز دیکھئے: امام الحرمین، نہایۃ المطلب ۳ / ۳۱، طبع اول دار المنہاج ۱۴۲۸ھ) (جیسے کوئی موتی نگل لے، تو اس کے پیٹ کو دوسرے کی ملکیت کی وجہ سے چاک کیا جائے گا)۔

اور یہی حنابلہ کا مسلک ہے، چنانچہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں: ”ولأن الميت لو بلع مال غيره، شق بطنه“ (المغنی ۲ / ۴۰۳) (اور اس لئے کہ مردہ نے اگر دوسرے کا مال (زندگی میں) نگل لیا ہو، تو اس کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا)۔

اور ایسے ہی شافعیہ اور بعض حنفیہ کے یہاں مضطر و مجبور شخص اپنی جان بچانے کی خاطر مردہ انسان کو کھا سکتا ہے۔ چنانچہ امام نووی شافعی (م: ۶۷۶ھ) رقم طراز ہیں: ”ولو لم يجد إلا آدميا معصوما ميتا، فالصحيح حل أكله، قال الشيخ إبراهيم المروزي: إلا إذا كان الميت نبيا، فلا يجوز قطعا“ (روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین

۲۸۴/۳ طبع سوم بیروت، المکتب الاسلامی ۱۴۱۲ھ) (اور اگر مضطر و مجبور غیر مباح الدم مردہ آدمی کو ہی پائے، تو صحیح قول یہ ہے کہ اس کا کھانا اس کے لئے حلال ہے، شیخ ابراہیم مروزی نے کہا کہ مگر جبکہ مردہ نبی ہو تو قطعی طور سے اس کا کھانا جائز نہیں)۔

اور علامہ ابن قدامہ مقدسی حنبلی (م: ۶۲۰ھ) تحریر فرماتے ہیں: "**وإن وجد معصوما ميتا لم يبح أكله في قول أصحابنا، وقال الشافعي، وبعض الحنفية: يباح، وهو أولى؛ لأن حرمة الحي أعظم......واختار أبو الحطاب أن له أكله**" (المغنی ۴۲۱/۹، مکتبۃ القاہرۃ ۱۳۸۸ھ) (اور اگر غیر مباح الدم مردہ آدمی کو پائے تو اس کا کھانا ہمارے علماء حنابلہ کے قول میں مباح نہیں، اور امام شافعی اور بعض حنفیہ نے کہا ہے کہ اس کا کھانا مباح ہے، اور یہی راجح ہے اس لئے کہ زندہ کی حرمت مردہ کی حرمت سے بڑھ کر ہے، ......اور حنابلہ میں سے فقیہ ابوالخطاب نے یہی رائے اختیار کی ہے کہ مضطر مردہ کو کھا سکتا ہے)۔

اور مالکی فقیہ ابن عربی کی رائے ہے کہ اگر مردہ آدمی کے کھانے سے زندگی کے بچنے کا گمان غالب ہو، تو کھا سکتا ہے، وہ سپرد قرطاس فرماتے ہیں: "**ولايأكل ابن آدم، ولا مات، قاله علماؤنا، وبه قال أحمد وداؤد......وقال الشافعي: يأكل لحم ابن آدم......الصحيح عندي ألا يأكل الآدمي إلا إذا تحقق أن ذلک ينجيه ويحييه**" (تفسیر القرطبی ۲۲۹/۲) (اور آدمی، آدمی کو نہ کھائے، خواہ نہ کھانے کی وجہ سے مر ہی کیوں نہ جائے، یہی ہمارے علماء مالکیہ کا قول ہے، اور امام احمد اور داؤد کا بھی یہی قول ہے، جبکہ امام شافعی کا قول ہے کہ آدمی، مردہ آدمی کا گوشت کھا سکتا ہے......میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ آدمی کو نہ کھائے، مگر جبکہ یقین ہو کہ مردہ آدمی کا گوشت کھانا اس کی جان بچا دے گا)۔

لہذا میرے نزدیک کسی متعین مریض کو اس کی جان بچانے کے لئے، نیز جگر انسانی کو محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارہ کو عطیہ دینے کی وصیت ایک شخص کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال ایسے مضطر بیمار کے لئے ہو جس کی زندگی جگر کی تبدیلی کے بغیر ممکن نہ ہو، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- زندہ کی مصلحت، مردہ کی حرمت کے تحفظ پر مقدم ہے، جیسا کہ فقہی نقول گزریں، نیز علامہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں: "**ولأن حرمة الحي، وحفظ نفسه أولى من حفظ الميت عن المثلة**" (المغنی ۴۰۳/۲) (اس لئے کہ زندہ کی حرمت اور اس کے نفس کا تحفظ مردہ کو مثلہ ہونے سے محفوظ رکھنے سے زیادہ راجح ہے)۔

۲- فقہی قاعدہ ہے: "**المشقة تجلب التيسير**" (السیوطی، الأشباہ والنظائر ص ۷،۶۲،۸۰، ابن نجیم حنفی، الأشباہ والنظائر ص ۶۴،۸۹) (مشقت آسانی پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے)۔

اور اس قاعدہ کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: "**وما جعل عليكم فى الدين من حرج**" (سورہ حج: ۷۸) (اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی)۔

اور اللہ تعالی کا فرمان ہے:"يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (سورۂ بقرہ:۱۸۵)(اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا)، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"إنما بعثتم ميسرين، ولم تبعثوا معسرين"(صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۲۰،۶۱۲۸، سنن ابی داؤد حدیث نمبر:۳۸۰)(تمہیں محض آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، اور دشواری پیدا کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے)۔

اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"يسروا ولا تعسروا" (صحیح البخاری، حدیث نمبر:۶۹، ۶۱۲۵،صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۷۳۴)(آسانی پیدا کرو اور دشواری پیدا نہ کرو)۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا:"أي الأديان أحب إلى الله ؟ قال: الحنيفية السمحة"(الأدب المفرد حدیث نمبر ۲۸۷، مسند عبد بن حمید حدیث نمبر ۵۶۹، مسند احمد حدیث نمبر ۲۱۰۷، اور یہ حدیث صحیح ہے)(اللہ تعالی کے یہاں سب سے پسندیدہ دین کون ہے، تو نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: دین اسلام جو آسان ہے)۔

لہذا جب زندہ مریضوں کی زندگی یا سخت بیماری سے شفایابی مردہ انسان کے عضو کی منتقلی پر منحصر ہو، تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

۳-اسلامی شریعت کی خصوصیت ہے کہ وہ عمومی اور اعلی درجہ کی مصلحتوں کی رعایت کرتی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:"مايريد الله ليجعل عليكم من حرج، ولكن يريد ليطهركم، وليتم نعمته عليكم لعلكم تشكرون"(مائدہ:۶)(اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے، اور تم پر اپنی نعمت مکمل کرے، تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو)۔

اور فرمان الٰہی ہے:"ويضع عنهم إصرهم والأغلال التي كانت عليهم"(اعراف:۱۵۷)(اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے، جو ان پر اب تک رہی ہیں)۔

اور اس میں شک نہیں کہ عام لوگوں کی اعلی درجہ کی مصلحت اس میں ہے کہ مردہ شخص کے عضو کی منتقلی جائز ہو۔

۴-فقہی قاعدہ ہے:"الضرر يزال"(سیوطی، الأشباہ ر ۷، ۸۳، ابن نجیم، الأشباہ ر ص ۷۲)(ضرر کا ازالہ کیا جائے گا)، نیز فقہی قاعدہ ہے:"الضرر يدفع بقدر الإمكان"(مجلۃ الأحکام العدلیۃ، دفعہ ۳۱، زرقا، شرح القواعد الفقہیہ ر ص ۲۰۷)(ضرر کا بقدر امکان ازالہ کیا جائے گا)۔

اور ان قواعد کی بنیاد حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث پر ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ "لا ضرر ولا ضرار" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر:۲۳۴۰، اور یہ حدیث صحیح ہے)(نہ کسی کو ابتداءً ضرر پہنچانا درست ہے، اور نہ ہی مقابلہ کے طور پر کہ دو میں سے ہر شخص دوسرے کے ضرر کا قصد کرے)۔

اور بلاشبہ مردہ کے عضو کی منتقلی میں زندہ مریضوں سے ضرر کا ازالہ ہے۔

۵-فقہی قاعدہ ہے: ''**يتحمل أخف الضررين دفعا لأعظمهما**'' (ابن نجیم، الأشباہ ص ۸۷، سیوطی، الاشباہ ص ۸۸، الأصل الجامع لإيضاح الدرر المنظومة في سلک جمع الجوامع للحسن المالكي ۳۸/۱، طبع اول تونس، مطبعۃ النہضۃ ۱۹۲۸ء) (دو ضرروں میں سے شدید تر ضرر کو دور کرنے کے لئے ہلکے ضرر کو انگیز کیا جائے گا)۔

اور علامہ کاسانیؒ (م: ۵۸۷ھ) رقم طراز ہیں: ''**وشق بطن الأم الميتة أهون من إهلاك الولد الحي**'' (بدائع الصنائع، کتاب الاستحسان، ۱۳۰/۵، طبع دوم، بیروت، العلمیہ ۱۴۰۶ھ) (اور مردہ ماں کے پیٹ کو چاک کرنا زندہ بچہ کو ہلاک کرنے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے)۔

یقیناً مردہ کے جگر کی منتقلی کی وصیت موجودہ دور میں اعزاز اور انسانیت نوازی کی دلیل مانی جاتی ہے، اور عرف میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ''**لا ينكر تغير الفتوى بتغير الزمان**'' (ابن القیم، اعلام الموقعین ۳۸/۳) (زمانہ کے تغیر سے فتوی کے بدلنے کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے)۔

البتہ بذات خود مردہ کی چیر پھاڑ میں ایک گونہ اس کی حرمت کی پامالی ہے، جس سے انکار بداہت کا انکار ہے، لیکن زندہ شخص کا اپنی زندگی کو جگر کے فیل ہونے کی وجہ سے کھودینا، اس سے بڑا ضرر ہے، لہذا ہلکے ضرر کے ارتکاب میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۶-جہاں تک نبی کریم ﷺ کے ارشاد: ''**لعن الله الواصلة والمستوصلة**'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۹۴۷، صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۱۲۴) (اللہ کی لعنت ہو، بال جوڑنے اور جڑوانے والی خاتون پر) کا تعلق ہے، تو اس میں اجزاء انسانی سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت اس صورت میں ہے، جہاں محض آرائش اور زینت مقصود ہو، لہذا اس میں ضرورت کی بنا پر انتفاع کی ممانعت نہیں۔

۷-رہا یہ امر کہ فقہاء نے مجبور کردہ شخص کے لئے اس بات کو مباح قرار نہیں دیا ہے کہ وہ کسی آدمی کی اجازت سے بھی اس کے جسم سے کوئی عضو کاٹ کھائے، جیسا کہ علامہ کاسانی رقم طراز ہیں: ''**ولا أذن له المكره عليه، أو قطعه، أو ضربه، فقال: للمكره: افعل، لا يباح له أن يفعل؛ لأن هذ امما لا يباح بالإباحة، ولو فعل فهو آثم، ألا ترى أنه لو فعل بنفسه أثم، فبغيره أولى**'' (بدائع الصنائع ۱۷۷/۷) (اگر وہ شخص جس کے سلسلہ میں کسی کو مجبور کیا گیا، وہ مجبور کردہ کو خود کے قتل کی اجازت دے دے، یا عضو کاٹنے یا مارنے پر مجبور کئے جانے کی صورت میں مجبور کردہ سے کہے کہ اس کام کو کرجاؤ، تو بھی یہ کام اس کے لئے مباح نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ چیز مباح کرنے سے مباح نہیں ہوجاتی ہے، اور اگر مجبور

کردہ اس کام کو کر جائے تو وہ گنہگار ہوگا، کیا تم غور نہیں کرتے کہ اگر وہ خود اپنی ذات میں یہ کام کر ڈالے تو گنہگار ہوگا، تو دوسرے شخص کی ذات میں کرنے کی وجہ سے بدرجہ اولی گنہگار ہوگا)۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس حالت پر محمول ہے، جبکہ عضو کی منتقلی ہلاکت یا ضرر شدید کا سبب ہو، لیکن اگر محفوظ طریقہ پر ہو یا مرنے کے بعد اس شخص کی اجازت سے ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۸-جہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث **"كسر عظم الميت ككسره حيا"**(سنن ابی داؤد حدیث نمبر:۳۲۰۷، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۱۶۱۶، اور اس کی سند صحیح ہے)(مردہ کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندہ ہونے کی حالت میں اس شخص کی ہڈی کو توڑنا) تو یہ حدیث عام حالات پر محمول ہے، جس سے ضرورت اور مجبوری کی حالت مستثنی ہے۔

جواب نمبر ۶ (الف):

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"ولا تقتلوا أنفسكم، إن الله كان بكم رحيما"** (نساء:۲۹)(اور خود کو قتل نہ کرو، اللہ تم پر بڑا مہربان ہے)، نیز فرمان الہی ہے: **"ولا تلقوا بأيدكم إلى التهلكة"** (بقرہ:۱۹۵)(اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو) اور اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے: **"فليغيرن خلق الله"** (سورۂ نساء:۱۱۹)(سو وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں گے)، اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **"من قتل نفسه بحديدة، فحديدته في يده يتوجأبها في بطنه في نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبدا، ومن شرب سما، فقتل نفسه فهو يتحساه في نار جهنم خالدا مخلدا أبدا، ومن تردى من جبل فقتل نفسه، فهو يتردى في نار جهنم خالدا مخلدا أبدا"** (صحیح البخاری حدیث نمبر:۵۷۷۸، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۰۹)(جو لوہے کے ذریعہ خود کو قتل کر ڈالے، تو اس کا لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا، وہ ہمیشہ ہمیش جہنم کی آگ میں اسے پنے پیٹ میں چبھوتا رہے گا، اور جو زہر پیتا رہیگا، اور جو پہاڑ سے گر کر خود کو ہلاک کر ڈالے، تو وہ ہمیشہ ہمیش جہنم کی آگ میں لڑھکتا رہے گا)۔

چنانچہ ذکر کردہ آیات اور احادیث کی روشنی میں پیوندکاری کی خاطر کسی انسانی عضو کے عطیہ کا جواز درج ذیل ضابطوں کے ساتھ مشروط ہے:

۱-پیوندکاری کی خاطر عضو کی منتقلی ضرورت شدیدہ کی بنا پر ہو یعنی ماہر اطباء کو گمان غالب ہو کہ مریض کی جان بچنے یا مرض شدید سے شفایابی کی صورت صرف یہ ہے کہ اس مریض کے عضو کی جگہ کسی دوسرے انسان کے عضو کی اس کے جسم میں پیوندکاری کر دی جائے۔

۲-انسانی عضو کی پیوندکاری کے سوا کوئی دوسرا متبادل نہ ہو۔

۳-جس شخص کا عضو منتقل کیا جارہا ہو اس کو اس کی وجہ سے ضرر شدید لاحق نہ ہو۔

۴-ایسے عضو کا عطیہ درست نہیں ہے، جس پر عطیہ دینے والے کی زندگی کا دارو مدار ہو، جیسے دل، سر، کیونکہ اس کا عطیہ دینا خود کشی کے ہم معنی ہے جو حرام ہے۔

۵-عضو کی منتقلی کی وجہ سے عطیہ دینے والے کے اندر بدنمائی، بدصورتی، بدزیبی، بھونڈا پن، بدشکلی اور بھدا پن پیدا نہ ہو۔

لہذا زندگی میں زندہ شخص کا کسی دوسرے شخص کو اپنی آنکھ کا قرنیہ (آنکھ کا سامنے والا شفاف حصہ) عطیہ کرنا جائز نہیں ہے۔

۶-پیوندکاری کی خاطر عضو کی منتقلی سے جسمانی عمل معطل نہ ہو، اور نہ ہی کسی واجب کے ترک کا باعث ہو۔

لہذا اپنے دونوں ہاتھ یا دونوں پیر کا عطیہ دینا مباح نہیں ہے، اس لئے کہ اس طرح کا عطیہ دینے کے بعد وہ ناکارہ ہوجائے گا، اور اپنی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہوجائے گا، اور دوسرے پر بوجھ بن کر رہ جائے گا، نیز اپنے اہل وعیال کے لئے کمائی نہ کرپائے گا، اور فقہی ضابطہ ہے: ''**الضرر لا یزال بمثله**'' (سبکی، الأشباہ والنظائر ص ۴۱-۴۲، سیوطی، الأشباہ ص ۸۶، ابن نجیم، الأشباہ ص ۸۷) (ضرر کا ازالہ ضرر کے ذریعہ نہیں کیا جائے گا)۔

۷-ماہر اطباء کو پیوندکاری کی کامیابی کا گمان غالب ہو۔

۸-بلا قیمت عطیہ کرے، کیونکہ انسانی اعضاء کی خرید وفروخت انسانی شرافت کے منافی ہے۔

۹-عطیہ دینے والا عاقل وبالغ ہو۔

۱۰-غیر مسلم کے اعضاء کی پیوندکاری میں حرج نہیں، کہ اعضاء بذات خود صاف وشفاف آلات کی طرح ہیں، ان کے اندر بگاڑ فاسد عقائد واعمال سے پیدا ہوتے ہیں، لہذا کفر کی خباثت اور فسق وفجور کے اثرات محض پیوندکاری کی بنا پر منتقل نہیں ہوں گے، چنانچہ علامہ سرخسی (م: ۴۸۳ھ) رقم طراز ہیں: ''**لا بأس بأن یستأجر المسلم الظئر الکافرة، أو التي قدولت من الفجور**'' (المبسوط ۱۵/ ۱۲۷، بیروت، دارالمعرفۃ ۱۹۹۳ء) (اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک مسلمان کسی دودھ پلانے والی کافر یا زانیہ خاتون جس نے زنا سے بچہ جنا ہو، کو اجرت پر رکھے)۔

اور علامہ شیخی زادہؒ قہستانی سے نقل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: ''**صح استئجار الظئر الکافرة والفاجرة**'' (مجمع الأنہر ۲/ ۳۸۷، دارالاحیاء) (دودھ پلانے والی کافر اور بدکار خاتون کو اجرت پر رکھنا صحیح ہے)۔

ب- جیسا کہ پیچھے تفصیل سے گزرا کہ ایک شخص اپنی موت کے بعد اپنی آنکھ کا قرنیہ (آنکھ کا سامنے والا شفاف حصہ) عطیہ کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کی پیوندکاری کی کامیابی کا گمان غالب ہو، اور مردہ کے اولیاء کو وفات کے بعد کوئی اعتراض نہ ہو۔

اگرچہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "الا إن لله من في السموات ومن في الأرض" (یونس:٦٦) (سن لو کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں)۔

اور فرمان الٰہی ہے: "وله من في السموات والأرض" (انبیاء:١٩) (اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں)، نیز ارشاد ہے: "وله من في السموات والأرض، كل له قانتون" (روم:٢٦) (اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اسی کے مملوک ہیں، سب اسی کے فرمانبردار ہیں)۔

البتہ ایک گونہ انسان کو اپنے جسم میں ایسے تصرف کی اجازت ہے جس سے اسے شدید ضرر لاحق نہ ہو۔

لہذا مالک حقیقی نہ ہوتے ہوئے بھی اسے عطیہ دینے کی اجازت ہے، گویا مالک حقیقی اللہ تعالی نے اسے اختیار عطا کر دیا ہے کہ وہ انسانی ہمدردی میں سخت ضرورت مند مریض کو اپنا عضو عطیہ دے سکتا ہے، جسے مرنے کے بعد اس کے جسم سے الگ کرلیا جائے۔

اور بعض فقہاء جو مالک نہ ہونے کی وجہ سے ایسے وصیت کو صحیح نہیں قرار دیتے ہیں، ان کا قول مرجوح ہے، اس لئے کہ ایک گونہ اپنے جسم میں تصرف کرنے کا ایک انسان کو اختیار ہے۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ انسان کی سانس بند ہونے اور دل کی حرکت رکنے کے بعد نیز شرعی طور پر وفات کی دیگر علامتوں جیسے آنکھیں پھٹی رہ جانا، ہونٹوں کا کھل جانا، پیروں کا ڈھیلا پڑ جانا، ہاتھ کے گٹوں کا سست پڑنا، ناک کا کج ہونا، چہرہ کی کھال میں کھینچاؤ پیدا ہونا، کنپٹی کا دھنس جانا اور فوطے کا سکڑنا اور ان کی کھال کا لٹکنا وغیرہ کے موجود ہونے کے بعد ہی عضو کو منتقل کیا جائے۔

ج- جیسا کہ پہلے گزرا کہ ایسے عضو کا عطیہ درست نہیں ہے جس سے آدمی بدنما اور بدصورت دکھنے لگے، لہذا زندہ شخص "آئی بینک" کو اپنی آنکھ کا عطیہ نہیں دے سکتا ہے۔

اور نہ ہی انسانی جسم کی پیچیدہ ساخت سمجھنے کے لئے تجرباتی میڈیکل تعلیم کی خاطر ریسرچ کے لئے اپنے جسم کی وصیت کرسکتا ہے، اس مقصد کے لئے یا تو بن مانس یا حیوان کے جسم یا پلاسٹک کے مصنوعی اعضاء سے استفادہ کیا جائے، یا غیر مسلم کے جسم سے استفادہ کیا جائے کہ ان کا قانون اسے مباح ٹھہراتا ہے۔

البتہ مردہ شخص "آئی بینک" کو اپنی آنکھ کا عطیہ دے سکتا ہے، بشرطیکہ گمان غالب ہو کہ جس شخص کو اس کی آنکھ کی پیوندکاری کی جائیگی، وہ کامیاب رہے گی، اور پیوندکاری کرانے والے شخص کو آنکھ کی پیوندکاری کرانے کی سخت ضرورت ہو، اور کوئی دوسرا متبادل فراہم نہ ہو۔

اس سلسلہ میں مسلم اور غیر مسلم کی قید نہیں ہے، کیونکہ یہ نیکی اور احسان کے باب سے ہے، جو سب کے ساتھ مطلوب ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''وأحسنوا إن الله يحب المحسنين'' (سورۂ بقرہ:۱۹۵) (اور احسان کرو، بیشک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء'' (سنن ترمذی حدیث نمبر ۱۹۲۴، اوراس کی سند صحیح ہے) (اہل زمین پر رحم کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا)۔

۷- ایک انسان ایک گونہ اپنے جسم میں تصرف کرسکتا ہے، جیسا کہ ارشاد الہی ہے: ''فصكت وجهها'' (سورۂ ذاریات:۲۹) (اس نے اپنی پیشانی ٹھونکی)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک انسان تعجب کے اظہار کے لئے اپنی پیشانی پر ضرب لگا سکتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غیر ضرر رساں تصرف وہ اپنی ذات میں کرسکتا ہے۔

اگر چہ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی جسم کا مالک حقیقی اللہ تعالی ہے، لیکن اللہ تعالی کے اختیار دینے سے ایک انسان کو اپنے جسم میں ایک گونہ غیر ضرر رساں تصرف کا حق ہے، لہذا مردہ کی وصیت بھی ضروری ہے، اور مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف سے رضامندی بھی ضروری ہے، کیونکہ مرنے کے بعد ورثہ ہی اس کے ولی ہیں، اور انہیں کو مقتول شخص کا قصاص طلب کرنے کا حق ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''ومن قتل مظلوما، فقد جعلنا لوليه سلطانا'' (سورۂ اسراء:۳۳) (اور جو ظلما قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا)۔

۸- انسانی دودھ کی تجارت، انسانیت، انسانی شرافت اور انسانی اقدار کے منافی ہے، اور مغربی تہذیب کی عیاشانہ ذہنیت کا شاخسانہ ہے، لہذا جائز نہیں ہے کہ ''دودھ بینک'' کو عوض دے کر یا بلا عوض کوئی خاتون دودھ فراہم کرے، اور دودھ بینک اسے ضرورت مند بچوں کے لئے فروخت کرے، چنانچہ علامہ مرغینانی (م:۵۹۳ھ) تحریر فرماتے ہیں: ''ولا بيع لبن امرأة في قدح، وقال الشافعي یجوز بيعه؛ لأنه مشروب طاهر، ولنا أنه جزء الآدمي، وهو بجميع أجزائه مكرم مصون عن الابتذال بالبيع، ولا فرق في ظاهر الرواية بين لبن الحرة والأمة، وعن أبى يوسف أنه يجوز بيع لبن الأمة؛ لأنه يجوز إيراد العقد على نفسها، فكذا على جزئها قلنا: الرق قد حل نفسها، فأما اللبن فلا رق فيه؛ لأنه يختص بمحل يتحقق فيه القوة التي هي ضده، وهو الحي، ولاحياة في اللبن'' (ہدایہ ۳/۴۶، بیروت دارالاحیاء)۔

(اور پیالہ میں دوہ کر عورت کے دودھ کو بیچنا درست نہیں ہے، اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ جائز ہے، اس لئے کہ یہ

پاک مشروب ہے، اور ہم حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ دودھ انسان کا جز ہے، اور انسان اپنے تمام اجزاء سمیت مکرم ومعزز ہے، اور خرید وفروخت کے ذریعہ استعمال میں لائے جانے سے محفوظ کردہ ہے، اور ظاہر الروایہ کے مطابق آزاد اور باندی خاتون کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ باندی کے دودھ کو فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ اس کی ذات کو محل عقد بنانا جائز ہے، تو ایسے ہی اس کے جزء کو محل عقد بنانا جائز ہوگا، ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ غلامی اس کی ذات میں سرایت کر چکی ہے، بہر حال دودھ میں غلامی کی ضد یعنی قوت کا تحقق ہو سکے، اور وہ زندہ عضو ہے، اور دودھ میں زندگی نہیں)۔

اور علامہ کاسانی (م:۵۸۷ھ) رقم طراز ہیں:"**ولا ينعقد بيع لبن المرأة في قدح عندنا......وأما المعقول فهو؛لأنه لا يباح الانتفاع به شرعا على الإطلاق، بل لضرورة تغذية الطفل، وما كان حرام الانتفاع به شرعا إلا لضرورة، لا يكون مالا، كالخمر والخنزير، والدليل عليه أن الناس لا يعدونه مالا، ولا يباع في سوق ما من الأسواق،"دل أنه ليس بمال، فلا يجوز بيعه، ولأنه جزء من الآدمي، والآدمي بجميع أجزائه محترم مكرم، وليس من الكرامة والاحترام ابتذاله بالبيع والشراء**"(بدائع الصنائع، کتاب البیوع ۵/۱۴۵)۔

(اور ہم احناف کے نزدیک پیالہ میں دوہ کر خاتون کے دودھ کی خرید وفروخت منعقد نہ ہوگی، اور عدم جواز کی عقلی دلیل یہ ہے کہ شرعی طور پر ہر حال میں اس سے انتفاع مباح نہیں ہے، بلکہ بچہ کو غذا دینے کی ضرورت کی بنا پر اس سے فائدہ اٹھانا مباح ہے، اور جس چیز سے شرعی طور پر ضرورت کی حالت کے سوا فائدہ اٹھانا حرام ہو، وہ مال نہیں ہوتا ہے، جیسے شراب اور خنزیر، اور اس کے مال نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ لوگ اسے مال نہیں سمجھتے ہیں، اور کسی بازار میں فروخت نہیں ہوتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مال نہیں، لہذا اس کی خرید وفروخت جائز نہیں، اور اس لئے کہ وہ انسان کا جزء ہے اور انسان اپنے تمام اجزاء سمیت محترم مکرم اور معزز ہے، اور تکریم واحترام کے باب سے یہ نہیں کہ خرید وفروخت کے ذریعہ اسے صرف و استعمال میں لایا جائے)۔

اور علامہ جمال الدین منبجی حنفی (م:۶۸۶ھ) تحریر فرماتے ہیں:"**لايجوز بيع لبن المرأة، قال الله تعالى:"فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن"**(طلاق:۶)**،فقد دلت هذه الآية على أن لبن المرأة، وإن كان عينا؟فقد أجري مجرى المنافع التي تستحق بعقود الإجارات، فكما لا يجوز عقد البيع على المنافع لا يجوز على لبن المرأة، وفارق لبن المرأة بذلک سائر البان الحيوانات، لأنه لا يجوز استئجار شاة**

لرضاع صبي ؛لأن الأعيان لا تستحق بعقود الإجارات، كاستئجار النحل والشجر" (اللباب فی الجمع بین السنۃ والکتاب، دارالقلم طبع دوم، ۱۴۱۴ھ)۔

(خاتون کے دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: سو اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں، تو ان کو معاوضہ دو)، چنانچہ اس آیت سے پتہ چلا کہ عورت کا دودھ اگر چہ متعین شے ہے، لیکن اسے ان منافع کے قائم مقام رکھا گیا ہے جن کا استحقاق عقد اجارہ سے ہوتا ہے، تو جس طرح منفعت کو محل عقد بنانا جائز نہیں، اسی طرح خاتون کے دودھ کو بیچنا جائز نہیں، اور اس طرح عورت کا دودھ دیگر جانوروں کے دودھ سے الگ ہے، اس لئے کہ بچہ کو دودھ پلانے کے لئے بکری کو اجرت پر لینا جائز نہیں، اس لئے کہ متعین اشیاء (جن کو باقی رکھتے ہوئے ان کی منفعت سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو) کا عقد اجارہ سے استحقاق نہیں ہوتا ہے، جیسے شہد کی مکھیوں اور درخت کو کرایہ پر لینا درست نہیں)۔

اور امام سرخسی (م: ۴۸۳ھ) رقم طراز ہیں: "ولا يجوز بيع لبن بني آدم على وجه من الوجوه عندنا، ولا يضمن متلفه أيضا، وقال الشافعيؒ يجوز بيعه ويضمن متلفه؛ لأن هذا البن طاهر أو مشروب طاهر كلبن الأنعام، ولأنه غذاء للعالم، فيجوز بيعه كسائر الأغذية وبهذا يتبين أنه مال متقوم، فإن المالية والتقوم بكون العين منتفعا به شرعا وعرفا، والدليل عليه أنه عين يجوز استحقاقه بعقد الإجارة فيجوز بيعه، ويكون مالا متقوما كالصبغ في عمل الصباغة والحبر في الوراقة والحرض والصابون في غسيل الثياب، بل أولى لأن العين للبيع أقبل منه للإجارة، وحجتنا في ذلک أن لبن الآدمية ليس بمال متقوم، فلا يجوز ب يعه، ولا يضمن متلفه، بالبزاق والمخاط والغرق، وبيان الوصف أن المال اسم لما هو مخلوق لإقامة مصالحنا به مما هو غيرنا، فأما الآدمي خلق مالكا للمال، وبين كونه مالا، وبين كونه مالكا للمال منافاة:وإليه أشار الله تعالى في قوله: "هو الذي خلق لكم ما في الأرض جميعا" (بقرہ:۲۹)،ثم لأجزاء الآدمي من الحكم ما لعينه، ألا ترى أن شعر الآدمي يدفن، وما ينفصل من سائر الحيوانات ينتفع به، واللبن جزء متولد من عين الآدمي، ألا ترى أن الحرمة تثبت باعتباره، وهي حرمة الرضاع، كما تثبت حرمة المصاهرة بالماء الذي هو أصل الآدمي، والمتولد من الأصل يكون بصفة الأصل، فإذا لم يكن الآدمي مالا في الأصل، فكذلک ما يتولد منه من اللبن بمنزلة الولد" (المبسوط ۱۵/۱۲۵، بیروت، دارالمعرفۃ ۱۴۱۴ھ)۔

(ہم حنفیہ کے نزدیک کسی صورت میں خواتین کا دودھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے ضائع کرنے

والے پرضمان لازم ہے،اورامام شافعی نے فرمایا کہ اس کی خرید وفروخت جائز ہے،اوراس کے ضائع کرنے والے پرضمان لازم ہوگا،اس لئے کہ یہ جانوروں کے دودھ کی طرح پاک دودھ یا پاک مشروب ہے،اوراس لئے کہ یہ دنیا میں رہنے والے انسانوں کی غذا ہے،لہذا تمام غذاؤں کی طرح اس کا فروخت کرنا بھی جائز ہوگا،اوراس سے واضح ہوگیا کہ دودھ قیمت رکھنے والا مال ہے،اس لئے کہ کسی چیز کا مال اوراس کا قیمت والا ہونا شرعی اورعرفی طور پراس کے قابل انتفاع ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے،اوراس کے مال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ ایسی چیز ہے جس کا عقداجارہ سے استحقاق جائز ہے،لہذااس کوفروخت کرنا جائز ہوگا،اوروہ قیمت رکھنے والا مال ہوگا،جیسے رنگ رنگائی کے کام میں،اوروشنائی کتاب کے اندر،اوراشنان (ایک خوشبودار گھاس)اورصابون کپڑے کی دھلائی میں، بلکہ فروخت کرنا زیادہ راجح ہوگا،اس لئے کہ متعین شئی فروختگی کواجارہ کے مقابلہ میں زیادہ قبول کرتی ہے۔

اور ہماری دلیل اس سلسلہ میں یہ ہے کہ خاتون کا دودھ قیمت رکھنے والا مال نہیں،لہذااس کوفروخت کرنا جائز نہیں، اوراسے ضائع کرنے والا ضامن نہیں ہوگا،جیسے تھوک، رینٹ اور پسینہ کا حال ہے،اوراس مسئلہ کا بیان اس طرح ہے کہ مال اس چیز کا نام ہے جسے ہماری مصلحتوں کوقائم کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جو ہماری ذات سے الگ ہے، رہا آدمی تو وہ مال کا مالک بنا کر پیدا کیا گیا ہے،اوراس کے مال اور مال کے مالک ہونے کے درمیان تضاد ہے،اوراسی طرف اللہ تعالی کے فرمان (وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جوزمین میں ہے) میں اشارہ ہے، پھرانسان کے اجزاء کا وہی حکم ہے جواس کی ذات کا حکم ہے،کیا تم غورنہیں کرتے کہ انسان کی تکریم میں انسان کے بال سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا ہے، برخلاف دیگرحیوانات کے،اورآدمی کا پاخانہ دفن کردیا جاتا ہے،جبکہ دیگر جانوروں سے جدا ہونے والی شئی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے،اوردودھ انسان کی ذات سے پیدا ہونے والا جزء ہے،کیاتم غورنہیں کرتے کہ حرمت اسی اعتبار سے ثابت ہوتی ہے اوروہ رضاعت کی حرمت ہے، جیسے حرمت مصاہرت اس نطفہ سے ثابت ہوتی ہے جوآدمی کی اصل ہے،اوراصل سے پیدا ہونے والا اصل کے درجہ میں ہوتا ہے،لہذا جب آدمی اصل کے اعتبار سے مال نہیں تواسی طرح اس سے پیدا ہونے والا دودھ اس کی اولاد کے درجہ میں ہے)۔

دیگر دبستان فقہ:

شوافع کی طرح مالکیہ بھی انسان کے دودھ کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیتے ہیں، چنانچہ رعینی مالکی (م: ۹۵۴ھ) رقم طراز ہیں:"ويجوز بيع لبن الآدميات؛لأنه طاهر منتفع به"(مواہب الجلیل ۴/۲۶۵،طبع ۱۴۱۲ھ)(خواتین کے دودھ کی خرید وفروخت جائز ہے،اس لئے کہ وہ پاک اورقابل انتفاع شئی ہے)۔

اور جہاں تک شافعیہ کا تعلق ہے تو خودان کے فقہاء نے خواتین کے دودھ کی خرید وفروخت کے جائز ہونے کی

صراحت کی ہے، جیسا کہ امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں: "بيع لبن الآدميات جائز عندنا لاكراهة فيه، هذا المذهب" (المجموع شرح المہذب ۹/ ۲۵۴، بیروت، دارالفکر) (خواتین کے دودھ کوفروخت کرنا جائز ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں ہے، یہی صحیح مذہب ہے)۔

واضح رہے کہ فقہاء حنابلہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے، لیکن فقیہ خرقی اور ابن قدامہ کے نزدیک خاتون کے دودھ کی خرید وفروخت درست ہے، چنانچہ ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں:

"فأما بيع لبن الآدميات، فقال أحمد: أكرهه، واختلف أصحابنا في جوازه، فظاهر كلام الخرقي جوازه لقوله: "وكل ما فيه المنفعة" وهذا قول ابن حامد، ومذهب الشافعي وذهب جماعة من أصحابنا إلى تحريم بيعه، وهو مذهب أبي حنيفة ومالک؛ لأنه مائع خارج من آدمية، فلم يجز بيعه كالعرق، ولأنه من آدمي؛ فأشبه سائرأجزائه، والأول أصح؛ لأنه لبن طاهر منتفع به، فجاز بيعه كلبن الشاة، ولأنه يجوز أخذ العوض عنه في إجارة الظئر، فأشبه المنافع، ويفارق العرق، فإنه لا نفع فيه، ولذلک لا يبا ع عرق الشاة، ويباع لبنها، وسائر أجزاء الآدمي يجوز بيعها، فإنه يجوز بيع العبد والأمة وإنما حرم بيع الحر؛ لأنه ليس بمملوک، وحرم بيع العضو المقطوع؛ لأنه لانفع فيه" (المغنی ۴/ ۱۹۶)۔

(رہا خواتین کے دودھ کی خرید وفروخت تو امام احمد نے فرمایا کہ میں اسے مکروہ قرار دیتا ہوں، اور ہمارے علماء کا اس کے جواز کے سلسلہ میں اختلاف ہے، چنانچہ خرقی کے کلام کا بہ ظاہر تقاضا جواز کا ہے، اس لئے کہ ان کا قول ہے کہ "ہر وہ چیز جس میں منفعت ہو، اس کوفروخت کرنا جائز ہے" اور یہی ابن حامد کا قول اور امام شافعی کا مذہب ہے، اور ہمارے علماء میں سے ایک جماعت خاتون کے دودھ کوفروخت کرنے کی حرمت کی طرف گئی ہے، اور یہی ابوحنیفہ اور مالک کا مسلک ہے، اس لئے کہ وہ خاتون سے نکلنے والا سیال مادہ ہے، لہذا اس کوفروخت کرنا جائز نہیں ہے، جیسے پسینہ کوفروخت کرنا جائز نہیں، اور اس لئے کہ دودھ آدمی کا جزء ہے، تو وہ بھی دیگر اجزاء کی مانند ہے۔

اور پہلا قول صحیح ہے، اس لئے کہ وہ پاک اور قابل انتفاع دودھ ہے، لہذا بکری کے دودھ کی طرح اسے فروخت کرنا جائز ہے، اور اس لئے بھی کہ دودھ پلانے والی کے اجارہ میں اس کا عوض لینا جائز ہے، لہذا وہ منافع کے مشابہ ہے، اور پسینہ سے الگ ہے، اس لئے کہ اس میں کوئی نفع نہیں، اسی وجہ سے بکری کا پسینہ فروخت نہیں کیا جاتا ہے، اور اس کا دودھ فروخت کیا جاتا ہے، اور انسان کے تمام اجزاء کی خرید وفروخت جائز ہے، کیونکہ غلام اور باندی کی خرید وفروخت جائز ہے، حرام تو بس آزاد کی خرید وفروخت ہے، اس لئے کہ وہ مملوک نہیں ہے، اور کٹے ہوئے عضو کی خرید وفروخت حرام ہے، اس لئے کہ اس میں کوئی نفع نہیں)۔

قول راجح:

حنفیہ اوران کے موافقین کا قول راجح ہے؛اس لئے کہ انسان کواللہ تعالی نے مکرم اورمعزز بنا کر پیدا کیا ہے،اور انسان میں اصل یہ ہے کہ وہ مملوک نہ بنے،اسی طرح اس کے تمام اجزاء میں اصل یہ ہے کہ اس پرکسی کی ملکیت طاری نہ ہو، جہاں تک کہ ابن قدامہؒ کا آزاد کے عضوکوغلام باندی پر قیاس کرنا ہے تو یہ کمزور ہے،اس لئے کہ غلام باندی کی خرید وفروخت خلاف اصل ہے، نیز خودان کواعتراف ہے کہ آزاد کی خرید وفروخت مملوک نہ ہونے کی وجہ سے حرام ہے،تو آزاد کے اعضاء کی خرید وفروخت بھی حرام ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ انسانی شرافت اورتکریم کے خلاف ہے کہ انسان کے کسی جزءکوخرید وفروخت کامحل بنادیا جائے۔

حرمت رضاعت کا مسئلہ:

اگرکوئی شخص اپنے ضرورت مند بچہ کو دودھ بینک سے دودھ خرید کر پلا ہی دے تو حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:"**يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب**"(صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۶۴۵،صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۴۴۷)(دودھ پینے کی وجہ سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جونسب سے حرام ٹھہرتے ہیں)۔

لیکن اگراس نے ضرورت شدیدہ کی بنا پر نہ خریدا ہوتو گنہگار رہوگا، نیز بدرجہ مجبوری خریدنے والے شخص پرلازم ہے ہے کہ اس خاتون کا دودھ خریدے جس کا نام پتہ ڈبہ پرتحریر ہو،البتہ اگرکسی نامعلوم خاتون کا دودھ بچہ پی لے،تو محض شک کی بنا پرکسی خاتون سے حرمت نکاح ثابت نہ ہوگی، چنانچہ علامہ ابن ہمام (م:۸۶۱ھ) رقم طراز ہیں:"**أدخلت الحلمة في الصغير، وشكت في الارتضاع، لا تثبت الحرمة بالشك، وهو كما لو علم أن صبية أرضعتها امرأة من قرية، ولا يدري من هي، فتزوجها رجل من أهل تلك القرية صح؛ لأنه لم يتحقق المانع من خصوصية امرأة، والواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة، وإذا أرضعن فليحفظن ذلك ويشهرنه ويكتبنه احتياطا**"(فتح القدیر کتاب الرضاع ۴۳۹/۳، بیروت، دارالفکر)(کسی خاتون نے بچہ کے منہ میں پستان داخل کی،اور بچہ کے دودھ پینے میں شک کیا،تو شک کی بنا پرحرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی،اور یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کوعلم ہوا کہ گاؤں کی ایک نامعلوم عورت نے ایک بچہ کودودھ پلایا ہے،پھراسی گاؤں میں سے کسی شخص نے اس بچی سے نکاح کرلیا،تو یہ نکاح صحیح ہے،اس لئے کہ نکاح سے روکنے والے امر کا کسی خاص عورت میں وجودنہیں ہوا،اور خواتین پرواجب ہے کہ بلاضرورت وہ ہر بچہ کودودھ نہ پلائیں،اوراگر دودھ پلائیں،تو اسے یادکرلیں،اورمشہور کردیں اور بہ طوراحتیاط لکھ لیں)۔

اور عام طور سے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ رضاعت اقرار یا شہادت سے ثابت ہوتی ہے، محض شک کی بنا پر حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے، چنانچہ ہندیہ میں ہے:"**الرضاع يظهر بأحد أمرين: أحدهما الإقرار، والثاني البينة**"(عالمگیری، کتاب الرضاع ۱/ ۳۴۷)(رضاعت دو چیزوں میں سے ایک سے ظاہر ہوتی ہے، پہلی چیز اقرار ہے اور دوسری چیز شہادت ہے)۔

اور شافعیہ کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ امام سیوطی شافعیؒ تحریر فرماتے ہیں:"**لو شك: هل رضع في الحولين أم بعدهما......فالأصح لا تحريم**" (الأشباہ ص ۷۰)(اگر شک ہو کہ دو سال کے اندر دودھ پیا یا اس کے بعد، تو صحیح قول کے مطابق حرمت ثابت نہ ہوگی)۔

۹- مادہ منویہ بینک قائم کرنا، اسی طرح کسی مرد یا خاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورت مند مرد یا خاتون کو مادہ منویہ یا بیضہ فروخت کرنا، یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا، سب ناجائز، سنگین گناہ اور زنا کی تسہیل کا ذریعہ بننے کے حکم میں ہے، اور معصیت میں تعاون ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"**ولا تعاونوا على الاثم والعدوان**" (مائدہ:۲)(اور گناہ اور ظلم و زیادتی اور تعدی کے کام میں تعاون نہ کرو)۔ اور فقہی اصول ہے:"**وما يؤدي إلى الحرام فهو حرام**"(البنایۃ ۱۲/ ۳۸۱، مجمع الأنہر ۲/ ۵۷۳)(جو حرام کا ذریعہ بنے تو وہ بھی حرام ہے)۔

اور زنا میں تعاون اس لئے ہے کہ مادۂ منویہ اور تولید کے لائق بیضے کی منتقلی سے مادہ منویہ والے مرد یا بیضہ والی خاتون کی موروثی صفات بھی منتقل ہوں گی، اور اس پر تمام میڈیکل سائنس والوں کا بھی اتفاق ہے، اور اس طرح اس کی وجہ سے اجنبی مرد وعورت کے مادہ کے اختلاط کے نتیجہ میں نسب میں اختلاط ہوگا، اور یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ زنا کی ممانعت کی اصل وجہ یہی اختلاط نسب ہے، چنانچہ حضرت رویفع بن ثابت انصاریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ حنین کے موقع سے ارشاد فرمایا:"**لا يحل لا مرئ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يسقي ماءه زرع غيره**" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۲۱۵۸، سنن ترمذی حدیث نمبر ۱۱۳۱، صحیح ابن حبان حدیث نمبر ۴۸۵۰، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے)(اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی آدمی کے لئے حلال نہیں کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے)۔

اسی کے ساتھ ماں باپ اور بچے میں وہ روحانی پاکیزگی بھی حاصل نہ ہوگی، جو حقیقی ماں باپ اور بچے میں ہوتی ہے، البتہ چونکہ اس عمل میں ظاہری اعتبار سے اجنبی مرد وعورت کے درمیان جسمانی مباشرت نہیں ہے، لہذا حد زنا جاری نہیں ہوگی۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ - اسلام کی نظر میں

مولانا مظاہر حسین عماد القاسمی☆

ہر انسان کو خون کا عطیہ دینا جائز ہے:

مسلم ہو یا غیر مسلم سب کو خون کا عطیہ دینا جائز ہے، اس لئے کہ یہ بہت بڑا تعاون ہے، خون نہ دینے کی صورت میں ایک انسان کی جان بھی جاسکتی ہے، اور اسلام تو رحمت ومودت اور محبت کا مذہب ہے، اور خون دے کر ایک انسان کو بچانا تو بہت بڑا تعاون اور مدد بھی ہے، اور محبت ورحمت کا اظہار بھی، دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- ارشاد باری تعالی ہے: "**تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**" (مائدہ:۲) (نیکی اور تقوی پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور برائی اور ظلم پر ایک دوسرے کی مذمت کرو)۔

۲- قرآن پاک میں ایک جان کے بچانے کو ساری انسانیت کے بچانے سے تعبیر کیا گیا ہے، جس سے ایک انسان کے جان کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالی کا بیان ہے: "**من قتل نفسا بغیر نفس أو فساد فی الأرض فکأنما قتل الناس جمیعا ومن أحیاها فکأنما أحیا الناس جمیعا**" (مائدہ:۳۳) (جس نے کسی ایسے آدمی کو قتل کیا، جس نے کسی کا قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس نے زمین میں فساد مچایا تھا تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کردیا اور جس نے کسی شخص کی جان بچائی گویا اس نے سب لوگوں کی جان بچائی)۔

۳- خون دے کر کسی کی جان بچانا ایک بہت بڑی مہربانی بھی ہے اور اللہ تعالی مہربان بندوں پر مہربانی فرماتے ہیں، حضور ﷺ فرماتے ہیں: "**إنما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء**" (رقم الحدیث ۹۲۳، باب البکاء علی المیت، کتاب الجنائز، صحیح مسلم ۲/۶۳۶، تحقیق محمد فؤاد الباقی طبع دار الحدیث قاہرہ) (بیشک اللہ تعالی اپنے مہربان بندوں پر مہربانی فرماتے ہیں)۔

۴- خون دے کر ایک آدمی کی جان بچانا صرف اس کی نہیں بلکہ ایک خاندان کی مدد ہے، بلکہ بالواسطہ ہر اس انسان کی مدد ہے جو کسی بھی طرح اس آدمی سے مستفید ہو رہا ہو جس کو خون عطیہ کیا جارہا ہے، اور مدد کرنے والے کے بارے

☆ استاذ حدیث وفقہ، الجامعہ اسلامیہ کیرالا، شانتاپورم کیرالا۔

میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "**والله فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیه**" (رقم الحدیث ۲۶۹۹، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن صحیح مسلم ۲۰۷۴/۴ تحقیق محمد فؤاد الباقی طبع دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان)۔

۵-اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ نے اپنی آٹھویں کانفرنس میں خون کے عطیہ کو جائز قرار دیا ہے، یہ کانفرنس ۱۹ تا ۲۸ جنوری ۱۹۸۵ میں منعقد ہوئی تھی۔

۶-غیر مسلم کو خون دینا دعوتی نقطہ نظر سے بھی بہت مفید ہے، اس لئے کہ جس غیر مسلم کو خون دیا جائے گا، وہ خود اور اس کے اعزہ واقارب خون دینے والے مسلمان کے احسان مند ہو جائیں گے، اور یہ جذبہ تشکر انہیں اسلام اور مسلمانوں سے قریب کرے گا، اور یہ قربت ویگانگت انہیں یا تو اسلام قبول کرنے میں مدد ومعاون ہوگا، یا کم از کم اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ان کی ہمدردی ہوگی، اور یہ ہمدردی مسلمانوں کے بہت سارے مسائل حل کرنے میں مددگار ثابت ہوگی، مسلمانوں کو جہاں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور حمزہؓ جیسے بہادروں اور خدا کی رضا کے لئے سب کچھ قربان کرنے والوں کی ضرورت ہے، وہیں ابوطالب جیسے غیر مسلم ہمدردوں کی بھی ضرورت ہے۔

جو غیر مسلم مسلمانوں کے دشمن ہیں یا غلط فہمی کی بنیاد پر مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں ان کے بارے میں تو اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم وتقسطوا إلیهم إن الله یحب المقسطین**" (سورۂ ممتحنہ:۸) (جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا، ان کے ساتھ سلوک واحسان کرنے، اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا، بلکہ اللہ تعالی تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اور جو غیر مسلم اعلانیہ دشمن ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، ان کو اپنے اخلاق سے متاثر کرنا مسلمانوں کا اولین فریضہ ہے، حضور ﷺ کے طرز عمل سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ میدان جنگ میں تو کفار کے ساتھ بہادری سے لڑا جائے مگر میدان جنگ سے باہر حتی الامکان کفار کے ساتھ بھی نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے، اس لئے کہ اسلام کا مقصد لوگوں کی گردنیں کاٹنا نہیں ہے، بلکہ اسلام کا مقصد تو دنیا سے فتنہ وفساد کو ختم کرنا ہے اور ساری انسانیت کو اللہ تبارک وتعالی کی اطاعت وبندگی پر لگانا ہے۔

۷-خون کا عطیہ دینے سے انسان کی کرامت وشرافت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ خون دینے سے نہ انسانی جسم بدنما ہوتا ہے اور نہ ہی خون دینے والے کو اتنی نقاہت اور کمزوری ہوتی ہے جس کو وہ برداشت نہ کر سکے اور جو اس کے لئے تکلیف مالا یطاق ہو۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ ہر صحت مند انسان ہر چار ماہ پر چار سو ملی گرام خون عطیہ کر سکتا ہے، گویا انسانی جسم میں ہر ماہ ایک سو ملی گرام خون بنتا ہے اور خون ایسا عضو ہے جس کے اجزاء بڑھتے رہتے ہیں۔

۲-بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے:

جیسا کہ سوال اول کے جواب میں وضاحت کی گئی کہ خون عطیہ کرنا جائز ہے، تو ناگہانی ضرورت کے لئے بلڈ بینک قائم کرنا بھی جائز ہے، آج کل کی بھاگ دوڑ کی زندگی میں خون عطیہ کرنے والے کو تلاش کرنا مشکل ہے آج کل کب کس کو کوئی حادثہ پیش آ جائے اور اسے خون کی ضرورت پڑ جائے کوئی نہیں بتا سکتا، دنیا نے جہاں سہولیات میں ترقی کی ہے وہیں ذرائع حادثات میں بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے، اس لئے انسانی جانوں کو بچانے کے لئے بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہی نہیں بلکہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

بلڈ بینک میں خون دینا اور اس سے خون لینا دونوں جائز ہے:

بلڈ بینک میں خون دینا بھی جائز ہے، اس لئے کہ بلڈ بینک کا مقصد انسانی جانوں کی حفاظت ہے، جو بہت اچھا مقصد ہے اور اس مقصد کے لئے خون دینا بھی بہت اچھا عمل ہے۔

بلڈ بینکوں سے خون لینے میں بھی کوئی برائی نہیں ہے اس لئے کہ بلڈ بینک اس لئے قائم کئے گئے ہیں کہ خون کی ضرورتمندوں کو وہاں سے خون فراہم کیا جائے۔

۳-بلڈ کیمپ قائم کرنا جائز ہے:

جب خون دینا جائز ہے تو لوگوں سے آئندہ کی ضرورت کے لئے خون کا عطیہ مانگنا اور اس کے لئے کیمپ قائم کرنا بھی جائز ہے، اور ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو بلڈ کیمپ کو ناجائز قرار دے۔

مسلمان بھی بلڈ کیمپ قائم کریں:

مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً بلڈ کیمپ لگانا چاہئے تاکہ انسانوں کی خدمت میں ان کی زیادہ حصہ داری ہو، اور مسلمانوں کا وقار اور شان بڑھے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ دینے والے کی پوزیشن میں رہیں نہ کہ لینے والے کی، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الید العلیا خیر من الید السفلی'' (صحیح مسلم باب بیان أن الید العلیا خیر من الید السفلی کتاب الزکوۃ ۲/۷۱۷) (بلند ہاتھ پست ہاتھ سے بہتر ہے، یعنی دینے والا انسان لینے والے انسان سے بہتر ہے)۔

اس حدیث میں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ خلق خدا کی خدمت میں مشغول رہیں، اور اپنے آپ کو

اس طرح بنا کر رکھیں کہ انہیں دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت نہ پڑے، دنیا میں ہر اعتبار سے وہ اپنا پلڑا بھاری رکھیں، وہ جہاں بھی رہیں خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں، اور عزت ووقار کے ساتھ سر اٹھا کر جیئیں۔

لہذا مسلمانوں کی طرف سے بلڈ کیمپ قائم کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ایک مستحسن قدم ہے۔

۴- اگر خون ایسے گروپ سے تعلق رکھتا ہو جیسے O-ve تو اس گروپ کے حامل شخص کے لئے خون عطیہ کرنے سے متعلق تین احکام ہوں گے۔

۱-خون کا عطیہ کرنا واجب ہے، اگر صورت حال یہ ہو کہ خون نہ ملنے کی صورت میں مریض کی جان ختم ہو جانے کا شدید خطرہ ہو، تو خون عطیہ کرنا واجب ہے، اس لئے کہ اس صورت میں خون عطیہ نہ کرنا بالواسطہ طور پر قتل کا مرتکب ہونا ہے، اور خالق دو جہاں کے نزدیک انسانی جان خاص طور سے مومن کی جان بہت پیاری ہے، ایک انسانی جان ہلاک کرنے والے کے متعلق ارشاد باری تعالی ہے: "**من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعا ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا** " (مائدہ: ۳۲) (جس نے کسی ایسے آدمی کو قتل کیا جس نے کسی کا قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس نے زمین میں فساد مچایا تھا، تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی شخص کی جان بچائی تو گویا اس نے سارے انسانوں کی جان بچائی)۔

مومن کے قتل عمد کے متعلق ارشاد ربانی ہے: "**ومن يقتل مؤمنا متعمدا فجزاء ه جهنم خالدا فيها وغضب الله عليه ولعنه وأعدله عذابا عظيما**" (نساء: ۹۳) (اور جس نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالی کا غضب ہے اور اللہ تعالی نے اس پر لعنت کی ہے، اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے)۔

۲-خون عطیہ کرنا مستحب ہے، اگر صورت حال یہ ہو کہ فی الحال تو خون کی اتنی ضرورت نہیں کہ خون عطیہ کئے بغیر مریض کی جان چلے جانے کا ڈر ہو، مگر کسی مریض کے لئے یا بدامنی اور حادثات کے پیش نظر اس طرح کے خون کے نادر گروپوں کی ضرورت کا احساس ہو تو خون عطیہ کرنا مستحب ہے، اس لئے کہ مہربانی کا تقاضا یہ ہے کہ پریشانی کے وقت انسانوں کی تمام ضروریات کا بندوبست اور انتظام کیا جائے، اور اللہ تعالی مہربانی کرنے والوں پر مہربانی فرماتے ہیں۔

"**يرحم الله من عباده الرحماء**" (صحیح مسلم ۶/۲ ۶۳ دار الحدیث القاہرہ) (اللہ تعالی اپنے مہربان بندوں پر مہربانی فرماتے ہیں)۔

۳-خون عطیہ کرنا واجب اور مستحب نہیں صرف جائز ہے، اگر خون کی ضرورت فی الحال بھی نہ ہو اور نہ ہی مریض کی

موجودہ حالت ایسی ہو جس میں خون کی ضرورت کا احساس ہو اور نہ ہی بدامنی اور حادثات والے حالات ہوں تو خون عطیہ کرنا صرف جائز ہوگا، اس لئے کہ جب نہ فی الحال خون کی ضرورت ہے اور نہ ہی خون کی ضرورت کا احساس ہے تو خون کا عطیہ واجب یا مستحب قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۵-مردہ انسان کے جگر کی پیوندکاری:

مردہ انسان کا جگر زندہ انسان کے جسم میں لگانا جائز ہے، اس لئے کہ مردہ انسان کا جگر بہرحال چند گھنٹوں کے بعد ناکارہ ہو جائے گا، اور دفن کے چند دنوں یا مہینوں کے بعد گل کر مٹی ہو جائے گا، جبکہ وہ زندہ انسان جس کو مردہ انسان کا جگر لگایا گیا ہے، اگر صحت مند ہو گیا تو دنیا کے دیگر لوگوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے، اگر وہ بڑا عالم اور محقق ہے تو اپنے علم کی روشنی سے مزید جہان روشن کر سکتا ہے اور سائنس داں اور محقق ہے تو وہ اپنے فن میں مزید تحقیق کر کے اور مزید نئی راہیں تلاش کر کے خلق خدا کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، اگر وہ ایماندار دیانتدار، اور بہادر سیاسی مدبر لیڈر ہے تو وہ عدل وانصاف کا بول بالا کر سکتا ہے، اور دنیا سے ظلم اور تاریکی کو کم کر سکتا ہے، اگر وہ عام آدمی ہے تو بھی کم از کم وہ اپنے خاندان کا سہارا بن سکتا ہے۔

جگر کی پیوندکاری ایک نیک کام نہیں بلکہ بہت ساری نیکیوں کا دروازہ ہے، دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱-"**تعاونوا على البر والتقوى**" (مائدہ:۲) (نیکی اور تقوی پر ایک دوسرے کی مدد کرو)۔

۲-"**من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعا ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (مائدہ:۳۲) (جس نے کسی آدمی کو قتل کیا جس نے کسی کا قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس نے زمین میں فساد مچایا تھا تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی شخص کی جان بچائی گویا اس نے سب لوگوں کی جان بچائی)۔

۳-"**يرحم الله من عباده الرحماء**" (صحیح مسلم ۶۳۶/۲ دار الحدیث القاہرہ) (اللہ تعالی اپنے مہربان بندوں پر مہربانی فرماتے ہیں)۔

۶-زندہ شخص اپنی آنکھ عطیہ کر سکتا ہے:

زندہ شخص بھی اگر اپنی ایک آنکھ عطیہ کرنا چاہے تو وہ اپنی ایک آنکھ عطیہ کر سکتا ہے، اس لئے کہ یہ ایثار و قربانی ہے، اور اسلام میں ایثار و قربانی کو سراہا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے، "**ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة، ومن يوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون**" (حشر:۹) (وہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو (بات یہ ہے کہ) جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب اور بامراد ہے)۔

اپنے آپ کو بلا مقصد ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں ہے مگر مقصد کے ساتھ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا جائز نہیں

ہے، جنگ اور لڑائی میں خطرے ہی خطرے ہیں، ناک، کان، ہاتھ اور پاؤں کٹ جانے کا ڈر ہے، اور اس سے بھی آگے جان چلی جانے کا بھی ڈر ہے، مگر اللہ تعالی نے مسلمانوں پر قتال کو فرض قرار دیا ہے۔

جس طرح سے قتال بظاہر ناپسندیدہ عمل لگتا ہے اور خود کو ہلاکت میں دھکیلنے کے جیسا محسوس ہوتا ہے مگر اللہ تعالی کے نزدیک وہ بہترین عمل ہے، اس لئے کہ قتال ظلم اور فساد کو ختم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

ٹھیک اسی طرح زندہ انسان کی آنکھ نکالنا اور اسے عیب دار بنانا اچھا نہیں لگتا، مگر اگر یہ کسی بڑے محقق عالم کو یا کسی ایماندار سیاسی لیڈر کو لگادی جائے تو نہ جانے کتنے لوگوں کے دل کی آنکھیں روشن ہوجائیں گی، اور نہ جانے کتنے بے خانماں اور بے سہارا لوگوں کو گھر اور سہارا مل جائے گا۔

ب-مردہ کی آنکھ عطیہ کرنا جائز ہے:

جب زندہ کی آنکھ عطیہ کرنا جائز ہے تو مردہ کی آنکھ عطیہ کرنا بدرجہ اولی جائز ہوگا، اور اس کے دلائل وہی ہیں جو سوال ۵ کے جواب میں تحریر ہوچکے ہیں۔

ج-آئی بینک قائم کرنا جائز ہے:

جب آنکھ عطیہ کرنا جائز ہے تو آئی بینک قائم کرنا بھی جائز ہے، اس لئے کہ اس میں زندہ انسانوں کی مدد ہے اور احسان عظیم ہے، اور اسلام احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**وأحسنوا إن الله يحب المحسنين**" (بقرہ: ۱۹۵) (اور احسان کرو، بے شک اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں)۔

۲-"**تعاونوا على البر والتقوى**" (مائدہ: ۲) (نیکی اور تقوی پر ایک دوسرے کا تعاون کرو)۔

۳-"**يرحم الله من عباده الرحماء**" (صحیح مسلم ۲/۶۳۶) (اللہ اپنے مہربان بندوں پر مہربانی فرماتے ہیں)۔

۴-"**والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه**" (صحیح مسلم ۴/۲۰۷۴) (جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالی اس کی مدد میں لگے رہتے ہیں)۔

آئی بینک کو زندہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ:

زندہ شخص کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ آئی بینک کو اپنی آنکھ کا عطیہ کرے، اس لئے کہ خود اس کو آنکھوں کی ضرورت ہے، اگر وہ دونوں آنکھیں عطیہ کردیتا ہے تو اندھا ہوجائے گا، اور اگر ایک آنکھ بھی عطیہ کرتا ہے تو بھی اس کی بینائی کمزور ہوجائے گی اور اسے دیکھنے میں پریشانی ہوگی، اس لئے اپنے آپ کو نامعلوم شخص کے لئے مشقت اور پریشانی میں ڈالنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔

آئی بینک کومردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ:

اگر مردہ شخص خود وصیت کرے، یا اس کے ورثہ آنکھوں کا عطیہ دینے پر رضامند ہوں تو آئی بینک کو مردہ شخص کے آنکھوں کا عطیہ دینا جائز ہے۔

۷-صرف وصیت کافی ہے:

آنکھ یا جگر حاصل کرنے کے لئے صرف مردہ کی وصیت کافی ہوگی، ورثہ کو چاہئے کہ وہ اپنی مورث کی وصیت کا احترام کریں اس لئے کہ یہ جسم اس کا ہے، اور اس کو اللہ تعالی کی طرف سے دیا گیا ایک عطیہ ہے، اور اس عطیہ کو جائز مصرف میں خرچ کرنے یا نہ کرنے کا اسے اختیار ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**إن الله اشترى من المومنين أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة**" (توبہ:۱۱۱) (بلاشبہ اللہ تعالی نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی)۔

یہاں اللہ تعالی نے لفظ "اشتری" (خرید لیا) کا صیغہ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان اپنی جان کا مالک ہے، ورنہ لفظ "اِشتری" استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اب یہ بات اور ہے کہ مال کی ملکیت اور نفس کی ملکیت میں فرق ہے، مال اللہ کے علاوہ غیروں کو بھی بیچا اور خریدا جا سکتا ہے، مگر انسانی جسم صرف اس خالق کو بیچا جائے گا جس نے اسے پیدا کیا ہے، یہ انسانی جسم خالق کا بے مثال شاہکار ہے، چنانچہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: "**لقد خلقنا الإنسان في أحسن تقويم**" (تین:۴) (ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے)۔

اس لئے انسان کو صرف اس کا خالق ہی خرید سکتا ہے، دوسرا کوئی اور نہیں، مگر انسان اپنے جسم کو ہر اس کام میں لگا سکتا ہے جس میں اس کے خالق کی معصیت نہ ہو۔

۸-دودھ بینک کا قائم کرنا جائز نہیں:

دودھ بینک کا قائم کرنا جائز نہیں ہے، اور نہ ہی اس طرح کے بینکوں کو عوض لے کر یا بلاعوض دودھ مہیا کرنا جائز ہے۔

اس لئے کہ ملاپورم شہر کیرالا کے ایک مشہور اسپتال کے ایک مسلمان ڈاکٹر عبد الرزاق نے مجھے بتایا کہ دودھ مہیا کرنے والی ۹۹ فیصد خواتین اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر دودھ مہیا کرتی ہیں، جب یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ کس بچے نے کس خاتون کا دودھ پیا ہے تو یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ کون عورت کس بچے یا کن بچوں کی رضاعی ماں ہے، جن قوموں میں حرمت رضاعت کا کوئی تصور نہیں ان کے یہاں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، مگر اسلام میں تو حرمت رضاعت بہت اہم مسئلہ ہے، اور

رضاعت کی وجہ سے بہت ساری خواتین سے نکاح حرام ہوجاتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:"**حرمت عليكم أمهاتكم وبناتكم وأخواتكم وعماتكم وخالاتكم وبنات الأخ وبنات الأخت وأمهاتكم التى أرضعنكم وأخواتكم من الرضاعة**" (نساء:۲۳) (حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں، اور تمہاری لڑکیاں، اور تمہاری بہنیں، اور تمہاری پھوپھیاں، اور تمہاری خالائیں، اور بھائی کی لڑکیاں اور بہن کی لڑکیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں)۔

اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:"**يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة**" (صحیح مسلم ۱۰۶۸/۲ رقم الحدیث ۱۴۴۴ محمد فواد الباقی طبع دار الحدیث قاہرہ) (جو کچھ ولادت سے حرام ہوتا ہے وہ سب رضاعت سے بھی حرام ہوجاتا ہے)۔

دسمبر ۱۹۸۵ میں ہی تنظیم اسلامی کانفرنس کے مجلس فقہ اسلامی نے اپنے جدہ کانفرنس میں دودھ بینک قائم کرنے کے عدم جواز کی قرارداد پاس کی تھی، اس قرارداد کے متعلق شام کے مشہور فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

تنظیم اسلامی کانفرنس کے مجلس فقہ اسلامی نے ۱۰-۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۲-۲۸ دسمبر ۱۹۸۵ میں جدہ میں اپنی دوسری کانفرنس منعقد کی تھی، جس میں دودھ بینک پر بھی بحث ہوئی تھی۔

دودھ بینک کے موضوع پر فقہی اور طبی تحقیقات اکیڈمی میں پیش کی گئیں، دونوں تحقیقات پر موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بھر پور مناقشہ اور غور وفکر کے بعد یہ باتیں ظاہر ہوئیں کہ:

۱-دودھ بینک ایسا تجربہ ہے جسے مغربی قوموں نے قائم کیا تھا، پھر تجربہ کے ساتھ اس میں علمی اور فنی اعتبار سے بعض منفی پہلو ظاہر ہوئے جس کی وجہ سے اس کا دائرۂ عمل سکڑ گیا، اور اس کا اہتمام کم ہوگیا۔

۲-اسلام رضاعت کی قرابت کو نسب کی قرابت کی طرح قرار دیتا ہے، اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ رضاعت سے بھی وہی چیزیں حرام ہوتی ہیں جو نسب سے حرام ہوتی ہیں، اور شریعت کے مقاصد کلیہ میں سے نسب کی حفاظت کرنا بھی ہے، اور دودھ بینک اختلاط یا شک کی طرف لے جانے والے ہیں۔

۳-عالم اسلامی کے سماجی تعلقات ناتمام بچے، کم وزن بچے یا مخصوص حالات میں انسانی دودھ کے محتاج بچے کو طبعی طور سے دودھ پلانے جیسے وہ تمام چیزیں مہیا کرتے ہیں، جن کی ان بچوں کو ضرورت ہوتی ہے اور یہی وہ حالت ہے جو عالم اسلامی کو دودھ بینک سے بے نیاز کردیتی ہے۔

اور اس بنا پر اکیڈمی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

۱-اسلامی دنیا میں دودھ بینک قائم کرنا منع ہے۔

۲- دودھ بینکوں سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۵۰۸۵-۸۶، دارالفکر دمشق)۔

دودھ بینک کو نہ دودھ فراہم کرنا جائز ہے اور نہ ہی وہاں سے دودھ حاصل کرنا جائز ہے:

چونکہ دودھ بینک میں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ کون کس بچے کو دودھ پلا رہی ہے، اور جب یہ معلوم نہیں ہو پاتا تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ رضاعت کی وجہ سے کون کس کے لئے حرام ہوا، اور اسلام میں حرمت رضاعت حرمت نسب کی طرح ہے، لہذا دودھ بینک کو نہ دودھ فراہم کرنا جائز ہے اور نہ ہی وہاں سے دودھ حاصل کرنا جائز ہے۔

۹- مادہ منویہ بینک قائم کرنا جائز نہیں ہے:

مادہ منویہ بینک قائم کرنا، یا اس بینک سے مادہ منویہ حاصل کرنا، یا ایسے بینک کو مادہ منویہ فروخت کرنا، یا بغیر قیمت کے بطور ہدیہ مادہ منویہ فراہم کرنا، یہ تمام چیزیں اسلام میں ناجائز ہیں، اسلئے کہ حفظ نسب ضروریات شرع میں سے ہے، اور اسلام میں صرف وہی بچہ حلال ہے جو اپنے شرعی ماں، اور باپ کے نطفہ اور بیضہ سے مل کر پیدا ہو، اور رحم بھی اس کی شرعی ماں کا ہو۔

اگر بیضہ یا نطفہ میں سے کوئی بھی زوجین میں سے کسی کا نہ ہو، یا نطفہ تو زوج کا ہو مگر بیضہ زوجہ کا نہ ہو، یا بیضہ تو زوجہ کا ہو مگر نطفہ زوج کا نہ ہو، یا بیضہ اور نطفہ تو زوجین کا ہو مگر رحم کسی اور کا ہو۔

ان چاروں صورتوں میں جو بچہ ہوگا وہ ولد الزنا ہوگا، نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: **"لا یحل لامرئ یؤمن بالله والیوم الآخر أن یسقی ماءہ زرع غیرہ"** (ابوداؤد ۳/ ۵۳ باب فی وطء السبایا، تحقیق محمد عوامہ مؤسسۃ الریان بیروت، لبنان)۔

(اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے کسی آدمی کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے پانی سے اپنے غیر کی کھیتی کو سیراب کرے)۔

اللہ کے رسول ﷺ نے مادہ منویہ کو پانی سے اور عورت کو یا عورت کی شرمگاہ اور رحم کو کھیتی سے تشبیہ دے کر یہ بتایا کہ مادہ منویہ صرف اور صرف زوج (شوہر) اور بیضہ اور رحم صرف اور صرف زوجہ (بیوی) کا ہونا چاہئے۔

مادہ منویہ بینک سے کسی طرح کا بھی تعاون جائز نہیں ہے:

چونکہ مادہ منویہ بینک میں حفظ نسب کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا اور اسلام میں حفظ نسب ضروریات دین میں سے ہے، اس لئے مادہ منویہ بینک سے کسی طرح کا بھی تعاون جائز نہیں ہے، نہ مادہ منویہ بینک قائم کر سکتے ہیں، اور نہ ہی مادہ منویہ بینک کو بے عوض یا قیمت کے ساتھ مادہ منویہ فراہم کر سکتے ہیں، اور نہ ہی مادہ منویہ بینک سے مادہ منویہ حاصل کرتے ہیں، اور نہ ہی اور کسی طرح کی مدد کر سکتے ہیں، اس لئے کہ یہ تعاون علی الاثم ہے، اس لئے کہ ارشاد خداوندی ہے: **"ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان"** (مائدہ:۲) (اور گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی مددمت کرو)۔

اجزاءانسانی کا عطیہ اور اسلام کا نقطہ نظر

مولانا محمد فاروق دربھنگوی☆

انسانوں کا مقام دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں نہایت ممتاز اور جداگانہ ہے، ان کے ساتھ دیگر جاندار وغیر جاندار کا سا معاملہ کرنا نہ یہ کہ صرف رتبہ انسانی کو گھٹاتا ہے بلکہ خالق کائنات کی کھلی بغاوت ہے، اسی لئے تکلیف احکام میں انسانوں کی جس طرح پوری پوری رعایت کی گئی ہے اسی طرح جان کی حفاظت وصیانت میں بھی بڑی خاص نظر رکھی گئی ہے کہ قطعی حرام امور کی شرط وقید کے ساتھ اجازت دے کران کے نفوس وجان کی شرافت وکرامت کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن ان تمام شرافت و کرامت کے باوجود انسانوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نفوس وجان اور اعضاء وجوارح میں کیف ما اتفق تصرف کرے، بلکہ ان تصرفات میں خالق کائنات کی تابعداری اور اس کے حکم کی تعلیم واجب وضروری ہے، اسی لئے یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ انسان کے لئے اپنے خون کا عطیہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

عام حالات میں عطیہ خون:

تو اس سلسلے میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ عام حالات میں جبکہ کوئی اضطرار نہ ہو خون کے عطیہ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ یہ فعل جس طرح تکریم انسانی کے خلاف ہے، اسی طرح نکلا ہوا خون نجاست غلیظہ بھی ہے جس کا استعمال حالت اضطراری کے بغیر جائز نہیں، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”انما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل به لغير الله فمن اضطر غير باغ ولاعاد فلا اثم عليه“ (سورۂ بقرہ:۱۷۲) (اللہ تعالی نے تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو اور خون کو اور خنزیر کے گوشت کو اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر بھی جو شخص بے تاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہوتا)۔

اسی طرح دوسرے مقام پر مذکورہ محرمات کے ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہے:

☆ جامعہ دارالاحسان مکی مسجد بارڈولی، سورت گجرات۔

”**فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لإ ثم فإن الله غفور رحیم**“(سورۂ مائدہ:۲)(پھر جو شخص شدت کی بھوک میں مبتلا ہوجائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہوتو یقیناً اللہ تعالی معاف کرنے والے ہیں، رحمت والے ہیں)۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:”**ان الحرمة المضافة الی العین یفید عرفا حرمة التصرف فیھا مطلقا إلا ما خصه الدلیل**“ (تفسیر بیضاوی ۱/ ۱۲۳)(یقیناً ایسی حرمت جس کی اضافت عین کی طرف ہو عرف و عادت کے مطابق مطلقا حرمت تصرف کا فائدہ دیتی ہے، الا یہ کہ کوئی دلیل مخصص موجود ہو)۔

مذکورہ نصوص قطعیہ سے معلوم ہوگیا کہ اس طرح کی قطعی حرام اشیاء کا استعمال کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا حالت اضطراری کے علاوہ میں جائز نہیں ہے۔

حرمت اجزاء کی علت:

رہی بات اصل علت کی تو جس کی وجہ سے انسانی اجزاء سے انتفاع کی حرمت ثابت ہوتی ہے تو اس سلسلے میں فتاوی ہندیہ میں دو قول موجود ہیں: ۱-نجاست، ۲-کرامت۔

”**الانتفاع باجزاء الأدمي لم یجز، قیل للنجاسة وقیل للکرامة وھو الصحیح کذا فی جواھر الأخلاطی**“(ہندیہ ۵/ ۴۳۴)۔

پہلی علت کا تقاضا ہے کہ انسان کے اجزاء میں سے صرف اسی جزء سے انتفاع حرام ہو جو نجس ہے، جیسے خون، یا جسم انسانی سے علاحدہ کردہ ٹکڑا خواہ کوئی عضو ہو یا کھال وغیرہ۔

لیکن دوسری علت کا تقاضا ہے کہ انسان کا کوئی بھی جزء خواہ نجس ہو یا نہ ہو قابل انتفاع نہیں، جیسے ناخن، بال، ہڈی دانت وغیرہ، اور فتاوی ہندیہ کی عبارت مذکورہ میں اسی دوسرے قول کو ”ہوالصحیح“ کہہ کر ترجیح دی گئی ہے، اب اگر علت حرمت جزء انسانی کی کرامت مان لی جائے تو اس صورت میں انسان کے جملہ اعضاء وجوارح کے ساتھ ساتھ اس کے تمام اجزاء سے انتفاع ناجائز ہوگا، البتہ اضطرار وضرورت کے وقت خون کے عطیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام اجزاء سے انتفاع ناجائز ہوگا، البتہ اضطرار وضرورت کے وقت خون کے عطیہ کرنے کی گنجائش ہوگی جبکہ دوسرے اعضاء وجوارح کے لینے دینے کی قطعا اجازت نہیں ہوگی، اور وجہ فرق یہ ہوگا کہ خون لینے دینے میں جسم میں کسی کانٹ چھانٹ کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ انجکشن کے ذریعہ لینے اور داخل کرنے کا عمل ہوتا ہے، نیز اسمیں ہونے والی کمی کی تلافی بڑھوتری کے ذریعہ ہوجاتی ہے، جبکہ اعضاء و جوارح سے انتفاع میں جہاں جسم میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت پڑتی ہے وہیں اس میں ہونے والی کمی کی تلافی نہیں ہوتی،

لہذا ضرورت کے وقت خون دینے لینے کی گنجائش ایسی ہوگی جیسے کہ بچوں کو دودھ پلانے کی ضرورت، کہ بچہ کو دودھ پلانے میں انسانی اجزاء سے انتفاع ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے نہ یہ کہ صرف جائز ہے بلکہ کبھی واجب بھی ہو جاتا ہے۔

اور اگر علت اجزاء انسانی کا نجس وحرام ہونا مان لیا جائے تو یہ مسئلہ تداوی بالمحرمات کا ہے، جو ضرورت کے بغیر اگرچہ ناجائز ہے تاہم ضرورت کے مواقع پر اس کی بھی گنجائش ہے، جیسا کہ تفصیل آرہی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عام حالات میں اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ انسانی اجزاء سے انتفاع جائز نہیں، البتہ حالت اضطراری میں اجزاء انسانی میں سے خون سے انتفاع جائز ہے، خواہ علت حرمت نجاست ہو یا کرامت۔

غیر مسلم کو خون کا عطیہ:

رہی بات کہ جب حالت اضطراری میں خون کا عطیہ کرنا اور خون کا لینا دونوں جائز ہیں، تو کیا کوئی مسلم کسی غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان تو انسان ہر غیر موذی جانور کی جان بچانے پر شریعت غرہ نے اجر وثواب کا وعدہ کیا ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ ایک بازاری عورت نے ایسے کتے کو کنویں سے پانی نکال کر پلا دیا جو شدت پیاس کی وجہ سے جاں بلب تھا، اور بے تاب ہو رہا تھا، تو خداوند قدوس نے اس عورت کی مغفرت فرما دی، اس وقت جناب نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ: ''**إن لنا فی البهائم أجرا؟ قال: فی كل ذات كبد رطبة اجر**'' (بخاری شریف رقم ۳۳۲۱، مشکوۃ شریف رقم ۱۹۰۲) (کیا ہم لوگوں کے لئے چوپائے پر احسان کرنے میں بھی اجر وثواب ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر تر کلیجے والے (حیوان) میں اجر وثواب ہے)۔

اس حدیث پاک کے ذیل میں ملا علی قاری علامہ مظہر سے نقل فرماتے ہیں:

"**قال المظهر: فی إطعام كل حیوان وسقیه أجر إلا أن یكون مأمورا بقتله كالحیة والعقرب**" (مرقاۃ ۴/۳۴۹) (مظہر نے فرمایا: ہر حیوان کو کھلانے اور سیراب کرنے میں اجر وثواب ہے، الا یہ کہ اس جانور کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہو، جیسے کہ سانپ اور بچھو)۔

معلوم ہوا کہ مسلمان کسی غیر مسلم کو بھی اس طرح کی حالت اضطراری میں خون دے سکتا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ ایسی اضطراری حالت میں مسلمانوں کا خون دینا اس کی ہدایت اور اسلام کے قریب ہونے کا ذریعہ ہو، البتہ حتی المقدور غیر مسلموں کے خون لینے سے مسلمانوں کو احتراز کرنا چاہئے، تاکہ اس کے کفر وفسق کا اثر بذریعہ خون مسلمانوں میں راہ یاب نہ ہو جائے جیسے کہ دودھ پلانے والی دایہ اگر بدکردار ہو جائے یا عقل سے جاتی رہے یا احمقانہ حرکت کرے تو اس صورت میں

اگرچہ فسخ اجارہ ضروری نہیں، تاہم حضرت قاضی خاںؒ فسخ اجارہ کا حق دیتے ہیں، تاکہ اس دایہ کے دودھ اور حرکتوں سے بچے متاثر نہ ہوجائیں، جیسا کہ فتاوی قاضی خاں میں ہے:

"**واذا ظهرت الظئر كافرة أو زانية أو مجنونة أو حمقاء كان لهم ان يفسخوا الإجارة**"(فتاوی قاضی خاں ۸/۳۸۴۴) (مذکورہ تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ واقعی اضطراری حالت میں خون کا عطیہ کرنا جائز ہے، خواہ مضطر مسلم ہو یا غیر مسلم)۔

بلڈ بینک کو خون کا عطیہ:

البتہ اس بات کی وضاحت باقی رہ گئی کہ جب واقعی اضطراری حالت موجود نہ ہو مگر متوقع اضطراری حالات سے نمٹنے کے لئے ابھی سے خون کی فراہمی کرنی ہو جیسا کہ بلڈ بینکوں میں مختلف گروپوں کے خون کا عطیہ لوگوں سے لیا جاتا ہے، اور اچانک پیش آنے والے حادثات میں اس کا استعمال ہوتا ہے تو کیا اس طرح کی متوقع حالت اضطراری کے لئے خون کا عطیہ درست ہوگا یا نہیں؟

تو اس سلسلہ میں حضرات اکابر کے دو موقف ہیں: ۱- جائز، ۲- ناجائز۔

اکثر اکابرؒ کی کتابوں میں عدم جواز ہی کا قول ہے، ان حضرات کا استدلال اس بات سے ہے کہ خون کا دینا اور اس سے انتفاع کرنا اپنی اصل کے اعتبار سے قطعی حرام ہے، جیسا کہ تفصیل مذکور ہوئی، تاہم جواز ضرورت بمعنی اضطرار کی وجہ سے ہے، اور اضطرار کا تحقق تب ہوگا جبکہ مریض کی جان کا خطرہ ہو، اور یہ خطرہ محض موہوم نہ ہو بلکہ کسی طبیب حاذق کے کہنے کی وجہ سے عادۃً یقینی ہو، تو ایسی صورت میں خون کا استعمال کرنا جائز ہوتا ہے، اور بلڈ بینک کو جس وقت خون کا عطیہ دیا جاتا ہے، اس وقت کسی قسم کی ضرورت واضطرار واقع نہیں ہے، بلکہ متوقع اضطرار کے لئے ہے، اس لئے بلڈ بینک میں خون کا عطیہ دینا درست نہیں ہے، جیسا کہ "**الا ما اضطررتم**" کی قید اس کی دلیل ہے، اور قاعدہ فقہیہ "**الضرورات تبيح المحظورات**" سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، نیز "موسوعہ فقہیہ" میں مقتضائے ضرورت کے مطابق عمل کرنے کے لئے شرط ہے کہ وہ ضرورت فی الوقت متحقق ہو، بعد میں پیش آنے والی نہ ہو۔

"**ويشترط للأخذ لمقتضى الضرورة أن تكون الضرورة قائمة لا منتظرة، (الى قوله) قال الشيخ عميرة: لو كانت الحاجة غير ناجزة فهل يجوز الأخذ لما عساه يطرأ؟ الظاهر لا**"(موسوعہ فقہیہ ۲۸/۱۹۴)۔

(مقتضائے ضرورت پر عمل کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ ضرورت موجود ہو اس کا مستقبل میں انتظار نہ ہو، شیخ عمیرہ

فرماتے ہیں کہ اگر حاجت بروقت موجود نہ ہوتو کیا مستقبل میں پیش آجانے کی امید سے اس پر عمل کرنا جائز ہوگا؟ ظاہر بات یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز نہ ہوگا)۔

معلوم ہوگیا کہ بلڈ بینکوں میں خون کا عطیہ دینا قبل از ضرورت ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، البتہ بعض اکابر نے ایسے موقع پر یہ مشورہ دیا ہے کہ خون عطیہ کرنے والے کا مکمل پتہ وغیرہ لے لیا جائے اور ضرورت کے وقت ان سے خون لیا جائے، جیسا کہ حضرت مفتی عبدالرحیمؒ فرماتے ہیں:

جو نوجوان اپنا خون دینا چاہتے ہیں ان کا نام اور کس گروپ کا خون ہے وہ لکھ لیا جائے اور آئندہ جب کسی مریض کو خون کی ضرورت ہو اس وقت ان نوجوانوں میں سے جس کا مریض سے رشتہ داری یا خصوصی تعلق ہو بقدر ضرورت اپنا خون دے دے (فتاوی رحیمیہ جدید ۵/۲۴۹)۔

لیکن جو لوگ اس طرح کے بینک میں خون دینے کی اجازت دیتے ہیں ان کے سامنے یہ ایک طبی ضرورت ہے، اور جس طرح واقعی ضرورت کے وقت خون کا عطیہ بالاتفاق درست ہے، اسی طرح اس طبی ضرورت کے لئے بھی بلڈ بینک میں خون کا عطیہ دینا درست ہے۔

کیونکہ اچانک حادثات کے واقع ہونے سے بیک وقت کافی مقدار میں خون کی ضرورت پڑتی ہے اور اس وقت اتنے خون کی فراہمی مشکل ترین امر ہے، اور تمام ضرورت مندوں کے متقاضی گروپوں کے خون کا مل جانا تو اور بھی جوئے شیر کے مترادف ہے، لہذا ہر وقت طبی ضرورت ہے کہ خون کی فراہمی کی جائے تاکہ وقت پر پیش آمدہ حالات سے نمٹنا آسان ہو جائے جیسا کہ حضرت مفتی نظام الدینؒ کا یہی موقف ہے (دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی ۳/۷۸)۔

لہذا موجودہ حالات کے اعتبار سے بلڈ بینک کا قیام ایک ضرورت ہے اور اس کے لئے خون عطیہ کرنے کی گنجائش ہے، خواہ بینک قائم کرنے والے مسلم ہوں یا غیر مسلم۔

لیکن خون کا عوض لینا اور دینا دونوں ناجائز ہوں گے، الا یہ کہ بلا معاوضہ خون کا حصول میسر نہ ہو تو عوض دے کر لینا درست ہوگا، لیکن عوض لینے والے کے لئے عوض لینا جائز نہیں ہوگا، جیسا کہ عنایہ میں ہے:

”**وعلى هذا قيل إذا كان لا يوجد إلا بالبيع جاز بيعه لكن الثمن لا يطلب للبائع**“ (عنایہ شرح الہدایہ علی ال ۶/۳۹۱)۔

خون کا عطیہ واجب یا مستحب:

تفصیل سے بات گذر چکی ہے کہ حالت ضروت میں خون کا عطیہ دینا جائز ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی مریض کو

خون کی شدید ضرورت ہو اور اس کا خون ایسے گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ملتا ہو اور اس گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو تو اس پر خون دینا واجب ہوگا یا مستحب یا جائز؟

تو اس مسئلہ کی مکمل تصریح اگرچہ نہیں ملی، تاہم دوسرے قریبی جزئیات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر مریض واقعی مضطر ہو اور ایسی حالت میں ہو کہ اگر خون کا عطیہ نہ کیا جائے تو ہلاک ہو جائے، اور اس گروپ کے خون کا حامل شخص طاقتور اور توانا ہو کہ اگر خون دیدے تو اس پر نہ منفی اثر پڑے اور نہ کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو اس صورت میں اس پر خون کا عطیہ کرنا واجب ہوگا، تاکہ اس کے ذریعہ مضطر کی جان بچ سکے، جیسے کہ شیرخوار بچہ ماں کے علاوہ کسی کا دودھ نہ لیتا ہو، یا والد کے پاس اجرت دایہ کی اجرت پر قدرت نہ ہو، اور ماں دودھ پلانے کی قدرت رکھتی ہو تو بچہ کی حفاظت جان کی خاطر ماں پر دودھ پلانا واجب ہوگا، اسی طرح کبھی ضرورت کے وقت ماں کے علاوہ پر بھی دودھ پلانا واجب ہوتا ہے، جیسا کہ تفسیرات احمدیہ میں ہے:

"ولا يجب الارضاع على الام بل هو مندوب عليها، إلا اذا لم يقبل الصبي غير ثدى أمه أو كان الاب عاجزا عن الاستيجار أو لم يوجد له ظئر فحينئذ يجب على الأم إرضاعه" (تفسیرات احمدیہ ص ۱۰۱)۔

"وفي الشامية: والواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة" (شامی ۵/۴۰۲)۔

اسی طرح اگر کسی کے پاس مال موجود ہو اور وہ خود اس مال کے لئے مضطر نہ ہو تو دوسرے مضطر کو مال دینا اور اس سے اس کی جان کی حفاظت کرنا واجب و ضروری ہے، حتی کہ اگر صاحب مال نے اس مضطر پر مال خرچ نہیں کیا اور وہ مر گیا تو اس کا یہ عمل قتل پر اعانت کے مرادف ہوگا، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"وإن لم يكن صاحبه مضطرا إليه لزمه بذله للمضطر، لأنه يتعلق به إحياء نفس آدمي معصوم فلزمه بذلک، (الى قوله) لان الامتناع عن بذله اعانة على قتل المضطر" (موسوعہ فقہیہ ۲۸/۲۰۳)۔

(اور اگر صاحب مال خود مال کا شدید محتاج نہ ہو تو اس پر مضطر کے لئے مال خرچ کرنا لازم ہوگا، اس لئے کہ اس کے ذریعہ ایک معصوم انسان کی جان کی حفاظت متعلق ہے، لہذا اس پر مال خرچ کرنا پڑے گا، کیونکہ خرچ کرنے سے رک جانا مضطر کے قتل پر اعانت کرنا ہے)۔

لیکن اگر صاحب گروپ کے خون کا عطیہ کرنے سے خود اس کی حالت غیر معمولی خراب ہو جائے اور وہ خود مضطر ہو جائے تو اس وقت خون کا عطیہ کرنا درست نہ ہوگا، کیونکہ اس صورت میں عطیہ دینا اپنے نفس کو اس طرح کے امر خاص کے ذریعہ ہلاکت میں ڈالنا ہے، اور یہ ممنوع ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة"** (بقرہ: ۱۹۵)۔

حضرت امام ابوبکر جصاص رازی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

"وإذا كان كذلک فلا ينبغی أن يتلف نفسه من غير منفعة عائدة على الدين ولا على المسلمين" (احکام القرآن ۱/۳۱۹)۔

اور جب معاملہ ایسا ہے تو مناسب نہیں ہے کہ دین اور مسلمانوں کی طرف لوٹنے والی منفعت کے بغیر اپنی جان کا اتلاف کرے۔

اور اگر خون کا عطیہ کرنے سے غیر معمولی خرابی اور اضطرار پیدا تو نہ ہو لیکن قدر مشقت لاحق ہوتی ہو تو اس صورت میں قاعدہ فقہیہ **"إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتكاب اخفهما"** اور قاعدہ **"الأشد يزال بالأخف"** کی رو سے بھی خون دینا ضروری ہوگا، الا یہ کہ خون دینے سے شدید مشقت کا سامنا کرنا پڑے اگرچہ حالت اضطرار کی نوبت نہ آئے تو پھر وجوب ساقط ہوجائے گا، اور صرف عطیہ خون جائز ہوگا، لیکن خون دینے والے کی یہ مختلف حالتیں ازخود متعین نہیں ہوں گی بلکہ کسی ماہر قابل اعتماد ڈاکٹر کے مشورہ سے ہوں گی۔

چشم وجگر کا عطیہ:

چشم وجگر کے عطیہ اور ان کی پیوند کاری کا مسئلہ کوئی جدید مسئلہ نہیں ہے، بلکہ آج سے بہت دنوں پہلے اس موضوع پر وقت کے چیدہ علماء اور مفتیان کرام کے مابین بحث ہوچکی ہے، اور اسی وقت سے یہ مسئلہ معرض اختلاف میں رہا ہے، جبکہ ضرورت واضطرار کے وقت خون کے عطیہ کا جواز تقریبا اجماعی ہے، جیسا کہ تفصیل مذکور ہوئی، البتہ مسئلہ پیوند کاری کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے بعض جائز اور بعض ناجائز ہے، چنانچہ انسان کے علاوہ کسی بھی حیوان مذبوح یا غیر مذبوح یا کسی دھات، پلاسٹک وغیرہ سے تیار شدہ اجزاء سے پیوند کاری کی گئی تو ضرورت کے وقت بالاتفاق درست و ماذون فیہ ہے، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"كل حيوان حی من الحيوانات التی لا توكل يحل للمضطر قتله بذبح أو بغير ذبح، للتوصل إلى أكله، قال الجصاص عند تفسيره لآيات الضرورة: ذكر الله تعالى الضرورة فی هذه الآيات أو وأطلق الإباحة فی بعضها لوجود الضرورة من غير شرط ولا صفة وهو قوله تعالى: "وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا مااضطررتم إليه" فاقتضى ذلک وجود الإباحة بوجود الضرورة فی كل حال وجدت الضرورة فيها" (موسوعہ فقہیہ ۲۸/۱۹۸)۔

(غیر ماکول حیوانات میں سے ہر زندہ حیوان کا مضطر کے لئے خواہ ذبح کرکے ہو یا بغیر ذبح کے کھانا حلال ہے،

جصاصؒ نے آیت ضرورت کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالی نے ان آیتوں میں ضرورت کا ذکر فرمایا ہے، اور اس کے بعض میں شرط وقید اور کسی صفت کے بغیر صرف ضرورت پائی جانے کی وجہ سے اباحت کو مطلق رکھا ہے، اور وہ اللہ تعالی کا قول "**وقد فصل لکم**" ہے، پس اس آیت کا تقاضا ہر حالت ضرورت کے وقت صرف ضرورت پائی جانے کی وجہ سے اباحت ہے۔

اسی طرح انسان سے علاحدہ کیا ہوا ایسا جزء جس میں دم مسفوح ہو اگرچہ ہمارے حنفیہ کے نزدیک بالاجماع نجس ہے، لیکن اس حصہ کا خود اسی انسان میں استعمال کیا جانا اور پیوند لگانا درست ہے۔ جیسا کہ بدائع الصنائع اور درمختار میں ہے:

"**إن كان المبان جزءا فيه دم كاليد والأذن والأنف ونحوها فهو نجس بالاجماع**" (بدائع ۱/۷۱۳)۔

"**وفي الدر المختار: العضو المنفصل من الحي كميتة كالأذن المقطوعة إلا في حق صاحبه فطاهر وإن كثر، وفي الشامية: اى زاد على وزن الدرهم، فلو صلى به وهو معه تصح صلوته**" (درمختار مع الشامی ۹/۴۵۰) (یعنی بدن انسانی سے علاحدہ کردہ جزء اگر دموی ہو جیسے ہاتھ، کان، ناک وغیرہ تو وہ بالاجماع نجس ہے اور درمختار میں ہے کہ زندہ انسان سے جو عضو علاحدہ کرلیا گیا ہو وہ مردار کے حکم میں ہے، جیسے کٹے ہوئے کان، مگر اس صاحب عضو کے حق میں پاک ہے اگرچہ ایک درہم سے زائد ہو، لہذا اگر اس جزء کے ساتھ نماز پڑھ لے تو نماز صحیح ہوجائے گی)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انسان سے علاحدہ کردہ ایسے اجزاء جن میں دم مسفوح ہو نجس ہونے کے باوجود اسی انسان میں استعمال ہوسکتے ہیں تو انسان کے وہ اجزاء جن میں خون بالکل نہ ہو، وہ اسی انسان میں بدرجہ اولی استعمال ہوں گے، اس لئے کہ اس طرح کے اجزاء کی نجاست اگرچہ مختلف فیہ ہے تاہم راجح یہی ہے کہ وہ طاہر ہیں، لہذا اسی انسان میں استعمال کئے جانے میں کوئی اشکال نہیں، چنانچہ علامہ علاء الدین الکاسانی اختلاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"**وان لم يكن فيه دم كالشعر والصوف والظفر ونحوها فهو على الاختلاف، (الى قوله) فى رواية طاهر وهى صحيحة، لانه لا دم فيها والنجس هو الدم**" (بدائع ۱/۷۱۳) (اور اگر بدن انسانی سے علاحدہ کردہ جزء ایسا ہو کہ اس میں خون نہ ہو جیسے کہ بال، اون اور ناخن وغیرہ تو اس میں اختلاف ہے، ایک روایت میں وہ طاہر ہے اور یہی روایت صحیح ہے، اس لئے کہ اسمیں خون نہیں ہے، اور نجس خون ہی ہوتا ہے)۔

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوگیا کہ کسی انسان کے جزء سے اسی انسان میں پیوندکاری بالکل جائز ہے۔

ایک انسان کے جزء کا دوسرے انسان میں استعمال:

البتہ اہم مسئلہ ایک انسان کے جزء کا دوسرے انسان کے جسم میں استعمال کئے جانے کا ہے، کہ آیا یہ صورت حالت اضطراری میں جائز ہے یا نہیں، تو اس سلسلے میں حضرات علماء کرام اور مفتیان عظام کے تین اقوال ہیں:

۱-مطلقا ناجائز خواہ میت انسان کے جزء کا استعمال دوسرے انسان میں ہو، یا زندہ انسان کے جزء کا۔

۲-میت اور زندہ دونوں کے اجزاء کا استعمال جائز ہے۔

۳-میت کے اجزاء کا استعمال جائز ہے زندہ کے اجزاء کا نہیں۔

اجازت کس کی معتبر ہوگی؟

جب مردہ انسان کے اجزاء سے پیوندکاری کی گنجائش ہوئی تو سوال یہ ہے کہ اس اجزاء کی تحصیل میں اجازت کس کی معتبر ہوگی؟ تو اس سلسلے میں ایک جزئیہ مذکور ہوا کہ مردہ حاملہ عورت کے شکم کو چاک کر کے زندہ بچہ نکالا جا سکتا ہے، اور یہ ایک واضح بات ہے کہ یہاں ولی وارث کی اجازت سے ایسا کرنا ہوگا، یا اس کی عدم موجودگی میں ذمہ دار قسم کے لوگوں کی اجازت سے یہ کام انجام پائے گا، اور جب یہ دونوں قسم کی اجازت ثابت ہوئی تو خود مرنے والا جو بظاہر اپنے جسم کا مالک ہے بدرجہ اولی وصیت کر سکتا ہے۔

دودھ بینک:

دنیا اپنی ظاہری حسی اور مادی اعتبار سے جس قدر روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اسی طرح اس کے شرعی دینی اور روحانی اقدار و مراتب کا تنزل بھی عیاں اور نمایا ہے، اسی لئے آج حیا سوزی کی پورے عالم میں عموما اور مغرب میں خصوصا آندھیاں چل رہی ہیں، جن میں عورتوں کا اپنی محفوظ خلوت گاہوں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ فیکٹریوں، ملوں اور آفسوں کی زینت بن جانا، اور امور خانداری سے یکسو ہو کر اس طرح کے کسب معاش کو فخر جاننا ہے، اسی غیر شرعی تقاضوں کا نتیجہ ہے کہ دودھ بینک کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تاکہ دودھ پلانے اور اس میں مشغول ہونے کی ساری پریشانیوں سے نجات مل جائے اور پوری عیش کوشی والی زندگی میں مخمور رہے، ورنہ دودھ پلانے کے لئے دوسروں سے خدمت لینا یا بچوں کو ان کے حوالہ کرنا کوئی برا نہیں بلکہ قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت ہے جسے ضروری شرطوں کے ساتھ اپنایا جا سکتا ہے۔

بہر حال دودھ بینک کا حکم شرعی جاننے کے لئے حسب ذیل امور کی وضاحت ضروری ہے تاکہ مقصود تک رسائی ہو سکے۔

دودھ صرف غذا نہیں:

چنانچہ نصوص سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خدائے عز و جل نے دودھ کو صرف بچوں کی نشو و نما کا ذریعہ اور ان کی غذا ہی قرار نہیں دی، بلکہ ایک خاص وقت میں پینے کو حرمت مؤبدہ کا ذریعہ بھی قرار دیا ہے، کہ اگر کوئی نوزائیدہ بچہ اپنے مدت رضاعت میں کسی خاتون سے دودھ پی لے تو ہمیشہ کے لئے دودھ پلانے والی حرمت میں حقیقی ماں، اور اس کا

شوہر حقیقی باپ کی طرح ہوجاتا ہے، اسی طرح اس کی صلبی اولاد یا اس سے دوسرے دودھ پینے والے بچے بچیاں حقیقی بھائی بہن کی طرح ہوجاتے ہیں، اور ابدی طور سے رشتہ محرمات میں جڑ جاتے ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وأمھاتکم اللتی ارضعنکم**" (نساء:۲۳)۔

اور جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: "**یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب**" (ترمذی/۱۱۴۶) (رضاعت سے وہ لوگ حرام ہوتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں)۔

اور چونکہ اس دودھ سے بچہ اور مرضعہ کے خاندان کے مابین حرمت نسب کی طرح حرمت رضاعت کا ثبوت ہوتا ہے، اسی لئے کسی مرضعہ کے لئے روا نہیں ہے کہ وہ بلاضرورت اور بدوں شوہر کی اجازت کے کسی دوسرے کے بچہ کو دودھ پلا کر حرمت ابدیہ کا ذریعہ بنے، جیسا کہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

"**والواجب علی النساء أن لا یرضعن کل صبی من غیر ضرورۃ**" (شامی زکریا ۳/۴۰۳)۔

اور ابن نجیم مصری فرماتے ہیں: "**امرأۃ ترضع صبیا من غیر اذن زوجھا یکرہ لھا ذلک إلا إذا خافت ھلاک الرضیع فحینئذ لا باس بہ**" (البحر الرائق ۳/۳۸۷)۔

اسی لئے دودھ پلانے والی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن بچوں کو دودھ پلا رہی ہے ان کے نام ونسب کو مکمل محفوظ رکھے اور اشتہار کے ساتھ ساتھ احتیاطا اپنی مخصوص ڈائری میں ان کی فہرست تیار کرے تاکہ حرمت ابدیہ میں اشتباہ والتباس سے حفاظت ہو، اور مستقبل میں کسی کو حرج نہ ہو، جیسا کہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**والواجب علی النساء ان لا یرضعن کل صبی من غیر ضرورۃ وان فعلن ذلک فلیحفظن او یکتبن کذا سمعت من مشائخ**" (ہندیہ ۱/۴۱۱)، "**وفی الشامیۃ: واذا ارضعن فلیحفظن ذلک ویشتھرنہ ویکتبنہ احتیاطا**" (شامی ۴/۴۰۲)۔

(عورتوں پر واجب ہے کہ وہ بلاضرورت ہر بچے کو دودھ نہ پلائیں اور اگر ایسا کرلیں تو یاد رکھیں یا لکھ لیں، اور شامی میں ہے کہ جب دودھ پلائیں تو اسے محفوظ کرلیں اور اس کی شہرت کریں اور احتیاطا اسے لکھ لیں)۔

مذکورہ عبارتوں سے معلوم ہوا کہ دودھ بچوں کے لئے صرف غذا نہیں بلکہ ایک قبیلہ اور خاندان کے ساتھ جڑ جانے کا ذریعہ بھی ہے جس کی حفاظت وصیانت فریضہ شرعی میں سے ہے۔

حرمت کے لئے دودھ کی مقدار:

اور اس حرمت ابدیہ کے ثبوت کے لئے دودھ کی کوئی خاص مقدار بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ تھوڑا دودھ ہو یا زائد

بہرصورت اس سے حرمت ثابت ہوجائے گی ،صرف شرط یہ ہے کہ بچہ کے جوف تک پہنچ چکا ہو، یہی جمہور ائمہ،حنفیہ اور مالکیہ کا مذہب اور حضرت احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت ہے، اور بہت سے صحابہ کرام اور تابعین عظام اسی کے قائل ہیں، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"فذهب الجمهور الحنفية والمالكية وأحمد فى رواية عنه وكثير من الصحابة والتابعين إلى أن قليل الرضاع وكثيره يحرم وان كان مصه واحدة، فالشرط فى التحريم أن يصل اللبن إلى جوف الطفل"(موسوعہ فقہیہ ۲۲/ ۲۴۴)۔

اسی طرح علامہ علاء الدین کاسانیؒ فرماتے ہیں: **"ويستوى فى الرضاع المحرم قليله وكثيره عند عامة العلماء و عامة الصحابة"**(بدائع ۵/ ۸۳)۔

یعنی عام صحابہؓ اور عام علماء کے نزدیک حرمت رضاعت کے ثبوت کے لئے قلیل وکثیر رضاعت دونوں برابر ہیں اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالی نے اپنے قول "امهاتكم اللتى ارضعنكم" میں تحریم کو اسم "رضاعت" پر معلق کیا ہے، لہذا جہاں کہیں بھی یہی رضاعت پائی جائے گی اس کا حکم تحریم بھی پائی جائے گی، اور یہی مفہوم حدیث پاک: "يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب" کے اطلاق سے بھی واضح ہوتا ہے، البتہ شافعیہ اور حنابلہ کے قول صحیح کے مطابق ثبوت حرمت کے لئے دودھ کی ایک خاص مقدار ضروری ہے، جب تک یہ مقدار نہ پائی جائے گی اس وقت تک تحریم ثابت نہ ہوگی۔

پستان سے پینا ضروری ہے؟

رہی بات کہ کیا حرمت ابدیہ کے ثبوت کے لئے بچہ کا سینہ سے منہ لگا کر پینا ضروری ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرمت رضاعت کے ثبوت کے لئے دودھ کا بچہ کے جوف معدہ میں پہنچنا کافی ہے، خواہ بچہ سینے سے منہ لگا کر پئے یا برتن وغیرہ سے، خواہ اس کی ناک میں ڈالا جائے یا حلق میں ٹپکایا جائے یہی قول حضرت امام شعبی، امام ثوری اور حنفیہ کا ہے، اور حضرت امام احمد بن حنبل کی دو روایتوں میں سے اصح روایت بھی یہی ہے، نیز حضرت امام مالکؒ بھی سینے سے پینے کو ضروری قرار نہیں دیتے ہیں، بلکہ کسی بھی طرح حلق میں ٹپکا دیئے جانے اور جوف تک پہنچ جانے سے ان کے نزدیک بھی حرمت ثابت ہوجاتی ہے، جیسا کہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

"والسعوط كالرضاع وكذلك الجوره واختلفت الرواية فى التحريم بهما فأصح الروايتين ان التحريم يثبت بذلك كما يثبت بالرضاع، وهو قول الشعبى والثورى واصحاب الرائے وبه قال مالك فى الوجور"(مغنی ۹/ ۱۹۶)۔

(ناک اورحلق میں دودھ ٹپکایا جانا ایسا ہے جیسے سینہ سے دودھ پینا، اوران دونوں سے تحریم کے سلسلے میں روایت مختلف ہے، لیکن دوروایتوں میں سے اصح روایت یہ ہے کہ اس سے تحریم ثابت ہوجائے گی، جیسے کہ رضاعت سے ثابت ہوجاتی ہے، یہی شعبی، ثوری اور اصحاب الرائے کا قول ہے، اورحلق میں ٹپکائے جانے کے سلسلے میں یہی قول امام مالک کا ہے)۔

اسی طرح ملک العلماء علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"ویستوی فی تحریم الرضاع الارتضاع من الثدی والاسعاط والایجار"(بدائع ۵/۹۳)، اوراس کی وجہ یہ ہے کہ حرمت رضاعت میں مؤثر دودھ سے غذا کا حاصل ہونا ہے تاکہ اس سے گوشت پوست میں اضافہ ہواورازالہ بھوک کا باعث ہو، اوراس سے مرضعہ اوردودھ پینے والے کے مابین جزئیت ثابت ہوجائے، اور یہ مقصد ناک اورحلق میں ٹپکانے سے حاصل ہے، اس کے لئے پستان سے منہ لگا کر پینا ضروری نہیں ہے، جیسا کہ بدائع الصنائع میں ہے:

"لأن المؤثر فی التحریم هو حصول الغذاء باللبن، وانبات اللحم وانشاز العظم وسد المجاعة، لان یتحقق الجزئیة وذلک یحصل بالاسعاط والایجار، لأن السعوط یصل إلی الدماغ وإلی الحلق فیغذی ویسدالجوع والوجور یصل الی الجوف فیغذی"(بدائع ۵/۹۲)۔

(اس لئے کہ تحریم میں اثر کرنے والی چیز دودھ سے غذا کا حاصل ہونا، گوشت پوست کا بڑھانا اور بھوک کوروکنا ہے، تاکہ (مرضعہ اوررضیع کے مابین) جزئیت متحقق ہوجائے، اور یہ ناک وحلق میں ٹپکانے سے حاصل ہوجاتے ہیں، کیونکہ ناک میں ڈالنے سے دماغ اورحلق تک رسائی ہوتی ہے تو باعث غذا اور مانع بھوک ہوتی ہے، اورحلق میں ڈالنے سے جوف معدہ تک رسائی ہوتی ہے تو وہ باعث غذا ہوتی ہے)۔

البتہ حضرت امام احمد بن حنبل کی خلاف اصح ایک روایت اورعلامہ ابوبکر کا قول مختاراورداؤدظاہری کا مذہب یہ ہے کہ اسعاط وایجار سے حرمت ثابت نہ ہوگی، کیونکہ یہ دونوں صورتیں رضاعت کی نہیں ہیں، اورمؤثر فی التحریم رضاعت ہے، لیکن جواب واضح ہے کہ حرمت کی اصل بنیاددودھ سے گوشت پوست کی بڑھوتری ہے اور یہ جس طرح رضاعت سے ثابت ہوتی ہے اسی طرح ایجارواسعاط سے بھی حاصل ہوتی ہے، لہذا اثبات حرمت میں سب برابر ہیں، چنانچہ موفق فرماتے ہیں:

"والروایة عنه(عن أحمد بن حنبل)لا یثبت التحریم بهما، وهواختیار أبی بکر ومذهب دائود وقول عطاء الخراسانی فی السعوط لأن هذالیس برضاع"(المغنی ۹/۱۹۵)۔

حاصل یہ ہے کہ جمہورعلماء کے نزدیک ثبوت حرمت کے لئے سینہ سے منہ لگا کر پینا ضروری نہیں، بلکہ جوف تک

دودھ کا پہنچنا ضروری ہے، خواہ رضاعت سے ہو یا اسعاط وایجار کے ذریعہ۔

مخلوط دودھ کا حکم:

اگر چند عورتوں کا دودھ مخلوط ہوجائے تو اس سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ اگر ثابت ہوگی تو سبھوں سے ہوگی یا کسی ایک سے؟ تو اس سلسلے میں حضرات ائمہ کا اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک اگر دو عورتوں کا دودھ مخلوط ہوجائے تو جس کا غالب ہوگا صرف اسی سے حرمت ثابت ہوگی، دوسری عورت سے نہیں، اگر دونوں کا دودھ مساوی ہو تو دونوں سے حرمت ثابت ہوگی، جبکہ حضرت امام محمدؒ اور امام زفر فرماتے ہیں کہ جن دو عورتوں کا دودھ مخلوط ہو خواہ کسی کا کم ہو یا زائد یا دونوں برابر ہوں بہرصورت دونوں سے حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی، یہی قول حضرات امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا ہے جیسا کہ علامہ وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

"وقالت المالكية ومحمد وزفر يثبت التحريم من المرأتين جميعا سواء تساوى مقدار اللبنين أو غلب أحدهما الآخر وهو الراجح لدى"(الفقہ الاسلامی ۱۰/۷۲۸۵)۔

اور مغنی میں ہے: **"المشوب المختلط بغيره والمحض الخالص لا يخالطه سواه، (الى قوله) وبهذا قال الشافعي"**(مغنی ۹/۱۹۹)۔

علامہ ابن قدامہ دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

"وان حلب من نسوة وسقيه الصبى فهو كما ارتضع من كل واحدة منهن"(مغنی ۹/۱۹۹)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دو عورتوں کا دودھ متحد الجنس ہے، تو جنس خود اپنے جنس پر غالب نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کا مقوی ومؤید ہوتا ہے، اور جب ایسا ہے تو ہر ایک دودھ میں گوشت پوست پیدا کرنے اور ہڈی وغیرہ میں افزائش کی مکمل صلاحیت ہے، خواہ قلیل ہو یا کثیر، لہذا ہر ایک سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی۔

معلوم ہوا کہ جمہور علماء کے نزدیک ایسا دودھ جس میں چند عورتوں کا دودھ مخلوط ہو اور اسے کوئی بچہ پی لے تو ہر ایک عورت سے حرمت ثابت ہوجائے گی، خواہ قلیل ہو یا کثیر، اور ہماری کتب فقہیہ میں اس موقع پر حضرت امام محمد اور زفر ہی کے قول کو بہت سے فقہاء نے راجح قرار دیا ہے، جیسا کہ عبارت ذیل سے پتہ چلتا ہے:

"فى الدر المختار: قيل هو الأصح: فى الشامية قال فى الغاية وهو اظهر واحوط، وفى شرح المجمع قيل انه الأصح، وفى الشرنبلالية: ورجح بعض المشائخ قول محمد، وإليه مال صاحب الهداية لتاخيره دليل محمد كما فى الفتح"(شامی زکریا ۴/۴۱۲)۔

مذکورہ تفصیلات سے چند امور ثابت ہوئے:

۱-رضاعت صرف بچوں کی غذا نہیں، بلکہ اس سے حرمت ابدیہ کا ثبوت ہوتا ہے اور ایک شیر خوار بچہ دودھ پی کر دوسرے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔

۲-حرمت رضاعت کے لئے جمہور کے نزدیک دودھ کی کوئی خاص مقدار شرط نہیں۔

۳-دودھ کا بچہ کے جوف میں جانا ضروری ہے خواہ رضاعت کے ذریعہ ہو یا اسعاط وایجار کے ذریعہ۔

۴-جمہور کے نزدیک مخلوط دودھ پینے سے ہر ایک عورت سے حرمت ثابت ہوجائے گی۔

۵-دودھ پلانے والی کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام دودھ پینے والے بچوں کے نام ونسب محفوظ رکھے اور اشتہار کے ساتھ ساتھ ان سبھوں کی فہرست اپنی ڈائری میں نوٹ کرلے۔

بحث مذکور سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ بینک میں جو دودھ جمع کیا جاتا ہے اگر اس سے شیر خوار بچے نے اپنی مدت رضاعت میں پی لیا تو ہر ایک دودھ فراہم کرنے والی عورت سے حرمت ثابت ہوجائے گی، اور وہ رضیع تمام دودھ فراہم کرنے والی عورتوں کا فرد خاندان اور محرم ابدی بن جائے گا، اور سارے دودھ پینے والے باہم ایک دوسرے کے ساتھ نسبی اخوت کی طرح رضاعی رشتہ اخوت میں پیرو جائیں گے، خواہ تھوڑی مقدار میں پیئے ہوں یا زائد مقدار میں، لیکن یہ تب ہی ممکن ہوگا جبکہ سبھی معلوم ہوں، اور یہاں اس طرح کا علم نہایت مشکل بلکہ محال ہے۔

لہذا جب دودھ دینے والی تمام عورتیں اور دودھ پینے والے تمام بچے معلوم نہ ہوں گے تو اس صورت میں حرمت کا معاملہ مشتبہ ہوجائے گا، اور یہ معلوم نہ ہوسکے گا کہ کون کون سی عورتیں رضاعی مائیں اور کون کون سے مرد رضاعی باپ بنے، نیز کتنے بچے رضاعی بھائی بہنیں اور کتنے لوگ رضاعی چچا، پھوپھیاں خالائیں اور ماموں بن چکے، اور جب یہ علم نہ ہوسکے گا تو حرمت رضاعت سے متعلق تمام احکام معطل نظر آئیں گے، اور باب نکاح نہایت پیچیدہ اور مشکل ہوجائے گا، اس لئے اس طرح کے بینک کی بالکل اجازت نہ ہونی چاہئے۔

مادہ منویہ بینک:

اسلام ایک فطری مذہب ہے، فطری امور کی رہنمائی کرتا ہے، اور تمام غیر فطری امور سے بچنے، علاحدہ رہنے کی تلقین کرتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"فأقم وجهک للدین حنیفا فطرة الله التی فطر الناس علیها، لا تبدیل لخلق الله ذلک الدین القیم" (روم:۳۰) (تو تم یکسو ہوکر اپنا رخ اس دین حق کی طرف رکھو، اور اللہ کی دی ہوئی قابلیت کی اتباع کرو، جس قابلیت پر

اللہ تعالی نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ تعالی کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے، پس سیدھا راستہ دین کا یہی ہے)۔

اسی فطری تقاضوں میں سے مرد وزن کے مابین کشش کا پیدا ہونا اور ایک دوسرے کا عقد مشروع کے ذریعہ باعث تسکین ہونا ہے، اور یہی طریقہ دونوں کے نتیجہ محبت اور ثمرہ کاوش کے ظہور کا وسیلہ بھی ہے، لیکن اللہ تعالی نے اس رشتہ ازدواجی کو اس نتیجہ کے ظہور کا سبب ضروری قرار دیا ہے تاہم ضروری قرار نہیں دیا کہ اس سے نتیجہ مرتب ہی ہو، بلکہ نتائج کی باریابی اور ثمرات متنوعہ کا انشاء اپنے دست قدرت میں رکھا ہے، اور باضابطہ اپنے مقدس کلام میں اس کا اعلان فرمایا ہے:

”**یهب لمن یشاء اناثا ویهب لمن یشاء الذکور، أویزوجهم ذکرانا واناثا، ویجعل من یشاء عقیما، انه علیم قدیر**“ (شوری:۵۰) (وہ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے، یا ان کو جمع کر دیتا ہے، کہ بیٹے بھی دیتا ہے اور بیٹیاں بھی، اور جس کو چاہے بے اولاد رکھتا ہے، بے شک وہ بڑا جاننے والا بڑی قدرت والا ہے)۔

معلوم ہو گیا کہ مرد وزن کا اختلاط اگرچہ شرع کے مطابق اور فطری طریقے سے ہو، لیکن اس کے نتائج وثمرات کا اظہار ان کے اختیارات میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالی نے اپنے اختیار میں رکھا ہے، وہ اپنے علم وقدرت اور حکمت ومصلحت سے جسے چاہتے ہیں نوازتے ہیں، اور جسے چاہتے ہیں محروم کر دیتے ہیں، البتہ ایسے وقت میں ثمرات کی باریابی اور نتائج کی حصولیابی کے لئے علاج ومعالجہ کی ممانعت نہیں ہے بلکہ حدود شرع میں رہ کر علاج ومعالجہ کی اجازت بھی ہے، اور بہت مرتبہ اس میں کامیابی قدم چومتی ہے، اور نتیجہ صالحہ کا ترتب ہوتا ہے جیسا کہ روزمرہ کے حالات سے ظاہر ہے۔

تاہم وہ تمام طریقے جو مزاج شرع سے دور فطرت سے بیزار ہوں جیسے مادہ منویہ کے بینک کا قیام کرنا اور اس میں بالعوض یا بلا عوض مادہ منویہ جمع کرنا اور اس سے تولیدی نظام تیار کرنا وغیرہ ناجائز وحرام ہیں

چنانچہ اس بینک سے جو مفاسد شرعیہ جنم لیں گے ان کی قدر تفصیل مشت نمونہ از خروارے کے طور پر حسب ذیل ہے:

۱-خلاف فطرت ہونا:

یعنی جب بینک میں جمع شدہ مادہ منویہ تحصیل اولاد کے لئے رحم زن میں رکھا جائے گا تو یہ مادہ اپنے شوہر کا خود اپنی بیوی کے رحم میں رکھا جانا خلاف فطرت ہوگا، کیونکہ اللہ تعالی نے تحصیل نتائج کا فطری طریقہ اپنے مقدس کلام میں کچھ اس طرح فرمایا ہے: ”**فلما تغشاها حملت حملا خفیفا**“ (اعراف:۱۸۹) (جب میاں نے بیوی سے قربت کی تو اس کو حمل رہ

گیا جو اول اول ہلکا سا رہا)۔

۲-نطفہ غیر کو اپنی طرف منسوب کرنا:

یعنی جب بینک کے ذریعہ جمع شدہ غیر کے نطفہ سے استقرار حمل ہوا اور اسی سے بچہ بھی پیدا ہوگا، تو شوہر کا یہ سب جانتے ہوئے اسے اپنی اولاد قرار دینا، یا اس پر سکوت اختیار کرنا جہاں خلاف واقعہ ہوگا وہیں دوسرے کی اولاد کو اپنی طرف منسوب کرنا ہوگا، اور یہ دونوں حرام ہیں، جیسا کہ البحر الرائق میں ہے:

"**الاقرار بالولد الذی لیس منه حرام كالسكوت لاستلحاق نسب من ليس منه**" (البحر الرائق ۴/ ۲۰۴، شامی ۶/ ۱۶۴)۔

(جو عورت (باطل انتساب کے ذریعہ) کسی قوم کے ساتھ اس شخص کو شامل کردے جو اس قوم سے نہیں ہے، تو وہ اللہ کے دین ورحمت کے کسی معتبر درجہ میں نہیں ہے، اور اللہ ہرگز اس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا)۔

۳-خود اپنی محرمہ کا حاملہ ہونا:

جب اس طرح کے بینک کا قیام ہوگا، اور لوگ عوض لے کر یا بلاعوض مادہ منویہ جمع کریں گے تو بہت ممکن ہے کہ اس کا استعمال مادہ فراہم کرنے والے کی قریبی رشتہ دار محرم بھی کرے، تو اس وقت شدت حرمت اور بھی بڑھ جائے گی، اور محرمات کا خود اپنے محرم سے حاملہ ہونا لازم آئے گا۔

۴-بغیر باپ کے بچہ پیدا ہونا:

جب اس طرح کے مادہ منویہ سے بچے پیدا ہونے لگیں گے تو نہ نکاح کی کوئی حیثیت رہ جائے گی اور نہ شوہر کی ضرورت باقی رہے گی، شادی شدہ عورت تو رہنے دیجئے، غیر شادی شدہ بھی بچے لئے پھریں گی۔

لہذا اس طرح کے بینک کا قیام بالکل ناجائز وحرام ہے۔

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ اس طرح کے بینک کا قیام ناجائز وحرام ہے تو اس کے لئے مادہ منویہ کی فراہمی خواہ رضا کارانہ طور سے ہو یا معاوضۃ ہو بالکل ناجائز وحرام ہوگا، اس لئے کہ اسمیں مذکورہ خرابیوں کی اعانت کے ساتھ کرامت انسانی کے خلاف اقدام ہے اور عوض لے کر ایک نجاست کو فروخت کرنا ہے، اور یہ سب ناجائز ہیں۔

☆☆☆

زندہ انسان کے اعضاء کا تبرع
فقہ حنفی کی روشنی میں

مفتی فرید احمد بن رشید کاوی☆

بنیادی بحث:

اعضاء کی پیوندکاری کے احکام کا تعلق دو بنیادی موضوعات سے متعلق ہیں: (۱) مریض، معذور اور محتاج کے لیے دیگر انسانی اعضاء کا استعمال درست ہے یا نہ؟ اور درست ہے تو کن احوال میں درست ہے؟

(۲) جن اعضاء کی مریض ومعذور کو ضرورت ہے، وہ کس طرح حاصل کیے جائیں؟ حالت حیات ہی میں کسی سے خرید کر؟ یا تبرعاً یعنی عطیہ لے کر؟ یا مرنے کے بعد ورثاء سے عطیہ اور تبرع کے طور پر حاصل کرکے؟

جیسا کہ سوال نامہ میں مذکور ہے، پہلا موضوع، اس سے قبل فقہ اکیڈمی انڈیا کے سمینار میں اور دیگر اکیڈمی کے سیمیناروں میں زیر بحث آچکا ہے۔ اور اس وقت سر دست دوسرا موضوع سیمینار میں زیر بحث ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ متبرع کی جانب سے یہ مسئلہ جسم انسانی کی ملکیت اور اس میں تصرف کے اختیار سے متعلق ہے، اس لیے اولاً جسم انسانی کے کل یا جز کی ملکیت کا حکم شرعی دلائل کی روشنی میں معلوم کرلینا بہت ضروری ہے۔

ابتدائی طور پر اس مسئلہ کے دو پہلو ہوسکتے ہیں: اور ہر پہلو دو شقوں پر مشتمل ہے:

۱-(الف) مکمل جسم کی ملکیت باعتبار مال، جس سے انسان کو اپنے کل جسم پر؛ اپنے دیگر اموال کی طرح 'خرید وفروخت کا اختیار' حاصل ہو۔

(ب) یا خرید وفرخت کو چھوڑ کر باعتبار 'صاحب حق' ایسے 'کلی تصرف کا اختیار'، جیسا کہ اموال میں انسان کو حاصل ہے، جس سے انسان کو اپنے کل جسم کو کسی مالی یا غیر مالی مفاد کی وجہ سے تلف وبرباد کرنے کا حق حاصل ہو۔ مثلاً ضائع کرنا یا ہبہ کرنا وغیرہ۔

☆ مدرس جامعہ علوم القرآن، جمبوسر، گجرات۔

۲-(الف)فقط بعض اجزاء جسمانی کی ملکیت باعتبار مال، جس سے انسان کو اپنے جسم کے ایک یا چند اعضاء پر؛ اپنے دیگر اموال کی طرح 'خرید وفروخت کا اختیار' حاصل ہو۔

(ب) یا خرید وفرخت کو چھوڑ کر، باعتبار' صاحب حق' اعضاء جسمانی پر ایسے 'کلی تصرف کا اختیار'، جیسا کہ اموال میں انسان کو حاصل ہے، جس سے انسان کو اپنے کل جسم کو کسی مالی یا غیر مالی مفاد کی وجہ سے تلف و برباد کرنے کا حق حاصل ہو۔ مثلاً ضائع کرنا یا ہبہ کرنا وغیرہ۔

جسم انسانی کی خرید وفروخت یا اس میں تصرف کا اختیار:

[ا] مالیت جسم:

باعتبار مال، مکمل جسم انسانی کی خرید وفروخت یا مکمل جسم پر ایسے تصرف کا اختیار، جس سے انسان کو اپنے کل جسم پر کسی مالی یا غیر مالی مفاد کی وجہ سے تلف و برباد کرنے کا حق حاصل ہو۔ مثلاً ضائع کرنا یا ہبہ کرنا وغیرہ؛ کا حکم قرآن وحدیث اورقواعد شرع اور فقہی عبارات میں واضح طور پر یہی ہے کہ جسم انسانی کی خرید وفروخت درست نہیں۔ چاہے ایک آزاد آدمی دوسرے آزاد کو غلام بنا کر بیچ دے یا آزاد انسان خود اپنی ذات کو غلام بنا کر دوسرے کے ہاتھ میں دے دے، یعنی انسان کسی صورت میں محل بیع نہیں اور نہ انسان کی بیع درست ہے نہ استرقاق۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ کوئی انسان خود کو اپنے جسم کا مختارِ کل سمجھ کر کوئی ایسا تصرف کرے جس سے جسم برباد ہوجائے اور موت واقع ہوجائے، جیسے خود کشی کرلینا وغیرہ۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء کا حقیقی مالک اللہ تعالی ہے، اور انسان کی ملکیت مجازی ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں: **"قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء"** (آل عمران:۲۶)۔

حتی کہ قرآن میں اللہ تعالی کو انسانوں کا بھی مالک قرار دیا گیا ہے: **"قل أعوذ برب الناس ، ملک الناس"**.

اور جن نصوص وآیات میں انسان کو مالک قرار دیا گیا ہے، وہ ملکیت مجازی ہے، مثلاً **"آمنوا بالله ورسوله وأنفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه"** (حدید:۷)۔

اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ انسان جن چیزوں کو اپنا مال سمجھ کر ملکیت کا تصور رکھتا ہے، ان میں بھی جب اس کی ملکیت اس قدر قاصر اور مجازی ہے تو جسم انسانی کا اس کی ملکیت میں نہ ہونا واضح اور متعین ہے۔

جن نصوص اور فقہی عبارات سے انسان کی بیع کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے وہ درج ذیل ہیں: علامہ شامی فرماتے ہیں: **"الآدمی مکرم شرعا وإن کان کافرا فإيراد العقد عليه وابتذاله به وإلحاقه بالجمادات إذلال له"**

(ج:۴،ص:۱۰۵)۔

"**الأدمی مالِک مبتذِل والمال مملوک مبتذَل فأنی یتماثلان**"(تکملہ فتح القدیر:۱۰/۲۰۷)۔

مجلۃ الأحکام العدلیہ میں ہے:"**بیع مالایعد مالا بین الناس والشراء به باطل مثلاً لوباع جیفة أوآدمیاحرا أواشتری بهما مالا فالبیع والشراء باطلان**"(مادہ:۲۱۰)۔

اسی لیے یہ بھی جائز نہیں کہ ایک انسان دوسرے آزاد انسان کو غلام بنا کر فروخت کردے: حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالی کا ارشاد نقل کرتے ہے :

قال الله : " ثلاثة أنا خصمهم یوم القیامة ، رجل أعطی بی ثم غدر و رجل باع حرا فأکل ثمنه و رجل استأجر اجیرا فاستوفی منه ولم یعطه أجره "(بخاری، کتاب البیوع)۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے :

"**إن الله عزوجل إذا حرم علی قوم أکل شیئ حرم علیهم ثمنه**"(کتاب الاجارۃ، باب فی ثمن الخمر والمیتۃ)(یعنی انسان کا گوشت کھانا درست نہیں، تو اس کی بیع بھی درست نہیں)۔

اور یہ بھی جائز نہیں کہ اپنی ذات کو کسی کے ہاتھوں بیچ کر اس کا غلام بن جائے۔

شرح اشباہ میں ہے:"**لا یجوز استرقاق الحر برضاه لما فیه من ابطال حق الله تعالی**"(غمز عیون البصائر)۔

فقہ حنفی کے علاوہ دیگر فقہی دبستان میں بھی انسان کی مکمل بیع کا یہی حکم ہے۔

تصرف کا اختیار:

جن دلائل سے جسم کو ہلاک کرنے والے تصرف کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

"**ولا تقتلوا أنفسکم إن الله کان بکم رحیما**"(نساء:۲۹)۔

حدیث شریف میں ہے:

"**الذی یخنق نفسه یخنقها فی النار والذی یطعنها یطعنها فی النار**"(بخاری شریف، کتاب الجنائز)۔

"**قال لغیره : اقتلنی فقتله یجب الدیة فی ماله فی الصحیح، لأن الإباحة لا تجری فی النفوس و سقط القصاص لشبهة**"(شامی:۱۰/۲۵۵)۔

خودکشی کرنا، یا شفا کے یقین یا گمان غالب کے ہوتے ہوئے علاج نہ کرنا، وغیرہ صورتوں کا حکم اور اس بارے میں

نصوص شرع اور فقہی قواعد وعبارات کی مزید تفصیل فقہ اکیڈمی کے سولھویں سیمینار بہ عنوان ’قتل بہ جذبہ رحم‘ کے مجموعہ مقالات میں بھی موجود ہے۔طوالت کے خوف سے اس کو یہاں نقل نہیں کیا جاتا۔

اپنے جسم پر انسان کی ولایت کی حقیقت:

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جسم انسانی پر اللہ تعالی کی طرف سے انسان کو بظاہر بہت کچھ اختیار اور تصرف کا حق دیا گیا ہے، اور جسم کی حفاظت، بقا اور سلامتی وغیرہ کی ذمہ داریوں میں انسان ہی مسئول ہے، چنانچہ انسان ضرورت کے مطابق اپنے جسم میں قطع وبرید کا حق بھی رکھتا ہے۔حدیث شریف میں ہے:”**بعث رسول الله ﷺ إلى أبى بن كعب طبيباً فقطع منه عرقا ثم كواه عليه، رواه مسلم** “(مشکوۃ شریف، کتاب الطب والرقی) کتب فقہ میں خراب یا زائد عضو کاٹنے کی گنجائش مذکور ہے۔جیسا کہ آگے آئے گا۔

اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو اپنے جسم میں اموال ہی کی طرح تصرف کا حق حاصل ہو۔آخر انسان اگر اپنی ذات سے خارج اشیاء پر مالکانہ حق رکھتا ہے تو پھر اپنی ذات پر کیوں نہیں۔؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسی فکر اور سوچ یا قیاس درست نہیں اس لیے کہ:

(۱) جسم میں تصرف کا جو کچھ اختیار اس کو دیا گیا ہے وہ جسم کی صلاح اور سلامتی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہے، اور یہ اللہ تعالی کا ایک حکم اور فریضہ ہے، نہ انسان کا اپنا حق ملک وتصرف۔

(۲) جسم میں دیا گیا یہ اختیار جسم کے مفاد اور مصلحت کے لیے ہے، تاکہ اس سے خود مستفید ہو سکے، اور اسی مقصد کے لیے مال کو وسیلہ قرار دیا گیا ہے، نہ کہ اس کے برعکس حصولِ مال، زیادتی اموال، اور نفع وتجارت کے لیے جسم کو وسیلہ بنایا جائے۔علامہ بابرتیؒ نے **فأني يتماثلان** سے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(۳) جسم انسانی بھی دیگر اموال کی طرح مال ہوتا تو شریعت کی طرف سے اس باب میں اجمالی وتفصیلی رہنمائی ضرور ہوتی، جس طرح کہ دیگر اموال کے بارے میں موجود ہے اور سلف صالحین سے مالیت جسم انسانی کا تعامل بھی نہیں پایا جاتا، یقیناً یہ اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ جسم انسانی مال نہیں، اور اس کو محل بیع سمجھنا درست نہیں۔

(۴) حنفیہ کے یہاں مال کی تعریف یہ ہے:”**اسم لغير الآدمي خلق لمصالح الآدمي و أمكن إحرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار**“ ، مال کی یہ تعریف جسم انسانی کی مالیت کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔یعنی انسان کا جسم خود اس کے حق میں بھی مال نہیں اور دوسرے کے لیے بھی نہیں۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ:”ایک انسان کو دوسرے انسان پر، یا انسان کو اپنی ذات

پر، خرید وفروخت کا اختیار حاصل نہیں، اور نہ ہی ایسے مالکانہ تصرف کا اختیار ہے، جس سے اپنی ذات کو برباد کردے۔ اسی سے اس مسئلہ کا حکم واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی دوسرے مضطر مریض کے لیے، کوئی صحت مند انسان اپنے پورے جسم کو یا جسم کے ایسے اعضاء ہبہ نہیں کرسکتا، جس سے صحت مند انسان کی زندگی ختم ہو جائے، جیسے دماغ، قلب، جسم کا پورا خون وغیرہ۔ خاص کر علامہ شامی کی یہ عبارت کہ " **لأن الإباحة لا تجری فی النفوس**' 'اس حکم کو بخوبی واضح کرتی ہے۔''

تبرع کے عدم جواز کی کچھ عبارات اوران کا مصداق:

فقہاء حنفیہ کی جن عبارات سے اس مسئلہ میں استدلال کیا جاسکتا ہے، وہ دوطرح کی ہیں:

(۱) جو انتفاع حاصل کرنے والے کے لیے انتفاع کی حرمت کو بیان کرتی ہیں۔ اور غالباً عبارات ایسی ہی ہیں۔ ان میں انتفاع بالاکل کی ممانعت بھی ہے۔ کھال سے انتفاع کو بھی منع کیا گیا ہے، اور بدائع میں میت کے دانت لینے کی بھی ممانعت ہے، اسی طرح گیہوں کے ساتھ پس کر انسان کا دانت آٹا بن جائے تو اس روٹی کا کھانا منع ہے۔ امام محمدؒ سے انسان یا خنزیر کی ہڈی سے تداوی کے حرام ہونے کا قول بھی مروی ہے، وغیرہ۔

(۲) متبرع کی جانب میں تبرع کو منع کیا گیا ہو، ایسی عبارات کم ہیں، اور جو ہیں اس میں مضطر کے اضطرار کو دور کرنے کے لیے اپنا ہاتھ کاٹ کر کھانے دینے کی ممانعت ہے اور کسی دوسرے عنوان سے ممانعت کا حکم بیان کرنے والی عبارات احقر کی نظر سے نہیں گذری۔

ذیل میں ایسی عبارات کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے مقصود یہ ہے کہ ان عبارات سے مریض مضطر کے لیے، کوئی شخص کسی بھی وجہ سے ایثار کرتے ہوئے اپنی کسی جزء کا تبرع کرنا چاہے تو مذکورہ عبارات کے مطابق وہ ممنوع سمجھا جائے گا یا درست؟

مبسوط میں ہے: **"ولو قال له: لأقتلنک أو لتقطعن ید هذا الرجل فقال له ذلک الرجل قد اذنت لک فی القطع فاقطعه وهو غیر مکره لا یسع المکره أن یقطع یده ، لأن هذا من المظالم ولیس المقصود بالفعل أن یأذن فی ذلک شرعاً لأنه یبذل طرفه لدفع الهلاک عن غیره وذلک لا یسعه کما لو رأی مضطراً فأراد أن یقطع ید نفسه لیدفعها إلیه حتی یأکلها ولا یسعه ذلک، فهذا مثله ولو لم یوجد الإذن لم یسعه الإقدام علی القطع فکذلک بعد الإذن"** (مبسوط ۹۱/۲۴)۔

(کسی نے بطور اکراہ قتل کی دھمکی دے کر دوسرے کو کہا کہ فلاں کا ہاتھ کاٹ دے، اس پر فلاں شخص نے بھی اس مکرَہ کو قطع کی اجازت دی، جب کہ اس 'فلاں' پر اپنا ہاتھ کٹوانے کا اکراہ نہ تھا، تو مکرَہ کے لیے اپنی جان بچانے کے لیے اس کا

ہاتھ کاٹنا درست نہیں۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ ’فلاں‘ شخص دوسرے کی جان بچانے کے لیے اپنا عضو تلف کر رہا ہے، جو نادرست ہے، جیسے کہ کسی مضطر کو اس کی جان بچانے کے لیے اپنا ہاتھ کاٹ کر کھانے کے لیے دینا درست نہیں)۔

مطلب یہ ہوا کہ دوسرے کو بچانے کے لیے اپنے عضو کو تلف کرنے کی اجازت بھی معتبر نہیں اور خود اس طرح عضو کاٹ کر مضطر کو دینا بھی درست نہیں۔ اور اس کے بعد علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ ’فلاں‘ شخص اجازت نہ دیتا تو مکرَہ کے لیے اپنی جان بچانے کے لیے ’فلاں‘ کا ہاتھ کاٹنا درست نہ تھا، اسی طرح اجازت کے بعد بھی درست نہ ہوگا۔

مختلف اعضاء کے تبرع کے احکام:

اس امر کے واضح ہوجانے کے بعد کہ: انسان کو اپنے جسم پر حاصل تصرف کے محدود اختیار کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض صورتوں میں بعض اعضاء کے تبرع کی اجازت ہونی چاہیے، اب اس امر میں غور کرنا مناسب ہوگا کہ کون سے عضو میں تبرع درست ہوگا اور کس میں نہیں؟

اس حکم تک پہنچنے کے لیے متعدد طریقوں سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔

جواز اور عدم جواز کے اعتبار سے اعضاء کی تقسیم کرتے ہوئے، یا جسم میں پائے جانے والے اعضاء کی مختلف قسموں کو سامنے رکھ کر یا مضطر اور متبرع کے احوال کے اعتبار سے یا دیگر طریقوں سے؛ البتہ ہمارے لیے مناسب ہوگا کہ حکم شرع، مریض اور متبرع کی ضرورت اور اعضاء کی مختلف حیثیات کو سامنے رکھتے ہوئے اس عنوان کو مختصر مگر واضح اور جامع انداز میں یہاں تحریر کردیں، اس طور پر کہ اس سے سوال نامہ میں درج صورتوں کا حکم بھی سامنے آجائے۔

(۱) خون، لعابِ دہن وغیرہ:

کچھ اجزاء وہ ہیں جن کے تبرع پر اور استعمال پر اتفاق ہے، مثلاً لعاب دہن، عورت کا دودھ اور انسانی خون۔

لعاب دہن کا استعمال تو حدیث شریف سے ثابت ہے (بخاری، طب، رقیۃ النبی ﷺ)۔

عورت کے دودھ سے تداوی کی بھی بعض حضرات نے گنجائش دی ہے (شامی، البیع الفاسد، مطلب فی التداوی بلبن البنت)۔

جب کہ خون کے تبرع کا حکم قرآن وحدیث میں صراحتاً مذکور نہیں؛ البتہ فقہی عبارات سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

متبرع کی جانب سے دیکھا جائے تو ایک تو مناسب مقدار میں اس کا اخراج متبرع کو نقصان دہ نہیں ہوتا۔

دوسرے: حجامت وغیرہ بعض صورتوں میں انسان کا اپنے جسم سے خون نکالنا اس کے لیے مفید بھی ہوتا ہے، چونکہ

خون ایسا جزء ہے، جو جسم میں متجددہوتا ہے، اور مناسب مقدار میں اخراج ہوتو جسم بہت جلد ضروری مقدار میں نیا خون پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح اس میں دفع مضرت کے ساتھ جلب منفعت بھی ہے، اور اتنی بات اخراجِ دم کے جواز لیے کافی ہونی چاہیے۔ پھر اس خون کا استعمال 'تداوی بالمحرم' کا مسئلہ ہے۔ جو کتب فقہ میں مندرج ہے، سابقہ سیمینار میں اس پر گفتگو ہو چکی اور ہماری بحث کا موضوع بھی نہیں۔

غیر مسلم کو خون کا عطیہ:

مسلمان کا مسلمان کے لیے خون کے تبرع کا جواز تو اوپر کی عبارات سے واضح ہے، اسی طرح غیر مسلم کو عطیہ کرنا بھی درست ہوگا۔ بشرطیکہ حربی نہ ہو۔

یہ تبرع اس عمومی احسان اور نیکی میں شامل ہے، جس میں مسلمان کے لیے کافر (غیر حربی) اور مسلمان دونوں برابر ہے۔ مثلاً: "**لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم و تقسطوا إلیھم**"۔ "**ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و أسیرا**"، "**ومن أحیاھا فکأنما أحیا الناس جمیعا**" وغیرہ آیات مطلق ہیں، جس میں کافر و مسلم برابر ہیں۔

اسی طرح اس مسئلہ کو نفلی صدقہ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ جو مسلم و کافر دونوں کو دیا جاسکتا ہے۔

خون اور جسم کے دیگر اندرونی اعضاء پر ایمان و کفر سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے جس طرح غیر مسلم کا خون لینا درست ہے، اس طرح غیر مسلم کو خون دینا بھی درست ہوگا۔

بعض حضرات نے ایک قیاسی دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ ذمیہ بیوی سے جماع کرنا اور اس میں مادہ منویہ کو منتقل کرنا جائز ہے، تو انتقال دم بھی درست ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر قرہ داغی صاحب نے ہی حنابلہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ مسلمان عورت کافر بچے کو دودھ پلاسکتی ہے۔

=معصوم الدم ہونے میں ذمی اور مسلمان دونوں برابر ہیں، چنانچہ مسلمان اور ذمی کے درمیان بھی قصاص ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ جسم و جان اور اطراف میں کفر مساوات اور مواساتِ انسانی سے مانع نہیں۔

تصور کیجئے، اگر مسلمان بیٹے کے کافر باپ کو یا کتابی ماں کو یہ ضرورت پیش آجائے تو یقیناً 'وصاحبھما فی الدنیا معروفا' میں تبرع بالدم کیوں شامل نہ ہو؟

خون کا معاوضہ:

کثرت احتیاج کے پیش نظر بلڈ بینک قائم کرنے اور اس میں خون جمع کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ آگے آرہا

ہے، اس سے واضح ہے کہ کسی بلڈ بینک میں خون کا عطیہ پیش کرنا بھی درست ہے۔

البتہ اگر کسی بلڈ بینک سے خون لینا اس شرط سے مشروط ہو کہ لینے والے اپنے خون کا عطیہ پیش کریں؛ تو یہ بہ ظاہر معاوضہ کی شکل ہے، گرچہ حقیقتاً معاوضہ نہیں۔ کیوں کہ لیا جانے والا اور دیا جانے والا؛ دونوں 'خون' مال نہیں۔ نیز لینے والا 'مریض محتاج' اور بلڈ بینک کی شرط کے مطابق دینے والا عزیز، دونوں الگ شخصیات ہیں۔ مگر مستفدین پر عطیہ کی شرط، اس کو خالص عطیہ ہونے سے خارج کر دیتی ہے، اس لیے بلڈ بینک کی شرط کو پورا کرنے کے طور پر بینک میں خون کا عطیہ دینا درست نہ ہونا چاہیے۔

بلڈ بینک:

خون کے اخراج میں آسانی، متبرع کی جانب میں اس کا نقصان دہ نہ ہونا، حادثات کی کثرت، آپریشن کے جدید طریقے اور مختلف امراض میں اس کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے، اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ بلڈ بینک میں اس کو مجتمع رکھا جائے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جو کوئی چاہے اپنا خون تبرع کرے۔

مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں مضطر کے لیے میت سے (یعنی مال غیر کے علاوہ سے) ضرورت کا اندیشہ ہو تو 'تزود' درست ہے۔

حنفیہ اور جمہور کا مذہب تو یہ ہے کہ مضطر کو سد رمق ہی کھانے کی اجازت ہے، لہٰذا تزود اور ذخیرہ کی اجازت نہ ہو (موسوعہ فقہیہ کویتیہ ۴-۱۹۰)، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بلڈ بینک کی گنجائش بھی نہ ہو۔

البتہ متاخرین علماء نے ضرورت کے پیش نظر اس کی اجازت دی ہے (ملاحظہ ہو: آپ کے مسائل اور ان کا حل: مولانا یوسف لدھیانویؒ، جلد ۴۔ص: ۳۸۵، منتخبات نظام الفتاوی: ۳/ ۷۸)۔

بینک میں خون جمع کرانا قبل از وقت ہونے کی وجہ سے جائز نہیں،'' **وما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها**''، حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے اس کی اجازت دی ہے (مفتی احمد خانپوری صاحب، محمود الفتاوی: ۵/ ۶۷۷)۔

موجودہ دور میں بہت سے پروگرام دکھاوے کے لیے، یا غیر حقیقی ضرورت کے لیے ہوتے ہیں، بلڈ ڈونیشن کے کیمپ میں بھی بہت سی مرتبہ فقط تماشا مقصود ہوتا ہے، لگتا ہے کہ سوال نامہ میں بھی اس کا کچھ اثر آ گیا ہے، لہٰذا اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کیمپ لگانے اور خون جمع کرنے والا ادارہ واقعی اس خون کو عوامی، رفاہی امداد میں استعمال کرتا ہو، دیگر ضمنی مقاصد کو اصلی مقاصد کا درجہ نہ دیا جائے، اور نہ اس غرض سے خون جمع کیا جائے۔

وجوب التبرع بالدم:

کسی مریض کو خون کی شدید اور فوری ضرورت ہو یا مریض کے خون کا گروپ دستیاب لوگوں میں سے کسی ایک ہی کے ساتھ مماثل ہو تو ایسی صورت میں اس شخص پر خون کا عطیہ واجب ہونا چاہیے، جس کے خون سے مریض کی ضرورت پوری ہو سکے، کیوں کہ مضطر کی جان بچانا اجتماعی فریضہ ہے، اور ہر شخص پر اس کی حیثیت کے مطابق یہ فرض عائد ہوتا ہے۔

"ولاخلاف بين أهل العلم متأخريهم و متقدميهم فى وجوب رد مهجة المسلم عند خوف الذهاب والتلف بالشئ اليسير الذى لا مضرة فيه على صاحبه وفيه البلغة ؛ وهذه المسئلة قد جودها اسماعيل بن اسحاق فى الأحكام وجودها أيضا غيره ولها موضع من هذا إن شاء الله نذكرها و نذكر ما فيها من الأثار عن السلف" (قرطبی، سورہ بقرہ، آیت ۱۳۳ / التمہید: ابن عبدالبر)۔

۲-خون کی طرح دیگر اعضاء کا بینک:

خون کے سوا دیگر انسانی اعضاء کو جمع رکھنے، اور محفوظ کر کے بوقت ضرورت استعمال کرنے کے لیے بینک قائم کرنا، بلڈ بینک پر قیاس کر کے درست نہیں ہونا چاہیے۔

"ولكن ينبغى أن لا تلحق أصلاً باقى الأعضاء الآدمية بحكم الدم من حيث الاحتفاظ به بما يدعى اليوم بنوك الدم وذلک لسهولة سحب الدم أولا ولما تطلبه عمليات الاسعاف به من سرعة زائدة ثانياً . وهذا ما لاتستدعيه عمليات الغرس الأخرى فى الأعم الأغلب، كما أن الدم ثالثاً سائل نجس -كالبول والعذرة - يطرح فى كل مكان، ولا تلتمس له الأماكن الطاهرة عادة فحظه فى 'بنوک الدم' ليس فيه إهانة ، بل فيه رفع لمكانته خلافاً لما عليه سائر الأعضاء الادمية التى يشرع دفنها بمجرد نزعها من البدن لما لها من الكرامة الادمية" (حکم الانتفاع بالأعضاء البشریۃ والحیوانیۃ: ۳۷۵)۔

جواز تبرع میں مختلف فیہ اعضاء:

جسم انسانی میں کچھ اعضاء وہ ہیں جو متجدد بھی نہیں اور مزدوج و مکرر بھی نہیں، جیسے ناک، دل، دماغ، وغیرہ، یا مکرر ہیں، مگر ان میں سے ایک عضو انسان کے لیے صحت مند زندگی کے لیے عام احوال میں کافی سمجھا جاتا ہو جیسے: گردہ۔

ان ہی دو قسم کے اعضاء کا تبرع اور استعمال ہی درحقیقت علماء اور محققین کے درمیان مختلف فیہ ہے: ایک فریق کے مطابق ایسے اعضاء کا تبرع، انتقال اور استعمال درست نہیں، چاہے مریض کی جانب میں اضطرار اور ضرورت کا جو بھی درجہ پایا جاتا ہو۔

جب کہ دوسرا فریق ایسے اعضاء کا تبرع اور استعمال فی الجملہ درست مانتا ہے، البتہ شرائطِ انتقال اور قابل استعمال وانتقال اعضاء کی تعیین میں ان کے مابین بھی اختلاف ہے۔

عدم جواز کے قائلین کے دلائل کا خلاصہ اوران کا مختصرا جواب ہم نے آخر مقالہ میں ذکر کیا ہے۔ جب کہ جواز کے قائلین کے دلائل بھی مقالہ میں مذکور ہو چکے ہیں۔

البتہ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس قسم کے (غیر متجد دومنفرد) کون سے اعضاء میں تبرع درست ہے اور کن میں نہیں؟

دو میں سے ایک گردے کا تبرع:

ایک انسان میں دو گردے ہوتے ہیں، عام احوال میں دونوں گردے اپنا وظیفہ ادا کرتے ہیں، مگر قدرتی طور پر دونوں میں اس قدر فعالیت ہوتی ہے کہ ایک گردہ، بلکہ صحت مند انسان کے ایک گردے کی ایک تہائی صلاحیت، جسم کے لیے ضروری وظیفہ کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں کیا مضطر شخص کو، اس کی جان بچانے کے لیے دو گردوں کا حامل صحت مند انسان، اپنے ایک گردے کا تبرع کرے تو، اس کی اجازت ہوگی یا نہ؟

جسم انسانی میں انسان کو کس قدر تصرف کا اختیار ہے، اس کا بیان ہم سابق میں کر چکے ہیں، اس کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہونی چاہیے کہ ایک گردے کا تبرع درست ہو۔

اسی طرح ایک گردے کا تبرع یا اخراج، متبرع کے لیے ضرر رساں نہیں سمجھا جاتا؛ بلکہ ایک گردے کا حامل شخص بھی دیگر صحت مند انسانوں کی سی زندگی گذار سکتا ہے۔ یہ طبی قاعدہ ہونے کے علاوہ عام مشاہدہ کی بات بھی ہے۔

مصالح اور مفاسد کے اعتبار سے دیکھیں تو کسی خاص ضرر اور مفسدہ کے بغیر انقاذ مریض کی مصلحت یہاں حاصل ہوسکتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ اجازت ایسی صورت میں ہی ہوگی جب کہ طبی اعتبار سے گردے کا تبرع اور اس کی پیوندکاری سے مریض کے جاں بر ہونے کا گمان غالب ہو۔ منقول منہ اور منقول اِلیہ کی پیشگی جانچ وغیرہ سے اطباء کو مریض میں اس گردے کے کارآمد ہونے اور منقول منہ کو ضرر فاحش لاحق نہ ہونے کا گمان غالب ہو۔ اگر نیا گردہ لگانے سے مریض کے صحت یاب ہونے کی امید کم ہو تو ایسے مریض کے لیے گردے کا عطیہ درست نہ ہوگا؛ چوں کہ اس صورت میں متبرع کو ضرر فاحش ہے اور الضرر لایزال بمثلہ۔

اسی وجہ سے پھیپھڑے کا تبرع زندہ انسان کی طرف سے درست نہیں۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

دو میں سے ایک آنکھ کا تبرع:

مکرر اور مزدوج اعضاء ایسے ہوں، جن میں سے ایک کا تبرع منقول منہ میں اس عضو کے کارآمد ہونے میں فی نفسہ اثر انداز نہ، مگر مخل اور مضر ہو، یعنی دو میں سے ایک اکائی کا نہ ہونا، آدمی کو اور باقی عضو کو اپنے وظیفہ سے نہ روکتا ہو، پھر بھی ایک صحت مند انسان کی طرح، زندگی اس کے لیے ممکن نہ ہو اور جسمانی اعتبار سے اس اکائی کا نہ ہونا، بڑا نقصان اور عیب سمجھا جاتا ہو، جیسے دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ یا دو ہاتھ میں سے ایک ہاتھ، دو پیر میں ایک پیر، کسی ایسے شخص کو تبرع کرنا جو اس قسم کی عضو کی دونوں اکائیاں نہ رکھتا ہو۔

لجنۃ الفتوی، وزارۃ اوقاف کویت، وزارۃ الشؤون الاسلامیہ از ہر شریف اور کچھ دیگر علماء نے ایسے تبرع کو درست قرار دیا ہے۔

لیکن ضرورت اور اضطرار کے قواعد اور جسم انسانی میں تصرف کے اختیار کا دائرہ دیکھتے ہوئے اس قسم کے تبرع اور تصرف کا ناجائز ہونا واضح معلوم ہے۔

(۱) ایسے اعضاء کا محتاج شخص یعنی منقول إلیہ، قواعد فقہ کی رو سے اضطرار یا حجت کے اس درجہ پر نہیں سمجھا جاتا، جیسا کہ گردے کا محتاج شخص ہوتا ہے۔ انسان ان اعضاء کے بغیر بھی صحت مند طریقے سے زندگی گذار سکتا ہے۔

نیز موجودہ زمانہ میں مصنوعی اعضاء اور کچھ ایسے متبادل بھی دستیاب ہیں، جن کی وجہ سے ایسے شخص کی حاجت اور پریشانی ایک حد تک ختم ہو جاتی ہے یا کم سے کم اس میں تقلیل ہو جاتی ہے۔

(۲) ایسا کرنا یقیناً منقول منہ کے لیے دائمی نفسیاتی تکلیف کا سبب بنے گا۔

(۳) اس میں 'ازالۃ الضرر بمثلہ' ہے۔ جب کہ ضرر کا قاعدہ ہے کہ الضرر لا یزال بمثلہ۔ دریں صورت متبرع یعنی منقول منہ شخص کی ظاہری شکل وصورت خراب ہو جائے گی۔ اور انسان کا جمال ظاہری بدصورتی اور ناقص الخلقی سے بدل جائے گا اور پھر یہ ایسا ضرر ہے جس کا ازالہ بھی ممکن نہیں۔

(۴) گردے کے تبرع کے بعد بقیہ ایک ایک گردے سے گردوں کا کام بحسن وخوبی انجام پاتا ہے۔ اور عامۃ اس میں کوئی نقصان اور خلل نہیں آتا جب کہ ایسے مزدوج اعضا میں سے ایک کا اگر تبرع کر دیا جائے تو متبرع کی جانب میں اس عضو کی منفعت نصف رہ جائے گی اور اب بقیہ عضو سے اس کی ضرورتیں علی وجہ الکمال پوری نہ ہوں گی۔ نہ آنکھ میں، نہ ہاتھ پیر وغیرہ میں۔

(۵) اس طرح کے تبرع کے عدم جواز کی ایک بہترین دلیل دکتور علی قرہ داغی صاحب نے یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ،

درحقیقت ایسا تبرع تبرع بالنفس کی طرح ہے، جو درست نہیں۔ اور یہ اس طور پر کہ ایسے تبرع کے نتیجہ میں یا تو اس عضو کی منفعت بالکلیہ ختم ہوجائے گی، مثلاً ایک آنکھ کے تبرع سے دوسری کی بینائی بھی چلی جائے گی، یا علی الاقل جسم کا ظاہری جمال ختم ہوجائے گا اور جنایت میں ان دونوں صورتوں میں حنفیہ کے یہاں کمال دیت واجب ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت تبرع بالنفس ہے، جو درست نہ ہونا چاہیے (قضایا فقہیہ فی نقل الاعضاء: ۹۸)۔

جن اعضاء کا تبرع درست نہیں:

(۱) جن اعضاء کا تبرع مفضی إلی الموت ہو۔

ایسا تبرع جس سے متبرع کو موت واقع ہوجائے، وہ بالاتفاق حرام ہے، جیسے دل، دماغ، جگر کا تبرع۔ اسی طرح دونوں گردوں کا تبرع، یا ایک ہو تو اسی ایک کا تبرع کردینا؛ وغیرہ۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ خودکشی کے مترادف ہے۔ نفس اور جان اللہ کی ملک ہے، جسے ہلاکت میں ڈالنے کا اسے اختیار نہیں۔

اس تبرع کو جہاد بالنفس پر قیاس کرنا بھی درست نہیں۔ تفصیل گذر چکی۔ ملاحظہ ہو: ص: ۴

(۲) ایسا تبرع جو وظیفہ حیات میں مخل ہو یا ضرر فاحش اور نقصان عظیم کا سبب ہو۔

اس کی چند صورتیں ہیں:

الف: جسم انسانی کا ایسا عضو جو جسم میں ایک ہی ہو، مکرر نہ ہو، جیسے زبان، ناک، آلہ تناسل، وغیرہ۔ ایسے اعضاء کا تبرع درست نہ ہوگا، کیوں کہ متبرع کی جانب میں تبرع کا جواز اور جسم میں تصرف، دوسرے کی ضرورت کو دفع کرنے کے لیے ہے، اور ضرورت کا قاعدہ یہ ہے کہ: "**الضرر لا يزال بمثله**"۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بدن کے منفرد اعضاء کو کاٹنا یا اس کی منفعت ختم کرنا شریعت کی نظر میں تقریباً موت کے برابر ہے۔ چنانچہ ایسی جنایت کی صورت میں دیت کامل واجب ہوتی ہے۔

"**واعلم أن ما لا ثاني بدله في بدن الانسان من الأعضاء أو المعاني المقصودة فيه كمال الدية**" (شامی)۔

معلوم ہوا کہ تبرع کی یہ صورت بھی حقیقت میں پہلی صورت کی طرح درست نہ ہوگی۔

مکرر اعضاء جیسے دونوں کان، دونوں آنکھ وغیرہ کا تبرع کردینا بھی مذکورہ صورت کا حکم رکھتا ہے، اس لیے کہ اس صورت میں بھی اس عضو کی مکمل منفعت فوت ہوجاتی ہے، اور دونوں اکائیوں کے تلف کرنے کی صورت میں کامل دیت

واجب ہوتی ہے۔

ایسا مکرر عضو، جس کے دونوں حصوں کا فعال ہونا لازمی ہو، اس کے ایک حصہ کا تبرع اور انتقال بھی درست نہ ہوگا، جیسے پھیپھڑے، کیونکہ اس صورت میں منقول منہ کو ضرر فاحش لاحق ہوتا ہے، اور صحت مند زندگی فقط ایک پھیپھڑے سے بظاہر ممکن نہیں۔ یہاں بھی الضرر لا یزال بمثلہ کے قاعدے پر عمل کیا جائے گا۔

(۳) موروثی صفات کے حامل اعضاء کا تبرع۔

انسانی جسم میں مرد میں خصیتین اور عورت میں انڈا شے، ایسے اعضاء ہیں، جو موروثی صفات کے حامل سمجھے جاتے ہیں، مثلاً مرد کے خصیہ سے نکلنے والے ہارمونس عورت کے انڈا شے (مبیض) سے نکلنے والے ہارمونس سے مل کر 'حمل' کی ابتدائی شکل میں مجتمع ہوتے ہیں۔ یہ دونوں عضو ہارمونس پیدا کرنے والے بنیادی مواد پر مشتمل ہوتے ہیں، ایسی صورت میں ان اعضاء کو منتقل کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ منقول الیہ میں اس سے بننے والا حمل اسی ہارمونس سے بنا ہے۔

عدم جواز کی ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ تبرع کے نتیجہ میں منقول منہ کا یہ عضو فوت ہو جائے گا اور یہ خصاء ممنوع کے زمرے میں آجائے گا، الضرر لا یزال بمثله کے تقاضے کے مطابق یہ بھی درست نہیں۔

نسب وحسب کی حفاظت، حرمتِ نسب اور مصاہرت، وغیرہ اسلامی احکام کا لازمی حصہ ہے، اور ایسے تبرع کے نتیجہ میں نسب اور حرمت نسب کا پورا نظام مختل ہو کر رہ جائے گا، لہٰذا ایسے تبرع کے عدم جواز میں بھی کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔

دودھ بینک:

دودھ بینک میں دودھ جمع کرانا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی شکل دور حاضر میں رائج ہے، وہ اسلامی اصول اور مقاصد شریعت سے واضح طور پر متصادم ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول اور ناجائز ہے۔

اسلام میں 'رضاعت' کا رشتہ، باجماع امت، نسب کی طرح موجبِ حرمت ہے، اور دودھ بینک سے دودھ حاصل کرنے کی صورت میں اس رشتہ کا، اور حرمت رضاعت کے احکام کا ضائع ہو جانا واضح ہے۔

حنفیہ اور جمہور کے قول کے مطابق 'حرمت رضاعت' کے لیے عورت کے پستان سے براہ راست دودھ پینا (مس الثدی) شرط نہیں، لہٰذا بینک میں محفوظ دودھ پینا بھی حرمت رضاعت کا موجب ہوگا اور پھر دودھ والی عورت مجہول ہونے کے سبب حرمت کا تعلق کس سے ہوگا وہ بھی مجہول ہوگا۔

"وإذا حلب لبن المرأة بعد موتها فأوجر الصبي تعلق به التحريم ، خلافاً للشافعي ، وفي العناية قيد بالموت لأنه لو حلب قبل الموت و أوجر بعد الموت كان قوله كقوله على الأظهر "(ہدایہ-

عنایہ، کتاب الرضاع)۔

جن مصالح کی وجہ سے دودھ بینک کے قیام کو مفید سمجھا جاتا ہے، وہ مصالح ضرورت پڑنے پر براہ راست عورتوں سے دودھ پلا کر بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں، اوراس صورت میں حرمت رضاعت کے احکام میں کوئی ابہام وشک نہ رہے گا۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ دودھ پلانے والی عورتیں میسر نہیں ہوسکتی۔ آج کل بچہ دانی کو کرایہ پر دینے کے لیے عورتیں مہیا ہوجاتی ہیں، ان سے اگر یمنٹ ہوسکتا ہے تو دودھ پلانے کے لیے بھی عورتیں مل سکتی ہیں۔

بچے کے لیے ماں کے دودھ کی افادیت سے انکار نہیں، مگراس کے لیے حرمتِ رضاعت کے ضیاع تک کی رخصت شرعی قواعد کے مطابق نہیں۔

دودھ بینک میں جمع کرانا، معاوضہ لے کر ہوگا یا بلا معاوضہ؛ مگر بینک سے دودھ حاصل کرنا تو یقیناً معاوضہ سے ہی ہوتا ہے۔ اورانسانی اجزاء کی تجارت ہے۔ جو ناجائز ہے۔

جواز کی دو وجہ ہوسکتی ہیں:

(۱) حرمت رضاعت کو 'مس ثدی' سے خاص قرار دیا جائے، جس کے جمہور قائل نہیں۔

(۲) دودھ بینک کے دودھ کی مالک عورت کی جہالت کو حرمت رضاعت کے شک کا موجب قرار دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ شک کی وجہ سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی؛ مگر یہ حکم شک ہوجانے کی صورت میں ہے۔ اس کو دلیل بنا کر ارادۃً اور ابتداءً شکوک وشبہات پیدا کرنے کی اجازت ثابت نہیں ہوتی۔

دودھ بینک کے قیام کے جواز اور عدم جواز کے متعلق، ہمارے سیمینار سے قبل بھی کچھ فتاوی اور فیصلے جواز اور عدم جواز، دونوں طرح کے آچکے ہیں۔ احقر کی نظر میں عدم جواز ہی راجح اور مناسب ہے۔

عملی اعتبار سے دودھ بینک کے دودھ سے استفادہ کیسے ہوا کرتا ہے، یہ پیچیدہ امر ہوگا۔ (۱) کسی بچے کو اپنے پوری مدت رضاعت میں ایک ہی عورت کا دودھ بینک سے دستیاب ہو سکے گا؟ یعنی کسی عورت نے اتنا سارا دودھ جمع کرایا ہوگا؟ (۲) اگر ایک دو قصے میں یہ ممکن بھی ہوا تو کیا بینک والے اس بات کے پابند ہیں کہ ایک بچے کو اسی ایک عورت کا دودھ دیں؟ بینک والے ہر عورت کا دودھ علیحدہ محفوظ رکھتے ہیں یا جانچ کے بعد، دودھ کی کوالٹی متعین کر کے، کوالٹی کے مطابق دودھ کو جمع کر کے محفوظ رکھتے ہیں؟

بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بچہ، اپنی مدت رضاعت میں دسیوں عورتوں کا دودھ پیے گا، اوراس کی شناخت وتعیین بہت دشوار ہے۔

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا نقطہ نظر

مولانا محمد انیس ندوی ☆

۱- کیا کوئی شخص دوسرے متعین فرد کو یا کسی بھی ضرورت مند کو زندگی کے تحفظ یا کسی اہم ترین جسمانی منفعت کے حصول کے لئے اپنے کسی جزء کا عطیہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب سے پہلے کچھ تمہیدی باتوں کا ذکر کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انسانی جسم کے اجزاء کے استعمال کی جو حرمت بیان کی گئی ہے وہ اس کے محترم ومکرم ہونے کی وجہ سے ہے، نہ کہ نجاست کی وجہ سے، تمام کتب فقہ میں تقریباً حرمت کی یہی وجہ بیان کی گئی ہے، کچھ عبارتیں بطور مثال کے درج کی جاتی ہیں:

"شعر الانسان والانتفاع به ای لم یجز بیعه والانتفاع به، لأن الآدمی مکرم غیر مبتذل فلا یجوز أن یکون شئ من أجزائه مهانا مبتذلا" (البحر الرائق ۶/۱۳۳)۔

یعنی انسان کے بال سے نہ فائدہ اٹھانا جائز ہے اور نہ ہی اس کو بیچنا جائز ہے، اس لئے کہ آدمی مکرم ہے نہ کہ قابل صرف کوئی چیز، لہذا جائز نہیں ہے کہ اس کے اجزاء میں سے کسی بھی جزء کو ذلیل کیا جائے اور استعمال کیا جائے۔

"الانتفاع بأجزاء الآدمی لم یجز قبل للنجاسة وقیل للکرامة وهو الصحیح" (ہندیہ ۵/۳۵۴)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی کے اجزاء سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں نجس ہونے کی وجہ سے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی کرامت کی وجہ سے یہ حکم ہے اور یہی صحیح ہے۔

"لم یجز بیع لبن المرأة لأنه جزء الآدمی وهو بجمیع أجزائه مکرم عن الابتذال بالبیع" (البحر الرائق ۶/۱۳۲)۔

عورت کے دودھ کی فروختگی جائز نہیں، اس لئے کہ دودھ انسان کا جزء ہے اور انسان اپنے تمام اجزاء سمیت مکرم ہے، مبتذل نہیں ہے **"حرمة الانتفاع بأجزاء الآدمی لکرامته"** (ہدایہ ۱/۴۱)۔

☆ مدرسہ انوار العلوم، رحیمیہ مسجد، اورنگ آباد، مہاراشٹرا۔

(انسان کے اجزاء سے فائدہ اٹھانا حرام ہے اس کے مکرم ہونے کی وجہ سے)۔

"والآدمی مکرما شرعا وإن کان کافرا فإیراد العقد علیه وابتذاله به والحاقه بالجمادات إذلال"(ردالمحتار ۷/۲۴۵)۔

(انسان شرعی طور پر مکرم ہے اگر چہ کافر ہی کیوں نہ ہو، لہذا اس کا عقد کرنا اور اس کو جمادات کے ساتھ جوڑنا گویا کہ اس کو ذلیل کرنا ہے)۔

"لأن لحم الانسان لا یباح فی الاضطرار لکرامته" (فتاوی شامی ۵/۲۱۵)۔

مذکورہ بالا فقہاء کی تمام عبارتیں اس بات کو ثابت کر رہی ہیں کہ انسان کے اجزاء کے استعمال کی ممانعت محض ان کے مکرم ہونے کی وجہ سے ہے، اس لئے کہ اگر استعمال کی اجازت دی جائے گی تو اس کی تکریم ختم ہوجائے گی اور وہ مبتذل بن کر رہ جائے گا جس کی وجہ سے اس کی اہانت ہوگی۔

دوسری بات اس مسئلہ کے تعلق سے یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں کسی شخص کا دوسرے کو اپنے جسم کے اجزاء دینا انسان کی اہانت میں داخل ہوگا یا نہیں؟ اور کیا اس پہلو سے انسان کی مدد کی جاسکتی ہے جو کہ شریعت میں ایک پسندیدہ فعل بھی ہے؟

اس کی وضاحت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے اپنے مقالے میں کی ہے کہ شارع نے انسان کو مکرم و محترم تو ضرور قرار دیا ہے، اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کی توہین کو جائز نہیں رکھتا، لیکن کتاب وسنت نے تکریم و اہانت کے سلسلے میں کوئی بے لچک حدود مقرر نہیں کی ہیں، اور اہل علم کی نظر سے یہ امر مخفی نہیں کہ نصوص نے جن امور کو مبہم رکھا ہو اور قطعی فیصلہ نہ کیا ہو، تو انسانی عرف وعادت ہی سے اس کی توضیح ہوتی ہے۔

"قال الفقهاء أیضا کل ماورد به الشرع مطلقا ولا ضابط له فیه ولا فی اللغة یرجع فیه إلی العرف کالحرز فی السرقة"(اصول الفقہ الاسلامی ۲/۸۳۱)۔

فقہاء نے کہا ہے کہ جو چیز شریعت میں مطلقا وارد ہوئی ہے اور اس کے لئے شریعت میں نہ کوئی ضابطہ ہے، نہ لغت میں تو اس میں عرف کی طرف ہی رجوع کیا جائے گا، جیسے کہ سرقہ کی حفاظت میں (جدید فقہی تحقیقات، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ۱/۳۱۱)۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اہانت واکرام کے تعلق سے شریعت نے کوئی متعینہ اصول وضابطہ نہیں بیان کیا ہے تو ہر زمانے کے عرف وعادت ہی کی روشنی میں کسی بات کے باعث توہین ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے، اور یہ بات ممکن ہے کہ ایک ہی جز جو کسی زمانہ میں توہین شمار ہو لیکن بعد کے دور میں اس کا شمار توہین میں نہ ہو، فقہاء نے اجزاء انسانی سے انتفاع کو بے شک منع کیا ہے لیکن ممانعت اس لئے تھی کہ اس زمانہ میں انسانی اجزاء سے انتفاع کو اس کی توہین سمجھا جاتا تھا، اور اس

دور میں ایسے طریقے بھی رائج نہیں تھے کہ آسانی کے ساتھ انسان کے اجزاء سے فائدہ اٹھایا جاسکے، اور آج ہمارے زمانہ میں اس عمل کو انسان کی توہین نہیں سمجھا جاتا کہ اگر کوئی شخص اپنا عضو یا جزء کسی اور کو دے دے تو یہ نہ وہ خود اپنی اہانت کا احساس کرتا ہے، اور نہ ہی لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں خاص طور سے یہ بات خون کے تعلق سے پائی جاتی ہے، بلکہ اس کی قدر ومنزلت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے، اور یہ چیز اس کے لئے نیک نامی کا باعث ہوتی ہے اور انسانیت نوازی کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

لہذا احقر کی رائے یہ ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں بطور عطیہ منتقل کیا جاسکتا ہے، اب اس پر قریب قریب اتفاق بھی ہو چکا ہے جبکہ آدمی اس صورت حال سے دوچار ہوجائے کہ اس کی جان یا بدن کے کسی حصہ کا تحفظ خون ہی چڑھانے پر موقوف ہو، کیونکہ فقہاء نے علاج کے طور پر اس کی اجازت دی ہے۔

”**یجوز للعلیل شرب الدم......للتداوی اذا أخبره طبیب مسلم أن شفاء ه فیه**“(ہندیہ ۵/۳۵۵)۔

اور اس کی ایک نظیر یہ بھی ہے کہ خون ہی کی طرح دودھ ایک سیال مادہ ہے اور بچوں کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی فقہاء نے علاجاً عورتوں کے دودھ کو جائز قرار دیا ہے۔”**ولا بأس بأن یسعط الرجل بلبن المرأة ویشربه للدواء**“(الفتاوی الہندیہ ۵/۳۵۵)۔

اب جس کو خون دیا جارہا ہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم دونوں کے لئے دینا جائز ہوگا کیونکہ انسان ہونے کے لحاظ سے تمام انسانوں کے جسم یکساں حیثیت رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمان کی طرح کافر اور پرہیزگاروں کی طرح گنہگاروں کا جوٹھا بھی پاک ہے۔

”**(فسؤرآدمی مطلقا)ولوجنبا أو کافرا أو امرأة......لأن علیه الصلاة والسلام أنزل بعض المشرکین فی المسجد علی ما فی الصحیحین، فالمراد بقوله تعالی: ”إنما المشرکون نجس**“(توبہ:۲۸)**النجاسة فی اعتقادهم**“(فتاوی شامی ۱/۳۸۱)۔

”**سؤر الآدمی طاهرویدخل فی هذا الجنب والحائض والنفساء والکافر**“(الفتاوی الہندیہ ۱/۲۳)۔

یہی خون چڑھانے کا بھی ہے، البتہ اگر اس میں احتیاط ممکن ہو تو بہتر ہے ورنہ ہر قسم کے آدمی کا خون چڑھایا جاسکتا ہے، ہمدردی اور انسانیت کا یہی تقاضا بھی ہے، کہ مسلمان کے اجزاء کے ذریعہ سے کافر شخص کی جان بچالی جائے کیونکہ کتے اور بلی کی جان بچانے میں بھی بخاری شریف کی روایت کے مطابق مغفرت کی بشارت ہے۔”**فسقی الکلب فشکر الله له فغفرله، قالوا: یا رسول الله!وإن لنا فی البهائم أجرا؟فقال: فی کل ذات کبد رطبة أجر**“(رواہ بخاری)۔

ہاں اگر کافر اور مسلم دونوں اس حال میں ہوں کہ خون کی دونوں کو ضرورت ہو تو مسلمان کو ترجیح دی جائے گی، اللہ

تعالی کا ارشاد ہے:"المؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (توبہ:۷۱) (مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں)۔

اسی طرح سے جب مستحق خون مسلمان رشتہ دار ہو یا پڑوسی تو دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں عطیہ کا زیادہ مستحق ہوگا، اس لئے کہ پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی زیادہ تاکید کی گئی ہے، رشتہ داروں میں بھی دور اور قریب کے رشتہ دار میں فرق رہے گا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"أولوا الارحام بعضهم اولى ببعض فى كتاب الله" (الأحزاب/۶) اللہ کی کتاب کی رو سے بعض رشتہ دار بعض رشتہ داروں سے زیادہ حقدار ہیں۔

۲، ۳- جہاں تک تعلق ہے ایسے بینکوں کا جن میں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہیں اور وہ بینک ضرورت کے پیش نظر قائم کئے گئے ہیں، یا پھر مسلمانوں کا خود ایسا بلڈ بینک قائم کرنا؟ تو احقر کی رائے یہ ہے کہ قائم شدہ بلڈ بینک میں خون کا عطیہ دینا یا پھر خود ایسی رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا دونوں شکلیں جائز ہیں، کیونکہ یہ فقہاء کا مشہور اصول ہے؛"إذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه"، اور یہ حدیث پاک بھی گونہ گو اس کی تائید کرے گی کہ "من استطاع أن ينفع أخاه فليفعل" (اپنے بھائی کو جتنا نفع پہنچانا ممکن ہو اتنا نفع پہنچنا چاہئے) لیکن تاجرانہ انداز سے باقاعدہ خون کی خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

۴- دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۱، ۲، ۳/ اپریل ۱۹۸۹ء (دہلی) میں طے شدہ تجاویز میں سے ایک تجویز یہ بھی پاس ہوئی ہے کہ اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ کو نکال لیا جائے تو بظاہر اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر بدلا نہیں گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچالے، اس تجویز پر مولانا محمد برہان الدین سنبھلی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کو چھوڑ تمام شرکاء سمینار بشمول مفتیان کرام دیوبند، امارت شرعیہ، بہار، گجرات، مالیگاؤں اور پنجاب وغیرہ نے دستخط کئے ہیں (جدید فقہی مسائل ۵/ ۹۰)۔

بعینہ یہی شکل اگر خون کے سلسلے میں پیش آجائے بایں طور کہ کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ہی ملتا ہو اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی تندرست شخص موجود ہو اور ماہر اطباء اس کے بارے میں رائے پیش کردیں کہ اگر اس کا خون نکال لیا جائے تو اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور وہ اس مضطر کو دیکھتا ہے کہ اگر اس کو خون نہ دیا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے تو ایسی حالت میں

احقر کی رائے یہ ہے کہ اس کے لئے بلا قیمت خون دے کر اس متاثرہ شخص کی جان بچالینا مستحب ہوگا، کیونکہ اعضاء کے مقابلے میں خون کا دینا زیادہ آسان اور اَہون ہے۔

۵،۶- عضو انسانی کے استعمال میں چونکہ نصوص قطعیہ نہیں ہیں، اور قرآن مجید کی آیت "**ولقد کرمنا بنی آدم**"، یہ آیت شریفہ انسانی عضو کی پیوندکاری کے ناجائز ہونے پر قطعی الدلالہ نہیں قرار دی جاسکتی بلکہ اس آیت میں عموم ہے، البتہ پیوندکاری کے مسئلہ میں مؤید بنایا جاسکتا ہے، لہٰذا آج موجودہ دور کے بعض علماء کرام ومفتیان عظام نے محتاط پہلو کو اختیار کرتے ہوئے عدم جواز کا فتوی دیا ہے، اور بعض نے جواز کا فتوی دیا ہے۔

لہٰذا جگر اور آنکھ کے قرنیہ کے سلسلے میں اصول فقہ کے مشہور قاعدہ "**الضرورات تبیح المحظورات**" (الاشباہ والنظائر) کے مطابق ضرورت واضطرار کی حالت میں جبکہ کسی انسان کی جان جانے کا خطرہ ظن غالب کے درجہ میں ہو تو دوسرے مردہ انسان کے مذکورہ عضو کے ذریعہ سے اس کی پیوندکاری کی گنجائش ملتی ہے تاکہ اس متاثرہ شخص کی جان بچ سکے، لیکن زندہ شخص کے بارے میں یہ اجازت نہیں ہے، کتب فقہ میں اس کے دلائل بکثرت موجود ہیں۔

۱- "**وکذا قطع عضو من أعضائه ولو أذن له المکره علیه فقال للمکرة افعل لا یباح له أن یفعل**" (بدائع الصنائع ۶/۱۸۷)۔

۲- "**خاف الموت جوعا وإن قال له الآخر اقطع یدی وکلها لایحل**" (فتاوی شامی ۷/۴۸۸)۔

۳- "**مضطر لم یجد میتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع یدی وکلها......لایسعه أن یفعل ذلک**" (الفتاوی الخانیة علی ہامش الفتاوی الہندیہ ۳/۴۰۴ کتاب الحظر والاباحۃ)۔

۴- اصول فقہ کا مشہور قاعدہ بھی اس بات کی دلیل بن رہا ہے: "**الضرر لا یزال بالضرر**" (الأشباہ والنظائر)۔

مذکورہ بالا تمام عبارتیں اس بات کو واضح کر دے رہی ہیں کہ جب بھوک سے بے تاب مضطر کو بھی جان بچانے کے لئے کسی زندہ انسان کے بدن کا حصہ اس کی اجازت کے باوجود کاٹنا اور کھانا حلال نہیں تو کسی متعین مریض یا کسی طبی ادارے کو دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے، اور جب مردہ انسان کا گوشت ایک مضطر کھا سکتا ہے تو اس سے ضرورۃ نکال کر کسی شخص کو بطور عطیہ بھی دیا جاسکتا ہے، جس سے اس کی جان بچ سکے، اس لئے کہ ماں اگر مرجائے اور آثار بتاتے ہوں کہ پیٹ میں ابھی جنین زندہ ہے تو فقہاء نے عورت کے آپریشن کی اجازت دی ہے، اور استدلال اس سے کیا ہے کہ یہاں تعظیم میت کو ایک زندہ نفس کے لئے ترک کیا جارہا ہے "**لان ذلک تسبب فی احیاء نفس محترمة بترک تعظیم المیت**" (البحر الرائق ۹/۶۷۳)، اسی اصول سے یہ مسئلہ بھی تعلق رکھتا ہے کہ مضطر کسی انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے کھا سکتا ہے، اس لئے

کہ زندہ کی حرمت مردہ سے بڑھ کر ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ ایسا کرنا میت کی حرمت کے منافی ہے، جس کی شریعت اسلامیہ نے رعایت کی ہے، حدیث میں آیا ہے: "**كسر عظم الميت ككسر عظم الحي**" (مردہ شخص کی ہڈی توڑنا زندہ شخص کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے)، اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ میت کے جسم کے عضو کا استعمال کرنا اس کی شرعی حرمت کے منافی نہیں ہے، عضو نکالنے کے باوجود اس کے جسم کی حرمت محفوظ رہے گی، اس کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی، زندہ شخص کے جسم کی طرح اس کے جسم کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے عضو حاصل کیا جائے گا، اور حدیث میں ہڈی توڑنے سے منع کیا گیا ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ میت کو مثلہ نہ کیا جائے اور اس کو مسخ نہ کیا جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ جنگوں میں کیا کرتے تھے اور اب بھی ایسا کیا جاتا ہے، اسلام اسے ناپسند کرتا ہے۔

۷- اب جبکہ مردہ شخص کے اعضاء کے استعمال کی گنجائش ہے تو اس مردہ شخص نے خود زندگی میں اس کی اجازت دی ہو اس لئے کہ من وجہ وہ جسم کا مالک ہے نیز مرنے کے بعد اس کے ورثہ کا بھی اس پر راضی ہونا ضروری ہوگا۔

۸- اسی طرح ہم جب موجودہ دنیا کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں خاص طور پر مغربی ممالک کی طرف تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان کا دودھ بھی ایک تجارت بن گیا ہے، ملک بینک قائم کردیئے گئے ہیں، اور خواتین اپنے دودھ کو وہاں پر جمع کرتی ہیں، اور انہیں معاوضہ بھی فراہم کیا جاتا ہے، اور پھر یہی دودھ ضرورت مند بچہ کو دے کر اس سے معاوضہ وصول کیا جاتا ہے، اب یہی رجحان ہمارے ملک ہندوستان میں بھی بڑھ رہا ہے، اور یہاں بھی اس طرح کے بینک قائم ہونے کی امید ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے بینک میں خواتین کا دودھ مہیا کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ تو فقہاء کی عبارتیں ہمیں ایسے بینک میں خواتین کا دودھ مہیا کرنے کی اجازت نہیں دیتیں، چاہے یہ عمل عوض کے ساتھ ہو یا پھر بلاعوض کے ہو، کیونکہ انسان کا ہر ہر جزء مکرم ومحترم ہے، اس کی خرید وفروخت سے فقہاء نے منع کیا ہے، اس لئے کہ بیع کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "**مبادلة المال بالمال بالتراضي**"، یعنی طرفین کی رضامندی سے ایک مال کا دوسرے مال سے بدلنا، اور صحابہ کرامؓ کا اس بات پر اجماع ہے کہ دودھ مال نہیں ہے کہ اس کو خرید وفروخت کے دائرہ میں شامل کیا جائے۔

"**ولنا أن اللبن ليس بمال فلا يجوز بيعه والدليل على أنه ليس بمال اجماع الصحابة رضي الله عنهم**" (بدائع الصنائع ۴/ ۷، ۳۳) (بیشک دودھ مال نہیں ہے، لہذا اس کی بیع بھی جائز نہیں ہے اور دودھ کے مال نہ ہونے کی دلیل "صحابہ کرامؓ کا اجماع" ہے)۔

نیز اس کی خرید وفروخت کی ممانعت اس کے مکرم ومحترم ہونے کی وجہ سے بھی ہے، کیونکہ انسان کے تمام اجزاء مکرم

ومحترم ہیں، ان کی خرید وفروخت کی اجازت دینا گویا ان کوشئ مبتذل بنانا ہے جس کی وجہ سے ان کا احترام باقی نہیں رہے گا۔

”**والآدمی بجمیع أجزائه محترم مکرم ولیس من الکرامة والاحترام ابتذاله بالبیع والشراء**“ (بدائع الصنائع ۴/۳۳۸) (انسان اپنے تمام اجزاء کے ساتھ مکرم ومحترم ہے، خرید وفروخت کے ذریعہ اس کے لین دین احترام کے خلاف ہے)۔

”**لم یجز بیع لبن المرأة لأنه جزء الآدمی وهو بجمیع أجزاء ہ مکرم مصون عن الابتذال بالبیع**“ (البحر الرائق ۶/۱۳۲) (عورت کے دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں، اس لئے کہ دودھ انسان کا جزء ہے اور انسان اپنے تمام اجزاء سمیت مکرم ہے، مبتذل (قابل صرف) نہیں ہے)۔

”**لا یجوز بیع لبن امرأة سواء کانت حرة أو أمة ولو بعد الحلب، لأنه جزء الآدمی وهو بجمیع أجزائه مکرم مصون عن الابتذال بالبیع**“ (مجمع الأنہر ۳/۸۵)۔

(کسی عورت کے دودھ کی بیع جائز نہیں، عورت چاہے آزاد ہو یا پھر باندی ہو، وہ دودھ کو چھاتیوں سے نکال کر بیع کرے یا بغیر نکالے ہوئے، کیونکہ عورت کا دودھ انسان کا ایک جزء ہے اور انسان کے تمام اجزاء مکرم ہیں نہ کہ مبتذل)۔

علامہ شامی نے بھی عورت کے دودھ کی خرید وفروخت کو بیع فاسد میں شمار کیا ہے اور فرمایا کہ کسی عورت کا دودھ بیچنا جائز نہیں ہے، چاہے وہ دودھ چھاتیوں سے نکال کر کسی برتن میں رکھا ہوا ہو یا پھر وہ دودھ کسی باندی کا ہو، کیونکہ وہ انسان کا جزء ہے اور اخیر میں فرمایا کہ یہی قول سب سے زیادہ نمایاں بھی ہے ”**لبن امرأة ولو وعاء ولو أمة علی الأظهر لأنه جزء آدمی**“ (فتاوی شامی ۷/۲۶۴)۔

لہذا فقہاء کی مذکورہ عبارتوں کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ ایسے ملک بینک میں کسی خاتون کا اپنے دودھ کی خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے، عورتوں کا ملک بینک میں دودھ مہیا کرنے کے سلسلے میں عدم جواز کا جو پہلو ہے اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر موجودہ دور میں اس کی اجازت دے دی بھی گئی تو حرمت رضاعت کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہمارے سامنے کھڑا ہوجائے گا جو نص قطعی سے ثابت ہے جس میں بالکل بھی تاویل کی گنجائش نہیں ہے اور فقہاء نے حکم یہ بیان کیا ہے کہ اگر دو عورتوں کا دودھ آپس میں ملا دیا جائے اور اس کو کوئی بچے پی لے تو صحیح قول کے مطابق دونوں سے حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی۔

”**إذا اختلط لبن امرأتین تعلق التحریم بأغلبهما عندهما، وقال محمد: تعلق بهما کیفما کان......وهو روایة عن أبی حنیفة قال فی الغایة: وهو أظهروأحوط، وفی شرح المجمع: قیل انه**

الأصح"(البحر الرائق ۳/۳۹۸)اس عبارت میں بھی امام محمدؒ کے قول کو ہی قول اُصح کہا گیا ہے۔

اس لئے احقر کی رائے یہ ہے کہ بلاعوض، بطور عطیہ بھی ایسے بینک میں خواتین کا دودھ دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ مذکورہ دلائل کی روشنی میں جن جن عورتوں کا دودھ اس میں ملا ہوگا، ان تمام عورتوں سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی اور جو بچہ بھی اس دودھ کو پیئے گا وہ سب عورتیں اس کے لئے حرام ہوں گی، اور ایسی صورت میں نسب محفوظ نہیں رہے گا، بلکہ خلط ملط ہوجائے گا کہ پتہ لگانا مشکل ہوگا اور لوگ انجانے میں رضاعی بھائی بہنوں سے نکاح کریں گے اور حرام کے مرتکب ہوں گے، نیز مغربی ممالک کے اس عمل کے پیچھے ممکن ہے کہ یہ سازش پوشیدہ ہو کہ مسلمانوں کے نسب کو اس طرح خلط ملط کر دیا جائے کہ تمیز ممکن نہ ہو اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زنا کاری جیسے فعل بد میں ملوث رہیں، اور ان کا امتیاز ختم ہوجائے۔

اسی لئے عورتوں کو واجبی حکم دیا گیا ہے کہ وہ بغیر ضرورت ہر بچہ کو دودھ نہ پلائیں اور اگر ایسا فعل ان سے سرزد ہوگیا ہے تو وہ اس کو یاد رکھیں یا پھر لکھ لیں"**الواجب علی النساء أن لا یرضعن کل صبی من غیر ضرورة، وإن فعلن ذلک فلیحفظن أو یکتبن**"(الفتاوی الہندیہ ۱/۳۴۵)۔

گویا یہ حکم بھی ایسی جگہوں میں دودھ جمع کرنے سے منع کر رہا ہے، رہی بات ضرورت مند بچوں کی تو کسی متعینہ عورت سے اس کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے اور ایسے موقع سے کوئی عورت انکار بھی نہیں کرتی ہے، اور بالفرض اگر انکار بھی کردے تو اس دور میں ڈبوں کے دودھ کے ذریعہ سے لوگوں کے لئے مزید سہولیات فراہم کردی گئی ہیں، ہم ان سے بھی اپنے بچوں کی ضرورتوں کو پوری کر سکتے ہیں اور ایسے ملک بینک کے مخلوط دودھ سے بچ سکتے ہیں۔

۹- نسب کی حفاظت انسان کا فطری جذبہ ہے اچھی نشو ونما والے تمام علاقوں کے لوگوں میں دو باتیں ضرور پائی جاتی ہیں ۱- لوگ باپ دادا کی طرف اپنی نسبت پسند کرتے ہیں اور اگر کوئی اس نسبت میں طعن کرے تو وہ اسے ناپسند کرتے ہیں، ۲- ہر کوئی ایسی اولاد کا خواہش مند ہوتا ہے جو اس کی طرف منسوب ہو اور اس کے بعد وہ اس کی قائم مقامی کرے، اس کے لئے لوگ انتہائی کوشش کرتے ہیں۔

لہذا دنیا جہان کے تمام لوگوں کا یہ اتفاق بلا وجہ نہیں ہوسکتا ہے بلکہ لوگ اس پر اس لئے متفق ہیں کہ یہ دونوں مقاصد فطری ہیں، انسانوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں، اور آسمانی شریعتوں کا مدار تین باتوں پر ہے، ان میں سے ایک یہی ہے کہ وہ تمام مقاصد جو فطری ہیں اور جن میں مناقشہ ہوتا ہے اور جھگڑا ہوتا ہے، ان کو باقی رکھا جائے رائیگاں نہیں کیا جائے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی بات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ:"**مبنی شرائع اللہ علی ابقاء ھذہ المقاصد التی تجری مجری الجبلة وتجری فیھا المناقشة والمشاحة**"(رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ ۵/۱۸۱)، یعنی

شریعت فطری مقاصد کو پامال نہیں کرتی، اوران میں مناقشہ اور مخالفت ہوتی ہے، یعنی ایسے مقاصد کو شریعت باقی نہیں رکھے گی تو فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔

لہذا ہر وہ عمل جس کی وجہ سے نسب میں اختلاط ہوجائے اور نسب آپس میں خلط ملط ہو کے رہ جائے شریعت نے اس کو صراحتا منع فرمایا، زنا کی ممانعت کی اصل وجہ یہی اختلاط نسب ہی ہے، اس سلسلے میں صریح نص موجود ہیں، آپ ﷺ نے ارشادفرمایا، رویفع بن ثابت انصاریؓ کی روایت ہے:"**لا یحل لامرئ یؤمن باللہ والیوم الآخر أن یسقی ماء ہ زرع غیرہ**"(مشکوۃ المصابیح ۲/۲۹۰) (خدا وآخرت پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی سیراب کرے)۔

نیز اختلاط نسب کو ہی بچانے کے لئے شریعت نے استبراء کا حکم دیا ہے، حضرت مالکؓ کے حوالے سے حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ "**کان یأمرباستبراء إلا ماء بحیضة إن کان ممن تحیض......وینھی عن سقی ماء الغیر**"(مشکوۃ المصابیح ۲/۲۹۰) (حضور ﷺ حائضہ باندی کوایک حیض کے ذریعہ استبراء کا حکم فرمایا کرتے تھے، اور آپ ﷺ غیر کے پانی کو سیراب کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے)۔

اسی اختلاط نسب سے حفاظت کے لئے ایک مرد کی زوجیت سے نکلنے کے بعد وسرے مرد کی زوجیت میں جانے کے لئے "عدت" ضروری قرار دیا گیا ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:"**منھا معرفة براء ة رحمھا من ماء ہ لئلا تختلط الانساب فان النسب احدما یتشاح بہ و یطلبہ العقلاء وھو من خواص نوع الانسان ومما امتازبہ من سائر الحیوان**"(رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ ۵/۱۶۹)۔

عدت کی مصلحتوں میں سے یہ ہے کہ اس کے ذریعہ عورت کے رحم کا شوہر سابق کے مادہ سے خالی ہونا معلوم ہوتا ہے، تاکہ نسب میں اختلاط نہ ہو، اس لئے کہ نسب وہ چیز ہے جس کی خواہش کی جاتی ہے اور عقلاء جس کے طلب گار ہوتے ہیں، جو انسان کی خصوصیت ہے اور جس کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے۔

لہذا مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ کسی مرد یا خاتون کا بینک اور بینک کا ضرورت مند کسی مرد و خاتون کو تولیدی صلاحیت کے حامل جرثومے والے مادہ منویہ اور تولید کے لائق بیضے فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کرنا جائز نہیں ہے، اور اس طرح اس کے بینک وغیرہ قائم کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ایسی صورت میں نسب آپس میں خلط ملط ہوجائے گا، لہذا اجنبی مرد وعورت کے مادے کے اختلاط کی تمام صورتیں گناہ ہوں گی اور حکم کے اعتبار سے "زنا" کے درجے میں ہوں گی، اگرچہ حد زنا ان پر لاگو نہیں کی جائے گی۔

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف

مولانا محمد ظفر عالم ندوی ☆

۱- خون انسان کا جزء ہے، اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس لئے اس کا اصل تقاضہ یہ ہے کہ عام حالات میں ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا حرام ہو، لیکن اضطراری حالات میں اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو خون کا عطیہ دے سکتا ہے، اسی طرح غیر مسلم کو بھی انسانی ہمدردی کی بنیاد پر خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے اور مسلم وغیر مسلم کے درمیان اس مسئلہ میں فرق کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے، چنانچہ مبسوط میں موجود ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ کوئی مسلم کسی کافر دودھ پلانے والی عورت کو اجرت پر رکھے۔

"ولابأس بأن يستأجر المسلم الظئر الكافرة الخ" (المبسوط للسرخسی ۱۵/ ۱۲۷)۔

جب دودھ کے مسئلہ میں اس توسع کو گوارا کیا جاسکتا ہے تو ایسے مواقع پر جہاں انسان طبی اعتبار سے اضطرار کے درجہ کو پہنچ گیا ہو بدرجہ اولی جواز کا پہلو نکلتا ہے، اسی طرح خون کے عطیہ کرنے کا جواز بھی معلوم ہوجاتا ہے اس مسئلہ میں مشہور حنفی فقیہ مفتی شفیعؒ نے بڑی عمدہ تحقیق معارف القرآن میں پیش فرمائی ہے، مناسب ہے کہ ان کی یہ تحریر یہاں درج کردی جائے:

مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ: اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی خون، انسان کا جزء ہے، اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے لئے جسم میں داخل کرنا دو وجوہ سے حرام ہو: اول اس لئے کہ اعضاء انسان کا احترام واجب ہے اور یہ اس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے، لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعت اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوئے، اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے میں اعضاء انسانی کی کانٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، انجیکشن کے ذریعہ خون نکالا

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اور دوسرے کے بدن میں داخل کیا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہوگئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کانٹ چھانٹ کرنکلتا ہے، اور دوسرے انسان کا جزء بنتا ہے اور شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا ہے، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے، طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رزق مہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسرے عورت سے دودھ پلوانے یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دے کر ان کو دودھ پلوائے، قرآن کریم میں اس کی واضح صراحت موجود ہے۔

"**فإن ارضعن لكم فاتوهن اجورهن**"، خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزء انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورۃ اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے اور بطور علاج بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے: "**ولا بأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء**" (المغنی کتاب الصید ۸/ ۶۰۲) اور مغنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے۔

اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے اور جزء انسانی ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہے اور خون ناپاک تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزء انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ رہی صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج ودوا کے معاملے میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی اجازت بھی دی ہے، اس لئے انسان کا خون دوسرے کے جسم میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں جائز تو نہیں مگر علاج ودوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے موثر یا موجود نہ ہو اور خون دینے سے اس کی جان بچانے کا ظن غالب ہو ان شرطوں کے ساتھ خون دینا اس نص قرآنی کی رو سے جائز ہے، جس میں مضطر کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحۃ موجود ہے (معارف القرآن ۱/ ۲۱، ۲۰، ۴۱۹)۔

جواہر الفقہ میں مفتی شفیعؒ ایک سوال کے جواب میں ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں دینے پر گفتگو فرماتے ہوئے اخیر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ حکم تو اصل مسئلہ کا ہے لیکن علاج ودوا کے لئے بعض فقہاء نے خاص اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے، درمختار، شامی وغیرہ میں اسی پر فتوی ہے، شرط یہ ہے کہ کسی مسلمان یا طبیب کی تجویز سے یہ معلوم ہوا ہو کہ اس حرام چیز کے سوا کوئی دوسرا علاج ممکن نہیں اور اس کے استعمال سے بغالب ظن تندرستی کی امید ہے (شامی آخر باب المیاۃ قبل فصل البئر)، اس فتوی پر بھی عالمگیری کی مذکورہ تصریح سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ انسانی خون کو دوسری حرام چیزوں پر قیاس

نہیں کیا جاسکتا، لیکن عالمگیری کی مذکورہ تصریح میں ایک ایسے عضو انسانی کا ذکر ہے جس کے قطع کرنے سے اس انسان کو انتہائی سخت تکلیف پہنچے گی، جس سے بعض اوقات اس کی جان جانے کا بھی خطرہ ہوسکتا ہے، اور خون لینے کا جو طریقہ رائج ہے اس سے انسان کو کوئی ایسی تکلیف لاحق نہیں ہوتی، معمولی کمزوری ہوتی ہے جو چند روز کے علاج سے دفع ہوجاتی ہے۔

اس فرق کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ بطور علاج و دوا ایسے حالات میں جبکہ کسی مسلمان ڈاکٹر یا طبیب کے کہنے کے مطابق اور کوئی دوا کارگر نہ ہو اور خون دینے سے جان بچنے کی قوی امید ہو تو صرف ایسے حالات میں خون دے کر علاج کیا جاسکتا ہے (جواہر الفقہ ۵/۱۸۰)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: "**يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه، ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه فيه وجهان**" (فتاوی ہندیہ ۵/۳۵۵)۔

مذکورہ تفصیلات سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو بر بنائے ضرورت خون دینا جائز ہے، البتہ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ خون بطور عوض دیا جائے یا بطور تبرع اور عطیہ، بطور عوض دینا فقہاء کے نزدیک جائز نہیں ہے، کیونکہ انسان جب اپنے جسم کے کسی جزء کا مالک نہیں ہے تو اسے کسی جزء کے فروخت کرنے اور معاوضہ لینے کی اجازت نہیں ہے بالخصوص خون جو ایک نجس شئ ہے اس کی خرید و فروخت بدرجہ اعلی درست نہیں ہوگی، البتہ بطور عطیہ کسی دوسرے کو دینے کی اجازت ہوگی، شیخ وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

"**ولكن لا يقبل بيع هذه الأعضاء بحال، كمالا يجوز الدم وإنما يجوز التبرع بدفع عوض مالى على سبيل الهبة أو المكافاة عند نقل العضو أو التبرع بالدم فى حالة التعرض بهلاك أوضرربالغ فإن نحتم رفع العوض، ولا يوجد متبرع من الآقارب أوغيرهم جاز للدافع الدفع للضرورة**" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۲۶۰۹)۔

۲- ایسے بلڈ بینکوں جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہوں اور وہ بلڈ بینکس ضرورت مندوں کو مفت خون فراہم کرتے ہوں، وہاں مسلمانوں کے لئے خون کا عطیہ پیش کرنا جائز ہے، کیونکہ موجودہ دور میں کسی وقت بھی بلڈ کی ضرورت پڑسکتی ہے، اسی لئے بلڈ بینکس وقت کی ضرورت بن گئے ہیں، ہم آئے دن یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ قدرتی و غیر قدرتی ناگہانی حادثات بہت زیادہ ہوتے رہتے ہیں اور ایک ہی وقت میں مختلف بلڈ گروپ ہمہ وقت موجود رہیں، جس کے لئے لامحالہ پہلے سے خون عطیہ کرنے اور حاصل کرنے کا انتظام ضروری ہے اور اس طرح خون کا عطیہ بلاضرورت یا قبل از وقت نہیں کہلائے گا، اور قاعدہ شرعی: "**ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها**" کے خلاف بھی نہیں ہے، کیونکہ خون کا زیادہ اسٹاک

کیا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ مقدار، ضرورت کے وقت کام آئے، مالکیہ کا یہ مسئلہ بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے کہ مضطر کے لئے حرام کھانا بھی حلال ہے اور اگر بعد میں بھی ضرورت پڑنے کا اندیشہ ہو تو اس کا ادخار کر لینا بھی جائز ہے، شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

”**یجوز للمضطر التناول من الحرام حتی یشبع وله التزود(ادخار الزاد) من المیتة ونحوها إذا خشی الضرورة فی سفره، فاذا استغنی عنها طرحها، لأنه لاضرر فی استصحابها**“(الفقہ الإسلامی وادلتہ ۴/ ۲۶۱۴)۔

البتہ ان بلڈ بینکوں میں خون فروخت کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! ان عطیہ کرنے والوں کو ان کے اعضاء یا خون کی منتقلی کے وقت ہبہ یا مکافات کے طور پر مالی معاوضہ دیا جاسکتا ہے یا اسی طرح ان کے عطیہ کرنے کے بدلہ ان کے اعزہ واقرباء کو خون دیا جاسکتا ہے۔

شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ”**کما لایجوز بیع الدم وإنما یجوز التبرع بدفع عوض مالی علی سبیل الهبة أو المکافاة عند نقل العضو أو التبرع بالدم فی حالة التعرض لهلاک أوضرربالغ**“(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۲۶۰۹)۔

۳- جب بلڈ بینک میں خون کا عطیہ کرنا اور بلڈ بینک قائم کرنا درست ہے تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے ایسے رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنے میں عدم جواز کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، البتہ جواز ہی کا پہلو نظر آتا ہے، خاص طور پر موجودہ حالات میں اس قسم کے رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنے میں اسلام مذہب کا ہمدردانہ پہلو غیر مسلموں میں واضح ہو کر آئے گا۔

۴- مطلوبہ بلڈ گروپ کے حامل موجود شخص کے لئے مستحب ہے کہ ایسے نازک موقع پر جہاں خون کا عطیہ نہ کرنے کی شکل میں جان کا خطرہ ہے وہاں عطیہ کر کے اس کی جان بچائے، فتاوی ہندیہ میں ایک جزئیہ ہے جس سے خون دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے جو استحباب کے درجہ میں ہے، جزئیہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اگر یہ بتائے کہ مریض کو خون استعمال کرنے سے جلد شفا ہو جائے گی تو دو اقوال میں ایک قول کے مطابق اس کو خون استعمال کرانا جائز ہے۔

”**وإن قال الطبیب: یتعجل شفاء ک ، فیه وجهان**“(فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۵۵) اس مسئلہ میں واقعہ عرینہ وعکل سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے بطور دوا ان کے لئے ابوال ابل استعمال کرنے کا حکم دیا تھا جس کو استحباب پر محمول کیا جاسکتا ہے، ان لوگوں نے استعمال بھی کیا اور وہ شفایاب بھی ہوئے، اس سے جہاں استعمال کے جواز کا پہلو نکلتا ہے، وہیں خون دینے والے کے لئے خون دینے کا استحباب بھی معلوم ہوتا ہے۔

۶،۵ – انسان کا بوقت موت اپنے اعضاء کو عطیہ کرنے کی وصیت کرنے کے سلسلہ میں فقہاء کے دو نقطہائے نظر ملتے ہیں، ایک یہ ہے کہ اعضاء انسانی کو عطیہ کرنے کی وصیت کرنا جائز نہیں ہے، اس نظریہ کے حاملین کے سامنے وہ نصوص ہیں جن میں انسان کو نہایت مکرم قرار دیا گیا ہے، اور اعضاء انسانی کی قطع و برید کو اس کی تکریم کے منافی عمل بتایا ہے، دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو جو زندگی اور قیمتی اعضاء عطا کئے ہیں ان کے تعلق سے اسلام کا تصور یہ ہے کہ وہ انسان کو بطور امانت دیئے گئے ہیں وہ خود ان کا مالک نہیں ہے اور اسے یہ اختیار نہیں ہے کہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کا اپنے اعضاء کو عطیہ کرنا درست ہے، اور شائستہ انداز میں میت کے اعضاء کی قطع و برید اس کی اہانت میں داخل نہیں ہے اور کسی متعین شخص کی جان بچانے کے لئے ایسا کرنا جائز اور انسانی ہمدردی کی اچھی مثال ہے، لہذا ایک زندہ انسان کی جان بچانے کے لئے اعضاء انسانی کی قطع و برید کو گوارہ کیا جا سکتا ہے۔

علماء شوافع نے مضطر کے لئے مردہ انسان کو کھانے کی اجازت دی ہے جبکہ اس کے علاوہ دوسرا مردار موجود نہ ہو، کیونکہ زندہ کی حرمت و کرامت میت کی حرمت و کرامت کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کی حامل ہے، شیخ وہبہ زحیلیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وأجاز الشافعية للمضطر أكل آدمى ميت إذا لم يجد ميتة غيره لأن حرمة الحى أعظم من حرمة الميت" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲۶۰۷/۴)۔

علماء شافعیہ نے مردہ ماں کے پیٹ سے زندہ بچہ کو نکالنے کے لئے اور مردہ شخص کے پیٹ سے مال نکالنے کے لئے اس کو پھاڑنے کی اجازت دی ہے، شافعیہ کی طرح فقہاء حنفیہ نے بھی مردہ شخص کا پیٹ پھاڑنے کی رخصت اس صورت میں دی ہے کہ جبکہ اس نے دوسرے کا مال نگل لیا ہو اور ترکہ بھی نہ چھوڑا ہو کہ اس سے وہ مال ادا کیا جا سکے۔

"وأجاز الشافعية شق بطن المرأة لإخراج ولدها وشق بطن الميت لاخراج مال منه كما أجاز الحنفية شق بطن الميت فى حال ابتلاعه مال غيره إذا لم تكن له تركة يدفع منها" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲۶۰۸/۴)۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

"ولوماتت امرأة حامل والولد حى يتحرك قد تجاوز ستة أشهر فانه يشق بطنها، طولا ويخرج الولد لقول الله تعالى: ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا، ومن تركه عمدا حتى يموت فهو قاتل نفس" (المحلی ۱۶۶/۵، ۱۶۷)۔

مالکیہ نے تو یہاں تک اجازت دی ہے کہ انسان موت سے پہلے وارث کو محروم کرنے کے لئے اگر مال نگل جائے خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، تو میت کا پیٹ شق کیا جائے گا۔

"أما إذا ابتلعه بقصد حرمان الوارث مثلا فيشق بطنه ولو قل" (الفقہ الاسلامی ۴/ ۲۶۰۸)۔

شیخ وہبہ زحیلیؒ نے ان مسالک کو ذکر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ ان آراء کی بنیاد پر جمہور علماء کے نزدیک بعض انسانی اعضاء جیسے دل، آنکھ، گردہ اور جگر وغیرہ دوسرے انسان کو منتقل کئے جاسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ کوئی دیندار قابل اعتماد مسلم ڈاکٹر بتائے کہ منقول عنہ شخص کی موت ہوچکی ہے، اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ زندہ میت کے مقابلہ افضل ہے، شیخ موصوف کے الفاظ اس طرح ہیں:

"بناء على هذه الآراء للمبيحة يجوز عند الجمهور نقل بعض الأعضاء من الإنسان للآخر، كالقلب والعين والكلية إذا تأكد الطبيب المسلم النفقة العدل موت المنقول عنه، لأن الحی أفضل من الميت" (الفقہ الاسلامی ۴/ ۲۶۰۹)۔

اسی طرح کسی انسان کو بینائی فراہم کرانا یا جان بچانا جائز ہی نہیں ایک بڑی نعمت ہے اور شرعا مطلوب بھی ہے، لیکن اعضاء انسانی کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے:

"وتوفير البصر أو الحياة للإنسان نعمة عظمى مطلوبة شرعا، وانقاذ الحياة من مرض عضال، أو نقص خطير أمر جائز للضرورة، والضرورات تبيح المحظورات، ولكن لا يقبل بيع هذه الأعضاء بحال كما لايجوز بيع الدم" (الفقہ الإسلامی ۴/ ۲۶۰۹)۔

فقہاء کے مذکوہ کلام کو سامنے رکھنے سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

الف- اگر کوئی زندہ انسان کسی دوسرے انسان کو اپنی ایک آنکھ کا قرنیہ دے اور خود دینے والے کو کوئی قابل ذکر نقصان نہ ہو تو یہ جائز ہے، خود نقصان کی صورت میں دوسرے کو دینے کی اجازت نہیں ہوگی۔

ب- اسی طرح مردہ شخص کا بھی قرنیہ حاصل کرنا درست ہوگا۔

ج- بر بنائے ضرورت شرائط جواز کا لحاظ رکھتے ہوئے رضا کارانہ قائم آئی بینکوں کو بھی زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ کیا جاسکتا ہے۔

۷- اعضاء منتقل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے، جس انسان کا عضو منتقل کیا جارہا ہو اس نے اپنی زندگی میں اپنے اعضاء کی منتقلی کی اجازت دے دی ہو اور موت کے بعد اس کے ورثہ بھی راضی ہوں، اگر منقول عنہ شخص کی شناخت نہ ہو تو مسلمانوں

معاملات کے جوذ مہ دار ہوں وہ اس منتقلی اعضاء پر متفق ہوں۔

اس مسئلہ کی تفصیل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید میڈیکل مسائل'' میں بیان کی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ نقطہ نظر بہت ہی اطمینان بخش ہے اور قابل عمل ہے۔

اعضاء کی منتقلی یا پیوند کاری کی بحث کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے ۱۸ رتا ۲۳ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مورخہ ۶ رتا ۱۱ رفروری ۱۹۸۸ء میں جو سمینار کیا تھا، بحث وتحقیق کے بعد جو تجاویز سامنے آئی تھیں میں یہاں ان کو نقل کردوں تا کہ موضوع کی تحقیق میں اس سے مدد مل سکے وہ قرارداد یہ ہیں:

اول: کسی انسان کے جسم کا عضو اسی انسان کے جسم میں دوسری جگہ لگانا اس اطمینان کے بعد جائز ہوگا کہ پیوند کاری سے متوقع فائدہ اس پر مرتب ہونے والے نقصان سے زائد ہو، نیز اس کا مقصد کسی مفقود عضو کو وجود میں لانا، یا اس کی شکل کو بحال کرنا یا اس کے مقصود وظیفہ کو بحال کرنا، یا کسی عیب کی اصلاح یا کسی ایسی بدصورتی کا ازالہ ہو جو اس شخص کے لئے نفسیاتی یا جسمانی اذیت کا سبب بنتی ہو۔

دوم: کسی انسان کا عضو (حصہ جسم) دوسرے انسان کے اندر منتقل کرنا ایسی صورت میں جائز ہوگا جبکہ وہ از خود تیار ہوتا رہتا ہو، جیسے خون اور جلد، اس شرط کے ساتھ کہ دینے والا کامل اہلیت رکھتا ہو اور معتبر شرعی شرائط ملحوظ رکھی گئی ہوں۔

سوم: ایسا عضو جو کسی مرض کی وجہ سے جسم سے نکال دیا گیا ہو اس کے کسی حصہ سے استفادہ دوسرے شخص کے لئے جائز ہے، مثلاً کسی مرض کی وجہ سے کسی شخص کی آنکھ نکال دی گئی ہو تو اس آنکھ کے قرنیہ سے استفادہ۔

چہارم: ایسا عضو جس پر زندگی کا دارومدار ہے جیسے قلب، اسے کسی زندہ انسان سے دوسرے انسان کے اندر منتقل کرنا حرام ہے۔

پنجم: کسی زندہ انسان کے ایسے عضو کا منتقل کرنا جس پر اگرچہ اصل زندگی کا دارومدار تو نہ ہو، لیکن اس کی عدم موجودگی سے زندگی کا ایک بنیادی وظیفہ موقوف ہو جاتا ہو، یہ جائز نہیں ہے، جیسے دونوں آنکھوں کے قرنیوں کو منتقل کرنا۔ اگر اس منتقلی سے کسی بنیادی وظیفہ کا ایک حصہ متاثر ہوتا ہو تو اس کا حکم قابل غور ہے، جیسا کہ آگے (دفعہ: ۸) میں آرہا ہے۔

ششم: کسی میت کا ایسا عضو کسی زندہ انسان کے اندر منتقل کرنا جائز ہے جس عضو پر زندگی کی بقا یا کسی بنیادی وظیفہ کی سلامتی منحصر ہو، بشرطیکہ خود میت نے اپنی موت سے پہلے یا اس کی موت کے بعد اس کے ورثہ نے، اور اگر میت کی شناخت نہ ہو یا لاوارث ہو تو مسلمانوں کے سربراہ نے اس کی اجازت دی ہو۔

ہفتم: یہ بات واضح رہے کہ جن صورتوں میں اعضاء کی منتقلی کے جواز پر اتفاق ہوا ہے، وہ اس امر کے ساتھ مشروط

ہے کہ ان اعضاء کا حصول خرید وفروخت کے بغیر ہوا ہو، کیونکہ کسی بھی حال میں اعضاء انسانی کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

البتہ استفادہ کرنے والے کا مطلوبہ عضو کے حصول کے لئے بوقت ضرورت یا اعزاز وانعام کے طور پر مال خرچ کرنا محل غور ہے۔

ہشتم: مذکورہ حالات اور صورتوں کے علاوہ وہ تمام صورتیں جو اس موضوع سے تعلق رکھ سکتی ہیں وہ سب محل نظر ہیں، طبی تحقیقات اور شرعی احکام کی روشنی میں ان پر آئندہ سیمینار میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا تجاویز میں تجویز نمبر ۳ میں سیمینار کا یہ فیصلہ درج ہے کہ آنکھ کا قرنیہ کسی بھی انسان کے لئے منتقل کرنا جائز ہے اور یہ اس صورت میں جبکہ دوسری آنکھ سے زندگی کا عمل جاری ہو اور تجویز ۵ میں یہ صراحت کردی گئی ہے کہ اگر ایسا عضو نکال دیا گیا جس سے زندگی کا اساسی عمل اور وظیفہ متاثر ہوجائے تو پھر اس قسم کا عضو منتقل نہیں کیا جا سکتا بلکہ حرام ہے، جیسے دونوں آنکھ کا قرنیہ منتقل کرکے دوسرے انسان کو دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک آنکھ کا قرنیہ تو منتقل کرنا درست ہے لیکن دونوں آنکھ کا قرنیہ منتقل کرنا جائز نہیں۔

۸- انسانی دودھ ایک قابل انتفاع شئی ہے، اگرچہ جزء انسان ہونے کی وجہ سے قابل خرید وفروخت نہیں ہے، لیکن اس کی خرید وفروخت نے حاجت کا درجہ اختیار کرلیا ہے، کیونکہ بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جن کی مائیں بعض وجوہات کی وجہ سے دودھ نہیں پلاسکتیں یا نہیں پلاتی ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی دودھ عورت کی چھاتی سے پیدا شدہ قدرتی دودھ کا متبادل نہیں ہوسکتا، اس لئے بچوں کی ضرورت کے پیش نظر اس معاشرہ میں جہاں اس طرح کے لین دین کا رواج جاری ہو چکا ہو، یہ بیع جائز ہوگی، ابن قدامہ حنبلی نے اسی رائے کو اصح قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”والأول أصح ، لأنه لبن طاهر منتفع به فجاز بيعه كلبن الشاة، ولأنه يجوز أخذ العوض عنه في إجارة الظئر فاشبه المنافع“ (المغنی لابن قدامہ ص ۹۲۴)۔

مرضعہ کو بطور اجرت دی جانے والی رقم دودھ ہی کا عوض ہوتی ہے، کیونکہ وہ صرف اپنا دودھ پلانے کی مکلّف ہوتی ہے، اسی لئے اگر وہ بچہ کو بکری کا دودھ پلادے تو کسی اجرت کی مستحق نہیں ہوگی۔

”أما المرضع فلا تكلف بشئ سوى الإرضاع، فإن أرضعته بلبن شاة فلا أجر لها، لأنها لم تأت بالعمل الواجب عليها“ (الفقہ الإسلامی ۱۰/۷۲۸۱)۔

البتہ یہاں یہ پہلو قابل غور ہے کہ مدت رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پینے سے جب حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے اور شریعت اسلامی نے رضاعت کو حرمت مؤبدہ کا ایک سبب مانا ہے تو پھر دودھ کی خرید وفروخت میں اس حرمت کی

شناخت مشکل ہوجائے گی، اسی سبب اور پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے عموماً فقہاء انسانی دودھ کی خرید وفروخت کو جائز نہیں قرار دیتے ہیں، لیکن بعض فقہاء جیسے امام لیث بن سعد، علامہ ابن حزم اور ایک قول میں امام احمد بن حنبلؒ نے حرمت رضاعت کے ثبوت کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ بچہ متعارف طریقہ پر عورت کی چھاتی سے دودھ پئے ورنہ رضاعت کا رشتہ قائم نہیں ہوگا، اور اس پر پردہ کے شرعی احکام بھی مرتب نہیں ہوں گے، اسی قول کو بنیاد بنا کر موجودہ دور کے اہل علم وتحقیق نے انسانی دودھ کا بینک قائم کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اور بینک کا مخلوط دودھ استعمال کرنے کی صورت میں حرمت رضاعت ثابت نہ ہونے کو ترجیح دی ہے۔

اس موضوع پر جواز کا قول اختیار کرتے ہوئے علامہ یوسف قرضاوی نے اپنی تحریر میں بڑی تفصیلات پیش کی ہیں (الانجاب فی ضوء الاسلام ص ۵۰ تا ۵۷)۔

علامہ ابن قدامہ کی اس رائے سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے جس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ رضاعت کے ثبوت میں شک ہوجائے تو حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔

"واذا وقع الشک فی وجود الرضاع أو فی عدد الرضاع المحرم هل کملا أو لا؟ لم یثبت التحریم لأن الأصل عدمه فلا نزول عن الیقین بالشک، کما لو شک فی وجود الطلاق وعدده" (المغنی مع الشرح الکبیر ۹/ ۱۹۴)۔

فقہ حنفی کی کتاب "الاختیار" میں اس سلسلہ کا ایک جزئیہ ہے:

"امرأة دخلت حلمة ثدیها فی فم رضیع، ولا یدری أدخل اللبن فی حلقه أم لا؟ لایحرم النکاح، وکذا صبیة أرضعها بعض أهل القریة ولا یدری من هو، فتزوجها رجل من أهل تلک القریة یجوز، لأن إباحة النکاح أصل فلا یزول بالشک" (الاختیار لابن مودود الحنفی ۳/ ۱۳۰)۔

(اگر کسی عورت نے اپنی چھاتی کسی بچہ کے منہ میں ڈال دی اور یہ معلوم نہ ہوسکا کہ دودھ بچہ کے حلق میں داخل ہوا یا نہیں؟ تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، اسی طرح اگر کسی بچی نے گاؤں کی ایک یا چند عورتوں کا دودھ پی لیا اور تعین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس نے کس کس کا دودھ پیا ہے تو اس گاؤں کے کسی آدمی کا اس لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہوگا کیونکہ محض شبہ کی بنیاد پر نکاح کی حلت ختم نہیں ہوگی)۔

آگے تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال: ویجب علی النساء أن لا یرضعن کل صبی من غیر ضرورة، فإن فعلن فلیحفظنه أو

یکتبنه احتیاطا''(حوالہ سابق) (لیکن یہ ضروری ہے کہ بلاضرورت عورتیں ہر بچہ کو دودھ نہ پلایا کریں اور اگر پلائیں تو اسے محفوظ رکھیں یا لکھ لیا کریں احتیاطا)۔

علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں یہی رائے پیش کی ہے، فرماتے ہیں:

''أما لو شک فیه بأن أدخلت الحمة فی فم الصغیر وشکت فی الارتضاع لاتثبت الحرمة بالشک، وهو کما علم أن صبیة أرضعتها امرأة من قریة ولا یدری من هی؟فتزوجها رجل من أهل تلک القریة صح، لأنه لم یتحقق المانع من خصوصیة إمرأة، والواجب علی النساء أن لایرضعن کل صبی من غیر ضرورة، وإذا أرضعن فلیحفظن ذلک ویشهرنه ویکتبنه احتیاطا''(فتح القدیر ۳/ ۳۰۴،۳۰۵)۔

(اگر دودھ پلانے کے بارے میں شک ہوجائے، اس طرح کہ عورت نے اپنی چھاتی بچہ کے منہ میں رکھا لیکن بچہ کے دودھ پینے نہ پینے کے بارے میں اسے شک ہوجائے تو شک سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، یہ ایسا ہی ہے کہ کسی بچی کو گاؤں کی کسی عورت نے دودھ پلادیا، لیکن یہی معلوم نہیں ہے کہ وہ کون ہے پھر اسی گاؤں کے کسی مرد نے اس لڑکی سے نکاح کرلیا تو یہ جائز ہوگا، کیونکہ عورت کی تعیین نہ ہونے کی وجہ سے مانع نکاح ثابت نہ ہوسکا، لیکن عورت پر واجب ہے کہ ہر بچہ کو بلاضرورت دودھ نہ پلایا کریں اور اگر پلائیں تو اسے محفوظ رکھیں اور لوگوں میں اسے مشہور کردیں اور احتیاطا لکھ بھی لیا کریں)۔

فتاوی قاضی خاں کے حوالہ سے ''الاشباہ والنظائر'' میں قاعدہ شرعی ''الیقین لایزول بالشک'' کے تحت یہ جزئیہ نقل کیا گیا ہے: ''صغیر وصغیرة ولا یعلم حقیقة قالوا لا بأس بالنکاح بینهما'' (شرح الحموی علی الاشباہ والنظائر ص ۲۱۳) (کوئی بچہ اور بچی اس طرح کے ہوں کہ ان دونوں کو اپنی حقیقت معلوم ہو تو ان دونوں کے درمیان نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

مذکورہ فقہی تصریحات سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ دودھ بینک کی صورت میں جو بچے اور بچیاں کسی عورت کا دودھ پی لیں اور اس عورت کا اسے علم نہ ہو تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، اگر ان بچوں اور بچیوں کا نکاح آپس میں ہوجائے تو نکاح درست ہوگا، البتہ دودھ بینک میں ایسا نظام بنایا جائے کہ فلاں عورت کا دودھ فلاں بچہ کا جزء بدن بنا ہے اور دودھ بینک کے ذمہ دار اس ذمہ داری کو قبول کریں کہ وہ ان عورتوں کو اطلاع کریں کہ آپ فلاں بچہ کی رضاعی ماں ہیں اور بچوں کے ذمہ داروں کو بھی خبر کردیں کہ فلاں فلاں عورتیں ان کی اولاد کی رضاعی مائیں ہیں، فقہاء نے جہاں نکاح

کی اجازت لکھی ہے وہی یہ صراحت بھی کردی ہے کہ اولاتو عورتیں بلاضرورت ہر بچہ کو دودھ نہ پلایا کریں اگر پلا دیں تو اس کو یادرکھیں، یا لکھ لیں، فقہاء کی اس تاکیدی رہنمائی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دودھ بینک کے ذمہ دار جب کسی عورت کا دودھ حاصل کریں تو ان کے پتے اور شناخت بھی محفوظ کرلیں اور بچے والوں کو جب یہ دودھ حوالہ کریں تو دودھ والی عورت کا پتہ اور شناخت بھی دے دیں۔

تاہم یہ ضرور ہے کہ بینک کے دودھ میں دودھ دینے والی عورتوں اور پینے والے بچوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنا دشوار عمل ہے، اگر یہ ریکارڈ نہ ہوسکا تو حرمت رضاعت کے سلسلہ میں شبہ پیدا ہوجائے گا، گو کہ فقہی طور پر یہ چنداں مضر نہیں، جیسا کہ اوپر کی بحثوں میں یہ بات آئی ہے اور انجان عورتوں اور بچوں کے درمیان حرمت نکاح کا فتوی نہیں دیا جاسکتا ہے لیکن شبہ سے بچنا بھی شرعا مطلوب ہے، اس لئے جواز کے ساتھ ساتھ احتیاط بہتر اور اولی ہے۔

۹- منی بینک اس کی خرید وفروخت کا مسئلہ بھی انتہائی اہم اور نازک ہے کیونکہ مرد کا مادہ منویہ (Sperm) یا عورت کا بیضۃ المنی (Ovum) انسانی اجزاء میں انتہائی اہم جزء ہے، نسل انسانی کی افزائش کے لئے یہ جزء اصل کی حیثیت رکھتا ہے، موجودہ غیر اخلاقی تہذیب نے اس کے سلسلہ میں لین دین کا جو رویہ اختیار کیا ہے اس نے اس کو زیادہ پیچیدہ اور نازک بنادیا ہے، اور موجودہ مغرب زدہ معاشرہ میں اس کا جس قدر عموم ہوتا جارہا ہے وہ اور ہی قابل توجہ بنتا جارہا ہے بالخصوص جب یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ ماضی میں یہ خارج میں قابل انتفاع جز نہیں تھا لیکن موجودہ دور میں یہ مادہ خارج میں قابل انتفاع چیز بن گئی ہے، اس لئے مسلم معاشرہ میں اس سوال کا پیدا ہونا ایک فطری بات ہے کہ کسی ضرورت مند مرد یا خاتون کے لئے اس کا حاصل کرنا یا اس کو فروخت کرنا یا بطور ہدیہ کسی کو دینا شرعی اعتبار سے کیا حکم رکھتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اولاد سے محروم میاں بیوی کے لئے ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید امید کی ایک کرن ہے اور ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید کی بعض شکلیں جن میں اختلاط اور اشتباہ نسب کی خرابی لازم نہیں آتی اور زنا کی ممانعت کی بنیادی علت یہی اختلاط نسب ہے، اگر اس ممانعت سے پاک طریقہ ہو جسے میاں بیوی کے مادہ اور بیضہ کو خلط کرکے بذریعہ انجکشن پہنچانا تو اس میں اگرچہ شرعا جواز کا پہلو نکلتا ہے۔ لیکن خرید وفروخت اور ہبہ کی صورت میں اختلاط نسب کا معاملہ یقینی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے، اس لئے اس کا بینک قائم کرنا، اس کی خرید وفروخت اور ہبہ ہرگز جائز نہیں، یہ اسلام اور تمام مذاہب وادیان کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کے خلاف ہے، اس کے متعلق وہ تمام نصوص اور روایات کتاب وسنت میں موجود ہیں، جو زنا اور اختلاط جنسی سے تعلق رکھتی ہیں۔

☆☆☆

اعضاء انسانی کا عطیہ اور اسلام

مولانا محمد مصطفی عبدالقدوس ندوی☆

۱-خون کا عطیہ:

اصولی طور پر جو چیز شرعاً ناجائز وحرام اور ناپاک ہو تو اس سے علاج درست نہیں، خون حرام ہونے کے ساتھ ناپاک بھی ہے، اور انسان کا جزء بھی ہے، اور انسان کے کسی جزء سے فائدہ اٹھانا درست نہیں، کیونکہ یہ اس کے احترام وتوقیر کے منافی ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو خون کی حرمت کے دو اسباب جمع ہو جا رہے ہیں ایک اس کا ناپاک ہونا (بقرہ: ۱۷۳، انعام: ۱۴۵، "اتفق العلماء علی أن الدم حرام نجس لا یؤکل ولا ینتفع به" تفسیر قرطبی ۲/ ۲۱۷)، اور دوسرے انسان کا جزء ہونا، لہذا ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں چڑھانا ناجائز وحرام ہوگا، گو خون چڑھانا طبی ضرورت کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔

یہ عام حالات کا حکم ہے، جہاں تک ازراہ علاج اضطرار کے وقت کی بات ہے تو قرآن میں خود حرام کردہ اشیاء کے تذکرہ کے بعد اضطرار کی حالت کا استثناء موجود ہے، یعنی اللہ تعالی نے اضطرار کی صورت میں جان بچانے کے لئے خون، شراب، مردار اور خنزیر کے گوشت کھانے کی اجازت دی (بقرہ: ۷۳، مائدہ: ۳)۔

حضور ﷺ نے علاج کی خاطر اصحاب عرینہ کو اونٹ کے پیشاب پینے کی اجازت دی تھی (بخاری عن أنس، باب الدواء بأبوال الإبل: ۲/ ۸۴۸)۔

ان ہی نصوص کی وجہ سے فقہاء نے ازراہ علاج بوقت ضرورت حرام و ناپاک اشیاء کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۵۵)، جہاں تک انسانی اعضاء سے انتفاع کی بات ہے تو علاج کی خاطر انسانی دودھ کے استعمال میں فقہاء نے کوئی مضائقہ نہیں کیا ہے: "**لا بأس بأن یسعط الرجل بلبن المرأة بشربه للدواء**" (حوالہ سابق)، اس لئے کہ ضرورت کے وقت اس کی کرامت کی اہانت کا حکم زائل ہو جاتا ہے، بالفاظ دیگر علاج ایک ضرورت ہے اس لئے اس مقصد کے لئے اس کا استعمال درست ہوگا، کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وقد فصل لکم ماحرم علیکم إلا ما اضطررتم**

☆ استاذ جامعۃ الصالحات، کڑپہ، آندھرا پردیش۔

إليه"(انعام:۱۱۹)(حالانکہ جو چیزیں تم پرحرام کی گئی ہیں، اللہ نے ان کو تمہارے سامنے وضاحت سے بیان کردیا ہے، سوائے اس کے کہ تم اس کو کھانے پر مجبور ہوجاؤ) اور ایک فقہی قاعدہ ہے: "**الأمر إذا ضاق اتسع وإذا اتسع ضاق**" (الأشباہ والنظائر لابن نجیم ا/۸۵)۔

لہذا ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کے جسم میں ڈالا جاسکتا ہے، اسی طرح اس کے برعکس بھی صحیح ہے، البتہ اس کے لئے درج ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

۱-خون کے علاوہ کوئی دوسری متبادل مباح دوا میسر نہ ہو جس سے علاج کیا جانا ممکن ہو اور مریض کی جان اس سے بچ سکے یا صحت یاب ہوسکے۔

۲-مسلم ماہر ڈاکٹر مریض کی صحت یابی یا اس کی جان بچانے کے لئے خون کے استعمال کو ضروری قرار دے، "**يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوي إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاء ه فيه، ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه، وإن قال الطبيب: يتعجل شفاء ك فيه وجهان**" (ہندیہ ۵/۳۵۵)۔

۳-محض قوت یا جسمانی حسن میں اضافہ مقصود نہ ہو کہ یہ ضرورت کے درجہ کی چیز نہیں ہے (جدید فقہی مسائل از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ا/۳۲۴)۔

۴-خون عطیہ کے طور پر حاصل کیا جائے نہ کہ معاوضہ کے ذریعہ، ہاں اگر خون عطیہ نہ مل سکے تو مجبوری میں خون خریدا جاسکتا ہے؛ اس لئے کہ حاجت وضرورت کے وقت شرعاً ممنوع کا ارتکاب مباح ہوجاتا ہے، چنانچہ فقہاء نے محتاج و ضرورت مند لوگوں کے لئے سودی قرض لینے کو جائز قرار دیا ہے، "**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ا/۹۳)، لیکن قرض دینے والے کے لئے سود لینا کسی بھی حال میں جائز نہیں، اسی طرح خون دینے والے کے لئے کسی طرح کا معاوضہ لینا حلال نہیں ہوگا، کیونکہ کسی انسانی عضو کی خرید وفروخت ناجائز ہے، اس لئے کہ انسانی اعضاء کو سامان خرید و فروخت بنانے میں انسان کی کھلی ہوئی اہانت ہے: "**كما بطل بيع...... شعر الإنسان لكرامة الآدمي**" (ردالمحتار مع الدر المختار ۷/۲۴۵)۔

جبکہ اللہ تعالی نے انسان کو مکرم ومعزز بنایا: "**ولقد كرمنا بني آدم وحملناهم في البر والبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا**" (اسراء:۷۰) (ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی ہے، ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سواری دی ہے، ان کو پاکیزہ ونفیس رزق عطا فرمائی ہے اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت سے نوازا ہے)۔

نیز چونکہ انسان کے پاس اس کے اعضاء اللہ کی امانت ہیں، اس لئے کسی عضو کو فروخت کرنا اللہ کی امانت میں خیانت کرنا ہوگا، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے خودکشی کو حرام قرار دیا (بقرہ:۱۹۵، نساء:۲۹)۔

ہاں اگر دونوں کے درمیان خرید وفروخت کا معاملہ نہیں ہوا اور نہ کسی طرح کے معاوضہ دینے کی بات طے پائی تھی، زید نے مثلاً خون دیتے وقت صراحت کردی تھی کہ میں بھائی چارگی اور انسانی ہمدردی کی بنا پر خون دے رہا ہوں، مجھے اس کا معاوضہ نہیں چاہئے، پھر بھی جس کو خون دیا گیا اس نے اپنی خوشی سے، بغیر کسی کے دباؤ و جبر کے کچھ رقم زید کو ہدیہ کے طور پر دے دی، تاکہ جو احسان زید نے کیا ہے اس کی کچھ تلافی ہو سکے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

گذشتہ تصریحات سے واضح ہو گیا کہ خون کا عطیہ دوسرے کو دینا جائز ہے، البتہ اس کی خرید وفروخت صحیح نہیں ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس کی ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے تو اس کے جواز میں کوئی کلام ہی نہیں، کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا اسلامی بھائی اور ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ ہیں (توبہ:۷۰، حجرات:۱۰)، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا ہے اور نہ ہی اس کو بے سہارا چھوڑتا ہے، جو شخص اپنی بھائی کی ضرورت میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کی حاجت روائی میں مصروف رہتا ہے، اور جو شخص کسی مسلمان بھائی کی مصیبت دنیا میں دور کرتا ہے تو اس کے بدلہ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے اس کی کسی مصیبت کو دور کرے گا (مسلم، کتاب البر، باب تحریم الظلم ۶۵۷۸)۔

پس اس صراحت و وضاحت کے بعد ایک مسلمان کا دوسرے غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بناء پر خون عطیہ دینا درج ذیل شرطوں کے ساتھ درست ہوگا:

۱- وہ غیر مسلم ان لوگوں میں سے نہ ہو جو مسلمانوں کے خلاف جنگی مہم میں شریک اور برسر پیکار ہوں، جن کو فقہ کی اصطلاح میں ''حربی'' کہا جاتا ہے۔

۲- اسی طرح وہ غیر مسلم ان میں سے نہ ہو جو اسلام اور مسلم دشمنی میں معروف ہیں گرچہ وہ دار المعاہدہ یا دار الامن جمہوری ممالک کے باشی ہوں، اس لئے کہ ایسے لوگوں کو بطور عطیہ خون دینا دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کو مضبوط کرنا اور تقویت پہنچانا لازم آئے گا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم ان تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين**'' (ممتحنہ:۸) (جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے اللہ تعالی تمہیں نہیں روکتا بلکہ اللہ تعالی تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

۳- وہ مذہبی آدمی نہ ہو، کیونکہ اس صورت میں کفر وشرک پر تعاون وحوصلہ افزائی کرنا لازم آئے گا جو کہ اللہ کے خلاف صریح بغاوت ہے، اللہ تعالی نے ہر طرح کی معصیت پر مدد کرنے سے منع فرمایا ہے: ''**ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**'' (مائدہ:۲) (گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مددمت کرو)۔

ان مذکورہ بالا شرطوں کے تحقق کے بعد کسی غیر مسلم کو خون عطیہ کے طور پر دینا درست ہوگا، اسی طرح اگر کسی غیر مسلم اسلام دشمن کی طرف سے جان ومال یا عزت وآبرو کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو جیسا کہ خود اللہ تعالی نے استثناء کے ذریعہ ارشاد فرمایا: ''**إلا أن تتقوا منهم تقاة**'' (توبہ:۲۸) (مگر سوائے ایسی صورت کے، کہ ان کے شر سے بچاؤ مقصود ہو) تو رفع ضرر کے لئے اسے خون دینا جائز ہوگا، یا اس کی مصلحت دینی ہو یعنی ہدایت پانے کی توقع ہو، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ایسے لوگوں کو زکاۃ کے مد سے مالی تعاون کرنے کا حکم دیا ہے ''**إنما الصدقات للفقراء...... والمؤلفة قلوبهم**'' (توبہ:۶۰) (زکاۃ تو غریبوں اور وہ لوگ جن کی دل جوئی مقصود ہو)۔

۲- بلڈ بینک میں مسلمانوں کا خون کا عطیہ دینا:

خون کے عطیہ دینے کی بابت جو اصول اوپر ذکر ہوا ہے، اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ دار الحرب میں قائم بلڈ بینک میں مسلمانوں کے لئے خون کا عطیہ پیش کرنا درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ نتیجہ کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کو تقویت پہنچانا لازم آئے گا، اور ان کے کفر وشرک اور اسلام کے خلاف سازشوں پر مزید ان کی مدد کرنے کو مستلزم ہوگا۔

اگر بلڈ بینک اسلامی ملکوں میں ہو تو اس میں مسلمانوں کے لئے خون کا عطیہ پیش کرنا بلا کراہت جائز ہوگا۔

اگر بلڈ بینک غیر مسلم جمہوری ممالک میں قائم ہو تو اس میں مسلمانوں کے لئے خون کا عطیہ پیش کرنا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن ہندوستان جیسے جمہور ممالک میں جہاں باطل مسموم نظریہ کی حامل دہشت گرد ہندو تنظیمیں قائم ہیں، جن کا بنیادی مشن اسلام اور مسلم دشمن ہے، مسلمانوں کے لئے خون کا عطیہ پیش کرنا خلاف اولی واحتیاط نظر آتا ہے، کیونکہ جہاں بلڈ بینک سے مسلمانوں اور سیکولر غیر مسلم فائدہ اٹھائیں گے وہیں ہندو دہشت گرد تحریکوں سے وابستہ لوگ بھی فائدہ اٹھائیں گے، یہ اور بات ہے کہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت کس کو پڑے گی، معلوم نہیں، البتہ احتمال ہر ایک کا ضرور ہے۔

یہ حکم اس وقت ہے جبکہ مسلمان اپنا خون بلڈ بینک کو پیش کرے، اس سے خون حاصل نہ کرے، اگر صورت حال یہ ہو کہ بلڈ بینک سے خون لینے کی ضرورت پڑ گئی، اور اس سے خون لیا، تو اس کے متعلقین کو چاہئے کہ وہ بلڈ بینک کو عطیہ کے طور پر خون دیں تا کہ احسان بالاحسان ہو جائے جس کی اسلام ترغیب دیتا ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا اسوہ

حسنہ یہ رہا ہے کہ ہدیہ قبول فرماتے تھے اوراس کا بدلہ بھی مرحمت فرماتے تھے (بخاری، ہبہ باب المکافاۃ فی الهبة ۲۵۸۵)۔

۳-رضا کارانہ بلڈ کیمپ قائم کرنا:

حاجت وضرورت کی بناء پر جب خون کا عطیہ پیش کرنا جائزٹھہراتو اس کے لئے از راہ ضرورت رضا کارانہ بلڈ کیمپ قائم کرنا بھی صحیح ہوگا، البتہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ اس خون کا استعمال مسلمانوں اور سیکولر ذہن کے حاملین غیر مسلم بھائیوں کے لئے ہو نہ کہ اسلام اور مسلم دشمن افراد کے لئے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک قدم آگے بڑھ کر رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کریں، کیونکہ ہندوستان میں فسطائی ذہن و طاقت دن بدن عروج پارہی ہے، ہوسکتا ہے کہ بعض مرتبہ ایمرجنسی کے موقعوں پر موجودہ بلڈ بینک سے مسلمانوں کو تعاون نہ مل سکے، اور عام حالات میں بھی بہانہ کردیا جاسکتا ہے، مسلمانوں کا اپنا رضا کارانہ بلڈ بینک رہے گا تو اس سے جہاں مسلمان فائدہ اٹھائیں گے وہیں سیکولر ذہن کے غیر مسلم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اوراس کو دعوتی مقصد کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۴-خون عطیہ دینے کا حکم:

غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں جوصورت ذکر کی گئی ہے اسمیں مریض کے گروپ کے خون کے حامل شخص پر اس مریض کو خون دینا شرعانہ واجب ہوگا اور نہ ہی مستحب، زیادہ سے زیادہ جواز کہا جاسکتا ہے، اس لئے کہ پیچھے تفصیل سے بات آچکی ہے کہ خون کا عطیہ پیش کرنا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر از راہ حاجت وضرورت جائز ہے، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے جسم سے اتنا ہی خون نکالنے کی اجازت دے جس سے اس کی صحت پر کوئی منفی اثر مرتب نہ ہو، نیز خون کا عطیہ پیش کرنا آدمی کے صواب دید اور مباحات میں سے ہے اور شریعت اسلامیہ کا اصول یہ ہے کہ جائز امور میں انسان کو مجبور کیا جانا درست نہیں ہے، نیز خون دینے کا معاملہ ایک طرفہ اور بلا معاوضہ ہے، اوراس طرح کے معاملات میں جبر واکراہ نہیں کیا جاسکتا۔

واضح رہے کہ خون کے معاملہ کو مال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مضطر ہو، اس کے پاس اپنی جان بچانے کے لئے کھانے پینے کی چیز نہ ہو، اس کے پاس ایک دوسرا موجود ہو، جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کھانے پینے کی اشیاء موجود ہوں تو اس پر مضطر کو کھانے پینے کے لئے دینا واجب ہے، مال پر قیاس نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مال جس کا استعمال ہر حال میں مباح ہے، اور خون اولا مال نہیں ہے، ثانیا اس کا استعمال ہر حال میں درست نہیں، اور یہ بات مسلم ہے کہ خون بھی انسان کا مکرم جزء ہے، اور فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی مضطر کی جان بچانے کے لئے اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر کھانے کے لئے دینا، بلکہ

مضطر کو کاٹ کر کھانے کی اجازت دینا بھی حلال نہیں،"**خاف الموت جو عاوإن قاله الآخر اقطع يدي و كلها لا يحل**"(ردالمحتار۵/۲۲۲)۔

۵-جگر کا عطیہ:

اصولی طور پر انسان جس طرح بقید حیات اپنے تمام اعضاء کے ساتھ مکرم ومحترم ہے"**ولقد كرمنا بني آدم**"(اسراء:۷۰)،"**وهو بجميع أجزائه مكرم مصون عن الابتذال بالبيع**"(البحر الرائق:۸۱/۶، ہدایہ مع الفتح ۳۸۸/۶-۳۸۹)، اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کے تمام اعضاء محترم ہیں، اس کے کسی عضو کی اہانت جائز نہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:"**كسر عظم الميت ككسره حيا**"(ابوداؤد:۱۰۲/۲)(میت کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے کہ جیسے زندہ شخص کی ہڈی توڑنا)، اس لئے عام حالات میں نہ اس کے کسی عضو کا نکالنا جائز ہوگا اور نہ ہی اس سے انتفاع درست ہوگا، لیکن شریعت میں حالت اختیار اور حالت مجبوری کے احکام الگ الگ ہیں، مجبوری کی حالت میں بعض ایسی باتوں کی گنجائش ہوتی ہے جو عام حالات میں نہیں ہوتی، اس لئے موجودہ دور کے علماء کی اکثریت نے کچھ شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، وہ شرطیں یہ ہیں:

۱-جس مریض کو جگر دیا جارہا ہے، اس کی وجہ سے اس کی جان بچ جانے کا یقین یا کم از کم غالب گمان ضرور ہو۔

۲-سوائے انسانی جگر کے کوئی دوسرا متبادل نہ ہو۔

۳-اس کے بغیر اس کی ہلاکت یا بڑی سخت پریشانی وتکلیف سے دوچار ہونے کا یقین یا قوی اندیشہ ہو۔

۴-ضرورت کی حد تک آپریشن کر کے اس کا جگر نکالا جائے، مزید اس کی اہانت اور مثلہ نہ کیا جائے۔

۵-میت حقیقی موت مر چکا ہو اس طور پر کہ معتمد ماہر ڈاکٹر نے اس کے مردہ ہونے کی رپورٹ دے دی ہو، کہ اس کے دل ودماغ اور پھیپھڑے کی حرکت بند ہو چکی ہو۔

۶-مرنے سے پہلے میت اس مریض کے حق میں وصیت کر چکا ہو، یا مطلق وصیت کی ہو کہ میرے مرنے کے بعد اگر میرا کوئی عضو کسی مریض کے کام آ سکتا ہو تو اسے میرے جسم سے نکال کر دے دیا جائے، وصیت نہ کرنے کی صورت میں اس کے ورثہ سے اجازت لیا جانا ضروری ہے، اگر اس کا کوئی وارث نہ ہو تو حاکم وقاضی کی اجازت ضروری ہوگی، تاکہ میت کے اعضاء کے ساتھ تجارت شروع نہ ہو جائے، یا اس کو بازیچہ اطفال نہ بنالیا جائے، جس کے نتیجہ میں لاش کی بے حرمتی ہوگی، اور اس کو مثلہ کر کے چھوڑ دیا جانے کا عام رواج ہو جائے گا، بعض مرتبہ مثلہ کر کے یوں ہی گڈھا کھود کر مٹی کے حوالہ کر دیا جائے گا، بلکہ آج کل سرکاری اسپتالوں میں ایسا شروع ہو چکا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے مثلہ سے سختی سے منع

فرمایا ہے (بخاری، ذبائح، باب ما یکرہ من المثلہ ۵۵۱٦)، اور یہ غیر انسانی اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے، اسی وجہ سے مثلہ کے ناجائز وحرام ہونے پر علماء امت کا اتفاق ہے (دیکھئے: شرح صحیح مسلم للنووی: ۲۸/۲، المغنی لابن قدامہ ۱۰/ ۵٦۵، مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۲۸/ ۳۱۴، عمدۃ القاری للعینی ۸/ ۲۹٦)۔

واضح رہے کہ اگر اسلامی ملک ہو تو ایمرجنسی کی حالت میں مسلم حاکم یا قاضی کی اجازت سے لاوارث لاش سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، اور اگر غیر مسلم جمہوری ملک ہو، وہاں حکومت کی طرف سے یا مسلمانوں کے رائے عامہ سے منتخب قاضی شریعت ہو تو اس سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہوگا، یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ لاوارث نعش کے مسلمان ہونے کی شناخت ہوچکی ہو، اگر لاوارث نعش مشتبہ ہو یا غیر مسلم ہونے کی شناخت ہوچکی ہو تو اس کے بارے میں ہم مکلف نہیں ہیں، اور نہ ہی ہم دوسرے کو اسلامی احکام کی پابندی کا مکلّف بنا سکتے ہیں۔

اگر لاوارث نعش کی شناخت مسلم ہونے کی حیثیت سے ہوئی، لیکن اس علاقہ میں کوئی مسلم قاضی یا امیر شریعت نہ ہو، البتہ کوئی مسلم تنظیم ہو تو اس کے صدر سے اجازت لی جائے گی۔

اگر صورت حال ایسی ہو کہ وہاں کوئی مسلم تنظیم بھی نہیں ہے، ایک مریض کو جگر کی ضرورت ہے، اس کا جگر بدلا نہیں گیا تو وہ مر جائے گا، وہاں ایک لاوارث نعش ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، تو اس کا جگر نکال کر مذکورہ بالا مریض میں لگایا جاسکتا ہے، کیونکہ ایک زندہ آدمی کو موت سے بچانا ایک شدید ضرورت ہے، اور شدید ضرورت کے وقت شرعاً ممنوع شئ مباح ہوجاتی ہے "الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری ۱/ ۸۷)، نیز فقہاء نے زندہ کی کرامت کو میت کی کرامت کے مقابلہ میں اقوی قرار دیا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر عورت کا انتقال ہوگیا، اس کے بطن میں بچہ زندہ ہے اور میڈیکل رپورٹ کے مطابق دنیا میں اس کے زندہ رہنے کی امید ہے تو اس میت عورت کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا اور بچہ کو اس کے پیٹ سے نکالا جائے گا (حوالہ سابق، ۱/ ۸۹، القاعدۃ الخامسۃ: الضرر یزال، تحفۃ الفقہاء للسمرقندی ۳/ ۳۴۳)۔

جہاں تک جگر کو محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دینے کی بات ہے تو اگر میت نے مرنے سے پہلے اپنے جگر کو محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دینے کی وصیت کر کے مرا ہو تو اس کی وصیت کے مطابق اس کے مرنے کے بعد مذکورہ بالا شرائط کی رعایت کے ساتھ اس کے جگر کو اس سے نکال کر اس طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دے دیا جائے گا، جس کے نام وصیت ہے، وصیت نہ کرنے کی صورت میں ورثہ کی اجازت سے اس کے جگر کو نکال کر کسی طبی ادارہ میں محفوظ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ مذکورہ بالا شرطوں کی رعایت رکھی جائے، مزید مسلم میت کے لئے لازم ہے کہ اپنے وصیت نامہ میں اس کی صراحت کر دے کہ میرا جگر کسی ضرورت مند مسلم مریض یا سیکولر ذہن کے حامل غیر مسلم کو دیا جائے، کسی دہشت

گردا اسلام اور مسلم دشمن غیر مسلم کو نہ دیا جائے، اسی طرح ورثہ پر لازم ہے کہ اجازت دیتے وقت اس شرط کا اضافہ کردے۔

کیا انسانی اعضاء کی پیوند کاری اہانت میں داخل ہے؟

جہاں تک یہ سوال کہ آیا انسانی اعضاء کی پیوند کاری اہانت میں داخل ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں: اول یہ کہ اہانت کا معیار اور حدود کیا ہیں؟ قرآن وحدیث میں اس کی بے لچک تحدید کی صراحت نہیں ہے، اس لئے یہ عرف وعادت پر محمول ہوگا، جیسا کہ ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ نے اس کی صراحت کی ہے (اصول الفقہ الاسلامی للزحیلی ۸۳۱/۲)، اور عرف و عادت کی صورتیں زمانہ وحالات اور علاقہ کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں، عین ممکن ہے کہ جن فقہاء نے انسانی اعضاء سے انتفاع کو منع کیا ہے ان کے زمانہ میں یہ عمل توہین تصور کیا جاتا تھا، اور اس دور میں انسانی اعضاء سے انتفاع کے ایسے طریقے رائج نہیں ہوئے تھے کہ شائستہ طور پر انسانی اجزاء سے انتفاع کیا جاسکے، جیسا کہ موجودہ دور میں رائج ہو چکے ہیں، اس لئے اس دور میں اس عمل کو توہین تصور نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ عطیہ کے طور اعضاء دینے والا اپنے آپ کو باعزت محسوس کرتا ہے اور لوگ بھی اسے عزت دیتے ہیں اور اس کی قدر ومنزلت میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا ہے، اسی وجہ سے بعض لوگ اپنی نیک نامی کے لئے اس قسم کی وصیت بھی کر جاتے ہیں، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بہ ضرورت جبکہ اس میں اہانت انسانی نہ ہو تو جائز قرار دیا ہے (کفایت المفتی ۱۴۳/۹)۔

موجودہ زمانہ میں اعضاء انسانی سے انتفاع کے ایسے طریقے ایجاد ہوگئے ہیں جن میں انسانی اہانت نہیں ہے اور نہ ہی عرف میں اس کو اہانت سمجھا جاتا ہے، اس لئے اصولی طور پر ان کو درست اور جائز ہونا چاہئے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے کہ دوسرے فقہی نظائر کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کے تحفظ اور بقا کے لئے قابل احترام چیزوں کی اہانت بھی قبول کی جاسکتی ہے (جدید فقہی مسائل ۷۶/۳)۔

۶-الف: زندہ شخص کا آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ کرنا:

اگر واقعی میں نابینا شخص کی بینائی لوٹانا مصنوعی طریقہ پر ممکن نہ ہو اور نہ ہی کسی جانور کی آنکھ سے اس کا علاج ممکن ہو تو گردہ کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے جیسا کہ علماء نے ایک صحت مند آدمی کے لئے دو گردوں میں سے ایک گردہ کو عطیہ کے طور پر کسی ضرورت مند مریض کو دینے کی اجازت چند شرطوں کے ساتھ دی ہے، ایک نابینا شخص کو بینائی بخشنے کے لئے کسی دوسرے صحت مند شخص کے لئے اپنی ایک آنکھ کے قرنیہ کو عطیہ کے طور پر پیش کرنے کو چند شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا جاسکتا ہے، اور وہ شرطیں یہ ہیں:

۱-جس شخص کی ایک آنکھ کا قرنیہ بطور عطیہ لیا جا رہا ہے، وہ بغیر کسی دباؤ کے اس سے اس کی رضامندی کے ساتھ

لیا جا رہا ہو، کیونکہ جبر واکراہ کے ساتھ ہبہ درست نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل**" (بقرہ:۱۸۸) (اور ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ)۔

۲-قرنیہ ہبہ کرنے والے شخص کی قرنیہ عطیہ دینے کی وجہ سے ہلاکت یا شدید مضرت کا اندیشہ نہ ہو اس طور پر کہ اس کی وجہ سے اس کی دوسری آنکھ متاثر نہ ہو جائے اور اس کی بنیائی سے وہ محروم ہو جائے، یا شوگر کا مریض ہو جس کی وجہ سے زخم مندمل نہ ہو پائے یا اس کی شفا میں اتنا زیادہ وقت لگنے کا اندیشہ ہو کہ کوئی دوسری بیماری یا ضرر پہنچنے کا خطرہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، جیسے ناسور یا کینسر میں تبدیل ہو جانے کا اندیشہ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**لا ضرر ولا ضرار**" (موطا امام مالک، باب الأقضیۃ فی المرافق ۲۲۶)۔

اسی حدیث سے ماخوذ فقہی قاعدہ ہے: "**الضرر لایزال بالضرار**" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری ۱/۸۸)۔

۳-ایک زندہ انسان کی آنکھ کا قرنیہ نکال کر نابینا شخص کے حلقہ چشم میں اس کی پیوندکاری کی کامیابی ویقین کے قریب ہو نہ کہ محض وہم وگمان ہو۔

۴-خرید وفروخت کا معاملہ نہ ہو، یعنی آنکھ کا قرنیہ دینے والا اس کی قیمت وصول نہ کرے، کیونکہ قیمت لینا جائز نہیں، اس لئے کہ آنکھ کا قرنیہ عضو انسانی ہے، اور اعضاء انسانی کی خرید وفروخت انسان کے احترام وکرامت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، جیسا کہ تفصیل سے پیچھے بات آچکی ہے۔

ب-مردہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ حاصل کرنا:

عام حالات میں کسی مردہ کی اہانت درست نہیں، لیکن مجبوری واضطرار کی حالت میں اسی طرح حاجت وضرورت کے وقت بقدر ضرورت اس میں تصرف کرنا اہانت کے حکم میں نہیں آتا ہے، اور کسی نابینا شخص کو بینائی فراہم کرنا ایک ضرورت ہے، لہذا اس مقصد کے لئے مردہ کی آنکھ کا قرنیہ درج ذیل شرطوں کے ساتھ درست ہوگا:

۱-اس نے مرنے سے پہلے اپنے کسی بھی عضو کے نکالے جانے کی وصیت مطلق کی ہو، یا صرف اپنی آنکھ کے قرنیہ نکالنے کی مطلق وصیت کی ہو، اگر کسی متعین شخص کے لئے مخصوص عضو کی وصیت کی ہو تو اسی مخصوص آدمی کے لئے وصیت ہوگی اور وہی اس سے استفادہ کرسکتا ہے، کسی اور کے لئے استفادہ جائز نہیں ہوگا۔

۲-وصیت نہ کرنے کی صورت میں تمام ورثہ کی اجازت ضروری ہوگی، اس کے ایک بھی وارث نہ ہونے کی صورت میں ولی الامر کی اجازت ضروری ہوگی، بہرحال ورثہ اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں ولی الامر کی اجازت کے بغیر میت میں کسی طرح کا تصرف جائز نہیں ہوگا، ولی الامر سے اجازت کا مسئلہ مسلم ملک میں متحقق ہوگا، جہاں تک غیر مسلم جمہوری

ممالک کی بات ہے تو اس سلسلہ کی تفصیل وہی ہوگی جو مردہ کے جگر نکالنے کی شرطوں کے ذیل میں گذر چکی ہے، اجازت کی ضرورت اور ضروری ہونے کی وجہ بھی گذر چکی ہے، پیچھے ملاحظہ ہو۔

۳-نابینا کی بینائی لانے کی کوئی اور متبادل صورت نہ ہو (جیسا کہ فقہاء نے حرام چیز سے علاج کو اسی شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے)۔

۴-جس کی آنکھ کا قرنیہ لیا جارہا ہو اس کی مکمل طور پر موت واقع ہو چکی ہو۔

۵-قرنیہ نکالنے کے لئے جس حد تک آپریشن کی ضرورت پڑے اسی حد تک آپریشن کیا جائے گا، ضرورت سے زیادہ کرنے میں میت کی کھلی ہوئی اہانت لازم آئے گی، کیونکہ جو ممنوع چیز از راہ ضرورت مباح ہوتی ہے تو بقدر ضرورت ہی مباح ہوتی ہے، اس سے زیادہ نہیں "**ما أبيح للضرورة يقدر بقدرها**" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/۸۷)۔

۶-خرید وفروخت کا معاملہ نہ ہو۔

۷-مردہ کی آنکھ کا قرنیہ نکال کر زندہ نابینا شخص کے حلقہ چشم میں اس کی پیوندکاری کی کامیابی متعین ہو یا کم از غالب گمان ضرور ہو۔

ج-آئی بینک میں آنکھوں کا عطیہ:

مذکورہ بالا شرطوں کی رعایت کے ساتھ آئی بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے، البتہ زندہ مسلمان شخص یا مردہ مسلمان مرنے سے پہلے اپنے وصیت نامہ میں اور اسی طرح وصیت نہ کرنے کی صورت میں ورثہ اجازت دیتے وقت مزید اس شرط کا اضافہ کردے کہ میری آنکھ سے استفادہ کوئی مسلمان ضرورت مند نابینا یا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سیکولر ذہن کے حامل غیر مسلم استفادہ کرے، اسلام اور مسلم دشمن کو استفادہ کے لئے نہیں دی جائیگی۔

مذکورہ بالا تفصیلات وتصریحات اور احکام اس وقت ہیں جبکہ نابینا شخص کو بینائی فراہم کرنے کے لئے کوئی اور متبادل مصنوعی صورت نہ ہو، لیکن اگر زمانہ گذرنے کے ساتھ سائنسی ترقی اندھوں کو نور بصارت فراہم کرنے والی کوئی چیز دریافت کرلے تو زندہ شخص کی طرف سے ایک آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ کرنا اور لینا دونوں اصل کے اعتبار سے ناجائز ہوں گے، اسی طرح کسی مردہ کی بھی آنکھ نکالنا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ از راہ ضرورت جائز ہوا تھا، جب ضرورت باقی نہیں رہی تو حکم اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا، یعنی انسانی اعضاء سے انتفاع کا حرام وناجائز ہونا، اس کی تائید ایک فقہی قاعدہ سے ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ: "**ما جاز لعذر بطل بزواله**" (الأشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/۸۸)۔

ابھی چند دنوں پہلے روز چہارشنبہ ۲۸/جنوری ۲۰۱۵ کو ایک خوش کن خبر آئی کہ نابینا کو نور بصارت فراہم کرنے

والی عینک سائنس دانوں نے تیار کرلیا ہے، جیسا کہ ایجنسی فرانس پریس (اے ایف پی) نے واشنگٹن سے خبر دی ہے کہ کناڈا میں ایک ۲۹ سالہ اندھی ماں کی بے نور آنکھوں کو بصارت کے لمحات فراہم کرنے والی ایک سائنسی عینک کے ذریعہ اپنے نوزائیدہ بچے کو اور دیکھنے چھونے کے قابل بنایا گیا ہے، بلاشبہ یہ سائنس دنیا کا ایک قابل فخر اور لائق تحسین کارنامہ ہے، جس سے دیکھنے کی اہلیت اور نعمت سے محروم انسانیت فائدہ اٹھا سکے گی (روزنامہ مصنف ۲۸/جنوری ۲۰۱۵، صفحہ ۴)۔

لہذا ایسی صورت میں کسی زندہ یا مردہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ نکالنا، عطیہ دینا اور قبول کرنا درست نہیں ہوگا، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اور شریعت اسلامیہ کا اصول یہ ہے کہ جو کام شرعا ناجائز ہو تو اس کا کرنا اور کسی سے کرنے کا مطالبہ کرنا دونوں ناجائز وحرام ہوں گے "**ما حرم أخذه حرم إعطاؤه**"...... **ويقرب من هذا قاعدة: ما حرم فعله حرم طلبه**" (الأشباہ والنظائر ۱/۱۵۵)۔

۷-مردہ کے جگر وآنکھ کے حصول کے لئے کس کی اجازت معتبر ہوگی؟

پیچھے یہ بات آچکی ہے کہ بہر حال مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ بلکہ کوئی بھی عضو لینا ہو تو اجازت ضروری ہوگی تا کہ لاش کو مزید بے حرمتی واہانت اور مثلہ سے بچایا جا سکے، نیز اعضاء انسانی کے کاروبار ہونے سے روکا جا سکے، اس لئے اس میں کھلی ہوئی اہانت ہے، اب جہاں تک یہ سوال کہ کس کی اجازت معتبر ہوگی؟ تو اس سلسلہ میں تفصیل سے بات آچکی ہے کہ اولا خود مرنے والے کی وصیت موجود ہو تو ورثہ سے اجازت لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، البتہ ورثہ کے انکار پر وصیت کے ثبوت کے لئے مدعی وصیت پر بینہ پیش کرنا لازم ہوگا، اگر وصیت کر کے نہ مرا ہو، تو ورثہ کی اجازت لازم ہوگی، اس میں بھی تمام ورثہ کی رضامندی ضروری ہوگی، اس میں میت اور ورثہ دونوں کی اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں، اگر دونوں کی اجازت حاصل ہو تو اور بھی اچھی بات ہے، ورنہ مردہ کی وصیت کے ساتھ ساتھ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف سے آمادگی ضروری نہیں ہوگی، البتہ وصیت کی توثیق وثبوت کے لئے بینہ کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

۸-انسانی دودھ بینک:

اس سوال میں بنیادی طور پر دو باتیں قابل غور ہیں: اول آزاد عورت کے دودھ کی خرید وفروخت کا مسئلہ، یعنی دودھ بینک کو عوض لے کر دودھ دینا، دوسرا مسئلہ بلاعوض دینا، ان دونوں ہی صورتوں پر مبنی تیسرا مسئلہ جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ ہے حرمت رضاعت کا مسئلہ، ایک اور مسئلہ ضمنا پیدا ہوتا ہے کہ بینک کو دودھ فراہم کرنے کے لئے ایجنٹ کا کام کرنا، خواہ رضا کارانہ ہو یا عوض لے کر۔

انسانی دودھ کی خرید وفروخت:

اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، شوافع، اصحاب ظواہر میں ابن حزم اندلسی کے یہاں جائز ہے، حنابلہ کے نزدیک اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم دبستان فقہ حنبلی کے مشہور فقیہ علامہ ابن قدامہ کے نزدیک بیع کے جواز والا قول راجح ہے (المغنی ۴/۱۷۷)۔

جواز کے قائلین حضرات کا استدلال یہ ہے کہ یہ دودھ پاک ہے، قابل انتفاع ہے، اس میں غذائیت بھی ہے، جس طرح دیگر پاک جانوروں کے دودھ پاک، قابل انتفاع اور غذائیت کے حامل ہوتے ہیں، گویا حلال پاک جانوروں کے دودھ پر قیاس کرتے ہوئے انسانی دودھ کی خرید وفروخت اور اس کی ذخیرہ اندوزی کو ان حضرات نے جائز قرار دیا، نیز فرمایا: جو چیز شرعاً حرام ہو جیسے شراب وغیرہ تو اس کا پینا حرام، اس کا کاروبار حرام اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، لہٰذا اس کے برعکس جو چیز حلال ہے جس کا کھانا پینا درست ہے، تو اس کا ثمن بھی حلال ہوگا، الغرض مجوزین کے نزدیک انسانی دودھ مال متقوم ہے، اس لئے اس سے انتفاع ہر طریقہ سے درست ہوگا (دیکھئے: المغنی ۴/۱۷۷)۔

احناف اور بعض دوسرے فقہاء نے انسانی دودھ کی خرید وفروخت کو ناجائز اور بیع باطل قرار دیا ہے، کیونکہ عورت کی ذات انسان ہونے کی حیثیت سے پورے طور پر قابل احترام ہے، اور خرید وفروخت سے اس کی ذلت ورسوائی اور کھلی ہوئی اہانت ہے، لہٰذا جس طرح آزاد عورت کو خریدا بیچا نہیں جاسکتا، بلکہ اگر ایسا ہوا تو اس کی بیع باطل ہوگی، اسی طرح اس کے دودھ کی بھی خرید وفروخت ناجائز وحرام اور بیع باطل ہوگی، کیونکہ وہ انسان کا ایک جزء ہے، "**لم يجز بيع لبن المرأة؛ لأنه جزء الآدمي، وهو بجميع أجزائه مكرم عن الابتذال بالبيع**" (البحر الرائق ۶/۸۱، ہندیہ ۳/۱۱۴، ہدایہ مع الفتح ۶/۳۸۸-۳۸۹، بدائع ۶/۴۶۲)۔

نیز قابل غور بات ایک یہ بھی ہے کہ انسانی دودھ اپنے اصل کے اعتبار سے مال نہیں ہے، کیونکہ انسانی جسم کا کوئی حصہ مال نہیں، اور اس کا ایک حصہ دودھ بھی ہے، اس سے انتفاع ضرورت شدیدہ اور اضطرار کی حالت میں ہی جائز ہوگا، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حفظ نفس کے لئے ممنوع شرع چیز بھی جائز ہو جاتی ہے، جیسے کسی کے حلق میں لقمہ اٹک جائے، وہاں شراب کے علاوہ کوئی پاک مشروب موجود نہ ہو، تو فقہاء نے لکھا ہے کہ لقمہ کو حلق سے نیچے اتارنے کے لئے شراب کے چند گھونٹ پینا جائز ہے، "**ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة، وإساغة اللقمة بالخمر**" (اشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/۸۷)، اسی بنیاد پر نومولود بچہ کی جان بچانے کے لئے خلاف قیاس نص کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے، غرضیکہ ایک ضرورت کی وجہ سے انسانی دودھ سے انتفاع کو جائز قرار دیا ہے، اور بینک کی شکل میں دودھ کا ذخیرہ کرنا یا عام سامان کی طرح

اس کی خرید وفروخت کو جائز قرار دے کر عام کرنا ضرورت سے زائد عمل ہوگا، جس کی شریعت میں گنجائش نہیں۔

جہاں تک شافعیہ اور دوسرے فقہاء کرام کا دودھ کو مال متقوم سمجھنا محل نظر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مال متقوم قرار دینا قیاس ہے، جو قیاس نص کے مقابلہ میں ہو اس کا اعتبار نہیں ہوتا، "لا عبرة بالقياس في موردالنص"، اس لئے کہ نص سے انسان کا مکرم ومحترم ہونا ثابت ہے "ولقد كرمنا بني آدم" (اسراء:۷۰)، اور خرید وفروخت کا معاملہ اس کے احترام کے خلاف یعنی اس میں انسان کی واضح اہانت ہے۔

بینک کو دودھ مہیا کرنا:

بینک کو دودھ فراہم کرنا دو طریقے سے ہوسکتا ہے، ایک عوض کے ذریعہ، دوسرے بلاعوض، بینک سے عوض لے کر اسے دودھ دینا، بالفاظ دیگر اس سے خرید وفروخت کا معاملہ کرنا شرعاً درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ مال متقوم نہیں ہے، نیز اس میں انسان کی کھلی ہوئی اہانت وتذلیل ہے۔

بلا معاوضہ دودھ مہیا کرنا بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ بینک کو دودھ مہیا کرنے کی فقہ کی اصطلاح والی ضرورت وحاجت متقاضی نہیں، نیز بینک کو دودھ مہیا کرنا خواہ عوض لے کر ہو یا بلاعوض بہر حال فساد سے خالی نہیں، اس لئے کہ مختلف عورتوں کے دودھ کے مل جانے کی وجہ سے کس عورت کا دودھ کون سا ہے، شناخت باقی نہیں رہے گی، اور یہاں حساب رکھنا بھی عملاً مشکل ودشوار کام ہے، نتیجہ کے طور پر عورتوں کے دودھ مختلف ہونے کی وجہ سے اختلاط نسب لازم آئے گا، حرمت رضاعت ومصاہرت کا نظام درہم برہم ہوجائے گا، اور فاسد نکاحوں کا دروازہ کھل جائے گا، جس کے نتیجہ میں برائیاں عام ہوں گی، اور اللہ تعالی کی محرمات کی پامالی ہوگی "لأن حرمة المصاهرة تثبت بشربه، ففي إشاعته ببيعه فتح لباب فساد الأنكحة، فانه لايقدر على ضبط المشترين والبائعين فيشيع فساد الأنكحه بين المسلين" (فتح القدیر ۶/۳۸۹)، لہذا "درء المفاسد أولى من جلب المصالح" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/۹۱) قاعدہ کی رو سے دودھ بینک کو عوض دے کر یا بلاعوض کسی خاتون کا دودھ مہیا کرنا اور پھر اس دودھ کو ضرورت مند بچوں کے لئے فروخت کرنا سب ناجائز ہوں گے۔

حرمت رضاعت کا حکم:

مذکورہ بالا صورت جائز تو نہیں ہے، تاہم اگر دودھ بینک قائم ہو جہاں عورتوں سے عوض دے کر اور بلاعوض دودھ جمع کیا جاتا ہو، اور خریدنے والے لوگ وہاں سے انسانی دودھ خریدتے ہوں تو ایسی صورت میں حرمت رضاعت کا حکم یہ ہوگا کہ اگر متعین عورت کا دودھ حاصل نہ کیا گیا ہو بلکہ سب کا دودھ مخلوط ہو اور یہ معلوم ومتعین نہ ہو کہ کن کن عورتوں کا دودھ ہے تو

حرمت رضاعت کسی عورت سے ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ دودھ دینے والی عورتیں نامعلوم ومجہول ہیں۔

دودھ فراہمی کے لئے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا حکم:

جو کام شرعاً ناجائز ہو تو اس تک پہنچنے کے ذرائع اختیار کرنا بھی ناجائز، اس لئے کہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ''**التابع تابع**'' (حوالہ سابق ۱/۱۲۰)، یعنی مقصود جب ناجائز ہے تو ذرائع اس کے تابع ہوئے وہ بھی ناجائز، انسانی دودھ کا بینک قائم کرنا ناجائز، اس سے دودھ کی خرید وفروخت کا معاملہ کرنا ناجائز اس لئے اس کا ایجنٹ بننا بھی ناجائز، کیونکہ ایجنٹ بن کر خلاف شرع عمل پر تعاون لازم آتا ہے جو کہ گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان**'' (مائدہ:۲) (یعنی گناہ اور ظلم وزیادتی پر مدد مت کرو)، اسی بناء پر جس طرح لائف انشورنس ناجائز وحرام ہے تو اس کا ایجنٹ بننا بھی ناجائز وحرام۔

۹- مادہ منویہ کی خرید وفروخت اور کسی کو ہدیہ کے طور پر دینا:

مادہ منویہ کا بینک سے یا کسی ضرورت مند مرد یا خاتون سے خرید وفروخت کا معاملہ کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا شرعاً جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ مال نہیں ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے مادہ منویہ کی خرید وفروخت کو بیع باطل شمار کیا ہے، ''**البیع الباطل...... نحو بیع المیتة والدم والعذرة والبول وبیع الملاقیح والمضامین وکل ما لیس بمال**'' (بدائع الصنائع ۷/۳۰۴، نیز دیکھئے: عالمگیری ۳/۶۲)، مادہ منویہ انسانی جزء ہے، اور انسان اپنی پوری ذات واجزاء کے ساتھ مکرم ومحترم ہے ''**الآدمي بجمیع أجزائه مکرم**'' (بدائع ۶/۶۲۴، نیز دیکھئے: البحر ۶/۸۱، ہدایہ مع الفتح ۶/۳۸۸-۳۸۹)۔

اس کو سامان تجارت بنانا اور ہدیہ کے طور پر پیش کرنا انسانی تکریم کے خلاف اہانت ہے (دیکھئے: ہدایہ مع الفتح ۶/۳۸۸-۳۸۹، ہندیہ ۳/۱۱۴)، اس کے علاوہ مزید برآں دوسری شرعی قباحتوں کا ارتکاب بھی لازم آئے گا، اور وہ قباحتیں یہ ہیں:

۱- اللہ کے قانون کے خلاف بغاوت، اس لئے کہ جس مرد کا مادہ تولید حاصل کیا جائے گا، اس کے اور اس خاتون کے درمیان جس کے رحم میں ڈالا جائے گا، رشتہ زوجیت موجود نہیں ہے، لہٰذا یہ ایک غیر فطری عمل ہوگا، اور اللہ تعالیٰ نے جس طریقہ وفطرت پر رشتہ وناطے کو بنایا ہے، اس کے خلاف ہوگا۔

۲- بینک کے ذریعہ یا پرائیویٹ طریقہ پر مردوں کو تولیدی صلاحیت کے حامل جرثومے فراہم کرنے اور عورتوں کو تولید کے لائق بیضے مہیا کرنے سے اختلاط نسب لازم آئے گا اور خاندانی نظام تہس نہس ہوجائے گا۔

۳- اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے بے حیائی عام ہوگی اور غیر کے سامنے بے پردگی ہوگی، جس کی شریعت اسلامی میں اجازت نہیں ہے۔

مادہ منویہ کی بینکاری:

مادہ منویہ کی ذخیرہ اندوزی کرنے اور اولاد کی خواہشمند مرد و خواتین کی دیرینہ دلی آرزوؤں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے بینک قائم کرنے کی جہاں تک بات ہے تو شرعی نقطہ سے اس کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ اولاد ایک نعمت الٰہی ہے، اگر کوئی وقت پر اس نعمت سے محروم نظر آتا ہے تو اللہ تعالی کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالی نے قرآن مجید کے اندر انبیاء علیہم السلام کی زبانی لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ اولاد مجھ سے مانگو، میں مریم علیہ السلام کو بے موسم پھل اور کھانے کی انواع واقسام دے سکتا ہوں تو تمہیں اولاد بڑھاپے میں بھی دے سکتا ہوں، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کو عطا کیا، اگر کوئی اسباب کے اعتبار سے اولاد سے مایوس ہو چکا ہے، جیسے بانجھ پن کا شکار ہو چکا ہے، تب بھی اللہ تعالی بانجھ پن کو ختم کر کے اولاد عطا کرنے پر بھرپور قادر ہے، وہ اللہ جس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا، حضرت عیسی علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا، اور حضرت زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں حضرت یحیی علیہ السلام کی خوشخبری دی، جبکہ انہوں نے اللہ تعالی سے کہا تھا کہ اے اللہ مجھے اولاد کیسے ہوسکتی ہے؟ صورت حال تو یہ ہے کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بوڑھا ہو چکا ہوں، اللہ تعالی نے جواب دیا ”**کذلک یفعل الله ما یشاء**“ (آل عمران: ۴۵) (اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کر دیتا ہے)۔

اصولی طور پر جو چیز ناجائز ہو تو اس کو فروغ دینا، اس کے شیوع میں حصہ لینا، اس کی اشاعت میں ایک دوسرے کی مدد کرنا سب ناجائز و حرام ہوتے ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”**ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**“ (مائدہ: ۲) (گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرو)، اور فقہی قاعدہ ہے: ”**ما حرم فعله حرم طلبه**“ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/ ۱۵۵)، لہذا انسانی مادہ منویہ بینک قائم کرنا شرعا درست نہیں، کیونکہ اس سے معصیت الٰہی کا چرچا بڑھے گا، منکرات کو تقویت ملے گی، شیطان کا دل خوش ہوگا، رشتہ مصاہرت کا نظام تباہ ہوگا، اختلاط نسب لازم آئے گا، غرضیکہ قانون الٰہی کے خلاف بغاوت وفساد کو بڑھاوا دینا ہوگا۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

مولانا محمد عثمان بستوی☆

خون کا عطیہ سبب کی کس قسم میں داخل ہے:

کسی مریض کوخون کا عطیہ کرنے کوحضرات علماء علاج ومعالجہ میں داخل کرتے ہیں، لہذا مریض کوخون دینا اسباب ظنیہ میں داخل ہوگا، اوراس پر اسباب ظنیہ کے احکام مرتب ہوں گے، یعنی اگرظن غالب ہے یا ظن مشکوک ومحتمل ہے تواس پر اسی اعتبار سے احکام مرتب ہوں گے۔

"ان نقل الدم فی هذه الحالات وأمثالها يعتبر داخلا فی عموم الأمر بالتداوی الذی ثبت فی السنة الصحيحة عنه عليه الصلاة والسلام: تداووا عباد الله فان الله ما أنزل داء إلاوضع له دواء" (احکام جراحۃ الطبیہ/ ۵۸۲)۔

جب یہ متعین ہوگیا کہ خون دینا علاج ومعالجہ میں داخل ہے، لہذا مناسب ہے کہ خون سے علاج ومعالجہ کے احکام ذکرکردیئے جائیں، اس لئے اب اس کے بعد خون سے علاج ومعالجہ کا تفصیلی حکم ذکر کیا جاتا ہے۔

خون سے علاج کا حکم سمجھنے سے پہلے درج ذیل چند باتیں پیش نظر رہنی چاہئے۔

۱-خون اجزاء انسانی میں سے کس جزء سے مشابہت رکھتا ہے؟ ۲-اشیاء محرمہ کے حلال ہونے کی شرائط کیا ہیں، ۳-مریض کا مرض کس نوعیت کا ہے، مذکورہ بالا تینوں امور میں سے ہر ایک پر گفتگو کے بعد خون دینے کا حکم متعین کردیا جائے گا۔

۱-خون کی مشابہت:

اجزائے انسانی میں سے دواجزاء سے خون زیادہ مشابہت رکھتا ہے: ۱-دودھ سے، ۲-پیشاب سے۔ دونوں سے مشابہت اس معنی کرکے ہے کہ جس طرح دودھ بدن سے نکلنے کے بعد دوبارہ ازسرنو پیدا ہوجاتا ہے اسی طرح خون بھی بدن

☆ ریاض العلوم، گورینی، جونپور۔

سے نکلنے کے بعد دوبارہ از سرنو پیدا ہوجاتا ہے،جس طرح سے دودھ بچوں کے نشو ونما اوران کے بقاء وحیات کا ذریعہ بنتا ہے، اسی طرح سے خون بھی مریضوں کے لئے صحت،قوت وحفاظت جان کا سبب و ذریعہ ہوتا ہے،اس سے معلوم ہوا کہ خون کو دودھ سے بہت حد تک مشابہت حاصل ہے اور اسی طرح سے خون کو پیشاب سے کچھ نہ کچھ مشابہت ضرور حاصل ہے، مثلاً نجس ہونے میں کہ دونوں نجاست غلیظہ ہیں اور فضلہ بن کر کے خارج ہونے میں بھی مشابہت رکھتے ہیں، کہ پیشاب کی طرح سے حیض، نفاس، استحاضہ اور نکسیر وغیرہ کی شکل میں بدن سے نکل جاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ خون، دودھ، پیشاب اوصاف ذیل میں مشترک ہیں: ۱-متجد دہونا، ۲-جسم کی غذا بننا، ۳-حرمت کا ہونا، ۴-نجس ہونا، ۵-خود سے خارج ہونا۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوگیا کہ خون کو دودھ اور پیشاب سے مشابہت حاصل ہے اور دودھ و پیشاب سے علاج و معالجہ تداوی بالمحرم میں داخل ہے، اسی طرح سے خون کا عطیہ بھی تداوی بالمحرم میں داخل ہوگا۔

۲-اشیاء محرمہ کے حلال ہونے کی شرائط:

کسی حرام چیز کے حلال ہونے کی کل تین شرطیں ہیں: ۱-حالت اضطرار کی ہو کہ حرام استعمال نہ کرنے میں جان کا خطرہ ہو، ۲-یہ خطرہ محض موہوم نہ ہو بلکہ کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کے کہنے کی بنا پر یا عادتاً یقینی جیسا ہو، ۳-یہ کہ اس حرام کے استعمال سے جان بچ جانا بھی کسی ڈاکٹر یا حکیم کی تجویز سے عادۃً یقینی ہو، ان تینوں شرطوں کے ساتھ باتفاق فقہاء امت استعمال حرام ہوجاتا ہے (جواہر الفقہ ۲/۳۰)۔

"أفاد سیدی عبد الغنی أنه لا یظهر الأختلاف فی کلامهم لا تفاتهم علی الجواز للضرورة واشتراط صاحب النهایة العلم لا ینافیه اشترامن بعد الشفاء ولذا قال والدی فی شرح الدرر أن قوله للتداوی محمول علی المظنون وإلا فجوازه بالیقینی إتفاقی کما صرح به فی المصفی أقول وهو موافق لما مرفي الاستدلال بقول الامام لکن قد علمت أن قول أطباء لا یحصل به العلم، والظاهر أن التجربة تحصل غلبة الظن دون الیقین إلا أن یرید وابالعلم غلبة الظن وهو شائع فی کلامهم فتأمل" (شامی ۱/۳۶۵ زکریا)۔

مرض کے اعتبار سے خون دینے کی تفصیل:

۱-اگر اضطرار کی حالت ہے اور اشیاء محرمہ کے علاوہ کوئی دوسری چیز جان بچانے کے لئے موجود نہیں ہے، تو ایسی صورت میں باتفاق ائمہ اربعہ حرام چیز کا استعمال کرنا جائز ہے، اسی طرح سے اگر جان کا بچنا خون پر موقوف ہو تو اس حالت میں بلاشبہ خون لینا اور دینا دونوں جائز ہے، جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

"لوتعین الحرام مدفعا للھلاک یحل کالمیتة والخمر عند الضرورة وتمامه فی البحر"(شامی ۱/۳۶۵، البحر الرائق ۱/۱۱۵)۔

۲-اگر اضطرار کی حالت تو نہ ہو لیکن طبیب حاذق کے فیصلہ کے مطابق خون کے بغیر بیماری سے چھٹکارہ ملنے کی امید نہ ہو تو حضرات طرفینؒ کے مطابق خون لینا اور دینا جائز نہیں، لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق خون دینا اور لینا دونوں جائز ہے۔"ویجوز للعلیل شرب البول والدم والمیتة للتداوی إذا أخبره طبیب مسلم أن شفاء ہ فیه ولم یجد من المباح ما یقوم مقامه"(۹/۵۵۸)۔

۳-اگر خون نہ دینے کی صورت میں مرض کے طویل ہونے کا ظن غالب ہو تو بھی خون دینے کی گنجائش ہے، البتہ احتراز بہتر ہے۔

"وإن قال الطبیب یتعجل شفاء ک به فیه وجهان"(شامی ۹/۵۵۸)۔

نوٹ: اگر خون علاج ومعالجہ کے مقصد سے نہیں بلکہ تحصیل قوت کے لئے لگوانا ہو تو اس کی بالکل اجازت نہیں۔

"لأن الدم المسفوح حرام لقوله تعالی "حرمت علیکم المیتة والدم"۔

دوسرے کے ساتھ تعاون کا حکم شرعی:

۱-اگر اضطرار کی حالت ہو اور اس کی جان کا بچنا کسی کے تعاون پر موقوف ہو اور تعاون کرنے والے کا تعاون کرنے کی صورت میں ضرر بین نہ ہو تو ایسی صورت میں تعاون کرنا واجب ہے، البتہ اگر تعاون کرنے والے کا ضرر بین ہو تو تعاون واجب نہیں۔

۲-اگر اضطرار کی حالت نہ ہو بلکہ ضرورت واحتیاج کی حالت ہو تو ایسی صورت میں تعاون کرنا واجب نہیں، لیکن مستحب ضرور ہے، کسی ضرورت مند انسان کے کام آنے کی بڑی فضیلتیں آئی ہیں۔

"وتکون الإعانة مندوبة إذا کانت فی خیر لم یجب"(موسوعہ ۵/۱۹۷)۔

غیر مسلم کے ساتھ ہمدردی اور تعاون:

غیر مسلموں کے ساتھ انسانی بنیادوں پر ہمدردی وغم خواری اور حسن سلوک بھی اللہ تعالی کو پسند ہے، انفرادی طور پر حسن سلوک کی تاکید تو قرآن کریم نے اس طرح فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص کے والدین مشرک ہوں تو شرک میں تو ان کی اطاعت جائز نہیں ہے لیکن ان کے ساتھ دنیا میں حسن سلوک ضروری ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے:

"وان جاھداک علی أن تشرک بي مالیس لک به علم فلا تطعهما وصاحبهما فی الدنیا

معروفا"(سورۂ لقمان)۔

"لاينهاكم الله من الذين لم يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم أن تبروهم وتقسطوا إليهم"(ممتحنہ)۔

اس میں انفرادی طور پر کسی غیر مسلم کے ساتھ حسن سلوک بھی داخل ہے، حضور ﷺ کی سیرت طیبہ میں اس کے بھی بہت سے واقعات موجود ہیں، صحیح بخاری میں کئی مقامات پر یہ واقعہ آیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی والدہ مشرکہ تھیں اور مدینہ منورہ آئیں اور اپنی بیٹی سے کچھ مالی مدد کی توقع ظاہر کی، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:"صلی أمک"(یعنی اپنی والدہ کے ساتھ نیک سلوک کرو)۔

خون دینے کی شرائط:

۱-خون دینے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ خون دینے والا خون دینے کی وجہ سے خود ضرر، حرج اور مرض میں مبتلا نہ ہو، لہذا اگر خون دینے والے کو ضرر لاحق ہو تو اس کے لئے خون دینا درست نہیں، کیونکہ جب وہ خود اس کا ضرورت مند و محتاج ہے تو اپنا ضرر برداشت کر کے دوسرے کو ایسا نفع پہنچانا جو مشکوک و متحمل ہو کسی طرح درست نہیں، اس لئے کہ نفع مشکوک کے لئے ضرر متیقن کو برداشت کرنا اصول شرعیہ کے خلاف ہے۔

"قد تعارض هنا إضراران إضرار صاحب اليد والملک، وإضرار من لا يدله ولا ملک والمعلوم من الشريعة تقديم صاحب اليد والملک، ولا يخالف فى هذا عندالمزاحمة على الحقوق"(الموافقات للشاطبی ۲/۳۵۲)۔

"وقد يتعين عليه حق نفسه فى الضروريات فلا يكون له خيرة فى إسقاط حقه لأنه من حقه على بينة"(الموافقات للشاطبی ۲/۳۵۱)**وفيه ايضا ومن حق غيره على ظن وشک۔**

۲-خون دینے کے لئے دوسری شرط یہ کہ جس مریض کو خون دیا جائے وہ خون کا محتاج و ضرورت مند بھی ہو اور ضرورت کی تشخیص کسی طبیب حاذق نے کی ہو۔

"لأن الدم نجس وحرام فلا يجوز إلا عند الاحتياج والضرورة لقوله تعالى: إنما حرم عليكم الميتة والدم ......فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" ۔

۳-تیسری شرط یہ ہے کہ خون کا کوئی متبادل موجود نہ ہو، **"عندوجود البديل لا يتحقق الا حتياج"** (شرح المجلۃ المادہ ۱/۲۰-۲۲)۔

۴-چوتھی شرط یہ ہے کہ خون صرف ضرورت کے بقدر دیا جائے،"وما أبیح للضرورة یقدر بقدرها"(الاشباہ والنظائر/۸۶)۔

"(فالحاصل)شروط جواز نقل الدم ینحصر فی الشروط الأربع أن یکون المریض محتاجا إلی نقل الدم، وأن یتعذر البدیل، وأن لا یتضرر شخص المنقول منه الدم بأخذه منه، وأن یقتصر فی نقل الدم علی مقدار الحاجة"(احکام الجراحۃ الطبیہ/ص ۵۸۳)۔

مریض کو خون دینے کا حکم:

شریعت مقدسہ نے ضرورت ومجبوری کے وقت حرام وناپاک چیزوں سے بھی دواء علاج کی رخصت دی ہے،لہذا جب کوئی ماہر ڈاکٹر مریض کی صحت کے لئے خون کو ضروری قرار دے تو ایسی صورت میں خون دینے کی شرعا اجازت ہے، مریض خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، کیونکہ خون دینا ہمدردی وتعاون ہے اور غیر مسلموں کے ساتھ بھی انسانی بنیاد پر ہمدردی وغمخواری حسن سلوک اللہ کو پسند ہے، جیسا کہ تفصیل سے گذرا، حاصل یہ کہ مذکورہ تفصیل شرائط وغیرہ ملحوظ رکھ کر خون دینا جائز ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، البتہ اگر اضطراری حالت ہو اور مریض صرف خون کی کمی کے باعث اپنی جان کھوتا ہوا نظر آئے اور خون دینے کی صورت میں اس کا جانبر ہوجانا ظن غالب اور یقین کے درجہ میں ہو تو ایسی صورت میں خون فراہم کرنا صرف جائز ہی ہے یا واجب؟ اور اگر اس کے خون کا گروپ صرف کسی ایک شخص سے ملے تو اس کے ذمہ خون دے کر اس کی جان بچانا لازم ہے کہ نہیں یہ دو مسئلہ تحقیق طلب ہیں:

خون دینا کس کے ذمہ لازم ہے؟ اور کب؟

اگر خون بآسانی کسی شخص سے بھی مل جائے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں،لیکن اگر خون آسانی اور سہولت سے دستیاب نہ ہو تو ایسی صورت میں مریض کی حالت کے اعتبار سے خون دینے والے کی تعیین ہوگی، مریض کی حالت کے اعتبار سے دو قسمیں ہوتی ہیں:۱-اضطرار کی حالت ہو لیکن خون ملنے کے بعد بھی صحت کا یقین اور ظن غالب نہ ہو، یا مریض خطرہ سے باہر لیکن جلد شفایابی کے لئے خون کی حاجت ہو تو ایسی صورت میں شرعا کسی کے ذمہ خون دینا واجب اور لازم نہیں، کیونکہ اس حالت میں خون کی فراہمی یہ علاج ومعالجہ کی قسم میں داخل ہو کر اسباب ظنیہ محتملہ کے قبیل سے ہوگی، اور ظاہر ہے مریض کے لئے خود ایسی صورت میں خون لینا واجب نہیں تو دوسرے کے ذمہ خون دینا واجب ولازم کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے اس صورت میں خون دینا کسی کے ذمہ شرعا واجب نہیں،لیکن چونکہ مریض قابل ترس وقابل رحم ہوتا ہے اور اس کے ورثاء واولیاء کے ذمہ اس کی دیکھ ریکھ اور تیمارداری اور اس کے ضروریات کی فراہمی ان کے ذمہ لازم ہوتی ہے، اسی طرح سے ان کا اخلاقی فریضہ خون دینے کا

بھی بنتا ہے کہ جب مریض کو خون کہیں سے دستیاب نہ ہوتو اس کے ورثاء اور اولیاء کے اخلاقی ذمہ داری ہوگی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ اس کا انتظام کریں، خواہ اپنے جسم سے نکلوائیں یا کسی اور طرح سے حاصل کریں۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ مریض کے تمام اعضاء صحیح سالم ہیں، صرف کسی حادثہ وغیرہ کی وجہ سے وہ اس قدر خون کی کمی کا شکار ہو گیا ہے کہ اگر اس کو خون نہ دیا جائے تو اس کی موت کا یقین اور ظن غالب ہو اور خون دینے کی صورت میں جان کا بچنا بھی یقین کے درجہ میں ہو تو ایسی صورت میں اس کو خون دینا بہر حال واجب ہے، اگر ان لوگوں میں سے کسی کا خون اس سے میل کھاتا ہے جس کے ذمہ اس کا نفقہ لازم ہوتا ہے اور وہ خون دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں تو ایسی صورت میں بھی اعزاء کے ذمہ خون کی فراہمی لازم ہوگی، خواہ اپنے جسم سے نکلوا کر دیں یا کسی اور طرح سے حاصل کریں "**قد عللوا وجوب النفقة عليه بأنه جزء فصار كنفسه**" (الجراحۃ/ ۳۶۳)، لیکن اگر مریض کا خون اپنے اعزا میں سے کسی سے میل نہیں کھاتا ہے تو پھر جس اجنبی سے بھی اس کا خون میل کھائے تو اس کے ذمہ خون دینا واجب ہے، اس لئے کہ انقاذ مسلم بہر حال واجب ہے، "**إنقاذ الآدمي واجب على كل مسلم**" (موسوعۃ الفقہیہ ۲۷/ ۲۳) "**من قد أجهده الجوع حتى يخاف عليه التلف فيلزمه ان يعطيه ما بسد جوعه**" (احکام القرآن ۱/ ۱۶۰)۔

بلڈ بینک میں خون کا عطیہ:

اس سے پہلے تفصیلی بحث سے یہ بات متحقق ہوگئی ہے کہ مریض اگر حالت اضطرار میں ہو یا خون کے بغیر اس کے صحت کی امید نہ ہو یا صحت میں تاخیر کا ظن غالب ہو تو ایسی حالت میں مریض کو خون کا عطیہ کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن جب مریض سامنے نہ ہو اور خون بعد میں آنے والے مریضوں کے لئے نکلوایا جائے تو ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فی الحال خون کی ضرورت متحقق نہیں، اس لئے خون کا عطیہ کرنا بلا ضرورت اپنے خون کو نکلوانا ہوگا اور اس کی اجازت معلوم نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ اسی کو بنیاد بنا کر بہت سے مفتیان کرام نے مریض کے علاوہ کسی دوسرے موقع ومحل میں خون کا عطیہ کرنے کو جائز نہیں کہا ہے، اس لئے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلڈ بینک میں اپنے خون کا عطیہ کرنا تا کہ بعد میں آنے والے مریضوں کے کام آسکے جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو جن شبہات کی بنیاد پر عدم جواز کا حکم لگایا گیا ہے تو ان شبہات کا جواب کیا ہوگا، لہذا اس مسئلہ کا حکم لکھنے سے قبل چند اصولی باتیں لکھی جاتی ہیں تا کہ حکم منقح ہونے کے ساتھ ساتھ شبہات کا جواب بھی ہو جائے۔

۱- اپنے علاج کی غرض سے خون نکلوانے کا حکم:

اپنے علاج وصحت کے لئے خون نکلوانے کا ثبوت درج ذیل نصوص شرعیہ سے ہوتا ہے، لہذا اپنے علاج وبقاء صحت

کے لئے خون نکلوانے کی شرعاً اجازت ہوگی۔

"حدیث عبدا لله بن عباسؓ أن النبي ﷺ احتجم فی رأسه"(احکام الجراحۃ الطبیہ ص۸۷)۔

"حدیث جابر بن عبد اللهؓ أنه عادمریضا ثم قال: لا أبرح حتی تحتجم فانی سمعت رسول الله ﷺ یقول: إن فیه شفاء"(احکام الجراحۃ الطبیۃ/۸۷)۔

"حدیث أنس بن مالکؓ وفیه أن النبی ﷺ قال: إن أمثل ماتداویتم به الحجامة والفسط البحری"(احکام الجراحۃ الطبیۃ ص۸۷)۔

"حدیث جابر بن عبد اللهؓ قال: بعث رسول الله ﷺ إلی أبي بن کعب طبیبا فقطع منه عرقا ثم کراه علیه"(احکام الجراحۃ الطبیۃ ص۸۸)۔

۲-بغیر مرض کے بھی خون نکلوانا مفید ہے:

اطباء کی تحقیق کے مطابق اگر خون نکلوانے کے تمام طبی اصول وشرائط کوملحوظ رکھا جائے توخون نکلوانا انسانی صحت کے لئے مفید ہے اور بہت سے امراض کے لئے حفاظت کا ذریعہ ہے، چنانچہ ڈاکٹروں کا اکثر بیان اخبارات میں یہ آتا رہتا ہے کہ خون نکلوانے سے انسانی صحت پر کسی بھی طرح کا کوئی غلط اثر نہیں پڑتا ہے، بلکہ جسم میں نئی توانائی پیدا ہوجاتی ہے اور جسم سے نکلا ہوا خون ۲۴ گھنٹہ میں اپنی کمی کی تکمیل بھی کرلیتا ہے(انقلاب ۱۲/اکتوبر ۳-۴/۲۰۱۴ء)۔

ڈاکٹروں کی اس یقین دہانی کو بنیاد بنا کر حضرات علماء نے بھی خون نکلوانے کو بغیر مرض کے بھی علاج میں داخل مانا ہے۔اورنصوص مذکورہ بالا کی روشنی میں خون نکلوانے کو جائز کہا ہے۔

"أنه لا حرج علی الشخص المتبرع فی إخراج سائل الدم من جسمه بل إن خروجه یعتبر علاجا ودواء ففیه منفعة ومصلحة لبدنه ولذلک وردالسنة بمشروعیة التدوی بالحجامة کما ثبت ذلک بقوله علیه الصلاة والسلام وفعله"(احکام الجراحۃ الطبیۃ ص۵۸۲)۔

۳-ضرورت متیقن الوجود فی المستقبل بھی شرعاً معتبر ہے:

جس طرح سے ضرورت موجودہ فی الحال رخصت کا سبب بنتی ہے، اسی طرح سے ضرورت متیقنہ فی المآل کی وجہ سے بھی رخصت حاصل ہوجاتی ہے، مثلاً جو شخص فی الحال صحت مند وتندرست ہو، لیکن پانی کے استعمال کرنے کی صورت میں مرض پیدا ہوجانے کا ظن غالب ہو تو شریعت اس کو تیمّم کی اجازت دیتی ہے، اسی طرح سے اگر پانی فی الحال اپنی ضروریات سے زائد ہو لیکن مستقبل میں پینے کی ضرورت پیش آنے کا ظن غالب ہو تو مستقبل کی ضرورت کے لئے پانی کا محفوظ رکھنا اور تیمّم

کر کے نماز ادا کرنا شرعا جائز ہے تو اس میں بھی جو ضرورت فی الحال نہیں بلکہ مستقبل میں پیش آنے والی ہیں اس کا بھی اعتبار کر کے تیمّم کی اجازت دی گئی۔

"جاز التیمم من عجز عن استعمال الماء لمرض أوخوف عدوأوعطش ولولکبد أو رفیق القافلة حالا أو مآلا" (شامی باب التیمّم ص۳۹۹-۳۹۸)۔

اسی طرح مضطر کے لئے اشیاء محرمہ سے اکل وشرب جائز ہے اور اس اکل وشرب کے بعد جب اضطرار کی حالت ختم ہوجائے اور مستقبل میں بھی اس کی ضرورت پیش آنے کا ظن غالب ہو تو اس مستقبل کی ضرورت کے لئے اشیاء محرمہ دم، میتہ، خمر وخنزیر کا ذخیرہ کرنے اجازت حضرات فقہاء کے کلام میں ملتی ہے، اس مسئلہ میں بھی ضرورت مستقبلہ کا اعتبار کر کے اشیاء محرمہ کی ذخیرہ کی اجازت دی گئی ہے۔

"ویتفق الشافعیة والحنابلة فی أصح الروایتین مع المالکیة في جواز التزودمن المحرمات إذا خشی الضرورة فی سفره" (الفقہ الاسلامی ۳/۵۲۲)۔

بلڈ بینک قائم کرنے کا حکم:

بلڈ بینک کا حکم معلوم کرنے سے پہلے اس میں انجام دیئے جانے والے امور واحکام کا معلوم ہونا ضروری ہے تا کہ تعیین حکم میں کسی طرح کا اشتباہ باقی نہ رہے، بلڈ بینک میں تین اہم امور انجام دیئے جاتے ہیں: ۱-خون نکالنا، ۲-اس کو محفوظ کرنا، ۳-لوگوں کو فراہم کرنا۔

کسی کے جسم سے خون نکالنے کا پیشہ:

شریعت کی نگاہ میں خون نکالنا جائز ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے حجامت یعنی پچھنہ لگوا کر خون نکلوایا، اور خون نکالنے والے کو اجرت بھی عطا فرمائی، اس سے حضرات فقہاء نے حجامت یعنی خون نکالنے کا عمل اور اس کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔

"جاز اجرة الحجام لأنه علیه الصلاة والسلام احتجم وأعطی الحجام أجرته، وحدیث النهی عن کسبه منسوخ–ولوعلم کراهیة لم یعطه–وفی روایة السنن ولوعلمه خبیثا لم یعطه" (شامی ۹/۷۲ زکریا)۔

۲-فقہاء کا ایک ضابطہ ہے کہ مصالح عامہ ضرورت خاصہ کے درجہ میں ہوجاتی ہیں اور ناگہانی حوادث کا پیش آنا اور کثیر مقدار میں خون کی ضرورت پڑنا مشاہد ومسلم ہے، اس لئے ناگہانی حوادث کے لئے خون کو محفوظ رکھنا مصالح عامہ کی قبیل

سے ہوگا اور مصالح عامہ بہ ضرورت خاصہ کے درجہ میں ہوتی ہے، لہذا خون کی حفاظت کرنا اور مستقبل کے لئے اس کو بلڈ بینک میں محفوظ رکھنا ضرورت خاصہ کے حکم میں ہوگا، فقہی مجلّہ میں ہے: جب کوئی اجتماعی حاجت ضرورت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو وہ شخصی طور پر بھی حاجت نہیں ضرورت قرار دی جائیگی (حاجت وضرورت: ۱۶۴)۔

"علل العز بن عبد السلام جوازتناول الحرام حينئذ دون أن يقتصر على الضرورات بقوله لأن المصلحة العامة كالضرورة الخاصة" (الفقہ الاسلامی ۳/ ۵۲۷)۔

نیز ضرورت متیقنہ فی المستقبل کے لئے اشیاء محرمہ کے ذخیرہ کی اجازت حضرات فقہاء کرام بھی دیتے ہیں، مثلاً مضطر جب میتہ سے بقدر ضرورت کھالے اور اس کا اضطرار ختم ہوجائے تو اضطرار کے ختم ہونے کے بعد مستقبل کی ضرورت کے لئے میتہ کے ذخیرہ کی اجازت ہے۔

"قال المالكية على المعتمد: يجوز للمضطر التناول من الحرام حتى يشبع وله التزودمن الميتة ونحوها إذا خشي الضرورة فى سفره، لأنه لا ضرر فى اعدادها لدفع ضرورته وقضاء حاجته......إن كانت المجاعة عامة مستمرة فلا خلاف بين العلماء فى جواز الشبع من الميتة ونحوها من سائر المحظورات، ويتفق الشافعية والحنابلة فى أصح الروايتين مع المالكية فى جواز التزودمن المحرمات ولورجا الوصول إلى الحلال" (المختصر من الفقہ الاسلامی ۲/ ۵۲۷)۔

انسانی ضرورت میں کام آنے والی اشیاء محرمہ کی حفاظت اور اس کی فراہمی:

جو چیزیں انسانی ضروریات میں کام آئیں شرعاً اس کو محفوظ کرنے اور دوسرے لوگوں کو فراہم کرنے کی بھی اجازت ہے، مثلاً حیوانی غلاظت، نیز انسانی فضلات کی خرید وفروخت کو اسی بنیاد پر جائز قرار دیا گیا ہے کہ یہ چیزیں زراعت وغیرہ کے لئے کام آتی ہیں، تو جب کھیتی کی ضرورت کو معتبر مانا گیا تو انسانی جان کی حفاظت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑے گرچہ وہ نجس وحرام ہوں یہ ضرورت کھیتی کی ضرورت سے بدر جہا بڑھی ہوئی ہے، لہذا انسانی ضرورت کے پیش نظر اس کو محفوظ کرنے اور اس پر آنے والے ضروری اخراجات کو لے کر فراہم کرنے کی شرعاً اجازت ہوگی۔

"كره بيع العذرة رجيع الآدمى خالصة لا يكره بل يصح بيع السرقين أمي الذبل خلافا للشافعي وصح بيعها مخلوطة بتراب أورماد غلب عليها فى الصحيح كما صح الانتفاع بمخلوطها اى العذرة بل بها خالصة على ما صححه الزيلعى وغيره خلافا لتصحيح الهداية فقد اختلف التصحيح، وفى الملتقى أن الانتفاع كالبيع أى فى الحكم فانهم–الظاهر أنه أشار بنقله على أن

تصحيح الانتفاع بالخالصة تصحيح لجواز بيعها أيضا"(شامی ص۵۵۲-۵۵۳)۔

ایک ضابطہ عامہ:

جب شریعت کسی چیز کی اجازت دیتی ہے تو جتنی چیزیں اس کے لئے لازم وضروری ہوں گی ان سب کی بھی اجازت لزوما ثابت ہوجاتی ہے، اسی لئے علماء کرام نے "**اذا ثبت الشي ثبت بلوازمه**" کے ضابطہ سے بلڈ بینک کے نظام وغیرہ کی اجازت دی ہے، چنانچہ آپ کے مسائل اوران کے حل میں ہے کہ اضطرار کی حالت میں مریض کی جان بچانے کے لئے خون دینا جائز ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر خون کا لینا، رکھنا اوراس کی خرید وفروخت جائز ہے (آپ کے مسائل اوران کا حل ۴/۴۴۲)۔

"**الضرورات تبيح المحظورات أى أن الأشياء الممنوعة تعامل كالاشياء المباحة وقت الضرورة**"(شرح المجلہ ۱/۲۹)۔

ان دونوں مسئلوں میں علماء کرام ومفتیان عظام کی آراء مختلف ہیں، چنانچہ فتاوی رحیمیہ (۱۰/ص ۱۷۳ اورصفحہ ۱۶۱) اور (محمود الفتاوی ۴/۵۶۷) میں عدم جواز کے پہلو کو اختیار کیا گیا ہے، اس کے برعکس آپ کے مسائل اوران کے حل، فتاوی قاضی، نظام الفتاوی، جدید فقہی مسائل وغیرہ میں جواز کے پہلو کو اختیار کیا گیا ہے، مجوزین کے دلائل میں ناگہانی ضرورت کا پیش آنا اور "**إذا ثبت الشي ثبت بلوازمه**"وغیرہ کو ذکر کیا گیا ہے، اورعدم جواز کی دلیل میں "**الضرورة تقدر بقدر الضرورة**" سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ بلڈ بینک میں خون دینے کے وقت اضطراری حالت پیدا نہیں ہوتی، اس لئے خون دینا جائز نہیں۔

زندہ انسان کا اپنے کسی عضو کو عطیہ کرنے کا حکم:

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں نمبر ۵ کا یہ حکم منقح ہوکر سامنے آجاتا ہے کہ کسی بھی زندہ انسان کے لئے اپنی حالت حیات میں اپنے کسی عضو کا تبرع کرنا شرعا حرام وناجائز ہے، شریعت مقدسہ کی کسی بھی دلیل صحیح سے اس کا جواز ممکن نہیں، کیونکہ اس تبرع سے اگر جان کا ضیاع ہوا تو یہ خودکشی یا اقدام خودکشی ہے اوراگر جان کا ضیاع نہیں ہوا تو تغیر خلق اللہ اورامانت الہی میں خیانت اورضرر ادنی کا ضرر اعلی سے دفع کرنا بہرحال لازم آتا ہے، اس طرح سے کہ جس کو تبرع کیا جائے گا اس کی جان کا بچنا یقینی نہیں، لہذا زیادہ سے زیادہ یہ علاج ومعالجہ میں داخل ہوگا، اورتبرع کرنے والا اپنے اعضاء کو گنوا کر اصول فقہیہ کے مطابق اضطرار اوراکراہ ملجی کا شکار ہوگا، لہذا دوسرے کے نفع ظنیہ کے لئے اپنے نقصان قطعیہ کو اختیار کرنا نہ تو اصولا درست ہے اورنہ ہی شرعا وعقلا جائز، اس موضوع پر بندہ کی نگاہ سے جو سب سے اہم کتاب گذری وہ "احکام جراحۃ الطبیۃ" کے نام

سے موسوم ہے، اس میں دونوں طرح کے دلائل ذکر کرنے کے بعد ان کا موازنہ کیا گیا اور موازنہ میں جو ترجیح دی گئی وہ یہ ہے کہ کسی بھی مسلم کے عضو کو منتقل کرنا خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ جائز نہیں، اصولی طور پر بات یہی راجح اور محقق ہے، البتہ مرخصین کے آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر مردہ انسان کے عضو کو منتقل کرنے کی اجازت دی جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مردہ انسان کے اعضاء کے عطیہ کا حکم:

شریعت مقدسہ نے جس طرح سے ایک زندہ انسان کو مکرم و معظم بنایا ہے، اسی طرح شریعت کی نگاہ میں روح نکلنے کے بعد بھی اعضاء انسانی کی تکریم واجب ہے، لہذا کسی مردہ انسان کی اہانت اور اس میں قطع و برید اسی طرح سے ناجائز ہے، جس طرح زندہ انسان کے جسم میں کاٹ چھانٹ ناجائز ہے، لیکن مردہ کے مقابلے میں زندہ انسان کی اہمیت کہیں زیادہ ہے، ایک مسلم انسان کی قیمت دنیا و مافیہا سے برتر ہے، "**ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**"۔

اس لئے اگر کسی زندہ مسلمان کی جان کا بچنا کسی مردہ انسان کے عضو پر موقوف ہو کہ اس کے عضو کے بغیر اس کی جان بچانا ممکن ہو تو ایسی صورت میں ذکر کردہ اصول و تصریحات فقہاء کو پیش نظر رکھنے سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ مردہ انسان کا عضو زندہ کی جان بچانے کے لئے ضرورت و مجبوری کی بنیاد پر دے دیا جائے، خصوصا موجودہ زمانے میں سرجری کے اس درجہ ترقی کر جانے کی وجہ سے مردہ جسم سے اعضاء کے نکالنے میں اہانت محسوس نہیں ہوتی ہے اور عرفا بھی اس کو بعض لوگ اہانت نہیں خیال کرتے، بہر حال زندہ انسان کی حفاظت کے لئے مردہ کے عضو سے استفادہ کرنے اور اس کا عطیہ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن شرائط ذیل کا خیال کرنا لازم و ضروری ہے۔

۱-مریض حالت اضطرار میں ہو، ۲-انسانی عضو کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا بدل موجود نہ ہو، ۳-مردہ کے عضو سے زندہ کی جان کا بچنا ظن غالب کے درجہ میں ہو، جس کی یقین دہانی ماہر تجربہ کار ڈاکٹروں نے کرائی ہو، حاصل یہ کہ زندہ آدمی کی جان بچانے کی خاطر میت کی لاش میں تصرف کیا جا سکتا ہے، اس لئے پیوندکاری کی خاطر اگر میت کے ورثاء کی اجازت سے جسم کا کوئی کارآمد حصہ نکال لیا جائے تو مصلحت اور ضرورت کی بنا پر جائز ہوگا، اسی طرح حادثہ وغیرہ کا شکار ہو جانے والے غیر معلوم اشخاص اور خاص طور پر غیر معلوم کی لاش سے کارآمد اجزاء علاحدہ کر لینا تاکہ کسی کی جان بچائی جا سکے یا آنکھ وغیرہ سے معذور شخص کی اعانت کی جا سکے از روئے شرعا جائز ہوگا۔

میت کے نقل اعضاء میں اجازت کا مسئلہ:

اس مسئلہ کا حکم متعین کرنے سے پہلے درج ذیل اصولی باتیں پیش نظر رہیں تاکہ تعین حکم میں آسانی ہو۔

۱-مابعد الموت وصیت و اجازت کے شرعا معتبر ہونے کے لئے موصی بہ (یعنی جس چیز کی وصیت کی جائے) کا عقد

کے ذریعہ سے قابل تملیک ہونا شرط ہے، خواہ وہ مال کے قبیل سے ہو یا نفع کے قبیل سے۔

"**وكون الموصى به قابلا للتمليك بعد موت الموصى بعقد من العقود مالا أو نفعا**" (درمختار مع شامی ۱۰/۳۳۸)۔

۲- انسانی اعضاء قابل تملیک نہیں، "**بطل بيع لبن إمرأة ولو فى وعاء ولو أمة على الأظهر، لأنه جزء آدمى**" (درمختار ۹/۲۶۴)۔

۳- انسان جس طرح سے حالت حیات میں مکرم ومحترم ہے، اسی طرح وفات کے بعد بھی، لہذا اس کے ساتھ احترام واکرام کے خلاف کوئی معاملہ کرنا شرعا حرام وناجائز ہے۔

"**ولقد كرمنا بنى آدم**" (ابنی اسرائیل)، "**لقول النبی ﷺ: ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا**" (احکام الجراحۃ ص ۳۶۱) "**وعنه: و كسر عظم الميت ككسر عظم الحي فى الاثم**" (احکام الجراحۃ ص ۳۶۲)، "**والآدمي مكرم شرعا ولو كان كافرا فإيراد العقد عليه وإبتذاله به وإلحاقة بالجمادات وإذلال له وهو غير جائز وبعضه فى حكمه وصرح فى فتح القدير ببطلانه**" (شامی ۵/۵۸، احکام الجراحۃ الطبیۃ ص ۳۶۷)۔

۴- انسان کے اعضاء کو اموال سے کچھ نہ کچھ مشابہت حاصل ہے، "**كما لو قال: أقتل عبدى أو اقطع يده ففعل فلاضمان عليه إجماعا كقوله إقطع يدى أورجلى وإن سرى لنفسه ومات لأن الأطراف كالأموال فصح الأمر**" (شامی ۱۰/۱۹۴) "**والأطراف كأنها ليست من الذات بل من المال، الأطراف كالمال فى نظر الشارع لاكالانفس**" (نورالانوار ص ۷۴)۔

۵- موت کے بعد انسان کا اپنے جسم وغیرہ سے تمام اختیار ختم ہوجاتا ہے، البتہ اس کی ضرورت کی چیزوں سے اس کے حقوق متعلق ہوجاتے ہیں، مثلاً کفن دفن کے اخراجات، وصیت، میراث وغیرہ۔

"**وأما الموت فانه عجز خالص يسقط به ما هو من باب التكليف لفوات غرضه......وما شرع عليه لحاجة غيره إن كان حقا متعلقا بالعين يبقى بقائه......وأما الذى شرع له نبناء على حاجته والموت لاينافى الحاجة فيبقى له ما ينقضى به الحاجة......وقد بطل أهلية المملوكية بالموت**" (حسامی ص ۱۵۴-۱۵۶)۔

۶- جب انسان اپنے حق میں نافع اور ضار کے فیصلہ سے عاجز ہو تو اس کے اولیا اس کے قائم مقام ہوجاتے ہیں۔

"**اعتبرت الولاية على الغير فى حال عجز ذلک الغير عن النظر فى مصالحه......كاعتبار الولاية على الصبى والمجنون والسفيه**" (احکام الجراحۃ الطبیہ ص ۲۴۶)۔

اعضاء کونقل کرنے کی اجازت کا حکم:

اس سے قبل کل چھ اصول اور ضابطے تحریر کئے گئے ہیں جن میں سے اول الذکر تین اصول کا تقاضا یہ ہے کہ میت کا کوئی عضو منتقل کرنا نہ تو ورثاء کی اجازت سے صحیح اور درست ہے نہ ہی متوفی کی اجازت سے، کیونکہ اجازت کے صحیح ہونے کے لئے لازمی شرط ماذون بہ کا شرعا جائز ہونا ہے، اور اصولی اعتبار سے چونکہ یہ شرط مفقود ہے، اس لئے میت یا ورثاء کی اجازت کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے اگر اجازت ہے تو شرعا اس کا کوئی اعتبار بھی نہیں، لیکن ضابطہ مذکورہ نمبر ۴ کو اعضاء انسانی کو اموال سے مشابہت حاصل ہے، اسی لئے اگر کوئی اپنے عضو کو کٹوادے اور اس کے سبب سے مرجائے تو اس صورت میں کسی پر کوئی ضمان عائد نہیں ہوگا، اور مال کی طرح سے اعضاء کے قطع کی اجازت کو صحیح مان لیا گیا ہے۔

"**لأن الأطراف كالأموال فصح الأمر**" (شامی ۱۰/ ۱۹۴)، اس کا تقاضا یہ ہے کہ میت کی اجازت نقل اعضاء میں معتبر ہوگی۔

نمبر پانچ وچھ سے معلوم ہوا کہ اگر میت نے اپنے اعضاء کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی ہے تو اس کی اجازت وغیرہ کے سلسلہ میں اس کے اولیاء اور ورثاء اس کے قائم مقام ہوں گے، لہذا حاصل یہ نکلا کہ جب ضرورۃ میت کے اعضاء کو نقل کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اس سلسلہ میں میت اور اس کے ورثاء کی رضا اور عدم رضا کا بھی اعتبار ہوگا، کیونکہ اگر کسی کے فعل سے کسی کو تکلیف ونقصان ہو تو جب تک تکلیف سہنے والے کی طرف اجازت نہ ہو اس کو کسی طرح کی تکلیف دینا جائز نہیں ہے، اور قطع اعضاء سے میت کو تکلیف پہنچنا منصوص ہے۔ "**كسر عظم الميت ككسر عظم الحي**"۔

اسی طرح سے میت کے ورثاء کا بھی میت سے جذباتی تعلق ہوتا ہے جس کی وجہ سے میت کے اعضاء میں تصرف سے اس کے ورثاء کو صدمہ اور تکلیف کا پہنچنا لازمی ہے، اسی کی تلافی کے لئے قصاص جیسے احکام کی مشروعیت ہوئی ہے، تو جب میت کے اعضاء کو کاٹنے اور منتقل کرنے سے خود میت کو ضرر والم اور اس کے ورثاء کو صدمہ اور تکلیف پہنچتی ہے تو بغیر ان دونوں کی اجازت کے اعضاء کو منتقل کرنا جائز نہ ہوگا، اور منتقل کرنے کے لئے دونوں کی اجازت لازم ہوگی، اسی میں احتیاط اور سد باب ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اصولا میت کے اعضاء کو نہ تو اجازت لے کر منتقل کرنا درست ہے، اور نہ ہی بلا اجازت، اور اس میں اجازت کا شرعا کوئی اعتبار نہیں، لیکن چونکہ ضرورت ومجبوری کے تحت نقل اعضاء کی اجازت دی گئی ہے اور نقل اعضاء سے خود میت اور اس کے ورثاء کو ضرر والم پہنچنا لازمی ہے، اس لئے دونوں کی اجازت بھی لازم وضروری ہوگی، کیونکہ کسی کو بھی بلا اجازت کے کسی طرح کی تکلیف وایذا پہنچانا شرعا حرام وناجائز ہے۔

"لقوله رسول الله ﷺ: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده الخ"۔

انسانی دودھ بینک:

انسانی دودھ بینک کا حکم متعین کرنے سے پہلے درج ذیل اصولی باتیں ملحوظ رکھنا ضروری ہیں:

۱- مدت رضاعت میں بچوں کو دودھ پلانا یہ بچوں کی فطری ضرورت ہے، اسی سے ان کا نشونما ہوتا ہے، اس لئے شریعت نے بچوں کو دودھ پلانے کی اجازت ہی نہیں بلکہ ضرورت کے وقت واجب اور فرض قرار دیا ہے، اور اگر بچوں کی یہ ضرورت رضاعت کے فطری طریقوں سے پوری نہ ہوسکے تو دودھ نکال کر کے فراہم کرنا مجبوری ہو تو شرعا اس کی بھی اجازت ہوگی، اور اگر دودھ مفت نہ ملے تو بدرجہ مجبوری حضرت امام شافعیؒ واحمد کے مذہب کے مطابق اس کو خرید وفروخت کے ذریعہ سے بھی حاصل کرنے کی اجازت ہوگی، گرچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے یہاں انسانی دودھ کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں، لیکن ایام رضاعت میں اس کو پلانے کی اجازت ہے خواہ کسی بھی طریقے سے ہو۔ اور ایام رضاعت کے بعد علاجا استعمال کرنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری دوا موجود نہ ہو۔

"لما كان من المقصود من النكاح الولد وهو لا يعيش غالبا فی ابتداء إنشائه إلا بالرضاع" (ردالمحتار ۳/۳۸۹)۔

۲- نکالے ہوئے دودھ سے رضاعت کا ثبوت اسی طرح سے متحقق ہوگا جس طرح فطری طریقے پر دودھ پینے سے رضاعت کا ثبوت ہوتا ہے، چنانچہ جمہور فقہاء حضرت امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک وغیرہم نے بچہ کے پیٹ میں دودھ پہنچنے پر رضاعت کا حکم لگایا ہے خواہ کسی بھی طریقے سے پیٹ میں پہنچ جائے خواہ ناک کے راستہ سے ہو یا منہ کے راستہ سے، البتہ ایک روایت کے مطابق حضرت احمد بن حنبلؒ اور حضرت لیثؒ اور ابن حزمؒ اور دیگر اصحاب ظواہر حرمت رضاعت کے ثبوت کے لئے متعارف طریقے پر عورت کے چھاتی سے دودھ پینے کو لازم قرار دیتے ہیں، اس کے بغیر وہ حرمت رضاعت کو ثابت نہیں مانتے۔

"أما صفة الرضاع المحرم فإنما هوما امتصه الراضع من ثدی المرضعة بفيه فقط......واختلف الناس فی هذا فعال الليث بن سعد لا يحرم السعوط لبن المرأة ولا يحرم اما يسقى الصبي لبن للرأة فی الدواء لأنه ليس برضاع وانما الرضاع ما مص من الثدی هذا نص قول الليث وهذا قولنا وهو قول ابی سليمان وأصحابه، وأما الخلاف فی ذلک فانه قال ابوحنيفة ومالک والشافعی السعوط والوجور يحرمان کتحريم الرضاع" (المحلی لابن حزم ۱۰/۸-۷)۔

”واتفقوا على أن السعوط والوجور يحرم إلا في رواية عن أحمد فانه شرط الارتضاع من الله“ (رحمۃ الامہ/ص ۳۱۷)۔

حاصل یہ کہ نکالے ہوئے دودھ کے پینے سے رشتہ رضاعت وحرمت رضاعت اسی طرح سے قائم ہوتی ہے جس طرح سے فطری طریقے سے پینے پر قائم ہوتی ہے۔

۳-(رضاعت سے) دودھ پلانے والی عورت اور دودھ پینے والے بچے کے درمیان خواہ کسی بھی طریقے سے دودھ پئے ایک مقدس رشتہ قائم ہوجاتا ہے، اور دونوں کے لئے اس رشتہ کی وہی عظمت وحرمت قائم ہوتی ہے جو حقیقی ماں اور بچے کے درمیان ہوتی ہے، چنانچہ شریعت مقدسہ نے اس رشتے کی طرف ”أمهاتكم اللاتي أرضعنكم وأخواتكم من الرضاعة“ سے رہنمائی کی ہے، یعنی دودھ پلانے والی عورت حقیقی ماں کے درجہ میں ہوجاتی ہے، اسی طریقے سے رضاعی رشتہ کے بھائی بہن حقیقی بھائی بہن کے درجہ میں ہوجاتے ہیں، اسی لئے قرآن کریم نے حقیقی ماں اور حقیقی بھائی بہن کے طرح سے ان کو بھی ماں اور بھائی بہن کہا ہے، اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”يحرم من الرضاعة مايحرم من النسب“ (متفق علیہ) یعنی رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے ہوا کرتے ہیں، لہذا جس طرح سے نسبی رشتوں کی حفاظت اور نسب کے اختلاط سے حفاظت ضروری ہے، اسی طرح سے رضاعی رشتوں کے اختلاط سے حفاظت لازم وضروری ہوگی۔

”والواجب على النساء أن لايرضعن كل صبي من غير ضرورة، وإذا أرضعن فليحفظن ذلك وليشهرنه ويكتبنه احتياطا“ (شامی ۴/ ۴۰۲)۔

۴-دودھ بینک میں جب دودھ فراہم کرنے والی عورتوں اور اس سے دودھ حاصل کرنے والے بچوں کا ریکارڈ محفوظ نہ رکھا جائے تو ایسی صورت میں عورتوں کے لئے اس میں دودھ فراہم کرنا بھی شرعاً جائز نہیں اور نہ ہی اس سے پلانا جائز ہوگا۔

”والاحتراز من اختلاط المياه وامتزاج الأنساب من مقاصد الشريعة ومحاسنها“ (اعلاء السنن ۱۷/ ۴۱۲)۔

”والواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة وإذا أرضعن فليحفظن ذلك ويشهرنه ويكتبنه احتياطا“ (شامی ۴/ ۴۰۲)۔

۵-دودھ بینک میں اگر عورتوں کے دودھ کو مخلوط کرنے کے بعد بچوں کو پلایا جائے تو حرمت رضاعت کس عورت

سے متعلق ہوگی اس میں حضرات فقہاء کا اختلاف ہے، حضرت امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق اس عورت کے ساتھ حرمت رضاعت قائم ہوگی جس کا دودھ زیادہ ہو امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے، البتہ حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں جتنے عورتوں کا دودھ ملا ہے سب کے ساتھ حرمت رضاعت قائم ہوجائے گی، اور اسی کے قائل امام زفرؒ بھی ہیں، امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنی جنس میں ملے تو کسی ایک کے غالب اور دوسرے کے مستہلک ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا بلکہ وہ سب بذات خود مستقل ہونے کی وجہ سے قائم وثابت رہیں گے، لہذا حرمت ہر ایک سے متعلق ہوگی، اور حضرت ابوحنیفہؒ سے دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں، راجح اور مفتی بہ حضرت امام محمدؒ کا قول ہے۔

"ومخلوط بماء أودواء أولبن أخرى أولبن شاة إذا غلب لبن المرأة، وكذا إذا استوي إجماعا لعدم الأولوية وعلق محمد الحرمة بالمرأتين مطلقا، قيل هو الأصح، قال فى الغاية هو أظهر وأحوط، وفى شرح المجمع قيل أنه الأصح" (شامی ۴/۴۱۲)۔

اور اگر انسانی دودھ کے علاوہ کسی دوسری سیال مشروب میں مل جائے تو ایسی صورت میں بالاتفاق غلبہ کا اعتبار ہے، البتہ غلبہ کی تفسیر میں اختلاف ہے کہ غلبہ اجزاء سے ہوگا یا رنگ ومزہ کے بدلنے سے ہوگا یا مغلوب کے اوصاف کو ختم کرنے سے (التفصیل فی الشامیہ ۴/۲۱۱)۔

۶- انسانی دودھ بینک میں جب دودھ فراہم کرنے والی عورتوں اور اس سے پینے والے بچوں کا ریکارڈ اور کوئی تفصیل معلوم نہ ہو تو حرمت رضاعت کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ حرمت کا حکم شک سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔

"ولوأرضعها أكثر اهل القرية ثم لم يدر من أرضعها فأراد أحدهم تزوجها وإن لم تظهر علامة ولم يشهد بذلک جاز -خانيه- والواجب على النساء أن لايرضعن كل صبي من غير ضرورة وإذا أرضعن فليحفظن ذلک وليشهرنه ويكتبنه احتياطا" (ردالمحتار ۴/۴۰۲)۔

دودھ بینک کا شرعی حکم:

دودھ بینک کے قیام سے چونکہ رشتہ رضاعت کا خلط ملط ہونا اور اس کا محفوظ نہ رہنا لازم ہے، اور نسب کی طرح سے رشتہ رضاعت کی بھی حفاظت ضروری ہے، لہذا جو چیز اس کے ضیاع کا سبب ہوگی وہ شرعا حرام وناجائز ہوگی، اسی لئے حضرات فقہاء نے عورتوں کے اوپر لازم قرار دیا تھا کہ وہ ہر بچے کو بغیر ضرورت کے دودھ نہ پلائے اور اگر ایسی نوبت آجائے تو احتیاطا اس کی تشہیر اور اس کی تحریر بھی کی جائے تاکہ رشتہ رضاعت میں خلط وغیرہ نہ ہوسکے۔ اور اس سلسلے میں علماء عصر میں سے بعض لوگوں نے اس پر کلام کیا ہے، چنانچہ جدید فقہی مسائل اور نظام الفتاوی میں اس موضوع سے گفتگو کی گئی ہے۔

نظام الفتاوی میں ہے کہ ڈھائی سال سے کم عمر بچہ کو کسی عورت کا بھی دودھ پلانا جائز ہے، اور یہ الگ بات ہے کہ مسلمان دیندار عورت کا دودھ پلانا بہتر ہے، باقی جواز میں کوئی کلام نہیں، اس لئے بغیر ضرورت اور بقدر ضرورت اس کا مہیا رکھنے کی گنجائش ہے (نظام الفتاوی ۳/ ۴۰۳، ایفا پبلیکیشنز) لیکن اس کے برعکس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ میں دودھ بینک کے عدم جواز کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

"ان الإسلام يعتبر الرضاع لحمة كلحمة النسب يحرم بها ما يحرم من النسب بإجماع المسلمين ومن مقاصد الشريعة الكلية الحافظة على النسب وبنوک الحليب مودة الاختلاط أو الريبة بناء على ذلک قرر منع انشابنوک حليب الامهات فی العالم الاسلامی" (قرار رقم ۶، الفقہ الاسلامی ۹/ ۴۸۴)۔

میرے نزدیک "مجمع الفقہ اسلامی جدہ" کا فیصلہ راجح ہے۔

انسانی مادہ تولیدی بینک:

اس کا حکم سمجھنے سے قبل درج ذیل امور ملحوظ رکھے جائیں تو حکم کی تعیین آسان ہوگی۔

۱- انقطاع نسب حکماً قتل کے مرادف ہے، لہذا ایسا سبب اختیار کرنا جس سے نسب کا ثبوت نہ ہو حکماً قتل ہونے کی وجہ سے شرعاً حرام وناجائز ہے، اسی بناء پر مکرہ کو حالت اکراہ میں بھی زنا کی رخصت حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ زانی سے نسب کسی حال میں ثابت ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے زنا اس کے حق قتل نفس کا سبب بنے گا، اور قتل نفس کی اجازت حالت اکراہ میں بھی نہیں، اس کے برعکس وہ عورت جس کو زنا پر مجبور کیا جائے تو اس کو رخصت اسی لئے حاصل ہوجاتی ہے کہ نسب کا انقطاع اس سے ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے یہ فعل اس کے حق میں قتل نفس کا سبب نہیں بنے گا۔

"ولو أكره على الزنا لا يرخص له لأن فيه قتل النفس بضياعها......وفی جانب المرأة يرخص لها الزنا بالاكراه الملجئی لأن نسب الولد لا ينقطع فلم يكن فی معنى القتل من جانبها بخلاف الرجل" (شامی ۹/ ۱۸۸) ہکذا فی حجۃ اللہ البالغہ (۲/ ۱۴۴ مطبع اشرفی دیوبند)۔

۲- نسب کی حفاظت مقاصد شرعیہ میں سے ہے، لہذا جو چیزیں اشتباہ نسب واختلاط نسب کا سبب ہوں وہ شرعاً حرام ہوں گی، اسی وجہ سے نکاح فی العدۃ وطی بغیر الاستبراء حرام ہے، کیونکہ یہ اشتباہ نسب واختلاط نسب کا سبب ہوجاتا ہے۔

"أماكانت المرأة مؤتمنة فی العدة ونحوها مأمورة أن لا تلبس عليهم أنسابهم وجب أن ترهب فی ذلک وربما عوتبت على هذا أنه سعي فی ابطال مصلحة العالم ومناقضة لما فی جبلة النوع

وذلک جالب بعض الملأ الأعلى ح يث امروا بالدعاء لصلاح النو ع"(حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۴۴)۔

۳-جو چیز کسی حرام کا سبب وذریعہ بنے وہ خود شرعا حرام ہوگی، انسانی مادہ تولیدی بینک انقطاع نسب کا سبب تو بہر حال ہوگا، نیز صاحب مادہ کے مجہول ہونے کی صورت میں اختلاط واشتباہ پایا جائے گا، جس کی وجہ سے احکام حرمت و حلت ضائع ہوں گے، اس لئے اس کی اجازت نہیں ہوسکتی۔

"والثالث أنه داخل فی التعاون على الاثم والعدوان المنهى عنه......لما كانت المصلحة تسبب مفسدة من باب الحيل أو من باب التعاون منع من هذا الجهة"(الموافقات للشاطبی ۲/ ۲۶۰، ما قامت المعصیۃ بعینہ یکرہ تحریما، شامی ۹/ ۵۶۱)۔

الحاصل:

حاصل یہ کہ جس شریعت مقدسہ نے ثبوت نسب کو حیات اور انقطاع نسب کو ممات کے مماثل قرار دیا اور نسب انسانی کی حفاظت کے لئے نکاح کو مشروع اور زنا کو حرام قرار دیا اور اختلاط واشتباہ سے بچنے کے لئے عدت واستبراء کے احکام متعین کئے، بھلا وہ شریعت اس حیا سوز طریقہ کی اجازت کیوں کر دے سکتی ہے؟ جبکہ اس طریقہ میں زنا صورۃ گرچہ نہ پایا جاتا ہو، لیکن معنا اس کے زنا ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ زنا کے نتائج ولوازمات اس میں بدیہی طور پر پائے جاتے ہیں، مثلاً اجنبیہ کا ایک اجنبی مرد کے نطفہ سے حاملہ ہونا، اجنبی کے نطفہ سے مستفید ہونا، نسب کا ثابت نہ ہونا وغیرہ جیسی چیزیں زنا اور اس طریقہ کار میں مشترک ہیں، لہذا اس کی اجازت کسی بھی حالت میں نہیں دی جاسکتی ہے، حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

"وہ اجنبیہ عورت جس کے رحم میں انجکشن سے شوہر کے علاوہ کسی مرد کا مادہ منویہ پہنچایا گیا ہو وہ عورت عقل سلیم کے نزدیک مزنیہ اور طوائف سے بھی زیادہ فاحشہ قرار پائے گی اور اس کی شناعت زنا وغیرہ سے بھی زیادہ قبیح ہوگی (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۳۱۰ ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی)۔

☆☆☆

اعضاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی☆

یہ اپنی جگہ صحیح ہے کہ انسان کو مالک کا امتیازی وصف عنایت کیا گیا اور ساری کائنات کو ان کا مخدوم ومملوک بنایا گیا، لیکن اعضاء وجوارح جو انسان کے لئے کل پرزے ہیں کیا ان کا بھی اسی معنی میں مالک ہے جیسا کائنات کی دوسری اشیاء کا ہوتا ہے جس طرح چاہے تصرف کرے، چاہے تو باقی رکھے چاہے جسم سے الگ کردے ایسا شاید ہی کوئی تسلیم کرے گا، نیز مخدوم وخادم کے مابین جو فرق ''فوقیت'' ہونا چاہئے وہ بھی ناگزیر ہے ورنہ ''مخدومیت'' چہ معنی دارد، اسی لئے تقریباً تمام ہی مفسرین نے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ''ولقد کرمنا بنی آدمی'' کے تحت انسان کی ذاتی شرافت وتکریم پر بحث کی ہے، اس کے علاوہ وجوہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس تکریم وتعظیم میں غلام وآزاد، مومن وکافر، زندہ ومردہ سب مساوی ہیں، صاحب فتح القدیر (کمال الدین محمد بن عبدالواحد ۶۸۱) لکھتے ہیں: ''الآدمي مكرم شرعاً وإن كان كافراً'' (فتح القدیر ۶/۳۹۰، کتاب البیوع، البیع الفاسد، زکریا ۱۴۲۱) (آدمی شریعت میں کافر ہی کیوں نہ ہو مکرم ہے)۔

ٹھیک ہے حربی کافر کو مباح الدم قرار دیا گیا ہے مگر اس لئے نہیں کہ وہ کافر ہے بلکہ اس لئے کہ وہ آمادہ جنگ وجدال ہے یہی وجہ ہے کہ ذمی کافر کو قتل کرنا جائز نہیں، نیز حربی کے مباح الدم ہونے کے باوجود کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹنا جائز ہے اور اس کے ساتھ مملوک حیوانوں کی طرح معاملہ کرنا جائز ہو۔

بایں معنی غلاموں اور مملوکوں کا انسان مالک تو ہوتا ہے کہ یہ ان کے کفر کی پاداش ہے، لیکن یہ مملوکیت بھی اس میں منحصر ہے کہ اس سے خدمت لی جاسکتی ہے، اس کو قتل کرنا، یا اس کے اعضاء وجوارح کو قطع وبرید کرنا ہرگز جائز نہیں، حنفیہ کے نزدیک تو مولی کو قصاص میں اپنے غلام کو قتل کرنا بھی جائز نہیں، خدمت تو انسان اجیر سے بھی لیتا ہے، بلکہ رضاکارانہ طور پر ایک انسان دوسرے کی خدمت بجالاتا ہے، یہ گویا کہ ایک نظیر ہے اس معنی میں مملوکیت محل بحث نہیں۔

☆ استاذ حدیث مدرسہ حسینیہ کایم کلم، کیرالا۔

شریعت میں زندہ اشخاص کی طرح مردہ انسان کی بھی حرمت ملحوظ رکھی گئی ہے، موطا امام مالک میں حضرت عائشہؓ کا قول ہے: "**كسر عظم المسلم ميتا ككسره وهو حي**" (موطا ا/ ۸۳ کتاب الجنائز، باب ماجاء في الاختفاء وهو النبش) (مسلمان میت کی ہڈی کو توڑنا، زندہ انسان کی ہڈی توڑنے کے مساوی ہے)۔

امام مالک نے ام سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یہ مساوات گناہ کی بابت ہے۔

پہلی روایت ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے مرفوعا ہے (ابوداؤد ۲/ ۴۵۸، کتاب الجنائز، باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب)۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے بھی مرفوعا نقل کیا ہے، ابن القطان نے حدیث کی تحسین فرمائی ہے، ابن دقیق العید تو فرماتے ہیں کہ یہ علی شرط مسلم ہے (دیکھئے: اوجز المسالک ۲/ ۵۰۷، کتاب الجنائز، باب ماجاء في الاختفاء وهو النبش)۔

اسی وجہ سے علامہ طیبی فرماتے ہیں: "**إشارة إلى أنه لايهان ميتا كمالايهان حياً**" (اوجز المسالک ۲/ ۵۰۷) (یہ اشارہ ہے کہ میت کی توہین نہیں کی جائے گی جس طرح زندہ شخص کی توہین نہیں کی جاتی ہے)۔

فقہاء نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے: "**الآدمي محترم بعد موته على ما كان عليه في حياته**" (شرح السیر الکبیر ا/ ۹۰) (آدمی مرنے کے بعد بھی اسی طرح محترم ہے جس طرح زندگی کی حالت میں)۔

اسی حرمت وتکریم کا نتیجہ ہے کہ خواہ اچھی ہی نیت سے کیوں نہ ہو مثلہ کرنے کی ممانعت حدیث میں وارد ہوئی ہے، بخاری میں مثلہ سے نہی وارد ہے، حتی کہ حیوانات کے ساتھ مثلہ کرنے والوں پر لعنت بھی آئی ہے (بخاری ۲/ ۸۲۹، کتاب الذبائح، باب مایکرہ من المثلہ)۔

اس میں اچھی نیت اور فاسد نیت کے مابین فرق نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر وہ صورت جس میں تشویہ صورت ہو جائے اس کو بھی مثلہ قرار دیا گیا۔

بعض فقہاء نے مونچھوں کے حلق کرانے کو بھی مثلہ سے تعبیر کیا ہے، اسکی بنیاد بھی یہی ہے، یہاں پر یہ خلجان نہیں ہونا چاہئے کہ پیدائش سے لے کر مرنے تک بار بار انسان ناخن تراشتا ہے، جسم کے مختلف حصوں کے بال صاف کرتا ہے، نیز ختنہ کا عمل بھی ہوتا ہے، جس میں زائد جلد کو کاٹا جاتا ہے، یہ بھی حرمت انسانی کے خلاف ہے، لیکن ذرا غور کیا جائے تو یہ حرمت انسانی کی بعینہ محافظت ہے، نظافت وصفائی کا مقصود بھی حرمت کا احترام ہے، اس میں جسم میں غیر متناسب حصہ کو کاٹا جاتا ہے تاکہ جسم انسانی خوب سے خوب تر ہو جائے، جو مسئلہ ہمارے سامنے زیر بحث ہے اس سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

حرمت انسانی کے خلاف امور:

جس طرح حرمت انسانی کے خلاف نیت فاسدہ سے کسی کی جان کو ہلاک کر دینا، یا اس کے کسی حصہ کو کاٹ دینا

ہے، اسی طرح خواہ اچھی ہی نیت سے ہو اس کو قابل استعمال سمجھنا اور اشیائے مملوکہ کی طرح اس سے انتفاع ہے، خواہ اس کو خرید وفروخت کر کے ہو یا عطیہ وعنایت کے ذریعہ ہو، فقہاء نے جا بجا اس پر تنبیہ فرمائی ہے، علامہ ابن الہمام انسانی بالوں کے بیچنے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ولایجوز بیع شعور الإنسان مع قولنا بطهارته ولا الانتفاع بها؛ لأن الآدمي مکرم لامبتذل، فلا یجوز أن یکون شئ من أجزائه مهانا ومبتذلا وفی بیعه إهانة وکذا في امتهانه بالانتفاع" (فتح القدیر مع الہدایہ ۳۹۱/۶، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، مطبوعہ زکریا ۱۴۲۱)۔

(انسانی بالوں کا بیچنا جائز نہیں ہے حالانکہ ہم ان کو طاہر کہتے ہیں اور نہ اس سے انتفاع جائز ہے، اس لئے کہ آدمی مکرم ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس کو استعمال کیا جائے پس جائز نہیں ہے کہ اس کے کسی جز کی اہانت کی جائے اور استعمال کیا جائے، بیع کرنے میں اسی طرح انتفاع میں توہین ہے)۔

اسی طرح صاحب عنایہ امام محمدؒ کا اختلاف نقل کر کے ظاہر الروایہ کی ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وجه الظاهر أن الآدمي مکرم غیر متبذل وما هو کذلک لا یجوز أن یکون شئ من أجزائه متبذلا مهانا وفي البیع والانتفاع ذلک" (عنایہ علی فتح القدیر ۳۹۲/۶، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، زکریا ۱۴۲۱ھ) (ظاہر الروایۃ کی وجہ یہ ہے کہ انسان مکرم ہے، قابل استعمال نہیں، اور جو ایسا ہو اس کے کسی جز کو استعمال کرنا اور توہین کرنا جائز نہیں ہے، بیع میں اور انتفاع میں یہ ہے)۔

امام محمدؒ نے انسانی بال سے انتفاع کو جائز اس لئے قرار دیا کہ ان کے ذہن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے بال مبارک لوگوں کے مابین تقسیم کروائے، بعض صحابہ نے تو اس کو اپنی ٹوپی میں لگا رکھا تھا، مگر یہ تبرک کا باب ہے، انتفاع نہیں، اس لئے ظاہر الروایۃ میں انتفاع کو ناجائز کہا گیا ہے، ظاہر الروایۃ کی دلیل وہ روایت ہے جو صحیحین وغیرہ میں موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے واصلہ ومستوصلہ پر لعنت بھیجی ہے، اس کی بنیادی علت یہی انتفاع اور حرمت انسانی کی پامالی ہے۔

بعض حضرات نے اس پر تردد کا اظہار بھی کیا ہے کہ اصل وجہ اور بنیاد تغریر وتزویر ہے، بلاشبہ بعض روایت میں "انه زور" بھی آیا ہے، لیکن فقہاء کی رائے تو یہی ہے کہ یہ وعید حکمت وزور کے ساتھ انتفاع کی وجہ سے ہے، ورنہ اگر تغریر ہی علت ہوتی تو غیر انسانی بالوں کو اپنے بال میں جوڑنے کی اجازت کیوں کر ہوتی، تغریر کی علت تو یہاں بھی پائی جارہی ہے جبکہ اس کو جائز کہتے ہیں، صاحب فتح القدیر نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”وقد قال ﷺ فيما ثبت عنه في الصحيحين: لعن الله الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوشمة فالواصلة هي التي تصل الشعر بشعرالنساء، والمستوصلة المعمول بها بإذنها ورضاها، وهذا اللعن للانتفاع بمالايحل الانتفاع به ألا ترى أنه رخص فى اتخاذ القراميل وهو ما يتخذ من بوبريزيد فى قران النساء للتكثير......فلولا لزوم الإهانة بالاستعمال لحل وصلها بشعورالنساء ايضا“(فتح القدیر ۳۹۱/۶، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، زکریا ۱۴۲۱ھ)۔

(صحیحین کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:”لعن الله الواصلة الخ“(اللہ کی لعنت ہے بال جوڑنے والی، اور جوڑوانے والی پر، گودنے والی اور گودوانے والی پر) پس واصلہ وہ عورت ہے جو بال عورتوں کے بال میں جوڑتی ہے، اور مستوصلہ وہ عورت ہے جس کو اس کی اجازت اور رغبت سے جوڑا جاتا ہے، یہ لعنت ایسی چیز سے انتفاع کی وجہ سے ہے جس سے انتفاع جائز نہیں ہے، کیا دیکھتے نہیں کہ موباف کی اجازت ہے، اور یہ وہ ہے جس کو اون سے بنایا جاتا ہے تاکہ عورتوں کی چوٹی میں جوڑا جائے تاکہ بال زیادہ ظاہر کیا جاسکے، پس اگر استعمال کی وجہ سے اہانت لازم نہیں آتی تو بالوں کا جوڑنا بھی جائز ہوتا)۔

البتہ اس پر اشکال ہوسکتا ہے کہ اسلامی عدالت میں جنایات ودیات کا بڑا وسیع باب ہے، دیت بھی حقیقت میں انسانی اعضاء اور جان کی قیمت ہے، جو بیع وشراء سے قریب تر ہے، بلکہ اعضاء انسانی کے قصاص کے باب میں تو فقہاء نے صراحت کی ہے کہ ”اموال“ کے منزلہ میں ہیں، اسی وجہ سے مساوات ومماثلت کو لازم وضروری قرار دیا جاتا ہے اور ایک غلام کے عضو کو ایک آزاد کے عضو کے مساوی نہیں سمجھا جاتا ہے۔

یہ بھی دھوکہ ہے حقیقت یہ ہے کہ دیت انسانی اعضاء کی قیمت نہیں ہے، بلکہ ایک عضو کو تلف کرنے کی سزا ہے اگر قیمت ہوتی تو بچے وجوان کے اعضاء کی دیت یکساں نہیں ہوتی، اور اس کا معاملہ توقیفی کے بجائے لوگوں کے تعامل واتفاق پر چھوڑا جاتا۔

اس لئے اعضاء انسانی کو بیچنا یا بغیر بیچے ہوئے اس طرح کا انتفاع جس طرح مملوکہ سامان سے ہوتا ہے، اصل کے لحاظ سے جائز نہیں ہے۔

۱-سیال اجزاء ودیگر اعضاء کے مابین فرق:

انسانی اجزاء میں بعض وہ ہیں جو سیال ہیں جیسے دودھ، خون، جو بھی سیال مادہ جسم میں پایا جاتا ہے وہ ہر وقت بنتا رہتا ہے، اگر نکالا بھی جائے تو دوسرا اس کی جگہ تیار ہوجاتا ہے، لیکن جامد اعضاء اس پوزیشن کے نہیں، اگر نکال لیا گیا تو عادۃ

اللہ جاری ہے کہ دوسرا اس کی جگہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ سیال مادہ کے سلسلہ میں بعض نظیریں ملتی ہیں، مثلاً حجامت کے ذریعہ خون نکالنا خواہ ضرورت نہ بھی ہو تو مستحب ہے، اسی طرح بچہ کو دودھ پلانے کا سلسلہ ہر دور میں رہا ہے بلکہ ماں کے دودھ کو خاص طور پر غذائیت میں اہم سمجھا گیا ہے، اس لئے اس کی ترغیب بھی وارد ہوئی ہے، اطباء بھی اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔

لہذا سیال وجامد اجزاء کے مابین فرق کرنا ہوگا، بلکہ فرق ہے، سیال اجزاء کا استعمال عندالضرورۃ جائز ہے، ہمارے فقہاء نے بھی اس پر بحث کی ہے، عالمگیری میں ہے:

"**يجوز للعليل شرب الدم والبول إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاء ه فيه ولم يجد من المباح مايقوم مقامه، وإن قال الطبيب يتعجل شفاؤک فيه وجهان**" (عالمگیری ۵/۳۵۵، کتاب الکراہیۃ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات طبع احیاء التراث العربی)۔

(بیمار کے لئے خون و پیشاب کا پینا جائز ہے، جبکہ مسلمان ڈاکٹر بتائے کہ اس کی سفارش میں ہے، اور کوئی مباح دوا موجود نہ ہو، اگر ڈاکٹر کہتا ہے کہ تمہیں اس سے جلد شفا ہوگی تو دو وجہ ہیں)۔

اسی طرح دودھ کے سلسلہ میں آیا ہے: "**ولابأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء**" (عالمگیری ۵/۳۵۵، کتاب الکراہیۃ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات، احیاء التراث العربی) (کوئی حرج نہیں ہے، عورت کے دودھ سے مرد کو سعوط کرایا جائے اور دوا کے لئے پلایا جائے)۔

اس لئے جامد اعضاء و سیال اجزاء کے مابین فرق کیا جانا ناگزیر ہے، لہذا مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں ایک مسلمان کسی دوسرے شخص کو خون کا عطیہ دینا چاہے، ضرورت بھی ہے، انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی ہے اس لئے عطیہ دینے میں حرج نہیں ہوگا۔

۲- بلڈ بینک میں خون کا عطیہ:

چونکہ اجزائے انسانی سے انتفاع کا مدار بھی ضرورت ہے اور ضرورت اس وقت شدید ہوجاتی ہے جبکہ حادثات ہوں، عام طور پر حادثات میں خون کا ضیاع دوسرے اعضاء کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے، فوری طور پر جان بچانے کے لئے خون کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ہر شخص کا خون ہر کسی کے لئے سازگار نہیں ہوگا، گروپ مل گیا تب تو کارگر ہوگا ورنہ انفیکشن کا خطرہ رہتا ہے، اسلئے اگر وقت پر خون کی تلاش کی جائے اور لوگوں سے خون کا مطالبہ کیا جائے تو مریض کی جان چلی جائے گی، اس لئے بلڈ بینک میں بطور عطیہ اگر خون دیا جائے تو مذکورہ بالا ضرورت پوری ہوجائے گی، اس لئے اس میں بھی کوئی حرج نہیں

ہے، حضرت مفتی نظام الدینؒ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''جب خون کے استعمال کو گو بدرجہ مجبوری ہو گنجائش ہوگی، تو چونکہ ایسی مجبوریاں اچانک بھی پیدا ہوجاتی ہیں اور خون کی بہت زیادہ مقدار کی متقاضی ہوجاتی ہیں جیسے ریل، بس وغیرہ کے حادثہ کے موقع پر بیک وقت بہت زیادہ افراد زخمی ہوجاتے ہیں اور ان کی جان بچانے کے لئے سب کو خون دینا ضروری ہوتا ہے، اس لئے اچانک پیش آمدہ ضروریات کے لئے ہر نمبر کے خون کو فراہم رکھنا بھی ضروری ہوجاتا ہے اور مقدار کی تعیین وتحدید نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں محفوظ رکھنا ضروری ہوگا، اور اس کا ایک خزانہ بنانا بھی لازم ہوگا جس کو بینک کا نام دیا جاسکتا ہے، ''لأن الشي إذا ثبت ثبت بجميع لوازمه''، لہٰذا اس فراہمی کے اور محفوظ رکھنے کے جو مناسب طریقے ہوں گے اور ان میں جو اخراجات درکار ہوں گے ان سب کو بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے برداشت کرنا ہوگا'' (نظام الفتاوی ۲/ص ۴۲۲)۔

۳- بلڈ بینک قائم کرنا:

جب بلڈ بینک میں عطیہ دینا جائز ہوا تو اس کے لئے کوشاں رہنا بھی جائز ہوگا، خاص طور پر جبکہ غیروں پر اثرات بھی اچھے مرتب ہوں، لہٰذا مسلمانوں کے لئے بلڈ بینک قائم کرنا بھی جائز ہوگا۔

۴- خون عطیہ دینے کا حکم:

فقہاء کے کلام سے متشرح ہوتا ہے کہ علاج ومعالجہ میں جو اسباب وتدابیر اختیار کی جاتی ہیں بعض اوقات واجب اور بعض اوقات صرف مباح تو کبھی افضل وسنت ہوتی ہیں، اگر تکلیف کا ازالہ یقینی ہو جیسے بھوک وپیاس کو مٹانے کے لئے روٹی پانی کا استعمال تب تو اس سبب کو اختیار کرنا فرض ہوتا ہے قدرت کے باوجود چھوڑنا حرام ہوتا ہے۔

اگر تکلیف کا ازالہ یقینی نہیں، ظنی ہو جیسا کہ عام طور پر دوا دارو کے استعمال کے وقت تکلیف کا ازالہ بدرجہ ظن ہوتا ہے، ایسے موقع پر علاج ومعالجہ کرنے کی ترغیب آئی ہے خود رسول اللہ ﷺ نے پچھنا لگوایا ہے اس لئے سنت کے درجہ میں ہوگا۔

لیکن بعض اوقات تکلیف کا ازالہ صرف وہمی ہوتا ہے جیسے آگ سے داغنا وغیرہ تو ایسے موقع پر چھوڑنا ہی بہتر ہے اختیار کرنے کی بھی گنجائش ہے (عالمگیری ۵/ ۳۵۵، کتاب الکراہیۃ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)۔

اب اگر گروپ والے خون کو چڑھانے میں یقینی طور پر صحت وعافیت ہے تو اس وقت بطور عطیہ جبکہ دوسرا کوئی انتظام نہ ہو، واجب ہوگا، کیونکہ محتاج ومضطر کو کھلانا واجب ہوتا ہے۔

''المحتاج إذا عجز عن الخروج يفترض على كل من يعلم حاله أن يطعم مقدار ما يتقوى به

علی الخروج وأداء العبادات"(عالمگیری ۳۳۸/۵، کتاب الکراہیۃ، الباب الحادی عشر فی الکراہۃ فی الأکل وما یتصل بہ) (ضرورت مند جب نکلنے سے عاجز ہوتو جس کو بھی اس کا حال معلوم ہو اس پر اس کو اتنی مقدار کھلانا فرض ہے جس سے اس کو باہر نکلنے اور عبادت کرنے کی قوت حاصل ہو)۔

حدیث شریف میں بھی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے:"**أطعموا الجائع وعودوا المریض وفکوا العاني**"(ابوداؤد ۴۴۲/۲، کتاب الجنائز، باب الدعاء للمریض بالشفاء) (بھوکے کو کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو، قیدی کی رہائی کرواؤ)۔

شارحین نے اس کو اضطراری حالت پر محمول کیا ہے، نیز حکم اطعام کو واجب قرار دیا ہے، اس کی تائید باب رضاعت کے ایک جزئیہ سے بھی ہورہی ہے: دودھ پینے والے بچے کا نفقہ باپ پر ہے، ماں اگر دودھ نہ پلانا چاہے تو مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، مگر یہ اس وقت ہے جبکہ کوئی دوسری خاتون ہو جو دودھ پلا سکے نیز اس کے دودھ کو بچہ قبول کررہا ہو، اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے فقہاء فرماتے ہیں:

"**ذلک إذا کان یوجد من ترضعه، أما إذا کان لاتوجد من ترضع تجبر الأم علی الإرضاع صیانة للصبی عن الضیاع**"(ہدایہ ۴۴۲/۲ باب النفقہ)۔

(یہ اس وقت ہے جب دودھ پلانے والی موجود ہو، اگر دودھ پلانے والی موجود نہیں ہے تو بچے کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ماں کو پلانے پر مجبور کیا جائے گا)۔

دودھ اور خون میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ایک غذا ہے دوسرا زندگی کو باقی رکھنے کا بنیادی اور قریبی ذریعہ ہے، لیکن دونوں ہلاکت وضیاع کے باب میں مساوی ہے۔

لہذا اگر کسی مریض کو خون کی اضطراری حد تک ضرورت ہو اور اس خون کا گروپ ایک شخص کے پاس ہی ہے، اس شخص کو خون دینے میں کسی ضرر کا اندیشہ بھی نہیں ہے تو یقیناً خون کا عطیہ کرنا واجب ہونا چاہئے۔

لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ خون کو یقینی وقطعی سبب علاج مانا جائے، مگر اس کو اگر سبب ظاہری کے طور پر تسلیم کریں (اس کو اطباء وماہرین کی تشخیص طے کرسکے گی) تو ایسی صورت میں مریض کے لئے خون لینا افضل ہوگا، لہذا دینا بھی زیادہ سے زیادہ سنت کے دائرے میں آئے گی۔

۵-جگر اور دیگر اعضاء کا قضیہ:

خون کے علاوہ دوسرے اعضاء دونوعیت کے ہیں، بعض وہ اعضاء ہیں جن کو زندگی کی حالت میں نہیں لیا جاسکتا ہے، جسم سے الگ ہوجائے تو موت واقع ہوجائے گی، جیسے جگر وقلب ہے، ہاں موت واقع ہونے کے فوری بعد اگر آپریشن

کے ذریعہ نکالا جائے تو ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق کارآمد ہوسکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں، اب ان اعضاء کو حاصل کرنے کا طریقہ صرف وصیت رہ جاتا ہے، وصیت کا ضابطہ ہے کہ موصی لہ یا تو فقراء ومساکین ہوں، یا پھر معین شخص ہو، اگر معین نہیں تو وصیت باطل ہوتی ہے، امام فقیہ ابوالفتح ظہیر الدین عبدالرشید بن ابی حنیفہ الولوالجی (۵۴۰ھ) ایک مسئلہ تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"**فإن كان عدد يحصون جازت الوصية لهم لأنهم معلومون، وإن كانوا لا يحصون فالوصية باطلة بخلاف الفقراء والمساكين......فكان هذا وصية للمجهول، وهذا لايجوز**" (فتاوی ولوالجیہ ۳۳۶/۵، کتاب الوصایا، مکتبہ دارالایمان سہارنپور)۔

(اگر وہ معین تعداد ہیں تو ان کے لئے وصیت جائز ہے اس لئے کہ معلوم ہیں، اگر غیر محصور ہیں تو وصیت باطل ہے، برخلاف فقہاء ومساکین...... نیز یہ مجہول کے لئے وصیت ہے جو کہ جائز نہیں)۔

نیز وصیت کے لئے لازم ہے کہ اگر وہ اشیاء کے قبیل سے ہو تو موصی بہ قابل تملیک ہو بایں طور کہ عقد بیع وشراء جاری ہوسکتا ہے، شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل تملیک ہونا موصی کی حیات میں ضروری ہے، ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "**قذا بأن وصية بما تلد أغنامه لاتجوز استحسانا لأنه لايقبل التمليك حال حياة الموصيب عقد من العقود**" (شامی ۴۵۹/۸ کتاب الوصایا، رشیدیہ پاکستان) (ہم کہتے ہیں کہ بکری کے ان بچوں کی وصیت جو بعد میں پیدا ہوں گے استحسانا جائز نہیں، اس لئے کہ موصی کی زندگی میں کسی بھی قسم کے عقد تملیک کو قبول نہیں کرتا ہے)۔

جو چیز زندگی میں قابل تملیک نہ ہو تو وہ مرنے کے بعد بھی قابل تملیک نہیں ہوگی، اسی لئے درمختار میں عبارت اس طرح ہے:

"**كون الموصى به قابلا للتمليك بعد الموت والموصى بعقد من العقود مالاً أو نفعاً، موجودا للحال أم معدوما**" (درمختار علی ردالمحتار ۴۹۹/۵ کتاب الوصایا، رشیدیہ پاکستان) (موصی بہ کو موصی کے مرنے کے بعد عقد کے ذریعہ قابل تملیک ہونا چاہئے، خواہ وہ مال ہو یا نفع، موجود ہو یا معدوم)۔

ظاہر بات ہے جگر وغیرہ کی وصیت میں افراد مطلوب ومقصود نہیں ہوتے ہیں، اس لحاظ سے مجہول ہیں، اور اگر متعین شخص بھی ہوجائے تو ایسے اعضاء کی خرید وفروخت کی گنجائش حالت حیات میں دینا مشکل ہے، اس لئے ایسے اعضاء کو پیوندکاری کے لئے وصیت کرنا ہی جائز نہیں کہ اب ورثہ کی اجازت کا مسئلہ ہو۔

اس میں ایک خرابی یہ بھی لازم آئے گی کہ کسی بھی عضو کو جسم سے الگ کرنے کے بعد اسلامی شریعت کا مقتضی یہ ہے

کہ اس کو اس شخص کے جسم کے ساتھ کر دیا جائے اور دفن کر دیا جائے، علامہ نووی لکھتے ہیں:

"**لأنه يحرم الانتفاع بشعر الآدمي وسائر أجزائه لكرامته بل يدفن شعره وظفره وسائر أجزائه**" (المجموع ۳/۱۴۰ دار الفکر) (انسان کے بال اور دیگر اعضاء سے انتفاع حرام ہے، اس لئے کہ انسان مکرم ہے، بلکہ بال، ناخن اور دیگر اجزاء کو دفن کر دیا جائے)۔

اس میں حافظ نے کچھ اختلاف بھی کیا ہے مگر راجح مسلک امام نووی کے مطابق ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: "**فلو قطع ظفره أوشعره أدرج معه في الكفن**" (شامی ۱/۶۳۳ کتاب الجنائز، مطلب في القراءة عند الميت، رشیدیہ پاکستان) (اگر ناخن یا بال کاٹا جائے تو کفن میں رکھ دیا جائے)۔

اس کے علاوہ آج کے زمانے کی بے راہ روی جو ہے وہ کسی باخبر انسان سے مخفی نہیں ہے، کتنے انسانوں کی جانیں اسپتالوں کی نذر ہو رہی ہیں، آئے دن کا قضیہ بنا ہوا ہے، یہ کہنا تو آسان ہے کہ قانون بنایا جائے لیکن قانون کون بنائے حکومت کا زمام تو اسلام دشمنوں کے ہاتھوں میں ہے بلکہ انسانیت کش ذہنوں کے کنٹرول میں ہے، اگر قانون بن بھی گیا تو عمل کس قدر ہوگا بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں یہ کہنا مشکل ہی نہیں مشکل ترین ہے، اس لئے ایسی چیزوں کی حوصلہ افزائی کرنا خطرات کے باب کو کھولنا ہوگا۔

۶، ۷- قرنیہ وگردہ کا عطیہ:

وہ اعضاء جن پر زندگی موقوف نہیں ہے جیسے قرنیہ، اور گردہ کیونکہ فطری طور پر اللہ نے ان کو جوڑا بنایا ہے، ڈاکٹروں کے ریسرچ کے مطابق ایک گردہ سے بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے، اس کی زندگی کے احوال وکوائف میں فرق نہیں پڑتا، سارا نظام جیسا کہ دو گردوں کی موجودگی میں چلتا ہے بعینہ اسی طرح یہ نظام چلتا رہتا ہے، اسی طرح ایک آنکھ کا قرنیہ اگر نکال دیا جائے تو بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے، ایسے اعضاء کی وصیت کا مسئلہ بھی جگر کے مسئلہ کی طرح ناجائز وحرام کا ہے، جو وجوہات وخرابیاں وہاں پائی جاتی ہیں یہاں بھی بعینہ موجود ہیں۔

البتہ زندگی کی حالت میں اگر کوئی دوسرے کی ہمدردی کرنا چاہتا ہے تو یہ " **الضرورات تبيح المحظورات** " کے زمرے میں آئے گا، اور ضرورت وحاجت کی شرائط معتبرہ اگر پائی جا رہی ہیں تو عطیہ کرنے میں حرج نہیں بلکہ عند اللہ ماجور ہونے کی توقع ہے۔

ضرورت کے وقت حرام کی حلت:

اس بحث سے اکیڈمی پہلے فارغ ہو چکی ہے، اکیڈمی کی اس بابت چوتھی تجویز میں ان شرائط وقیود کا احصاء کیا گیا

ہے، یہاں بعینہ نقل کی جاتی ہے:

۱-ضرورت بالواقع موجود ہو، مستقبل میں پیش آنے والی ضرورتوں کا اندیشہ وخطرہ معتبر نہیں۔

۲-کوئی جائز مقدور متبادل نہ ہو۔

۳-ہلاکت وضیاع کا خطرہ یقینی ہو یا مظنون بظن غالب ہو۔

۴-محرمات کے استعمال یا ارتکاب سے ضرر شدید کا ازالہ یقینی اور نہ استعمال کرنے کی صورت میں اس کا وقوع یقینی ہو۔

۵-بقدر ضرورت استعمال کیا جائے۔

۶-اس کا ارتکاب اس کے مساوی یا اس سے کسی بڑے مفسدہ کا سبب نہ ہو (ضرورت وحاجت سے مراد اور احکام شرعیہ میں ان کا لحاظ ص ۲۴، طبع اکیڈمی)۔

اس کا ہر دفعہ نصوص وعبارات سے مبرہن ہے، تفصیلی مقالات ومناقشات اس کے لئے شاہد عدل ہیں، مذکورہ تجویز ودفعات کی روشنی میں زیر بحث پیوندکاری کے لئے قرنیہ وگردہ بطور عطیہ دینے کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں، اگر دینے والے کو کوئی ضرر لاحق نہ ہو، اور اس کی وجہ سے ظاہری بدنمائی جو عام طور پر قرنیہ لینے کے وقت آنکھ کے ظاہری حصہ پر رونما ہوتی ہو وہ نہ ہو، قابل اعتماد ڈاکٹروں کی تجویز کے مطابق وہ قرنیہ وگردہ، مریض کے لئے کارآمد ہوں گے، اور یہی یقینی یا مظنون بظن غالب ہو، نیز ایک اہم شرط یہ ہے کہ واقعتاً کسی مریض کو اس کی ضرورت ہو صرف متوقع نہ ہو، یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ کوئی متعین مریض ہے اسکے دونوں گردے فیل ہو چکے ہیں یا کوئی نابینا ہے جس کی دونوں بینائی مفقود ہو چکی ہیں، اب ایسے شخص کے لئے انسانی ہمدردی اور تعاون علی الخیر کے جذبہ سے کوئی شخص اس کو اپنا قرنیہ یا گردہ ہبہ کر کے عند اللہ ماجور ہو اور ایک انسان کی شدید ضرورت کو پورا کرنے والا ثابت ہو۔

اس تفصیل سے سوال کے تمام اجزاء حل ہو گئے۔

الف-اگر کوئی زندہ شخص ایسا عطیہ کرنا چاہے اور تمام شرائط موجود ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ب-موت کے بعد قرنیہ کا کسی متعین شخص کو دینا وصیت کے زمرے میں آتا ہے، اس میں اگر جہالت مرتفع ہو گئی پھر بھی بہت سے مفاسد ہیں، اس لئے سد اللباب گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

ج-آئی بینک میں قرنیہ کا عطیہ محل نظر ہے، اس لئے کہ ضرورت ابھی متحقق نہیں ہے صرف متوقع ہے، نیز آنکھ کی بینائی نہ ہونے سے جان کا خطرہ بھی نہیں ہے، اس لئے اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

۸-دودھ بینک:

دودھ کی بیع وشراء ایک تو علاج ومعالجہ کے لئے ہوتی ہے، امام شافعیؒ کے یہاں تو ہر طرح کی بیع کی گنجائش ہے، اس لئے کہ یہ طاہر قابل انتفاع شئ ان کے نزدیک بیع وشراء کے قابل ہوتی ہے، دیگر فقہاء کے یہاں اصل کے لحاظ سے ناجائز ہے، ہاں دوا کے لئے اس کی اجازت ہے۔

"**أهل الطب يثبتون نفعا للبن البنت للعين وهي من أفراد مسئلة الانتفاع بالمحرم للتداوي كالخمر واختارفي النهاية والخانية الجواز إذا علم فيه الشفاء ولم يجددواء غيره**"(شامی ۴/ ۱۲۶ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، رشیدیہ پاکستان)۔

(ڈاکٹر حضرات آنکھ کے لئے لڑکی کے دودھ کو نفع بخش کہتے ہیں، یہ مسئلہ بھی خمر کی طرح علاج کے لئے انتفاع بالمحرم کے قبیل سے ہے، نہایہ وخانیہ میں جواز کو اختیار کیا ہے، جبکہ اس میں شفاء معلوم ہو، اور اس کے علاوہ کوئی دوسری دوا موجود نہ ہو) لیکن دودھ کو اگر تغذیہ کے لئے استعمال کیا جائے جیسا کہ نومولود بچے کو پالنے کے لئے خاص طور پر ماں کے دودھ کو سب سے زیادہ نفع آور سمجھا جاتا ہے، نیز اس کے لینے دینے کا رواج بہت قدیم سے ہے، کہیں بھی نکیر ثابت نہیں ہے، لہذا اگر بلاعوض ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لیکن اس کا عوض لینے کی بابت شافعیہ کے یہاں اور حنابلہ کی ایک روایت میں جواز کا قول راجح ہے، "**بيع لبن الآدميات جائز عندنا لاكراهة فيه هذا المذهب وقطع به الأصحاب إلا الماوردي والساشى والروياني**"(المجموع ۹/ ۲۵۴ کتاب البیوع، باب مایجوز بیعہ ومالا یجوز دار الفکر) (عورتوں کے دودھ کی بیع جائز ہے، کراہت نہیں ہے، یہی مذہب ہے اور یہی اصحاب شافعیہ کی رائے ہے سوائے ماوردی، ساشی، اور رویانی کے)۔

جبکہ مالکیہ وحنفیہ کے نزدیک بیع جائز نہیں ہے، اب رہا یہ اشکال کہ ہر زمانہ میں مرضعہ سے بچوں کو دودھ پلوانے کا رواج رہا ہے، اور اس پر اجرت بھی لی دی جاتی رہی ہے، تو اس کا جواب امام محمد کے کلام سے مستفاد ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ اجرت دودھ کی نہیں بلکہ دودھ پلانے والے کی ہے، امام محمد فرماتے ہیں:

"**جواز إجارة الظئر دليل على فساد بيع لبنها لأنه لما جازت الإجارة ثبت أن سبيله سبيل المنافع وليس سبيله سبيل الأموال، لأنه لو كان مالالم تجز الإجارة ألا ترى أن رجلا لواستاجر بقرة على أن يشرب لبنها لم تجز الإجارة ، فلما جاز إجارة الظئر ثبت أن لبنها ليس مالا**"(فتح القدیر ۶/ ۳۸۹، ۳۹۰، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، زکریا ۱۴۲۱ھ)۔

(مرضعہ کو اجرت پر لینے کا جواز اس کے دودھ کی بیع کے فساد پر دلیل ہے، اس لئے کہ جب اجارہ جائز ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بر سبیل منافع ہے نہ کہ بر سبیل مال، کیونکہ اگر مال ہوتا تو اجارہ جائز نہ ہوتا، کیا دیکھتے نہیں کہ ایک شخص اگر گائے اجرت پر دودھ پینے کیلئے لیتا ہے تو اجارہ جائز نہیں ہے، لہذا جب مرضعہ کا اجارہ جائز ہے تو اس کا دودھ مال نہیں ہوگا)۔

خرید وفروخت کو بھی حاجت کے وقت جائز کہا جاسکتا تھا، لیکن نومولود کی پرورش کے لئے آج انسانی دودھ کی حاجت نہیں ہے، مختلف قسم کے دودھ، مارکیٹ میں دستیاب ہیں جو ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق موافق ومفید ہیں، آج کتنے بچے ایسے ہی دودھ پر پل رہے ہیں، اس لئے قیمت لینے دینے کے بجائے اس طریقہ کو اپنایا جائے جو ہمیشہ سے رائج ہے کہ مفت اور بلاعوض دودھ مہیا کیا جائے، ہاں کسی بچہ کو انسانی دودھ کے علاوہ کوئی دوسرا مصنوعی دودھ سیٹ نہیں کررہا ہے تو الگ بات ہے۔

حرمت رضاعت کے سلسلہ میں حکم:

حرمت رضاعت کا تعلق مدت رضاعت میں کسی عورت کا دودھ بچے کے معدہ میں پہنچنے سے ہے بشرطیکہ وہ منفذ کے طریقے سے اندر پہنچا ہو، لہذا ناک کے راستہ سے یا منہ کے راستہ سے پہنچنے والا دودھ حرمت رضاعت کو ثابت کردے گا (فتاوی ولوالجیۃ ۱؍۳۶۵، کتاب الرضاع، مکتبہ دارالایمان سہارنپور)۔

حرمت رضاعت حرمت نسب کے مساوی ہے، جس طرح نسب کی وجہ سے حرمت مؤبدہ کا ثبوت ہوتا ہے، اسی طرح رضاعت کی وجہ سے دائمی حرمت ثابت ہوتی ہے، اس میں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی تاکید کی گئی ہے اور بوقت ضرورت ہی دوسرے بچے کو دودھ پلانے کی تلقین کی گئی ہے۔

"الواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة فإن فعلن فليحفظن وليثبتن احتياطا" (فتاوی ولوالجیہ ۱؍۳۶۴ کتاب الرضاع، مکتبہ دارالایمان سہارنپور) (عورتوں کے لئے لازم ہے کہ ہر بچے کو بلاضرورت دودھ نہ پلائے اور پلاتی ہیں تو یاد رکھیں اور احتیاط برتیں)۔

لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر رضاعت کے بعد اشتباہ پیدا ہوگیا اور یقینی طور پر مرضعہ یا رضیعہ کا پتا نہ رہا تو نکاح کے باب میں گوارہ کرلیا گیا ہے۔ **"لو أرضعها أكثر أهل قرية ثم لم يدر من أرضعها فأراد أحدهم تزوجها إن لم تظهر علامة ولم يشهد بذلك جاز"** (الدرالمختار علی الرد ۲؍۴۳۹ کتاب الرضاع، رشیدیہ پاکستان)۔

(اگر بچی کو ایک گاؤں کی اکثر خواتین نے دودھ پلایا پھر معلوم نہیں ہوسکا کہ کس نے پلایا، پس اس گاؤں کا کوئی فرد اس سے نکاح کرنا چاہے اور علامت ظاہرہ نہ ہو اور اس پر شہادت نہ ہو تو جائز ہے)۔

"وفی الخانیة: صغیر وصغیرة بینهما شبهة الرضاع ولا یعلم ذلک حقیقة قالوا: لا بأس بالنکاح بینهما هذا إذا لم یخبر بذلک أحد، فإن أخبربه عدل ثقة یأخذ بقوله ولا یجوز النکاح بینهما" (الأشباہ لابن نجیم ۱/ ۲۱۲، الفن الأول القاعدۃ الثالثۃ الیقین لا یزول بالشک، دار الکتاب)۔

(خانیہ میں ہے: ایک بچہ اور بچی کے مابین رضاعت کا شبہ ہے، حقیقتاً اس کا علم نہیں ہے تو نکاح میں کوئی حرج نہیں ہے یہ اس وقت ہے جبکہ اس کی خبر کوئی نہ دے، پس اگر کوئی عادل ثقہ خبر دے تو اس کے قول کی وجہ سے نکاح جائز نہیں ہوگا)۔

اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ جب تک رضاعت کا تیقن نہ ہو اس وقت تک حرمت کا ثبوت نہیں ہوگا، لہذا دودھ بینکنگ کے مسئلہ میں دودھ کی عطیہ دہندہ عورتوں کے دودھ کو دوسرے دودھ میں خلط ملت نہیں کیا جاتا ہو اور عطیہ دہندہ خاتون کا علم ہو، جس بچہ کو دیا جارہا ہے اس کا علم بھی ہے جو بینک کے ریکارڈ بک سے معلوم ہوسکتا ہے اور دونوں کے علم میں بھی ہے بلکہ ضروری ہے کہ ایسے افراد اس کا علم رکھیں تو ان دونوں کے مابین رضاعت کا تعلق ہونے کی بنا پر حرمت ثابت ہوگی، مگر علم نہیں ہو یا دودھ خلط ملط کردیا گیا، عطیہ دہندہ عورتوں کا کچھ پتا بھی نہیں، عام طور پر ہوتا بھی ایسا ہی ہے تو مرضعہ ورضیع کے مابین حرمت کا تعلق نہیں ہوگا، البتہ جتنے بچے وبچیاں اس بینک سے منتفع ہوں گے اور علم ہو کہ فلاں، فلاں نے اس بینک سے دودھ لے کر پیا ہے تو ان کے مابین حرمت ثابت ہوگی اور ایسے افراد کے مابین بھائی بہن کا رشتہ قائم ہوجائے گا، لیکن کوئی ریکارڈ نہیں ہے محض شبہ ہے تو حرمت کا معاملہ نہیں ہوگا۔

ایسے موقع پر صاف وشفاف طریقہ وہ ہے جو ہمیشہ سے رائج ہے کہ ضرورت کے وقت جس خاتون کا دودھ استعمال کیا جائے اس کو یاد رکھا جائے یا پھر بینک کے دودھ کے بجائے ڈبہ کے دودھ یا گائے کے دودھ پر اکتفا کیا جائے، تاکہ نکاح وحرمت کا مسئلہ پیچیدہ نہ ہو، علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں عورتوں کے دودھ کی خرید وفروخت کو اس لئے بھی منع کیا کہ ایسی تجارت میں ایک سے دوسرے کے پاس پہنچتا ہے جس سے بائع ومشتری کا علم نہیں ہوتا ہے جس سے نکاح کا معاملہ متاثر ہوتا ہے (فتح القدیر ۶/ ۳۸۹ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، زکریا دیوبند)۔

۹- بینک میں تولیدی مادہ کی لین دین:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے ایک پاکیزہ طریقہ مقرر کیا ہے، اسی طرح اولاد کے حصول کے لئے ایک مستحکم نظام بنایا ہے، جو فطرت وطبیعت سلیمہ سے ہم آہنگ، طہارت ونظافت سے بھرپور، اور شک وشبہ سے پاک وصاف ہے، اور وہ یہ کہ زوجیت یا ملکیت کے طریق سے تحصیل اولاد کی جائے، یہی وہ طریقہ ہے جو جائز ومباح ہے اس کے علاوہ ہر کوشش گناہ اور عند اللہ مبغوض ہے، ابوداؤد کی روایت ہے:

"لايحل لامرئ يومن بالله واليوم الآخر أن يسقي ماء ه زرع غيره" (ابوداؤد ا/ ۲۹۳ کتاب النکاح، باب فی وطی السبایا) (کسی اہل ایمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے)۔

اس معنی کی حدیث مسلم شریف میں بھی موجود ہے، اس کی بہت حد تک پاسداری کی گئی ہے، اس ممانعت کی علت حفاظت نسب کا فقدان ہے جو کہ دین کے مقاصد پنج گانہ کا اہم جز ہے، اختلاط نسب سے بچنے کے لئے مختلف تدبیروں کو واجب قرار دیا گیا ہے، کوئی شخص اپنی مملوکہ باندی سے استبراء رحم کے بغیر وطی نہیں کرسکتا، طلاق کے بعد دوسرا نکاح کرنے کے لئے عدت کو لازم کیا گیا تا کہ براءت رحم معلوم ہوجائے، اور اختلاط نسب نہ ہوسکے۔

تولیدی مادہ، وقابل حمل بیضہ کی بینکنگ اور اس میں لین دین کر کے شرکت سے جہاں اختلاط نسب کا باب کھلے گا وہیں دوسرے کی کھیتی کو اپنے پانی سے سیراب کرنے کا قریبی سبب ہوگا، جو "لاتعاونوا على الإثم والعدوان" کے زمرے میں یقیناً داخل ہوگا، لہذا اس طرح کے بینکنگ کا نہ تو مشورہ دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ایسے بینک سے تولیدی مادہ و بیضہ کو خریدنے یا مفت دینے کی اجازت دی جاسکتی ہے، بلکہ مسلم عورتوں کو ترغیب دی جائے گی کہ وقت پر شادی کریں، تا کہ بانجھ پن کے عیب سے پاک رہ سکیں، ماڈرن تہذیب وثقافت سے توبہ کر کے سنت نبوی کو گلے لگائیں تا کہ "ماں" بن کر زندگی کی راحت وآسودگی سے ہم کنار ہوسکیں۔

☆☆☆

انسانی اعضاء واجزاء سے متعلق شرعی مسائل

مولانا اکرام الحق ربانی ندوی☆

انسانی اعضاء واجزاء کے عطیہ کے سلسلہ میں فقہاء متقدمین کے ہاں گو بڑی احتیاط کا پہلو پایا جاتا ہے، لیکن اس سختی اور احتیاط کی وجہ صرف اور صرف انسان کا قابل اکرام واحترام ہونا ہے؛ اسی لئے فقہاء کرام نے انسان کے اعضاء واجزاء سے انتفاع کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ خرید وفروخت کے ذریعہ ہو یا کسی اور ذریعہ سے، چنانچہ علامہ مرغینانیؒ م ۵۹۳ھ فرماتے ہیں:

"لايجوز بيع شعور الإنسان ولا الانتفاع بها؛ لأن الآدمي مكرم لامبتذل، فلا يجوز أن يكون شئ من أجزائه مهانا مبتذلا" (ہدایہ ۱/ ۳۴)۔

(انسان کے بال کی فروختگی اور انتفاع درست نہیں، کیونکہ انسان قابل احترام ہے نہ کہ قابل صرف، چنانچہ اس کے کسی جزء کو قابل ذلت وصرف بنانا ناجائز نہیں)۔

ملک العلماء علامہ کاسانیؒ (م ۵۸۷ھ) فرماتے ہیں: **"وأما عظم الآدمي وشعره فلا يجوز بيعه؛ لا لنجاسته؛ لأنه طاهر فى الصحيح من الرواية، لكن احتراما له والابتذال بالبيع يشعر بالإهانة"** (بدائع ۵/ ۱۴۲) (انسان کی ہڈی اور بال کی بیع درست نہیں اور یہ نجاست کی وجہ سے نہیں ہے، اس لئے کہ صحیح روایت کے مطابق یہ پاک ہے، بلکہ یہ احتراما ہے اور اس کی بیع اہانت کی عکاسی کرتی ہے)۔

اور علامہ خطیب شربینی شافعیؒ (م ۹۷۷ھ) فرماتے ہیں: **"والآدمي يحرم الانتفاع به وبسائر أجزائه لكرامته"** (مغنی المحتاج ۱/ ۱۹۱) (انسان کی کرامت کی وجہ سے اس کے کسی بھی جز سے انتفاع حرام ہے)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے مدت رضاعت کے بعد دودھ پلانے کی اجازت نہیں دی ہے اور بغیر ضرورت استعمال کو حرام قرار دیا ہے۔

☆ جامعہ المؤمنین ام سلمہؓ، فردوس نگر، توپچانچی، دھنباد، جھارکھنڈ۔

"ولم يبح الإرضاع بعد مدته؛ لأنه جزء آدمي، والانتفاع به بغير ضرورة حرام على الصحيح" (الدر مع الرد ۳/۲۲۵)۔

ڈاکٹر محمد نعیم یاسین مذکورہ عبارتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"هذه النصوص وأشباهها في كتب الفقه تدل على أن الأصل تحريم الانتفاع بأجزاء الإنسان؛ إما لكرامته، وإما لعدم إمكان الانتفاع بها على وجه مشروع" (ابحاث فقہیہ فی قضایا طبیۃ معاصرہ/ص ۱۳۹)۔

کتب فقہ میں اس طرح کے نصوص اجزائے انسانی سے انتفاع کی حرمت پر دلالت کرتے ہیں، یا تو اس کی کرامت کی وجہ سے یا صحیح طریقہ سے انتفاع ناممکن ہونے کی وجہ سے۔

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ فقہاء کرام کے بعض اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بوقت ضرورت اجزاء انسانی سے انتفاع کے جواز کے قائل ہیں، خاتم الفقہاء علامہ شامیؒ م ۱۲۵۲ھ فرماتے ہیں:

"إن أهل الطب يثبتون نفعا للبن البنت للعين، وهي من أفراد مسئلة الانتفاع بالمحرم للتداوى كالخمر" (ردالمحتار ۵/۱۷) (اطباء دوشیزہ کے دودھ کو آنکھ کے لئے نفع بخش بتاتے ہیں اور یہ شراب ہی کی طرح حرام چیزوں سے انتفاع کے مسائل میں سے ہے)۔

علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ (م ۶۲۰ھ) انسانی اعضاء واجزاء کی بیع کے بھی قائل ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"فظاهر كلام الخرقى جوازه......لأنه لبن طاهر منتفع به، فجاز بيعه ، كلبن الشاة......وسائر أجزاء الآدمى يجوز بيعها فإنه يجوز بيع العبد والأمة" (المغنی ۱/۹۲۴)۔

ان عبارتوں سے یہ روشنی ملتی ہے کہ انسانی اعضاء واجزاء سے انتفاع درست ہے، لہذا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس کی ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے، مگر انسان کے جسم سے دو حقوق وابستہ ہوتے ہیں: ۱-حق اللہ، ۲-حق العبد۔

سلطان العلماء علامہ عز بن عبد السلامؒ (م ۶۶۰ھ) فرماتے ہیں:

"وكذلک جناية الإنسان على أعضائه نفسه يتفاوت إثمها بتفاوت ماجنى عليه، ويتفاوت مافوته على الناس من عدله ومقساطه......وليس لأحد أن يتلف ذلک من نفسه؛ لأن الحق في ذلک كله مشترک بينه وبين ربه" (قواعد الاحکام ۱/۱۳۰)۔

(اسی طرح انسان کا اپنے اعضاء پر زیادتی کرنے کا گناہ منفعت کے اعتبار سے مختلف ہوگا......،لہذا کسی شخص کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے اعضاء کو ضائع کرے، کیونکہ تمام اعضاء کا حق اس کے اور اس کے رب کے مابین مشترک ہے)۔

تمام اعضاء میں حق انسان اور رب کے درمیان گو مشترک ہوتا ہے، لیکن انسان کو اپنے حق میں تصرف کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ شاطبیؒ (م ۶۹۰ھ) فرماتے ہیں:

"کل ماکان من حقوق الله فلاخیرة فیه للمکلف علی حال، وأما ماکان من حق العبد في نفسه فله فیه الخیرة" (الموافقات ۲/۳۷۸)۔

(جو اللہ کے حقوق ہیں ان میں بندہ کو کسی حال میں تصرف کا اختیار نہیں، بہرحال جو بندہ کے حقوق ہیں ان میں تصرف کا اختیار ہے)۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن قیم (م ۷۵۱ھ) نے نہ صرف تصرف، بلکہ معاوضہ لینے کو بھی درست قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"والحقوق نوعان: حق الله وحق الآدمي، فحق الله لا مدخل للصلح فیه......وأما حقوق الآدمیین فهي التي تقبل الصلح والإسقاط والمعاوضة علیها" (اعلام الموقعین ۱/۱۰۸)۔

اور شارح مجلّہ سلیم رستم باز فرماتے ہیں:

"کل یتصرف في ملکه کیف شاء" (شرح مجلّہ ص ۶۵۴، مادہ: ۱۱۹۲)، یعنی انسان اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے۔

اس طویل گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے وجود پر اختیار حاصل ہے، لہذا وہ نہ صرف اپنے خون کا عطیہ دے سکتا ہے، بلکہ وہ اسے فروخت بھی کرسکتا ہے، جیسا کہ علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ (م ۶۲۰ھ) فرماتے ہیں: **"وسائر أجزاء الآدمي یجوز بیعها"** (المغنی ۱/۹۲۴)۔

جہاں تک غیر مسلم کو خون کا عطیہ دینے کی بات ہے تو یہ بھی درست ہے اور صرف دینا ہی درست نہیں، بلکہ اس کا خون لینا بھی درست ہے، چونکہ بحیثیت انسان وہ بھی محترم ہے، علامہ ابن ہمامؒ (م ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"والآدمي مکرم شرعا وإن کان کافرا" (فتح القدیر، کتاب البیوع ۶/۴۲۵)۔

اور اگر نجاست کی بات کی جائے تو نجاست اس کے عقیدہ میں ہوتی ہے، علامہ مرغینانیؒ (م ۵۹۳) فرماتے ہیں:

"ونجاسة المشرک في اعتقاده، لا في ظاهره" (ہدایہ، کتاب ادب القاضی ۳/۱۳۵)، **"وأما نجاسة**

المشرک ففي الاعتقاد علی معنی التشبیه" (ردالمحتار، کتاب ادب القاضی ۵/ ۳۷۲)۔

۲- آج کل آفات وبلیات کی بہتات ہے، حادثات وواقعات درپیش ہوتے رہتے ہیں، جن میں بے شمار لوگ جاں بحق ہوجاتے ہیں اور ایک بڑی تعداد ان کی ہوتی ہے جو موت وزیست کی کشمکش میں رہتے ہیں، ان کے علاج ومعالجہ کے لئے کمیٹیاں ہوتی ہیں یا تشکیل دی جاتی ہیں، جو ممکنہ طور پر ان کی جان بچانے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن ایک پیچیدگی یہ پیدا ہوتی ہے کہ ان کو جس گروپ کا خون درکار ہوتا ہے وہ فراہم نہیں ہو پاتا، چنانچہ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے بہت سارے مقامات پر بلڈ بینک (Blood Bank) قائم ہوتے ہیں، جہاں لوگ تطوعاً اپنا خون عطیہ کرتے ہیں، ایسے بلڈ بینکس متاثرین کو مفت میں خون دیتے ہیں، البتہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ روپئے کے عوض خون دینے کی بجائے ان کے اعزہ واقربا سے خون وصول کرلیا جائے تاکہ وہ دیگر مریضوں کے کام آسکے تو اس طرح کے بلڈ بینک میں مسلمان اپنے خون کا عطیہ پیش کرسکتے ہیں، علامہ عز بن عبد السلامؒ (م ۶۶۰ھ) فرماتے ہیں: "**اما غلب وقوع هذه المفسدة جعل الشرع المتوقع کالواقع**" (قواعد الاحکام ۱/ ۱۰۷)۔

(جب مفسدہ واقع ہونے کا غلبہ ہو تو شریعت نے متوقع حادثہ کو حقیقت کے درجہ میں رکھا ہے)۔

لیکن اگر خون کا عطیہ پیش کرنا خود اپنی جان کی ہلاکت کا پیش خیمہ ہو (اتنا خون دے دے کہ اسے سستی وغفلت اور کمزوری محسوس ہونے لگے) تو پھر درست نہیں، کیونکہ وہ خود اپنی جان کے لالے پڑ جائے گا۔

"**إذا أراد الرجل أن یقطع إصبعا زائدة أو شیئا آخر، قال نصیر رحمه الله: إن کان الغالب علی من قطع مثل ذلک الهلاک، فإنه لا یفعل، وإن کان الغالب هو النجاة فهو في سعة من ذلک**" (ہندیہ ۵/ ۳۶۰)۔

۳- خدمت خلق کے جذبہ سے متاثر ہوکر جو تنظیمیں کام کرتی ہیں اور بلڈ کیمپ لگاتی ہیں تاکہ ناگہانی حالات میں ضرورتمندوں کو بآسانی خون فراہم کیا جاسکے، خصوصاً حضور اکرم ﷺ کی ولادت کے موقع پر ایسا کرتے ہیں، جس کا برادران وطن پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے اور چونکہ مسلمان اس وقت محبت نبوی ﷺ سے سرشار ہوکر زیادہ تعداد میں خون کا عطیہ پیش کرتے ہیں، لہذا یہ جائز ہے، کیونکہ اصول ہے "**الأمور بمقاصدها**"۔

اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ حادثہ کے وقت اپنے بھائیوں کی مدد اور تعاون کی جائے، شریعت اس بات پر ابھارتی ہے۔

۴- اگر مماثل گروپ کے خون کا حامل مل جائے اور وہ اس موقف میں ہو کہ خون دے سکے تو اس کے لئے اپنا خون دینا

واجب ہے،اس لئے کہ ایک جاں بلب انسان کو ہلاکت سے بچانا لازم اور ضروری ہے، کیونکہ اللہ رب العزت کے نزدیک جان کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اسی لئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (مائدہ:۳۲) (جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی)۔

ہاں اگر وہ شخص مفت میں خون دینے پر راضی نہ ہو تو متاثر شخص کے اولیاء کو چاہئے کہ اس سے خون خرید کر لے۔

"**فلو لم يجد إلا بشراء جاز شراء ه**" (فتح القدیر ۵/۲۰۲)۔

۵- انسانی جسم مختلف اعضاء و جوارح پر مشتمل ہے، جن میں بعض ایسے ہیں جو تلف ہو جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہوتے ہیں، مگر جگر ایک ایسا عضو ہے، جس پر زندگی کا انحصار ہے اور یہ دوبارہ پیدا بھی نہیں ہوتا، اس لئے اسے مردہ شخص سے لے کر پیوندکاری کی جاتی ہے۔

جہاں تک آنکھ کی بات ہے تو یہ ایک ایسا عضو ہے جس کا مماثل موجود ہے، لیکن اس کی چند صورتیں ہیں:

۱-تمام اعضاء (دونوں آنکھ) کا عطیہ کرنا، درست نہیں ہے، کیونکہ یہ اس عطیہ کی طرح ہے، جس کی نظیر موجود نہیں جیسے قلب و جگر وغیرہ۔

۲-کوئی ایک عضو عطیہ کرنا مثلاً بھینگا شخص کو ایک آنکھ دینا یہ صورت بھی درست نہیں، کیونکہ اس سے منفعت میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔

۳-کسی عضو کی منفعت کھوئے ہوئے شخص کو ایک عضو عطیہ کرنا، جیسے اندھے کو ایک آنکھ دینا یا دونوں ہاتھ کٹے ہوئے شخص کو ایک ہاتھ دینا۔

اور انسان کے جسم میں بہت سارے جفت اعضاء ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کسی کو دے دیا جائے تو دوسرے عضو کی قوت آدھی سے زائد ختم ہو جاتی ہے، مثلاً پاؤں کہ ایک پاؤں کے بالمقابل انسان کے لئے دو پاؤں زیادہ تقویت بخش ہیں، لیکن آنکھ اس سے مستثنی ہے، اگر کوئی شخص اپنی ایک آنکھ کسی دوسرے کو دے دے تو اس سے کام کرنے کی قوت نصف سے بھی کم ختم ہوتی ہے، اس حیثیت سے اگر کوئی زندہ انسان یہ خیال کرے کہ میرا کام تو ایک آنکھ سے چل سکتا ہے اور دوسری آنکھ کا قرنیہ (Cornea) کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دے تو یہ درست ہے، لیکن پیوندکاری کے تعلق سے چند باتیں قابل غور ہیں، کیونکہ اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں، لہذا ذیل میں ہم دونوں طرح کے اقوال مع دلائل و تجزیہ پیش کرتے ہیں:

مانعین کے اقوال ودلائل:

جوحضرات ایک انسان کے اعضاء کی دوسرے انسان میں پیوندکاری کودرست قرارنہیں دیتے وہ مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں:

۱-انسان کاالگ کیاہواعضوناپاک ہے۔

۲-انسان اللہ کی طرف سے اپنے وجودکاامین ہے۔

لیکن ان حضرات کے نزدیک اصل سبب انسان کا قابل احترام ہوناہے،ذیل میں چندمثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"**الانتفاع بأجزاء الآدمي لايجوز**"(ہندیہ ۵/۳۵۴)(انسان کے اجزاء سے انتفاع درست نہیں)۔

"**وكذا بيع ما انفصل عن الآدمي كشعر وظفر لأنه جزء الآدمي وكذا وجب دفنه**" (ردالمحتار ۵/۲۴۶)(آدمی کے جسم سے جوچیزجداہوجائے اس کادفن کرناواجب ہے،اس لئے کہ وہ آدمی کاجزءہے،جیسے بال اورناخن)۔

"**وحرمة الانتفاع بأجزاء الآدمي لكرامته**"(ہدایہ،کتاب الطہارت ۱/۴۱)(انسانی اجزاء سے انتفاع کی حرمت اس کی کرامت کی وجہ سے ہے)۔

"**كسر عظم الميت ككسره حيا**"(موطاامام مالک/ص ۶۰)(مردہ انسان کی ہڈی کوتوڑنازندہ شخص کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے)۔

اگرآئی بینک میں آنکھوں کے قرنیہ کی ذخیرہ اندوزی کی بات کی جائے تو یہ درست معلوم نہیں ہوتا،کیونکہ لوگوں کے خون کے مقابلہ میں آنکھوں کی ضرورت کم پڑتی ہے اورجب ضرورت نہیں ہے توبلاوجہ مردہ جسم کوکاٹنااوراس کی آنکھیں نکالنامناسب معلوم نہیں ہوتا،کیونکہ شریعت ضرورت کااعتبارکرتی ہے اوریہاں ضرورت نہیں ہے۔

"......**والانتفاع بغير ضرورة حرام على الصحيح**"(الدرمع الرد ۳/۲۲۵)۔

ملک العلماءعلامہ کاسانیؒ(م ۵۸۷ھ)فرماتے ہیں:

"......**فكان فيه ضرورة فسقط اعتبار حرمته**"(بدائع ۴/۳۱۶)(......ضرورت کی بنیادپرحرمت کااعتبار ساقط ہوگیا)۔

مذکورہ عبارتوں سے یہ بات کلی طورپرمنقح ہوچکی ہے کہ ایک انسان کے اعضاء کی پیوندکاری دوسرے انسان میں بالکل درست ہے،ڈاکٹروہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

"إذا تأكد الطبيب المسلم الثقة العدل أن الذي يؤخذ قلبه أو عينه سيموت حتماً، جاز نقل القلب أو العين وزرعه لآخر مضطر إليه؛ لأن الحي أفضل من الميت، ورعاية المصالح أمر مطلوب شرعاً، وتحقيق النفع للآخرين مندوب إليه في الإسلام، والضرورات تبيح المحظورات، لأنه يترتب على النقل إنقاذ مريض بالقلب، أو إعادة البصرلإنسان اتوفين الحياة أو البصر نعمة عظمى مطلوبة شرعا" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹/۴۴۰)۔

اورڈاکٹرمحمدنعیم یاسین رقم طراز ہیں:

"ويؤيد ذلک ماتقدم من إباحتهم الأكل من جثة الآدمي عند تعين ذلک لإنقاذ حياة المضطر، وتوسعهم فيما يجوز أخذه من الميت للحاجة بصورة عامة" (ابحاث فقہیہ فی قضایاطبیہ معاصرہ/ص ۱۴۵)۔

رہی وصیت کی بات تو مردہ شخص کے جسم سے آنکھ یا جگر کے حصول کے لئے خودمیت کی وصیت اورورثہ کی اجازت وآمادگی بھی ضروری ہے۔

"أن تكون الاجازة بعد موت الموصي فلا عبرة بإجازة الورثة حال حياة الموصي، فلو أجازوها حال حياته، ثم ردوها بعد وفاته صح الرد وبطلت الوصية" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸/۳۸)۔

وصیت کرنے والے کی موت کے بعداجازت ضروری ہے، چنانچہ موصی کی زندگی میں ورثہ کی اجازت معتبرنہیں، اگروارثین اس کی زندگی میں اجازت دے دیں پھراس کی وفات کے بعد واپس لے لیں تو واپس لینا درست ہے اوراس صورت میں وصیت باطل ہوجائے گی۔

۷-انسانی دودھ کی بیع کاحکم:

عورت کادودھ عوضا یابلاعوض مہیا کرانے کے سلسلہ میں علماءکرام کی مختلف آراء ہیں،بعض حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں،اوربعض حضرات عدم جواز کے،ذیل میں اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

عدم جواز کے قائلین:

حنفیہ کی رائے (امام ابویوسفؒ کےعلاوہ) یہ ہے کہ انسانی دودھ کی بیع درست نہیں ہے۔

"ولا ينعقد بيع لبن المرأة في قدح عندنا" (بدائع ۴/۳۳۷)۔

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ملک العلماء علامہ کاسانیؒ (م ۵۸۷ھ) مزید فرماتے ہیں:

"لأنه لا يباح الانتفاع به شرعا على الإطلاق بل لضرورة تغذية الطفل وما كان حرام الانتفاع به شرعا إلا لضرورة لا يكون مالا كالخمر والخنزير......ولأنه جزء من الآدمي والآدمي بجميع أجزائه محترم مكرم وليس من الكرامة والاحترام ابتذاله بالبيع والشراء" (بدائع ۴/۳۳۸)۔

(چونکہ شریعت نے عورت کے دودھ سے انتفاع کو مطلقا مباح قرار نہیں دیا ہے، بلکہ ضرورۃ بچہ کی غذا کی وجہ سے مباح کہا ہے اور جس چیز سے شرعی طور پر انتفاع حرام ہو وہ مال نہیں ہوسکتا، جیسے شراب اور خنزیر......اور اس لئے بھی کہ دودھ انسان کا جزء ہے اور انسان اپنے تمام اجزاء کے ساتھ محترم ومکرم ہے، ان کی خرید وفروخت کرنا اکرام واحترام کے منافی ہے)۔

حنابلہ کی ایک جماعت بھی عدم جواز، بلکہ حرمت کی قائل ہے، دبستان حنابلہ کے ترجمان علامہ ابن قدامہؒ (م ۶۲۰ھ) فرماتے ہیں: **"وذهب جماعة من أصحابنا إلى تحريم بيعه"** (المغنی ۱/۹۲۴)۔

جواز کے قائلین:

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ (اصح قول کے مطابق) نے عورت کے دودھ کی فروختگی کی اجازت دی ہے اور استدلال کیا ہے کہ یہ طاہر، پاک اور قابل انتفاع ہے اور شارع نے بغیر ضرورت اس کے پینے کو مباح قرار دیا ہے، لہذا اس کی بیع درست ہے (الفروق وتہذیب الفروق ۳/۲۴۰-۲۴۱، روضۃ الطالبین ۳/۳۵۳، المغنی ۴/۱۰)۔

حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ باندی کے دودھ کی بیع کے جواز کے قائل ہیں: **"وعند أبي يوسف ؒ أنه يجوز بيع لبن الأمة"** (بدائع ۴/۳۳۸)۔

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **"لأنه جزء من آدمي هومال فكان محل البيع كسائر أجزائه"** (بدائع ۴/۳۳۸) (اس لئے کہ یہ ایسے آدمی کا جزء ہے جو مال ہے اور اس کے تمام اجزاء کی طرح محل بیع ہے)۔

علامہ ابن حزم ظاہری (م ۴۵۴ھ) کی رائے بھی اسی کے موافق ہے، وہ فرماتے ہیں:

عورتوں کے دودھ کی بیع جائز ہے اور اس سلسلہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عورت اپنا دودھ کسی برتن میں نکال کر کسی ایسے شخص کو دے جو اپنے بچہ کو پلائے اور یہ عمل حقیقۃ دوسرے کو اپنے دودھ کا مالک بنانا ہے۔

اور جس چیز کی منتقلی اور تملیک جائز ہے اس کی بیع بھی درست ہے (المحلی ۷/۵۲۷)۔

دودھ کی بینک کاری اور اس کے مضمرات:

دودھ بینک قائم کر کے دوسرے بچوں کے لئے عورتوں سے دودھ عوضا یا تطوعا جمع کرنا درست نہیں، کیونکہ اس کے

برے نتائج اسلامی معاشرہ میں مرتب ہوں گے، جوحسب ذیل ہیں:

۱-حرمت رضاعت: دودھ بینک کے قیام سے ''حرمت رضاعت'' کا مسئلہ پیدا ہوگا اورعدم علم کی وجہ سے معاشرہ کے اندر فساد نکاح کا عموم ہوگا، علامہ کاسانی (م ۵۸۷ھ) فرماتے ہیں:

''ولو اختلط لبن امرأة بلبن امرأة أخرى فالحكم الغالب منهما في قول أبي يوسف، وروي عن أبي حنيفة كذلک، وعند محمد: تثبت الحرمة منها جميعا وهو قول زفر وجه قول محمد: أن اللبنين من جنس واحد والجنس لايغلب الجنس فلا يكون خلط الجنس بالجنس استهلاكا'' (بدائع ۴۰۹/۳)۔

اگر ایک عورت کا دودھ دوسری عورت کے دودھ میں ملا دیا جائے تو امام ابویوسفؒ کے نزدیک غالب کا اعتبار ہوگا، یہی رائے امام ابوحنیفہؒ سے بھی مروی ہے، امام محمدؒ کے نزدیک تمام سے حرمت ثابت ہوگی، یہی قول امام زفرؒ کا ہے۔

امام محمدؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ دونوں دودھ ایک ہی جنس سے ہیں اور جنس، جنس پر غالب نہیں ہوتی، لہذا جنس کو جنس سے ملانا استہلاک نہیں سمجھا جائے گا، علامہ آلوسیؒ (م ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

''......ان الطاعة إذا أدت إلى معصية راجحة، وجب تركها، فإن ما أؤدي إلى الشر شر'' (روح المعانی ۲۵۲/۷) (......جب کوئی طاعت غالب معصیت تک پہنچادے تو اس کا ترک واجب ہے، اس لئے کہ جو شر تک پہنچادے وہ بھی شر ہے)۔

اور درمختار میں ہے: ''كل مايؤدى إلى مالايجوز، لايجوز'' (الدرمع الرد، کتاب الحظر والاباحۃ ۳۶۰/۶) (جو چیز ناجائز تک پہنچنے کا ذریعہ بنے وہ بھی ناجائز ہے)۔

اور فقہ کا مشہور ومعروف اصول ہے: ''درء المفاسد مقدم على جلب المصالح'' (منفعت کے حصول پر مفسدہ کی علاحدگی کو فوقیت حاصل ہے)۔

۲-اخلاق کا بگاڑ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ دودھ بچوں کی طبیعت پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی ضرر اخلاق وعادات پر بھی پڑتی ہے، اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے بے وقوف عورت کا دودھ پلانے سے منع فرمایا ہے، حدیث پاک میں ہے: ''نهى رسول الله ﷺ أن تسترضع الحمقاء، فإن اللبن يشبه'' (السنن الکبری للبیہقی ۴۶۴/۷)۔

۳-متعدی امراض:

ممکن ہے کہ دودھ بینکوں میں جن عورتوں کا دودھ جمع ہوگا وہ متعدی امراض سے متاثر ہوں گی اور جب ان کا دودھ

بچوں کو پلایا جائے گا تو وہ بھی ان امراض متعدیہ کا شکار ہوں گے، کیونکہ سائنس نے بہت ساری چیزوں کی تلاش کر لی ہے، مگر اب بھی بہت سی چیزیں تحقیق طلب اور تشنہ ہیں، جیسے HIV کے جراثیم کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں ہے، البتہ اگر ضرورت شدیدہ ہو تو دوسرے کے دودھ سے انتفاع درست ہے، اگر وہ بعوض راضی ہو تو عوض دے کر دودھ لینا ضروری ہے:

"كإباحة المتأخرين من فقهاء الشافعية الانتفاع بعظم الميت إذا تعين لجبر عظم الإنسان الحي، و كذلک فإن هؤلاء الفقهاء عندما رأوا أن الانتفاع بلبن الآدمية لا يعود بأي ضرر على من أخذ منها، لا جسدياً، ولا معنوياً، أباحوه وأباحوا أخذ العوض عنه" (ابحاث فقہیہ ص ۱۴۵)۔

لیکن عمومی طور پر دودھ بینک کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ وہاں کن عورتوں کا دودھ جمع ہورہا ہے، اس کا علم نہیں اور لاعلمی کی بنیاد پر حرمت رضاعت کا مسئلہ پیدا ہوگا، ہاں اگر ریکارڈ موجود رہے تو جواز کے سلسلہ میں غور کیا جاسکتا ہے، پھر بھی بے حیائی کا اندیشہ ہے، لہذا یہ درست نہیں۔

۹- مادہ منویہ کے لئے بینک قائم کرنا اور کسی ضرورت مند عورت یا مرد کو قیمۃً یا ہدیۃً دینا درست نہیں، کیونکہ اس سے بہت سارے مفاسد رونما ہوں گے مثلاً:

۱-اختلاط نسب: مادہ منویہ بینک کے قیام سے لامحالہ نسب کا اختلاط ہوگا، حالانکہ شریعت کی 'کلیات خمسہ' میں نسب کی حفاظت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسی وجہ سے جب لوگ "حضرت زید بن حارثہ" کو زید بن محمد کہنے لگے تو قرآن کریم کی آیت نازل ہوئی: "**أدعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله**" (احزاب:۵) (منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے)۔

پھر یہ بات پیدا ہوگی کہ بچہ کس کا ہے؟ آیا جس کا بیضۃ المنی ہے اس کا یا جس نے اس کو جنا ہے؟ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس کا بیضۃ المنی ہے اسی کا بچہ متصور ہوگا، مگر قرآن کا فرمان ہے: "**إن أمهاتهم إلا الائي ولدنهم**" (مجادلہ:۲) (ان کی مائیں تو وہی ہیں، جنہوں نے ان کو جنا ہے)۔

۲-مشابہت زنا: اس میں گو صورۃً زنا نہیں پائی جارہی ہے، مگر اس سے مشابہت ضرور ہے اور شریعت کا حکم ہے: "**ولا تقربوا الزنا إنه كان فاحشة وساء سبيلا**" (بنی اسرائیل:۳۲) (زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ)۔

۳-تفریق ابن وام: اس میں کوکھ کی کرایہ داری سے بچہ اور ماں کے درمیان تفریق کی شکل پائی جارہی ہے، جبکہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"**لا یفرق بین والدة وولدها**" (السنن الکبری للبیہقی، حدیث ۱۸۸۲۰)(بچہ اور ماں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی)۔

اور فقہاء کرام نے اس کو ممنوع لکھا ہے، علاوہ ازیں بہت سے ایسے مفاسد ہیں، جن سے چشم پوشی ممکن نہیں اور شریعت کی بنیاد احتیاط پر ہوتی ہے، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے: "**الشریعة مبنیة علی الاحتیاط وسد الذرائع**" (شریعت کی بنیاد احتیاط اور سد ذرائع پر ہوتی ہے)، لہٰذا احتیاط ہی میں خیر ہے اور احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ مادہ منویہ کی خرید و فروخت اور بغیر قیمت اس کی فراہمی ہی درست نہیں، چہ جائیکہ مادہ منویہ بینک کے قیام کی اجازت ہو۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اسلام کی نظر میں

مفتی محمد خالد حسین قاسمی نیموی☆

اسلام اللہ تعالی کا نازل کیا ہوا ایسا قانونِ رحمت ہے، جس میں قیامت تک کی انسانیت کے لیے ہدایت اور رہنمائی موجود ہے، زمانہ جتنی بھی ترقی کرے اور حالات وواقعات کتنے ہی متغیر ہوں؛ لیکن اسلام کے دامنِ رحمت میں ان کا واقعی حل موجود ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وننزل من القرآن ماهو شفاء ورحمة للمومنين'' (الاسراء ۸۲) (یعنی ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کررہے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شفاء اور رحمت ہے)، چنانچہ شریعت کی صفتِ رحمت اور شفاء زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔

موجودہ زمانہ میں زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ طب وصحت کے میدان میں بھی ہوش ربا ترقی ہوئی۔ جدید میڈیکل سائنس نے ایسی چیزوں کو ممکن کردکھایا، جو چیزیں پہلے خواب وخیال میں بھی نہیں آتی تھیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان ہوش رُبا ترقیات میں سے نہ تمام امور کو جائز کہا جاسکتا ہے، نہ انھیں ناجائز ٹھہرایا جاسکتا ہے، بلکہ انھیں چیزوں کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے؛ جو شرعی نقطہ نظر سے حدِّ جواز میں ہوں؛ جہاں تک طب یا میڈیکل سائنس کا معاملہ ہے تو اس کا مقصد بھی صحت وسلامتی سے متعلق انسان کے مصالح دنیوی کی حفاظت ہے، جس طرح شریعت کا مقصد انسان کے دنیوی واخروی تمام مصالح کی حفاظت ہے۔ علامہ عز بن عبد السلام تحریر فرماتے ہیں: ''**الطب كالشرع. وضع لجلب مصالح السلامة والعافية ولدرء مفاسد المعاطب والاسقام**'' (قواعد الاحکام ۱/ ۴)، یعنی طب کا ماحصل بھی انسان کے مصالح یعنی سلامتی اور عافیت کا حصول اور مفاسد یعنی ہلاکت میں ڈالنے والے امور اور بیماریوں سے حفاظت ہے۔ جس طرح شریعت کا مقصد مصالح انسانی کا حصول اور مفاسد کا سد باب ہے۔

ایک شخص کے عضو کی دوسرے شخص کے جسم میں پیوندکاری کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

یہ مسئلہ کئی ملکی اور بین الاقوامی فقہ اکیڈمیوں کے زیر بحث آچکا ہے، جس میں کافی کچھ اختلاف ہے۔ علماء کی ایک

☆ دار الافتاء مدرسہ بدر الاسلام بیگوسرائے، بہار۔

بڑی تعداد نے مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ مسئلہ بھی اہم ترین ہے کہ کیا کوئی شخص اپنے جسم کے کسی متعین حصہ کو دوسرے کے جسم میں لگانے کے لیے ہبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ سے وابستہ مندرجہ ذیل جزئیات خاص طور پر قابل تحقیق ہیں۔

۱- کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بناء پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے یا نہیں؟

انسانی کرامت، نوعِ بشری کی فضیلت اور اعضاء انسانی کے احترام کا اصل تقاضہ یہ ہے کہ اعضاء انسانی اور انسانی خون دوسروں کو دینا درست نہ ہو، لیکن ضرورت اور حاجت کے مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ایمرجنسی حالات میں اس کی مشروط اجازت ہے۔ ایک انسان کا خون دوسرے کو چڑھانا اس وقت درست قرار دیا جاسکتا ہے؛ جب کہ اس کی سخت ضرورت ہو اور اس کا کوئی بدل دستیاب نہ ہو اور اس خون سے ضرورت مند شخص کو نفع پہنچنے کا غالب گمان ہو اور جس شخص کا خون چڑھایا جارہا ہے وہ شخص برضا ورغبت خون دینے کے لیے تیار ہو اور اس کے جسم سے خون لینے میں اس کو ضرر لاحق نہ ہو۔ اس صورت میں اس کے جسم سے اتنا خون لینا درست ہوگا کہ وہ خود ہلاکت کا شکار نہ ہو (مختصر الفقہ السلامی فی ضوء القرآن والسنۃ۔ لمحمد بن ابراہیم التویجری)۔

اس لیے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے حرام اور نجس چیزوں کے بیان کرنے کے بعد ان حالات کا استثناء بھی فرمادیا، جن میں انسان اضطرار کا شکا ہو اور جان بچانے کے لیے نجس یا حرام چیزوں کی ضرورت ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما اهل به لغير الله فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه ان الله غفور رحيم** '' (البقرہ ۱۷۳) (اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو اور بہتے ہوئے خون کو اور خنزیر کے گوشت کو اور ایسے جانوروں کو جو غیر اللہ کے نام زد کیا گیا ہو، پھر بھی جو شخص جو بھوک سے بیتاب ہوجائے بشرطیکہ وہ طالب لذت نہ ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے اور بے حد مہربان ہیں)۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے: ''**فكلو ا مما ذكر اسم الله عليه إن كنتم بآياته مومنين ومالكم ألا تاكلوا مما ذكر اسم الله عليه وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم إليه** '' (الانعام ۱۱۸، ۱۱۹) (تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا جائے، اس میں سے کھاؤ اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو اور کیا سبب کہ تم نہیں کھاتے اس جانور میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اور وہ واضح کرچکا ہے ان تمام چیزوں کو جس کو اس نے تم پر حرام کیا ہے مگر جب کہ تم

اس کے کھانے پر مجبور ہو جاؤ)۔

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ دم مسفوح یعنی بہنے والے خون کو اللہ تعالی نے حرام قرار دیا۔ ارشاد ہے: "**أو دما مسفوحا**"، لیکن جب تک خون جسم انسانی میں رگوں میں موجود ہو تو وہ خون فی نفسہ پاک ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "**ان دم الآدمی طاهر مادام فی جسده فاذا ظهر وبرزکا ن نجسا**" (الفتاوی ۲۱/۵۵۸۔۶۲۱) کہ آدمی کا خون پاک ہے جب تک کہ وہ اپنے رگوں میں رہے لیکن جب وہ نکل کر بہنے لگے تو ناپاک ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے ارشاد فرمایا: "**سبحان الله المومن لا ینجس**" (سبحان اللہ ایمان والا ناپاک نہیں ہوتا)۔

اس سلسلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے خون کی خرید و فروخت کرنے کی ممانعت فرمائی۔ ارشاد ہے: "**عن ابی جحیفة رضی الله عنه نهی رسول الله ﷺ عن ثمن الکلب وثمن الدم ونهی عن الواشمة والموشومة وآکل الربو وموکله ولعن المصورین**" (رواہ البخاری، کتاب البیوع رقم الحدیث ۲۰۸۶) (حضرت ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت اور خون کی قیمت کی ممانعت فرمائی۔ اور جسم کو گودنے والیوں اور گودوانے والیوں کو بھی ان کے اعمال سے منع فرمایا۔ اسی طرح سود لینے اور سود دینے کی ممانعت فرمائی اور تصویریں بنانے والی پر لعنت فرمائی)۔

خون چڑھانے میں اصل یہ کہ انسان خون کو ڈونٹ کرے عطیہ اور ہبہ کے طور پر دے۔ اس کو فروخت کرنا اور اس کا معاوضہ طلب کرنا انسانی کرامت اور بشری احترام اور اس کی قدر و قیمت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**ولقد کرمنا بنی آدم وحملناه فی البر والبحر وفضلناه علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا**" (کہ ہم نے انسان کو مکرم بنایا اور خشکی و تری میں اس کی سواری کا انتظام کیا اور اپنی مخلوقات میں سے بہتوں پر اس کو فضیلت دی)۔

لیکن اگر جان بچانے کے لیے خون عطیہ کرنے والا کوئی نہ ہو؛ بلکہ عوض لے کر خون دینے والا دستیاب ہو؛ تو اس صورت میں اس شخص سے خون قیمتا لینا بھی درست ہوگا، لیکن بیچنے والے کے لیے اس کی قطعا اجازت نہیں ہوگی۔ "**وبیع الدم واخذ ثمنه حرام فان أعطی المتبرع هدیة مجازاة علی معروفه واحسانه فلاباس باخذها**" (موسوعۃ الفقہ الاسلامی۔ ۵/۴۹۳) (یعنی خون کو فروخت کرنا اور اس کی قیمت لینا حرام ہے، لیکن اگر خون کا عطیہ دینے والے کو اس کی نیکی اور احسان پر ہدیہ کے طور پر کچھ بدلہ دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے)۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دم'' نجس ہے:''وما قطع من حی فهو كمیتة نجس ۔والنجس لایجوز بیعه'' (۲/ ۵۲ فقہ النوازل) کہ نجس کی بیع درست نہیں ہے۔حضرت ابوواقدؓ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اونٹ کے کوہان کو کاٹ دیا کرتے تھے،اسی طرح دنبہ کی دم سے متصل چکتی کو کاٹ لیا کرتے اور اسے کھانے میں استعمال کرتے تھے،جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:''ما قطع من البهیمةوهی حیة فهو میت'' (رواہ احمد، والترمذی وابوداؤد) کہ کسی چوپایہ کا جو حصہ کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہو جب کہ وہ جانور زندہ ہو تو اس کا حکم مردار کا ہے یعنی نجس ہے۔امام ترمذیؒ نے اس پر باب قائم کیا:''باب ماجاء ماقطع من الحی فهو میت ''فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:''ان جواز الانتفاع لایستلزم جواز البیع''(یعنی نفع اٹھانے کے جائز ہونے سے بیع کا جائز ہونا لازم نہیں آتا ہے)،لہٰذا اس کا فروخت کرنا حرام ہے۔

اپنے خون کا یا دوسروں کے خون کا معاوضہ وصول کرنا درحقیقت اس قیمتی قابل احترام انسانی حصے کو دیگر سامانوں کی طرح بنانا اور ایک طرح سے جزوی غلامی میں دینا ہے،جو انسانیت کی تذلیل ہے۔لیکن اگر بغیر عوض کوئی خون دینے کے لیے تیار نہ ہو،تو ضرورت مند مریض کے لیے اس کا عوض دے کر خون حاصل کرنا درست ہوگا،لیکن قیمت لینے والا بہر حال گنہ گار ہوگا،''كما روی عن ا لنبی ﷺ انه نهی عن ثمن الدم''،البتہ اگر مریض نے بطور تبرع خون دینے والے شخص کو پھل وغیرہ استعمال کرنے کے لیے کچھ رقم دیا تاکہ اس کے جسم کے خون کی کمی کی تلافی ممکن ہو سکے تو یہ درست ہے،لیکن پہلے نہ دے تاکہ خرید وفروخت کی شکل نہ بنے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۲۶۰۹)۔

کیا بلڈ بنک میں مسلماں خون ڈونیٹ(DONATE) کرسکتا ہے؟

ایمرجنسی حالات مثلاً اکسیڈینٹ،آتش زنی،ولادت یا خطرناک امراض مثلاً کینسر،ہیپاٹائٹس بی،ڈینگو بخار وغیرہ کے مواقع پر ضرورت مندوں کو خون فراہم کرکے اس کی جان بچانے کے لیے بلڈ بنک قائم کرنا درست ہے،اور چوں کہ ایسے حادثات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں اور اس طرح کے حادثات کا شکار مسلم غیر مسلم کوئی بھی شخص ہوسکتا ہے،لہٰذا ایسے بلڈ بنک میں انسانی جانوں کے تحفظ کے لیے خون ڈونٹ کرنے کی اجازت ہے۔اگر مسلمان اپنی ضرورت کے لیے دوسروں کے قائم کردہ بلڈ بنک سے استفادہ کرے اور اس کے ذریعہ اپنی یا اپنے قریبی مریض کی جان بچائے،لیکن وہ اس طرح کے اداروں میں خون ڈونٹ نہ کرے،تو آئندہ خود اس کے لیے اس طرح کے اداروں سے استفادہ ممکن نہیں رہ جائے گا۔

کیا خون دینا واجب ہے یا مستحب یا جائز؟

اگر کسی مریض کو خون کی ضرورت ہو لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جس کا ملنا مشکل ہو؛اب اگر

کوئی ایسا فرد دستیاب ہو جس کا خون اسی گروپ سے تعلق رکھتا ہو تو ایسی صورت میں اس شخص کے لیے خون کا عطیہ کرنا مستحب ہوگا واجب نہیں ہوگا۔

اس لیے کہ اللہ تعالی بندوں کو حرج میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ارشاد باری ہے:"**مایریداللہ لیجعل علیکم من حرج**"(المائدۃ۶)(اللہ تعالی نہیں چاہتا کہ تم کو تنگی میں مبتلا کرے)۔سورہ حج میں ارشاد ہے: "**وما جعل علیکم فی الدین من حرج**" (سورۂ حج:۷۸)،سورہ بقرہ میں ارشاد ہے: "**یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر**" (سورۂ بقرہ:۱۸۵)(یعنی اللہ تعالی احکام میں تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمانا چاہتے ہیں، تمہیں دشواری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے)۔اور سورہ نسا میں ارشاد ہے:"**یرید اللہ ان یخفف عنکم وخلق الانسان ضعیفا**" (سورۂ نساء:۲۸)(یعنی اللہ تعالی تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمانا چاہتا ہے)۔

اسی طرح اللہ تعالی نے ان مومنوں کی تعریف کی ہے جو اپنے کھان پان ودیگر معاملات میں اپنے بھائی کو اپنی ذات پر اور اس کی ضروریات اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا ہے۔"**ویؤثرون علی أنفسھم ولو کا ن بھم خصاصۃ**"۔جب چھوٹی چھوٹی چیزوں کا یہ معاملہ ہے،تو جو شخص دوسروں کی جان بچانے کے لیے اپنے جسم کے انتہائی قیمتی خون کو ہبہ کردے تو وہ شخص تو زیادہ قابل تعریف ہوگا۔

فقہاء کرام نے خون سے علاج کو درست قرار دیا ہے فتاوی ہندیہ میں ہے: "**ولا باس ان یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشربہ للدواء**" (فتاوی ہندیہ ۳۵۵/۵)،اسی طرح ہڈی سے متعلق یہ جزئیہ موجود ہے:"**ولا باس بالتداوی با لعظم اذا کا ن عظم شاۃ أوبقرۃ او بعیر او فرس او غیرہ من الدواب إلا عظم الخنزیر والآدمی فانہ یکرہ التداوی بھا**"۔

لہذا ضرورت کے پیش نظر خون چڑھانے کی اجازت ہے،لیکن چند شرطوں کے ساتھ(۱) مریض کو خون کی سخت ضرورت ہو،اور اس کی شہادت کوئی ماہر ڈاکٹر دے(۲)اس کا کوئی بدل نہ ملے جس سے اس کی پریشانی دور کی جا سکے،(۳)جس سے خون لیا جا رہا ہے اس شخص کو ضرر لاحق نہ ہو۔(۴) خون لینے میں ضرورت پوری ہونے کی حد پر اکتفا کیا جائے،زائد از ضرورت نہ لیا جائے،"**ما ابیح للضرورۃ یقدر بقدر ھا**"(شرح القواعد الفقہیۃ ۱۳۳/،الاشباہ والنظائر للسیوطی ۱۶۸/۱)۔

۵-کیا گردہ وغیرہ کا عطیہ کسی ضرورت مند شخص یا ادارہ کو کیا جاسکتا ہے:

اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا انسان کا جسم اس کی ملکیت ہے؟ کیا انسان کا جسم اور اس جسم کے مختلف

اعضاء اس کی ملکیت ہیں؟ یا ملکیت نہیں ہیں۔ محض اللہ رب العالمین کی طرف امانت اور ودیعت ہیں اور وہ اس جسم کا امین ہے؟ یا وہ اس کا مالک ہے۔ اور اس میں جیسا چاہے تصرف کرسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں زیادہ تحقیقی بات یہی ہے کہ جسم انسانی میں دو حقوق جمع ہیں اول اللہ کا حق ہے کہ اس کا بندہ بن کر رہا جائے اس کے احکامات کی تعمیل کی جائے اور اس کے منشاء کے مطابق اعضاء و جوارح کا استعمال کرے؛ لہذا اس کے لیے خودکشی حرام ہے۔ اسی طرح وہ اپنا کوئی عضو دوسرے کو ہبہ نہیں کرسکتا ہے۔ علامہ قرافیؒ فروق میں تحریر فرماتے ہیں: "**وحرم الله القتل والجرح صونا لمهجته واعضائه ومنافعها عليه ولو رضى العبد باسقاط حقه من ذلک لم يعتبر رضاه ولم ينفذ اسقاطه**"۔ دوسرا بندے کا حق ہے کہ وہ بہت سے معاملات میں آزاد ہے اور اپنے اعضاء و جوارح کا مالک ہے۔ حالات و ضرورت کے لحاظ سے کوئی ایک راجح اور دوسرا مرجوح ہوتا ہے۔

شریعت ولادت سے قبل ہی اس کے حقوق کی نگہداشت کرتی ہے اور شکم مادر میں زیر پرورش بچہ کی جنایت میں دیت کو واجب قرار دیا ہے، اسی طرح جو ماں اپنا کامل الخلقت حمل ساقط کرادے تو اس پر بھی دیت کو واجب قرار دیا ہے، اسی طرح اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت فرمائی ہے۔" **ولا تلقوا بأيدكم إلى التهلكة** " (یعنی تم اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو)۔

اسی طرح کسی مصیبت اور تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے بھی منع فرمایا: "**لا تتمنوا الموت** " (ابن ماجہ، احمد) (یعنی تم موت کی تمنا مت کرو)۔

مسلمانوں کو مختلف انداز میں جان کی حفاظت پر آمادہ کیا گیا ہے اور کسی کی جان بچانے کو بہت بڑی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**ومن أجل ذلک كتبنا على بني اسرائيل أنه من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل النا س جميعا ومن أحيا ها فكأنما احيا الناس جميعا**" (المائدۃ ۳۲) (اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جو شخص کسی شخص کو دوسرے شخص کے کے عوض یا ملک میں فساد برپا کیے بغیر قتل کرڈالے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کرڈالا اور جس شخص نے کسی انسان کو بچالیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچالیا)۔

ہلاکت کے اسباب میں سے سب سے زیادہ پیش آنے والا سبب مختلف امراض اور بیماریاں ہیں، تو کسی مسلمان کی طرف سے اپنے بھائی کو بیماری سے بچانے کے لیے بطور ایثار کے کچھ دینا درحقیقت اسے بیماری سے اور نتیجتاً اسے ہلاکت سے بچانے کی کوشش ہے، انسانی جان اور اس کے جسم کے اسی احترام کی وجہ سے مثلہ کرنے اور شکلیں بگاڑنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور جو چیزیں بھی مثلہ کے زمرے میں آتی ہیں ہیں انھیں بھی حرام قرار دیا گیا ہے، اور اسے شیطانی عمل فرمایا گیا، اللہ

تعالی کا ارشاد ہے:''ولآمرنهم فليغيرن خلق الله ومن يتخذ الشيطان وليا من دون الله فقد خسر خسرانا مبينا'' (النساء۱۱۹) (یعنی میں انھیں سکھلاؤں گا کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلیں)۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ ہجرت کر کے حضرت طفیل بن عمرو دوسی بھی تشریف لائے، اوران کے ساتھ ان کی قوم کے ایک آدمی بھی ہجرت کر کے آئے، لیکن انھیں مدینہ منورہ کی آب وہوا راس نہیں آئی، اسی درمیان انھیں سخت بیماری لاحق ہوگئی۔ اور انھیں سخت گھبراہٹ لاحق ہوگئی۔ تو انھوں نے دھار دار تیر لیا اوراس کے پھل سے انگلیوں کے سرے کو کاٹا جس کی وجہ سے ان کے خون نکلنے لگا یہاں تک کہ ان کی موت ہوگئی۔ تو طفیل بن عمرو دوسی نے انھیں خواب میں دیکھا۔ ان کی شکل حسین وجمیل تھی، ہیئت اچھی تھی اور انھیں دیکھا یہ کہ ان کے دونوں ہاتھ ڈھکے ہوئے ہیں حضرت طفیل نے ان سے دریافت کیا کہ اللہ تعالی نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ تو انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ کی خدمت میں ہجرت کر کے آنے کی وجہ سے اللہ نے میری مغفرت فرمادی۔ تو انھوں نے پوچھا کہ آپ کے ہاتھ کیوں ڈھنپے ہوئے ہیں۔ تو انھوں نے بتایا کہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑ دیا اسے میں ہرگز درست نہیں کروں گا۔ طفیل بن عمرؓ نے اس خواب کے واقعہ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیان کیا۔ تو آپ نے فرمایا:''اللهم وليديه فاغفر'' (اے اللہ! اوران کے ہاتھ کی بھی مغفرت فرمادیجیے)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے اعضاء میں تصرف کر کے اسے بگاڑنا سخت ممنوع ہے (صحیح مسلم ۱/۴۹،۵۰)۔

چونکہ انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے؛ بلکہ امین ہے اس لیے اس کے لیے اپنے آپ کو فروخت کرنا یا اپنے اعضاء میں سے کسی عضو کو فروخت کرنا کسی بھی حال میں درست نہیں، اس لیے کہ کسی چیز کو فروخت کرنا اسی وقت درست ہوسکتا ہے جب کہ وہ چیز ملکیت میں ہو۔ ''وقد نهى الشارع عن بيع مالا يملكه'' (البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا ۱/۴۱۶۔ لعبدالناصر الخضر)۔

علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:''والآدمي مكرم شرعا وإن كان كافرا فإيراد العقد عليه وابتذاله وإلحاقه بالجمادات اذلا ل له وهو غير جائز'' (ردالمحتار علی الدر ۷/۲۴۵)۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ:''كسر عضوالميت ككسر عظم الحى فى الاثم'' (ابو داؤد رقم الحدیث ۳۲۰۷، ابن ماجہ ۱۶۱۶) یعنی میت کے کسی عضو کو توڑنا اتنا ہی گناہ کا سبب ہے جتنا زندہ کی ہڈی کو توڑنے کا گناہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے یہ موقف اختیار کیا کہ کہ اگر کوئی شخص کسی میت کو زخمی کردے یا اس کی ہڈی توڑ دے تو اس سے بدلہ لیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت کریمہ'' والجروح قصاص'' کے عموم کا تقاضہ ہے (المحلی لابن حزم ۱۱/۹۲۔ المجموع ۵/۲۸۳)۔

لہذا اگر کوئی ماہر ڈاکٹر پختگی کے ساتھ اس بات کی ضمانت دے کہ ایک شخص کی زندگی محض ایک گردے سے باقی رہ سکتی ہے اور وہ صرف ایک گردے سے اپنی زندگی گذار سکتا ہے اور وہ شخص اپنے کسی رشتہ دار یا عزیز قریب کو اس کی جان بچانے کے لیے گردہ ہبہ کرتا ہے کہ تو اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ اس صورت میں بظاہر مثلہ کی شکل بھی نہیں بنتی اور دونوں کی زندگی بھی بچ جاتی ہے، جن فقہاء نے اعضاء کی پیوند کاری کو ناجائز قرار دیا تھا وہ اس وقت کی بات تھی جب کہ عمل جراحی کو فروغ حاصل نہیں ہوا تھا اور اعضاء کی پیوند کاری ایک خطرناک معاملہ تھا جس میں جان جانے کا بھی خطرہ برقرار رہتا تھا، لیکن اب جب کہ یہ معاملہ آسان ہوگیا ہے، ماہرانہ طور پر اس عمل کو کیا جائے تو نہ اس میں مریض کو کوئی خطرہ ہوتا ہے، نہ تو ڈاکٹر کو تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ عدم جواز کے قول کا اعادہ کیا جائے، خاص طور پر ضرورتوں کے پس منظر میں۔ اس لیے اضطراری حالات میں اس کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح انسان کے وہ اعضاء جو کسی بیماری کی وجہ سے اس کے جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہو، اگر وہ عضو کسی دوسرے مریض کے لیے مفید ہو تو اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً کسی مرض کی وجہ سے آنکھ کا قرنیہ مریض کے جسم سے الگ کر دیا گیا تو اگر اس سے کسی دوسرے مریض کی ضرورت پوری ہوسکتی ہو تو اس کا استعمال اس شخص کے لیے درست ہوگا۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۵۱۲۲)۔

اسی طرح اگر جسم کا کوئی حصہ اس طور پر الگ کیا جاتا ہے کہ اس سے مثلہ کی شکل نہیں بنتی ہے اور انسانی احترام کی خلاف ورزی بھی نہ ہوتی ہو اور خرید وفروخت کی شکل بھی نہ ہو تو ایمرجنسی حالات میں اس سے مریض استفادہ کرسکتا ہے۔

۶- کیا کوئی شخص اپنی آنکھ کا عطیہ کرسکتا ہے۔ آنکھ یا آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس عمل میں اگر ایک آنکھ کا قرنیہ عطیہ کے طور پر آنکھ کے کسی مریض کو دیتا ہے تو یہ اپنے کو یک چشم بنانا ہے اور اگر دونوں آنکھوں کا عطیہ کرتا ہے تو یہ اپنے کو نابینا اور اندھا بنانا ہے۔ جو مثلہ کی ممانعت "**لا تمثلوا**" (صحیح مسلم) اور "**لا تلقوا بايدكم الى التهلكة**" کی وجہ سے ممنوع ہے۔

۷- کیا اعضاء کے عطیہ کرنے کی وصیت کرنا درست ہے؟

ماقبل میں یہ بحث آچکی ہے کہ انسان اپنی ذات کا اور اپنے اعضاء وجوارح کا مالک نہیں بلکہ امین ہے۔ اپنے انتقال کے بعد اپنے جسم پر اسے کوئی اختیار بھی باقی نہیں رہ گیا؛ لہذا نہ اس وصیت کو شرعی وصیت کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی یہ وصیت معتبر ہوگی۔ جہاں تک وارثوں کے اختیار کا معاملہ ہے تو ان کے لیے بھی مردہ جسم میں تصرف کرنا درست نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ اللہ کے ذمہ میں چلا گیا۔ اب مردہ جسم میں تصرف کرنا درحقیقت اسے مثلہ کرنا ہے، جس کی اسلام قطعا اجازت نہیں دیتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "**لاتمثلوا**" (صحیح مسلم)، یہ درحقیقت شیطانی عمل ہے، اللہ تعالی نے قرآن

کریم میں شیطان کے حوالہ سے فرمایا: ''**ولآمرنهم فليغيرن خلق الله**''(النساء۱۱۹)، روایت ہے: ''**اذی المومن فی موته كأذاه فی حياته**''(ابن ابی شیبہ)، یعنی کسی مومن کو مرنے کے بعد تکلیف پہنچانا ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ زندگی میں تکلیف پہنچانا حرام ہے، علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: ''**يستفاد منه ان حرمة المومن بعد موته باقية كما كانت فی حياته**''(فقہ النوازل ۲/۱۴)۔

علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: ''**عظم الذمی محترم فلايكسر اذا وجد فی قبره لانه لما حرم ايذائه فی حياته لذمته وجبت صيانة نفسه عن الكسر بعد موته** ''(ردالمحتار ۱/۲۰۷)، بعض حضرات زندہ بچے کو بچانے کے لیے وفات یافتہ ماں کے شکم کو چاک کرنے کے جواز (ردالمحتار ۲/۲۰۲) سے نقل اعضاء پر استدلال کرتے ہیں؛ لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ بچہ کو نکالنے کی کوئی اور شکل شکم مادر کو چاک کرنے کے علاوہ نہیں ہے، جب کہ دیگر معاملات میں بہت سے متبادل ہوتے ہیں۔ علماء کی ایک بڑی تعداد نے اس قول کو اختیار کیا ہے: **وهناك اتجاه آخر يمنع نقل العضو من الميت إلى الحی على أساس ان جسد الآدمی ملك لله سبحانه وتعالى وبالتالی لايجوز للانسان وهو حی أن يوصی او يتبرع بشئی من أعضائه بعد موته كما لا يجوز لأحد أقاربه أو النيابة العامة أو ای جهة أخرى الاذن بالمساس بجسد هذا الميت لأخذ عضو منه أو اكثر**''(ردشبہ المجیزین لنقل الاعضاء لمحمود محمد عوض سلامۃ ۱/۷)۔

خیال ہوتا ہے کہ یہ نقطہ نظر دلائل کے لحاظ سے راجح اور احوط ہے۔ نقل اعضاء کے جواز کے قائلین عام طور پر ''**الضرورات تبيح المحضورات** '' جیسے قواعد سے استدلال کرتے ہیں؛ لیکن اس بات پر بھی اجماع ہے؛ ''**ان الضرورة لا تقبل جرائم النفس ابدا** '' کہ ضرورت کی بنیاد پر نفس سے وابستہ جرائم کی اجازت کبھی بھی نہیں دی جاسکتی ہے۔ انسانی جان کے حساب پر دوسرے کو بچانا یا میت کی حرمت کو پامال کرنا چہ معنی دارد۔؟ اگر نقل اعضاء کے سلسلہ میں ضرورت معتبر ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ایک عورت کو اپنی گنجا پن کی بیماری میں مبتلا بیٹی کو وصل شعر سے منع نہیں فرماتے اور واصلہ اور مستوصلہ پر اللہ کی لعنت کی وعید نہ سناتے۔ لعنت تقاضہ کرتی ہے کہ وہ کام ناجائز اور حرام ہو۔ جہاں تک اقوال فقہاء کا تعلق ہے تو فقہاء حنفیہ میں سے علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: ''**الانتفاع باجزاء الآدمی لم يجز قيل للنجاسة وقيل للكرامة وهو الصحيح** ''(ردالمحتار ۵/۵۸)، اسی طرح اس فتنہ وفساد کے زمانہ میں جب کہ لوگوں کے دینی شعور میں کمی آئی ہے، مردہ جسم میں تصرف کا اختیار وارثوں کو بھی نہیں دیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ ورثاء اپنی مادی منفعت کے حصول کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں، ان سے ہر حال میں خیر کی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔

مالکیہ میں سے علامہ صاویؒ فرماتے ہیں: ’’ان کسر عظام المیت انتهاک لحرمته ...فان بقی شیء من عظامه فالحرمة باقية لجميعه فلا يجوز استخدام ظفر الميت ولا جزء منه ولا شعره لأن هذه الأجزاء محترمة وفی اخذها انتهاک لحرمتها‘‘ (بلغۃ السالک ۱/ ۴۳۲)۔

علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: ’’وان وجد معصوما میتا لم یبح أكله‘‘ (المغنی مع الشرح الکبیر ۱۱/ ۱۹۱)۔

اس سلسلہ میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پیوندکاری کے جواز سے حوصلہ پاکر بعض سنگ دل لوگوں کی طرف سے دفن شدہ لاشوں کو جس طرح کھود کر نکالا جارہا ہے اور اس کے اعضاء وجوارح کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے اور بسا اوقات اسی کے لیے بچوں معذوروں اور غربت زدہ لوگوں کا اغوا کیا جاتا ہے اور انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کا جو غیر انسانی کاروبار کا بازار گرم ہے، وہ انسانی تذلیل کی انتہاء ہے۔ اللہ حفاظت فرمائے۔ اس کے علاوہ ایک میت کی تذلیل کرکے اگر بعض اعضاء ضرورت کی بنیاد پر حاصل بھی کرلیے جائیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان اعضاء کو زندہ مریض کا جسم قبول کرلے گا اگر قبول بھی کرلیا تو کیا وہ مستقل کام کرتا رہے گا۔ جب اللہ نے موت کا وقت مقرر کررکھا ہے۔ تو محض موت سے بچنے کے لیے جائز وناجائز کی پروا کیے بغیر اس چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

۸- کیا دودھ بنک قائم کرنا درست ہے؟

دودھ ایک خالص غذا ہے، جو انسانی زندگی کے لیے محور ہے

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ’’وان لكم فی الانعام لعبرة نسقيكم مما فی بطونه من بين فرث ودم لبنا خالصا سائغا للشاربين‘‘ (النحل ۶۶) (یقیناً تمہارے لیے چوپایوں میں عبرت کا سامان ہے۔ ہم پلاتے ہیں تم کو خالص دودھ اس کے پیٹ میں موجود گوبر اور خون کے درمیان سے جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے)۔ دودھ پاکیزہ اور طیب غذا ہے، بناتِ آدم کے دودھ کی پاکیزگی مسلم ہے، اسی طرح ماکول اللحم جانوروں کا دودھ بھی پاک اور طیب ہے، لیکن ماں کا دودھ اپنے احترام میں دوسرے دودھ سے بدرجہا فائق ہے، اس لیے کہ وہ انسان کا ایک جزء ہے اور انسانی اعضاء کا احترام مسلم ہے، یہ بیشک اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے ماؤں کی تھن میں ایسی غذا رکھ دی جو بچوں کے لیے امرت سے بھی بڑھ کر ہے، اگر تھن سے بچے دودھ پئیں تو اس سے حرمت رضاعت بھی متعلق ہوتی ہے، یہ دودھ کے رشتہ کا احترام ہے۔ خواتین اگرچہ ممتا کے جذبہ سے دودھ پلاتی ہیں لیکن اس بات کی بھی اجازت ہے کہ وہ شوہر یا کسی اور شخص سے اجرت وصول کرکے دودھ پلائیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ’’فإن أرضعن لكم فآتو هن أجورهن‘‘ (الطلاق ۶)، خود سرور کائنات ﷺ نے اپنے صاحبزادہ ابراہیم کے لیے دودھ پلانے والی دایہ کو اجرت پر مقرر کیا تھا۔ اسی لیے علامہ ابن قدامہ نے دودھ پلانے کے لیے

دایہ کو اجرت پر رکھنے کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے (۴۹۶/۵)۔

جہاں تک عورتوں کے دودھ کو تھن سے الگ کر کے بیچنے کا معاملہ ہے تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔حنفیہ کا مسلک ہے کہ عورتوں کے دودھ کی بیع درست نہیں ہے۔اسی وجہ سے کبھی بھی اس کو جانوروں کے دودھ کی طرح بیچنے کا رواج نہیں رہا۔اس میں ایک پہلو احترام کا بھی ہے کہ وہ ایک انسان کا جزء ہے، انسان اپنے تمام اجزاء کے ساتھ محترم ہے؛لہذا اس کی حرمت کا تقاضہ ہے کہ اس کی بیع درست نہ ہو۔علامہ کاسانی رقم طراز ہیں: "**ولاینعقد بیع لبن المرأة فی قدح عندنا لأن اللبن لیس بمال فلایجوز بیعه ۔ثم لا فرق بین لبن الحرة وبین لبن الامة فی ظاهر الروایة وعند أبی یوسف یجوز بیع لبن الامة لانه جزء من آدمی هو مال فکان محلا للبیع کسائر أجزائه**" (بدائع الصنائع ۱۴۵/۵)۔

ہدایہ میں ہے: "**ولایجوز بیع لبن امراة فی قدح وقال الشافعی رحمه الله یجوز بیعه لأنه مشروب طاهر ۔ولنا انه جزء الآدمی وهو بجمیع اجزائه مکرم مصون عن الابتذال با لبیع ولا فرق فی ظاهرالروایة بین الحرة والأمة**"۔

مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ عورتوں کے دودھ کو الگ کر کے بھی بیچنا جائز ہے،وہ پاک ہے اور اس سے انتفاع درست ہے۔

مواہب الجلیل میں ہے: "**ولبن الآدمی الا المیت أی والطاهر لبن الآدمی ذکرا کا ن أو أنثی مسلم أو کا فر وقوله إلا الآدمی المیتة فلبنه نجس بناء علی انه نجس ویجوز بیع لبن الآدمیات لانه طاهر منتفع به**" (الحطاب ۹۳/۱)۔

مالکیہ کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ زندہ آدمی کا دودھ جو اس کی زندگی میں اس سے الگ کرلیا جائے پاک ہے۔اس میں مذکر،مونث اور مسلم وکافر کا دودھ برابر ہے جب کہ جو شخص مر چکا ہو اس کا دودھ ناپاک ہے، جہاں تک اس کے فروخت کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے،اس لیے کہ وہ پاک ہے اور بچوں کی غذائی ضرورت اس سے وابستہ ہے۔

شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ عورتوں کے دودھ کی بیع درست ہے اور اس کی خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ وہ دودھ زندہ ہونے کی حالت میں نکالا گیا ہو،البتہ شافعیہ میں سے بعد کے بعض اصحاب نے اس سے اختلاف کیا ہے ،چنانچہ مجموع میں ہے: "**بیع لبن الآدمیات جائز لا کراهة فیه عندنا هذا هو المذهب وقطع به الأصحاب**" (النووی ۳۰۴/۹)۔

جہاں تک حنابلہ کے مذہب کا تعلق ہے تو اصل مذہب ان کے ہاں بھی عورتوں کے دودھ کی بیع درست ہے، اس لیے کہ وہ جسم انسانی سے جدا ہوا ہے لہذا وہ پاک ہے اور اس سے نفع اٹھانا شرعا درست ہے، البتہ حنابلہ کے یہاں ایک دوسرا قول عدم جواز کا بھی ہے۔ کشاف القناع میں ہے: "**یصح بیع لبن آدمیة ولو کانت حرة ای المنفصل منها لانه طاهر منتفع به کلبن الشاة......ویکره للمراة بیع لبنها**" (البھوتی ۴/۱۳۸۴)۔

اس سلسلہ میں تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) عورتوں کے دودھ کی بیع مطلقا درست ہے، چاہے وہ آزاد ہو یا باندی۔ جیسا کہ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا مسلک ہے۔

(۲) عورتوں کے دودھ کی بیع مطلقا ناجائز ہے، جیسا کہ حنفیہ کا مسلک اور شافعیہ میں سے ابوالقاسم انماطی کا قول اور حنابلہ کا قولِ ثانی ہے۔

(۳) عورتوں کے دودھ کی بیع مطلقا مکروہ ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

(۴) آزاد عورتوں کے دودھ کی بیع درست اور باندیوں کے دودھ کی بیع ناجائز، جیسا کہ امام ابو یوسف اور بعض حنابلہ کا قول ہے۔

مذکورہ تمام اقوال میں سے ہر ایک کے لیے مختلف دلائل ہیں، جن میں سے بعض کا تذکرہ اقوال کے ساتھ آچکا ہے۔ دلائل کے مناقشے تو اپنے مقامات پر موجود ہیں؛ یہاں اتنی بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ یہ مسئلہ منصوص نہیں بلکہ مجتہد فیہ مسئلہ ہے، البتہ حنفیہ کا مذہب انسانی قدروں کے احترام پر مبنی ہے۔ لہذا شرعی نقطہ نظر سے دودھ پلانے کے لیے خواتین کی خدمت تو حاصل کی جاسکتی ہے اور انھیں اس کا معاوضہ اور اکرامیہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن عورتوں کی تھنوں سے دودھ نکلوا کر اسے بکنے اور خریدی جانے والی چیز بنا دینا درحقیقت انسانیت کی توہین ہے۔ قبل میں فقہ کا مشہور قاعدہ آچکا ہے: "**ان جواز الانتفاع لایستلزم جواز البیع**"۔ یعنی نفع اٹھانے کے جائز ہونے سے بیع کا جائز ہونا لازم نہیں آتا ہے، لہذا اس کا فروخت کرنا حرام ہے۔ دودھ کوئی عام سی چیز نہیں بلکہ اس کو اسلام نے اس قدر اہمیت سی ہے کہ محض چند گھونٹ دودھ کی وجہ سے حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے جو زندگی بھر قائم رہتی ہے، اجنبیت ختم ہوجاتی ہے اور چند سیراب کُن گھونٹ دودھ پلانے والی خاتون زندگی بھر کے لیے ماں کی طرح عزت واحترام کا مستحق بن جاتی ہے۔ محض بچوں کی ضرورت کی وجہ سے اس کے پینے کو اور اس پر اجرت لینے کو درست قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے جب بچہ مستغنی ہوجائے اور بڑا ہوجائے تو اس کے لیے دودھ پینا درست نہیں رہ جاتا ہے، لہذا انسانی دودھ کی خرید وفروخت کا ناجائز ہونا ہی راجح معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ خون کا

فروخت کرنا ناجائز ہے، البتہ ضرورت مند شخص کے لیے ضرورت کے مواقع پر اس دودھ کے خریدنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جہاں تک انسانی دودھ کی خرید وفروخت کے لیے بنک قائم کرنے کا سوال ہے تو اس کی ضرورت قابل تسلیم نہیں، اس لیے کہ یہ ضرورت بہتر طور پر مصنوعی دودھ اور گائے وبکری کے دودھ سے پوری ہورہی ہے۔ لکٹوجین، نسٹوجین، امول وغیرہ ناموں سے میڈیکل ٹیم کی نگرانی میں بچوں کے ہاضمہ کے مطابق دودھ تیار کیا جاتا ہے جس سے اس انسانی ضرورت کی تکمیل بخوبی ہورہی ہے، اس لیے خواتین کے دودھ کو بازار کا مال بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ جو چیز بکتی اور خریدی جاتی ہے اس کی اہانت اور بے حرمتی یقینی ہے۔

اس کے علاوہ دودھ بنک قائم کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں: اختلاط نسب اور شکوک وشبہات کا خطرہ ہے ان علماء کے قول کے مطابق جو اس طرح کے دودھ پینے سے بھی حرمت رضاعت کے قائل ہیں۔ اسی طرح غریب ماؤں کو اپنا دودھ اپنے بچے کو نہ پلا کر فروخت کر کے پیسہ کمانے پر آمادہ کرنا ہے۔

۹- کیا مادہ منویہ کا بنک قائم کرنا درست ہے؟

تولید کی صلاحیت اللہ تعالی کی طرف سے ودیعت ہوئی۔ ہر شخص صاحب اولاد ہو یہ خالق کا منشا نہیں ہے بلکہ وہ جس کو چاہتا ہے بیٹا بیٹی دونوں عطا کرتا ہے، کسی کو صرف بیٹی عطا کی جاتی ہے اور کسی کو اللہ بانجھ بنا دیتے ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**لله ملک السموت والارض يخلق مايشاء يهب لمن يشاء اناثا ويهب لمن يشاء الذكور. أو يزوجهم ذكرانا واناثا ويجعل من يشاء عقيماانه عليم قدير**" (الشوری ۴۹) (اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے، یا ان کو جمع کردیتا ہے بیٹے اور بیٹیاں بھی اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ بیشک وہ بڑا علم والا اور بڑی قدرت والا ہے)۔

بعض وقتی امراض مانع حمل کے ازالہ کے لیے جدید میڈیکل سائنس سے مخصوص شرطوں کے ساتھ استفادہ کی تو گنجائش ہے؛ لیکن اس میں بہرحال انسانی حیا اور شرم کو باقی رکھنا بھی ضروری ہے، لیکن مختلف مردوں سے مادہ منویہ کو حاصل کر کے اس کے لیے بنک قائم کرنا سخت بے حیائی کی بات ہے، جو "**اذا لم تستحيی فافعل ما شئت**" کے مطابق ہے، لہذا شرعی نقطہ نظر سے قطعا اسے درست نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ماضی قریب کے مشائخ میں سے علامہ شیخ صالح بن عثیمین نے بھی اس کی حرمت کا فتوی دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں: "**وعلى هذا يجب ابطال مشروع بنک الحيوانات المنوية وقتله فی مهده لما يخشى به من فوضى اجتماعية لا يعلم مدى مفا سدها الا الله تعالى**" (مجموع فتاوی ورسائل الشیخ صالح بن عثیمین ۱۷/۴۷)۔

بلڈ بینک کا قیام ضرورت اور اندیشے

مفتی امتیاز ولنوی☆

امور مسئولہ سے قبل بطور تمہید کے چند اصولی باتیں مدلل طور پر سپرد قرطاس کی جارہی ہیں:

۱- روئے زمین پر حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے نمایاں مقام اور خصوصی شرف سے نوازا ہے، ظاہری ومعنوی ہر طرح کے کمالات واعزازات سے نواز کر اسے ممتاز درجہ عنایت کیا ہے، چنانچہ آیاتِ کریمہ ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ'' (بنی اسرائیل: ۷۰)، ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ'' (التین: ۴)، اور ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ'' (العلق: ۵)، اُسی خصوصی عزوشرف پر صراحۃً دلالت کررہی ہیں، پھر اُسی خصوصی عزوشرف کی بنیاد پر شریعت مطہّرہ نے جہاں انسان کو حدودِ شرع کے دائرہ میں رہ کر کائنات ومخلوقات سے متمتع ہونے کا حق دیا، وہیں انسان کو خوراک اور علاج وتداوی کے لئے بہت سی ناجائز اشیاء کے استعمال کی اضطراری حالات میں گنجائش دے کر یسر وسہولت کا معاملہ فرمایا ہے، یہاں تک کہ تحفظ نفس انسانی کی خاطر اعضاءِ حیوان اور اس کی ہڈیاں تک مباح کردی گئیں ہیں، مگر انسان (زندہ ہو یا مردہ) کے کسی جز یا عضو کے ساتھ تکریم انسان کی بنیاد پر یہ معاملہ روا نہیں رکھا گیا، یہی وجہ ہے کہ دیگر اشیاء کی طرح اجزاء انسانی کے لین دین، بیع وشراء یا رضا کارانہ طور پر کسی جز کو بہ طور عطیہ دینے کی ممانعت کردی گئی۔

۲- بعض مخصوص حالات میں مخصوص شرائط کے ساتھ بعض اجزاء انسانی جیسے خون، دودھ اور مردہ انسان کے گوشت کے استعمال کی گنجائش ضرور دی گئی ہے، مگر خون اور دودھ پر دیگر اعضاء انسانی کا قیاس درست نہیں، کیونکہ ان کے مابین کافی فرق پایا جاتا ہے، دودھ کی تخلیق ہی افراز وارضاع کے لئے ہے، جبکہ خون کا معاملہ بوجوہ ذیل مختلف ہے:

۱- بسا اوقات خون کا اخراج ناگزیر ہوتا ہے۔

۲- اخراج دم میں کسی عضو کے قطع وبرید کی نوبت نہیں آتی ہے۔ اور نہ ہی اس میں لحوق شین ہوتا ہے۔

۳- خون دینا تغذیہ ہے، تداوی نہیں۔ جبکہ دیگر اعضاء انسانی پر زندہ انسان کے گوشت کو چھوڑ کر تداوی بالمحرم کا حکم

☆ مہتمم دار العلوم سعادت دارین سنتپون بھروچ گجرات۔

جاری ہوتا ہے (مستفاد: توقیع الاعیان علی ترقیع الانسان)۔

۳- زیر بحث مسائل کا تعلق ضرورت وحاجت جیسے امور سے وابستہ ہے، بنابریں ضرورت اوراس کے شرائط کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، تا کہ مسائل کی تنقیح میں آسانی ہوسکے، چنانچہ اس کے پانچ درجات مع احکام ذیل میں درج کئے جارہے ہیں:

ضرورت: اگر کوئی شخص ممنوع چیز کا استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب بہ ہلاکت ہوجائے (یہی صورت اضطرار کی ہے) اس کا حکم یہ ہے کہ ممنوع چیز کا استعمال (بچند شرائط) جائز ہوجاتا ہے۔

شرائط ضرورت: ضرورت چونکہ اضطرار کے ہم معنی ہے بنابریں ضرورت کے بعض اہم شرائط ذکر کئے جاتے ہیں:

۱- ضرورت واقعی ہو، امکانی درجہ کی نہ ہو، یعنی فی الواقع نفس واطراف کے تلف یا ہلاک ہونے کا خطرہ ہو اور اس کا علم تجربات کی بنیاد پر غلبۂ ظن سے ہوگا۔

۲- مضطر کے سامنے دفع ضرر کے لئے سوائے ارتکاب محرّم کے کوئی چارہ نہ ہو (یعنی کوئی مباح متبادل موجود نہ ہو)۔

۳- ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے میں مضطر مبادیات شریعت کی خلاف ورزی نہ کرے، کیونکہ انتقال بھی شارع کی اجازت سے ہی درست ہوگا، لہٰذا اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے دوسرے کا قتل کرنا یا زنا کا ارتکاب کرنا حلال نہ ہوگا۔

۴- جمہور فقہاء کے نزدیک مضطر ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کرے کیونکہ حرام کی اباحت بقدر ضرورت ہی ہوتی ہے، (قاعدہ مشہور ہے)۔

۵- مضطر ماہر عادل متدین طبیب کی تجویز پر ہی اعتماد کرے تا کہ اضطراری حالت کے واقعی تحقق پر شرح صدر ہو۔

۶- مشقت وحرج کا اعتبار تب ہی ہوگا جہاں نص موجود نہ ہو، اگر نص موجود ہو تو وہاں اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

مدلل تمہید کے بعد جوابات ذیل میں درج کئے جارہے ہیں:

{۱} اصل حکم تو یہ ہے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجاست کا استعمال خارج بدن بھی حرام ہے، تو داخل بدن میں بدرجۂ اولیٰ حرام ہے، "**کما هو مصرح في كتب الفقه تحت الانجاس**"، حدیثِ جابرؓ میں ہے کہ: فتح مکہ کے موقع پر آپ علیہ السلام سے مُردار کی چربیوں کے متعلق سوال کیا گیا: تو آپ ﷺ نے فرمایا: "**لا هو حرام**" یعنی استعمال کرنا حرام ہے (بخاری ۲/ ۲۹۸)، علاوہ ازیں انسانی خون انسان کا جزو ہے، اور یہ بات بدیہی ہے کہ انسانی اجزاء کا استعمال بوجہِ کرامت

حرام ہے،اس کی نظیر ماقبل میں ذکر کردہ جزئیہ (**مضطر لم یجد میتة الخ**) ہے کہ ایک انسان کی جان بچانے کی خاطر بدن کے ٹکڑے کا استعمال کرنا جائز ہے، یہ حکم اصل مسئلہ کا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ کیا اضطراری حالات میں بطور معالجہ کے حرام اشیاء کے استعمال کی گنجائش ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ماہر مسلمان ڈاکٹر کے بقول خون دیئے بغیر چارہ نہ ہو تو انسانی جان بچانے کی خاطر خون دینا جائز ہے،''**کما دلت علیه بعض العبارات السالفة**''، بلکہ ضرورت کے موقع پر خون سے فائدہ اٹھانے پر امت اسلامیہ کا اجماع ہے، چنانچہ عصمت اللہ عنایت اللہ محمد اپنے تحقیقی رسالہ''**الانتفاع بأجزاء الادمی**''میں رقم طراز ہیں کہ:''**وعلی حل الانتفاع بالدم عندا لضرورة انعقد اجماع الامة الاسلامیة**''(ص:۱۸۰)۔

ہمارے خیال میں مسلمان ماہر ڈاکٹر نہ ہو تو غیر مسلم، غیر متعصب، منصف ماہر ڈاکٹر کی رائے بھی بربنائے ضرورت معتبر ہونی چاہئے۔

اس میں مسلم وغیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہ ہونا چاہئے (کیونکہ یہ رواداری اور برادرانِ وطن کے قریب لانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے) یہی قیاس کا تقاضہ بھی ہے، وجہ قیاس یہ ہے کہ مسلم شخص کا نکاح کتابیہ سے جائز ہے، اور ظاہر سی بات ہے کہ کتابیہ سے اولاد وجود میں آئے گی اور تولد میں اس کے خون کا عمل دخل ہوتا ہی ہے،''**کمادلت علیه هذه الآیة ،ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً**''(المؤمنون:۱۴)(پھر ہم نے نطفہ کو جمے ہوئے خون کی شکل دی) تو جب خون سے اصل جسم کا وجود پذیر ہونا جائز ہے، تو نقل دم کا جواز بطریق اولیٰ ہونا چاہئے، کیونکہ یہ انسان کی محض حاجت برآری اور معاونت کی قبیل سے ہے کما فی '' **الانتفاع بأجزاء الآدمی**'' :**ولا فرق بین دم المسلم ودم الکافر فی أصل مشروعیة الانتفاع وإباحة النقل عندالحاجة لأنه إذا أبیح زواج المسلم بالکتابیة وتکون الاولاد من هذا الزواج بدما ئها فاباحة نقل الدم من باب الاولیٰ حیث انه مجرد اسعاف لا یتکون منه اصل الجسد**''(ص:۱۸۸)، البتہ ایک مسلمان کے لئے بہتر تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے غیر مسلم یا موروثی مرض میں مبتلا شخص کے خون کے استعمال سے گریز کرے تاکہ اثراتِ بد نمودار نہ ہوں، بلکہ امت محمدیہ سلف صالحین فاسقہ عورت کا دودھ بھی اپنی اولاد کو نہیں پلاتے تھے، تاکہ بداخلاقی کے اثرات رونما نہ ہوں۔''**کما فی الانتفاع:الا انه یحسن الاجتناب قدر الاستطاعة من نقل دماء الکافر إلی أجسام المرضی المسلمین لخطر انتقال الآثار والأمراض الخبیثة المتواجدة فی دمائهم الی المنقول الیهم وخاصة بعد ما ظهر المرض المخیف ''نقص المناعة الطبیعة''فی الاجساد** ''(ص:۱۸۸)۔

فتوى مجلس البحث العلمي والافتاء للقضايا المعاصرة باكستان

وفيه ايضاً:السوال الثالث : ماحكم نقل الدم من الكافر الى مسلم ؟

الجواب :لافرق بين الدمين فی اصل المشروعية ،ولكن ينبغي الاجتناب ۔ قدر الاستطاعة ۔ من دم الكافر والفاسق والفاجر ،لخطر انتقال الآثار الخبيثة المتواجدة فی دمائهم إلى المنقول إليه ولخوف تأثيره على الأخلاق ،ولم يكن سلف الامة الصالحون يسترضعون الاولاد المرأة الفاسقة(ص:۳۱۸)۔

{۲} ایسے بلڈ بینکوں میں مسلمان کا رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ کرنا قبل از وقت بلاضرورت ہونے کی بناء پر ناجائز ہے،البتہ ذکر کردہ خدشہ کا متبادل طریق یہ ہے کہ عطیہ دہندگان کے خون کے گروپس مع اسامی کی فہرست تیار کر دی جائے تا کہ بروقت رابطہ کر کے شخص مطلوب کو طلب کیا جا سکے (مگر طلبی کے درمیان درپیش موانع وعوارض کے ازالہ کا بھی انتظام ہونا چاہئے ،اگر شخص مطلوب موانع کا عذر کرے)یہی رائے صاحب فتاویٰ رحیمیہ کی ہے ،چنانچہ حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ:''چونکہ انسان اپنے بدن یا کسی عضو کا مالک نہیں ہے،تو اس کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ اپنا خون نکلوا کر بلڈ بینک میں جمع کرادے،لہٰذا سوال میں جو تحریر کیا گیا ہے کہ کیمپ لگوا کر نوجوان اپنا خون جمع کروائیں ،شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے،البتہ سوال میں جو پریشانی لکھی گئی ہے،اس کا ایک حل یہ ہوسکتا ہے کہ جو نوجوان اپنا خون دینا چاہتے ہیں ان کا نام اور کس گروپ کا خون ہے،وہ لکھ لیا جائے اور آئندہ جب کسی مریض کو خون کی ضرورت ہو اس وقت اِن نوجوانوں میں سے جس کا مریض سے رشتے داری یا خصوصی تعلق ہو مندرجہ بالا شرائط کو پیش نظر رکھتے ہوئے بقدر ضرورت خون دیدے'' (تفصیلی جواب کے شروع میں شرائط مرقوم ہیں یہ شرائط چونکہ ہمارے تمہیدی کلام میں موجود ہیں بنابریں مقصد کے بقدر عبارت درج کردی ہے،فتاویٰ رحیمیہ ۴۴۹/۵ مکتبہ الاحسان دیوبند)،البتہ صاحبِ نظام الفتاویٰ نے ایسے بلڈ بینک کے قیام کی گنجائش دی ہے (منتخبات نظام الفتاویٰ ۳۵۶/۱)ہمارے خیال میں صاحبِ فتاویٰ رحیمیہ کی رائے احترام انسانی کی بنیاد پر احریٰ بالقبول ہے۔

علاوہ ازیں آج کل بلڈ بینک کے قیام میں متعدد خرابیاں بھی رونما ہو رہی ہیں ،یہ مقالہ لکھا جا رہا تھا،اسی درمیان مقالہ نگار کو مسلم اخبار ''گجرات ٹوڈے'' کا اسی سلسلہ میں تراشہ موصول ہوا،جس میں بلڈ بینک کے تئیں ہونے والی خرابیوں کو تفصیلاً اجاگر کیا گیا،اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:بلڈ کی حفاظت وبیع (جبکہ بیع عند الشرع ناجائز ہے)کے متعلق حکومتی قوانین کو بالائے طاق رکھا جا رہا ہے،اور حکومتی عملہ آنکھ کان بند کئے ہوئے ہیں ،بلڈ بینک کا کالا بازار زوروں پر ہے،نام نہاد بلڈ بینک کے ایجنٹ اور گماشتے غرباء کو لالچ دے کر ان کا خون بلاضرورت سستے داموں میں خرید کر مہنگے داموں پر فروخت کر دیتے ہیں،

پھرانہی غرباءکوجب خون کی ضرورت پڑتی ہےتوجان بچانے کی خاطرایجنٹوں کے جال میں پھنس کرخون خریدنے پرمجبورہونا پڑتا ہے،فٹ پاتھ پرسونے والےنشہ کی عادت کی بناء پربھی ایجنٹ کی معرفت چوردروازہ سےخون سستے داموں پربیچ کراپنی ہوس نکالتے ہیں،نیزبلڈبینک میں گروپ کےخون کا خیال نہیں رکھا جاتا؛بلکہ گروپوں کےخون کوخلط ملط کرکےفروخت کیا جاتا ہے،اوراسی مخلوط خون کے استعمال کی وجہ سےکئی اموات بھی واقع ہوئی ہیں،علاوہ ازیں ڈاکٹروں اوربلڈبینک کے ذمہ داروں کے مابین خون کی بیع وفراہمی کےمتعلق سانٹھ گانٹھ کی بنیادپربھی مریضوں کومہنگے داموں پرخون خریدنے پرمجبور ہونا پڑتا ہے(گجرات ٹوڈے تاریخ:۹محرم الحرام ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۳راکتوبر ۲۰۱۴ء بروز پیر)،مذکورہ بالا اخبارکی تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اب بلڈکا بھی بلاضرورت کاروباراوراس کےتئیں کرپشن کے واقعات منظرعام پرآنے لگے ہیں،اوراس میں روزبروز اضافہ ہی ہوتاجارہاہے،بنابریں سداً للباب بلڈبینک کاقیام مذکورۃ الصدرخرابیوں کی بناءپربھی ناجائزہوناچاہئے۔

علاوہ ازیں انسانی خون کا متبادل مصنوعی خون بھی موجودہے،سوال میں ذکرکردہ خدشہ کاحل مصنوعی خون سے بآسانی کیاجاسکتاہے یہ بھی بلڈبینک کےعدم جوازکی ایک اہم وجہ ہے،جہاں تک مصنوعی خون کی افادیت کاتعلق ہے،تواس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ مصنوعی خون سوفیصد(۱۰۰٪)نظیف ہوتاہے،مصنوعی دم کی نقل وحفاظت بھی نسبۃً آسان ہوتی ہے، اوراس سے علاج بھی مؤثراورکارگرہوتاہے،جس کا کامیاب تجربہ جاپان کے بعدچین وویتنام کے بیچ واقع ہوئی جنگِ حدود کےنتیجہ میں سینکڑوں بیماروں اورزخمیوں پرکیاجاچکاہے،"**کما فی الانتفاع :وقد نجح هذا الدم الصناعی فی انقاذ مئات المرضی فی المستشفیات وجرحی حرب الحدود التی نشبت بین الصین وفیتنام ،وتعتبر الصین الدولة الثانیة بعد الیابان التی تقوم بتطویربدائل الدم**"(ص:۱۷۲)۔

تنبیہ:صاحب"الانتفاع"نےجس مصنوعی خون کے بارے میں بعض معلومات درج کی ہیں،اس کےتئیں سردست متعددسوالات ذہن پردستک دیتے نظرآتے ہیں،وہ یہ کہ کیا مصنوعی خون کا وجودواستعمال دورِحاضرمیں ہے یا نہیں؟اگرہےتواس کا شیوع ہرجگہ اورہرملک میں ہے یانہیں؟نیزمصنوعی خون کی حفاظت وضمانت کے بارے میں موجودہ دورکے سائنسدانوں کا کیاتأثرہے؟اورکیااس کا استعمال مرض کی جملہ انواع میں ہوگا یابعض انواع میں؟یہ وہ اہم نکات وامورہیں،جن پرارباب فقہ وسیمینارکوماہرین سے رابطہ کرکےتوجہ دینے کی خاص ضرورت ہے تاکہ یہ امورمسائلِ شرعیہ کےحل میں مدومعاون ہوں،راقم سطورکونیٹ اوربعض ماہرین سے جومعلومات حاصل ہوئیں وہ بڑی ہی حوصلہ افزاءہیں، جنہیں ذیل میں باحوالہ درج کیاجارہاہے۔**واللہ الموفق**۔

مارک ٹرنر(پروفیسرآف یونیوسٹی ایڈنبرگ)کی گفتگوٹیلی گراف کےساتھ

Marc Tuner(Professor of Edinburgh University) Interview with The Telegraph

سائنسدانوں نے انسانی خون کے متبادل کے طور پر مصنوعی خون بنانے کے اجزاءِ ترکیبی اور اس کا اندازِ تخلیق دریافت کرلیا ہے، اس نئی دریافت کا سہرا ''یونیورسٹی آف ایڈن برگ'' کے پروفیسر جناب مارک ٹرنر اور ان کے قائم کردہ ویلکم نامی ٹرسٹ کے سر جاتا ہے، اس نئے طریقہ پر سائنسداں پُر امید ہیں کہ وہ مستقبل قریب میں نہایت ہی وافر مقدار میں ''O NEGATIVE BLOOD'' مہیا کرنے پر بآسانی قادر ہو سکیں گے۔

خون کی نوعیت کے بارے میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ: وہ صحت مند اور ہر قسم کی آلائشوں اور آلودگیوں سے محفوظ ہوگا، اور مریضوں کے لئے کار آمد اور مفید ہوگا، اسے تحقیقی مراحل سے گزار کر کامیاب تجربے بھی کئے گئے ہیں، تاہم تحقیقاتی ٹیم کے بقول اس کا باقاعدہ زندہ انسانوں پر تجربہ ۱۶۔ ۲۰۱۷ء میں کیا جائے گا، اور اس خون کا استعمال اُن مریضوں پر کیا جائے گا، جن کو تھیلے سیمیا کا مرض ہو یا جن کا خون فاسد ہو۔

عامۃً نقلِ خون کی ضرورت جسم انسانی سے کثیر مقدار میں خون بہہ جانے یا کسی حادثۂ فاجعہ میں مجروح ہونے یا پھر کسی سرجری (جراحت) کے وقت پڑتی ہے، "National Institute Of Health" یعنی عالمی ادارۂ صحت کی رپورٹ کے مطابق تقریباً سالانہ پانچ لاکھ امریکی باشندوں کو نقل خون کی ضرورت پڑتی ہے۔

نقل خون کے طریقۂ کار کو اجاگر کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ Stem cells کے استعمال کے خاطر ریگولر Stem cells انسانی جسم سے دور کر کے اس کو Stem cells میں منتقل کرنے پڑتے ہیں، مارک ٹرنر اور ان کی تحقیقاتی آزمودہ ٹیم (عملہ) O NEGATIVE BLOOD تیار کرنے کی صلاحیت اور قابلیت رکھتی ہے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے ایسا مصنوعی خون تیار کیا ہو جو اپنی کوالٹی اور اعلیٰ درجہ کی حفاظت کی ضمانت لیتا ہو، انسانی جسم میں نقلِ خون کے متعلق مصنوعی خون کا یہ تحقیقی کام سب سے پہلے صدر مذکور (مارک ٹرنر) کی زیر سرپرستی ریسرچ کنندہ ٹیم نے انجام دیا۔

نوٹ: مقالہ نگار کی پیش کردہ مندرجۂ بالا معلوماتِ مہمہ ''دی ٹیلی گراف'' کو دیئے گئے مارک ٹرنر کے تفصیلی انٹرویو سے مأخوذ ہیں، ملاحظہ کے لئے ایک فوٹو کاپی مقالہ سے منسلک کردی گئی ہے۔ فلیراجع۔

ملاحظات:

نمبر(۱) اگر ۱۶۔ ۲۰۱۷ء کے تجربات زندہ انسانوں پر کامیابی کے مراحل سے ہمکنار ہوجاتے ہیں، اور اہل سائنس اپنے دعویٰ کے بقول مصنوعی خون عام کرنے پر قادر ہوجاتے ہیں، تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ بلڈ بینک کا قیام

ناجائز ہوگا؛ بلکہ بوقتِ ضرورت شدیدہ انسانی خون کا عطیہ کرنا بھی دائرۂ جواز سے خارج ہوجائے گا، کیونکہ اس وقت متبادل مصنوعی خون ہر جگہ میسر ہوگا، اور انسانی خون کا جواز بربنائے ضرورت تھا، اور شرائط ضرورت میں ایک اہم شرط متبادل کا نہ ہونا ہے، جیسا کہ تمہید نمبر ۴ کے تحت گذرا۔ ''ھذا امر لا یخفی علی اھل النظر''۔

نمبر(۲) اگر بالفرض بلڈ بینک کے تئیں امکانی ضرورت کے پیش نظر قولِ جواز اختیار کربھی لیا جائے تب بھی سداً للباب مستقبل قریب میں مصنوعی متبادل خون کے امکانی بلکہ بقولِ ماہرین واقعی وجود کے پیش نظر اس کا قیام ناجائز ہونا چاہئے ورنہ اس وقت مسلم بلڈ بینکوں کا بند کرنا/ کروانا متعذر ہوجائے گا۔ کما لایخفی علی اھل الخبرۃ۔

نمبر(۳) ہنگامی حادثات کی صورت میں ہنگامی مسلم بلڈ بینک کا قیام جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں واقعی ضرورت کا تحقق ہوجاتا ہے۔

{۳} قبل از ضرورت ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، نمبر(۲) کی ترکیب اختیار کی جائے باقی تفصیل نمبر(۲) کے تحت آچکی ہے، برادرانِ وطن پر اچھا اثر مرتب کرنے کے لئے مداھنت سے کام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اچھا اثر مرتب کرنے کے متبادل طریقے موجود ہیں، انہیں کو اختیار کرنے اور ترغیب دینے کی ضرورت ہے، مثلاً: مسلمانوں کے ہسپتالوں میں غیر مسلموں کا مفت یا کفایتی خرچ پر علاج کرنا یا نمبر(۲) کے مطابق مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تئیں ہمدردی پیدا کرکے خون دینے پر آمادہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ارباب سیمینار کسی موقع پر برادرانِ وطن کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک کی حدود وقیود پر سوالنامہ مرتب فرماکر مقالہ نگاروں کو غور وخوض کی دعوت دیں تو یہ بہتر اور وقت کی پکار پر عمل ہوگا۔

{۴} ہمارا خیال ہے کہ خون دینا مستحب ہونا چاہئے۔صاحبِ '' الانتفاع ''جناب عصمت اللہ عنایت اللہ محمد صاحب نے جواب شیخ محمد الحامد رحمۃ اللہ سے استفادہ کرتے ہوئے وجوب واجبار کا حکم لکھا ہے: ''کما فی الانتفاع: وینبغی أن یستثنی من ھذا الشرط ما إذا تعین دم شخص لمریض أو جریح بحیث لم یوجد احد غیرہ او وجد ولکن دمہ لا یوافق دم المریض ،فیکون بذل الدم فی ھذہ الحالۃ واجبا،فاذا ضن بدمہ اجبر شرعا علی بذلہ ولا ینتظر لاذنہ'' (ص:۱۸۸)،مگر وجوب واجبار کا یہ حکم محل نظر ہے، جب انسان اپنے اعضاء وغیرہ کا مالک ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ تکریم انسانی کی بناء پر اجزاء انسانی کے لین دین کی بہ طور عطیہ ممانعت کردی گئی ہے کما مر فی التمھید تو پھر یہ وجوب کا حکم کیسے ہوسکتا ہے، مگر یہ کہ اس پر کوئی دلیل شرعی قائم ہو، البتہ چونکہ دوسری طرف انسان کی مجبوری بھی ہے تو کم از کم انسانیت کے ناطے اس کو ''تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ''اور'' وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ''جیسی نصوص کے تحت

داخل کر کے استحباب کا درجہ دینا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

{۵/۶} تمہید میں یہ بات آچکی ہے کہ انسان اپنے بدن یا عضو کا مالک ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ خودکشی تک کو حرام قرار دیا ہے، بنابریں انسان کا اپنے کسی عضو یا جزو کو بطور عطیہ دوسرے شخص یا ادارہ (آئی بینک وغیرہ) کو دینا جائز نہیں ہے، خواہ وہ آنکھ کا قرنیہ ہو یا جگر انسانی ۔ نیز یہ تکریم انسانی کے منافی ہے، کتبِ فقہ وفتاویٰ میں اس کی واضح نظیر فتاویٰ عالمگیری کے حوالہ سے مرقوم فی التمہید "**مضطر لم یجد میتةً الخ**" والا جزئیہ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ: شخص مضطر تحفظِ نفس کی خاطر نہ تو دوسرے شخص کا ہاتھ یا گوشت کھا سکتا ہے اور نہ ہی اپنا گوشت تناول کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اسکا مالک نہیں، جب شخصِ مضطر اپنے بدن کا گوشت اپنی جان کے تحفظ کے لئے نہیں کھا سکتا ہے تو پھر شخص آخر کو جگر یا آنکھ کا قرنیہ دینا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے! خواہ انسان زندہ ہو یا مردہ۔ نیز تمہید میں "**الانتفاع بأجزاء الآدمی لم یجز الخ**" والا جزئیہ بھی تکریم انسانی کی بناء پر اجزاءِ انسانی سے انتفاع کے عدمِ جواز پر صراحةً دلالت کر رہا ہے۔

اگر مردہ انسان کے جگر وغیرہ کے تئیں جواز کا قول اختیار بھی کر لیا جائے تو مستقبل میں لوگ دفن کرنا ہی چھوڑ دیں گے، اور اجزاء انسانی کی خرید وفروخت کا کالا بازار گرم ہو جائے گا اور رَواں دور میں یہ کوئی مستبعد بھی نہیں ہے؛ بلکہ اب تو اس کا وقوع ہو رہا ہے، جیسا کہ جواب نمبر (۲) کے تحت اخبار کا تراشہ قلمبند کر کے بلڈ بینک کی قباحت کو اجاگر کیا گیا تھا، لہٰذا سداً للباب بھی حکمِ امتناعی ہونا چاہئے۔

صاحبِ احسن الفتاویٰ نے اپنے تحقیقی رسالہ" **توقیع الاعیان علی حرمة ترقیع الانسان**" میں مستحکم دلائل سے عدمِ جواز کے قول کو اختیار کر کے جواز کے فتویٰ پر سخت تنقید کی ہے، قائلِ جواز نے گیارہ دلائل پیش کئے تھے، حضرت رحمہ اللہ نے ان پر علمی نقد کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ کوئی بھی دلیل مثبتِ مدعا نہیں ہے؛ بلکہ "**الحاق**" کے تحت لکھا ہے کہ: بندہ کی تحریر کے بائیس برس بعد اس موضوع پر مختلف ممالک کے اہل قلم کے دس ضخیم مطبوعہ مقالے میرے سامنے آئے ، جس میں آٹھ میں ترقیع انسان کی حلت ثابت کرنے پر زورِ قلم صرف کیا گیا ہے؛ مگر ان میں محرّرہ دلائل میں سے کوئی ایک دلیل بھی مثبتِ مدعیٰ نہیں، بلکہ سب دلائل ایسے ساقط ہیں کہ لائقِ اعتناء ہی نہیں الخ (ملاحظہ ہو: رسالہ مذکور احسن الفتاویٰ: ۸/۲۷۰ تا ۲۸۶)۔

مقالہ نگار کے سامنے بھی ایک ضخیم رسالہ" **الانتفاع باجزاء الآدمی**" موجود ہے، (ممکن ہے کہ یہ رسالہ بھی صاحبِ احسن الفتاویٰ کے سامنے رہا ہو) جو اپنی جگہ نہایت ہی قیمتی اور اہم مباحث پر محیط رسالہ ہے، مگر زیر بحث مسئلہ میں علماء ہند و پاک وغیرہ کے عدمِ جواز کے قول کو ذکر کر کے بالآخر جواز کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے، کئی دلائل پر غائرانہ یا طائرانہ

نظر ڈالنے سے صاحب احسن الفتاویٰ کا تبصرہ نہایت ہی موزوں معلوم ہوا، اور عدم جواز کے موقف پر ہی شرح صدر ہوا۔

ایک نمونہ ملاحظہ ہو: صاحب ''الانتفاع'' مصالح کثیرہ کی بناء پر قولِ جواز کو ترجیح دیتے ہوئے اخیر میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''**وهل ذلک الا صورة من صور تطبيق الآية الكريمة "يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ" قال ابن مسعود : هی النطفة تخرج من الرجل وهی ميتة وهو حی ،ويخرج الرجل منها حيا وهی ميتة" وغيرها من أعضاء الانسان وأجزائه كالنطفة بجامع ان كلا منها بعض الانسان وان نقل العضو من الميت الى حی من شانه أن يحييه ،فكان نقل الاعضاء مثل النطفة مبعث الحياة ۔ فردا من أفراد عموم الآية** ''(ص:۱۵۶)۔

مسئلۂ زیر بحث پر آیت کریمہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو لے کر انطباق کی دوراز کار جبری کوشش پر حیرت ہوتی ہے، خصوصاً جب کسی محقق کے قلم سے نصوص کے تئیں اس نوع کی زلات سامنے آتی ہیں'' کہاں قدرت کاملہ کا ذکر'' اور'' کہاں اعضاء کی پیوندکاری کا مسئلہ'' دین متین کا خدا ہی حافظ ہو۔

{۷} جب جائز ہی نہیں تو اس سوال کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، اور یہ بات بدیہی ہے کہ ناجائز امر کی وصیت غیر معتبر ہے، **كما هو ظاهر فی الكتب الفقهية والفتاوىٰ** ۔

{۸} اولاً تو ایسے بینک کے قیام کی ہمت افزائی نہ کی جائے، اہل نظر پر یہ بات مخفی نہیں کہ ایسے بینک وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کے مصداق ہوا کرتے ہیں، ثانیاً عورت کا دودھ مال متقوم نہیں، یہی وجہ ہے کہ تھوک پسینہ کی طرح اس کے تلف کرنے والا پر کوئی ضمان لازم نہیں ہوتا ہے، لبن آدمیہ کے مال نہ ہونے کی دلیل اجماع صحابہ ہے، اور عقلاً بھی مال ہونے کی نفی ہوتی ہے۔

''**كما فی البدائع :ولا ينعقد بيع لبن المراة فی قدح عندنا ،وقال الشافعی رحمه الله: يجوز بيعه**''(بدائع الصنائع:۷ ۳۳۳تا ۳۳۸)۔

شمس الائمہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح آدمی مال نہیں، ویسے ہی اس سے پیدا شدہ چیز یعنی دودھ بھی مال نہیں، بلکہ دودھ ولد کے درجہ میں ہے، نیز فرماتے ہیں کہ: مال اس چیز کا نام ہے، جس کو ہمارے مصالح کے لئے پیدا کیا گیا ہو اور اس کا تعلق انسانی ذات سے نہ ہو، جبکہ آدمی کو مالکیت کا شرف عطا کر کے پیدا کیا گیا ہے، پھر اسی کو مال قرار دیا جائے تو اس صورت میں مالکیت ومملوکیت کا اجتماع لازم آتا ہے، اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے اپنے اس فرمان میں: ''وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَافِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' اور جو حکم آدمی کا ہے وہی اس کے اجزاء کا بھی ہے۔

’’کمافی المبسوط :ولا یجوز بیع لبن بنی آدم علی وجه من الوجوه عندنا ولا یضمن متلفه أیضا، وقال الشافعی رحمه الله: یجوز بیعه ویضمن متلفه لأن هذا لبن طاهر أو مشروب طاهر کلبن الانعام، ولأنه غذاء للعالم فیجوز بیعه کسائر الأغذیة وبهذا یتبین أنه مال متقوم فإن المالیة والتقوم بکون العین منتفعاً به شرعاً وعرفاً، والدلیل علیه أنه عین یجوز استحقاقه بعقد الاجارة فیجوز بیعه ویکون مالا متقوما کالصبغ فی عمل الصباغة والحبر فی الوراقة والحرض والصابون فی غسیل الثیاب بل اولیٰ لأن العین للبیع أقبل منه للاجارة (وحجتنا)فی ذلک ان لبن الآدمیة لیس بمال متقوم فلا یجوز بیعه ولا یضمن متلفه کالبزاق والمخاط والعرق وبیان الوصف ان المال اسم لما هو مخلوق لإقامة مصالحنابه مما هو غیرنا فأما الآدمی خلق مالکا للما ل وبین کونه مالا وبین کونه مالکا للمال منافاة والیه اشار الله تعالیٰ فی قوله: وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثم لاجزاء الآدمی من الحکم مالعینه.....فاذا لم یکن الآدمی مالا فی الاصل وکذلک ما یتولد منه من اللبن بمنزلة الولد‘‘(المبسوط لشمس الدین السرخسی ۱۵؍۱۲۵)۔

علاوہ ازیں تکریم انسانی کا پہلو بھی مدنظر ہونا چاہئے ،بنا بریں کسی خاتون کا دودھ بالعوض یا بلاعوض مہیا کرنا ناجائز ہے،اسی طرح بینک کا اس ناجائز طریقہ سے وصول کرکے بچوں کے لئے فروخت کرنا بھی جائز نہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کی حسبِ ذیل مدلل تحریر نہایت ہی معتدل،معقول اور مزاج شریعت سے ہم آہنگ ہے، چنانچہ حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ:’’یہ بات تو بالاتفاق درست ہے کہ جس خاتون کو دودھ آتا ہو اس کو اجرت دے کر بچہ کو دودھ پلوایا جائے یہ جائز ہے،لیکن کیا عورت کا دودھ فروخت کرنا بھی جائز ہے؟اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک انسانی دودھ کی فروخت جائز نہیں،شوافع اور حنابلہ کے نزدیک جائز ہے،حنفیہ اور مالکیہ کی رائے شریعت کے مزاج ومذاق سے قریب تر ہے،اور اس میں احترام انسانی کا پاس ولحاظ ہے،پس دودھ بینک کا قیام اور اس کے واسطہ سے انسانی دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں،اسی طرح انسان کا اپنے خون یا اپنے عضو کو بیچنا درست نہیں گو ضرورت مند مریض کے لئے مجبوری کی وجہ سے اس کا خرید کرنا درست ہوگا‘‘ (قاموس الفقہ ۴؍۵۸۰،بعنوان انسانی دودھ کی خرید وفروخت)۔

تاہم اگر کسی جگہ اس نوع کے بینک کا قیام ہو(بلکہ ہماری دانست میں اس نوع کی مخصوص صورت’’ کاشیبا چلڈرن ہسپتال‘‘ KASHIBA CHILDREN HOSPITAL بڑودہ میں موجود ہے) تو حرمت رضاعت کے احکام

جاری ہوں گے، بشرطیکہ بینک کے ذمہ داران عطیہ دہندگان کے نام خاندان وغیرہ کو بہ اہتمام رجسٹر میں درج کرتے ہوں اور انہیں محفوظ رکھتے ہوں، مگر آج کل یہ امر نہایت ہی دشوار بلکہ ناممکن سا نظر آتا ہے، تو اس صورت میں مقالہ نگار کی رائے یہ ہے کہ حرمتِ رضاعت کے احکام جاری نہ ہونے چاہئے۔

''**كما فى الاختيار لتعليل المختار: امرأة أدخلت حلمة ثديها فى فم رضيع ،ولا يدرى أدخل اللبن فى حلقه أم لا لا يحرم النكاح، وكذا صبية ارضعها بعض اهل القرية ولا يدرى من هو فتزوجها رجل من اهل تلك القرية يجوز ،لان اباحة النكاح اصل فلا يزول بالشك ؛ويجب على النساء ان لا يرضعن كل صبى من غير ضرورة ،فان فعلن فليحفظنه او يكتبنه احتياطاً**'' (الاختيار لتعليل المختار: ۳/ ۱۳۵، البحر الرائق: ۳/ ۳۸۷ دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

{۹} انسانی اہانت اور شرافتِ انسانی کی پامالی کی بناء پر کسی بھی صورت میں امورِ مسئولہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، آدمی کو متبادل راستے اختیار کرنے چاہئے اور انہی کی ترغیب دینی چاہئے ، ورنہ قضاوقدر کے فیصلے پر راضی رہے کہ یہ ایمانیات کے قبیل سے ہے، خود قرآن کہتا ہے کہ: ''**اَوۡیُزَوِّجُهُمۡ ذُكۡرَانًا وَّاِنَاثًا ج وَيَجۡعَلُ مَنۡ يَّشَاءُ عَقِيۡمًا ط اِنَّهٗ عَلِيۡمٌ قَدِيۡرٌ**'' (شوریٰ: ۵۰)۔

☆☆☆

اعضاء انسانی جگر اور آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ - احکام ومسائل

مولانا ریحان مبشر قاسمی☆

یورپ میں آپس کی جنگوں کے دوران ایک فرانسیسی نے انتقالِ خون کی پہلی کوشش کی لیکن وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی، اس وقت تک خون کے گروپ کا علم نہیں ہوا تھا اور نہ ان کے ذیلی مثبت اور منفی اجزاء کا علم تھا، جیسے جیسے طبی علوم میں ترقی ہوتی رہی خون کے گروپ اور ان کے دیگر فیکٹرز اور ان میں مطابقت کا انکشاف بھی ہوتا رہا کہ کون سے گروپ والا کس فیکٹر کے حامل کو دے سکتا ہے جس سے متعلقہ فرد کے بدن میں کوئی منفی ردعمل نہ ہو۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال خون کے سلسلے میں سکی فوسوکی انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس نے ماسکو میں ایک انوکھا تجربہ کیا، ایک ساٹھ سالہ فرد جو حادثے میں مر چکا تھا ۱۲/ گھنٹے کے اندر اس کا خون ایک ایسے نوجوان کے بدن میں منتقل کر کے اس کی جان بچائی جس نے اپنی کلائیوں کی رگوں کو کاٹ کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح پھر ۱۹۳۳ء میں میوکلینک انگلستان میں کیمیکل اسٹریٹ ڈالا ہوا خون مریضوں میں منتقل کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اسپین میں خون بینک کی موبائل وین کے ذریعے خون اسپتالوں میں پہونچایا جانے لگا۔ ۱۹۳۹ء میں انگلستان کی ایک ڈاکٹر فلپ نے خون میں اینٹی باڈی کا موروثی طور پر منتقل ہونا دریافت کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر ایڈنون کوبن نے خون کے مختلف حصوں مثلاً پلازما اور سرخ خلیوں کو علیحدہ کرنے، اسٹور کرنے کے طریقے معلوم کیے، پھر ۱۹۴۱ء میں ریڈ کراس نے بلڈ بینک کے قیام کا آغاز کیا، اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر پالی بی سن نے انکشاف کیا کہ یرقان یا ہیپاٹائٹس کے امراض کا خون ایسے امراض سے مبرا مریضوں میں منتقل کرنے سے ان میں بھی مرض ہوجاتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر کیپری والٹر نے خون کی بوتلوں کی جگہ پلاسٹک کی تھیلیوں کا استعمال شروع کیا (ماخوذ از وکیپیڈیا، خون کا عطیہ)۔

خون کا عطیہ جائز ہے یا نہیں؟

ہر انسان کے بدن میں تین بوتل اضافی خون کا ذخیرہ ہوتا ہے، ہر تندرست مرد ہر تیسرے مہینے میں خون کی ایک بوتل عطیہ میں دے سکتا ہے، جس سے اس کی صحت پر مزید بہتر اثرات مرتب ہوسکتے ہیں، اور اس کا کولیسٹرول بھی قابو میں

☆ استاذ جامعہ اسلامیہ عربیہ گلزار حسینیہ، اجراڑہ، میرٹھ۔

رہتا ہے، تین ماہ کے اندر ہی نیا خون ذخیرے میں آجاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ نیا خون بننے کے ساتھ ساتھ بدن میں قوت مدافعت کے عمل کو بھی تحریک ملتی ہے، مشاہدہ ہے کہ جو صحت مند افراد ہر تیسرے ماہ خون کا عطیہ دیتے ہیں وہ نہ تو موٹاپے میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ انھیں کوئی جلد بیماری لاحق ہوتی ہے؛ لیکن انتقال خون سے پہلے خون کی مکمل جانچ پڑتال ضروری ہے؛ کیوں کہ بہت سی مہلک بیماریاں جیسے: ایڈز وغیرہ انتقال خون کی وجہ سے ایک دوسرے تک منتقل ہوتے ہیں۔

خون انسان کا جزء ہے اور جب اسے بدن سے نکال لیا جاتا ہے تو وہ نجس اور ناپاک ہوجاتا ہے پھر یہ کہ وہ جزء انسانی ہونے کے باعث قابل تکریم بھی ہے؛ اس لیے عمومی حالات میں جب کہ خون کی کسی کو ضرورت وحاجت نہ ہو تو بلا ضرورت اپنے جسم سے خون نکلوانا، اور کسی کو شرعی حاجت وضرورت کے بغیر کسی کو عطیہ کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

"قال الإمام الشافعي في الأم : وإن أدخل دما تحت جلده ،فنبت عليه ،فعليه أن يخرج هذا الدم ويعيد كل صلاة صلاها بعد إدخاله الدم تحت جلده" (کتاب الأم: ۱/۱۷، باب ما یوصل بالرجل والمرأۃ، ط: دار الفکر بیروت)۔

خون دینے کی شرائط:

البتہ ناگزیر حالات میں خون دینے کی کچھ شرائط وقیودات کے ساتھ اجازت ہے، انھیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

پہلی قسم ان شرائط کی ہے جن کو اطباء نے وضع کیا ہے، لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ شرائط بھی فقہ کے کسی نہ کسی اصول پر مبنی ومتفرع معلوم ہوتی ہیں، دوسری وہ شرائط ہیں جنہیں شریعت کی روشنی میں متعین کیا گیا ہے۔

اطباء کی شرائط:

(۱) خون دینے والا کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو جو مرض خون کے ساتھ منتقل ہوسکتا ہو۔

(۲) خون نکالنے سے خون دینے والے کو کسی بیماری کے لاحق ہونے کا اندیشہ نہ ہو

(۳) خون دینے والا کسی دل یا سانس کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔

(۴) خون کے خلیات خون دینے سے مطلوبہ مقدار سے کم نہ ہوں۔

(۵) خون دینے والے کا وزن اس کی لمبائی کے مناسب ہو۔

(۶) خون دینے والا دو یا تین مہینہ کے اندر دوبارہ نہ دے رہا ہو۔

(۷) جو شخص خون دے رہا ہو اس کا چھ سات ماہ کے اندر کوئی بڑا آپریشن نہ ہوا ہو۔

(۸) نکلے ہوئے خون کی مقدار اس کی عمر کے مناسب ہو۔

(۹) گروپ یکساں ہو، یا مختلف گروپ ہو تو نقصان دہ نہ ہو۔

(۱۰) خون دینے والی اگر عورت ہے تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ حاملہ یا دودھ پلانے والی نہ ہو۔

فقہاء کی شرائط:

(۱) اس سلسلے کی سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ ضرورت یا حاجت کا تحقق ہو۔

(۲) علاج اور شفایابی خون دینے میں ہی منحصر ہو کوئی اور دوسرا علاج دریافت نہ ہو۔

(۳) خون لینے دینے والے کو کوئی ضرر لاحق نہ ہو، اس کی دلیل فرمان نبوی ہے: "**لا ضرر ولا ضرار**" (ابن ماجہ)۔

(۴) حکما و اطباء کو خون منتقل کرنے سے فائدہ کا یقین یا ظن غالب ہو؛ کیوں کہ محض شک یا وہم کی وجہ سے ایک امر محظور کا ارتکاب نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) خون دینے والا خون کے بدلے رقم نہ لے رہا ہو؛ کیوں کہ خون کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اور اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد موجود ہے: کہ آپ ﷺ نے خون کے ثمن سے منع فرمایا: "**نهى عن ثمن الدم**" (بخاری کتاب البیوع: باب ثمن الکلب)۔

اور فقہائے کرام کا بھی اس کے بیع کی حرمت پر اجماع ہو چکا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (۴/۴۹۹) میں اس کی بیع کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "**والمراد تحريم بيع الدم كما حرم بيع الميتة والخنزير ،وهو حرام إجماعا أعني بيع الدم وأخذ ثمنه**" (فتح الباری: ۴/۴۹۹ کتاب البیوع، باب ثمن الکلب، ط: مکتبۃ الملک فہد)۔

(۶) خون دینے والا رضامندی سے دے رہا ہو مجبور نہ کیا گیا ہو، یا کم از کم اس کے اولیاء کی رضامندی شامل ہو۔

(۷) خون بقدر ضرورت نکالا گیا ہو۔

(۸) خون نکالنے اور چڑھانے کا عمل کسی ماہر ڈاکٹر سے کیا گیا ہو۔

البتہ اس زمانے میں بعض لوگوں نے دوا کی غرض سے اس کے بیع کو جائز قرار دیا ہے؛ بل کہ بعض حضرات تو ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے اسے مستحب قرار دینے سے بھی نہیں چوکے۔ یا للأسف!

جوازعطیہ کے دلائل:

(۱)ضرورت کے موقع پرخون چڑھانا تداوی بالمحرمات کے قبیل سے ہے،اورضرورت کے موقع پر دوسرے شخص کا خون چڑھانا (محرمات سے علاج کرنا)فقہاء کے نزدیک جائز ہے،آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل عرینہ کو اونٹ کے پیشاب پینے کا حکم دینا اور عرفجہ بن اسعد رضی اللہ عنہ کا سونے کی ناک لگوانے کا مشورہ دینا اس باب کے بنیادی متدلات ہیں۔

فقہ حنفی میں بھی تداوی بالمحرمات کو (قدرے اختلاف کے ساتھ)جائز قرار دیا گیا ہے۔فتاوی ہندیہ میں ہے:"**ويجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوي ،إذا أخبره طبيب أن شفاؤه فيه ،ولم يجد في المباح ما يقوم مقامه**"(ہندیہ:کتاب الکراہیۃ ،الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات)۔

انسان کے اعضاء حالت اضطراری میں بھی مباح نہیں ہوتے جیسا کہ آگے آرہاہے،اورخون بھی اعضائے انسانی کی طرح اگرچہ جزءانسانی ہے مگراس کو دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لیے کانٹ چھانٹ کی ضرورت نہیں ہوتی؛اس لیے اس کی حیثیت انسانی دودھ کی سی ہوگی جو بدن سے کسی قطع وبرید کے بغیر نکالا جاتا ہے،اورشریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر اسے غذا بنایا ہے،بچوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی حضرات فقہاء نے انسانی دودھ کو جائز قرار دیا ہے،عالمگیری میں ہے:"**ولا باس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة وبشربه للدواء**" (ہندیہ:کتاب الکراہیۃ ،الباب الثامن عشر في التدوای والمعالجات)؛اس لیے جزءانسانی ہونے کی حیثیت سے اگرخون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید قیاس بھی نہیں؛لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح شریعت اسلام نے عورت کے دودھ کو جزءانسانی ہونے کے باوجود ضرورت کی بناء پر بچوں کے لیے جائز قرار دیا ہے اسی طرح ضرورت کی بناء پرخون دینا بھی جائز ہوگا۔

علاوہ ازیں قرآن کریم،احادیث نبویہ،قواعد کلیہ اورعقلی طور پر بھی اس طرح کا عطیہ جائز معلوم ہوتا ہے۔فرمان باری ہے:"**من أحيا ها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (سورۂ مائدہ:۳۲)۔

اس آیت کریمہ میں ایسے افراد کی مدح سرائی کی گئی ہے جونفس محترم کو بچانے میں کسی بھی طرح سے ذریعہ اور وسیلہ بنتے ہیں،اورخون کا تبرع کرنے والا بھی نفس محترم کو بچاتا ہے؛اس لیے وہ بھی اس زمرے میں آئے گا اور اس کا یہ عمل درست قرار پائے گا،نیز ان آیات سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے جن میں تبرع اوراحسان اور خیر وبھلائی کے امور میں تعاون کی اپیل کی گئی ہے،مثلا:"**وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**" (سورہ مائدہ:۲)۔

"**إنما المومنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم**"(سورہ حجرات:۱۰)۔

جن احادیث میں بیماری کا علاج کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ بھی اس سلسلے میں مستدل بن سکتی ہیں؛ کیوں کہ خون کا عطیہ بھی ایک طرح کی دوا ہی ہے۔

”عن أسامة بن شريک قال :قالت الأعراب :يا رسول الله ! ألا نتداوى ؟قال :نعم يا عباد الله ! تداووا؛فإن الله لم يضع داء إلا وضع له شفاء“ (ترمذی: أبواب الطب، باب ماجاء في الدواء والحث عليه)۔

”وقال عليه السلام :من استطاع منكم أن ينفع أخاه ،فليفعل “(مسلم: کتاب السلام، باب استحباب الرقیۃ من العین والنملۃ)۔

اس حدیث میں حسب استطاعت ایک مسلمان بھائی کو فائدہ پہونچانے کا حکم دیا گیا ہے، اور مضطر، مجبور جاں بلب فرد کو خون دینا بھی اس کو فائدہ پہونچانا ہے۔

”وقال عليه السلام :من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا ،نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة ---والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه“(مسلم: کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القران)۔

یہ حدیث مسلمانوں سے تکالیف کو دور کرنے پر ابھارتی ہے، اور ایسا کرنے پر اجر جزیل کا وعدہ بھی کرتی ہے، اور مضطر حاجت مند آدمی کو خون دینا اس سے تکالیف کو دور کرنا ہی ہے۔

عقل انسانی بھی ایسے نازک موقع پر عطیہ کے جواز کا فیصلہ کرتی ہے؛ کیوں کہ حفظ نفس مقاصد شریعت کا ایک اہم باب ہے، یہ تو ضرورت کے وقت عطیہ کے جواز کے دلائل تھے، اب ہم بلاضرورت عطیہ کے عدم جواز کے دلائل کو ذکر کر رہے ہیں۔

بلاضرورت عطیہ کے عدم جواز کے دلائل:

(۱) خون کا دوسرے کے بدن میں داخل کرنا ضرورت وحاجت کے وقت مشروع ہے، اور ضرورت ہی کی وجہ سے عطیہ کو جائز قرار دیا گیا ہے؛ لہذا فی الفور جب ضرورت داعیہ نہ ہو تو مستقبل موہوم کے واسطے عطیہ بھی جائز نہیں ہوگا؛ **”لما تقرر في الأصول :الضرورات تقدر بقدرها“**.

(۲) خون اعضاء انسانی میں سے ایک جزء ہے اور انسان اپنے تمام اعضاء واجزاء کے ساتھ مکرم ومعزز ہے: **”ولقد كرمنا بني آدم“** (سورہ اسراء، آیت ۷۰) (ہم نے اولاد آدم کو خاص اعزاز بخشا ہے)، بلاضرورت خون کا نکالنا اور دوسرے کو عطیہ کرنا تکریم اعضاء انسانی کے خلاف معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے بلاضرورت اس کی اجازت نہ ہوگی۔

(۳) اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اور اس کی ضرورت کے واسطے وہ حواس خمسہ ظاہرہ و باطنہ ودیعت کیے جس کا وہ قدم قدم پر محتاج ہو سکتا تھا، دیکھنے کے لیے آنکھ، سننے کے لیے کان، سونگھنے کے لیے ناک دی اور اندرونی سسٹم کو درست رکھنے کے لیے اعضائے رئیسہ کو بنایا جو ایک مشین کے پرزے کے مانند کام کرتے ہیں اور انسانی ڈھانچہ کو درست اور قائم رکھتے ہیں، مگر اللہ تعالی نے بنی آدم کو ان مستعار اشیاء کا مالک ومختار نہیں بنایا اور نہ اس میں مضر تصرفات کی اجازت دی، یہ چیزیں انسان کے پاس امانت ہیں اور اس میں بلاضرورت تصرف کرنا ایک طرح کی خیانت ہے جس کی اجازت نہیں، بلاضرورت خون کا عطیہ انسان کے اپنے اعضاء واجزاء پر مالک ہونے، اور ان اجزاء کے مملوکہ ہونے کے غماز ہوتے ہیں؛ جب کہ انسان نہ تو ان کا مالک ہے اور نہ ہی وہ مملوکہ؛ اس لیے بلاضرورت عطیہ کی اجازت نہیں ہوگی۔

(۴) بہت سارے مقامات پر بلڈ بینک کھل گئے ہیں جن میں باقاعدہ طور پر خون کی خرید وفروخت ہوتی ہے، جہاں منشیات کے رسیا افراد یا مفلوک الحال شخص اپنے خون کو فروخت کر کے ضرورت کو پورا کرتے ہیں، قانونا جرم ہونے کے بجائے ایسے کاروبار کو مادیت پرست افراد کی سرپرستی بھی حاصل ہے، بلاضرورت عطیہ کی اجازت دینا ان افراد کے لیے اس طرح کے ناجائز کاروبار کے واسطے جواز کا چوپٹ دروازہ کھولنے کے مرادف ہوگا؛ اس لیے سدا للذریعہ- جو شریعت کا اہم باب ہے- کی بناء پر بلاضرورت خون کے عطیہ کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی؛ اس لیے ضرورت کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو خون کا عطیہ دے سکتا ہے، ذمی کو بھی دے سکتا ہے، البتہ حربی کو عطیہ کرنے سے بعض معاصر علماء نے منع کیا ہے، اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والإفتاء کا فتوی بھی اسی نظریے پر مبنی ہے:

"إذا مرض إنسان واشتد ضعفه ،ولا سبيل لتقويته أو علاجه إلا بنقل دم من غيره إليه ،وتعين ذلک طريقا لإنقاذه ،وغلب على ظن أهل المعرفة انتفاعه بذلک ، فلا باس لعلاجه بنقل دم غيره إليه ولو اختلف دينهما،فينقل الدم من كافر ولو كان حربيا،وينقل من مسلم لكافر غير حربي ،أما الحربي فنفسه غير معصومة فلا تجوز إعانته"

(جب انسان مریض اور سخت لاغر ہو جائے اور اس کی طاقت اور علاج کے لیے سوائے خون چڑھانے کے اور کوئی شکل نہ ہو، اور خون چڑھانے سے اس کی جان بچ سکتی ہو، اور ڈاکٹروں کو اس سے شفاء کا ظن غالب ہو تو دوسرے کے خون کو جسم میں داخل کرنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ دونوں کا دین مختلف ہو؛ لہذا کافر کا خون خواہ وہ حربی کیوں نہ ہو مسلمان کو دیا جا سکتا ہے، حربی کی جان چوں کہ معصوم ومحترم نہیں؛ اس لیے اس کی خون دے کے اعانت کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ سورہ ممتحنہ: ۸،۹ میں مسلمانوں کو ایسے کفار کے ساتھ احسان اور اچھا برتاؤ کرنے سے منع کیا گیا ہے جو مسلمانوں سے قتال کرتے ہیں اور

انھیں ان کے گھروں سے نکالتے ہیں)۔

رضا کارانہ بلڈ بینک کا قیام:

دنیا کے پہلے خون کے بینک کے قیام کا سہرا ایک کینیڈین ڈاکٹر نارمل بیتھیوں کے سر ہے جس نے ہسپانوی جنگ کے دوران اسے قائم کیا، اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے دوران بینک میں اسٹور کیے گئے خون کو زخمیوں کی جان بچانے کے لیے استعمال کیا گیا؛ البتہ باقاعدہ رضا کارانہ طور پر خون کے عطیات اسٹور کرنے کے لیے پہلا خون بینک ۱۹۲۲ء میں انگلستان میں قائم ہوا تھا۔

سوویت یونین دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے اسپتالوں میں داخل مریضوں کو فراہمی خون کے لیے دنیا کا پہلا خون بینک قائم کیا۔

یہ امر مسلم ہے کہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء پر مالکانہ تصرف حاصل نہیں ہیں اور نہ وہ اس میں کتر بیونت کرنے کا مجاز ہے، پس عمومی حالات جہاں پر خون لینے یا دینے کی حاجت شرعیہ نہ ہو خون لینا اور خون دینا دونوں ناجائز رہے گا، رضا کارانہ بلڈ بینک کے قیام میں- جب کہ شخصی یا اجتماعی فی الفور ضرورت نہ ہو- چوں کہ ضرورت کے پائے جانے سے قبل ایک امر محظور کا ارتکاب ہوتا ہے؛ اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور اس طرح رضا کارانہ بینک کا قیام یا طبی کیمپ کا انعقاد درست نہ ہوگا۔ دلائل درج ذیل ہیں:

قرآن کریم نے جن مواقع پر حرام چیز کے ارتکاب کی اجازت دی ہے وہ عین ضرورت کے وجود کے وقت ہے قبل از وقت ان کا استعمال مشروع نہیں رکھا گیا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ کے اسلوب سے ظاہر ہے، ''**إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل لغير الله به ،فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه**'' (سورہ بقرہ: ۱۷۳)۔

دوسری بات یہ کہ حنفیہ کے نزدیک اضطراری حالات میں حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت صرف بقدر سد رمق ہے، اسے آیندہ کے لیے جمع کرنے کی اجازت نہیں۔

صحابی رسول حضرت عرفجہ بن اسعد رضی اللہ عنہ کا ابتداء چاندی کی ناک لگوانا اس میں بد بو پیدا ہونے کے بعد سونے کی لگوانا، اس بات کی دلیل ہے کہ حرام چیز کے استعمال کی اجازت عین حاجت کے تحقق کے وقت ہے، محض امر موہوم یا مستقبل میں پیدا ہونے والے خطرات سے نپٹنے کے لیے نہیں۔

بلاضرورت خون کے عطیہ کے عدم جواز کے سلسلے میں جو چار دلائل اوپر ذکر کیے گئے ہیں وہ بھی بلڈ بینک کے قیام کی ممانعت پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ تکرار کے خوف سے اس کی طرف اشارہ کو کافی سمجھا گیا۔

ایسے بینک کے قیام کے سلسلے میں عموماً درج ذیل دلائل دیے جاتے ہیں:

(۱) خون کا انتقال اس زمانے میں ایک ناگزیر ضرورت بن گیا ہے، اس طرح کے بینک قائم کر کے مسلمانوں کو خون کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے ان کی مصلحت عامہ کو بروئے کار لانا ہے۔

(۲) شریعت اسلامیہ کا ایک اہم عنصر مفاسد کو دور کر کے مصالح کی تعمیر ہے، اور وہ اس بینک کے ذریعہ ہوسکتی ہے، کیوں کہ اس طرح کے بینک قائم کرنے سے ان ہزاروں مریضوں کو مرنے سے بچایا جاسکتا ہے جو بہ وقت ضرورت خون نہ ملنے سے داعی اجل کو لبیک کہہ دیتے ہیں۔

(۳) اس طرح کے بینک ایک طبی ضرورت بن گئے ہیں؛ اس لیے الضرورات تبیح المحظورات کے تحت اس کی اجازت ملنی چاہیے؛ کیوں کہ ہر مریض کو ضرورت کے وقت اولاً تو خون ملنا مشکل ہوتا ہے، ثانیاً اگر مل بھی جائے تو یہ ضروری نہیں کہ گروپ یکساں ہو۔

(۴) ضرورت سے قبل خون جمع کرنے کا حکم- جب کہ آیندہ مستقبل میں اس کی ضرورت کا ظن غالب ہو- ائمہ ثلاثہ کے اس نظریے سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے جو مضطر کے لیے میتہ مردار کے ذخیرہ کے جواز پر مبنی ہے۔ جیسا کہ مؤطا امام مالک میں ہے: ''إن أحسن ما سمع في الرجل يضطر إلى الميتة أنه ياكل منها حتى يشبع ،ويتزود منها ، فإن وجد عنها غنى ،طرحها'' (مؤطا للإمام مالک: کتاب الصید، باب ماجاء في من یضطر إلی المیتۃ)۔

''وفي المجموع :الرابعة:قال أصحابنا :يجوز له التزود من الميتة إن لم يرج الوصول إلى طاهر'' (المجموع: ۹ / ۴۳، کتاب الأطعمۃ، ط: دار المعرفۃ، بیروت)۔

''وفي كشاف القناع:وله أي المضطر أن يتزود منه أي المحرم إن خاف الحاجة إن لم يتزود ---ولا ياكل منها إلا عند الضرورة'' (کشاف القناع: ۶ / ۱۹۶، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)۔

دلائل کا جواب:

جو دلائل اوپر ذکر کیے گئے ہیں ان کے بارے میں مختصراً عرض ہے:

ان تمام دلائل میں چند چیزیں مشترک ہیں: (الف) مصالحہ عامہ کی تشکیل (ب) ضرورت وحاجت کا تحقق (ج) خروج عن المذہب جہاں تک مصالح عامہ کی بات ہے تو یہ ایک امر مستحسن اور محمود چیز ہے اور اس کی اہمیت سے چشم پوشی بھی نہیں کی جاسکتی......مگر مصالح کی رعایت اس جگہ روا رہتی ہے جہاں پر کوئی خرابی لازم نہ آتی ہو اور کسی مفسدہ عظیمہ کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، فی الفور خون کی ضرورت کے نہ ہونے کے وقت ایسے بینک کا قیام انسان کے اپنے اعضاء واجزاء پر مالکانہ تصرف

کے غماز ہونے کے ساتھ ساتھ تکریم انسانی کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، جو اپنے آپ میں ایک بڑا مفسدہ ہے؛ اس لیے فقہ کے قاعدے: ''درء المفاسد أولى من جلب المصالح'' کے پیش نظر اجازت نہیں دی جاسکتی۔

ضرورت کی وجہ سے جہاں تک کسی حرام کے ارتکاب کی اجازت ہے وہ اس وقت ہے جب عین ضرورت کا تحقق ہو گیا ہو اور آدمی کے ہلاکت یا حرج شدید میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، آیندہ پیش آنے والے خطرات کے سبب ارتکاب معصیت کی اجازت نہیں دی جاسکتی؛ اس لیے فی الفور ضرورت کے نہ ہونے کے وقت ضرورت کے قاعدہ سے قیام بینک کے جواز پر استدلال محل نظر معلوم ہوتا ہے۔

مضطر کو خون دینے کا حکم:

اس وقت انسان خون کی ۳۰۰ مختلف سسٹم کے تحت درجہ بندی کی جاسکتی ہے، جس میں روز مرہ زندگی میں اے بی او (A.B.O) اور آر ایچ (R.H) سسٹم سب سے زیادہ استعمال ہوتے ہیں، ویسے تو ہر انسان کا بلڈ گروپ ساری زندگی ایک ہی رہتا ہے؛ مگر انتہائی شاذ و نادر مثالیں دستیاب ہیں جن میں کیور اور بون میرو ٹرانسپلانٹ میں مریض کا خون بدل گیا۔

اور ہر مریض کو وہی خون دیا جاتا ہے جیسا کہ خود اس کا اپنا خون ہے، مگر کبھی کبھی جب مریض کے گروپ کا خون دستیاب نہ ہو تو دوسرے گروپ کا خون بھی (احتیاط کے ساتھ) دیا جاسکتا ہے مگر اس کے کچھ قواعد ہیں:

نیگیٹیو (NEGATIVE) گروپ کے مریض کو پازیٹو (POSSATIVE) گروپ کا خون نہیں دیا جاسکتا، البتہ اس کے برخلاف کیا جاسکتا ہے۔

اے بی (A-B) گروپ کے مریض دوسرے گروپ کے لوگوں کا خون لے سکتے ہیں، مگر انھیں خون دے نہیں سکتے۔

او (O) گروپ کے لوگ دوسرے گروپ والوں کو خون دے سکتے ہیں، مگر خود کسی دوسرے گروپ کا خون قبول نہیں کر سکتے۔

اے (A) گروپ کا انسان گروپ بی (B) کو اور بی (B) گروپ کا انسان گروپ اے (A) کو خون نہ دے سکتا ہے اور نہ لے سکتا ہے۔

معاشرہ انسانی کی عمدہ تعمیر و تشکیل اور اس کے بنیادی ڈھانچوں کو پختہ کرنے میں جس چیز کو بڑا دخل ہے وہ ایک دوسرے کی نصرت وحمایت اور مصیبت کے وقت کام آنا ہے ،شریعت اسلامیہ ایک جاں بہ لب مریض آدمی کی دستگیری قابل تحسین نگاہ سے دیکھتی ہے، اور اس سلسلے میں آیات و آثار بہت کثرت سے وارد ہوئے

ہیں، فرمان باری ہے: "**من أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (سورہ مائدہ: ۳۲)، اسلام کے نزدیک ایک نفس محترم کی بہت اہمیت ہے، اسی وجہ سے اس کی حفاظت کا بندوبست بھی منظّم طریقے سے کیا ہے، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلام ہی وہ واحد آفاقی نظام ہے جو ایک جان کی حفاظت کو پوری انسانیت کے بچانے سے تعبیر کرتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "**من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا، نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة**" (مسلم: کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر)۔

جس شخص نے کسی مضطر آدمی سے اس کی پریشانی دور کی اللہ رب العزت کل قیامت میں اس کی پریشانی کو دور فرمائیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا: "**من استطاع منكم أن ينفع أخاه، فليفعل**" (مسلم: کتاب السلام، باب استحباب الرقیۃ من العین)۔

مضطر آدمی جو سخت بھوکا پیاسا ہو اور جاں بلب ہو کہ اگر کچھ نہ ملے تو مر جائے، اور دوسری طرف کسی شخص کے پاس مال موجود ہے اور وہاں کوئی دوسرا مددگار نہیں تو مال والے پر لازم ہوگا کہ وہ اس لاچار کی مدد کرے۔

اس لیے ان نصوص کے پیش نظر اگر کسی کا گروپ ایسا نادر ہو کہ دوسرے کا اس جیسا نہ ہو، اور جن لوگوں سے ملنے کی امید ہے ان افراد میں سوائے ایک کے کسی اور کا خون اس گروپ کا نہ ہو تو اس شخص کے لیے خون دینا جائز رہے گا، اگر وہ خون نہ دے تو اس پر شرعاً زبردستی نہیں کی جائے گی، اور وہ شخص منع کرنے کی وجہ سے گنہگار بھی نہ ہوگا۔ ہاں! اگر کسی حلال پاک چیز سے جان بچنے کی امید ہو وہ کسی کے پاس ہو تو حفظ نفس کے لیے وہ چیز دینا واجب وضروری ہوگا اور ایسی حالت میں نہ دینے سے وہ گنہ گار ہوگا۔ دونوں صورتوں میں یہ چند وجوہ فرق ہے:

اولا: انسان اپنی اشیائے خورد ونوش کا مالک ومختار ہے اس میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے، برخلاف اپنے اعضاء یا خون کے۔

ثانیا: ایسے ناگزیر حالات میں عطیہ کو واجب قرار دینے سے یہ مظنہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے خون کا مالک ہے؛ اس لیے سوال میں مذکور صورت میں خون کا عطیہ واجب نہیں ہوگا محض جائز رہے گا۔

جگر اور قرنیہ کا عطیہ:

مرنے کے بعد میت کے جگر یا کسی عضو کو دوسرے کی جان بچانے کے واسطے نکالنا یا اس عضو کو کسی مخصوص ادارے کو اس نیت سے عطیہ کرنا کہ مستقبل میں اپنے کسی بھائی کی جان بچائی جاسکے، جائز نہیں قطعاً حرام ہے، یا کسی مسلمان کا نیک نیتی سے اپنی ایک آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرنا یہ سوچ کر کہ میرا تو ایک آنکھ سے کام چل ہی رہا ہے، یا کسی مردہ سے اس کی قرنیہ کو حاصل

کرنا، یا کسی بینک کو اپنی آنکھ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ دلائل درج ذیل ہیں:

"مضطر لم یجد میتة وخاف الھلاک،فقال له رجل :اقطع یدي وکلھا ،أو قال :اقطع مني قطعة وکلھا ،لایسعه أن یفعل ذلک ولا یصح أمره به ،کما لا یسع للمضطر أن یقطع قطعة من نفسه فیأکل" ،کذا في فتاوی قاضي خان (ہندیہ:۵/۳۱۶ کتاب الکراہیۃ، الباب الحادي عشر في الکراہۃ في الأکل، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)۔

اس جیسی عبارات معمولی تغیر کے ساتھ تقریباً تمام ہی کتابوں میں درج ہے۔

جب ایسے عطیات ناجائز ہیں تو کسی کی اجازت اسے معتبر اور جائز نہیں بنا سکتی، اور ایسی اجازت عند الشرع معتبر بھی نہیں ہوگی، حدیث میں ہے: **"لا طاعة لمخلوق في معصیة الخالق"**۔

عطیہ کرنے کے تعلق سے یہ شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ مذکورہ صورت مفید ہی مفید ہے اور انسانیت کے ساتھ ایک طرح کی خیر خواہی بھی؛ کیوں کہ مرنے والے کے تو سارے ہی اعضاء فنا ہونے والے ہیں، ان میں سے کوئی عضو اگر کسی زندہ انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ یہ ایسا معاملہ ہے کہ عام لوگوں کی نظریں صرف اس کے مفید پہلو پر جاتی ہیں لیکن اس کے مہلک نتائج نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں، مثلاً: انسان کے ساتھ یہ معاملہ ہو کہ اس کی کھال اور بال اور اعضاء کو قطع و برید کرکے استعمال کیا جائے تو یہ انسانی شرافت و تکریم اور منشائے تخلیق کائنات کے بالکل منافی ہوگا، اور اگر یہ طریقہ رواج پا گیا اور اس پر شریعت کے جواز کی مہر ثبت ہوگئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک غریب انسان کی آنکھ اور گردہ اور دوسرے اعضاء ایک بکاؤ مال کی طرح بازار میں فروخت ہوا کریں گے اور ایک نادار آدمی اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر یہ قربانی بڑی آسانی سے دینے پر آمادہ ہوجائے گا، اور اگر لاشوں سے اس طرح رضا کارانہ اعضاء کو لینے کا سلسلہ چل پڑے گا تو بہت سے مردے خصوصاً لاوارث مردے بہت سے اعضاء سے محروم ہوکر اس دنیا سے جایا کریں گے، اور پھر آج ان اعضاء کو تادیر صحیح سالم رکھنے کی صورتیں بھی دریافت کرلی گئی ہیں تو اس طرح کا خیر خواہانہ جذبہ معاشرہ کو ایک بھیانک صورت حال کی طرف لے جانے والا ہوجائے گا۔

کچھ لوگ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی درج ذیل حدیث سے اعضائے انسانی کے عطیہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں: **"عن عبادة رضی الله تعالی عنه من تصدق بشئی من جسده ،أعطي بقدر ما تصدق"** (الجامع الصغیر: ۲/۱۶۸)۔

مگر یہ حدیث نفس مسئلہ پر مستدل نہیں بن سکتی؛ کیوں کہ یہ جنایت سے متعلق ہے، یعنی کسی نے کسی پر جنایت کی

مثلاً: کسی کا ہاتھ کاٹ دیا، مجنی علیہ نے قصاص لینے کے بجائے معاف کر دیا تو یہ اس کی طرف سے مجنی علیہ پر صدقہ ہے، اور یہ حدیث درحقیقت آیت کریمہ: ''أن النفس بالنفس والعين بالعين والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص ،فمن تصدق به فهو كفارة له'' (سورہ مائدہ:۴۵) کی تفسیر ہے۔

دودھ بینک:

اللہ رب العزت نے نو مولود کی صحت بخش غذا اس کے ماں کے دودھ میں رکھی ہے، ماں کا دودھ جن مزایا خصوصیات، مقوی اجزاء، پروٹین اور وٹامن پر مشتمل ہوتا ہے وہ مصنوعی دودھ کے اندر بسیار کوشش کے باوجود بھی پیدا نہیں کیا جاسکا۔ اسی وجہ سے عالمی طبی ادارے نے اپنی قرارداد میں اس بات پر زور دیا کہ ہر مائیں اپنی اولاد کو اپنا دودھ پلائیں اور حتی الامکان مصنوعی چیزں سے احتیاط برتیں۔

ادھر موجودہ صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں محبوس ہو کر رہنا نہیں چاہتیں؛ بل کہ مردوزن کے مساوات کے علم برداروں کے بہکائے میں آ کر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا پسند کرتی ہیں، اس طرح وہ ایک غیر واجب کام کو لازم کر کے اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جاتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کے اخلاق بھی فاسد سے فاسد ہوتے جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ معیار زندگی کو بلند کرنے کی خاطر ملازمت کرنا شرعی ذمہ داریوں سے دور ہونے کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش ان کی دیکھ بھال میں کوتاہی کا ایک ذریعہ بھی ہو جاتا ہے، جس کا مشاہدہ بہت سے ممالک میں ہو رہا ہے۔ اسی تدارک کے لیے بچہ گھر اور ان کو مطلوبہ غذا پہونچانے کے لیے دودھ بینک بھی قائم کیے جا رہے ہیں؛ تا کہ ان کی صحیح نشو ونما ہو سکے، جب کہ ماں کی شرعی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری بچہ کی پرورش ہے اور اس کو دودھ پلانا ہے۔ ''قال الحنفية: يجب على الأم ديانة لا قضاء'' (الموسوعۃ:۲۲/۲۳۹)۔

ہاں اگر کوئی عورت بیمار رہتی ہو، یا اس کا دودھ بچے کے واسطے مضر ہوتا ہو تو شریعت نے اس کے لیے ایک دوسرا متبادل راستہ بھی پیدا کیا ہے کہ بچہ کو دودھ پلانے کے لیے کسی اجنبیہ عورت کو بالعوض یا بلا معاوضہ اس کام پر آمادہ کر لیا جائے۔ قدیم عرب معاشرہ میں یہ رواج رہا بھی ہے، خود آقائے نامدار رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دائی حلیمہ سعدیہ کا ان کے گھر پر رہ کر دودھ پیا ہے، اس طرح دودھ پینے کے بعد شریعت ماں یا اس دودھ پلانے والی عورت اور اس بچے کے درمیان ایک نیا رشتہ قائم کرتی ہے جسے رضاعت سے جانا جاتا ہے اور اس طرح بچہ اور دودھ پلانے والی عورت ایک نئے رشتہ میں بندھ جاتے ہیں اور ان کے درمیان ماں اور بیٹے کا تعلق ہو جاتا ہے، اور جس طرح اپنی حقیقی ماں سے نکاح حرام ہوتا ہے اسی طرح رضاعی ماں سے بھی نکاح حرام ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے محرمات کو بیان کرتے ہوئے

رضاعی ماں کو بھی محرمات میں شمار کیا ہے۔ ''**وأمهاتكم اللاتي أرضعنكم وأخواتكم من الرضاعة**'' (سورہ نساء: ۲۲) (تمہارے لیے تمہاری مائیں بھی حرام کی گئیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور وہ بہنیں بھی جو دودھ میں شریک رہی ہیں)۔

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''**يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب**'' (بخاری ومسلم) (رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے ہوا کرتے ہیں)۔ اس طرح دودھ پینے اور پلانے سے ایسے ماں بیٹوں، بھائی بہنوں میں جو جسمانی وجذباتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اسلام نے اس کی بڑی اہمیت رکھی ہے؛ کیوں کہ شریعت کے بنیادی مقاصد میں جس طرح جان ومال، انسانی عقل اور دین کی حفاظت ہے اسی طرح حسب نسب کی بھی حفاظت ہے؛ اسی لیے شریعت نے رضاعت کے سلسلے میں بہت سے قاعدے وقوانین وضع کیے ہیں تا کہ نسب کی شناخت قائم ودائم رہ سکے اور ان رشتوں کا تقدس پامال ہونے سے محفوظ رہے۔

(۱) سب سے بنیادی حکم اسلام نے رضاعت کو حرمت مؤبدہ کا ایک سبب مانا ہے۔ (کما فی الحدیث) شرط یہ ہے کہ بچہ شیر خوارگی کی مدت میں دودھ پیے، تھوڑی مقدار میں پیے یا زیادہ مقدار میں۔

''**فذهب الجمهور: (الحنفية والمالكية وأحمد في رواية عنه) وكثير من الصحابة والتابعين إلى أن قليل الرضاع وكثيره يحرم، وإن كانت مصة واحدة........ وذهب الشافعية والحنابلة في القول الصحيح عندهم إلى أن ما دون خمس رضاعات لا يؤثر في التحريم**'' (الموسوعۃ: ۲۲/ ۲۴۴)۔

(۲) عورتیں بلاضرورت ہر کس وناکس بچے کو دودھ نہ پلائیں، اور اگر کسی کو پلائیں تو انھیں محفوظ رکھیں اور قوم کے درمیان انہیں مشہور کردیں یا احتیاطاً ان کے نام ونسب کو تحریر کرلیں؛ چناں چہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

''**والواجب على النساء أن لا يرضعن كل صبي من غير ضرورة، وإذا أرضعن فيحفظن ذلك، ويشتهرنه، وكتبنه احتياطاً**'' (فتح القدیر: ۳/ ۴۱۸، کتاب الرضاع، ط: زکریا)۔

(۳) مشرکہ فاجرہ کے دودھ سے احتراز کیا جائے؛ چناں چہ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور خلیفہ خامس حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: دودھ سے مشابہت ہوتی ہے؛ اس لیے کسی یہودیہ نصرانیہ عورت کا دودھ بچہ کو نہ پلاؤ۔ ''**عن عمر بن الخطاب وعمر بن عبد العزيز أنهما قالا: اللبن يشتبه، فلا تستق من يهودية ولا نصرانية ولا زانية**'' (الموسوعۃ: ۲۲/ ۲۵۵) کافرہ یا فاجرہ کے دودھ میں جو اثرات خبیثہ ہیں ان کے منتقل ہونے اور اخلاق پر اثر انداز ہونے کا قوی خطرہ ہوتا ہے۔

اسی طرح کسی بے وقوف پاگل عورت کے دودھ سے بھی احتراز کرنا چاہیے؛ تا کہ بچہ بے وقوفی میں اپنی ماں کے

مشابہ نہ ہوجائے، یا اسے اس کی احمق رضاعی ماں کی وجہ سے عار نہ دلایا جائے۔

دودھ کی خرید وفروخت تکریم انسانی کے خلاف ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے، امام شافعی کے نزدیک جائز ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"ولا (يجوز) بيع لبن امرأة في قدح، وقال الشافعي: يجوز بيعه؛ لأنه مشروب طاهر. ولنا أنه جزء الآدمي وهو بجميع أجزاءه مكرم مصون عن الابتذال بالبيع" (ہدایہ: ۳/۵۵، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، ط: اشرفیہ دیوبند)۔

مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اب نفس مسئلہ کا حکم استخراج کیا جاسکتا ہے کہ دودھ کے ایسے بینک کے قیام کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور بینک کا قیام ناجائز رہے گا، اسی طرح دودھ کا اسٹاک کر کے اسے ضرورت مندوں کو فروخت کرنا بھی ناجائز رہے گا، جیسا کہ اوپر گزرا کہ اس کی بیع وشراء میں رضاعی ماں بیٹے کی شناخت دشوار ہوجاتی ہے، اور ایسا ممکن ہے کہ ایک بھائی اپنی رضاعی بہن سے شادی کرلے اور اس کو خبر بھی نہ ہو، جب کہ حدیث میں رضاعت کو حرمت مؤبدہ کا سبب بتایا گیا ہے، اور بینک کے لیے بھی ان کے ناموں کو محفوظ رکھنا کارے دارد ہے، یا پھر مادیت پرست لوگوں کے ہاتھ میں ان بینک کی باگ ڈور ہونے کی وجہ سے اسے لایعنی سمجھ کر ترک کردیں گے، جب کہ شناخت محفوظ کرنا ایک مستقل حکم ہے۔ ایسے بینک میں غیر شرع عورتوں کے دودھ کا بھی اسٹاک ہوتا ہے جن کے پینے سے فقہاء نے منع فرمایا، نیز ایسے بینک کے قیام اور ان سے عام اشیاء خورد ونوش کی طرح دودھ کی خرید وفروخت سے بے شمار مضرات اور مفاسد بھی جنم لے سکتے ہیں۔ مثلا:

(۱) اس کا غیر فطری عمل اور تکریم انسانی کے خلاف ہونا (۲) صحت پر منفی اثر کا پڑنا (۳) ضرورت مند بچے کا اس کے صرفہ کا تحمل نہ کر پانا (۴) بچے کا ماں کی ممتا سے محروم ہونا (۵) یہود سے مشابہت: اعلی کے موجود ہوتے ہوئے ادنی کا مطالبہ کرنا، یعنی: دودھ پلانے والی ماؤں کے رہتے ہوئے دودھ بینک کو قائم کرنا (۶) معاشرتی نقصان کا پیدا ہونا (۷) حسب ونسب کا ضائع ہونا (۸) دودھ میں کمی کا باعث ہونا۔

دودھ بینک کے قیام کے سلسلے میں بنیادی طور پر تین نظریے ہیں:

(۱) عالم اسلام میں انسانی دودھ کے بینک کا قیام حرام وناجائز ہے اور اس سے دودھ حاصل کرنا بھی ناجائز ہے۔ مجمع الفقہ الاسلامی نے اپنے ۱۴۰۶ھ میں اس موضوع پر منعقد ہوئے سیمنار میں اسی نظریے کو اختیار کیا ہے۔

(۲) ایسے بینک کا قیام اور اس سے دودھ حاصل کرنا جائز ہے۔ یہ نظریہ فقہ الزکاۃ کے مؤلف ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مصر کے مفتی شیخ عبداللطیف حمزہ اور شیخ علی التسخیری کا ہے۔

(۳) جب ایسے بینک کا قیام ناگزیر ہوجائے تو درج ذیل شرائط کے ساتھ اجازت دی جاسکتی ہے:

(الف) ہر عورت کا دودھ علاحدہ شیشی میں رکھا جائے۔

(ب) ہر شیشی پر دودھ عطیہ کرنے والی عورت کا نام لکھ دیا جائے۔

(ج) جو نومولود اس دودھ کو استعمال کرے اس کا نام، پتہ رجسٹر میں لکھ دیا جائے۔

(د) بچے کو اس عورت کے بارے میں خبر دی جائے کہ وہ اس کی رضاعی ماں ہے۔

مادہ منویہ بینک کا قیام:

دنیا کے مختلف علاقوں میں جب بانجھ پن کے واقعات رونما ہونے لگے تو سب سے پہلے ۱۹۵۰ء میں منی کو محفوظ رکھنے کا عندیہ ڈاکٹروں میں پیدا ہوا؛ تاکہ بوقت ضرورت اس کی تلقیح کرکے بچوں کو حاصل کیا جاسکے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا بینک بعض لوگوں کے مطابق سترویں دہائی اور بعض کے مطابق ۱۹۸۰ء میں قائم کیا گیا۔

بینک کی سرگرمیاں:

(الف) مادہ منویہ جمع کرنا: اس طرح کے بینک مختلف طریقے سے مادہ منویہ جمع کرتے ہیں: کوئی شخص اپنی منی اس بینک کو فروخت کرے یا عطیہ کردے، یا کوئی آدمی اس بینک میں اپنا مادہ منویہ بطور عاریت رکھے اور ضرورت کے وقت اسے حاصل کرلے۔ یہ منی مختلف طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے، ایک طریقہ تو وہی جو معروف ہے، یعنی مشت زنی کرکے، دوسرا طریقہ وائبریٹر مشین کے ذریعہ، (ملک چین میں اس طرح کی مشین ایجاد ہو چکی ہے)، تیسرا عزل کے ذریعہ کہ صحبت کے دوران جب انزال کا وقت آئے تو مرد اپنی منی کو کسی برتن میں محفوظ کرلے۔

(ب) منی کو چیک کرنا: کہ یہ مادہ کہیں کسی مہلک امراض کو جنم دینے والا تو نہیں۔

(ج) محفوظ رکھنا: یہ بینک منی کو لیبارٹری میں اس طرح محفوظ رکھتا ہے کہ طویل مدت تک بھی وہ خراب نہ ہو سکے، بعض نے اس کی مدت پندرہ سال بتلائی ہے، بعض نے تاحیات بتلائی ہے، امریکہ کے ٹائلر میڈیکل کلینک (TYLER MEDICAL CLINIC) میں ۱۹۷۸ء میں ایک ۳۲ سالہ آدمی نے اپنی منی محفوظ کی تھی اور ۱۹۹۷ء کے وسط میں اس نے شادی کی اور بینک سے رجوع کرکے اپنی منی کو اپنی بیوی میں تلقیح کرائی تو آپریشن کامیاب ہوا اور اس کی بیوی حاملہ بھی ہوئی۔

(د) ہر ایک کا ریکارڈ محفوظ رکھنا: یہ بینک ہر عطیہ کرنے والے یا فروخت کرنے والے کا پورا پتہ محفوظ رکھتے ہیں، مگر اس میں احتیاط نہیں ہو پاتی ہے، ذخیرہ میں رہنے والی منی کو ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط کردینے کے واقعات بھی سامنے آئے ہیں۔

(ھ) مطلوبہ افراد کو فروخت کرنا۔

(و) ایسے لوگوں کے ناموں کا اخفاء۔

بینک کی تفصیل اور اس کی سرگرمیاں اس وجہ سے تحریر کی گئی ہیں تا کہ مسئلے کی پوری کیفیت سامنے آ جائے اور اس پر کوئی حکم لگانا آسان ہو۔

مادہ منویہ بینک قائم کرنے کا حکم:

مادہ منویہ بینک قائم کرنے کے سلسلے میں دو قول ہیں:

اول: ایسے بینک کا قیام ناجائز و حرام ہے۔

دوم: ایسے بینک کا قیام چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، جو درج ذیل ہیں:

(الف) شوہر اپنے مادہ کو بینک میں محفوظ کر دے، اور صرف اس کی بیوی کو ہی وہ بھی نکاح کے قائم ہونے کے وقت دیا جائے۔

(ب) ایسے برتن میں منی کو محفوظ کیا جائے جس میں اختلاط کی گنجائش نہ ہو، نہ سہوا، نہ نسیانا اور نہ خطا۔

قول اول کے دلائل:

اس نظریے کے حاملین قرآن کریم کی مختلف آیتوں سے استدلال کرتے ہیں، مثلا:

"**ولقد خلقنا الإنسان من سلالة من طين ،ثم جعلناه نطفة في قرار مكين** "(مومنون:۱۲، ۱۳)۔

"**ألم نخلقكم من ماء مهين ،فجعلناه في قرار مكين**"(مرسلات:۲۰، ۲۱)۔

بینک قائم کر کے مادہ منویہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے اس کو غیر مستقر میں رکھنا ہے؛ لہذا اسلام میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

"**ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم وسآء ت مصيرا**"(سورہ نساء:۱۱۵)۔

اور اس طرح کا بینک مسلمانوں کے طریقہ کا نہیں؛ بل کہ یہ یہود و نصاری اور غیر مشرکین کے طریقہ کا ہے۔

نیز حدیث میں ہے: "**لا ضرر ولا ضرار**" (ابن ماجۃ: کتاب الأحکام، باب من بنی في حقه ما يضر بجاره) اور اس طرح کے بینک کے قیام میں نقصان ہی نقصان ہے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

بینک کا انسان کو اور انسان کا بینک کو منی فروخت یا ہدیہ کرنا:

اس طرح فروخت کرنا یا ہدیہ کرنا ناجائز ہے؛ کیوں کہ منی ناپاک ہونے کے ساتھ مال متقوم بھی نہیں۔

"**تنقسم النجاسة إلى قسمين :غليظة:......فالغليظة كالخمر والدم المسفوح......وما ينقض الوضوء بخروجه من بدن الإنسان، كالدم السائل، والمني**" (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي:۱۵۲-۱۵۵ کتاب الطهارة ،ط: دار الكتاب دیوبند)۔

نیز آپ ﷺ نے مضامین کی بیع سے منع فرمایا ہے، اس سے بھی مسئلہ پر استیناس کیا جاسکتا ہے۔

"**نهى النبي ﷺ عن المضامين والملاقيح**" (فیض القدیر ۶/ ۳۰۷، باب المناہی، ط: المکتبۃ التجاریۃ، مصر۔ طب، عن ابن عباس)۔

مضامین: اصلاب میں رہنے والی منی کو کہتے ہیں۔

دودھ انسان کا جزء ہے اور اس سے انسان کی نشو ونما ہوتی ہے، منی کی بھی یہی کیفیت ہے، اور دودھ کی بیع حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے تو دودھ پر منی کو قیاس کر کے کہا جاسکتا ہے کہ منی کی بیع بھی ناجائز ہونی چاہیے۔ جب منی کے ناپاک اور مال متقوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیع ناجائز ہے تو ہدیہ اور تبرع وعطیہ بھی ناجائز ہوگا؛ کیوں کہ ہبہ کے شرائط میں سے شئی موہوب کا مال متقوم ہونا ہے:

"**قال في البدائع : ولا هبة ما ليس بمتقوم كالخمر ،ولهذا لم يجز بيعها**" (۸/ ۹۵ کتاب الهبة، ط: دار الكتب العلمية، بیروت)، علاوہ ازیں اس طرح کے مادہ منویہ کو لینے میں بے شمار مفاسد اور مضرات ہیں:

(الف) غیر ثابت النسب بچوں کی کثرت، اس وقت تقریبا چار ملین بچے ایسے ہیں جن کے باپ کا علم نہیں۔

(ب) نسلی امراض کی کثرت اور اضافہ۔

(ج) نسب کا اختلاط۔

(د) منی کی بیع۔

(ر) ایسے بینک کا قیام معاشرہ اور خاندانی ڈھانچے کو منہدم کرنے والا ہے۔

(س) زنا کا فروغ، خصوصا ان نوجوان عورتوں کے تعلق سے جن کے شوہر وفات پا گئے، زنا کے صدور کے وقت وہ دعوی کریں گی کہ مذکورہ حمل ان کے شوہر کا ہے جنہوں نے اپنی منی کو بینک میں محفوظ کرا رکھا تھا۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

مفتی اعجاز الحسن بانڈے القاسمی☆

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے چوبیسویں فقہی سمینار کیلئے متعینہ موضوع اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ کے سلسلے میں یہ مختصر تحریر پیش خدمت ہے، منتخبہ موضوع پر کچھ بھی تحریر کرنے سے پہلے بطور مقدمہ ملکیت اور پھر حق کے سلسلے میں یہ چند باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، ممکن ہے کہ اصل مسئلہ کا حل ڈھونڈنے میں قدرے آسانی ہو۔

کسی چیز کے مالک ہونے کی کئی حیثیتیں ہیں:

(۱) **ملک تام**: اسکی تعریف یہ ہے، کسی چیز کا اس طرح مالک ہونا کہ وہ چیز بھی اسکی ہو اور اسکے تمام منافع بھی اسی کے ہوں، تمام حقوق کا وہ بذات خود مالک ہو، "**هو ملک ذات الشئ (رقبته) و منفعته معاً**" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۲۸۹۴)۔

جب تک وہ شخص باقی ہے اس کی ملکیت بھی باقی ہے اسکو یہ کامل حق ہے کہ وہ اس چیز کو بیچ سکتا ہے، ھبہ دے سکتا ہے، وقف کرسکتا ہے یا مابعد الموت کسی شخص کیلئے وصیت کرسکتا ہے، زندگی میں کسی کو عاریۃً یا کرایہ پر دے سکتا ہے غرض یہ کہ وہ اس چیز پر مکمل حق رکھتا ہے، اس شئ کو استعمال کرسکتا ہے اور اسکے منافع سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لئے اگر وہ چیز کسی وجہ سے ضائع ہوجائے تو اس پر کسی طرح کا ضمان واجب نہیں ہے۔

(۲) **ملک ناقص**: اسکی تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کسی چیز کا مالک ہو، لیکن اسکے منافع کسی اور کی ملکیت ہوں، جیسے کسی چیز کو عاریت پر دینا، کرایہ پر دینا، وقف کرنا، کسی چیز کے منافع کیلئے وصیت کرنا یا کسی چیز کو دوسروں کیلئے مباح قرار دینا، مثلاً کسی کو کھانے کیلئے کہنا، اپنے مملوکہ راستے سے گذرنے کی عمومی یا خصوصی اجازت دینا، اپنی گاڑی میں بٹھانا یا گھر میں رہنے کی اجازت دینا یا اس جیسی دیگر مثالیں۔

عاریت، اجارہ، وقف اور اباحہ کی تعریف فقہاء کرام نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

☆ ناظم وصدر مفتی الجامعہ سبیل الھدیٰ (بمنہ)، سرینگر، کشمیر۔

(۳)**اعارہ**: جمہور احناف اور فقہاء مالکیہ کے نزدیک بغیر عوض کسی چیز سے نفع اٹھانے کو کہتے ہیں، لہذا مستعیر کیلئے خود نفع اٹھانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو نفع اٹھانے کی اجازت دینے کا بھی حق ہے لیکن وہ شئ مستعار کو کرایہ پر نہیں دے سکتا، کیونکہ اجارہ اور اعارہ میں یہ بنیادی فرق ہے کہ اعارہ عقد غیر لازم ہے بایں طور کہ معیر کو کسی بھی وقت وہ چیز واپس مانگنے کا حق ہے جبکہ اجارہ عقد لازم ہے۔ اور فقہاء شوافع وحنابلہ کے نزدیک تو خود نفع اٹھانے کی اجازت ہے لیکن دوسروں کو استعمال کی اجازت دینے کا حق نہیں ہے، کیونکہ انکے نزدیک اعارہ بغیر عوض نفع اٹھانے کی اجازت دینے کو کہتے ہیں اور یہ اجازت لازم ہے متعدی نہیں، اسلئے خود تو نفع اٹھالے لیکن دوسروں کیلئے اسکو عام نہیں کرسکتا۔

(۴)**اجارہ**: یعنی بالعوض نفع اٹھانے کا مالک بننا، لہذا کرایہ دار خود بھی نفع اٹھا سکتا ہے دوسروں کو بھی نفع اٹھانے کی اجازت دے سکتا ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ وہ نفع اٹھانا اصل مالک کی منشاء کے خلاف نہ ہو، ایسی صورت میں اصل مالک کی اجازت لیناضروری ہے۔

(۵)**وقف**: چیز کو کسی کی ملکیت بنانے سے روکنے اور اس چیز کے منافع کو موقوف علیہ کیلئے لرضاء اللہ بخشنے کو کہتے ہیں، لہذا واقف کی اجازت سے شئ موقوف کا نفع لازم بھی ہوسکتا ہے متعدی بھی ہاں اگر شئ موقوف سے استفادہ تب ہی ممکن اور فائدہ مند ہو جب کہ وہ وقف عام ہو تو اس وقت پھر واقف کی پابندی یا تخصیص وقف کیلئے درست نہیں ہوگی، جیسے کہ مسجد وغیرہ کیلئے وقف کرنا اگر اس میں متعین نمازیوں کی تخصیص جیسی شرائط ہوں تو یہ شرائط قابل عمل نہیں ہونگی۔

عاریت، اجارہ، وقف اور اباحہ میں مستعیر کیلئے شئ مستعار کو معیر کی اجازت کے بغیر مستجیر کیلئے ماٴجور کو موٴجر کی اجازت کے بغیر موقوف علیہ کیلئے واقف کی اجازت کے بغیر اور ایسے ہی منتفع کیلئے امر مباح کو عاریت یا اجارہ یا اباحہ کرنا قطعاً جائز نہیں ہے کہ انکی ملکیت ناقص ہے، ان کو صرف بالعوض یا بلاعوض نفع اٹھانے کی اجازت ہے، مزید تعدی یا تصرف ممنوع ہے۔

کسی بھی چیز پر حق ملکیت کا دعویٰ کرنے کے معاملے میں ذکر کردہ امکانات و وسائل کی روشنی میں جب ہم مذکورہ تفصیلات ملک تام، ملک ناقص، عاریت، اجارہ اور وقف وغیرہ کی تعریفات وتفصیلات پر غور کرتے ہیں تو اس کائنات میں اشرف المخلوقات حضرت انسان کے اختیارات و مالکانہ حقوق کی دو حیثیتیں اور جہتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ انسان کا اپنے بغیر دوسری چیزوں کا مالک ہونا یا تو بر بناء بیع ہو، ھبہ کے ذریعہ ہو، اجارہ کے ذریعہ ہو، وقف کے ذریعہ ہو یا عاریت کے ذریعہ ہو۔ اگر یہ ملکیت بیع، ھبہ یا وقف خاص کے ذریعہ ہو اور مشتری، موھوب لہ، وموقوف علیہ نے قبضہ بھی کرلیا ہو تو اس سے ملکیت تام حاصل ہوگی، مشتری، موھوب لہ اور موقوف علیہ اس چیز پر ہر قسم کا تصرف کرسکتے

ہیں، بیچ سکتے ہیں، ھبہ دے سکتے ہیں، وقف کر سکتے ہیں، اس چیز پر انکی ملکیت تمام منافع سمیت درست وثابت ہے۔

۲۔ کسی چیز پر ملکیت ثابت ہونے کیلئے وقف عام یا عاریت کے الفاظ سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے جہاں تک وقف عام کا معاملہ ہے، اس کی تعریف میں ہی یہ داخل ہے کہ کسی ایک کی ملکیت سے روکنے کیلئے لرضاء اللہ وقف کرنا، اسلئے شئی موقوف پر کسی بھی حال میں فرد واحد کی ملکیت ثابت نہیں ہوسکتی ہے، ہاں اسکے منافع عام ہونے کی وجہ سے ہر فرد کو اس چیز سے نفع اٹھانے کا حق حاصل ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفع اٹھانے کی مدت تک اس شخص کو اس چیز پر ملکیت ناقص حاصل ہے۔

اب جہاں تک عاریت کا معاملہ ہے تو اس سے بھی مستعیر کیلئے صرف نفع اٹھانے کی اجازت کا حق ثابت ہوتا ہے دوسروں کو بھی اسے نفع اٹھانے کی اجازت دینے کا حق حاصل ہے اور دوسروں کو نفع اٹھانے کی اجازت دینے کا یہ حق صرف جمہور احناف اور فقہاء مالکیہ کے نزدیک ہے، البتہ کسی دوسرے کو کرایہ پر نہیں دے سکتا جب کہ فقہاء شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اعارہ عقد لازم ہے، لہذا صرف خود نفع اٹھا سکتا ہے دوسروں کیلئے اسکی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ اسے مالک اصلی کو نقصان پہونچانا لازم آئے گا۔

یہ بات بھی طے ہے کہ احناف کے نزدیک منافع میں وراثت کا حق نہیں ہے، کیونکہ وراثت کیلئے مال ہونا شرط ہے اور احناف کے نزدیک منافع مال نہیں ہے، لہذا منافع میں حق ارث بھی ثابت نہیں ہوتا ہے۔ اسی لئے موجر یا معیر کی موت سے حق منفعت بھی احناف کے نزدیک ختم ہوجاتا ہے کہ اب یہ چیز موجر اور معیر یعنی اصل مالک کے ورثاء کی ملک ہے وہ چاہیں تو حق منفعت مستعیر یا مستاجر کیلئے برقرار رکھ سکتے ہیں، ہاں جمہور فقہاء کے نزدیک اگر عاریت یا اجارہ کیلئے کوئی مدت متعین ہو تو مستعیر یا مستاجر کے ورثاء کیلئے مدت مکمل ہونے تک حق منفعت حاصل رہے گا (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲۸۹۹/۴۔ ۲۸۹۸)۔

ملکیت ثابت ہونے کیلئے اس مختصر سی تفصیل کے بعد حق اور ثبوت حق پر چند گذارشات پیش خدمت ہیں انشاء اللہ اسکے بعد ہمارے لئے اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ مسئلے پر گفتگو کرنا قدرے آسان ہوگا۔

کسی چیز کا حق ہونا الگ بات ہے اور کسی چیز پر حق ہونا بالکل الگ ہے جیسے کہ اللہ کا ہونا، فرشتوں کا ہونا، جنت وجہنم کا ہونا، رسولوں اور پیغمبروں کا ہونا، آسمانی صحائف کا ہونا یہ سب حق ہیں۔

دوسرا ہے کسی چیز پر حق ہونا، جیسے کہ مال مملوک پر حق ہونا، حق ولایت، حق حضانت، حق خیار کا ہونا حقوق دینیہ، جیسے بندوں پر اللہ کا حق نماز وروزہ وغیرھم عبادات کے ذریعہ۔ آداب کے قبیل سے بچوں پر والدین کی اطاعت کا حق، بیوی پر شوہر کی فرمانبرداری کا حق، رعایہ پر بادشاہ کی اطاعت ووفاشعاری کا حق، شوہر پر بیوی ونابالغ بچوں کے نفقہ کا حق وغیرہ

وغیرہ۔حقوق کا یہ باب بہت ہی مفصل ہے مگر ہم اس تفصیل میں سے کچھ مثالوں کا انتخاب کر کے اس نکتے پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کو اپنے اعضاء پر کس درجہ کا حق حاصل ہے۔حق شرعی ہے،حق عقلی ہے،حق طبعی ہے،حق اعتباری ہے،اس تعین سے پہلے ہم یہاں پرحق کی تین قسمیں بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔حق اللہ، ۲۔حق الانسان، ۳۔مشترک حق (یعنی اللہ کا بھی حق ہو اور بندے کا بھی حق ہو) لیکن کبھی اللہ کا حق غالب ہوتا ہے اور کبھی انسان کا شخصی حق غالب ہوتا ہے۔

۱۔**حق اللّٰہ** : وہ افعال واعمال جن کا مقصد تقرب الی اللہ ہو،اللہ کے احکام کی تعظیم،بجا آوری اور شعائر دین کی اقامت ہو،جیسے عبادات نماز،روزہ،زکوٰۃ،حج،جہاد،امر بالمعروف نھی عن المنکر،نذر ومنّت،ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا،ہر مہتم بالشان کام کی انجام دہی،گناہوں سے بچنا،برائیوں پر حدود نافذ کرنا،مختلف جرائم پر تعزیر کرنا،وغیرہ وغیرہ۔

حقوق اللہ میں نہ ہی تغییر جائز ہے نہ ہی معاف کرنا اور نہ ہی صلح یا کسی کے حق میں نزول وتبدیلی کی اجازت ہے اور نہ ہی ان میں وراثت جاری ہوگی،یعنی مورث کے اعمال خیر کی ادائیگی وارث پر واجب نہیں اور نہ مورث کے جرم کے بارے میں وارث سے کل قیامت میں پوچھا جائیگا۔

۲۔**انسان کا حق**: یعنی وہ حق جس میں شخص کی مصلحت کو دخل ہو،یہ عام ہو یا خاص،عام جیسے جسم،صحت،اعضاء جسم،بچوں و مال کی حفاظت،امن برقرار رکھنا،جرائم نہ کرنا،حکومت کے مفادات کو مدنظر رکھنا،**خاص** جیسے:اپنی ملکیت کو بچانا،بائع کا ثمن میں حق،مشتری کا مبیع میں حق،بیوی کا نفقے کیلئے شوہر پر حق،بچے کی پرورش میں ماں کا حق،باپ کو اپنی اولاد پر حقِ ولایت،ان جیسے حقوق میں صاحب حق کیلئے معاف کرنا بھی درست ہے،دوسرے کے حق میں دستبردار ہونا بھی جائز ہے اور اس میں وراثت بھی جاری ہوگی۔

۳۔**مشترک حق** :یعنی وہ حق جس میں اللہ کا حق اور انسان کا حق دونوں حق جمع ہو گئے ہوں،کبھی اللہ کا حق غالب ہو اور کبھی انسان کا حق غالب ہو،جیسے:مطلقہ کا عدت گذارنا،اس میں نسب کو خلط ملط ہونے سے بچانا اللہ کا حق ہے اور اپنے بچے کے نسب کو بچانا بندے کا حق ہے،لیکن اس میں اللہ کا حق غالب ہے یا جیسے انسان کا اپنی زندگی کی،اپنی عقل کی،اپنی صحت کی اور اپنے مال کی حفاظت کرنا،اس میں بھی دونوں حق جمع ہیں لیکن اللہ کا حق غالب ہے کہ انکی حفاظت کا فائدہ عام انسانوں کیلئے ہے،لیکن اللہ کا حق غالب ہونے کی وجہ سے اس میں صلح،معافی یا کسی کے حق میں نزول وغیرہ درست نہیں،یا جیسے مقتول کے ولی کیلئے قصاص کا حق ثابت ہے اس میں اللہ کا بھی حق ہے انسان کا بھی حق ہے،اللہ کا حق یہ ہے کہ ماحول کو گناہوں سے صاف کرنا،انسانیت کو گناہوں سے پاک ماحول وسماج فراہم کرنا،اور انسان کا حق یہ ہے کہ قصاص سے اسکا

غصہ ٹھنڈا ہوگا، قاتل کو مارنے سے اسکو سکون ملے گا، اس میں انسان کا حق اللہ کے حق کے مقابلے میں غالب ہے کیونکہ قصاص میں مماثلت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

"وَ کَتَبۡنَا عَلَیۡھِمۡ فِیۡھَا اَنَّ النَّفۡسَ بِا لنَّفۡسِ وَالۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ ...... الخ" (المائدہ:۴۵)۔

اس میں چونکہ بندے کا حق غالب ہے لہذا معافی اور صلح کی گنجائش ہے بلکہ قصاص میں تو معاف کرنا ہی مستحب ہے "فَمَنۡ عُفِیَ لَه مِنۡ اَخِیۡهِ شَیۡئٌ فَاتِّبَاعٌ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَیۡهِ بِاِحۡسَانٍ ذَالِکَ تَخۡفِیۡفٌ مِنۡ رَّبِّکُمۡ وَرَحۡمَةٌ" (البقرہ:۱۷۸)۔

ملکیت اور حق سے متعلق اس مختصر سی گفتگو کے بعد جب ہم اعضاء انسانی کے عطیہ کے سلسلے میں غور کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل امور بطور خلاصہ ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسان نے نہ ہی اپنے اعضاء بدن کو خریدا ہے۔

۲۔ نہ ہی اللہ نے یہ وقف عام کی قبیل سے دیے ہیں۔

۳۔ اور نہ ہی اعضاء بدن کا حصول بطور ھبہ ہوا ہے۔

۴۔ البتہ ایک انسان کو اعضاء بدن بطور عاریت و ودیعت دیئے گئے ہیں اور ان سے وہ خود جائز حدود میں نفع اٹھا سکتا ہے۔

۵۔ انسان کیلئے اسکے اعضاء حقوق کی قبیل سے مشترک حق کے دائرے میں آتے ہیں یعنی اعضاء پر حق اللہ بھی ہے حق العبد بھی ہے، حق اللہ کیلئے دلیل قرآن مقدس کی یہ آیت کریمہ بالکل واضح ہے۔

" اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ "۔

(اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے انکے جسم (اعضاء بدن) اور انکے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں) (سورہ توبہ:۱۱۱)۔

اور حق العبد ہونے کیلئے یہ حدیث مبارک جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا: "وان لعینک علیک حقاً و ان لنفسک علیک حقاً" (کہ اے انسان تمہارے اوپر تمہارے نفس کا تمہاری آنکھوں کا (وغیرہ وغیرہ) حق ہے)۔

لیکن جب حق اللہ اور حق العبد کی تفصیلات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو حق اللہ کا درجہ حق العبد کے مقابلے میں غالب نظر آتا ہے۔

بحث کی ایک جہت تو مندرجہ بالا تفصیلات کے دائرے میں آتی ہے جب کہ بحث کی دوسری جہت یہ بھی ہے کہ اگر انسان کو مالکانہ حیثیت کی قبیل سے ملکیت ناقص کے درجے میں حق اللہ اور حق العبد کے اشتراک کے باوجود یہ اجازت دیدی جائے کہ وہ اعضاء بدن پر کسی درجہ میں یہ اختیار رکھتا ہے کہ ان سے خود نفع اٹھائے اور احناف و مالکیہ کے مطابق عاریت والے قانون کی روشنی میں اصل چیز اور اسکے منافع کو نقصان پہونچائے بغیر دوسروں کیلئے بھی نفع کی اجازت دیدے تو ایسا کرنا درست ہے اور اگر بوقت ضرورت وحاجت شدیدہ اپنے آپکو نقصان پہونچائے بغیر اعضاء بدن کے استعمال کی وصیت کی اجازت دیدی جائے تو پھر چند شرعی موانع ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔

موانع: ۱۔ جب کوئی عضو جسم سے الگ ہوجاتا ہے تو وہ ناپاک ہوجاتا ہے، ۲۔ جسم سے الگ شدہ ان اعضاء کا استعمال قطعاً حرام ہے۔

۳۔ انسان کی عظمت وتکریم کے یہ خلاف ہے کہ اسکے اعضاء میں کتر بیونت یا کانٹ چھانٹ کی جائے اس میں انسانیت کی توہین وتذلیل ہے، انتقال کے بعد میت کا یہ حق ہے کہ اسکو دفن کیا جائے، اسی طرح اگر جسم سے کوئی عضو الگ ہوجائے تو اس عضو کا بھی یہ حق ہے کہ اسکو دفن کیا جائے، طرفین امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک تو جسم سے اس علحدہ شدہ حصہ کی اپنے ہی جسم میں پیوندکاری بھی نادرست ہے۔

"**فاذا انفصل استحق الدفن كله والاعادة صرف له عن جهة الاستحقاق**" (یعنی اس کٹے ہوئے حصے کو دفن کرنے کے بجائے اپنے ہی جسم میں دوبار استعمال کرنا اس حصے کو اسکے حق (دفن) سے روکنا ہے) (بدائع الصنائع: ۵/ ۱۳۲)۔

لیکن سیدنا امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کٹے ہوئے حصے کو دوبارہ اپنے ہی بدن میں استعمال کرنا بالکل درست ہے، اس میں اس جزء بدن کی نہ ہی اہانت ہے اور نہ ہی تذلیل، "**ولا اهانة فی استعمال جزء منه**" (بدائع الصنائع: ۵/ ۱۳۲)، اور فقہاء کے درمیان فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حرام اشیاء کا استعمال بطور علاج بعض کے نزدیک ناجائز اور بعض کے نزدیک بحالت مجبوری وضرورت درست ہے۔

حضور ﷺ نے خود اہل عرنیین کو صدقہ کے اونٹوں کا دودھ وپیشاب بطور علاج استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، ایک بار آپ ﷺ نے ایک صحابی کو سونے کی ناک بنانے کی اجازت دے دی، اسی حدیث کو بنیاد بنا کر بعض فقہاء نے سونے کا دانت استعمال کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل واضح حکم ہے کہ مردوں کیلئے سونا حرام ہے۔

نیز فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

"أكل خُرء الحمام في الدواء لا بأس به" (فتاویٰ ہندیہ:۳۵۵/۵)(دوا میں کبوتر کی بیٹ کھانے میں کوئی حرج نہیں)۔

جو حضرات اعضاء انسانی سے پیوند کاری کے سلسلے میں عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں انکے پیش نظر مذکورہ موانع کے ساتھ ساتھ اصل مانع حرمتِ آدمیت ہے اگر اسکی اجازت دیدی جائے تو انسان بکاؤ مال بن جائے گا اور اسکی خرید وفرخت شروع ہوجائے گی۔

قرآن کریم نے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ" (بنی اسرائیل:۷۰) کہہ کر انسان کی من حیث الانسان تکریم وتحریم کا اعلان فرمایا ہے، اسی لئے فقہاء نے انسان کے بدن کے کسی بھی جزء کو قابل انتفاع نہیں مانا ہے۔

" **وشعر الانسان والانتفاع به أى لم يجز بيعه والانتفاع به، لأن الآدمى مكرم غيرمبتذل فلا يجوزأن يكون شئ من اجزائه مهانا مبتذلاً**"۔

(انسان کے بال کو نہ ہی بیچنا جائز ہے اور نہ ہی اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، اس لئے کہ ہر انسان قابل عزت وتکریم ہے، نہ کہ کسی چیز کی طرح قابل استعمال ہے، لہذا یہ کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے کہ اسکے کسی بھی جزء بدن کو استعمال کر کے ذلیل کیا جائے)۔

خیال رہے یہ عزت وکرامت ایک انسان کو حاصل ہے، لہذا مردہ ہو یا زندہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اسلئے جس طرح زندہ انسان کا کوئی عضو قابل فروخت وانتفاع نہیں ہے مردہ انسان کے بھی کسی عضو کو کسی ایسے مقصد کیلئے استعمال کرنا درست نہیں ہونا چاہیے۔

حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:" **كسر عظم الميت ككسر عظم الحى**" (نیل الاوطار)(کسی میت کی ہڈیاں توڑنا اسی طرح ممنوع ہے جس طرح زندہ رہتے ہوئے کسی شخص کی ہڈیاں توڑنا منع ہے)۔

حضور ﷺ کی اس حدیث مبارک کا ایک ایک جز بکمالہ آج بھی اپنے متدل پر مکمل طور سے قائم ودرست ہے، کسی بھی انسان کی تذلیل تو دور اسکے کسی جزء بدن کی توہین بلکہ اس کا شبہ بھی ناجائز اور حرام ہے، بہت سارے دہشت پسند اور ظالم لوگ آج بھی کھلم کھلا اس گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں پس اللہ ہی اہل ایمان کا حافظ وناصر ہے۔

انسانی کرامت وتعظیم پر وارد آیات واحادیث پر بنظر غائر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ ہر وہ عمل جس سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہو، ہر حال میں اور ہر زمانے میں مہذب سماج میں ناجائز ہی قرار پایا ہے، لیکن کس

حرکت سے انسانیت ذلیل ٹھہرتی ہے اور کونسا عمل انسانیت کیلئے باعث افتخار واعزاز قرار پاتا ہے، اس میں عرف اور زمانے کا بڑا دخل ہے، انسان بکاو مال بن جائے، انسانیت جس حرکت سے شرمسار ہوجائے ناجائز اور حرام ہی ہے لیکن ایک انسان کسی نقصان وتوہین کے بغیر انسانیت کے احترام میں کسی ضرورت منداور محتاج کے کام آئے نہ صرف بہتر و درست ہے بلکہ یہ شخص اور اسکا یہ عمل قابل اعزاز و اکرام بھی ہے۔ پہلے زمانے میں ایک انسان کے عضو سے دوسرے انسان کو مہذب طریقے سے فائدہ پہونچانا ممکن نہیں تھا، نہ ہی میڈیکل سائنس اور نہ ہی شعبہ جراحی نے اس قدر ترقی کی تھی جبکہ موجودہ زمانے میں ایسا کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ میڈیکل شعبہ اس قدر ترقی پذیر ہے کہ روزانہ بنیادوں پر ناقابل یقین حد تک عمل جراحی کا شعبہ آگے بڑھ رہا ہے اب تو آپریشن میں چیر پھاڑ کی دنیا سے باہر نکل کر ٹیکنکل انداز سے جراحی کی جاتی ہے، لہذا اب نہ ہی اس میں کسی کی توہین وتذلیل ہے اور نہ ہی کسی کا نقصان اور ضرر ہے بلکہ عضو دینے والا قابل افتخار واعزاز قرار پاتا ہے اور بالفرض اگر ہم یہ کہیں کہ اس میں ضرر تو ضرور ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضرر کثیر سے بچنے کیلئے ضرر قصیر قابل برداشت ہے۔

علامہ سمرقندیؒ ایک مقام پر اسطرح کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اگر کوئی حاملہ مرجائے اور اسکے پیٹ میں بچہ ہو جو حرکت کرتا ہو، اگر غالب گمان یہ ہو کہ بچہ زندہ ہے اور اتنی مدت کا ہے جس میں بچہ عام طور پر زندہ رہ جاتا ہے تو اس حاملہ کا پیٹ چاک کیا جائے گا، اس لئے کہ اس میں ایک انسان کی زندگی کو بچانا ہے اور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلے میں زیادہ آسان یہ ہے کہ آدمی کی تعظیم وتکریم کا تقاضا ہی چھوڑ دیا جائے۔

"لو ان حاملاً ماتت وفی بطنها ولد یضطرب فان کان غالب الظن انه ولد حی وهو فی مدة یعیش غالباً فإنه لیشق بطنها لان فیه احیاء الآدمی فترک تعظیم الآدمی أهون من مباشرة سبب الموت" (تحفۃ الفقہاء: ۳/ ۳۴۳)۔

علامہ سمرقندیؒ کی اس گفتگو سے اس مسئلے کا سمجھنا بہت حد تک آسان ہوجاتا ہے، اکرامِ آدمیت کی عظمت اپنی جگہ، لیکن جب کسی کی جان بچانا مقصود ہو تو پھر اس احتیاط اور تدبیر کے ساتھ کہ ہمارے فیصلے سے انسان بکاؤ مال نہ بن جائے اور اسکی حرمت متأثر نہ ہو یہ فتویٰ درست قرار پائے گا کہ میت کی تعظیم وتکریم کے ساتھ ساتھ اگر کسی ممکنہ عطیہ وعمل سے دوسرے کی جان بچانا اور اسکے کسی جسمانی نقص کو دور کرنا متوقع ہو تو پھر یہ عطیہ کرنا اور اس موہوبہ عضو سے دوسرے کا نفع اٹھانا شرعاً جائز ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فقہاء شوافع اور بعض فقہاء احناف نے ایک مضطر اور بے حال آدمی کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کیلئے کسی مردہ انسان کا گوشت کھا سکتا ہے، اس لئے کہ زندہ کی حرمت مردہ کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

"وقال الشافعی و بعض الحنفیة یباح و هو اولیٰ لأن حرمة الحی اعظم" (المغنی لابن قدامہ: ۹/ ۳۳۵)۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی مالکیؒ نے بھی فقہاء شوافع کی رائے کو صحیح قرار دیکر مضطر کیلئے مردہ انسان کا گوشت کھانا جائز قرار دیا ہے،

"**الصحیح عندی أن لایاکل الآدمی إلا اذا تحقق أن ذالک ینجیه و یحییه**" (الجامع لاحکام القرآن: ۲/۲۲۹)۔

خلاصئہ بحث :

اس ساری گفتگو کے بعد یہ بات تقریباً بالکل صاف ہوگئی کہ:

۱- ایک انسان کو اپنے اعضاء بدن پر ودیعت کے قبیل سے ہونیکی وجہ سے ملکیت ناقص حاصل ہے۔

۲- ایک انسان کو اپنے اعضاء بدن پر حق کے اعتبار سے تیسری قسم یعنی مشترک حق کا درجہ حاصل ہے۔

۳- ہلکے نقصان کو برداشت کرتے ہوئے ایک انسان کا عضو دوسرے کو منتقل کرنا تب جائز ہوگا جبکہ دوسرے کا بچنا قریب قریب طے ہو۔

۴- یہ بھی بالکل واضح ہے کہ اگر عضو کی منتقلی سے ضرر شدید لاحق ہو اور واہب کی زندگی کو خطرہ شدید لاحق ہو تو پھر منتقلی اور اعضاء کی پیوندکاری کا عمل جائز نہیں ہوگا۔

۵- یہ بھی طے ہے کہ موجودہ زمانے میں اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے اکرامِ آدمیت اور خدمتِ آدمیت کے جذبے سے سرشار ہوکر اپنا کوئی عضو بعد از مرگ عطیہ کرنا چاہے تو ایسا کرنا جائز ہے کہ اس عمل سے عضو دینے والے کی توہین نہیں ہوتی بلکہ موجودہ عرف میں یہ اس کیلئے باعث تعظیم ہے۔

۶- اگر بالفرض کسی درجہ میں توہینِ میت کا تصور بھی ہوتا ہو تو پھر ایک انسان کی زندگی بچانے یا زندہ انسان کے کسی نقص شدید کو دور کرنے کیلئے ہلکے درجے کی توہینِ میت قابل برداشت اور درست ہے۔

۷- جس طرح سے مسلمان میت کے عضو کو کسی دوسرے مسلمان میں پیوند کرنا درست ہے، اسی طرح بوقت ضرورت ایک کافر میت کے عضو کو بھی مسلمان مضطر کے جسم میں پیوند کرنا درست ہوگا، کہ کافر کی نجاست جسمانی اور ظاہری نجاست نہیں مانی گئی ہے بلکہ وہ باطنی اور عقیدے کی نجاست شمار کی گئی ہے، لہٰذا اگر کسی کافر کا کوئی عضو مسلمان کے جسم میں پیوند کیا جاتا ہے تو شرعاً یہ درست ہوگا، ہاں ظاہری طور پر یہ صرف مستحب قرار پائے گا کہ کسی مسلمان کا کوئی عضو ہی کسی دوسرے مسلمان میں پیوند کیا جائے۔

۸-اگرکوئی انسان یہ وصیت کرتا ہے کہ مرنے کے بعد میرا فلاں عضو پیوند کاری کیلئے استعمال کریں تو وارثین کیلئے اس وصیت پرعمل کرنا لازم نہیں ہے کہ شرعاً یہ وصیت بایں طور معتبر نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کا مالک کلی نہیں ہے لیکن وارثین کیلئے اس وصیت پرعمل کرنا جائز ہوگا اور اگر وہ اس غیر شرعی اور غیر لازم وصیت پرعمل کرتے ہیں تو وہ اس میں گنہ گار نہیں ہونگے۔

☆☆☆

اعضاء واجزاءِ انسانی کا عطیہ اور اسلام

مفتی آفتاب عالم غازی☆

۱- کسی مسلمان یا غیر مسلم کو ضرورت کے وقت خون کا عطیہ دینا:

(الف): خون کا عطیہ کسی کو دیا جاسکتا ہے یا نہیں اس کا فقہی حکم جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے استعمال کا حکم معلوم ہو، چنانچہ خون کے استعمال کے جواز میں بظاہر دو چیزیں مانع ہوسکتی ہیں: ایک اس کا بدن انسانی کا جزو ہونا اور دوسرے اس کا ناپاک ہونا، ان دونوں موانع پر اگر غور کریں تو دوسرے مانع کے سلسلہ میں شریعت کی متعدد نظیریں ایسی ملتی ہیں جن میں علاج کے طور پر ناپاک چیزوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، جیسے اہل عرینہ کے لئے پیشاب سے علاج کی اجازت: "**وأن یشربو من أبو الھا وألبانھا**" (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۳)، اور اس کی متعدد نظیری فقہ کی کتابوں میں بھی مذکور ہیں، لہذا خون سے علاج جائز ہوگا اور جس چیز سے علاج جائز ہے، اس کا عطیہ بھی جائز ہوگا: "**ان بعض الفقھاء نصوافی کتبھم علی جواز التداوی بالدم عندالحاجة الیه، والحاجة موجودة ھنا، بل ھی أعلی مراتب الحاجة الموجبة للترخیص وھی الضرورة**" (البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا: ۱/۴۲۷)۔

رہا دوسرا مانع یعنی خون کا بدن انسانی کا جزو ہونا ہے، تو اس کے لئے بھی شریعت میں نظیر ملتی ہے کہ دودھ بھی بدن انسانی کا جزو ہے، لیکن پھر بھی اس کے استعمال کی اور اس سے علاج کی اجازت دی گئی ہے، چنانچہ معاصر علماء نے بھی اس کے جواز ہی کا قول اختیار کیا ہے: "**والمقرر أنه لامانع من ھذاالتبرع لانقاذ الغیر فی حالة المرض الذی یستدعی اسعافه الفوری**" (فتوی رئیس لجنۃ الفتوی بالأزہر، ۱۷ فروری ۱۹۸۹ء)، اور شیخ عبدالناصر بن خضر میلا د لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں فقہ کے قاعدہ: "**الضرورات تبیح المحظورات**" (الأشباہ والنظائر لابن نجیم: ۱/۷۳) کے پیش نظر اسی رائے پر فتوی دیا جائے گا: "**وھذاماستقر علیه الرأی واعتبر مسلکاللفتاوی فی ھذا العصر، إعمالاللقاعدة: الضرورات تبیح المحظورات**" (البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا: ۱/۴۲۵)۔

☆ معہد الطیبات، نرسری روڈ، کرم گنج، دربھنگہ، بہار۔

جواز کے دلائل:

ضرورت کے وقت خون کا عطیہ جائز ہے،اس کی درج ذیل دلیلیں ہیں:

(۱): خون بدنِ انسانی کا جز ہے،اس حیثیت سے اس کی مثال عورت کے دودھ کی ہوگی،جس کا استعمال علاج کے لئے فقہاء نے جائز لکھا ہے (دیکھئے: فتاوی ھندیہ: ۴/۱۱۲، ط: مصر)،اور جن صورتوں میں خون کا ''استعمال'' جائز ہے،ان صورتوں میں اس کا ''عطیہ'' بھی جائز ہوگا،یعنی جس طرح بوقت ضرورت دوسرے کی اولاد کو دودھ پلانا جائز ہے،اسی طرح ضرورت کے وقت خون کا عطیہ دے کر جان بچانا بھی جائز ہے،بلکہ بعض اوقات حالات کے لحاظ سے ضروری بھی ہوجاتا ہے۔

(۲): خون کی مجبوری دودھ کے جواز کی مجبوری سے بڑھ کر ہے،کیوں کہ دودھ کی ضرورت کبھی کسی جانور جیسے بکری،گائے وغیرہ کے دودھ سے بھی پوری کی جاسکتی ہے،جیسا کہ آج کل بچوں کے دودھ کی زیادہ تر ضرورت ڈبے کے دودھ سے پوری ہوتی ہے،جب کہ خون کی ضرورت انسان کے خون سے ہی پوری ہوسکتی ہے،اس کی دوسری کوئی متبادل صورت نہیں ہوتی ہے،اس لئے اس میں دودھ سے بڑھ کر جواز حاصل ہوگا۔

(۳): خون ایسی چیز ہے جو کسی کو دینے کے بعد پھر دوبارہ اس کا حصول ہوجاتا ہے،کیوں کہ بدن میں بقدر ضرورت نیا خون پیدا ہوتا رہتا ہے،لہذا اس کے دینے میں کوئی خاص حرج نہیں ہوگا،چنانچہ یورپ کے بعض فقہی سیمیناروں میں اس کے جواز کی ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے: ''کسی انسان کا عضو دوسرے انسان کے اندر منتقل کرنا ایسی صورت میں جائز ہوگا،جب کہ وہ ازخود تیار ہوتا رہتا ہو،جیسے خون اور جلد اس شرط کے ساتھ کہ دینے والا کامل اہلیت رکھتا ہو اور معتبر شرعی شرائط ملحوظ رکھی جائے'' (فتاوی یورپ: ۹۵، اردو ترجمہ)۔

(۴): جس طرح دودھ بدن کے ایک مخرج سے نکلتا ہے اور دوسرے کے بدن میں پہنچتا ہے،اسی طرح خون بھی بدن میں کسی طرح کے کاٹ چھانٹ کے بغیر انجکشن سے نکالا جاتا ہے،اس لئے جس طرح دودھ میں شریعت نے گنجائش رکھی ہے،اسی طرح خون میں بھی ضرورت کے وقت گنجائش ہوگی۔

(۵): اس میں اہانت کا پہلو بھی نہیں ہے،اگر اہانت ہوتی تو فصد کھلوانا (پچھنے لگوانا) جائز نہیں ہوتا،لہذا جس طرح اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے ضرورت کے وقت فصد کے ذریعہ خون نکالنے کی گنجائش ہے،اسی طرح دوسرے بھائی کی صحت کی حفاظت کے لئے بھی ضرورت کے وقت خون دینے کی اجازت ہوگی،اور آج کے عرف میں اسے توہین نہیں بلکہ تکریم کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے کہ فلاں مریض کو فلاں فلاں لوگوں نے خون کا عطیہ دیا۔لہذا موجودہ زمانہ کے عرف کو دیکھتے ہوئے اس کے جواز میں کسی طرح کا کلام نہیں ہونا چاہئے۔اور اگر توہین کا پہلو بھی ہوتا،تب بھی یہ جائز ہوتا،کیوں کہ علاج کے لئے

بسااوقات بعض توہین کے پہلوکوبھی گوارا کرلیاجاتا ہے ،جیسے پیشاب پینا انسانیت کی توہین ہے ،مگرناگزیرحالات میں بطورعلاج اس کے استعمال کی اجازت ہے:"وأن یشربوا من أبوالھاوألبانھا"(صحیح بخاری،حدیث نمبر:۲۳۳)،اسی طرح مردارکھانابھی انسانیت کی توہین ہے ،مگرحفظ نفس کے لئے قرآن نے اس کی اجازت دی ہے:" اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَاعَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"(البقرہ:۱۷۳)،معلوم ہوا کہ اضطراری حالت میں" تکریم انسانی" سے زیادہ" نفس انسانی" کالحاظ ضروری ہے۔

دودھ کے جواز میں بعض لوگوں کویہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ بچہ کی فطری غذاہے، لہذا اس پرخون کوقیاس نہیں کیاجاسکتا،لیکن فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر بڑوں کوبھی دوا کے طور پرخاتون کادودھ پینے یااستعمال کرنے کی ضرورت پڑگئی تواس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے:"لابأس بأن یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشربہ للدواء"(فتاوی ھندیہ:۵؍۳۵۵،الباب الثامن عشرفی التداوی والمعالجات)،اب مردوں کے سلسلہ میں تونہیں کہاجاسکتا ہے کہ ان کے حق میں عورتوں کادودھ ان کی فطری غذاہے،لہذاجس طرح دودھ کودوا کے طورپراستعمال کی اجازت ہے،اسی طرح خون کوبھی علاج کے طورپراستعمال کی اجازت ہوگی۔

خون اوردودھ میں اتنافرق ہے کہ دودھ بدن میں رکھاہی اس لئے گیاہے کہ وہ جسم سے خارج ہواوراس کااستعمال کسی اورانسان کے لئے ہو،مگرخون کایہ مقصدنہیں ہوتاہے،لیکن اتناضرورہے کہ ضرورت کے وقت صحت کی بقاکے لئے خون کوبھی بدن سے نکالنے کی اجازت ہے،جیسا کہ پہلے فصد کے ذریعہ نکالا جاتا تھا،لہذافقہی اعتبار سے دونوں کے حکم میں اتنافرق رکھناکافی ہوگاکہ کہ دودھ پرقیمت لی جاسکتی ہے(جیسا کہ اس کاجواز کتب فقہ میں مصرح ہے)اورخون کے عوض قیمت لیناجائزنہیں ہوگا۔

جواز کی شرائط:

دوسروں کوخون کاعطیہ دینے کے لئے درج ذیل شرطیں ہوں گی:

۱):ایک یہ کہ ضرورت ثابت ہو۔

۲):ضرورت کے بقدرہی خون لیاجائے،کیوں کہ فقہ کاقاعدہ ہے:"الثابت باالضرورۃ یتقدربقدرالضرورۃ"(القواعدالفقھیہ:۱؍۲۸۱)اور"ماأبیح للضرورۃ یقدربقدرھا"(حوالہ سابق)،ہاں اگراس میں نادانستہ کمی بیشی ہوگئی تواللہ تعالی معاف فرمائے گا،ارشادالہی ہے:"فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ

اللّٰہَ غَفُوْر'' رَّحِیم'' (المائدہ:۳)۔

۳): ماہر ومعتبر ڈاکٹر کی تصدیق ہو، چنانچہ ماضی قریب کے جید عالم دین اور فقیہ مولانا مفتی شفیع صاحب نے بھی اس کو جائز کہتے ہوئے لکھا ہے: ''جب خون دینے کی ضرورت ہو، یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، تو خون دینا جائز ہے اور جب ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دینے کی (ضرورت نہ ہو، بلکہ) حاجت ہو، یعنی مریض کی ہلاکت کا خطرہ تو نہ ہو، لیکن ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دیئے بغیر صحت کا امکان نہ ہو اُس وقت بھی خون دینا جائز ہے'' (جواہر الفقہ :۷/۴۶) اور شیخ محمد بن مختار لکھتے ہیں: **''فلاحرج علی المریض ولاعلی الطبیب ولاعلی المتبرع نظر الحالۃ الضرورۃ الداعیۃ الی ھذاالنقل''** (احکام الجراحۃ الطبیۃ، ص:۵۸۰)۔

۴): خون دینے سے خود خون دینے والے کی صحت کو خطرہ کا اندیشہ نہ ہو، ورنہ یہ اپنی ہلاکت کے قبیل سے ہوگا، جس کی اجازت نہیں ہوگی، اللہ پاک کا ارشاد ہے: **''لاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ''** (البقرۃ:۱۹۵)۔

۵) خون کا مالی معاوضہ نہ لیا جائے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے: **''نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ثمن الکلب وثمن الدم''** (صحیح بخاری، حدیث نمبر:۲۰۸۶)، نیز اس میں انسان کے جزو کی توہین بھی ہے: **''تقرر عدم جواز بیع الدم لکرامۃ الانسان''** (البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا:۱/۴۲۹، از: عبدالناصر بن خضر میلاد)۔

البتہ ضرورت کے وقت اگر بلاعوض نہیں ملے تو خریدنے کی اجازت ہوگی، جیسا کہ علامہ نووی نے اس کی صراحت کی ہے: **''کمایحرم أخذالأجرۃ فی ھذایحرم اعطاؤھا، وانمایباح الاعطاء دون الأخذ فی موضع الضرورۃ''** (روضۃ الطالبین:۵/۱۹۴) گویا خون کا معاوضہ ''لینا'' جائز نہیں ہے، لیکن ضرورت کے وقت معاوضہ ''دینا'' جائز ہوگا، البتہ خون دینے والے کی صحت متأثر ہونے کی صورت میں خون دینے کے بعد غیر مشروط طور پر غذا وغیرہ فراہم کی جاسکتی ہے، جس کو شرعاً معاوضہ نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ معاوضہ مشروط ہوتا ہے: **''وجاء فی فتوی رئیس لجنۃ الفتوی بالأزھر الشریف أنہ: ''لامانع من أن یعطی المتبرع بالدم المقابل فی صورۃ أغذیۃ تعوضہ عن الدم المأخوذمنہ، وذلک بطبیعۃ الحال بعدأخذالدم منہ ولیس قبلہ، فضلاعن أنہ لایشترط قدرامعیناوإلاصار بیعا''** (فتوی رئیس لجنۃ الفتوی بالأزھر، ۱۹۸۹ء)۔

(ب): خون دینے کا جواز انسانیت کی بنیاد پر ہے نہ کہ مسلمانیت کی بنیاد پر، کیوں کہ اللہ تعالی کے ارشاد: **''وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ''** (الاسراء:۷۰)۔ میں سارے اولاد آدم کی تکریم کی خبر ہے، لہذا اس میں مسلم غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہوگا، اور فرق کرنا انسانی ہمدردی کے خلاف تصور ہوگا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالات جنگ کے علاوہ میں غیر مسلم

بھائیوں کو بھی جان کا تحفظ فراہم کیا ہے۔

البتہ جس طرح غذاؤں کا اثر انسان کے جسم پر پڑتا ہے اسی طرح اس کی روح پر بھی پڑتا ہے اور تمام حرام غذاؤں کی حرمت کی بنیاد دراصل وہی برا اثر ہے، جس کی بنیاد پر اس کی ممانعت آئی ہے، لہذا بدن میں جب خون داخل کیا جائے گا تو اس خون کا اثر بھی جسمانی طور پر اس کو صحت بخشے گا، لیکن اگر کافر کا خون ہے تو روحانی طور پر کچھ نہ کچھ اس کا اثرِ بد ضرور پڑے گا، اس لئے کافروں سے خون لینے میں احتیاط بہتر معلوم ہوتا ہے، لہذا کوشش یہ کرنی چاہئے کہ مسلمانوں ہی کا خون لیا جائے، چنانچہ جواہر الفقہ میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ''کسی غیر مسلم کا خون مسلم کے بدن میں داخل کرنا جائز ہے یا نہیں؟'' لکھا ہے کہ ''نفس جواز میں کوئی فرق نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کافر یا فاسق فاجر انسان کے خون میں جو اثراتِ خبیثہ ہیں ان کے منتقل ہونے اور اخلاق پر اثر انداز ہونے کا خطرہ قوی ہے، اسی لئے صلحاء امت نے فاسق فاجر عورت کا دودھ پلوانا بھی پسند نہیں کیا ہے، بناء علیہ کافر اور فاسق فاجر انسان کے خون سے تابمقدور اجتناب بہتر ہے'' (جواہر الفقہ: ۴/۷/۷)، اور اگر دینا ہو تو مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہ کرے، الا یہ کہ اس شخص سے اجتماعی طور پر مسلمانوں کو شر کا اندیشہ ہو۔

۲- بلڈ بینکوں میں خون کا عطیہ دینا:

خون دینے کے لئے ضرورت کا تحقق ضروری ہے، اگر یہ ضرورت ثابت ہو جائے تو خون دیا جا سکتا ہے، اور اس میں کسی فرد کو مالک بنا دینا، یا خاص کر اس کے حوالے کرنا ضروری نہیں ہے، اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ خون دینے والے کو اطلاع ہو کہ اس کا خون کس کے بدن میں استعمال کیا جا رہا ہے، لہذا بلڈ بینکوں میں خون کا عطیہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا، بلکہ بسا اوقات ضرورت اسی وقت پوری ہو سکتی ہے، جب کہ پہلے سے خون مہیا ہو، ورنہ بروقت مطلوبہ گروپ کا خون حاصل کرنے میں حرج لازم آئے گا۔

اس صورت میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ پہلے سے خون دینے میں بظاہر فی الحال ''ضرورت'' کا تحقق نہیں ہے، اور جب ضرورت کا تحقق نہیں ہے تو قبل از ضرورت خون کا عطیہ کیسے جائز ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر گروپ کا خون پہلے سے اکٹھا کر کے رکھنا بھی ایک ضرورت ہے، جیسا کہ تجربہ شاہد ہے، ورنہ اس میں حرج لازم آئے گا اور متعدد لوگ بروقت مطلوبہ گروپ کا خون نہ مل سکنے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

(۳) بلڈ بینکوں کا قیام:

جب بلڈ بینکوں میں خون دینے کا جواز ثابت ہو گیا تو بلڈ بینکوں کا قیام بھی جائز ہوگا، بلکہ ایسا اقدام مستحسن ہوگا، اس

لئے کہ غیروں کے قائم کردہ بلڈ بینکوں کی بنسبت اس میں شرعی اصولوں کا زیادہ لحاظ کیا جاسکے گا۔

نیز غیر مسلم اور فاسق کے خون کے غلط روحانی اثرات سے بھی حفاظت ہوسکے گی، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اس میں بھی صرف دوسروں پر امید کی نظر نہ رکھیں، بلکہ اس اقدام کے ذریعہ اپنی قوم کو خود کفیل بنائیں۔

(۴) اگر مطلوبہ گروپ کا خون ایک ہی شخص کے پاس ہو؟

خون دینا اصل میں مندوب ہے، لیکن اگر ایک ہی کے پاس ہو تو گویا اس کی جان اس ایک شخص کے عطیہ پر موقوف ہے، لہٰذا اس پر خون دینا واجب ہوگا، یعنی جب ضرورت کے وقت اس کا جواز ثابت ہوگیا تو اضطرار کے وقت خون دینا واجب ہوجائے گا، جیسا کہ فقہاء مالکیہ میں علامہ خرشی نے صراحت کی ہے کہ ہبہ تو اصلاً مستحب ہے، لیکن یہ مضطر کے لئے واجب ہوجاتا ہے: ''**قوله: الندب لذاتها: أى وقديعرض لهاالوجوب كالهبة للمضطر**'' (شرح مختصر خلیل للخرشی: ۷/۱۰۱، باب الھبۃ والصدقۃ والعمری)۔

غرض جس کو خون دیا جارہا ہے اگر اس کی صحت کے لئے خون کی ''حاجت'' ہو تو دینا مستحب ہوگا اور اگر جان بچانے کے لئے خون کی ''ضرورت'' ہو اور مطلوبہ خون صرف اسی کے پاس ہو اور اس سے خون دینے والے کی خود کی صحت زیادہ متأثر نہ ہو رہی ہو تو ایسی حالت میں خون دینا واجب ہوگا، جیسے اگر کوئی بچہ دودھ کے بغیر مر رہا ہو تو اس کو دودھ پلانا واجب ہوجاتا ہے۔

(۵) مردہ کا جگر نکال کر دینا یا پہلے سے عطیہ کرنا:

اس زمانہ میں مردہ کے جگر سے علاج متعارف ہوگیا ہے اور اس کے ذریعہ بعضوں کی جان کی حفاظت ہوجاتی ہے، فقہی اعتبار سے یہ درج ذیل شرطوں کے ساتھ جائز ہوگا:

(۱): دوسرے کے عضو کا اور خاص کر مردہ کے عضو کے استعمال کے عام حالات میں حرام ہونے پر کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن اگر ''ضرورت'' ہو، یعنی حرام کا استعمال نہ کرنے پر موت یا قریب الموت ہوجانے کا اندیشہ ہو اور اس کے علاوہ جان بچانے کی کوئی اور صورت نہ ہو تو یہ صورت ''اضطرار'' کی ہوگی اور اِس صورت میں اعضاء انسانی سے استفادہ جائز ہوگا، جیسا کہ قرآن میں اس کی اجازت دی گئی ہے: ''وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ'' (الانعام :۱۱۹)، چنانچہ شیخ عبدالناصر فرماتے ہیں: ''**ان هذه الآيات الكريمات قددلت على استثناء حالة الضرارة من التحريم المنصوص عليه فيها، فالانسان المريض إذا احتاج الى نقل العضو، فانه سيكون فى حكم المضطر، لأن حياته مهددة بالموت، واذاكانت حالته حالة الاضطرار، فانه يدخل فى عموم الاستثناء**

الوارد فی ھذہ الآیات ،ویباح نقل العضو الیه‘‘(البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا:۴۲۱/۱،المطلب الاول:حکم نقل أعضاء الانسان،از:عبدالناصر بن خضر میلاد)،لہذا اگر انسانی عضو کے علاوہ کسی دوسری چیز سے علاج ہوسکتا ہوتو انسانی عضو کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی:’’**أن لاتوجد میتة أخری غیرمیتة الآدمی ،وإلا فلایحل الانتفاع بمیتة الآدمی**‘‘ (البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا:۱/۴۱۸)۔

(۲):دوسری شرط یہ ہے کہ جان جانے کا یہ خطرہ محض موہوم نہ ہو، بلکہ کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کے کہنے کی بنا پر عادۃً یقینی ہو،یعنی یہاں’’اضطرار‘‘ کا فیصلہ بھوک کی طرح’’احساس‘‘ سے یا اپنی ذاتی رائے سے نہیں ہوگا، بلکہ ماہر ومعتمد ڈاکٹر کے ذریعہ ہوگا،چنانچہ امام قرطبی نے ابن عربی مالکی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر آدمی کے گوشت سے جان کا بقا ثابت ہوجائے تبھی اس کو کھانے کی اجازت ہوگی:’’**قال ابن العربی:الصحیح عندی ألایأکل الآدمی إلا إذاتحقق أن ذلک ینجیه ویحییه**‘‘(الجامع لأحکام القرآن:۲/۲۲۹)۔

(۳):تیسری شرط یہ ہے کہ اس حرام کے استعمال سے جان بچ جانا بھی کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کی تجویز سے عادۃً یقینی ہو،چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:’’کسی حرام چیز کا حلال ہونا تین شرطوں کے ساتھ مشروط ہے(جو ابھی مذکور ہوئیں)ان تینوں شرطوں کے ساتھ باتفاق فقہائے امت استعمال حرام جائز ہوتا ہے(جواہر الفقہ:۷/۴۷)۔

البتہ مذکورہ شرطوں میں’’یقینی‘‘ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سے بیماری کا ازالہ فنی طور پر یقینی ہو،جس کو فقہ کی اصطلاح میں’’غلبۂ ظن‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں،یعنی علاج کے جائز ہونے کے لئے صحت کا غالب گمان کافی ہوگا،کیوں کہ ڈاکٹر حضرات کوئی عالم الغیب تو ہوتے نہیں ہیں،جو یقین کے ساتھ کوئی بات کہنے کے موقف میں ہوں،بلکہ ان کا علم تجربہ پر مبنی ہوتا ہے، لہذا اگر ان کے تجربہ اور فن کے مطابق صحت کا ظنِ غالب ہوتو جواز ورخصت کے لئے کافی ہوگا،چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:
’’**قد علمت أن قول الأطباء لایحصل به العلم ،والظاهر أن التجربة تحصل غلبة الظن دون الیقین ، الا أن یریدوابالعلم غلبة الظن ،وهوشائع فی کلامهم**‘‘(ردالمحتار:۱/۲۱۰،کتاب الطہارۃ،فروع:التداوی بالمحرم)اور فقہ میں اس کی نظیر بھی ملتی ہے،چنانچہ علامہ علاؤالدین سمرقندی نے لکھا ہے کہ اگر حاملہ عورت مرگئی ہو اور اس کے پیٹ میں بچہ کے زندہ ہونے کا غالب گمان ہو تو اس بچہ کی جان کی حفاظت کے لئے اس عورت کے پیٹ کو چاک کرنا جائز ہوگا:’’**ولو أن حاملاماتت وفی بطنهاولدیضطرب ،فان کان غالب الظن أنه ولدحی وهوفی مدة یعیش غالبافانه یشق بطنها،لأن فیه احیاء الآدمی بترک تعظیم الآدمی وترک التعظیم أهون من مباشرة سبب الموت**‘‘(تحفۃ الفقہاء:۵/۳۴۵،کتاب الاستحسان)۔

(۴): چوتھی شرط یہ ہے کہ حتی الوسع مردہ کی توہین سے بچا جائے، یعنی ایسی صورت اختیار کی جائے جس میں مردہ کی تکریم کا پہلو متأثر نہ ہو۔

(۵): اور پانچویں شرط یہ ہے کہ مردہ سے پیشگی اس کی زندگی میں ہی اجازت لی گئی ہو، ورنہ مرجانے کے بعد ورثہ کی اجازت لی گئی ہو اور اگر میت لاوارث ہو تو حکومت وقت سے اس کی اجازت لی گئی ہو۔

جواز کے دلائل:

(۱): اللہ تعالی نے کھانے پینے کی چیزوں میں ایثار اور اپنے بھائی کو ترجیح دینے والوں کی تعریف کی ہے: ”وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَة“ (الحشر:۹)، جب کہ یہ چیزیں اعضاء کی بنسبت بہت معمولی ہیں تو اگر کوئی انسان اپنا عضو دوسرے بھائی کو ڈونیٹ کردے تو یہ عمل تو اور بھی قابل تعریف ہونا چاہئے، کیوں کہ کھانے پینے کی چیزوں سے کسی بھائی کی ”بھوک مٹتی“ ہے، مگر عضو کے عطیہ سے کسی بھائی کی ”جان بچتی“ ہے اور ظاہر ہے کہ جان بچانا بھوک مٹانے سے زیادہ قابل تعریف بات ہے: ”**قالوا بأن الله تعالى امتدح من آثر أخاه على نفسه بطعام أو شراب أو مال هو أحق به، فاذا كان ذلک فى هذه الأمور اليسيرة، فكيف بمن آثر أخاه بعضو أو جزء هلكى ينقذه من الهلاک المحقق، لاشک أنه أولى وأحرى بالمدح والثناء، ومن ثم يعتبر فعله جائزا أو مشروعا**“ (بہ حوالہ: فتوی لجنۃ الافتاء التابعۃ للمجلس الأعلی بالجزائر، مجلۃ البحوث الاسلامیۃ: ۷/۲۲/۴)۔

(۲): بہت سے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اضطرار کی حالت میں بعض زندہ آدمی کو قتل کر کے کھایا جاسکتا ہے، جیسا کہ امام نووی نے حربی اور مرتد کو بالاتفاق قتل کر کے کھانے کی اجازت دی ہے اور شادی شدہ زانی، باغی اور نماز چھوڑنے والے کے سلسلہ میں بھی جمہور سے جواز کا قول نقل کیا ہے: ”**قال الإمام النووي: ويجوزله قتل الحربى والمرتد، وأكلهما بلاخلاف، وأما الزانى المحصن، والمحارب، وتارک الصلاة ففيهم وجهان: أصحهما، وبه قطع امام الحرمين، والمصنف، والجمهور: يجوز**“ (المجموع شرح المہذب: ۹/۴۴، کتاب الأطعمۃ)، اور امام قرطبی نے بھی لکھا ہے کہ حربی اور شادی شدہ زانی کو قتل کر کے اس کا گوشت کھانا جائز ہے: ”**فإن كان حربيا أو زانيا محصنا جاز قتله والأكل منه**“ (الجامع لأحکام القرآن: ۲/۲۲۹)، نیز امام قرطبی نے امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے کہ مجبوری میں انسان کا گوشت کھانے کی اجازت ہے: ”**وقال الشافعي: يأكل لحم ابن آدم**“ (حوالہ سابق)۔

جب اضطراری حالت میں زندہ کو قتل کرنے کی اجازت ہے تو میت کے عضو سے اس کی رضامندی سے استفادہ

کرنے میں بدرجہ اولی کوئی قباحت نہیں ہوگی ۔ چنانچہ علامہ نووی مردہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ معصوم ہو پھر بھی اضطراری حالت میں صحیح قول کے مطابق اس کے اعضاء سے استفادہ جائز ہوگا:''**وأمااذالم يجد المضطر الاآدميا ميتا معصوما، ففيه طريقان: أصحهما وأشهرهما: يجوز، وبه قطع المصنف والجمهور**''(المجموع:۹/۴۴، کتاب الأطعمۃ)۔

شوافع کے علاوہ بعض احناف نے بھی اس کی اجازت دی ہے اور دلیل یہی دی ہے کہ کسی انسان کی زندگی کی حفاظت کسی مردہ کی حرمت وتعظیم سے مقدم ہے:''**وقال الشافعي وبعض الحنفية :يباح وهوأولى ،لأن حرمة الحی أعظم**''(المغنی:۹/۳۳۵)، نیز فقہاء حنابلہ میں سے ابوالخطاب کی بھی یہی رائے ہے:''**واختارأبوالخطاب :أن له أكله**''(حوالہ سابق، نیز دیکھئے: المبدع فی شرح المقنع لابی اسحاق:۸/۱۷)، اور فقہاء مالکیہ میں ابن عبدالسلام نے اس کے جواز وعدم جواز کے قول میں سے جواز کے قول کو صحیح قرار دیا ہے:''**وصحح أكل المضطر الميت الآدمي**''(شرح مختصر خلیل للخرشی:۲/۱۴۶)''**أى صحح ابن عبدالسلام القول بجواز أكله للمضطر**''(الشرح الکبیر للدردیر:۱/۴۲۹)۔ یہاں تک کہ بعض نے تو انبیاء کا گوشت تک کھانے کی اجازت دی تھی۔

مذکورہ وضاحت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کی جان کسی مردہ کے کسی عضو کے ذریعہ محفوظ ہوسکتی ہو تو مردہ کے عضو کے ذریعہ اس زندہ آدمی کی جان کی حفاظت کی جائے گی اور اس مردہ کی توہین کا پہلو نہیں دیکھا جائے گا، جیسا کہ انسانی صحت کی حفاظت کے لئے قرآن کی تکریم کے پہلو کو بھی نظرانداز کرتے ہوئے (حالاں کہ قرآن پاک کی تکریم انسانی تکریم سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے) فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو معلوم ہو کہ نکسیر کی بیماری میں پیشانی یا ناک پر خون سے سورۂ فاتحہ لکھی جائے تو شفا مل جائے گی تو ایسا کرنا جائز ہوگا، حتی کہ اگر بالفرض معلوم ہو کہ پیشاب سے لکھنے کی وجہ سے شفا مل جائے گی تو اس کی بھی گنجائش ہوگی:''**لورعف فكتب الفاتحة بالدم على جبهته أوأنفه جازللاستشفاء ،وبالبول أيضا ان علم فيه شفاء ،لكن لم ينقل،وهذالأن الحرمة ساقطة عندالاستشفاء**''(البحر الرائق:۱/۱۲۲، التداوی ببول ما یؤکل لحمہ)۔

اور خاص طور سے جب مردہ کی طرف سے اس کی خوشی سے اس کی زندگی اور ہوش وحواس کے وقت اس کی اجازت لے لی گئی ہو تو پھر اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی لئے مجمع الفقہ الاسلامی، جدہ کے آٹھویں سیمینار (منعقدہ: مکہ مکرمہ ۱۴۰۵ھ مطابق:۱۹۸۵ء) میں علماء کی اکثریت نے مردہ کے عضو سے استفادہ کو جائز کہا ہے:''**وقرر بالأكثرية جوازنقل عضوأوجزءه من انسان ميت الى مسلم اذااضطر الى ذلک وأمنت الفتنة فى نزعه ممن**

أخذمنه وغلب على الظن نجاح زرعه فيمن سيزرع فيه‘‘(البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا ص:۱۵، ۱/۴، از:عبدالناصر بن خضر میلاد، ط:مصر ۱۴۲۶ھ ۲۰۰۵ء)۔

جواز پر ہونے والے شبہات کا تجزیہ:

مردہ کے عضو سے استفادہ کے سلسلہ میں درج ذیل شبہات ہو سکتے ہیں:

(۱): پہلا شبہ یہ ہے کہ ماضی قریب کے بہت سے علماء اور فقہاء نے اسے ناجائز کہا ہے؟ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اسی زمانہ میں اس کو جائز کہنے والوں کی بھی خاصی تعداد رہی ہے، اور دلائل دونوں فریق کے پاس تھے، نیز نصوص میں جس چیز کو مبہم رکھا گیا ہے علماء نے اپنے زمانہ کے عرف کے مطابق اس کی تشریح کرتے ہوئے اس کو ناجائز لکھا تھا کہ اس میں انسان کی توہین ہے، مگر آج کے عرف میں یہ توہین نہیں ہے، نہ تو اعضاء دینے والا اس میں اپنی توہین محسوس کرتا ہے، نہ معاشرہ میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے، بلکہ ایسا کرنے والوں کی قدر و منزلت لوگوں کی نگاہوں میں اور بڑھ جاتی ہے، اسی لئے بڑے بڑے قائدین، زعماء اور شہرت یافتہ لوگ اپنے اعضاء کے سلسلہ میں اس قسم کی وصیت کر جاتے ہیں اور یہ چیز ان کی نیک نامی کا باعث ہوتی ہے اور انسانیت نوازی کی دلیل سمجھی جاتی ہے، چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی (مکہ مکرمہ) کی قرارداد میں علماء نے لکھا ہے: ’’ان أخذ عضومن جسم انسان حی وزرعه فی جسم آخر مضطر إليه لانقاذحياته أولاستعادة وظيفة من وظائف أعضاء ه الأساسية هوعمل جائز ،لايتنافى مع الكرامة الانسانيه بالنسبة للمأخوذمنه، كما فيه مصلحة كبيرة واعانة خيرة للمزروع فهوهوعمل مشروع وحميد‘‘(دیکھئے: البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا: ۱۵، ۱/۴، المطلب الاول: حکم نقل أعضاء الانسان، از: عبدالناصر بن خضر میلاد) اور ’’فتاوی واستشارات الاسلام الیوم‘‘ میں ہے: ’’وبعد المناقشةالمستفيضة بين أعضاء مجلس المجمع ،رأى المجلس أن استدلالات القائلين بالجوازهي الراجحة‘‘(فتاوی واستشارات الاسلام الیوم: ۸، ۷/۴ ۱۴۱، زراعۃ الاعضاء)۔

قدیم فقہاء نے غالباً اس لئے بھی اس کو ناجائز کہا ہے کہ اعضاء کے نکالنے اور پیوندکاری کا طریقہ اس وقت ایسا رہا ہوگا، جو انسان کی توہین کو مستلزم ہوتا ہو، لیکن آج کے ترقی یافتہ میڈیکل میں جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس میں عموماً توہین کی صورت پیدا نہیں ہوتی ہے۔

(۲): دوسرا شبہ یہ ہے کہ اس طرح کسی مردہ کے عضو سے استفادہ تکریم انسانی کے خلاف ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ’’وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا‘‘ (الاسراء: ۷۰)، اس میں مردہ اور زندہ کی کوئی تفریق نہیں ہے، لہذا بہرحال مردہ کی تکریم ضروری

ہے،اور یہ حق الٰہی ہے،صرف بندوں کا حق نہیں، کیوں کہ بندہ کے پاس وہ اعضاء بطور امانت ہیں،حتی کہ خود بھی اگر اس کی توہین کرنا چاہے، یا اس توہین پر راضی ہو تو اس کو اس کا اختیار نہیں ہوگا اور اس کی رضامندی کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اس کو آج تکریم انسانی کے خلاف نہیں سمجھا جاتا، اور اگر سمجھا بھی جاتا ہے تو اس کو انسانی جان کی حفاظت کی وجہ سے برداشت کیا جائے گا، کیوں کہ انسانی جان کی حفاظت کے لئے بسا اوقات بعض قابل احترام چیزوں کی اہانت بھی قبول کر لی جاتی ہے، اس لئے کہ کسی زندہ انسان کی زندگی کی حفاظت کسی مردہ کی تکریم کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر حاملہ عورت کا انتقال ہو جائے اور غالب گمان کے مطابق اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو تو اس عورت کے پیٹ کو چاک کر کے بچہ کی زندگی کی حفاظت کی جائے گی، جیسا کہ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: ''**امرأة حامل ماتت فاضطرب الولدفی بطنها،فان کان أکبر رأیه أنه حی ،یشق بطنها،لأن ذلک تسبب فی احیاء نفس محترمة بترک تعظیم المیت فالاحیاء أولی**''(البحرالرائق:۸/۲۳۳،کتاب الکراھیۃ خصی البھائم)اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ جب دو مفسدے جمع ہو جائیں تو ضرر شدید کے مقابلہ میں ضرر خفیف کو گوارا کر لیا جاتا ہے:''**إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهماضررا بارتکاب أخفهما**''(الأشباہ والنظائر،ص:۱۱۲)۔

مرنے کے بعد بھی انسانی احترام باقی رہتا ہے اس میں کوئی کلام نہیں، لیکن مسئلہ دو چیزوں میں ترجیح کا ہے، یا دو مصیبتوں میں سے کم تر کو گوارا کرنے کا ہے، چنانچہ قرآن پاک کی تکریم انسانی تکریم سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے، اس کے باوجود فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو معلوم ہو کہ نکسیر کی بیماری میں پیشانی یا ناک پر خون سے سورۂ فاتحہ لکھی جائے تو شفا مل جائے گی تو ایسا کرنا جائز ہوگا، حتی کہ اگر بالفرض معلوم ہو کہ پیشاب سے لکھنے کی وجہ سے شفا مل جائے گی تو اس کی بھی گنجائش ہوگی: ''**لورعف فکتب الفاتحة بالدم علی جبهته أوأنفه جازللاستشفاء ،وبالبول أیضا ان علم فیه شفاء ، لکن لم ینقل،وهذالأن الحرمة ساقطة عندالاستشفاء**''(البحرالرائق:۱/۱۲۲،التداوی ببول مایؤکل لحمہ)۔

اسی طرح حضرت امیر معاویہ نے لوگوں کی مصلحت کو دیکھتے ہوئے شہدائے اُحد کی لاشوں کو قبروں سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیا تھا:''**لماأرادأن اجراء العین بجانب أحدأمرمنادیافنادی فی المدینة:من کان له قتیل فلیخرج الیه ولینبشه ولیخرجه ولیحوله،قال جابر:فأتیناهم فأخرجناهم من قبورهم رطابا**''(الاستذکار:۵/۱۵۷،باب الدفن فی قبر واحد من ضرورۃ......) علامہ خرشی نے اس سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مصلحت عامہ کی خاطر تھا اور مصلحت عامہ کی خاطر مردہ کو قبر سے نکالنا جائز ہے:''**من مسائل جوازاخراج المیت**

ماااقتضت ذلک مصلحۃ المسلمین کفعل معاویۃ فی شہداء أحد"(الخرشی:۲/۱۴۵:۵)۔گویا اسے مردہ کی بے حرمتی شمار نہیں کی گئی،اور اگر بے حرمتی بھی سمجھی گئی ہو تو اسے عمومی مصلحت کی خاطر گوارا کیا گیا۔

(۴):ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ مردہ کی ہڈی توڑنا جائز نہیں ہے،چنانچہ حدیث پاک میں ہے:"کسر عظم المیت ککسرہ حیا"(سنن أبی داؤد،حدیث نمبر:۳۲۰۷،باب فی الحفار یجد العظم ھل یتنکب ذلک المکان؟)اور علامہ طحاوی لکھتے ہیں: "لایجوز کسر عظامہ ولاتحویلھا"(طحاوی)۔اس کا جواب بھی یہی ہوگا کہ یہ بلاوجہ توڑنے کی ممانعت ہے اور ہماری بحث اضطراری حالت میں جواز وعدم جواز سے ہے،کہ اضطراری حالت میں بہت سی چیزیں جائز ہوجاتی ہیں،فقہ کا قاعدہ ہے:"الضرورات تبیح المحظورات"(الاشباہ والنظائر:۱/۷۳)۔

(۵):ایک مضبوط اشکال یہ ہے کہ اعضاء کا عطیہ فقہی اعتبار سے ہبہ یا وصیت ہوگا،جس میں ملکیت شرط ہوتی ہے اور مردہ کے اعضاء میں مردہ کی ملکیت نہیں ہے اور زندگی میں بھی اعضاء پر اس کی ملکیت نہیں تھی کہ وہ کسی کو ھبہ اور دینے کی ہدایت کرے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ہر تصرف کے لئے ملکیت ضروری نہیں ہے،مالکانہ تصرف کے لئے ملکیت ضروری ہے، جس میں مالک بننے کے بعد مالک بننے والا اسے فروخت بھی کرسکتا ہو،زیر بحث مسئلہ میں مریض اس عضو سے محض "استفادہ" کرتا ہے،اسے اس پر مالکانہ تصرف حاصل نہیں ہوتا ہے کہ اسے وہ فروخت بھی کرسکے۔گویا یہ"تصرفِ ملک"نہیں ہے،بلکہ"تصرفِ ولایت"ہے،بہ لفظ دیگر کسی کو"مالک بنانے"کے لئے خود کی ملکیت ضروری ہوتی ہے، مگر یہاں پر موہوب لہ کو"مالک بنانا"نہیں پایا جاتا ہے،کیوں کہ موہوب لہ اس حاصل کئے گئے عضو کا"مالک"نہیں بنتا ہے،لہذا کہا جائے گا کہ یہ تصرف ولایت ہے اور ہر شخص کو اپنے نفس پر ولایت حاصل ہوتا ہے،چنانچہ دکتور حسن علی لکھتے ہیں:"ھذاالاذن یمکن أن یکون صادرامن المیت قبل موتہ باعتبار ولایتہ علی نفسہ"(البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا:۱/۴۱۵،المطلب الاول:حکم نقل أعضاء الانسان،از:عبد الناصر بن خضر میلاد،بہ حوالہ:مجمع الفقہ الاسلامی:۴/۲۶۳،مقالہ:دکتور حسن علی الشاذلی)۔چنانچہ یہاں پر اگر ہبہ بولا جائے تو اس سے ھبہ کے اصطلاحی معنی نہیں،بلکہ لغوی معنی مراد ہوں گے،کیوں کہ ہبہ کے لغوی معنی میں عموم ہے کہ وہ مال میں بھی ہوسکتا اور غیر مال میں بھی:"الھبۃ فی اللغۃ : إعطاء الشیء إلی الغیر بلاعوض ،سواء کان مالاأوغیرمال۔۔کمایقال:وھب اللہ فلاناولداصالحا ومنہ قولہ تعالی:" فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِيًّا "(مریم:۵)،اسی طرح عطیہ کے لغوی معنی ہیں'ہروہ چیز جودی جائے':"العطیۃ لغۃ :کل مایعطی"۔یہاں پر یہی لغوی معنی مرادلیا جائے گا،کیوں کہ فقہاء کے یہاں اس کا استعمال لغوی معنی میں بھی ہوتا ہے:"ویستعمل الفقھاء العطیۃ۔۔أیضا۔۔بالمعنی اللغوی نفسہ"(الموسوعۃ الفقھیہ:۲۷/۳۵۸،بہ حوالہ: لسان

العرب، مادۃ: عطا، والکلیات: ۳/۲/۹۷۷، والفتاوی الکبری لابن حجر الھیثمی: ۳/۳/۷۱)۔اس کے علاوہ یہ اضطراری حالت کا حکم ہے جس میں فقہ کے اندر یسر وسہولت اور توسع کی گنجائش ہوتی ہے، جیسے اضطراری حالت میں کسی کا مال چوری کر کے کھانا جائز ہے، حالاں کہ اس پر اس کی ملکیت نہیں ہوتی ہے۔

علماء نے ہر طرح کے دلائل اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فی زماننا بعض شرائط کے ساتھ (جن کے ذریعہ ان ممکنہ مفاسد سے بچا جا سکے) زندہ اور مردہ دونوں کے عضو سے استفادہ کے جواز کو ترجیح دی ہے، چنانچہ شیخ عبدالناصر لکھتے ہیں: **"ویترجح هناجوازنقل الأعضاء من الحی والمیت علی نحوماذهب الیه أنصار المذهب الثانی ،غیرأن هذامشروط بشروط مهمة تجب مراعاتهاوالتأكدمن توافرها"** (البیوع المحرمۃ والمنھی عنہا: ۱/۴۲۳، المطلب الاول: حکم نقل أعضاء الانسان)۔

اردن کے دارالافتاء نے بھی درج ذیل شرطوں کے ساتھ میت سے عضو کی منتقلی کے جواز کا قول اختیار کیا ہے:

(۱): میت کی زندگی میں اس کی تحریری اجازت حاصل کی گئی ہو اور موت کے بعد اس کے والدین یا اس کے ولی یا میت لاوارث ہو تو حکومت وقت کی جانب سے اجازت لی جائے۔

(۲): اس عضو کے حوالہ سے ضرورت واضطرار یا حاجت متحقق ہو، یعنی لینے والے کی زندگی یا جسم کے کسی اہم حصہ کی سلامتی اس عضو کے حصول پر موقوف ہو اور اس ضرورت کی تصدیق ماہر ومعتبر ڈاکٹروں کی ٹیم کی جانب سے کی گئی ہو۔

(۳): اس عضو کا کوئی مادی عوض اور قیمت نہ لی جائے: **"ولجنة الفتوی فی المملكة الأردنية الهاشمية ، حیث تضمن القرارجوازالنقل بشروط خمسة بالنسبة للنقل من المیت ،منها: موافقة المیت أووالدیه، أوولیه بعدوفاته ،أوولی الأمر المسلم اذاكان المتوفی مجهول الهویة ،وأن توجدالحاجة أوالاضطرار، وألایكون بمقابل مادی....وذلك لحفظ كرامة المیت"** (البیوع المحرمۃ والمنھی عنہا: ۱/۴۱۶، المطلب الاول: حکم نقل أعضاء الانسان، از: عبدالناصر بن خضر میلاد، بہ حوالہ: مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، الدورۃ الرابعۃ، العدد الرابع: ۱/۴۱۳، ط: ۱۴۰۸ھ..۱۹۸۸ء)۔

(۵): جس کو عضو دیا جائے وہ شرعاً قتل کا مستحق نہ ہو، ورنہ ایسے آدمی کو عضو دے کر اس کی حیات کے اسباب کو بڑھانا درست نہیں۔

اور ہندوستان کے مفتی اعظم، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں: "یہ شبہ کہ انسان کے اجزاء کا استعمال ناجائز ہے، اس لئے وارد نہ ہونا چاہئے کہ استعمال کی جو صورت کہ مستلزم اہانت ہو وہ ناجائز ہے اور جس میں اہانت نہ ہو تو بہ ضرورت وہ استعمال ناجائز نہیں" (کفایۃ المفتی: ۹/۱۴۳)۔

اس سلسلہ میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہوگا، اس لئے کہ موت کے بعد دونوں کا یکساں احترام ضروری ہے: ''**لافرق بین میتة المسلم والکافر فی الحرمة**'' (شرح مختصر خلیل للخرشی: ۳/۲۸)۔

(۶) آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ:

(الف): زندہ آدمی کی آنکھ کا قرنیہ: زندہ آدمی کی آنکھ کا قرنیہ لینے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱): ایک یہ کہ اس دینے والے کی آنکھ سلامت ہو: اس صورت میں عطیہ جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ دینے والے کی آنکھ کا ضائع ہونا یقینی ہے اور لینے والے کی آنکھ کا ٹھیک ہونا امر محتمل ہے اور احتمالی فائدہ کے لئے یقینی نقصان کو گوارا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۲): دوسری صورت یہ ہے کہ آنکھ کی روشنی سلامت نہ ہو، لیکن دوسروں کو لگادیا جائے تو اس کی آنکھ روشن ہوسکتی ہو: اس صورت میں بھی عطیہ جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ آنکھ انسان کی ''حاجت'' میں تو داخل ہے، ''ضرورت'' میں نہیں اور ایک انسان سے اس کا عضو حاصل کرنا صرف ضرورت واضطرار کی حالت میں جائز قرار دیا جائے گا۔

۳): تیسری صورت یہ ہے کہ کسی مرض کی وجہ سے اس کی آنکھ کاٹ کر علاحدہ کردی گئی ہو اور اس سے دوسرے کی آنکھ کو روشنی مل سکتی ہو: ایسی صورت میں اس علاحدہ کی ہوئی آنکھ سے استفادہ جائز ہوگا، اس لئے کہ اس میں دوسرے کو نقصان پہنچانا یا اس کی توہین کرنا نہیں پایا جاتا ہے۔

(ب): مردہ کی آنکھ کا قرنیہ:

ازہر کی مجلس فتوی نے مردہ کی آنکھ کا قرنیہ لینے کو جائز قرار دیا ہے: ''**تری اللجنة جواز نقل جزء من عین المیت لإصلاح عین الحی اذا توقف علی ذلک اصلاحه او قیا مها بما خلقها الله له**'' (بہ حوالہ: مجلۃ الأزہر: ۲۰/۲۴۲، ط: ۱۳۶۸ھ...۱۹۴۹ء)، لیکن یہ محل نظر ہے، کیوں کہ انسانی اعضاء سے استفادہ کی اجازت بالکل اضطراری حالت میں ہوتی ہے، یعنی جس میں بصورت دیگر جان کو خطرہ ہو، اور چوں کی آنکھ کے نہ ہونے میں جان کو خطرہ نہیں ہے، اس لئے یہ فقہی اصطلاح میں ''ضرورت'' میں داخل نہیں ہوگا، بلکہ اسے حاجت کہا جائے گا اور اس کے لئے انسانی اعضاء کے قطع وبرید کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ پھر انسان اس (نابینا پن) کا ایسا عادی ہوجاتا ہے کہ اس کی بہت زیادہ حاجت بھی محسوس نہیں ہوتی ہے اور یہ تکلیف عموماً فطری بھی ہوتی ہے، جس پر انسانی طبیعت آمادہ رہتی ہے، اس لئے اس کو ایسی انسانی ''ضرورت'' نہیں کہا جائے گا، جس کے لئے وہ سب خرابیاں گوارا کی جائیں جو ایک انسان کے عضو کے لینے میں اور مردہ کے جسم کے قطع وبرید میں پائی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ اس طرح کے آپریشنوں میں بعض تحقیقات کے مطابق بہت کم کامیابی مل رہی ہے، چنانچہ امریکی رسالہ ''سیربین'' نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے:'' پہلے اس (آنکھ) کے پردے کو نقصان پہنچنے کی صورت میں اس کی جگہ وہ پردہ لگا دیا جاتا تھا جو ایسے لوگوں کے مرتے ہی ان کی آنکھ سے حاصل کر لیا جاتا تھا جو اسے بطور عطیہ دینا چاہتے تھے، لیکن بعض اسباب کی بنا پر جنہیں ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا ہے اس طرح لگائے جانے والے بہت سے پردے دھندلا جاتے تھے اور آدمی دوبارہ بصارت سے محروم ہو جاتا تھا(جواہر الفقہ :۷/۷۷، بہ حوالہ: رسالہ: سیربین، ص: ۳۳، امریکہ، ۱۹۶۷ء)، لہٰذا اس طرح کے موہوم اور وقتی فائدہ کے لئے کسی مردہ کے جسم کو کاٹنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(ج): بینکوں کو قرنیہ کا عطیہ:

ذکر کردہ صورتوں میں سے:

(۱): مردہ کی آنکھ کا قرنیہ کسی صورت میں بینکوں کو دینا درست نہیں ہوگا۔

(۲): زندہ آدمی کی صحیح آنکھ کا قرنیہ نکال کر بینکوں کو دینا درست نہیں ہوگا۔

(۳): زندہ آدمی کی ناکارہ آنکھ (جو حلقۂ چشم سے) علاحدہ نہ کی گئی ہو، اس کو کاٹ کر بینکوں کو دینا درست نہیں ہوگا۔

(۴): زندہ آدمی کی وہ آنکھ جو کسی عذر کی بنا پر حلقۂ چشم سے علاحدہ کر دی گئی ہو اور اس آدمی کے لئے وہ کارگر نہ ہو، وہ اگر دوسرے آدمی کے لئے کارگر ثابت ہو سکتا ہو تو اس کو بینک کے حوالہ کرنا درست ہوگا۔ ورنہ اسے دفن کرنا ضرورہ ہوگا، جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ انسان کے جسم سے علاحدہ کئے گئے حصہ کو دفن کرنا ضروری ہے:''**فاذاانفصل استحق الدفن ككله**''(بدائع الصنائع: ۵/۱۳۳، کتاب الاستحسان)۔

(۷) مردہ سے عطیہ میں اجازت:

(الف): جن صورتوں میں اعضاء کا عطیہ جائز ہے، ان میں میت کی اجازت ضروری ہوگی، کیوں کہ ہر شخص کو اپنے نفس پر ولایت حاصل ہوتی ہے:''**هذا الاذن يمكن أن يكون صادرامن الميت قبل موته باعتبار ولايته على نفسه**''(البیوع المحرمۃ والمنھی عنھا:۱/۴۱۵، المطلب الاول: حکم نقل أعضاء الانسان، از: عبدالناصر بن خضر میلاد، بہ حوالہ: مجمع الفقہ الاسلامی: ۴/ ۲۶۳، مقالہ: دکتور حسن علی الشاذلی) یعنی ضروری ہوگا کہ موت سے قبل اس کی تحریری اجازت دے، یا اس پر کسی کو گواہ رکھ دے، صرف زبانی کہنے پر اکتفاء نہ کرے، ورنہ موت کے بعد لوگ غلط بیانی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ تاہم اس صورت میں موت کے بعد ورثاء کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی، کیوں کہ مرنے والا ایسی چیز دوسرے کو دے رہا ہے، جس میں اس کی موت کے بعد بھی اس کے ورثاء کا حق متعلق نہیں ہے۔

(ب): میت نے اگر پہلے سے اجازت نہ دی ہو اور نہ صراحتا اس سے منع کیا ہو تو موت کے بعد والدین یا دوسرے ولی کی اجازت وموافقت سے عطیہ دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ اس کے قتل کی صورت میں ورثہ کو قصاص کے مطالبہ کا یا دیت لینے کا حق رہتا ہے۔

(ج): اگر میت لاوارث ہو تو حاکم وقت کی اجازت سے اس کا عضو دوسرے کو دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں اس کی ولایت حاکم ہی کو حاصل رہتی ہے۔ چنانچہ فتاوی یورپ میں ہے: ''کسی میت کا ایسا عضو کسی زندہ انسان میں منتقل کرنا جائز ہے، جس پر زندگی کی بقا، یا کسی بنیادی وظیفہ کی سلامتی منحصر ہو، بشرطیکہ خود میت نے اپنی موت سے پہلے یا اس کی موت کے بعد اس کے ورثہ نے اور اگر میت کی شناخت نہ ہو، یا لاوارث ہو تو مسلمانوں کے سربراہ نے اس کی اجازت دے دی ہو (فتاوی یورپ:۹۵)۔

(۸) دودھ بینک میں اجرت پر دودھ دینا، لینا اور رضاعت کا حکم:

اس سوال کے جواب کو پانچ بحثوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: اجرت پر دودھ لینا، اجرت پر دودھ دینا، دودھ بینک میں قیمتا دودھ دینا، دودھ بینک سے قیمت پر دودھ لینا اور اس دودھ سے رضاعت کا حکم۔

(الف): اجرت پر دودھ لینا:

اجرت پر دودھ پلانے کا جواز خود قرآن پاک سے ثابت ہے، ارشاد ہے: ''**فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ**'' (الطلاق:٦) اور رسول اللہ کے عمل سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ آپ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اجرت دے کر دودھ پلوایا تھا (دیکھئے: مسند أبی یعلی الموصلی حدیث نمبر: ۴۱۹۲، عن أنس)، اور ایک حدیث میں آپ ﷺ نے قبیلہ مزینہ کی خواتین سے دودھ پلوانے کی تلقین فرمائی ہے: ''**استرضعوا فی مزینة فانهم أهل أمانة**'' (مسند الحارث، حدیث نمبر:۴۸۱)، نیز اس کی ''ضرورت'' بھی ہے: ''**أما لبن الظئر فانما جاز للحضانة لأنه موضع حاجة**'' (المغنی:۴/۱۵۷)، کیوں کہ بسا اوقات اپنی ماں کے پاس دودھ نہیں ہوتا ہے، یا اتنی مقدار میں نہیں ہوتا ہے جو بچہ کے لئے کافی ہو سکے، اس لئے اجرت پر دودھ لینے کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: ''**وأجمع أهل اعلم علی جواز استئجار الظئر وهی المرضعة**'' (المغنی:۵/۳۶۷)۔

(ب): اجرت پر دودھ دینا:

جب دودھ پر اجرت دینا جائز ہے تو دودھ پر ''اجرت لینا'' بھی جائز ہوگا، ورنہ رسول اللہ ﷺ دودھ پلانے پر اجرت نہیں دیتے اور نہ قرآن میں اس کی اجازت دی جاتی۔

(ج): دودھ بینک میں قیمتاً دودھ دینا:

اوپر کی بحث دودھ لینے اور دینے کی اس صورت میں تھی جب کہ عورت براہ راست اپنے بدن سے دودھ پلائے، لیکن اگر دودھ کو بدن سے علاحدہ کردیا جائے تو یہ ''اجرت''، یعنی اجارہ کی صورت نہیں ہوگی، بلکہ ''بیع'' ہوگی اور اس کا حکم بدل جائے گا، چنانچہ بدن سے علاحدہ ہوجانے والے دودھ کے سلسلہ میں احناف کی رائے یہ ہے کہ اس کو بیچنا درست نہیں ہے: **''لاینعقد بیع لبن ا لمرأة فی قدح عند نا''** (بدائع الصنائع: ۵/۱۴۵، فصل فی الشرط الذی یرجع الی المعقود علیہ)، اس کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ یہ مال نہیں ہے، صرف بچہ کی پرورش کے لئے اس سے ''انتفاع'' کو درست قرار دیا گیا ہے، اور اس کے مال نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی نے ایک مرتبہ فیصلہ کیا تو دوسری چیزوں کی قیمت تو لگائی، مگر دودھ کی قیمت نہیں لگائی: **''روی عن سیدناعمروسیدناعلی :أنهماحکمافی ولدالمغرور بالقیمة ،وباالعقربمقابلة الوطء، وماحکمابوجوب قیمة اللبن بالاستهلاک،ولوکان مالا لحکما''** (بدائع الصنائع: ۵/۱۴۵، فصل فی شرط ا لذی یرجع الی المعقود علیہ)، اور ان دونوں حضرات کا یہ عمل صحابہ کرام کی موجودگی میں تھا اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی تو گویا اس پر صحابہ کا اجماع ہوا کہ دودھ مال نہیں ہے: **''وکان ذلک بمحضر من الصحابة ،ولم ینکرعلیه أحدفکان اجماعا''** (سابق)۔

احناف نے اسے تکریم انسانی کے پہلو کے خلاف تصور کرتے ہوئے فروختگی کو منع کیا ہے: **''لم یجز البیع لبن المرأ ة ،لأنه جزء الآدمی وهو بجمیع أجزائه مکرم عن الابتذال بالبیع''** (البحر الرائق: ۶/۸۱، فتاوی ہندیہ: ۳/۱۱۴)، کیوں کہ عورت براہ راست پلائے اور اس پر اجرت لے تو یہ ''خدمت'' کی اجرت کے قبیل سے ہوتی ہے اور اس میں توہین نہیں سمجھا جاتا ہے، لیکن نکال کر فروخت کرنے کو توہین شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں قباحت ہے اور یہ درست نہیں ہوگا۔

اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ آدمی اپنے جمیع اعضاء کے ساتھ محترم ہے، لہذا اس کے کسی جزو کو فروخت کرنا اس کی توہین شمار ہوگی اور یہ جائز نہیں ہوگا: **''ولأنه جزء من الآدمی ،والآدمی بجمیع أجزاء ہ محترم مکرم ،ولیس من الکرامة والاحترام ابتذاله بالبیع والشراء''** (بدائع الصنائع: ۵/۱۴۵)، البتہ احناف میں سے امام ابویوسف نے باندی کا دودھ بیچنے کو جائز کہا ہے۔

شوافع کی رائے ہے کہ یہ جائز ہے، کیوں کہ یہ مشروب طاہر ہے، البتہ شوافع میں سے علامہ ماوردی، علامہ رویانی، علامہ شاشی اور ابوالقاسم انماطی نے اسے ناجائز کہا ہے (دیکھئے: البیوع المحرمة والمنھی عنها: ۵/۱۴۳۳)۔

اسی طرح مالکیہ بھی اس کو جائز کہتے ہیں: "**ویجوزبیع لبن الآدمیات ،لأنه طاهرمنتفع به**" (مواهب الجلیل فی شرح مختصر خلیل: ۲۶۵/۴)۔

حنابلہ سے چار طرح کے اقوال منقول ہیں:

(۱): مطلق جائز ہے: "**ظاهر کلام الخرقی :جوازہ**" (المغنی: ۱۹۶/۴)، اور ابواسحاق لکھتے ہیں: "**یصح بیع لبن الآدمیات المنفصل منها**" (المبدع فی شرح المقنع: ۱۲/۴)۔

(۲) مطلق ناجائز ہے: "**لایجوزبیع لبن الآدمیة**" (المحرر فی الفقہ علی مذهب الامام أحمد: ۲۸۵/۱)۔

(۳): امام احمد ابن حنبل قول مکروہ کا ہے: "**أمابیع لبن الآدمیات فقال احمد:أکرهه**" (المغنی: ۱۹۶/۴)۔

(۴): باندی کے دودھ کی بیع صحیح ہے آزاد کی نہیں، لیکن ابن قدامہ نے جواز کے قول کو اصح کہا ہے: "**فأمابیع لبن الآدمیات فقال أحمد:أکرهه ،واختلف أصحابنافی جوازه ......والأول الأصح،لأنه لبن طاهر منتفع به فجازبیعه**" (المغنی: ۱۹۶/۴)۔

غرض بدن سے علاحدہ کئے جانے والے دودھ کی بیع کے سلسلہ میں چار طرح کے اقوال ہوئے:

(الف): مطلقا جائز: یہ مالکیہ اور شوافع کی رائے اور حنابلہ کا مذہب ہے۔

(ب): مطلقا ناجائز: یہ حنفیہ اور بعض شوافع جیسے ابوالقاسم انماطی کا قول ہے۔

(ج): مکروہ ہے: یہ امام احمد کا قول ہے۔

(د): باندی کا دودھ بیچنا جائز ہے آزاد کا نہیں: یہ امام ابویوسف اور بعض حنابلہ کا قول ہے۔

چنانچہ شیخ عبدالناصر تمام ائمہ کے اقوال کی روشنی میں لکھتے ہیں: "**بعدعرض الآراء علی نحوما استخلصناه ومراجعة مااستدل به کل فریق ،یتضح لنارجحان القول بعدم جواز لبن الآدمیة الحرة**" (البیوع المحرمة والمنهی عنها: ۴۴۳/۱) اور اس کی متعدد دلیلیں بھی دی ہیں:

۱): آزاد آدمی قابل فروخت مال نہیں ہے، لہذا اس کا جزو بھی قابل فروخت مال نہیں ہوگا۔

۲): "مشروب طاہر" کو جواز کی علت نہیں بنایا جاسکتا ہے، کیوں کہ بچہ کی "ضرورت" کی بنا پر اسے جائز مشروب کہا گیا ہے، اسی لئے بچہ بڑا ہوجائے تو اس کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

۳): قابل انتفاع ہونا بھی اس کی بیع وشراء کے جواز کی دلیل نہیں ہوگا، کیوں کہ ہر قابل انتفاع چیز کی بیع جائز نہیں ہوتی ہے۔

(د): دودھ بینک سے قیمتاً دودھ لینا:

حنفیہ کے نزدیک اجرت پر دودھ پلوانا استحسانا بچہ کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے جائز ہے، قیاسا جائز نہیں، لہذا اس کی دوسری شکلوں کی اجازت نہیں ہوگی، پھر اس میں متعدد اخلاقی خرابیاں بھی ہیں:

(الف): دودھ پینے والے بچے کو معلوم نہیں ہوگا کہ کس کا دودھ پیا ہے، لہذا ہوسکتا ہے کبھی اس کا نکاح رضاعی بہن وغیرہ سے ہوجائے۔

(ب): دودھ بینک نسب میں اختلاط اور شک پیدا کرتا ہے۔

(ج): دودھ بینک کا تجربہ مغربی اقوام نے کیا ہے، لیکن فنی اور سائنسی اعتبار سے اس کے بعض منفی نتائج سامنے آنے کے بعد اس تجربہ سے گریز کا راستہ اختیار کیا جارہا ہے۔

(د): اس کی دوشری شکلیں اور جائز شرعی متبادل موجود ہیں، لہذا اس کی ضرورت نہیں۔

(ہ): اس میں عموما غیر مسلم خواتین دودھ پیش کرتی ہیں اور غیر مسلم خاتون کا دودھ پلانے کو بعض فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے، کہ اس میں کسی حرام اور مضر چیز کی آمیزش کا اندیشہ ہے: ”**ویکره الظؤرة من الیهودیات والنصرانیات لمایخشی من أن تطعمهم الحرام وتسقیهم الخمر**“ (المقدمات الممھدات: ۱/۴۹۶ لابن رشد)، اسی طرح آج کے زمانہ میں بھی غیر مسلم دودھ بینکروں کی طرف سے اس کا اندیشہ قوی ہے، کہ بعض مہلک ادویات اس میں شامل کردیں، اس لئے اس سے حتی الوسع گریز کرنا چاہئے کہ اللہ کا ارشاد ہے: ”لَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ“ (البقرۃ:۱۹۵)۔

(و): بعض مضرتیں تو ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے جسم کو بیمار کرتی ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن سے گو جسم کو کوئی ظاہری مضرت نہیں پہنچتی ہے، مگر وہ انسانی روح کے لئے مضرت رساں ہوتی ہیں، چنانچہ ان دودھ بینکوں کے اندر اگر دودھ میں اس طرح کی مہلک ادویات کے ملائے جانے کا اندیشہ نہ بھی ہو، تب بھی کم سے کم اخلاقی طور پر تو یہ مہلک ہے ہی کہ فاسق وفاجر اور ایمان واخلاق سے محروم خواتین کے دودھ کا اثر بچوں پر منفی پڑے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”**الرضاع یجر الطبائع**“، اور ایک حدیث میں آپ ﷺ نے قبیلہ مزینہ کی خواتین سے دودھ پلوانے کی تلقین فرمائی ہے کہ یہ لوگ امانت دار ہوتے ہیں: ”**استرضعوا في مزینة فانهم أهل أمانة**“ (مسند الحارث، حدیث نمبر:۴۸۱)، اور ابن رشد نے عبدالملک کا قول نقل کیا ہے کہ اسی اخلاقی اثرات کی بنیاد پر عرب اپنی اولاد کو دودھ پلانے کے لئے، سخی، دلیر اور حسن اخلاق کے پیکر خاندانوں کی خواتین کو ترجیح دیتے تھے: ”**قال عبدالملک: ولذلک کانت العرب تسترضع أولادها في أهل بیت السخاء أو أهل بیت الوفاء أو بیت الشجاعة أو ما أشبه ذلک من الأخلاق الکریمة**“ (المقدمات

المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی ۱/۴۹۶، کتاب الرضاع)، اسی پس منظر میں فقہاء نے بھی صراحت کی ہے کہ ایسی خواتین سے بچوں کو بچانا چاہئے: ”ویتقی رضاع الحمقاء وذوات الطبائع المکروهة“(حوالہ سابق)، اور چوں کہ اس قسم کے بینکوں سے زیادہ تر ایسی خواتین منسلک ہوتی ہیں جو حسنِ اخلاق سے یا کم سے کم اسلامی اخلاق سے عاری ہوتی ہیں، لہذا اس سے گریز بہتر ہے۔

(ز): اسلام میں دودھ کی وجہ سے جزئیت پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے اس میں احترام رکھا گیا ہے، یہاں تک کہ دودھ پلانے والی کو ماں کا درجہ دیا گیا ہے، لیکن موجودہ طریقہ میں دودھ کی ایک گونہ بے حرمتی ہے، اس لئے بینک میں دودھ دینے سے گریز کرنا چاہئے۔

لہذا فی زماننا اس کی اخلاقی خرابیوں کو دیکھتے ہوئے اس سے منع کیا جائے گا، جیسا کہ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے اپنے سیمینار (دسمبر ۱۹۸۵ء) میں یہ طے کیا ہے کہ ”مسلم ممالک کو خواتین کا دودھ بینک قائم کرنے سے منع کیا جائے گا“ ....لیکن اگر ضرورت ثابت ہوجائے تو ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے اسے جائز قرار دیا جائے گا، کیوں کہ احناف نے بھی اس کے عدم جواز کی ایک عقلی دلیل یہ دی ہے کہ لوگ اسے مال نہیں تصور کرتے ہیں اور یہ بازاروں میں فروخت نہیں ہوتا ہے: ”والدلیل علیه أن الناس لایعدونه مالا، ولایباع فی سوق مامن الأسواق دل أنه لیس بمال فلایجوز بیعه“(بدائع الصنائع: ۵/۱۴۵)، لیکن یہ بات اس زمانہ کے عرف کے اعتبار سے تھی، اب اسے مال بھی تصور کیا جاتا ہے اور بازار میں اسے فروخت بھی کیا جاتا ہے، جس کی متعدد مثالیں یورپی ممالک میں موجود ہیں، لہذا اس زمانہ میں ضرورت وحاجت کے وقت یہ جائز ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں: ”ولاریب أن أیة امرأة مرضع تسهم بالتبرع یبیع لبنهالتغذیة هذاالصنف من الأطفال مأجورة عندالله، ومحمودة عندالناس، بل یجوزأن یشتری ذلک منهااذالم تطب نفسهابالتبرع، کماجازاستئجاهاللرضاع کمانص علیه القرآن وعمل به المسلمون“(مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی: ۲/۲۵۵، بنوک الحلیب)، اور جہاں تک متعدد عورتوں کے دودھ کے اختلاط کا مسئلہ ہے تو فقہ میں ایک وقت میں ایک سے زیادہ عورت کو بھی دودھ پلانے کے لئے رکھنے کا ثبوت ملتا ہے: ”ومن واجرظئرین فماتت واحدة فللباقیة أن ترضع وحدها“(حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر: ۴/۳۳، احوال تکرہ فیہا الاجارۃ)، لہذا ضرورت کے وقت اس کو بھی گوارا کرلیا جائے گا۔

(ہ): اس دودھ سے رضاعت کا حکم:

دودھ خواہ بدن سے لگا کر پلایا جائے یا الگ سے، عمر کی ایک حد تک اس سے رضاعت کا حکم لگ جاتا ہے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر فطری راستہ منہ کے بجائے ناک کے راستہ سے بھی دودھ داخل ہو تو رضاعت ثابت ہوجائے گی اور بعض

نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حقنہ کے طور پر بھی دودھ داخل کیا جائے تو رضاعت ثابت ہوجائے گی:"**کل مایصل إلی جوف الصبی عن طریق حلقه ،مثل الوجور،وهوأن یصب اللبن فی حلقه ،بل ألحقوابه السعوط وهوأن یصب اللبن فی أنفه ،بل بالغ بعضهم فألحق الحقنة عن طریق الدبر بالوجور والسعوط**"(البیوع المحرمۃ والمنهی عنها:۱/۴۴۵)"**لافرق فی ثبوت التحریم بالرضاع بین أن یرضع الطفل من الثدی مباشرة أوأن یشرب لبن المرأة من زجاجة مثلا بعدحلبه**"(حوالہ سابق)،اسی لئے مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے اپنے سیمینار (منعقدہ دسمبر ۱۹۸۵ء) میں یہ طے کیا ہے کہ "مسلم ممالک کو خواتین کا دودھ بینک قائم کرنے سے منع کیا جائے اوراس بینک کے دودھ سے بھی رضاعت ثابت ہوجائے گی"۔ نیز احتیاط بھی حرمت ثابت کرنے میں ہی ہے۔

البتہ آج کل کے دودھ بینکوں میں دودھ پیش کرنے والی خواتین کی طرف سے نام ظاہر نہ کرنے کی ہدایت ہوتی ہے اوراس میں چوں کہ مختلف عورتوں کا دودھ ملا ہوا ہوتا ہے اوراس طرح ملے ہوئے دودھ سے رضاعت ثابت ہونے کے لئے "غلبہ" کا اعتبار ہوتا ہے اورہم جنس چیزوں کے اختلاط میں جب کہ رنگ اورذائقہ کے اعتبار سے غلبہ کا اندازہ نہ ہو،مقدار کا اعتبار کرتے ہیں:"**اذااختلط الجنس بالجنس کاللبن یختلط بلبن آخر....یعتبر الغالب،غیر أن الغلبة من حیث اللون والطعم لم یمکن اعتبارهاهھنافیعتبر بالقدر**"(البحرالرائق:۳۵۷/۴)،لہذا اگر مقدار میں غلبہ متعین ہوجائے،تبھی اس سے حرمت ثابت ہوگی،لیکن آج مقدار سے غلبہ ثابت نہیں ہوتا ہے،لہذا کسی سے بھی حرمت ثابت نہیں ہوگی۔نیز فی زمانااس سے حرمت ثابت کرنے میں حرج بھی ہے اور فقہ کا قاعدہ ہے :"**الحرج مدفوع**" (اصول السرخسی:۱۰۵/۱)،البتہ دودھ پیش کرنے والی خواتین میں جس علاقہ کی خواتین کی تعداد زیادہ ہووہاں کی خواتین سے نکاح وغیرہ میں احتیاط بہتر ہوگا۔

(۹) مادہ منویہ کسی کو قیمتاً یا بلا قیمت دینا اوراس کے لئے بینک قائم کرنا:

(الف): قیمت پر دینا بالکل جائز نہیں ہوگا،اس لئے کہ یہ مال نہیں ہے،چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مضامین یعنی مذکر کا مادۂ منویہ اور ملاقیح یعنی مؤنث کا بیضہ فرخت کرنے سے منع فرمایا ہے:"**انما نهی من الحیوان عن ثلاثة :عن المضامین والملاقیح وحبل الحبلة**"(مؤطاامام مالک،حدیث نمبر:۲۴۱۱)،اورحضرت ابن عباس کی روایت ہے:"**عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ نهی عن بیع المضامین والملاقیح وحبل الحبلة**"(المعجم الکبیر للطبرانی،حدیث نمبر:۱۱۵۸۱)،چنانچہ فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے کہ یہ ناقابل فروخت ہے،اس لئے کہ یہ مال نہیں ہے :"**لاینعقدبیع الملاقیح والمضامین الذی وردالنهی عنه ،لأن ...ذلک لیس بمال**"(بدائع الصنائع:۱۴۵/۵)،یہ حکم جانور کے

سلسلہ میں ہے،لیکن یہی حکم انسانوں کے مادہ کا بھی ہوگا:"**والسابع بیع المضامین ،وھوبیع ماتضمنہ الاناث فی بطونھامن کل جنس**" (النتف فی الفتاوی للسغدی:۱/۴۶۷) ، بلکہ اس کی شناعت اور بڑھ جائے گی ، کیوں کہ جانورخودقابل فروخت مال ہوتے ہیں، پھربھی اس کا مادہ قابل فروخت اور مال نہیں ہےتوانسان جوخودقابل فروخت اور مال نہیں ہے،اس کا مادہ کیسے قابل فروخت اور مال ہوجائے گا،اس کے علاوہ اس میں انسانوں کی توہین کا پہلوبھی ہے اورنسب کے اختلاط کا بھی۔جن کی شریعت میں ممانعت آئی ہے۔

(ب): بلاقیمت دینابھی جائزنہیں ہوگااوراس کی متعدددلیلیں اوروجوہات ہیں:

۱):اس سےنسب میں اختلاط ہوگااورنسب کی نعمت اولاد کی نعمت سے کم نہیں ہے، نیزنسب کااختلاط تکریم انسانی کےبھی خلاف ہے،شریعت میں عدت اوراستبراء کاحکم اسی لئے دیا گیاہے؛ تاکہ نسب میں اختلاط کےشبہ سے بچا جاسکے:"**ان الاستبراء انمایجب صیانة للماء کی لایختلط ماؤہ بماء غیرہ**"(تحفۃ الفقہاء:۲/۱۱۳)،نیززنا کی حرمت کی بھی ایک وجہ یہی ہے کہ اس سےنسب میں اختلاط کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔کیوں کہ بچہ منی سے بنتا ہے:"**اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ، ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی**"(القیامۃ:۳۸)،اور یہ ایک مخفی چیز ہے،لہذا پتہ نہیں چلے گا کہ باپ کے جماع کے ذریعہ جونطفہ رحم میں گیاہےاس سے یہ بچہ تیار ہواہے یا زانی کے نطفہ سے۔

۲):بعض کا مقصدصرف اولاد کاحصول ہوتا ہے، ایسےلوگ اس طرح اولادحاصل کرکے آزادغیرشادی شدہ زندگی گزارنے کوترجیح دیں گے،جس سے معاشرہ میں متعدداخلاقی خرابیاں پیداہوں گی۔جیسا کہ مغرب میں اس کارواج بڑھ رہاہےاوراس کی خرابیاں بھی روزروشن کی طرح عیاں ہیں،شایداسی لئے اس وقت سندوں اوردستاویزات میں ماں کے نام کااضافہ ضروری سمجھا جارہاہے، کیوں کہ بینک سےمنی حاصل کرنے کی صورت میں باپ کا پتہ ہی نہیں ہوگا۔اور بچہ ماں کی طرف ہی منسوب ہوگا۔

۳):مادہ دینے کی اجازت دے دی جائے تولوگ بینکوں کوواسطہ بنانے اوراس پرخطیررقم خرچ کرنے کے بجائے براہ راست بھی اسے حاصل کریں گے،اس طرح زنا کادروازہ کھلے گا۔

۴):اس طرح سے حاصل کئے گئے مادہ سے پیدا ہونے والے بچے کومعاشرہ میں معیوب سمجھا جائے گا۔جس سے اس کی عزت نفس پامال ہوگی۔

۵):حدیث پاک میں بیوی کے علاوہ تک اپنامادہ پہنچانے کی ممانعت آئی ہے:"**لایحل لامرء یؤمن باللہ والیوم الآخرأن یسقی ماءہ زرع غیرہ**"(سنن أبی داؤد،حدیث نمبر:۲۱۵۸،باب فی وطءالسبایا)۔

۶): مرنے کے بعد بھی حاملہ کرنے کا عمل جاری ہوجائے گا، کہ ایک شخص کا مادہ لے کر بینک اپنے پاس رکھ لے اور اس کی موت کے بعد کسی کے مطالبہ پر اس کو دیدے۔ پھر اس سے متعدد مسائل پیدا ہوں گے۔

۷): اس سے پیدا ہونے والے بچے کے سلسلہ میں دو باپ یا دو ماں میں تنازع ہوگا، اور ابھی رضامندی بھی ہو تو بعد میں اس کا قوی اندیشہ ہے، خاص کر اگر زیادہ کمائی ہوئی تو ہر ایک اس سے اپنا رشتہ جوڑنے اور اس کے مال میں اپنا حق جتانے کی کوشش کرے گا۔

ذکرکردہ منکرات ومحظورات اور منفی نتائج پر نظر کرتے ہوئے اسے بالکل ناجائز اور حرام کہا جائے گا، اور اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، جیسا کہ دور حاضر کے متعدد علماء نے اس کی صراحت بھی کی ہے، چنانچہ شیخ عبداللہ بن زید آل محمود لکھتے ہیں: ”**والذی أری :أن الفقہ الاسلامی لایرحب بھذاالأمرالمبتدع ولایرضی عن فعلہ وآثارہ**“(مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی: ۲/ ۲۰۵)۔ اور دور حاضر کے محقق اور فقیہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اسے بھی زنا کی ایک صورت قرار دیتے ہوئے اس کو حرام لکھا ہے: ”**ان ھذاحرام بطریق الیقین، لکونہ یلتقی مع الزنافی اتجاہ واحد، حیث انہ یؤدی الی اختلاط الأنساب**“(مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی: ۲/ ۲۰۵)، اور ”فتاوی الشبکۃ الاسلامیہ“ میں ہے: ”**لایجوزالتبرع بالبویضۃ لامرأۃ أخری،لأن ھذایؤدی الی اختلاط الأنساب ومایترتب علی ذلک من محاذیر**“(فتاوی الشبکۃ الاسلامیہ: ۶/ ۲۹۸۳)، یہاں تک کہ شوہر کی اجازت ورضامندی سے بھی اس کے عدم جواز میں کوئی فرق نہیں پڑے گا: ”**ھل یجوزللمرأۃ ادخال المنی من الرجل الغریب فی رحمھا ،مع استیذان من زوجھا؟الفتوی :لایجوزالقدوم علی ھذاالأمر لمافیہ من المخالفۃ الواضحۃ للشرع والأخلاق ولوأذن جمیع الأطراف**“(سابق)، اور اس وجہ سے بھی کہ یہ حکماً زنا ہے اور زنا کی اجازت شوہر بھی دے دے تو یہ جائز نہیں ہوتا ہے۔

☆☆☆

اعضاءواجزاءانسانی کا عطیہ

مفتی عمرامین الٰہی☆

اللہ تبارک وتعالیٰ کے بے شمار احسانات وانعامات میں سے جو خاص طور پر ہمارے زمانے سے متعلق ہیں آج کے سائنسی انکشافات وتحقیقات بھی ہیں، اللہ عزوجل نے سائنس کو اتنی ترقی عطا فرمائی کہ کل کی ناممکنات آج کی ممکنات میں تبدیل ہوگئیں، جدید میڈیکل سائنس ہی کو لیجئے کہ کل تک جو انسان تداوی کے لیے صرف جمادات ونباتات پر منحصر تھا وہ آج حیوانات سے بھی آگے انسان کے ذریعے تداوی کی طرف بڑھ گیا ہے جس کی ایک کڑی اعضاء انسانی کی پیوندکاری ہے۔

اعضاء کی پیوندکاری سے متعلق دو چیزیں ہیں:

(۱) ایک انسان کا عضو اسی کے جسم میں پیوند کیا جائے، یہ مسئلہ تقریباً روز اول ہی سے علماء وفقہاء کے درمیان بالاتفاق جائز رہا ہے کیوں کہ اس کی بہترین نظیر دور نبوت علی صاحبہا الف الف تحیہ ہی میں ملتی ہے، چنانچہ روایات میں ہے کہ غزوہ بدر یا احد کے موقعہ پر حضرت قتادہ بن نعمانؓ کی آنکھ باہر آگئی تو لوگوں نے اسے کاٹنا چاہا لیکن پھر رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ان کی آنکھ اپنے دست مبارک سے واپس اپنی جگہ لگائی اور وہ ٹھیک ہوگئی بلکہ پھر پہچانا ہی نہیں جاتا تھا کہ وہ کون سی آنکھ ہے (مسند ابوعوانہ رقم الحدیث ۶۹۲۹، مسند ابی یعلیٰ رقم الحدیث ۱۵۴۹) معلوم ہوا کہ اس کے جواز کی دلیل خود نبی کریم ﷺ کا فعل مبارک ہے اس لیے یہ بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) ایک زندہ یا مردہ انسان کا عضو دوسرے زندہ انسان میں پیوند کیا جائے، اس بارے میں اگرچہ کچھ علماء کا اختلاف تھا تاہم آج تقریباً جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں اور دنیا کی بڑی فقہی اکادمیوں نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے، لہٰذا اس پر مزید کلام کی کوئی ضرورت نہیں، اب رہی بات اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ وتبرع کی تو اس بارے میں اب تک علماء وفقہاء کی دورائیں سامنے آئی ہیں:

☆ مدرس، دارالعلوم الٰہیہ شاہ فیصل کالونی صورہ سری نگر کشمیر۔

(۱) پہلی رائے:

علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ انسان اپنے اعضاء کا تبرع اور عطیہ کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

(۲) دوسری رائے:

لیکن علماء کی ایک بہت بڑی جماعت اس کے جواز کی قائل ہے، ان میں مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ اور دیگر فقہی انجمنوں کے اکثر اراکین علماء وفضلاء بھی ہیں (دیکھیں ! مجمع الفقہ الاسلامی مکہ کے سیمینار منعقدہ ۲۸، ۴، ۱۴۰۸ھ اور مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے سیمینار منعقدہ ۱۴۰۸ھ کے فیصلے)۔

اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ کی شرائط:

جوحضرات اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ کے جواز کے قائل ہیں، انہوں نے کچھ شرائط رکھی ہیں جن میں سے کچھ اہم شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی شرط: ضرورت کا تحقق:

اعضاء واجزاء انسانی کے تبرع وعطیہ کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ معطیٰ لہ ایسا شخص ہو جو واقعی حالت ضرورت میں ہو یعنی اگر اسے وہ عضو نہ ملا تو اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو نیز وہ ضرورت کسی دوسرے مصنوعی آلہ سے یا حیوانی جز سے یا اسی طرح کسی میت کے عضو سے پوری نہ ہو رہی ہو اگر وہ ضرورت کسی مصنوعی آلہ سے یا حیوانی جزء یا کسی میت سے پوری ہو رہی ہے تو زندہ انسان کے لیے اس جزء کو عطیہ کرنا درست نہیں ہوگا اور میت کا تذکرہ اس لیے کیا کہ میت سے وہ جزء لینے میں اتنا حرج نہیں ہے، جتنا کہ زندہ سے لینے میں اور شریعت کا اصول ہے: "**إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما**" (شرح المجلہ ۱/ ۳۷)۔

نیز قاعدہ ہے: "**التحريم المخفف أولى أن يقتحم من التحريم المثقل**" (احکام القرآن لابن العربی ۱/ ۱۰۴) (ہلکی حرمت کا ارتکاب سخت حرمت کے مقابلے اولی ہے)۔

اسی طرح سے یہ بھی دیکھا جائے گا کہ متبرع یا معطی کے لیے اس جز کی اہمیت معطیٰ لہ سے اہم نہ ہو، یعنی اگر وہ عطیہ کرے تو اسے ہلاکت کا خطرہ ہو کیوں کہ قاعدہ ہے: "**لايزال الضرر بمثله أو بما هو أكثر منه**" (الاشباہ والنظائر ص ۸۵) (ضرر کو اس جیسے ضرر یا اس سے بڑھ کر ضرر کے ذریعے دور نہیں کیا جائے گا)۔

یا اسی طرح اگر کسی شخص کا ایک گردہ ٹھیک ہے اور وہ دوسرے سے گردے کے عطیہ کا سوال کرے تو اس شخص کے لیے اسے گردہ عطیہ کرنا جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ یہاں معطیٰ لہ میں حالت ضرورت ومجبوری نہیں پائی جارہی ہے۔

دوسری شرط: اہلیت:

دوسری شرط یہ ہے کہ معطی تبرع اور عطیہ کا اہل ہو یعنی وہ شخص عاقل، بالغ، ممیّز ہو، لہٰذا پاگل یا مجنون اور نابالغ کا عطیہ معتبر نہیں ہوگا، کیوں کہ عطیہ کے لیے معطی کی رضا شرط ہے اور ان حضرات کی رضا معتبر ہی نہیں بلکہ ان کے اولیاء کو بھی ان کی طرف سے عطیہ کی اجازت نہیں ہوگی۔

تیسری شرط: معطیٰ لہ معصوم الدم ہو:

اعضاء واجزاء انسانی کے تبرع وعطیہ کے لیے علماء نے تیسری شرط یہ بیان کی ہے کہ معطیٰ لہ معصوم الدم ہو، کیوں کہ اس کی زندگی کی حفاظت کی ذمہ داری ہے کہ مہدور الدم اس کی زندگی غیر محفوظ بلکہ شرعاً مستحق ہلاکت ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے مضطر کے لیے حربی اور مرتد کو قتل کر کے اس کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے بلکہ اگر کوئی محصن زانی ہو یا اس پر قصاص ہو تو اسے بھی قتل کر کے اس کا گوشت کھانے کی اجازت دی گئی ہے، لہٰذا یہ شرط ضروری ہوگی کہ معطیٰ لہ معصوم الدم ہو نہ کہ غیر معصوم الدم، اگر کوئی شخص کافر حربی، مرتد، زانی محصن یا جس پر حد قصاص ہو ان کے لیے اعضاء یا کسی بھی جزء کا عطیہ کرے تو یہ جائز نہیں ہوگا۔

چوتھی شرط: انتقال کی اہلیت:

چوتھی شرط یہ ہے کہ جو عضو عطیہ کیا جا رہا ہے وہ معطیٰ لہ کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہو، مثلاً: گردہ وغیرہ اور اگر وہ ایسا جزء یا عضو ہے جو منتقل کرنا ناممکن ہو تو اس کا عطیہ کرنا جائز نہیں ہوگا، مثلاً: اگر کوئی دماغ کا تبرع کرے تو شاید اب تک اس کی پیوند کاری ممکن نہیں ہو سکی ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں ہوگا۔

پانچویں شرط: عدم ضرر شدید:

پانچویں شرط یہ ہے کہ معطی یا متبرع کو عطیہ کرنے کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو بلکہ وہ عضو اس سے باسانی منتقل کیا جا سکتا ہو اور اسے کوئی نقصان نہ ہو۔

ان اہم شرائط کی بنیاد پر اگر اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ کو جائز قرار دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مختلف اعضاء واجزاء کے عطیہ کے احکام:

اعضاء واجزاء انسانی میں کچھ ایسے ہیں کہ تمام حضرات ان کے انتقال پر متفق ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ تمام حضرات ان کے عدم انتقال پر متفق اور کچھ مختلف فیہ ہیں۔

پہلی قسم:

بہر حال وہ اعضاء جن کے انتقال پر تمام حضرات متفق ہیں ان میں خون، جلد، دودھ اور ہڈیوں کا گودا وغیرہ ہیں ان

کے تبرع وعطیہ کے سلسلہ میں تقریباً تمام حضرات متفق ہیں، لیکن ماقبل کی شرائط کے ساتھ، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اجزاء ایسے ہیں کہ ایک جسم سے انتقال کے بعد بھی یہ دوبارہ recover ہوجاتے ہیں بلکہ اطباء کے بقول اگر انسان اپنے جسم سے ہر سال خون کی کچھ مقدار نکالا کرے تو اس سے اس کا جسم مضبوط اور تندرست ہوگا۔

دوسری قسم:

اعضاء کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن کے انتقال کی حرمت پر تمام متفق ہیں اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ایسے اعضاء جن پر زندگی کا انحصار ہو یعنی ایسا جزء کہ اگر اسے کسی کے جسم سے منتقل کیا جائے تو معطی اور متبرع کی موت کا اندیشہ ہو مثلاً: قلب، جگر، یا کسی کے پاس صرف ایک گردہ یا پھیپھڑا ہے یا اسی طرح دماغ ان اعضاء کا انتقال بالکل ناجائز ہوگا، کیوں کہ زندگی کا انحصار ان پر ہوتا ہے اگر چہ کوئی اپنی رضا سے ہی ایسا کرے پھر بھی جائز نہیں ہوگا اور یہ ''**ولا تقتلوا أنفسکم**'' (النساء ۲۹) میں داخل ہوگا، اور یہاں اس مجاہد پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جو بہت سارے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے، کیوں کہ اس حالت میں بھی اس کی موت یقینی نہیں ہوتی بلکہ کئی دفعہ وہ زندہ بچتا ہے اور دشمن بھاگ جاتے ہیں یا مرجاتے ہیں اور ہمارے اس مسئلہ میں تو موت یقینی ہے، نیز یہ ایثار میں بھی داخل نہیں ہوسکتا (انظر احکم التبرع بالاعضاء الآدمیۃ ص ۴۵ محمد نعیم یاسین)۔

(۲) وہ اعضاء بھی اس حکم میں ہیں جو انسانی جسم میں تنہا ہیں مثلاً: زبان، ناک وغیرہ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو انتقالِ عضو کا جواز نقل کیا گیا ہے وہ تو ضرورت کی بنیاد پر ہے اور اصول شرع کا قاعدہ ہے کہ ''**الضرر لایزال بمثله**''، لہٰذا اگر کسی کی صرف ایک آنکھ ہو اور وہ دوسرے کو عطیہ کرنا چاہے تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا۔

(۳) وہ اعضاء جو دو دو ہیں اگر ان دونوں کو عطیہ کیا جائے یہ بھی درست نہیں ہوگا، مثلاً کوئی دونوں آنکھیں یا دونوں کان عطیہ کرے تو یہ جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ بھی اصول شرع ''**الضرر لایزال بمثله**'' کے خلاف ہے۔

(۴) اسی طرح اگر عضو تو دوہرے ہیں لیکن ایک کے انتقال سے ضرر فاحش ہو رہا ہے مثلاً: پھیپھڑا کہ اگر ایک منتقل کیا جائے تو عادتاً اس کا زندگی گزارنا بڑا مشکل ہے، لہٰذا یہ بھی جائز نہیں۔

(۵) نیز اس حرمت میں اعضاء تناسلیہ کا عطیہ بھی داخل ہوگا، چاہے آلۂ تناسل، خصیہ یا بچہ دانی یا ہر وہ جزء جس کا توالد وتناسل سے براہ راست واسطہ ہو، یہ سارے اعضاء واجزاء بھی اس حرمت میں شامل ہوں گے یعنی ان کا تبرع اور انتقال بھی بالکل ناجائز ہوگا اور اس کا سب سے بڑا مفسدہ اختلاط انساب ہے کہ اس سے نسب کا سارا نظام متاثر ہوگا (تفصیل کے لیے دیکھیں! قضایا فقہیہ فی نقل الاعضاء البشریۃ ص ۸۰، ۸۵)۔

تیسری قسم:

اعضاء کی تیسری قسم وہ اعضاء ہیں کہ جو مکرر بھی ہیں اور ان کے انتقال سے حرمان کلی بھی نہیں ہوتا ہے، جیسے دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ کسی اندھے کو منتقل کرنا، یا دو ہاتھوں یا پاؤں میں سے ایک کسی ایسے شخص کو دینا جس کے پاس دونوں نہ ہوں۔ اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات جواز کے اور بعض عدم جواز کے قائل ہیں، چنانچہ قائلین حضرات کی دلیل یہ ہے کہ معطی سے وہ چیز منتقل کرنا ہلاکت کا بھی باعث نہیں اور اس سے اس کی زندگی پر بھی کوئی خاصا اثر نہیں پڑتا ہے، نیز ضرورت بھی پائی جا رہی ہے کیوں کہ ضرورت صرف یہ نہیں ہے کہ مریض کی جان بچالی جائے بلکہ ضرورت یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی منفعت سے کلی طور پر محروم ہوا سے عطیہ دیکر اس کو کسی قدر منفعت کے قابل بنایا جائے (الانتفاع من اعضاء الآدمی حیا ومیتا ص ۱۰۱، اللبوطی، بیان للناس من الازہر الشریف ۲/۳۱۱)۔

الغرض! ان حضرات نے اس مسئلہ کو دو گردوں کے مسئلہ پر قیاس کیا ہے۔

جو حضرات عدم جواز کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس سے بڑے نقصان کا اندیشہ ہے بلکہ بڑا نقصان یقینی ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ عطیہ کرے تو عمر بھر اسے اس کی منفعت سے محروم ہونا پڑے گا۔

اگر غور کیا جائے تو قائلین عدم جواز کا قول راجح معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دو آنکھوں، دو ہاتھوں یا دو پاؤں میں سے ایک عطیہ کرے تو اس سے انسان کے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ منفعت میں بھی نقصان ہوگا اور یہ "**لقد خلقنا الإنسان فی احسن تقویم**" کے مغائر اور "**ولآمرنهم فليغيرن خلق الله**" کے ضمن میں داخل ہوگا، کیوں کہ یہ ظاہر سے بھی تعلق رکھتا ہے اور حسن و جمال اور خلقت کے ساتھ ساتھ اپنی منفعت بھی کھو دیتا ہے، نیز اس سے معطی کو بہت تکلیف بھی ہوگی۔

اسی طرح ان اعضاء کا عطیہ اضطرار اور ضرورت میں داخل نہیں، کیوں کہ ان اعضاء کے معدوم ہونے کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ ان اعضاء کا بدل بھی مارکیٹ میں موجود ہے، نیز یہ ضرورت ایک مردہ انسان سے بھی پوری کی جاسکتی ہے جو زندہ انسان سے حصول سے اخف ہے لہذا اخف الضررین پر عمل کیا جاسکتا ہے، نیز اگر کسی زندہ انسان سے لیا جائے تو وہ "**الضرر لایزال بمثله**" کے ضمن میں داخل ہوگا جو شرعاً صحیح نہیں، لہذا اس میں قائلین عدم جواز کا قول ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

شیخ عارف علی عارف قرہ داغی نے اس مسئلہ میں ایک اصول بیان فرمایا ہے جو کسی حد تک تمام صورتوں پر حاوی ہے، موصوف فرماتے ہیں:

"یحرم نقل عضو یؤدی إلی الموت أو فوات جنس عضو أو وظیفة من وظائف الجسم أو جمال ظاهر أو الإضرار بذلک اضرارا شدیداً او یؤدی نقله الی مساس بالدین او العرض او النسب او اخلال بین بالتکسب" (قضایا فقہیۃ فی نقل الاعضاء البشریۃ ص۱۰۶)۔

اس عضو کا منتقل کرنا حرام ہوگا جو موت یا کسی عضو کی جنس کے فوات یا جسم کی ڈیوٹی یا ظاہری حسن و جمال یا سخت نقصان کا پیش خیمہ ہو یا اس سے سخت قسم کا نقصان ہو رہا ہو یا اس کے انتقال سے دین، عرض یا نسب کے ساتھ چھیڑ خوانی ہو رہی ہو یا کسب کے ساتھ واضح خلل ہو رہا ہو، ان سب اعضاء کا منتقل کرنا نا جائز ہوگا۔

چنانچہ اس اصول میں اوپر کی ذکر کردہ ساری چیزیں آئیں گی۔

اعضاء انسانی کی خرید و فروخت:

انسانی عضو یا جزء کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں بھی علماء کے دو قول ہیں:

پہلا قول:

کچھ حضرات حالت ضرورت میں اعضاء و اجزاء انسانی کی بیع کی اجازت دیتے ہیں، ان حضرات میں شیخ محمد نعیم یاسین (بیع الاعضاء الآدمیۃ) شیخ احمد محمد جمال (زراعۃ الاعضاء البشریۃ) شیخ جمیل عبداللہ بن مبارک (نظریۃ الضرورۃ الشرعیۃ ص ۱۴۱) شیخ حسام الدین الاہوانی (المشاکل القانونیۃ التی تثیر ہا عملیات زرع الاعضاء البشریۃ ص ۱۴۱) شیخ احمد محمد سعد (زرع الاعضاء بین الحظر والاباحۃ ص ۱۴۳) شیخ عبدالمطلب عبدالرزاق حمدان (مدی مشروعیۃ الانتفاع باعضاء الآدمی حیا و میتا فی الفقہ الاسلامی ص ۵۴)۔

دوسرا قول:

علماء کی ایک جماعت بلکہ اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ اعضاء و اجزاء انسانی کی بیع نا جائز ہے، ان میں شیخ احمد شرف الدین، شیخ محمد متولی شعراویؒ اور مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے بھی اپنے ۱۹۸۸ میں منعقدہ سیمینار میں یہی فیصلہ فرمایا ہے، نیز دیگر فقہی انجمنوں نے بھی یہی فیصلہ دیا ہے۔

قائلین جواز کی دلیل:

قائلین جواز نے انسانی دودھ کی بیع پر قیاس کرتے ہوئے اعضاء و اجزاء انسانی کی بیع کی اجازت دی ہے، گویا کہ ان حضرات نے اپنے مسئلہ کی بنیاد دودھ کے مسئلہ کو بنایا حالاں کہ وہ متفق علیہ مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ، بعض شوافع اور مالکیہ عدم جواز کے قائل ہیں اور ظاہریہ، زیدیہ نیز شوافع اور حنابلہ

جواز کے قائل ہیں (تفصیل ودلائل کے لیے دیکھیں! بدائع الصنائع ۵ / ۱۴۵، المجموع ۹ / ۲۷۶)۔

قائلین حرمت کے دلائل:

پہلی دلیل:

قائلین حرمت نے وہ تمام نصوص اپنے استدلال میں پیش کی ہیں جن میں انسانی کرامت کا ذکر ہے، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"عظم الآدمی وشعره لایجوز بیعه لا لنجاسته لأنه طاهر فی الصحیح من الروایة ولکن احتراماً له والابتذال بالبیع یشعر بالاهانة" (بدائع الصنائع ۵ / ۱۴۲)۔

آدمی کی ہڈی اوراس کے بال کی بیع جائز نہیں ہے اس کی نجاست کی وجہ سے نہیں، کیوں کہ وہ صحیح قول کے مطابق پاک ہے، لیکن اس کے احترام کی وجہ سے اس کی بیع ناجائز ہے اور بیع کے ذریعے اس کی حقارت کرنا اس کی اہانت ہے۔
معلوم ہوا کہ انسانی اعضاء یا اجزاء کی خرید وفروخت کرامت وشرافت انسانی کے مغائر ہے، لہٰذا یہ ناجائز ہے۔

دوسری دلیل:

قائلین حرمت نے اس حدیث شریف سے بھی استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

"ثلاثة أنا خصمهم یو م القیامة .... رجل با ع حرا وأکل ثمنه" (بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا) (تین افراد ایسے ہوں گے جن کے خلاف قیامت کے دن میں خود مدعی ہوں گا، ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے آزاد شخص کو بیچا اوراس کی قیمت کواستعمال میں لایا)۔

اس حدیث شریف میں صراحتاً کسی آزاد کو بیچنے کی حرمت بیان فرمائی گئی بلکہ اس میں شدت بھی کہ اللہ جل شانہ اس کے خصم ہوں گے، نیز فقہاء میں سے کسی نے بھی کل اور جزء میں تفریق نہیں فرمائی، لہٰذا یہ حرمت کل اور جزء دونوں کو شامل ہوگی۔

تیسری دلیل:

خرید وفروخت کے لیے مبیع مال ہونا چاہئے اور انسانی اعضاء واجزاء مال نہیں ہیں، لہٰذا ان کی خرید وفروخت ناجائز ہوگی، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ مال کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"المال اسم لغیر الآدمی خلق لمصالح الآدمی و أمکن احرازه والتصرف فیه علی وجه الاختیار" (البحرالرائق ۴ / ۲۵۶) (مال انسان کے علاوہ ہراس شئ کا نام ہے جوانسان کی مصالح کے لیے تخلیق ہوئی اوراسے

تحویل میں لینا اور اختیار کے ساتھ اس میں تصرف کرنا ممکن ہو)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"ولا یرد علیه العبد فانه وان کان فیه معنی المالیة فانه لیس مالا علی الحقیقة حتی لا یجوز قتله واهلاکه" (ردالمحتار ۴/۵۰۱)۔

(اس پر غلام کو لیکر اشکال نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ اگرچہ اس میں مالیت کے معنی ہیں لیکن وہ حقیقی طور پر مال نہیں ہے اسی لئے اسے قتل کرنا یا ہلاک کرنا جائز نہیں)۔

معلوم ہوا کہ انسانی اعضاء واجزاء مال ہی نہیں لہٰذا اس کی بیع بھی درست نہیں۔

خلاصہ:

فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قائلین حرمت کا موقف راجح ہے، کیوں کہ اعضاء تو دور کی بات فقہاء کرام نے انسانی بالوں کی بیع کو بھی انسانی شرافت وکرامت کے منافی قرار دیکر نا جائز قرار دیا ہے، بلکہ مشرکین نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص کی لاش دس ہزار درہم میں خریدنے کی کوشش کی لیکن آپ ﷺ نے بالکل منع فرمایا۔

"عن ابن عباسؓ ان المشرکین ارادوا ان یشتروا جسد رجل من المشرکین فابی النبی ﷺ ان یبیعهم" (ترمذی باب ماجاء لاتفادی جیفۃ الاسیر)۔

"قال ابن هشامؒ: بلغنا انهم بذلوا فیه عشرة الآلاف" (اعلاء السنن ۱۴/۱۱۳)۔

معلوم ہوا کہ انسان بکاؤ مال نہیں، اسے تجارت کی جنس نہیں بنایا جاسکتا، اگر انسان کے کسی ایک عضو کو فروخت کردینا جائز قرار دیا جائے تو پھر پورے انسان کو فروخت کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اگر یہ بند دروازہ ایک مرتبہ کھول دیا جائے تو پھر وہ وقت دور نہیں جب انسانی خرید وفروخت کی منڈیاں قائم ہوجائیں اور انسانیت کے سوداگر انسانوں کی سوداگری کرنے لگیں بلکہ جو لوگ غربت کے ہاتھوں تنگ آکر خودکشی کرسکتے ہیں، اپنی بیٹیوں کو بیچ سکتے ہیں وہ لوگ غربت کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنی اولاد کے اعضاء واجزاء بھی بیچ سکتے ہیں پھر سخت سے سخت قانون بھی ایسے مفاسد کا انسداد نہیں کرسکے گا، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اعضاء واجزاء انسانی کی خرید وفروخت کو ناجائز ہی رکھا جائے۔

استثنائی صورت:

لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس وقت دنیا میں اتنے مریض ہیں کہ صرف تبرع وعطیہ ہی سے کام نہیں چلے گا، کیوں کہ اعضاء واجزاء کے مستحق افراد کی تعداد لاکھوں میں ہے، اور ان کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اپنی ضرورت کے

اعضاء خرید لیں اور اپنی جان بچالیں تو ان حضرات کے لیے بعض علماء کرام نے اضطرار کے پیش نظر قیمت دیکر اعضاء خرید نے کی اجازت دی ہے، لیکن بیچنا بہرحال حرام ہی ہے اور یہ رائے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (جدید فقہی مسائل ۵/۸۹)، شیخ عبدالعزیز بن باز (مجلۃ الخیریۃ عدد ۵/ ۱۹۸۹ء)، شیخ ہاشم جمیل (مجلۃ الرسالۃ الاسلامیۃ عدد ۲۱۱/ص ۱۷۹)، شیخ ابو زید بکر عبداللہ (التشریح الجثمانی ص ۲۴)، شیخ سید محمد طنطاوی (جریدۃ السیاسۃ ۱۴/۱/۱۹۷۹)، شیخ عبدالملک السعدی وغیرہم کی ہے (مجلۃ الرسالۃ الاسلامیۃ عدد ۲۴۲/۳/۸۵)۔

ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حالت اضطرار میں ہو تو اس کے لیے اعضاء واجزاء کا خریدنا تو جائز ہوگا البتہ بیچنا بہرصورت حرام ہوگا۔

ان حضرات کی رائے قرین قیاس ہے کہ شریعت میں بہت سارے معاملات ایسے ہیں کہ ضرورت کی بناء پر ان کی خرید جائز قرار دی گئی ہے مثلاً: قرآن شریف کا خریدنا، صحابہ کرامؓ قرآن کی بیع کے بالکل عدم جواز کے قائل تھے (المجموع شرح المہذب ۹/ ۲۵۲)۔

مردہ کے جسم سے انتفاع:

شریعت اسلامیہ میں زندہ انسان ہی نہیں بلکہ میت کے ساتھ بھی اعزاز واکرام کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ عزت واحترام کے ساتھ اسے نہلانا، گہری قبر کھودنا اس کے ستر کی طرف نہ دیکھنا، عیوب نہ گنوانا اسی احترام کے پیش نظر ہے بلکہ مرنے کے بعد قبر کا بھی احترام کرنے کو کہا گیا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لأن يجلس أحدكم على جمرة فتحرق ثيابه فتخلص الى جلده خير له من أن يجلس على قبر" (صحیح مسلم، باب النہی عن الجلوس علی القبر والصلاۃ علیہ)۔

(اگر تم میں سے کوئی آگ کے انگارے پر بیٹھ جائے اور وہ اس کے کپڑے جلا دے اور اس کا اثر اس کی جلد تک پہنچ جائے یہ بہتر ہے اس سے کہ تم میں سے کوئی شخص قبر پر بیٹھ جائے)۔

یہ تو اس جگہ کا حال ہے جہاں یہ میت دفن کیا گیا ہو اور اس سے چھیڑ خوانی کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"كسر عظم الميت ككسره حيا"** (مسند احمد رقم الحدیث ۲۴۷۳۹) (یعنی میت کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا)۔

شرح سیر کبیر میں ہے: **"والآدمی محترم بعد موته على ما كان عليه فى حياته"** (۱/۸۸،۸۹) (آدمی مرنے کے بعد بھی اسی طرح قابل احترام ہے جیسا کہ مرنے سے پہلے تھا)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان بعد از مرگ بھی قابل احترام واکرام ہے، لیکن کیا ضرورت اور حاجت کی بناء پر اس مردہ سے تعرض اور اس کے جسم میں تصرف کیا جاسکتا ہے؟ اس بارے میں علماء کے دو قول ہیں:

پہلا قول:

علماء کی ایک جماعت بلکہ اکثر حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں، لیکن کچھ شرائط وضوابط کے ساتھ جنہیں ہم آگے بیان کریں گے۔

دوسرا قول:

علماء کی ایک چھوٹی سی جماعت عدم جواز کی قائل ہے۔

قائلین کے دلائل:

پہلی دلیل:

قائلین حضرات فرماتے ہیں کہ ضرورت کے وقت میت میں تصرف کیا جاسکتا ہے اور فقہ میں اس کی بہت ساری نظائر موجود ہیں، چنانچہ بہت سارے فقہاء جن میں جمہور احناف اور شوافع بھی ہیں اس بات کے قائل ہیں کہ اگر بچہ ماں کے پیٹ میں ہو اور والدہ کی وفات ہوجائے تو اس کا پیٹ چاک کر کے بچہ کو نکالا جائے گا اور یہ ارتکاب اخف الضررین لدفع اعظمہما والے قاعدہ کی بنیاد پر ہوگا کہ دو نقصانوں میں سے کم تر کا ارتکاب بڑے نقصان کے مقابلہ میں برداشت کیا جاسکتا ہے، نیز یہ قاعدہ بھی کہ الاشد منہما یزال بالاخف اور نیز زندہ کو بچانے کی مصلحت میت کی حرمت کے مفسدہ سے عظیم ہے، لہٰذا اس مفسدہ کو گوارا کر کے عظیم مصلحت کی رعایت کی جائے گی (قواعد الاحکام ۱/ ۱۰۲)۔

البتہ مالکیہ اور حنابلہ شق بطن کے قائل نہیں ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ مثلہ ہے اور بچہ کی زندگی موہوم ہے اور یہ بچہ عام طور پر زندہ نہیں رہتا، لہٰذا ایک موہوم شئ کی بناء پر اس یقینی حرمت کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا (المغنی ۲/ ۵۵۱)۔

ان حضرات کے ان دلائل پر اگر آج کی جدید میڈیکل سائنس کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ دلائل بالکل کمزور ہیں، کیوں کہ یہ مثلہ نہیں ہے جیسا کہ ہم نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا، نیز بچہ کا ہونا یا نہ ہونا آج کے دور میں یقینی ہوتا ہے، لہٰذا ان حضرات کے ہاں بھی آج اسے گوارا کیا جائے گا۔

مانعین کے دلائل:

پہلی دلیل:

مانعین کی پہلی دلیل وہ تمام نصوص ہیں جو میت کے ساتھ اکرام کرنے پر دلالت کرتی ہیں، ان کے جواب میں یہ کہا

جا تا ہے کہ یہ ساری نصوص بے شک اکرام میت پر دال ہیں لیکن یہاں حالت اضطرار ہے، اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہئے، نیز اس میں اہانت کمتر اور فائدہ اس سے بڑھ کر ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جو ہڈی توڑنا وغیرہ منع کیا گیا ہے وہ تو بیکار اور عبث حالت میں ہے جب ضرورت ہو اس وقت جائز ہے۔

دوسری دلیل:

مانعین کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اکثر فقہاء مضطر کے لیے میت کے گوشت میں سے کھانے کو حرام قرار دیتے ہیں اور یہ امام احمدؒ، امام مالکؒ، اکثر احناف اور بعض شوافع کا مسلک ہے نیز ظاہریہ کا بھی یہی مسلک ہے (فتح القدیر ۸ / ۶۴، الفتاوی الہندیہ ۵ / ۳۵۴، المحلی ۸ / ۱۳۴، ردالمحتار ۵ / ۲۱۵، المغنی ۱۱ / ۷۹)۔

قائلین کی طرف سے اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ یہ بات صحیح ہے کہ اکثر فقہاء اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، لیکن جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا کہ فقہاء کی ایک جماعت جواز کی بھی قائل ہے اور جو حضرات عدم جواز کے قائل ہیں، انہوں نے اس کے عدم جواز کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں چنانچہ علامہ ابن حزمؒ عدم جواز پر استدلال یوں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میت کو دفنایا جائے اب اگر کوئی شخص اسے کھاتا ہے تو اس نے اس کو نہیں دفنایا اور نہ دفنانے کی وجہ سے اس نے اللہ کی نافرمانی کی لہٰذا یہ جائز نہیں۔

اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ اصل تو واجب دفنانا ہی ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے اس میں خفت آتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص کشتی میں مرجائے اور ساحل سمندر دور ہو تو اسے غسل وکفن اور نماز جنازہ کے بعد سمندر میں پھینکا جائے گا (زراعۃ الاعضاء، ہاشم جمیل)۔

یہاں تو اس کو چھپانا اور دفنانا نہیں پایا گیا لیکن پھر بھی فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے اور مسئلہ مجوث عنہا بھی حالت اضطرار میں ہے، نیز یہ بھی واضح رہے کہ دفنانے کا حکم میت کے لیے دیا گیا ہے اور یہاں جو عضو ہم منتقل کررہے ہیں وہ تو مردہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ تو زندہ ہے، تبھی تو وہ دوسرے کے کام آسکتا ہے، لہٰذا وہ اس حکم سے خارج ہے۔

مالکیہ اور شوافع نے اپنے استدلال میں یوں فرمایا ہے کہ میت کی حفاظت زندہ کی طرح لازم ہے اور یہاں حفاظت میں خلل واقع ہورہا ہے، لیکن امام نوویؒ نے اس پر رد کرتے ہوئے فرمایا ہے:

”ان حرمة الحی آکومن حرمة المیت“ (المجموع ۹ / ۴۲، ۵۲) (زندہ کی حرمت مردہ کی حرمت سے مؤکد ہے)۔

یعنی مردہ کی حرمت زندہ کے مقابلے کچھ بھی نہیں بلکہ زندہ کی حرمت وصیانت میت کی حرمت وصیانت سے اہم

ہے،لہٰذاان حضرات کا یہ استدلال بھی قوی نہیں۔

معلوم ہوا کہ میت سے استفادہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس مسئلہ میں تو زندہ کے مقابلہ مردہ کو ترجیح دی جائے گی کیوں کہ اصول ہے:" **اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمھمابارتکاب اخفھما ضررا** "اور یہاں اخف الضررین مردہ سے انتفاع ہے،لہٰذا اسے جائز قرار دیا جائے گا۔

مردہ کی وصیت کا اعتبار ہوگا یا ورثاء کی اجازت کا؟

یہاں دو مسئلے قابل غور ہیں:

(۱) کیا کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے جسم کے کسی حصہ کے بارے میں وصیت کرسکتا ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے،بعض حضرات عدم جواز کے اور اکثر علماء جواز کے قائل ہیں۔

مانعین کی دلیل یہ ہے کہ انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے،لہٰذا اس کی وصیت کرنے کا بھی مجاز نہیں، نیز انسان کا جسم مال بھی نہیں اور وصیت کے لیے مال متقوم کی شرط لگائی گئی ہے،علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:"**یشترط فی الموصی به ان یکون مالا متقوما**" (بدائع الصنائع ۱۰/۴۸۸۶)(جس چیز کی وصیت کی جائے اس میں شرط ہے کہ وہ مال متقوم ہو)۔

قائلین کی طرف سے پہلے جزء کا جواب پچھلے صفحات میں آچکا ہے، نیز یہاں وصیت سے اس کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ یہاں مطلب کسی انسان کا اپنے حق سے سبکدوش ہوجانا ہے اور اپنے اوپر قدرت دینا ہے اور انسان اس کا مجاز ہے جیسا کہ اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

قائلین فرماتے ہیں: انسان کو اپنے آپ پر ولایت حاصل ہے اور اس کے خلاف کوئی معتمد علیہ دلیل نہیں ہے،لہٰذا انسان اپنے جسم کے کسی بھی حصہ کے بارے میں وصیت کرنے کا مجاز ہے اور اس کی وصیت بعد از مرگ نافذ بھی ہوگی اور اسے اس سے رجوع کا بھی حق ہے(قضایا فقہیہ ص ۱۳۷)۔

(۲) اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں وصیت نہیں کی تو کیا اس کے ورثہ اس کی موت کے بعد اس کی میت سے انتفاع کی اجازت دینے کے مجاز ہیں؟

اس بارے میں بھی علماء کی مختلف رائیں ہیں، اکثر علماء جواز کے قائل ہیں، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی نے قتل کیا تو مقتول کے ورثاء کو اسے معاف کرنے کا بھی اختیار ہے گویا کہ اس کے جسم کا حق ورثاء کی طرف منتقل ہوگیا، اسی طرح اگر کسی نے دوسرے پر تہمت لگائی اور یہ مقذوف مطالبہ سے پہلے ہی مرگیا تو حد قذف کا مطالبہ ان کے ورثاء کی طرف منتقل ہوگا اگر وہ دعویٰ قائم کر کے حد جاری کرنا چاہیں تو انہیں اس کا حق ہوگا، اور اگر معاف کریں تو اس کا بھی حق ہوگا۔

معلوم ہوا کہ جو حق میت کو اپنی زندگی میں تھا اب اس کے مرنے کے بعد یہ حق اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوگا اور جب انسان کو اپنی زندگی میں عطیہ وتبرع کرنے کا حق ہے، اسی طرح اس کے ورثہ کو اس کی موت کے بعد اس کا حق حاصل ہوگا۔

مردہ کے جسم سے انتفاع کے لیے شرائط:

جو حضرات میت کے جسم سے جواز انتفاع کے قائل ہیں انہوں نے اس میں کچھ شرائط بھی رکھی ہیں، اگر ان شرائط کی رعایت کر کے مردہ سے انتفاع کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

(۱) موت کا تحقق:

سب سے پہلی شرط موت کا تحقق ہے، یعنی شرعی طور پر اسے میت قرار دیا جائے بایں طور کہ اس کی سانس کی آمد ورفت پوری طرح رک جائے اور موت کی علامات بھی مکمل طور پر ظاہر ہو جائیں، کیوں کہ وصیت کا نفاذ اور میراث کا اجراء وغیرہ تب ہی جائز ہوگا۔

(۲) اہل کی طرف سے اجازت:

میت کے جسم سے انتفاع کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس میت نے وصیت کی ہو یا اس کے ورثہ اس کی اجازت دیں، نیز وہ میت یا اس کے ورثہ اس کے اہل بھی ہوں یعنی جو شخص وصیت کر رہا ہے یا جو وارث اجازت دے رہا ہے وہ اس وصیت کا اہل بھی ہو مثلاً: عاقل بالغ ہو یہ احناف کا مسلک ہے، لیکن امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق صبی ممیّز کی وصیت بھی معتبر ہوگی۔

(۳) ضرورت یا عمومی حاجت کا تحقق:

یعنی منتقل الیہ طبی اعتبار سے ضرورت کے درجے میں پہنچ چکا ہو، یعنی ایسی حالت کہ اگر اسے وہ عضو نہ مل جائے تو اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو، نیز اس کی ضرورت کسی مصنوعی آلہ یا کسی جانور کے ذریعے پوری نہ ہو رہی ہو یا حاجت شدیدہ ہو، کیوں کہ حاجات کو بھی کبھی ضرورت کا درجہ دیا جاتا ہے۔

(۴) میت کا احترام اور اس کی اہانت سے بچنا:

جب کسی عضو کو میت سے منتقل کیا جائے تو آپریشن احترام کے ساتھ ہو، یعنی بلاضرورت چیر پھاڑ نہ ہو اور جتنی ضرورت ہو اتنا ہی استعمال کیا جائے بقیہ اعضاء کو احترام کے ساتھ دفن کیا جائے، کیوں کہ اصل وجوب دفن کرنا ہی ہے اور قاعدہ ہے "الضرورة تتقدر بقدرها"۔

(۵) مؤنث کے ساتھ پردہ کا اہتمام:

اگر منقول منہ کوئی عورت ہے تو اس کا عورت ہی آپریشن کرے تاکہ بے ستری نہ ہو جائے، لیکن اگر عورت میسر نہ ہو تو ضرورت کی بناء پر مرد بھی کر سکتا ہے، اسی طرح اس کے برعکس بھی یہی حکم ہے۔

(۶) منقول الیہ معصوم الدم ہو:

جس کے لیے یہ عضو منتقل کیا جا رہا ہے وہ معصوم الدم ہو، کیوں کہ غیر معصوم الدم جیسے حربی کافر وغیرہ تو خود زندگی کا مستحق نہیں، لہٰذا اس کے لیے کسی میت کے ساتھ چھیڑ خوانی درست نہیں۔

(۷) عضو کا صحیح استعمال:

جو عضو منتقل کیا جا رہا ہے وہ اسی مقصد کے لیے منتقل کیا جا رہا ہو جس کے لیے وہ منقول منہ کے جسم میں تھا، یعنی اگر کسی کے جسم سے گردہ یا جگر وغیرہ منتقل کیا جا رہا ہے تو اسے اسی کام کے لیے منقول الیہ کے جسم میں رکھا جائے۔ اگر بعض مغربی مما لک کی طرح میت سے اعضاء اخذ کر کے ان کو کریم crime وغیرہ میں استعمال کیا جائے یا اسی طرح کھاد وغیرہ میں یہ بالکل ناجائز ہوگا۔

(۸) منتقل کئے جانے والے اعضاء حرام نہ ہوں:

میت سے وہی اعضاء منتقل کیے جا سکتے ہیں جو حرام نہیں ہیں مثلاً: وہ اعضاء جو نسب کے اختلاط وغیرہ کا سبب ہوں، کیوں کہ ان کا انتقال بالاتفاق حرام ہے، چاہے وہ انتقال زندہ سے ہو یا مردہ سے۔

اعضاء کے عطیہ میں کفر واسلام کا فرق:

یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کفار و مسلمانوں کے اعضاء ایک دوسرے کو عطیہ میں دیکر ان کی پیوندکاری درست ہوگی یا نہیں؟ اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت:

پہلی صورت یہ ہے کہ کافر کے اعضاء کی مسلمان کے جسم میں پیوندکاری کی جائے، اس صورت کے جواز میں تقریباً تمام حضرات متفق ہیں، کیوں کہ کفر اس عضو میں سرایت نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے کافر دایہ کا دودھ مسلم بچہ کو پلانے کی اجازت دی ہے، علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

”ولاباس بان یستاجر المسلم الظئر الکافرة والتی قد ولدت من الفجور لأن خبث الکفر فی اعتقادها دون لبنها والانبیاء علیهم السلام والرسل صلوات اللّٰه علیهم فیهم من ارضع بلبن الکوافر وکذلک فجورها لایؤثر فی لبنها“ (المبسوط ۱۵/۱۲۷)۔

اس میں کوئی حرج نہیں کہ کوئی مسلم کسی دودھ پلانے والی کافر عورت کو اجرت پر رکھے، یا ایسی عورت کو جو فاجر ہو، کیوں کہ کفر کی خباثت اس کے اعتقاد میں ہوتی ہے دودھ میں نہیں، انبیاء کرام اور رسل عظام علیہم الصلوات والتسلیمات میں بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے کافر عورتوں کا دودھ پیا ہے، اسی طرح فاجرہ کے فسق وفجور کا اثر اس کے دودھ میں نہیں ہوتا۔

لیکن اس پر ایک اشکال کیا گیا ہے کہ کافر کا جسم تو ناپاک ہوتا ہے، اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: "**انما المشرکون نجس**" (التوبۃ ۲۸) (بے شک مشرکین ناپاک ہیں)، اور نجس چیز سے دوا دارود کیسے جائز ہوگا؟ لیکن ظاہری بات ہے کہ یہاں تو بات ضرورت کی ہورہی ہے کہ ایک انسان طبی اعتبار سے ضرورت کی حد میں داخل ہو چکا ہے اور ایسی صورت میں تو نجس اور حرام شئی سے بھی دوا کی جاسکتی ہے۔

دوسری صورت:

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے جسم کا کوئی حصہ کافر کے جسم میں پیوند کیا جائے، مثلاً کسی شخص کے والدین میں سے کوئی ایک کافر ہو اور اسے کسی عضو کی ضرورت ہو تو کیا مسلمان لڑکا اپنے کافر والد یا والدہ کو کوئی حصہ عطیہ کرسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں اگر ان دلائل پر غور کیا جائے جو جوازِ عطیہ کے لیے پیش کی گئی تھیں تو ان میں عموم پایا جاتا ہے، مثلاً: "**ویؤثرون علی انفسهم الخ**" (سورۃ الحشر ۹)، "**ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعاً**" (المائدہ ۳۲) ان میں سے کسی دلیل میں مسلمان کی تخصیص نہیں کی گئی ہے بلکہ سورہ ممتحنہ میں ارشاد ہے: "**لاینهکم اللّٰه عن الذین لم یقتلوکم ......**" (الممتحنۃ ۸)۔

(اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ تم کوئی نیکی کا یا انصاف کا معاملہ کرو)۔

اس آیت میں تو اللہ عزوجل صراحتاً کفار (ذمی، مستامن یا معاہد) کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمارہے ہیں اور اپنا کوئی جزء یا حصہ عطیہ کرکے کسی کی جان بچا لینے سے بہتر کون سا احسان اور اکرام ہوسکتا ہے۔

نیز فقہاء نے مسلمان عورت کے لیے کافر کے بچہ کو دودھ پلانے کی اجازت دی ہے، حالانکہ دودھ بھی انسان کا جزء ہے، لیکن اس کے باوجود شریعت نے مسلمان کا جزء کافر میں چلے جانے کو گوارا کیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: "**یجوز للمسلمة ان تؤجر نفسها لارضاع ولد الکافر**" (رد المحتار ۶/ ۵۳) (مسلمان عورت کے لیے کافر کو اجرت پر دودھ پلانا جائز ہے)۔

معلوم ہوا کہ دودھ جو انسان کا جزء ہے، جیسے اسے کافر بچہ کے پیٹ میں پہونچانے کو جائز قرار دیا گیا بالکل اسی طرح یہاں بھی مسلمان کا عضو کافر کو عطیہ کیا جاسکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ معصوم الدم ہو کیوں کہ غیر معصوم الدم جیسے

حربی کافر وغیرہ اس کے لیے عطیہ کرنا بالکل ناجائز ہے، کیوں کہ وہ زندہ رہنے کا مستحق نہیں ہے۔

اس پر ایک اشکال کیا گیا ہے کہ اگر ہم ایک مسلمان کے لیے اپنے عضو کو کسی کافر کے لیے عطیہ کرنے کو جائز قرار دیں تو یہ اعانت علی المعصیہ ہوگی، کیوں کہ اگر کسی نے اپنا دانت کسی کافر کو عطیہ کیا تو وہ اس سے حرام چیز بھی کھالے گا یا اس کے علاوہ کوئی عضو جسے وہ غیر شرعی کاموں میں استعمال کرے اور یہ گناہ پر مدد کرنا ہے لہٰذا یہ جائز نہیں۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ اشکال تو مسلمان کے حق میں بھی لازم آتا ہے، کیوں کہ اگر کوئی نیکوکار مسلمان کسی فاسق شخص کو اپنا کوئی عضو عطیہ کر رہا ہے اور یہ فاسق اس عضو کو گناہ کے کام میں استعمال کرے تو اشکال تو یہاں بھی لازم آتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنا کوئی عضو یا حصہ بدن عطیہ کرتا ہے تو وہ اب معطیٰ لہ کا عضو بن جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری اس سے ساقط ہوجاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اس کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو درحقیقت اس کا دماغ یہ سب کچھ سوچتا اور پھر اس عضو کو اس کا حکم کرتا ہے، لہٰذا وہ عضو تو مامور ہے۔

سوالات کے نمبر وار جوابات:

(۱) ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بناء پر خون کا عطیہ دینا جائز ہے۔

(۲) جب خون کا عطیہ دینا جائز ہوا تو اس کا ذخیرہ کرنا اور اس کے لیے بلڈ بینک قائم کرنا بھی جائز ہوگا، یہاں اگرچہ بظاہر ضرورت نہیں پائی جارہی ہے، لیکن حادثات کی کثرت اور ان میں خون کی اہم ضرورت کی بناء پر اس کی گنجائش ہے، چنانچہ فقہاء نے کثرت سے پیش آنے والے واقعات کو ضرورت میں داخل کیا ہے، یعنی اگر کوئی چیز بکثرت پیش آتی ہے تو اسے ضرورت کا درجہ دیا گیا ہے یا کوئی چیز اگرچہ ابھی پیش نہیں آئی ہے لیکن کثرت وقوع کی وجہ سے اسے واقع کے حکم میں مانا جاتا ہے علامہ عز بن عبدالسلامؒ ایک اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لما غلب وقوع هذه المفسدة جعل الشرع المتوقع كالواقع" (جب اس مفسدہ کا وقوع غالب ہوا تو شریعت نے یہاں متوقع کو واقع کے حکم میں کر دیا)۔

نیز فرماتے ہیں:" والشرع قد يحتاط لما يكثر وقوعه احتياطه لما يتحقق وقوعه" (قواعد الاحکام فی مصالح الانام ۱/۱۰۷) (اور شریعت کبھی کثرت سے واقع ہونے والی چیز میں ایسا احتیاط کرتی ہے جیسا کہ وقوع پذیر چیز میں احتیاط کیا جاتا ہے)۔

"والجمهور علی ان المتوقع کالواقع "(المجموع شرح المہذب ۱۱/۴۹۹)(اور جمہور کا موقف یہی ہے کہ واقع ہونے والی چیز وقوع پذیر کے حکم میں ہے)۔

(۵،۴) جائز ہے۔

(۶) الف: کسی شخص کا اپنی دونوں آنکھیں یا ایک آنکھ کسی کو اپنی زندگی میں عطیہ کرنا جائز نہیں ہے۔

ب: یہ صورت جائز ہے کہ میت اپنی آنکھ کے بارے میں وصیت کرے اور پھر اس کی موت کے بعد اس کی آنکھ منتقل کی جائے۔

ج: آئی بینک میں میت کی آنکھ کا عطیہ دیا جاسکتا ہے۔

(۷) میت کی وصیت بھی کافی ہوگی اور ورثہ کی اجازت بھی کافی ہوگی، دونوں کی اجازت ضروری نہیں۔

(۸) اس میں حرمت رضاعت کا مسئلہ ہے، کیوں کہ مرضعہ کا کوئی اتہ پتہ نہیں، لہٰذا یہ صورت جائز نہیں ہے۔

(۹) اس صورت میں اختلاط نسب کا قوی اندیشہ ہے، لہٰذا یہ صورت بھی جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

انسانی خون کا عطیہ اور اسلام کا موقف

مولانا محمد عفان منصور پوری☆

۱-مسلمانوں کا بلڈ بینکوں میں خون کا عطیہ:

عام حالات میں فی نفسہ ایک انسان کا اپنے خون کو عطیہ کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ پہلے سوال کے جواب میں تفصیلات ذکر کی جاچکی ہیں، البتہ مجبوری کی حالت میں نقل خون کی اجازت دی گئی ہے، جب کوئی انسان جاں بلب ہو اور ماہر اطباء کی رائے میں خون چڑھانا اس کے لیے باعث صحت بن سکتا ہو تو خون دینے کی شرعاً اجازت ہے۔ ''**كما فى الهندية: يجوز للعليل شرب الدم والبول و أكل الميتة للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم أن شفائه فيه ولم يجز من المباح ما يقوم مقامه و ان قال الطبيب يتعجل شفائك فيه وجهان**''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی متوقع ضرورت کے پیش نظر اس عمل کی اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ بروقت ضرورت کا پایا جانا لازمی ہے؛ اس لیے صورت مسئولہ میں مسلمانوں کا بلڈ بینک میں خون کا عطیہ کرنا درست نہیں کیونکہ بالفعل ضرورت نہیں پا جارہی ہے، ہاں اگر بلڈ بینک کے ذمہ داران یہ کہیں کہ مثلاً مختلف اسپتالوں میں زیر علاج پچاس مریضوں کی درخواست ہمارے پاس جمع ہے جن کو ڈاکٹروں نے فوری طور پر خون چڑھانے کے لیے کہا ہے ورنہ ان کو خطرہ ہوسکتا ہے، تو ایسی شکل میں علت کے پائے جانے کی بناء کر بلڈ بینک میں خون کا عطیہ کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۲-مسلمانوں کا بلڈ بینک قائم کرنا:

مسلمانوں کے لیے رضا کارانہ طور پر بلڈ بینک قائم کرنے کی اجازت تین وجوہ سے نہیں دی جاسکتی:

اوّل: یہ کہ موہوم ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے خون کو جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے، ہاں اگر حالات خراب ہوں اور زخمیوں کی جان بچانے کے لیے بڑی مقدار میں خون کی ضرورت ہو تو بدرجہ مجبوری اضطراراً خون کو اسٹاک کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے تاکہ بوقت ضرورت متاثرین کے کام آسکے۔

☆ خادم تدریس جامعہ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد، امروہہ۔

دوم: یہ کہ بلڈ بینک قائم ہوگا تو اس میں اسٹاک کرنے کے لیے بہر حال خون مہیا کرنا پڑے گا، اگر رضا کارانہ طور پر مل جاتا ہے تو فبہا ورنہ قیمتاً بھی خریدنا پڑسکتا ہے اور خون کی بیع جائز نہیں ہے، ایمرجنسی حالات میں اگر کسی کو بلا قیمت خون نہ ملے تو اس کے لیے قیمتاً خریدنا بھی جائز ہوگا مگر خون دینے والے کے لیے اس کی قیمت لینا درست نہیں: ''**قال الفقیه أبو اللیث ان کانت الأساکفة لا یجدون شعر الخنزیر الا بالشراء ینبغی أن یجوز لهم الشراء للضرورة (النهایه) ان شعر الخنزیر یوجد مباح الاصل فلا ضرورة الی بیعه و علی هذا قیل اذا کان لا یوجد الا بالبیع جاز بیعه لکن الثمن لا یطیب للبائع (عینی)** ''

تیسرے یہ کہ بعض لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جن کو اپنی ذات کی، اپنے جسم وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، اور ان کے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہوتا، یعنی وہ لوگ جو فٹ پاتھ پر زندگی گذارتے ہیں اور پورے دن کا ان کا مشغلہ صرف اور صرف شراب پینا ہوتا ہے اور اس کے نشہ میں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہوتا، اور ان لوگوں کو صرف اپنی شراب کے لیے پیسے چاہیے ہوتے ہیں، ان کو ان کی عادت کے مطابق شراب مل جائے، یا اسی طرح وہ لوگ جن کو انجکشن وغیرہ کے ذریعہ نشہ کرنے کی لت ہوتی ہے، تو جب ان کو کہیں سے اپنے نشہ کے لیے کچھ نہیں ملے گا تو وہ مجبور ہو کر ان بینکوں کی طرف رجوع کریں گے، جہاں ان کو ان کی ضرورت کے مطابق پیسہ مل جائے گا اور اس کے بدلہ میں وہ اپنا خون وغیرہ دینے کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے، تو اس طرح ان برائیوں کو فروغ ملے گا۔ لہٰذا ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر خاص طور سے مسلمانوں کو اس طرح کے خون بینک قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔

۳-خون دینے کا حکم:

صورت مسئولہ میں اولا یہ دیکھا جائے گا کہ بالفعل ضرورت پائی جارہی ہے یا نہیں، اگر ضرورت متحقق ہے تو دیکھا جائے گا کہ خون دینے والے کو نقل دم میں خود کوئی ضرر لاحق ہوتا ہے یا نہیں، پہلی صورت میں تو کسی بھی حال میں خون دینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ اس کا یہ عمل خودکشی کے مرادف ہوگا، دوسری شکل میں اگر اس کی جان کو خطرہ نہ لاحق ہوتا ہو اور نہ اسے کوئی غیر معمولی ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس سلسلہ میں بعض اہل علم نے کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، اس کے جواز کے دو پہلو سامنے رکھے گئے ہیں، ایک تو کسی انسان کی جان بچانے کی اہمیت، دوسرے ڈاکٹروں کی طرف سے مسلسل یہ یقین دہانی کہ اس سے عطیہ دینے والا شخص کی جان یا صحت پر کوئی قابل ذکر منفی اثر نہیں ہوگا تو اس شخص کے لیے ایسی صورت میں بھی خون دینا مباح ہوسکتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ صرف مستحب، لیکن اس کو واجب کا درجہ دینا صحیح نہ ہوگا۔

۴-مردہ انسان کا عضو زندہ انسان میں منتقل کرنا:

اس مسئلہ میں دوطرح کے موقف سامنے آتے ہیں، ایک عدم جواز کا اور دوسرا جواز کا۔ہم فریقین کے موقف کو مدلل پیش کرنے کے بعد یہ طے کرنے کی کوشش کریں گے کہ کون سی رائے احوط ہے اور کون سی غیر احوط۔

موقف اوّل: آج کل ایک مسئلہ یہ درپیش ہے کہ انسان دنیا سے جارہا ہے خواہ کسی عارضہ کے سبب یا کسی جرم میں قتل کئے جانے کے سبب تو اس کے جسم سے کوئی عضو نکال کر کسی زندہ مریض انسان کے جسم میں منتقل کرنا یہ صورت بظاہر مفید ہی مفید ہے کہ مرنے والے کے تو سارے اعضاء فنا ہونے والے ہیں ان میں سے کوئی عضو اگر کسی زندہ انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے، یہ ایسا معاملہ ہے کہ عام لوگوں کی نظریں صرف اس کے مفید پہلو پر جم جاتی ہیں اور اس کے وہ مہلک نتائج نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں جو پورے معاشرے کو تباہی میں ڈال سکتے ہیں، مگر شریعت اسلام جو انسان اور انسانیت کے ظاہری اور معنوی صلاح وفلاح کی ضمان ہے، اس کے لیے مضر اور مہلک نتائج سے صرف نظر اور صرف ظاہری فائدہ کی بنیاد پر اس کی اجازت دے دینا ممکن نہیں، شریعت اسلام نے صرف زندہ انسان کے کارآمد اعضاء ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بیکار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے، اور مردہ انسان کی قطع وبرید کو بھی ناجائز کہا ہے اور اس معاملہ میں کسی کی اجازت اور رضامندی سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی، اور اس میں مسلم وکافر سب کا حکم یکساں ہے کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے، تکریم انسانی کو شریعت اسلام نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ کسی وقت اور کسی حال میں کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی طمع دامن گیر نہ ہو اور اس طرح یہ مخدوم کائنات اور اس کے اعضاء واجزاء عام استعمال کی چیزوں سے بالاتر رہیں جن کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں اور دواؤں اور دوسرے مفادات میں استعمال کیا جاتا ہے۔اس پر ائمہ اربعہ اور پوری امت کے فقہاء متفق ہیں اور نہ صرف شریعت اسلام بلکہ شرائع سابقہ اور تقریباً ہر مذہب وملت میں یہی قانون ہے۔

حضرات فقہاء کی تصریحات اس معاملہ میں حسب ذیل ہیں:

۱-’’**قال في الهداية: لا يجوز بيع شعر الانسان ولا الإنتفاع به لأن الأدمي مكرم مبتذل فلا يجوز ان يكون شيئ من اجزائه مهانا مبتذلا**‘‘(ہدایہ ص ۳۹)۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات کلی طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ مردہ انسان کے اعضاء کو نکال کر کسی زندہ انسان کے اندر منتقل کرنا از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ اس میں ظاہری فائدہ کچھ بھی نظر آتا ہو لیکن اس کے ذریعہ پیش آنے والے مہلک نتائج کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہ رائے ہے مفتی شفیع صاحبؒ اور مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ کی، اور پر ان شرکا مجلس کی تصدیقات ہیں:

(۱) مولانا یوسف بنوریؒ، (۲) مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ، (۳) مولانا رشید صاحب اور ان کے علاوہ دیگر حضرات ہیں (جواہر الفقہ ۵/ ۵۲)۔

مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی زیر بحث مسئلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ: کسی انسانی عضو کا (خواہ مردہ کا ہو یا زندہ کا) استعمال کسی دوسرے انسان کے جسم میں جائز نہیں ہے بلکہ شرعاً ممنوع ہے، اس لیے اسباب وعلل درج ذیل ہیں:

۱- مثلہ ہونا: کسی انسان کا عضو اس کے جسم سے علیحدہ کرنا جس میں خود اس انسان کی جسمانی منفعت نہ ہوا سے مثلہ کہا جاتا ہے جس کے مکروہ یا حرام ہونے پر تقریباً پوری امت کے علماء متفق ہیں۔

۲- کسی زندہ حیوان (جس میں انسان بھی شامل ہے) کے جسم سے کوئی جزو الگ کرلیا جائے تو وہ مردار کے حکم میں ہوجاتا ہے، یعنی ناپاک ہونے اور دوسرے تمام احکام میں، الا یہ کہ اسی جسم میں لگا دیا جائے جس سے علیحدہ ہوا تھا۔ دیکھیے حدیث: ''ما قطع من البهيمة وهي حية فهي ميتة'' (ابوداؤد وترمذی شریف)۔

پیوند کاری کی وجہ سے پوری عمر ایک ناپاک جزو سے جسم انسانی ملوث رہے گا، اس کے نتیجہ میں طہارت ونجاست کے بہت سے احکام متعلق ہوں گے۔

۳- ایک عضو یا چند اعضاء انسانی کے جواز کے قول سے تمام اجزاء کا استعمال کا، پھر ان کی بے توقیری کا دروازہ کھل جانے کا اندیشہ ہے، جس کے ہولناک وخطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔

۴- حلت وحرمت کا اجتماع ہو تو حرمت کو ترجیح ہوتی ہے (مستفاد از جدید فقہی تحقیقات ۱/ ۲۹۰)۔

موقف ثانی: مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی تحریر فرماتے ہیں کہ جن حضرات نے مردہ انسان کے عضو کو کسی زندہ انسان کی جان بچانے کے لیے اس کے اندر منتقل کرنے کو جائز قرار دیا ہے ان کے پیش نظر وہ فقہی قواعد ہیں جن کے مطابق ''ضرورت'' کی وجہ سے ناجائز چیزیں جائز قرار پاتی ہیں ''الضرورات تبيح المحظورات'' یا یہ قاعدہ کہ مشقت پیدا ہوجائے تو یسر وآسانی کی راہ اختیار کی جاتی ہے ''المشقة تجلب التيسير'' اور خود ان قواعد میں قرآن مجید کی وہ آیات پیش نظر ہیں جن میں جان بچانے کے لیے حالت اضطرار میں حرام چیزوں کے کھانے یا حالت اکراہ میں کلمہ کفر کو زبان سے ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

مانعین کے پیش نظر اصل علت وہ انسانی حرمت وکرامت کا تحفظ ہے اور چونکہ حرمت وکرامت زندہ ومردہ دونوں میں مساوی ہیں، اس لیے اس بارے میں دو باتیں قابل غور ہیں:

(۱)اول یہ کہ کیا موجودہ زمانہ میں پیوندکاری کا طریقہ ''اہانت انسان'' میں داخل ہے؟ (۲) دوم یہ کہ انسانی جان و مال کے تحفظ کے لیے اہانت محترم کو گوارہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

پیوندکاری کے اہانت ہونے کے سلسلہ میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شارع نے انسان کو مکرم ومحترم تو ضرور قرار دیا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کی توہین کو جائز نہیں رکھتا، لیکن کتاب وسنت میں تکریم واہانت کے سلسلے میں کوئی بے لچک حدود مقرر نہیں ہیں اور اہل علم کی نظر میں یہ امر مخفی نہیں کہ نصوص نے جن امور کو مبہم رکھا ہو اور قطعی فیصلہ نہ کیا ہو انسانی عرف وعادت ہی اس کی توضیح ہوتی ہے۔

پھر اس امر میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عرف وعادت کی بعض صورتیں زمانہ وعلاقہ کی تبدیلی سے بدلتی رہتی ہیں اور ایک ہی معاملہ میں علاقہ ووقت کی تبدیلی کی وجہ سے دو مختلف حکم لگائے جاتے ہیں، کبھی ایک حکم کو بہتر اور درست سمجھا جاتا ہے اور کبھی اس کو قبیح ونادرست۔

پس جب اہانت واکرام کے متعلق شریعت نے متعین اصول وضع نہیں کئے ہیں تو ضروری ہے کہ ہر زمانہ کے عرف و عادت ہی کی روشنی میں کسی بات کے باعث توہین ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

فقہاء نے اجزائے انسانی سے انتفاع کو بے شک منع کیا ہے، لیکن یہ ممانعت اس لیے تھی کہ اس زمانہ میں انسانی اعضاء سے انتفاع کو توہین تصور کیا جاتا تھا اور اس دور میں ایسے طریقہ رائج نہیں تھے کہ شائستہ طور پر انسانی اجزاء سے انتفاع کیا جاسکے۔ ہمارے زمانہ میں اس عمل کو انسان کی توہین نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرے فقہی نظائر کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کے تحفظ اور بقاء کے لیے قابل احترام چیزوں کی اہانت بھی قبول کی جاسکتی ہے۔

علامہ سمرقندیؒ نے ایک خاص جزئیہ پر بحث کرتے ہوئے جس اصول سے استدلال کیا ہے وہ یہی ہے کہ ایک انسان کی بقاء کے لیے دوسرے کی تکریم کے پہلو کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں: ''**لو ان حاملا ماتت و فی بطنها ولد يضطرب فان كان غالب الظن انه ولد حی وهو فی مدة يعيش غالباً فانه يشق بطنها لان فيه احياء الآدمی فترک تعظيم الآدمی اهون من مباشرة سبب الموت**'' (تحفۃ الفقہاء ۳/۳۴۳ بحوالہ جدید فقہی مسائل ۵/۷۷) (اگر کوئی حاملہ مرجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ ہو جو حرکت کرتا ہو اگر غالب ظن ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے اور اتنی مدت کا ہے جس میں عام طور پر بچہ زندہ رہ جاتا ہے تو اس حاملہ کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا، اس لیے کہ اس میں ایک انسان کی زندگی بچانا ہے اور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے کہ آدمی کی تعظیم وتکریم کے تقاضہ کو چھوڑ دیا جائے)۔

ماں کی موت ہوجائے اور آثار بتاتے ہیں کہ جنین زندہ ہے تو فقہاء نے عورت کے آپریشن کی اجازت دی ہے اور استدلال یہ کیا ہے کہ یہاں تعظیم میت کو ایک زندہ نفس کی بقاء کے لیے ترک کیا جارہا ہے، لہٰذا ایک زندہ انسان کو بچانا مردہ انسان کی تکریم سے بڑھ کر ہے۔

رہ گئیں بعض نصوص مثلاً ''لعن الله الواصلة والمستوصلة'' تو اس میں اجزائے انسان سے ایسے انتفاع کو منع کیا گیا ہے جو انسان کی ضرورت کا درجہ نہ رکھتا ہو بلکہ محض تزیین وآرائش کے جذبات کی تسکین اس سے مقصود ہو، اسی طرح وہ حدیث: ''کسر عظم المیت ککسر عظم الحی'' عام حالات پر محمول ہے جب کہ کوئی انسانی ضرورت اس سے متعلق نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نہ صرف جنین کی حفاظت کے لیے مردہ ماں کے آپریشن کی اجازت دی ہے بلکہ اگر کسی شخص نے کسی کا موتی نگل لیا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو بعض حالات میں اس دوسرے شخص کے ایک حق مال کے تحفظ کے لیے بھی مردہ کی چیر پھاڑ اور اس کے پیٹ سے موتی نکالنے کو فقہاء نے جائز رکھا ہے (البحر الرائق ۸/۲۰۵)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگرچہ پہلے زمانہ میں اعضاء انسانی سے انتفاع اور مردہ انسان کی چیر پھاڑ کو توہین تصور کیا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانہ میں اس کو توہین نہیں گردانا جاتا۔ دوسرے یہ کہ بعض حالات کے مطابق انسانی جان کے تحفظ کے لیے اہانت محترم کو گوارا کیا جاسکتا ہے، لہٰذا شدید ضرورت کی بناء پر ایک زندہ انسان کی جان بچانے کے لیے کسی مردہ انسان کے عضو کو زندہ انسان میں منتقل کیا جاسکتا ہے (مستفاد از: جدید فقہی مسائل ص ۷۰ تا ۷۲)۔

فریقین کے دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی انسان کی جان بچانے کے لیے شرعی حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے آخر حد تک کوشش کی جائے گی، مسلمان اس بات کا مکلّف ہی نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کی جان بچانے کی خاطر- جو اس پر فرض وواجب بھی نہیں ہے- کسی امر محرّم کا ارتکاب کرے، مردہ انسان کے کسی عضو کو نکالنا شرعاً حرام ہے، اس کی کرامت کے باعث، اگر ضرورت کے دائرے کو ضرورت سے زیادہ وسیع کرکے مردہ انسان کے اعضاء کو منتقل کرنے کی عام اجازت دے دی گئی تو انسانی لاش کے ساتھ بڑا ناروا سلوک ہونے لگے گا اور معاشی اعتبار سے کمزور خاندان کے لوگ تو خاص طور پر اپنے متعلقین کی وفات کے منتظر رہیں گے کہ یہ جائیں اور ہم ان کے اعضاء رئیسہ کو بھاری داموں میں فروخت کرکے اپنے حالات کو درست کریں۔

فریق ثانی نے علامہ سمرقندیؒ کے جس اصولی کلام سے استدلال کیا ہے اس میں کسی عضو کی منتقلی کا مسئلہ ہے ہی نہیں وہ تو ماں کے پیٹ میں موجود بچے کو محض آپریشن کرکے نکال لینا ہے اور اس میں واقعتہً کوئی اہانت نہیں ہے، لیکن مردہ انسان کے جسم سے کسی عضو کو نکال لینا شرعاً وعقلاً کرامت انسانی کے مقتضی کے خلاف ہوگا۔

اس لیے احوط یہی ہے کہ فریق اول کے موقف کو تسلیم کیا جائے اور اعضائے انسانی کی منتقلی کو ممنوع قرار دیا جائے۔

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ سابق مفتی دار العلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں: جو حضرات ایک انسان کے اعضاء کی دوسرے انسان میں پیوند کاری کو جائز کہتے ہیں وہ کتاب وسنت اور فقہ وفتاویٰ کی کھلی مخالفت کرتے ہیں، یہ کیسی دانشمندی ہوگی کہ ایک انسان کی صحت یابی کے لیے دوسرے کی صحت سے کھیلا جائے اور مستقبل میں اس کو بیماری کو لقمہ تر بنا دیا جائے، یہ کہنا کہ عورت کے پیٹ کو چاک کرنے کی فقہاء نے بعض اوقات اجازت دی ہے، تشریح یہ ہے کہ جب تک بچہ عورت کے پیٹ میں ہے زندہ یا مردہ، اس کا جزو بدن ہے، علیحدہ نہیں ہے دونوں ایک حکم میں ہیں، الگ الگ نہیں، لہٰذا اس مسئلہ خاص کو اس پر قیاس کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے (ماخوذ از جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۰۵)۔

۵- ایک انسان کا دوسرے انسان کو آنکھ عطیہ کرنا:

الف- انسانی اعضاء کی پیوندکاری کے سلسلہ میں مذکورہ سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ کوئی شخص سوچے کہ میں اپنی ایک آنکھ کسی کو دے دوں تا کہ اس شخص کا فائدہ ہو جائے، یہ بات اگرچہ ظاہری طور پر بھلی معلوم ہوتی ہے، لیکن قرآن کریم کی آیات میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق انسان یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم کے اندر کوئی بھی جزو یا عضو بیکار پیدا نہیں کیا، ارشاد ربانی ہے:

’’**ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنه مسؤلا**‘‘ (سورہ بنی اسرائیل ۳۶) (کان، آنکھیں اور دل ہر ایک کے بارے میں باز پرس ہوگی)۔

اس لیے وہ اسی حد تک اس میں تصرف کر سکتا ہے جس حد تک کہ شریعت نے اسے اجازت دی ہے، اس حد سے تجاوز کر کے اسے تصرف کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں دی ہیں۔ ’’**ألم نجعل له عینین و لسانا و شفتین**‘‘ (سورہ بلد ۸-۹) (کیا ہم نے نہیں دی، اسے دو آنکھیں، زبان اور دو ہونٹ)۔

اب اگر کوئی شخص اپنی ایک آنکھ کسی ایسے شخص کو دینا چاہے جس کی دونوں آنکھیں چلی گئیں ہوں تو باوجود اس کے کہ وہ ایثار سے کام لے رہا ہے اس کا یہ فعل قابل مذمت ہوگا، کیونکہ شریعت نے اس تصرف کی اسے ہرگز اجازت نہیں دی ہے اور نہ اس کی دوسری آنکھ اس کے لیے بیکار کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی عضو بیکار کا پیدا نہیں کیا ہے بلکہ ہر عضو کی تخلیق میں عظیم مصلحت کارفرما ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ دوسرا عضو عبث محض نہیں بلکہ اس احتیاط کے طور پر پیدا کیا گیا ہے کہ ایک عضو کے ناکارہ

ہونے کی شکل میں اس دوسرے سے فائدہ اُٹھایا جائے جیسا کہ اطباء کی تحقیق کے مطابق انسانی بدن میں بعض ہڈیاں اور غدوودا ایسے ہیں جو فی الحال بظاہر بیکار ہیں، انہیں نکال دینے سے اس کی زندگی پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوسکتا مگر اللہ تعالیٰ نے صرف اس لیے اسے بدن انسانی میں جمع کر دیا ہے کہ انسان کو اصلاح بدن کے لیے کسی دوسرے حصے میں ہڈی، گوشت کی پیوندکاری کی ضرورت پڑے تو اس سے کام لیا جائے، کیونکہ ہر انسان کی ہڈی، گوشت اور رگیں دوسروں کے لیے کارآمد نہیں ہو پاتیں۔

ب-بعد از مرگ قرنیہ دینا شرعاً جائز نہیں ہے دلائل گذر چکے۔

۶-مردہ شخص کے عضو حاصل کرنے میں کس کی اجازت معتبر ہوگی؟

جب مردہ جسم سے اعضاء کو نکالنا ہی جائز نہیں تو یہ سوال بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔

۷-انسانی دودھ کی خرید وفروخت:

دودھ بھی جزو انسان ہے، اس لیے اس کی خرید وفروخت، منتقلی یا بینک قائم کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، انہی اسباب و علل کی بنا پر جو عام حالات میں خون کی خرید وفروخت کے ناجائز ہونے کا باعث ہے، جن کی تفصیل گذر چکی ہے، اس سلسلے میں مولانا بدر الحسن صاحب قاسمی کے ایک مضمون کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، جس سے زیر بحث مسئلہ کی تنقیح ہو جائے گی:

ظاہر نظر میں تو یہ ایک خیر کا کام معلوم ہوتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اجازت ہوگی کہ عورتوں کا دودھ اکٹھا کر کے ملک (Milk) بینک قائم کئے جائیں اور اگر عطیہ سے وافر مقدار میں دودھ حاصل نہ ہو سکے تو اس کی خرید وفروخت بھی کی جائے اور معاوضہ دے کر دودھ اکٹھا کیا جائے، پھر جو بچہ سینکڑوں انجان عورتوں کا مخلوط دودھ سے پرورش پائیں گے کیا ان کے درمیان رضاعت کا رشتہ قائم ہوگا؟

اس سلسلہ میں بنیادی بات تو یہ ہے کہ رضاعت کو اسلام نے حرمت کے لیے بنیاد قرار دیا ہے اس لیے جہاں یہ بنیاد پائی جائے گی وہاں دودھ کے رشتہ قائم ہوتے جائیں گے، شرط یہ ہے کہ بچہ نے عورت کا دودھ شیر خوارگی کی عمر میں پیا ہو، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور جمہور فقہاء نے شیر خوارگی کی مدت میں بچہ کے پیٹ میں دودھ پہنچنے کو حرمت رضاعت کے لیے کافی سمجھا ہے، خواہ بچہ کو متعارف طریقہ پر عورت کے سینے سے حلق کے ذریعہ پلایا گیا یا اس کی ناک کے ذریعہ دودھ چڑھایا گیا ہو، بلکہ بعض نے حقنہ کے ذریعہ معدہ تک دودھ پہنچانے کو بھی (شیر خوارگی کے ذریعہ قائم ہونے والے رشتہ کے لیے) کافی قرار دیا ہے، اس کے برخلاف بعض دوسرے اصحاب ظواہر اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ نے حرمت رضاعت کے ثبوت کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ بچہ متعارف طریقہ پر عورت کی چھاتی سے دودھ پئیے ورنہ حرمت

رضاعت کا رشتہ قائم نہ ہوگا اور اس پر وہ شرعی احکام مرتب نہیں ہونگے ،اس قول کو بنیاد بنا کر بعض معاصر اہل قلم نے انسانی دودھ بینک قائم کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اور بینک کا مخلوط دودھ استعمال کرنے کی صورت میں حرمت رضاعت نہ ہونے کو ترجیح دی ہے۔

لیکن ہماری رائے میں عورتوں کے دودھ کے بینک کا قیام اور اس میں دودھ کی خرید وفروخت یا بلاعوض دودھ دینا اسلامی روح اور اسلامی معاشرہ کے اسپرٹ کے منافی ہے۔

اس لیے کہ اس سلسلہ میں بنیادی بات تو یہ ہے کہ انسانی دودھ وہ عضو انسان ہے، انسان کے جسم کا حصہ ہے اور انسان کے کسی بھی عضو کی بیع ناجائز ہے۔

"وشعر الإنسان والإنتفاع به ای لم یجز بیعه والإنتفاع به لأن الآدمی مکرم غیر مبتذل فلایجوز ان یکون شیئ من اجزائه مهانا مبتذلا" (المبسوط ۱۵/ ۱۲۵ بحوالہ جدید فقہی مسائل ۵/ ۷۲)۔

(یعنی انسان کے بال سے نہ انتفاع جائز ہے نہ اس کی بیع جائز ہے اس لیے کہ آدمی قابل تکریم ہے نہ کہ قابل صرف کوئی چیز، پس جائز نہیں ہے کہ اس کے اجزاء میں سے کسی بھی جزء کو ذلیل کیا جائے اور استعمال کیا جائے)۔

لہٰذا جب عضو انسان سے انتفاع اور بیع ناجائز ہے تو دودھ بھی انسان کا ایک جزء ہے تو اس کی بیع بھی ناجائز ہے۔

دوسری بات یہ کہ ضرورت مند بچوں کے لیے دودھ پلانے والی عورتوں کی فراہمی ہی انسان کی فطرت سے ہم آہنگ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے، اجرت لے کر دودھ پلانے کی بھی شریعت نے اجازت دی ہے، اس لیے دودھ کا چندا اکٹھا کرنا یا اس کی خرید وفروخت کرنا اور اس طرح کے بینک قائم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، ایک تو غیر فطری عمل ہونے کی وجہ سے عورتوں میں اس سے دلچسپی نہیں ہوسکتی، دوسری طرف صحت کے لحاظ سے اس کے مضر اثرات کا تجربہ ان ملکوں میں ہو چکا ہے جہاں سے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے، پھر نادار بچوں کے لیے بینک کے دودھ کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جس کا تحمل بھی جو صحیح معنوں میں ضرورت مند بچے ہیں وہ نہیں کر سکتے، پھر بچہ کو ماں کی ممتا بھی نہیں ملتی جو براہ راست دودھ پینے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور جس کا بچہ کی عقلی ونفسیاتی سلامتی پر گہرا اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خود مغربی ممالک میں بھی اب اس کا سلسلہ وہ جوش وخروش کے ساتھ باقی نہیں رہا جو شروع میں تھا، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی (ملخص از عصر حاضر کے فقہی مسائل ۹۵ تا ۱۰۴)۔

دودھ بینک قائم کرنے میں دو مسئلے ہیں، ایک تو دودھ کی خرید کا دوسرے فروخت کا، اس پر تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ دودھ پلانے والی دودھ پلانے کی اجرت لے سکتی ہے، لیکن بیع اور اجارہ میں فرق ہے، احناف کے یہاں دودھ کا اجزائے

انسانی میں سے ہونے کی وجہ سے اس کی بیع ناجائز ہوگی اور حنفیہ کا نقطہ نظر فطرت سے ہم آہنگ عقل کے تقاضوں کے مطابق اور نصوص کے موافق ہے (جدید فقہی مسائل ۱۰/۳۸۰)۔

۹-منی بینک قائم کرنا:

وہ قومیں جن میں حلال وحرام کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے اور جہاں ناجائز طور پر پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد جائز بچوں کے مساوی یا اس سے کچھ ہی کم ہو اور جس معاشرہ میں غیر شادی شدہ ماؤں کی کثرت فخر ومباہات کا باعث بن گیا ہو وہاں کے لیے تو مادہ منویہ کو ایک دوسرے میں منتقل کرنا اور ایک مرد کے مادہ تولید سے کسی دوسری عورت کا حاملہ ہونا، اپنے مادہ منویہ کو فروخت یا ایک عمر تک صنفی لذت اُٹھانے کے لیے آزاد زندگی اسی طرح کی عملی تحقیق سمجھی جائے گی جس طرح سے جانوروں کی مختلف قسم کی نسلیں تیار کرنے کے لیے مدت سے تجربات کا سلسلہ جاری ہے، لیکن مسلمان جو ایک کامل دین اور مستقل تہذیب کے حامل ہیں اور دین اسلام جس نے نسب کی حفاظت کو بھی اس طرح ضروری قرار دیا ہے جس طرح کے انسانی جان کی حفاظت اس کی تعلیمات کی رو سے ضروری ہے، چنانچہ مادہ تولید کا بے محل استعمال اسی طرح ناجائز اور سنگین جرم ہوگا جس طرح اجنبی مرد وعورت کا باہم جنسی اتصال، چاہے اس کا کتنا بھی مہذب نام رکھا جائے، اور اس کے لیے کتنی ہی نوایجاد مشینوں اور آلات کا استعمال کیا جائے، لیکن ظاہری صورت کی تبدیلی سے فحش کاری کی حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور شرعی نقطہ نظر سے اس کے غلط اور ناروا ہونے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

چونکہ اسلام نسب کی حفاظت کی بھی ضمانت ہے اور وراثت کو بھی اس کے صاحب حق کو صحیح طور پر پہنچانے والا ہے، اس لیے شریعت ان تمام اسباب کو جو نسب کے اندر بھی اختلاط پیدا کرنے والے ہیں اور وراثت کے اندر بھی، سب سے روکتا ہے اور چونکہ زنا کی ممانعت کی اصل وجہ بھی یہی اختلاط نسب ہے، اسی لیے زنا کے تمام اسباب سے انسان کو منع کرتا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لا یحل لرجل أن یسقی ماء ہ ولد غیرہ**'' (مسند احمد: ۱۷۱۲۴) (کسی بھی شخص کے لیے روا نہیں ہے کہ اپنے پانی سے دوسرے کی اولاد کو سیراب کرے)۔

اسی اختلاط نسب سے حفاظت کے لیے ایک مرد کی زوجیت سے نکلنے کے بعد دوسرے مرد کی زوجیت میں جانے کے لیے ''عدت'' کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

پس اجنبی مرد اور عورت کے مادہ کے اختلاط کی تمام صورتیں ''گناہ'' ہیں اور حکم کے اعتبار سے ''زنا'' ہیں البتہ چونکہ حدود معمولی شبہات کی وجہ سے بھی ساقط ہوجاتی ہیں اور یہاں بھی یہ شبہ موجود ہے، اس لیے کہ زنا دو اجنبیوں کے درمیان ایک جسمانی فعل، یعنی مباشرت کا نام ہے اور ان صورتوں میں یہ فعل اپنی ظاہری شکل کے ساتھ موجود نہیں ہے، دوسرے زنا

میں دو اجنبی مرد عورت ایک دوسرے کے جسم سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں جب کہ اس مصنوعی عمل کے ذریعہ اس طرح کی لذت حاصل نہیں کی جاسکتی، اس لیے اس عمل کی وجہ سے زنا کی مقررہ شرعی سزا نافذ نہیں کی جائے گی، البتہ چونکہ یہ عمل اپنی روح اور نتائج کے لحاظ سے اس قدر مضر ہے جس قدر خود فعل زنا، اس لیے قاضی اس پر مناسب تعزیز اور سرزنش کرے گا۔

اسلام اولاد کے حصول کی جائز خواہش کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس پر مزید ابھارتا ہے، لیکن اس کے حصول کا راستہ متعین ہے اس سے انحراف از روئے شرع ناجائز ہے۔ اس لیے نہ تو یہ درست ہوگا کہ انسان کا مادۂ تولید بینکوں میں جمع کیا جائے اور اس میں بغیر کسی تفریق کے بہت سے انسانوں کا مادہ تولید اکٹھا کر دیا جائے، لیکن اگر اس میں تفریق بھی کی جائے تو پھر بھی کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں اختلاط کا امکان ضرور ملتا ہے، اور نہ یہ درست ہوگا کہ بغیر کسی رشتہ وقانون کے انسانی مادہ تولید کو آزادانہ عورتوں کی آبیدگی کے لیے استعمال کیا جائے۔

شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی عورت کسی مرد کی زوجیت میں رہتے ہوئے کسی اور اجنبی کے مادہ سے حاملہ ہو یا صاحب اولاد بنے تو مولود کا نسب اس کے حقیقی شوہر سے ثابت ہوگا، اس لیے کہ ثبوت نسب کے باب میں فقہی اصول ہے کہ عورت جس مرد کا فراش ہو اس سے پیدا ہونے والے بچہ کا نسب اسی سے متعلق ہوگا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**الولد للفراش وللعاھر الحجر**''، نیز اگر کنواری لڑکی اس طرح ماں بنے تب بھی بچہ کا نسب صرف اسی عورت سے متعلق ہوگا اس مرد سے نسب کا کوئی تعلق نہیں ہوگا جس کے مادہ تولید سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت اس طرح کی تمام صورتوں کو جس کی بناء پر نسب میں ذرہ برابر بھی شبہ ہو، ناجائز قرار دیتی ہے۔

رہ گئی بینک وغیرہ میں مادہ منویہ کی خرید وفروخت تو ایک تو اس کی ممانعت کی وجوہات مذکورہ بالا سطور سے صاف واضح ہو رہی ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ایک انسانی جزو ہے اور انسان جزو سے انتفاع حالت اضطرار کے علاوہ دیگر حالات میں ناجائز اور حرام ہے، اور اس کی خرید وفروخت کے ناجائز ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، لہٰذا اس طرح کے بینک قائم کرنا اس میں مادۂ تولد کی خرید وفروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، اس لیے ان چیزوں کی اجازت نہیں دی جاسکتی (مستفاد از: جدید فقہی مسائل ۱۵۱ تا ۱۵۵، عصر حاضر کے فقہی مسائل ۵۶ تا ۶۵)۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ سے متعلق احکام

مفتی امانت علی قاسمی ☆

اللہ تعالیٰ نے انسان کو محترم ومکرم بنایا ہے اور ہر موڑ پر اس کی شرافت وکرامت کا پورا لحاظ رکھا ہے، حتی کہ جسم کے کٹے ہوئے ناخن اور بال کی بھی عظمت کا حکم دیا گیا ہے اور گھٹیا جگہ اس کو ڈالنے سے منع کیا گیا ہے، شرعی لحاظ سے انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کی مقدس امانت ہے اور ممکن حد تک اس کی حفاظت کرنا اس کا دینی فریضہ ہے، اس کو ضائع کرنا سخت گناہ اور حرام ہے، اس لئے انسان اپنے بدن میں اسی حد تک تصرف کرسکتا ہے جہاں تک شریعت نے اس کو اجازت دی ہے، لیکن حالیہ طبی انقلاب کی وجہ سے بہت سے شرعی مسائل پیدا ہوگئے ہیں، موجودہ طب نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ایک انسان کا عضو دوسرے انسان میں کامیابی کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے، اس کی وجہ سے یہ مسئلہ پیدا ہوگیا ہے کہ ایک انسان کوئی اپنا عضو اپنی زندگی میں ہبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ یا اپنے عضو کی مرنے کے بعد وصیت کرسکتا ہے یا نہیں، ذیل میں اس کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

خون کا عطیہ:

خون انسان کا جزء ہے اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس اور ناپاک بھی ہے، اس کا اصل تقاضہ تو یہ ہے کہ عام حالات میں ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا حرام ہو، اجزائے انسانی کی تکریم بھی اسی کی مقتضی ہے، لیکن فقہاء نے اضطراری حالت میں خون کے ذریعہ علاج کرنے کی اجازت دی ہے، فتاوی عالمگیری میں ہے:

”یجوز للعلیل شرب البول والدم والمیتة للتداوي إذا أخبره طبیب مسلم أن شفاء ه فیه ولم یجد في المباح مایقوم مقامه“ (ردالمحتار ۴/۴۸۰، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اس لئے اگر کوئی شخص ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ خون چڑھائے بغیر اس کا علاج ممکن نہ ہو اور ماہر طبیب حاذق کی رائے ہو کہ خون دینے سے مریض شفاء یاب ہوسکتا ہے تو ایسی صورت میں خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے، اور یہ انسانی مسئلہ ہے

☆ استاذ حدیث وافتاء، دارالعلوم حیدرآباد۔

شریعت نے مطلقا بنی آدم کو محترم قرار دیا ہے، ایک مرتبہ آپ ﷺ کے سامنے سے ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ ﷺ اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے، آپ سے کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو آپ نے فرمایا تو کیا وہ انسان نہیں ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو قابلِ احترام ہے، اس لئے اس میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ غیر مسلموں کو بھی خون کا عطیہ دے کر اس کی جان بچائی جاسکتی ہے۔

بلڈ بینک کا حکم:

آج کل خون کی بہت کثرت سے ضرورت پڑتی ہے اور بسا اوقات جس گروپ کا خون چاہئے افرادِ خاندان میں کوئی ایسا نہیں ہوتا ہے جس کا گروپ موافق ہو، اور بسا اوقات کسی حادثے کی وجہ سے بہت زیادہ لوگوں کو خون کی ضرورت پڑ جاتی ہے، جس کا فوری طور پر دستیاب ہونا مشکل ہوتا ہے، اس ضرورت کے پیشِ نظر بلڈ بینک کا قائم کرنا بھی جائز ہے، حضرت مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

جب خون کے استعمال کی گو بدرجہ مجبوری گنجائش ہوگئی تو چوں کہ ایسی مجبوریاں اچانک بھی پیدا ہوجاتی ہیں، اور خون کی بہت زیادہ مقدار کی متقاضی ہوجاتی ہیں، جیسے ریل کے ایکسڈینٹ کے موقع پر — پھر اس میں بھی خون کا نمبر بالکل یکساں ہونا ضروری ہوتا ہے، ورنہ بجائے نفع کے نقصان کا اندیشہ ہوجاتا ہے، اس لئے اچانک پیش آمدہ ضروریات کے لئے ہر نمبر کے خون کا فراہم رکھنا ضروری ہوتا ہے، اور مقدار کی تعیین وتحدید معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں محفوظ رکھنا ضروری ہوگا، اور اس کا ایک خزانہ بنانا لازم ہوگا، جس کو آج کل کی اصطلاح میں بینک کا نام دیا جاتا ہے، "**لأن الشيء إذا ثبت ثبت بجميع لوازمه**" (منتخبات نظام الفتاوی، ۱/ ۴۲۲)۔

حضرت مفتی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بلڈ بینک کا قیام جائز ہے اور جب بلڈ بینک کا قیام جائز ہوا تو بلڈ بینک کو خون کا عطیہ دینا بھی جائز ہے، اس کے لئے بلڈ کیمپ قائم کرنا اور لوگوں کو خون دینے کی ترغیب دینا بھی جائز ہے، اس سلسلے میں مسلمانوں کو اپنا بلڈ بینک قائم کرنا بھی مفید ثابت ہوگا، تاکہ مسلمانوں کو بلا شرط وعوض کے خون فراہم کرکے کمزور اور معذور انسانوں کی خدمت کی جاسکے، اس کے لئے کسی مخصوص دن کیمپ قائم کرنا اور لوگوں کو ترغیب دینا بھی درست ہے، نیز اگر بینک کسی مریض کو خون دیتے وقت اس کے کسی رشتہ دار سے خون کا مطالبہ کرے تو یہ ہبہ بالعوض ہے، اس لئے بینک کا یہ مطالبہ جائز ہے، تاکہ بینک میں خون کا اسٹاک موجود رہے اور آئندہ دوسرے مریض کی ضرورت پوری کی جاسکے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

"**وهب لرجل عبدا بشرط أن يعوضه ثوبا إن تقايضا جاز وإلا لا**" (رد المحتار ۸/ ۵۰۸، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو اور اس کا خون نادر گروپ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دستیاب نہ ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں جس شخص کے پاس اس گروپ کا خون ہے، اگر اس کے خون دینے میں اس کو کوئی جسمانی ضرر لاحق نہ ہو اور اس کو جس مقدار میں خون کی ضرورت ہے اس کے جسم میں اس سے زیادہ خون ہو تو ایسے شخص کے لئے ایک انسان کی جان بچانے کے لئے خون کا عطیہ دینا مستحب ہوگا، اس لئے کہ یہ مصیبت زدہ شخص کی مصیبت دور کرنا اور کسی کے ساتھ احسان اور تعاون علی البر والخیر کی قبیل سے ہے، جس کے مستحب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو شخص کسی مسلمان کی دنیا میں کسی مصیبت کو دور کردے گا اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کی مصیبت کو دور فرمادیں گے'' (مسلم شریف، رقم الحدیث: ۳۸)۔

جگر، گردہ اور دیگر اعضاء کے عطیہ کا حکم:

اعضاءِ انسانی کے عطیہ کے سلسلے میں اب تک حضرات علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، ہندوستان اور برصغیر کے علاوہ عرب علماء کی رائیں بھی اس سلسلے میں مختلف ہیں، علامہ یوسف قرضاوی، سید طنطاوی، مصطفیٰ زرقاء، نصر فرید، علی جمعہ، ابراہیم دحقوبی اور محمد نعیم یاسین کے علاوہ بہت سے عرب علماء اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اعضاء انسانی کے تبرع کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اپنی زندگی میں اپنا کوئی عضو ہبہ کردیا جائے، دوسری صورت یہ کہ موت کے بعد ہبہ کی وصیت کی جائے، جو حضرات جائز قرار دیتے ہیں انہوں نے دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ شرطیں ذکر کی ہیں۔

زندگی میں اعضاء کے عطیہ کی جواز کی شرطیں:

(۱) معطی کو اپنا کسی عضو دینے کے بعد کسی قسم کا کوئی ضرر لاحق نہ ہو، نہ فی الحال اور نہ آئندہ۔

(۲) عضو کا عطیہ دینے کے علاوہ کوئی اور چیز اس کو بچانے یا نفع پہونچانے والی نہ ہو۔

(۳) عطیہ کرنے والے نے اس آپریشن کی رضا کارانہ اور باشعوری طور پر اجازت دی ہو، اپنے عضو کی کوئی قیمت یا کوئی مادی منفعت حاصل نہ کی ہو۔

(۴) اس کی قانونی عمر ہو (اٹھارہ یا اس سے زائد سال کی عمر مراد ہے)۔

(۵) جس عضو کا ہبہ کیا جارہا ہے وہ ایسا عضو نہ ہو جو اختلاط نسب کا سبب بن جائے۔

موت کے بعد اعضاء کے عطیہ کی شرطیں:

(۱) ہبہ کرنے والے کی موت کلی اور شرعی طور پر متحقق ہوگئی اور تین عادل اور اس سے باخبر لوگوں نے اس کے موت کی شہادت دی ہو۔

(۲) جس کے لئے عضو عطیہ کیا جارہا ہے اس کی حالت ایسی ہو کہ بغیر اس عضو کے اس کی جان نہ بچائی جاسکتی ہو اور ماہر ڈاکٹروں کی رائے ہو کہ بغیر اعضاء کی تبدیلی کے اس مریض کے حق میں کوئی دوسری تدبیر کارگر نہیں ہے۔

(۳) جس کے عضو کو دوسرے مریض میں منتقل کیا جارہے ہے، اس نے اپنی زندگی میں بغیر کسی اکراہ اور بغیر کسی فائدے اور قیمت کے کامل ہوش وحواس میں اپنا عضو دینے کی وصیت کی ہو۔

(۴) جس عضو کو منتقل کیا جارہا ہے وہ اختلاط نسب کا سبب نہ ہو، جیسے اعضاء تناسل۔

(۵) اعضاء کو منتقل کرنا ایک ایسی طبی ادارے سے ہو جس میں اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی ٹیم ہو اور اس طبی ادارے کو حکومت کی طرف سے اس کی اجازت ہو، نیز طبی ادارے کا کوئی مادی فائدہ نہ ہو۔

مختلف فقہ اکیڈمیوں کے فیصلے:

عالم اسلام کی مختلف فقہی اکیڈمیوں کی جانب سے مخصوص شرائط کے ساتھ اعضاء انسانی کے عطیہ کے جواز کے فتاویٰ صادر ہوئے ہیں۔

(۱) سعودی عربیہ کے ''ھیئۃ کبار العلماء'' نے ۱۴۰۲ھ میں مخصوص شرائط کے ساتھ اعضاء انسانی کو منتقل کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

(۲) رابطہ عالم اسلامی کی ''فقہ اکیڈمی'' نے اپنے آٹھویں سمینار میں اس کو جائز قرار دیا ہے۔

(۳) ملیشیا میں اپریل ۱۹۶۹ء میں عالم اسلامی کانفرنس ہوئی تھی جس میں یہ فیصلہ لیا گیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر انسانی اعضاء کو نکال کر دوسرے کے جسم میں لگایا جاسکتا ہے۔

(۴) کویت، اردن، مصر اور جزائر میں قائم ''مجمع الفقہ الاسلامی'' نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

قائلین جواز کے دلائل:

(۱) ان حضرات نے قرآن کریم کی کئی آیتوں سے استدلال کیا ہے: ''**من أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً**'' (مائدہ:۳۲) (جس نے کسی شخص کو زندہ کیا، گویا اس نے تمام لوگوں کو زندہ کیا)۔

ایک دوسری جگہ ارشاد باری ہے: ''**فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه**'' (البقرہ:۱۷۳) (جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بے تاب ہوجائے بشرطیکہ نہ تو طالبِ لذت ہو اور حد سے تجاوز کرنے والا ہو اس شخص پر کوئی گناہ نہیں)۔

''**فمن اضطر في مخمصة غير متجانف لاثم فإن الله غفورٌ الرحيم**'' (المائدہ:۳) (پس جو شخص شدت

بھوک میں بے تاب ہوجائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہوتو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحم کرنے والے ہیں)۔

مذکورہ آیات میں اس شخص کے لئے جو بھوک و پیاس سے مررہا ہو اور جان بچانے کے لئے حرام چیز کے علاوہ کوئی اور چیز نہ ہو تو ایسی اضطراری حالت میں اس حرام چیز کو استعمال کرکے اپنی جان بچالینا نہ صرف جائز بلکہ لازم قرار دیا گیا ہے، ایسے ہی وہ مریض جس کو کسی عضو کی ضرورت ہو اور اس کو عضو دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو ایسے مریض کی جان بچانے کے لئے اس کو اپنا عضو بھی دینا جائز ہوگا، اسی طرح وہ آیات جن میں بندوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جو مریض خرابیٔ عضو کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہو اس کو اپنا عضو دے کر اس کے ساتھ آسانی کا برتاؤ کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یرید اللہ بکم الیسر ولا یریدبکم العسر" (البقرۃ: ۱۸۵) (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں)۔

(۲) فقہی قواعد سے استدلال:

۱- "الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ والنظائر) (ضرورتیں ممنوع چیزوں کو مباح کردیتی ہیں)۔

۲- "الضرر یزال" (ضرر کو زائل کیا جائے گا)۔

۳- "المشقۃ تجلب التیسیر" (مشقت آسانی پیدا کرتی ہے)۔

ان قواعد کا حاصل یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت ایک ناجائز چیز جائز ہوجاتی ہے، لہٰذا انسانی عضو اپنی اصل کے اعتبار سے اگرچہ اس کا انتقال ممنوع ہے، لیکن ایک انسان کی جان بچانے کی خاطر اور اس کو ہلاکت سے بچانے کی ضرورت کے پیش نظر اعضاء انسانی کے عطیہ کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۳) جو حضرات اعضاء انسانی کے عطیہ کے جواز کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ اپنے کسی عضو کا عطیہ یہ صدقۂ جاریہ ہے، جیسے کوئی جوان شخص گردہ کے خراب ہوجانے کی وجہ سے موت کے دہانے پر ہو اور کسی ایسے آدمی کا گردہ اس کو لگادیا جائے جس کی برین ہمریج کی وجہ سے موت ہوگئی ہو تو ایسی صورت میں اس متوفی شخص کا یہ عضو اس کے لئے یقیناً صدقۂ جاریہ ہوگا۔

(۴) بعض عرب علماء نے یہ دلیل دی ہے کہ اگرچہ انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں، لیکن اپنے اعضاء کا متولی ہے، اور جو چیز متولی کی ولایت میں ہو اس میں تصرف کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس تصرف میں اس کا اپنا کوئی نقصان نہ ہو، لہٰذا نقصان نہ ہونے کی صورت میں اپنے کسی عضو کا عطیہ جائز ہوگا۔

قائلین عدم جواز اوران کے دلائل:

برصغیر کے اکثر علماء بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے ارباب افتاء عدمِ جواز کے قائل ہیں، اسی طرح عرب علماء میں عبداللہ بن باز اور صالح العثیمن جو یہ دونوں حضرات کے عرب علماء میں ممتاز مقام اور مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے عرب علماء کا یہی موقف ہے کہ مرنے کے بعد اعضاء کی وصیت کرنا ناجائز ہے، مجموعہ فتاویٰ ابن باز میں ہے:

”**والأقرب عندي أنه لا يجوز للحديث المذكور ولأن في ذلک تلاعبا بأعضاء الميت وامتهانا له والورثة قد يطمعون في المال ولايبالون بحرمة الميت والورثة لا يرثون جسمه وإنما يرثون ماله**“(مجموعہ فتاویٰ ابن باز، ۱۳ / ۳۶۴)۔

عدم جواز کے قائلین کہتے ہیں کہ انسانی اعضاء کے سلسلے میں دو پہلو قابل غور ہیں، ایک یہ کہ انسان کا وجود درحقیقت ودیعت وامانت ہے، انسان اپنے جسم وروح بلکہ اپنے کسی عضو کا بھی مالک نہیں ہے، انسان اپنے اعضاء کا امین ومحافظ ہے، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ”**لأن نفسه ليست ملكا له مطلقا بل هي لله تعالي فلا يتصرف فيها**“ (بخاری شریف تحت رقم الحدیث: ۵۷۷۸)(اس لئے کہ جان اس کی ملکیت میں بالکل نہیں ہے، بلکہ وہ کامل طور پر اللہ تعالی کی ملکیت ہے، اس لئے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے)۔

اسی لئے خودکشی کرنا یا حالت اضطرار میں کسی شخص کو اپنا کوئی عضو کھانے کے لئے دینا جائز نہیں ہے، اور نہ ہی کسی مضطر کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی انسان کا عضو کھا کر اپنی جان بچالے، اگر انسان کو اپنے اعضاء میں اس طرح کے تصرف کا حق ہوتا تو مضطر کو اپنا عضو کھانے کے لئے دینا جائز ہوتا، فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

”**مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع يدي وكلها أو قال: اقطع منى قطعة فكلها لا يسعه أن يفعل ذلک ولا يصح أمره كما لا يصح للمضطر أن يقطع قطعة من لحم نفسه فيأكل**“(فتاوی عالمگیری، ۵ / ۳۳۸، مکتبہ زکریا)۔

قرآن میں بھی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کا محافظ اور نگراں ہے، سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”**إن السمع والبصر والفؤاد كل أولئک كان عنه مسئولا**“(بنی اسرائیل: ۳۶)(کان، آنکھیں اور دل سب کے بارے میں باز پرس ہوگی)۔

اسی لئے وہ اس حد تک اس میں تصرف کرسکتا ہے جس حد تک شریعت نے اسے اجازت دی ہے، اس حد سے تجاوز کرکے تصرف کرنے کا اسے کوئی اختیار نہیں ہے۔

موت کے بعد اعضاء کی وصیت کا حکم:

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو مکرم و محترم بنایا ہے، اس لئے اعضاء انسانی میں کسی قسم کا تصرف کرنا اور اپنے جسم سے علیحدہ کر کے دوسرے کو عطا کرنا یہ احترامِ انسانی کے خلاف معلوم ہوتا ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"**والثاني أن استعمال جزء منفصل عن غيره من بني آدم إهانة بذلک الغير والآدمي بجميع أجزائه مكرم ولا إهانة في استعمال جزء نفسه في الإعادة إلي مكانه**" (بدائع الصنائع ۵/۱۳۳، دار الکتاب العربی، بیروت)۔

(اپنے جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر اپنے جسم میں لگانا یہ احترام انسانی کے خلاف نہیں ہے، لیکن دوسرے کے جسم میں لگانا یہ احترام انسانی کے خلاف ہے)۔

اسی احترامِ انسانی کے پیش نظر فقہاء نے اعضاء انسانی سے انتفاع اور اس کی بیع و شراء کو ناجائز قرار دیا ہے۔

"**لا يجوز بيع شعور الإنسان ولا الانتفاع به، لأن الآدمي مكرم لا مبتذل فلا يجوز شيء من أجزائه مهانا مبتذلا**" (ہدایہ ۳/۵۵)۔

اعضاء انسانی کو جسم سے علیحدہ کر کے دوسرے کے جسم میں استعمال کرنا ابتذال ہے، اور اعضاء انسانی کا ابتذال احترام انسان کے منافی ہے، اس لئے جس طرح اپنی زندگی میں اپنا کوئی عضو ہبہ کرنا احترامِ انسانی کے خلاف ہے، اسی طرح مرنے کے بعد اپنے کسی عضو کی وصیت کرنا بھی ناجائز ہے، اس لئے کہ جس طرح اپنی زندگی میں کسی قسم کے تصرف کرنے کا انسان مجاز نہیں ہے، اسی طرح مرنے کے بعد کسی تصرف کا مالک بھی نہیں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

"**كسر عظم الميت ككسره حياً**" (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۳۲۰۷) (میت کی ہڈیوں کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندہ شخص کی ہڈی توڑنا)۔

آئی بینک کا حکم:

کسی زندہ شخص کا اپنی آنکھ کا ایک قرنیہ ہبہ کرنا یا موت کے بعد کے لئے وصیت کرنا ناجائز اور حرام ہے، اس لئے کہ جن حضرات نے بھی اعضاء انسانی کے تبرع کو جائز کہا ہے انہوں نے ضرورت اور اضطرار کی قید لگائی ہے، کوئی انسان بلا آنکھ کے زندہ رہ سکتا ہے، کسی دوسرے انسان کی آنکھ لگانا ضرورت کے درجہ میں نہیں ہے، اس لئے یہ صورت ناجائز ہے، پھر زندہ انسان اگر اپنی ایک آنکھ دیدے تو اس میں مثلہ کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدنما کرنا اور تغییر خلق اللہ بھی پایا جا رہا ہے، اس لئے انسان اپنے جسم میں اس طرح کے تصرف کرنے کا مالک نہیں ہے، اسی سے آئی بینک کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ جب آنکھ کا عطیہ جائز نہیں ہے تو پھر اس کا بینک قائم کرنا بھی ناجائز ہے۔

دودھ بینک کاحکم:

شریعت اسلامیہ نے عورت کے دودھ کو اپنے بچے کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی پلانے کی اجازت دی ہے، اور اس پر اجرت لینے کو بھی جائز کہا ہے، لیکن دودھ بینک قائم کرنا تاکہ عورتوں سے رضا کارانہ یا قیمتا دودھ کو خریدا جائے اور ضرورت مند بچوں کو بلاعوض یا قیمت سے دے دیا جائے احترامِ انسانی کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام نے رضاعت کی بنیاد پر دودھ پینے والے بچے اور دودھ پلانے والی عورت کے درمیان جو مقدس رشتہ قائم کیا ہے، اس کے بھی مغائر معلوم ہوتا ہے، شریعت نے دودھ پلانے پر اجرت لینے کو ضرور جائز قرار دیا ہے لیکن اس کو فروخت کرنے کی کسی صورت میں گنجائش نہیں ہے، اگر اضطراری ضرورت پیش آجائے تو عورت کے دودھ کو خریدنے کی اجازت ہوسکتی ہے جس طرح خون کے خریدنے کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے، لیکن اس کو فروخت کرنا بالکل درست نہیں ہے، اس لئے دودھ بینک قائم کرنا اسلامی اصول کے بالکل مغائر معلوم ہوتا ہے، ایسی صورت میں گویا جان بوجھ کر رضاعت کے مقدس رشتے کو پامال کیا جارہا ہے، اس کے لئے مناسب صورت یہ ہوسکتی ہے جو عورتیں بچوں کو دودھ پلانا چاہتی ہیں وہ اپنا نام بینک میں لکھادیں اور جس کو دودھ کی ضرورت ہو وہ بینک سے رابطہ کرے اور بینک دونوں سے دلالی کی اجرت لے کر دونوں کے درمیان رابطہ کرادیں، اور دودھ پلانے والی عورت بچے کے ذمہ داروں سے معاملہ طے کرکے دودھ پلادیں، ایسی صورت میں رضاعت کا مقدس رشتہ بھی برقرار رہے گا اور لوگوں کی ضرورت بھی پوری ہوجائے گی، اس صورت میں دودھ کا اجارہ ہوگا دودھ کی خرید وفروخت نہیں ہوگی، نیز ضرورت مند لوگ اپنے مناسب عورت کا انتخاب بھی کرسکیں گے۔

حرمت رضاعت کی تفصیل:

اگر کسی عورت کا دودھ کوئی بچہ مدت رضاعت میں پی لے تو حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے، اور وہ عورت اس بچے کی رضاعی ماں بن جاتی ہے، یہ مسئلہ نص قطعی سے ثابت ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **"وأمهاتكم اللاتي أرضعنكم"**، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **"يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب"**، لیکن اگر کسی جگہ دودھ بینک قائم ہو اور کوئی اس بینک سے دودھ لے کر بچے کو پلادے اور متعین طور پر معلوم ہو کہ بچے نے کس کس عورت کا دودھ پیا ہے تو ایسی صورت میں رضاعت کا رشتہ برقرار رہے گا، لیکن اگر معلوم نہ ہو کہ کن کن عورتوں کا دودھ بچے نے پیا ہے تو حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

"ولو أرضعها أكثر أهل قرية ثم لم يدر من أرضعها فأدا أحدهم تزوجها إن لم تظهر علامة ولم يشهد بذلك جاز" (الدر مع الرد ۴/۴۰۲، مکتبہ زکریا)۔

مادہ منویہ بینک کا حکم:

اسلام نے نسب کے تحفظ پر بہت زیادہ زور دیا ہے، اور نسب کے حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اسی حفاظت نسب کے پیش نظر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يسقي ماء ه زرع غيره**" (ابوداؤد، باب وطئ السبایا، رقم الحدیث: ۲۱۵۸) (جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کا پانی (مادہ منویہ) دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے)۔

اسلام کے تحفظ نسب کے نظام کو سامنے رکھ کر مادہ منویہ بینک کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ کرنا آسان ہے، اس لئے کہ مادہ منویہ بینک میں اسلامی اصول کی بہت سی مخالفتیں موجود ہیں۔

(۱) مادہ منویہ انسان کا جز ہے اور جزوِ انسانی سے انتفاع بلاضرورت جائز نہیں، جب کہ یہاں بلاضرورت اپنا مادہ منویہ بینک کو فراہم کیا جارہا ہے۔

(۲) مادہ منویہ جو انسان کو جز ہونے کی وجہ سے محترم ہے اس کو فروخت کیا جاتا ہے۔

(۳) مادہ منویہ بینک کے قیام کی وجہ سے نسب خلط ملط ہوجائے گا، اس لئے کہ ایک اجنبی مرد کا مادہ منویہ ایک اجنبی عورت کے رحم میں ڈالا جائے گا، اس سے نسب کا تحفظ کہاں رہ جائے گا؟

(۴) اس کے قیام کی کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے، اور بلاشرعی ضرورت کے اجزاء انسانی کی تذلیل وتوہین جائز نہیں ہے۔

(۵) ایک عورت جو اپنے رحم میں کسی اجنبی کے منی کو داخل کرائے گی اس میں کشف عورت لازم آئے گا، جب کہ یہاں کشف عورت کی کوئی شرعی ضرورت اور مجبوری نہیں ہے۔

(۶) قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے صاحبِ اولاد بنادے اور جس کو چاہے اولاد کی نعمت سے محروم کردے، لیکن مادہ منویہ بینک کا قیام اسلام کے اس نظریہ کے بالکل مخالف ہے، مادہ منویہ بینک کا قیام اس بنیاد پر مبنی ہے کہ ہر کسی کو اولاد کی نعمت سے بہرہ ور کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں "**ويجعل من يشاء عقيما**" کی بنیاد ہی ختم ہوکر رہ جائے گی۔

ان مفاسد کی وجہ سے مادہ منویہ بینک کا قیام ناجائز ہے، عرب سے شائع فتاویٰ میں فتاویٰ اسلامیہ ایک اہم فتاویٰ شمار کی جاتی ہے، جس کے اصحابِ افتاء میں عبداللہ بن باز، صالح العثیمن، عبداللہ بن عبدالرحمٰن جبرین شامل ہیں، اس میں لکھا ہے:

”لا يجوز التبرع بذلک (أي المني) فيما يظهر لما يستلزمه من مس العورات واستعمال الأشياء القذرة وملامسة النجاسة مع أنه غير متحقق الثبوت، والله تعالي هو الخالق المتصرف ”يهب لمن يشاء إناثا ويهب لمن يشاء الذكور أو يزوجهم ذكرانا وأناثا ويجعل من يشاء عقيما“ وليس هناک ضرورات وعلى المرء أن يرضى بما خلق الله وأعطاه“ (فتاویٰ اسلامیہ، حکم التبرع بالدم ۴/۴۱٦)۔

☆☆☆

اعضاءواجزاءانسانی کا عطیہ اور مسائل واحکام

(مفتی) محمد نصر اللہ ندوی☆

خون کا عطیہ:

انسان کا پورا وجود نہایت قابل احترام ہے، اور انسان کا اپنے کسی عضو یا جزء کو کسی دوسرے انسان کو دینا انسانی وقار کے منافی ہے؛ البتہ اگر کوئی شدید ضرورت ہو تو ایک انسان کا جزء دوسرے انسان کو دیا جاسکتا ہے؛ مثلاً ایک انسان کو خون کی ضرورت ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر اس کو خون میسر نہیں ہوا تو وہ زندگی سے سے محروم ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ علاج اصلا مباح اور پاک چیزوں کے ذریعہ ہی ہونا چاہئے، جہاں تک خون کا تعلق ہے تو وہ حرام اور نجس ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**انما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير**۔"(البقرۃ:۱۷۳)(اللہ نے تمہارے اوپر مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے)، سورہ مائدۃ میں فرمایا گیا: "**حرمت عليكم الميتة والدم**" لیکن اگر ایک انسان دوسرے کے خون کیلئے مجبور ہوجائے اور اس کی زندگی بچانے کا صرف یہی راستہ ہو اور ظن غالب ہو کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا تو شرعا خون چڑھایا جاسکتا ہے؛ تاکہ اس کی زندگی سلامت رہے اور وہ بیماری سے شفایاب ہوجائے۔

اللہ تعالی نے خون کو حرام قرار دینے کے بعد یہ بھی واضح فرمادیا کہ شدید مجبوری کی صورت میں خون کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ فرماتا ہے: "**فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه**" (البقرۃ۱۷۳)(اور جو مجبور ہو بشرطیکہ اس کے اندر خواہش نہ ہو نیز ضرورت سے زیادہ کی طلب نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے)۔

لہذا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ضرورت کی بنا پر خون دے سکتا ہے، یہ نہ صرف جائز؛ بلکہ بسا اوقات مستحب اور اجر عظیم کا باعث بھی ہوسکتا ہے؛ اس لئے کہ ایک انسان کو زندگی عطا کرنا، ساری انسانیت کو زندگی عطا کرنے کے برابر ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "**من أحيا ها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (المائدۃ۳۲)(جس نے ایک انسان کی زندگی کا

☆ استاذ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

انتظام کیا،اس نے گویا ساری انسانیت کوزندگی عطا کیا)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:"**يجوز للعليل شرب الدم والبول إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه وان قال الطبيب يتعجل شفاءك فيه وجهان**"(فتاوی ہندیہ ۵/۳۵۵)(بیمار شخص کیلئے خون اور پیشاب پینا جائز ہے جب مسلمان ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس میں شفاء ہے اور مباح چیزوں میں اس کا کوئی بدل نہ ہو اور اگر ڈاکٹر یہ کہے کہ اس سے جلدی شفا مل جائے گی تو اس میں دو صورتیں ہیں)۔

اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ مجبوری میں خون اور پیشاب پینا بھی جائز ہے؛لہذا خون چڑھانا بھی جائز ہوگا اور جب خون چڑھانا جائز ہوگا تو خون دینا بھی جائز ہوگا۔

خون جس طرح مسلمان کو دینا جائز ہے،اسی طرح غیر مسلم کو بھی دینا جائز ہے؛اس لئے یہ صدقہ ہے اور صدقہ میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق جائز نہیں ہے(اگرچہ مسلمان زیادہ اولی ہے)،حضور اکرم ﷺ اور آپ کے بعض اصحاب اپنے مشرک اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کرتے تھے اور ان پر صدقہ کرتے تھے،کچھ صحابہ کو اس پر اعتراض ہوا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:"**ليس عليك هداهم ولكن الله يهدي من يشاء وما تنفقوا فلأنفسكم وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله وما تنفقوا من خير يوف اليكم وأنتم لا تظلمون**" (البقرۃ:۲۷۲)(اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اپنے لئے کرو گے اور جو بھی خرچ کرو اللہ کی رضا کیلئے کرو اور جو بھی تم مال میں سے خرچ کرو گے اس کا پورا بدلہ اللہ کے یہاں دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گا)۔

البتہ ایک مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ حربی کو اپنا خون دے؛اس لئے کہ یہ تعاون علی الاثم کے زمرے میں آجائے گا۔اللہ تعالی فرماتا ہے:"**لا تعاونوا على الاثم والعدوان**" (البقرۃ:۱۷۲)(ظلم وزیادتی میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو)۔

رہا سوال بلڈ بینکوں میں خون دینے کا تو یہ نہ صرف جائز بلکہ مستحب عمل ہوگا اور ایسے کرنے والا اللہ کے نزدیک اجر عظیم کا مستحق ہوگا،اس لئے کہ ایک انسان کو زندگی عطا کرنے والا ساری انسانیت کو زندگی عطا کرنے والے کے برابر ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے،جس کا تذکرہ ابھی اوپر گذرا ہے۔اسی طرح یہ نیکی اور خیر میں تعاون بھی ہے جو بجائے خود پسندیدہ عمل ہے۔ارشاد ربانی ہے:"**تعاونوا على البر والتقوى** "(البقرۃ:۱۷۲)۔

لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بلڈ بینکوں کو خون دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں؛اس لئے کہ وہ جس دین کے پیروکار ہیں وہ سراپا رحمت وہمدردی ہے،وہ نہ صرف انسانوں؛ بلکہ حیوانوں اور جانداروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ دوسروں کی زندگی بچانے کیلئے خون کا دینا درست ہے تو اس سے متعلق تمام چیزیں جو اس کے لوازم میں سے ہیں از خود درست قرار پائیں گی؛ مثلا بلڈ کیمپ کا رضا کارانہ قیام، شرعا اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ یہ مستحسن اور قابل ستائش عمل ہے، خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر اس طرح کے کیمپ کا اہتمام بہت ہی مناسب اور موزوں ہے؛ اس لئے کہ آپ ﷺ سارے جہان کیلئے رحمت بنا کر بھیجے گئے، اور آپ ؐ کی انسانیت نوازی، ہمدردی و غمگساری کا دائرہ انسانوں سے آگے بڑھ کر حیوانات تک وسیع تھا۔

جگر کا عطیہ:

فقہ کی کتابوں میں عام طور پر انسان کے اعضاء سے انتفاع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انسان جس طرح زندگی میں قابل احترام ہے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی قابل تکریم ہے۔ شرح السیر الکبیر میں ہے:

"**والآدمی محترم بعد موته علی ما کان علیه فی حیاته،فکما لا یجوز التداوی بشیء من الآدمی الحیّ اکراما له فکذلک لا یجوز التداوی بعظم المیت ،قال رسول الله ﷺ:کسر عظم المیت ککسر عظم الحیّ.**" (شرح السیر الکبیر ۱/۲۹) (آدمی موت کے بعد بھی محترم ہے جس طرح زندگی میں قابل احترام ہے، لہذا جس طرح زندہ انسان کے کسی جزء سے احتراماً علاج جائز نہیں ہے، اسی طرح مردہ کی ہڈی سے بھی علاج درست نہیں ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: مردہ کی ہڈی کو توڑنا زندہ شخص کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے)۔

لیکن یہاں پر دو باتیں قابل تنقیح ہیں: اول یہ کہ کیا مروجہ پیوند کاری بھی اہانت کی تعریف میں داخل ہے؟ دوم یہ کہ کسی انسان کی جان بچانے کیلئے محترم کی اہانت کو گوارا کیا جا سکتا ہے؟

اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں:

فقہاء نے اجزاء انسانی سے انتفاع کو بے شک منع کیا ہے، لیکن یہ ممانعت اس لئے تھی کہ اس زمانہ میں انسانی اعضاء سے انتفاع کو توہین سمجھا جاتا تھا اور اس دور میں ایسے طریقے بھی رائج نہیں تھے کہ شائستہ طور پر انسانی اجزاء سے انتفاع کیا جا سکے، ہمارے زمانہ میں اس عمل کو انسان کی توہین نہیں سمجھا جاتا، اگر کوئی شخص اپنا عضو کسی اور کو دیدے تو نہ وہ خود اہانت کا احساس کرتا ہے، نہ لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں؛ بلکہ اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اسی لئے بڑے بڑے قائدین اور زعماء اپنے اعضاء کے سلسلہ میں اس قسم کی وصیت کر جاتے ہیں اور یہ چیز ان کیلئے نیک نامی کا باعث ہوتی ہے اور انسانیت نوازی کی دلیل سمجھی جاتی ہے (اعضاء کی پیوند کاری، ص: ۳۱۲)۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا انسانی جان کو بچانے کیلئے محترم کی اہانت کو گوارا کیا جا سکتا ہے؟ اس کے بارے میں مولانا

فرماتے ہیں:

فقہی نظائر کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کے تحفظ اور بقاء کیلئے قابل احترام چیزوں کی اہانت بھی قبول کی جاسکتی ہے۔علامہ سمرقندی نے ایک خاص جزئیہ پر بحث کرتے ہوئے جس اصول سے استدلال کیا ہے وہ یہی ہے کہ ایک انسان کی بقاء کیلئے دوسرے کی تکریم کے پہلو کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

وہ فرماتے ہیں:"**لو أن حاملا ماتت فی بطنها ولد یضطرب فان کان غالب الظن أنه ولد حیّ وهو فی مدة یعیش غالبا فانه یشق بطنها ؛لأن فیه احیاء الآدمی فترک تعظیم الآدمی أهون من مباشرة سبب الموت**"(تحفۃ الفقہاء/ ۳۴۳)(اگر کوئی حاملہ عورت مرجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کررہا ہو،اور ظن غالب ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے تو اس حاملہ کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا؛اس لئے کہ اس میں ایک انسان کو زندگی بخشنا ہے،اور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلہ میں زیادہ آسان یہ ہے کہ آدمی کی عظمت کے تقاضہ کو چھوڑ دیا جائے)(اعضاء کی پیوند کاری،ص:۳۱۴)۔

اس سے یہ بات منقح ہوگئی کہ موجودہ زمانہ میں پیوند کاری کا جو طریقہ رائج ہے،اس میں انسانیت کی توہین نہیں ہے،اور اگر فرض کرلیا جائے کہ اس میں توہین ہے بھی تو ایک جان کو بچانے کیلئے اس توہین کو گوارا کیا جاسکتا ہے؛لہذا ایک انسان کا جگر موت کے بعد دوسرے ضرورتمند متعین انسان کے اندر لگانا درست ہوگا۔

لیکن اسکے لئے مندرجہ ذیل شرائط مطلوب ہیں:

۱-جس انسان کا جگر نکالنا ہواس کی موت سو فیصد ہوچکی ہواور زندگی کا کوئی شبہ نہ ہو۔

۲-جگر نکالنے کی ضرورت شدید ہو بایں طور پر کہ جس مریض کو جگر کی ضرورت ہو اس کی حالت کافی نازک ہو۔

۳-مرنے والا عاقل و بالغ ہو اور اس نے اپنی زندگی میں بغیر کسی جبر واکراہ کے اس کی اجازت دی ہو۔اگر اس نے زندگی میں اس بارے میں کچھ نہ کہا ہو تو مرنے کے بعد اس کے ورثہ اس کیلئے راضی ہوں۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:"**یجوز نقل بعض أعضاء الانسان لآخر کالقلب والعین،إذا تأکد الطبیب المسلم الثقة العدل موت المنقول عنه، لأن الحیّ أفضل من المیت وتوفیر البصر أو الحیاة لانسان ،نعمة عظمی مطلوبة شرعاً**"(الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۳/ ۵۲۲)(ایک انسان کے اعضاء دوسرے کو منتقل کیا جاسکتا ہے،جیسے دل اور آنکھ بشرطیکہ کوئی معتبر مسلمان ڈاکٹر اس انسان کی موت کی تصدیق کردے جس کے عضو کو نکالنا ہے؛اس لئے کہ زندہ انسان مردہ سے افضل ہے،اور کسی انسان کو بینائی یا زندگی عطا کرنا بہت بڑی نعمت ہے جو شرعا مطلوب ہے)۔

اگر کسی شخص نے زندگی میں یہ وصیت کی ہو کہ اس کا جگر بعد از مرگ عطیہ کر دیا جائے تو اس کی وصیت نافذ کی جائے گی، علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"اذا أوصى فيجب أن تحترم وصيته كما إذا أوصى بالمال يجب أن تنفذ وصيته ،القرآن يتحدث عن تركة الميت فيقول :" من بعد وصية يو صى بها أو دين"(النساء:١٠)،" فالوصية حتى أقدمها على الدين هذا فى الماليات ففى غير الماليات المفروض تحترم وصية الميت بالايجاب أو بالسلب لو أوصى بالتبرع يجب أن يتبرع"(موقف الاسلام من التبرع بالأعضاء:ص ١٢)(اگر وصیت کرے تو اس کی وصیت کا احترام کیا جائے گا، جیسا کہ مال کے بارے میں وصیت کرے تو اس کی وصیت نافذ کی جائے گی، قرآن وصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: من بعد وصية يو صى بها أو دين. اس نے وصیت کو دین سے مقدم رکھا ہے جو مال سے تعلق رکھتا ہے، لہذا مالیات کے علاوہ میں بھی اس کی وصیت کا احترام کیا جائے گا خواہ وہ سلبی ہو یا ایجابی ہو، اگر اس نے تبرع کی وصیت کی ہے تو تبرع کیا جائے گا)۔

جہاں تک کسی طبی ادارہ کو عطیہ کرنے کا تعلق ہے تو وہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس کا انتظام نہایت ہی معتبر اور ثقہ ہاتھوں میں ہو نیز اس بات کا مکمل اطمینان ہو کہ وہ اس کا غلط استعمال نہیں کریں گے؛ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ مرنے والے شخص نے زندگی میں اس کی اجازت دی ہو، اور اس نے زندگی میں اس کی اجازت نہیں دی تھی تو مرنے کے بعد اس کے ورثہ کا اس کیلئے راضی ہونا ضروری ہے۔ اور اگر مرنے والے کی شناخت نامعلوم ہو یا اس کا کوئی وارث نہ ہو تو ولی المسلمین کی طرف سے اس کی اجازت ہونی چاہئے۔ فقہ اکیڈمی جدہ نے ۱۴۰۸ھ میں اس موضوع پر ایک قرارداد پاس کیا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

"يجوز نقل عضو من ميت الى حيّ تتوقف حياته على ذلك العضو أو تتوقف سلامة وظيفة انسانية فيه على ذلك بشرط أن يأذن الميت أو ورثته بعد موته، أو بشرط موافقة ولى المسلمين ان كان المتوفى مجهول الهوية أولا ورثة له.(قرار مجمع الفقه الاسلامى جده بشأن انتفاع الانسان بأعضاء جسم آخر حيا أو ميتا"(ایک مردہ انسان کا ایسا عضو جس پر اسکی زندگی کا دارومدار ہو یا کوئی انسانی ذمہ داری اس سے وابستہ ہو، کسی زندہ شخص کے اندر منتقل کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ مرنے والے نے یا اسکے ورثہ نے اس کی اجازت دیدی ہو، اور اگر میت کی شناخت نہ ہو سکے یا اس کا کوئی وارث نہ ہو تو مسلمانوں کے امیر نے اس کی اجازت دیدی ہو)۔

آنکھ کا عطیہ:

آنکھ اللہ تبارک وتعالی کی بہت بڑی نعمت ہے،اس کے بغیر زندگی کا ہر لطف بے کیف ہے،اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں بطور احسان اس کا تذکرہ بار بار کیا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کیلئے روشنی ہونے کے ساتھ اسکے حسن و جمال کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے۔اگر انسان کی ایک آنکھ چلی جائے تو اس کے چہرہ کا حسن زائل ہوجاتا ہے اور وہ داغدار ہوجاتا ہے؛لہذا اگر کوئی شخص یہ سوچ کر کہ میرا تو ایک آنکھ سے کام چل سکتا ہے،اس لئے میں اپنی آنکھ کا قرینہ دوسرے بھائی کو دیدوں تاکہ اس کی آنکھیں بھی روشن ہوجائیں تو ایسا کرنا اس کیلئے جائز نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہ صورت کو بگاڑنے اور اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرنے کے مترادف ہوگا جو بہر حال ناجائز ہے۔قرآن کریم میں اس کو شیطانی عمل سے تعبیر کیا گیا ہے۔اللہ تعالی فرماتا ہے:"**ولآمرنهم فليغرن خلق الله**"(النساء:۱۱۹)۔

حدیث شریف میں ان لوگوں پر لعنت بھیجی گئی ہے جو اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرتے ہیں۔ارشاد نبویؐ ہے:

"**لعن الله الواشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المتغيرات خلق الله** "(الجمع بین الصحیحین،حدیث نمبر:۲۳۲۰) (اللہ کی لعنت ہے گودوانے والی عورتوں پر اور ان عورتوں پر جو اپنے پلکوں کو باریک کرتی ہیں اور حسن میں اضافہ کرنے کیلئے دانتوں میں سوراخ کرتی ہیں، یہ عورتیں اللہ کی خلقت کو تبدیل کرنے والی ہیں)۔

البتہ اگر کسی شخص کی آنکھ کسی حادثہ کی وجہ سے باہر نکل آئی اور دوبارہ اسکا اپنی جگہ پر لگانا ممکن نہ ہو تو یہ قرنیہ کسی دوسرے شخص کو صاحب چشم کی اجازت سے دیا جاسکتا ہے۔

کسی کی موت کے بعد اس کی آنکھ کسی متعین شخص کو بینائی فراہم کرنے کیلئے دی جاسکتی ہے؛لیکن اس کیلئے وہ تمام شرطیں ضروری ہوں گی جن کا تذکرہ اوپر جگر نکالنے کے ضمن میں آچکا ہے؛ مثلاً جس کی آنکھ نکالی جارہی ہو اس کی موت قطعی طور پر ہوچکی ہو،مرنے والا شخص عاقل و بالغ ہو اور زندگی میں اس نے اجازت دی ہو یا اس کے ورثہ اس کیلئے راضی ہوں۔

اگر کوئی شخص پس مرگ اپنی آنکھ آئی بینک میں عطیہ کرنے کے بارے میں وصیت کرجائے تو اس کی وصیت نافذ کی جائے گی اور اسکی آنکھ آئی بینک میں دیدی جائے گی؛خواہ اس سے استفادہ کرنے والا مسلم ہو یا غیر مسلم؛اس لئے کہ آنکھ کا عطیہ دراصل ایک طرح کا صدقہ ہے اور صدقہ کا تعلق کسی مخصوص انسان سے نہیں ہوتا،اس کے دائرے میں مسلم و غیر مسلم سبھی آتے ہیں۔قرآن کریم میں ابرار اور متقیوں کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: "**ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا**"(الدھر:۸) اسیر کا تعلق اس وقت مشرکین سے تھا اس کے باوجود قرآن کریم میں ایمان والوں کی اس بات کیلئے مدح سرائی کی گئی کہ وہ قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔آگے فرمایا گیا کہ وہ صرف اللہ کی رضا جوئی کیلئے

کھلاتے ہیں :"انما نطعمکم لوجه الله لا نريد منكم جزاء ولا شكورا" (الدھر:۹)۔

سعودی عرب کے ممتاز علماء پر مشتمل "ھیئۃ کبار العلماء" کے ایک فتوی سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے جس کو ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

بینک الأعضاء میں جو اعضاء دیئے جاتے ہیں ان سے استفادہ کرنے والوں میں مسلم اور غیر مسلم سبھی ہوتے ہیں ؛اس لئے اس میں عطیہ کرنے میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے ؛اس لئے کہ یہ صدقہ ہے اور صدقہ کے معاملہ میں اسلام کوئی تفریق نہیں کرتا ؛البتہ مسلمان غیر مسلم کے مقابلہ اولی ہے جس طرح صالح مسلمان فاسق مسلمان کے مقابلہ اولی ہے (فتاوی اللجنۃ برقم: ۴۴-۴۳/۶۱/۱۵۹۹)۔

دودھ کی خرید وفروخت اور رضاعت کے احکام:

نومولود بچوں کیلئے اللہ تبارک وتعالی نے ماں کے دودھ کو سب سے زیادہ صحت بخش اور مقوی بنایا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک قیمتی تحفہ ہے ؛لہذا بچہ کی پیدائش کے بعد دو سال تک ماں کو ہی دودھ پلانا چاہئے، یہی فطرت کا اصول ہے ؛لیکن موجودہ زمانہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان فطرت کے تمام اصولوں کو توڑنے پر آمادہ ہے، انسانی دودھ کی خرید وفروخت اس کی واضح مثال ہے۔

جہاں تک انسانی دودھ کی خرید وفروخت کا سوال ہے، تو احناف کے نزدیک اسکی اجازت نہیں ہے، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- دودھ انسان کا جزء ہے اور جس طرح انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے، اسی طرح اپنے جزء کا بھی مالک نہیں ہے اور جب مالک نہیں ہے تو اس کی بیع بھی جائز نہیں ہوگی ؛ کیونکہ بیع کیلئے ملکیت ضروری ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے غیر مملوکہ شیء کو فروخت کرنے سے منع کیا ہے (المستدرک علی الصحیحین ۲/۲۱ حدیث نمبر:۲۱۸۶)۔

۲- دودھ مال نہیں ہے اور بیع درست ہونے کیلئے مبیع کا مال ہونا ضروری ہے۔ صاحب بدائع الصنائع لکھتے ہیں:

"ولنا أن اللبن ليس بمال فلا يجوز بيعه، والدليل على أنه ليس بمال بإجماع الصحابة ......" آگے لکھتے ہیں: "لأنه لا يباح به الانتفاع شرعا على الاطلاق بل لضرورة تغذية الأطفال وما كان حرام الانتفاع به شرعا الا لضرورة لا يكون مالا كالخمر والخنزير" (بدائع الصنائع ۵/۱۴۵) (ہماری دلیل یہ ہے کہ دودھ مال نہیں ہے ؛لہذا اس کی بیع جائز نہیں ہے، دودھ کے مال نہ ہونے کی دلیل صحابہ کا اجماع ہے....اس لئے اس سے استفادہ شریعت کی رو سے مطلقا جائز نہیں ہے، البتہ بچوں کی غذا کے پیش نظر اس کی اجازت دی گئی ہے، اور جس چیز سے

شرعانہ کہ ضرورتاانتفاع حرام ہواس کو مال نہیں کہا جا سکتا جیسے شراب اور خنزیر)۔

۳-انسان کا پورا وجود محترم ومکرم ہے، دودھ چونکہ اس کا جزء ہے؛لہذا اسکی بیع انسانیت کی توہین وتذلیل ہے، نیز شرف انسانیت کے منافی ہے۔اللہ تعالی فرماتا ہے:"**ولقد کرمنا بنی آدم**"(الاسراء:۷۰)۔

علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں:"**لم یجز بیع لبن المرأة لأنه جزء الآدمی وهو بجمیع أجزاء ه مکرم عن الابتذال بالبیع**"(البحر الرائق ۶/۱۱)(یعنی عورت کے دودھ کی بیع جائز نہیں ہے اس لئے کہ وہ انسان کا جزء ہے اور انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ مکرم ہے، بیع کے ذریعہ اس کی توہین نہیں کی جاسکتی)۔

لہذا ایک عورت کیلئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ دودھ بینک کے ہاتھوں اپنا دودھ فروخت کرے؛البتہ اگر وہ ھبہ کرنا چاہے تو شرعا اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا؛لیکن اگر بینک کو کوئی ایسی عورت نہ مل سکے جو دودھ تبرع کرے تو بدرجہ مجبوری خریدنے کی گنجائش ہوگی، پھر بینک دودھ حاصل کرنے کے بعد ضرورت مند بچوں کیلئے فروخت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا؛اس لئے جب کوئی بینک اسی مقصد سے قائم ہوگا تو اس کے لوازمات ہوں گے؛مثلا بینک کی تعمیر کے اخراجات، ملازمین کی تنخواہیں، مشین وآلات کی فراہمی، سیل ٹیکس کی ادائیگی وغیرہ، گویا اس بینک کی حیثیت ایک دودھ تیار کرنے والی کمپنی کی ہوگی اور اس کے سامان کی حیثیت مال کی ہوگی اور مال کے کاروبار میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

اس مسئلہ سے جڑا ہوا ایک اہم پہلو حرمت رضاعت کا ہے،سوال یہ ہے کہ اس بینک کے ذریعہ جو بچے دودھ پیئیں گے،ان پر رضاعت کے احکام مرتب ہوں گے؟

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بینک میں ہر اس عورت کی مکمل شناخت کا انتظام ہو جس سے دودھ حاصل کیا گیا ہے،اور بینک سے دودھ حاصل کرنے والے ہر شخص کو متعین طور اس کا علم ہو تو ایسی صورت میں اس پر رضاعت کے مکمل احکام جاری ہوں گے۔دوسری صورت یہ ہے کہ متعین طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کس عورت کا دودھ ہے جیسا کہ بلڈ بینکوں میں ہوتا ہے کہ ایک گروپ سے تعلق رکھنے والے تمام خون کو ایک ہی جگہ محفوظ رکھا جاتا ہے تو ایسی صورت میں اس بینک کے ذریعہ دودھ پینے والے بچے کی حیثیت مجھول الام یا مجھول المرضعۃ کی ہوگی؛چنانچہ اس پر رضاعت کے احکام جاری نہیں ہوں گے؛کیونکہ رضاعت کے ثبوت کیلئے اقرار یا بینہ کا پایا جانا ضروری ہے۔علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"**فالرضاع یظهر بأحد أمرین: أحدهما الاقرار،والثانی البینة،أما الاقرار فهو أن یقول لامرأة تزوجها هی أختی من الرضاع،وأما البینة فهی أن یشهد علی الرضاع رجلان أو رجل وامرأتان ،ولا یقبل علی الرضاع أقل من ذلک**"(بدائع الصنائع ۴/۱۴)(رضاعت دو چیزوں کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے:اقرار یا

ثبوت۔اقرار یہ ہے کہ مرد اپنی منکوحہ سے یہ کہے کہ یہ میری رضاعی بہن ہے۔ثبوت یہ ہے کہ دومرد یاایک مرد اور دوعورت رضاعت کی گواہی دیں۔اس کم گواہی رضاعت کے سلسلہ میں قابل قبول نہ ہوگی)۔

واضح رہے کہ اس طرح بینک سے دودھ حاصل کرنے میں یک گونہ حرمت کا شبہ ہوسکتا ہے؛اس لئے اس سے اجتناب ہی بہرحال بہتر ہے۔حدیث شریف میں کہا گیا ہے:"**دع ما یریبک الی ما لا یریبک**" (جامع الاصول حدیث نمبر:۴۰۴۲)(مشکوک چیز کو چھوڑ کر ایسی چیز اختیار کر جس میں کوئی شبہ نہ ہو۔)دوسری جگہ فرمایا گیا:"**من اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه،و من وقع فی الشبهات وقع فی الحرام**"(جامع الاصول حدیث نمبر:۸۱۳۳)(جوشبہات سے بچتا ہے وہ اپنے دین اور آبرو کو سلامت رکھتا ہے،اور جوشبہات میں پڑتا ہے وہ حرام میں پڑجاتا ہے)۔

ان دونوں حدیثوں کا تقاضہ یہ ہے کہ مشتبہ چیزوں سے اجتناب ہی کیا جائے۔اسی لئے ھیئۃ کبار علماء(سعودی عرب)نے بنک کے ذریعہ دودھ پلانے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ان کے فتوی کے الفاظ ملاحظہ کریں:

"**لا یجوز استحلاب الأمهات والاحتفاظ بحلیبهن وتغذیة طفل آخر ؛لما فی ذلک من الجهالة المؤدیة إلی هتک حرمات الرضاع التی یقع التحریم بها شرعا من جهة المرضعة ومن جهة صاحب اللبن ومن جهة الرضیع اذ أنه یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب،وقال النبی ﷺ:من اتقی الشبهات فقد استبرأ لدینه وعرضه**"(مجلۃ البحوث الاسلامیۃ ۲۱/۴۴)م(ماؤں سے دودھ حاصل کرکے اس کو محفوظ رکھنا،پھر دوسرے بچے کو پلانا جائز نہیں ہے؛اس لئے کہ اس میں جہالت ہے جس سے رضاعت کی حرمت پامال ہوتی ہے،اس رضاعت سے مرضعہ،اس کا شوہر اور شیرخوار بچے سے حرمت متعلق ہوتی ہے؛کیونکہ ضابطہ ہے کہ رضاعت سے وہی حرمت ثابت ہوتی ہے جونسب سے ثابت ہوتی ہے۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جوشبہات سے بچتا ہے وہ اپنے دین اور آبرو کو محفوظ رکھتا ہے)۔

مادہ منویہ کی خرید وفروخت:

اگر کوئی مرد یا عورت اپنے مادہ منویہ کو بینک کے ہاتھوں فروخت کرے تو اس کی اجازت قطعا نہیں ہوگی۔یہ حد درجہ شرمناک اور اخلاق وانسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے؛اس کی حرمت محتاج بیاں نہیں ہے،کیوں کہ ایسا کرنے سے نسب میں اشتباہ پیدا ہوجائے گا،جبکہ اسلام نے نسب کے تحفظ کو ضروری قرار دیا ہے،اسی لئے زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کی سخت سزا مقرر کی ہے؛لہذا ہر وہ عمل جونسب میں اشتباہ پیدا کرنے والا ہو،شریعت میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔"**ما أدی الی الحرام فهو حرام**"(قواعد الأحکام فی مصالح الأنام ۲/۱۸۶)۔

اسی طرح بینک کیلئے بھی قطعا یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی عورت کے ہاتھ مادہ منویہ کو فروخت کرے یا بطور ہدیہ دے؛ اس لئے کہ یہ تعاون علی الإثم ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ "**تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدون**"(المائدۃ:۲)۔

☆☆☆

اعضاء واجزائے انسانی سے استفادہ

قرآن وحدیث اور فقہِ اسلامی کی روشنی میں

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی☆

۱-کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو اُس کی ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے؟

جواب: اِس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے تین اعتبار سے خون کی شرعی حیثیت پر گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے:

۱-پاکی وناپاکی کے اعتبار سے، ۲-جزءِ انسانی ہونے کے اعتبار سے، ۳-ملکیت اور عدمِ ملکیت کے اعتبار سے

اِس حقیر کے نزدیک علاج کی حد تک اگر خون کو پاک مانا جائے تو حرام چیز سے علاج کے مقابلہ میں بہرحال بہتر ہوگا، واللہ اعلم!

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ جمہور علماء کے نزدیک خون نجس ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نجس چیز سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اِس سلسلہ میں فقہاء کی رائے درج ذیل ہے:

(الف) نجس چیزوں سے حالتِ اضطرار میں استفادہ تمام فقہاء کے یہاں اِس کی اجازت دی گئی ہے؛ چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

”أجمعت الأمة على أن المضطر إذا لم يجد طاهراً، يجوز له أكل النجاسات كالميتة، والدم، ولحم الخنزير، وما معناها“ (المجموع، کتاب الأطعمة: ۴۳/۹، ط: مکتبۃ الإرشاد، جدہ، نیز دیکھئے: بدایۃ المجتہد، کتاب الأطعمۃ: ۳/ ۱۲۲۷، ط: دارالسلام، شارع ازہر، مصر ۱۹۹۵ء، کشاف القناع، کتاب الأطعمہ: ۵/ ۱۷۳، ط: عالم الکتب، بیروت، لبنان ۱۹۹۷ء، المحیط البرہانی، کتاب الطہارات: ۱/۱۸۷، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۲۰۰۴)۔

(ب) بطورعلاج استفادہ: اِس سلسلہ میں دو رائیں ملتی ہیں:

☆ جامعہ ام سلمہ، فردوس نگر، توپچانچی، دھنباد (جھارکھنڈ)۔

۱- فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، اِس کے قائلین میں احناف اور شوافع ہیں؛ چنانچہ علامہ خطیب شربینیؒ رقم طراز ہیں:

”**والتداوی بالنجس جائز عند فقد الطاهر الذی یقوم مقامه**“ (مغنی المحتاج، باب النجاسۃ: ۱/ ۱۳۱، المجموع، کتاب الأطعمۃ: ۹/ ۵۴)۔

پاک چیز کی غیر موجودگی میں نجس چیز سے علاج درست ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ”**یجوز للعلیل شرب الدم والبول وأكل المیتة للتداوی**“ (الفتاوی الہندیہ: ۵/ ۳۵۵) (بیمار کے لئے علاجاً خون و پیشاب کا پینا اور مردار کا کھانا جائز ہے)۔

۲- نجس چیزوں سے علاج درست نہیں، اِس کے قائلین میں مالکیہ اور حنابلہ ہیں؛ چنانچہ موفق ابن قدامہؒ لکھتے ہیں: ”**لایجوز التداوی بمحرم، ولا بشئ فیه محرم، مثل ألبان الأُتن ولحم شئ من المحرمات**“ (المغنی، کتاب الصید والذبائح، فصل: لا یجوز التداوی بمحرم......: ۹۰۲ /۲۳، نیز دیکھئے: کشاف القناع، کتاب الأطعمہ: ۵/ ۱۷۳، ط: عالم الکتب، بیروت، لبنان ۱۹۹۷ء) (نہ تو حرام چیز سے علاج درست ہے اور نہ ہی ایسی چیز سے، جس میں حرام چیز ملی ہوئی ہو، جیسے: گدھی کا دودھ اور حرام چیز کا گوشت)۔

قولِ راجح:

اِس حقیر کے نزدیک احناف و شوافع کا قول درج ذیل وجوہات کی بنیاد پر زیادہ قرینِ صواب ہے:

۱- علاج ایک انسانی ضرورت ہے اور ضرورت کے وقت ممنوعات سے استفادہ کی گنجائش ہوتی ہے؛ چنانچہ قاعدہ فقہیہ ہے: ”**الضرورات تبیح المحظورات**“ (الأشباہ والنظائر: ۲/ ۹۴)۔

۲- دین کی حفاظت کے بعد شریعت میں جان کی حفاظت کی اہمیت ہے؛ چنانچہ مقاصدِ شریعت کے ایک ماہر ڈاکٹر یوسف حامد العالم لکھتے ہیں:

”**فأعلاها مایقع فی مراتب الضرورات كحفظ النفس، فإنه مقصود الشارع**“ (المقاصد العامۃ للشریعۃ الإسلامیۃ، ص: ۱۵۷، ط: المعہد العالمی للفکر الإسلامی ۱۹۹۴ء) (ضرورت کے مراتب میں اعلی درجہ نفس کی حفاظت ہے کہ یہ شارع کا مقصود ہے)۔

علامہ عزالدین بن عبدالسلامؒ لکھتے ہیں: ”**لأن حفظ الحیاة أعظم فی نظر الشارع من رعایة المحرمات**“ (قواعد الأحکام: ۱/ ۱۳۱) (شارع کی نظر میں حرام چیزوں کی رعایت سے زیادہ زندگی کی حفاظت بڑھی ہوئی ہے)۔

لہٰذا شریعت کے اِس مقصد کی رعایت کرتے ہوئے نجس چیزوں سے علاج کی گنجائش ہونی چاہئے۔

۳-عدمِ علاج ہلاکت کا باعث ہوسکتا ہے اور قرآن اِس سے روکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**ولاتلقوا بأيديكم إلى التهلكة**''(البقرة:۱۹۵)۔

۲-جزء انسانی ہونے کے اعتبار سے:

خون انسانی جزء ہے اور انسانی جزء سے استفادہ کے سلسلہ میں فقہاء کی رائے ''عدمِ جواز'' کی ہے؛ چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

''**إجماع المسلمين على تحريم سلخ جلد الآدمي و استعماله**''(المجموع:۱/۲۷۰، نیز دیکھئے: الفتاوی الہندیۃ: ۴/۳۵۵)(آدمی کی جلد کشی اور اُس کے استعمال پر مسلمانوں کا اجماع ہے)۔

اِسی طرح اِس بات پر بھی اتفاق ہے کہ یہ ممانعت انسان کی اُس شرافت کی وجہ سے ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''**ولقد كرمنا بني آدم**'' (الإسراء:۷۰) کے ذریعہ سے عطا کر رکھی ہے، چنانچہ علامہ خطیب شربینیؒ لکھتے ہیں:

''**والآدمي يحرم الانتفاع به وبأجزائه لكرامته**''(مغنی المحتاج:۱/۱۹۱)(آدمی اور اُس کے اجزاء سے استفادہ اُس کی شرافت کی وجہ سے حرام ہے)۔

پھر اِس حرمت میں بعض فقہاء کے نزدیک اِس قدر شدت ہے کہ سخت بھوک کی حالت میں، جب کہ مردار بھی کھانے کو نہ مل رہا ہو اور ہلاکت کا اندیشہ بھی ہو، اپنا یا اجازت کے ساتھ کسی اور کا عضو کاٹ کر کھانا چاہے تو گنجائش نہیں، علامہ اوزجندیؒ لکھتے ہیں:

''**مضطر لم يجد ميتة، وخاف الهلاك ، فقال له رجل: اقطع يدي وكلها، أو قال: اقطع قطعة مني وكلها لايسعه، أن يفعل ذلك، ولايصح أمره به، كما لايسعه للمضطر أن يقطع قطعة من لحم نفسه فيأكل**''(الفتاوی الخانیۃ علی ہامش الہندیۃ:۳/۴۰۴)(مضطر مردار نہ پائے اور اس کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، (اُس وقت) کوئی اُس سے کہے: میرا ہاتھ کاٹ کر کھالو، یا کہے: میرے (جسم) کا کوئی حصہ کاٹ کر کھالو تو اُس کے لئے ایسا کرنے کی گنجائش نہیں اور نہ ایسا حکم دینا درست ہے، جیسا کہ خود مضطر کے لئے اِس بات کی گنجائش نہیں کہ وہ اپنے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر کھائے)۔

جزء انسانی سے استفادہ کے سلسلہ میں اِس قدر شدت کے باوجود اگر غور کیا جائے تو تمام مکاتبِ فکر کی کتابوں میں ایسی جزئیات مل جاتی ہیں، جن سے اجزائے انسانی سے استفادہ کی گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ البتہ اِس گنجائش کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) عمومی گنجائش: یہ شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کا مسلک ہے؛ چنانچہ اِن حضرات کے یہاں انسانی دودھ، جو انسانی اجزاء میں سے ہے، کی خرید وفروخت کی عام اجازت دی گئی ہے اور بیع بھی استفادہ کا ہی نام ہے، علامہ خطیب شربینیؒ لکھتے ہیں:

"**ویصح بیع لبن الآدمیات؛ لأنه طاهر منتفع به**" (مغنی المحتاج، کتاب البیوع: ۲/ ۱۸، ط: دارالمعرفہ، بیروت، لبنان ۱۹۹۷ء، نیز دیکھئے: کشاف القناع، کتاب البیوع: ۲/ ۴۶۵، ط: عالم الکتب، لبنان ۱۹۹۷ء، بدایۃ المجتہد، کتاب البیوع: ۲/ ۱۲۸، ط: دارالمعرفۃ، لبنان ۱۹۸۲ء) (عورتوں کے دودھ کی خرید وفروخت درست ہے؛ کیوں کہ وہ طاہر اور قابلِ انتفاع ہے)۔

علامہ ابن قدامہؒ نے تو تمام اجزائے انسانی کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"**وسائر أجزاء الآدمی یجوز بیعها**" (المغنی، کتاب البیوع، فصل: حکم بیع لبن الآدمیات: ۲/ ۹۲۴، ط: بیت الأفکار الدولیۃ، لبنان ۲۰۰۴ء) (آدمی کے تمام اجزاء کی خرید وفروخت جائز ہے)۔

(ب) خصوصی گنجائش: یہ احناف کا مسلک ہے؛ چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**لابأس بأن یستعط الرجل بلبن المرأة ویشربه للدواء**" (الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۳۵۵) (دوا کے طور پر عورت کے دودھ کو ناک میں ڈالنے اور پینے میں کوئی حرج نہیں)۔

دراصل فقہاء کے یہاں جزء انسانی سے استفادہ کی ممانعت کی دو بنیادی اسباب ہیں:

۱- انسانی تکریم۔

۲- مشروع طریقہ پر انتفاع کا عدمِ امکان، اِس کی وضاحت موفق ابن قدامہؒ اِس طرح کرتے ہیں:

"**وحرم بیع العضو المقطوع؛ لأنه لانفع فیه**" (المغنی، کتاب البیوع، فصل: حکم لبن الآدمیات: ۲/ ۹۲۴) ("انسان" کے کٹے ہوئے عضو کی خرید وفروخت اِس لئے حرام ہے کہ اُس میں نفع نہیں ہے)۔

اور نفع کی وضاحت کرتے ہوئے "مبیع کی شرائط" کے ضمن میں علامہ خطیب شربینیؒ لکھتے ہیں:

"**(النفع) أی: الإنتفاع به مشروعاً، ولو فی المآل**" (مغنی المحتاج، کتاب البیوع: ۲/ ۱۷)۔

(مبیع کی شرط میں سے یہ ہے کہ) وہ مشروع طریقہ پر قابل انتفاع ہو، گرچہ یہ انتفاع مستقبل میں ہو۔

اب غور کیا جائے کہ آج کل جزء انسانی سے استفادہ میں اِن دونوں اسباب کی رعایت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ طبی طور پر استفادہ میں انسانی تکریم کے ساتھ ساتھ مشروع طریقہ پر انتفاع بھی ہوتا ہے؛ کیوں کہ اِس طریقہ پر استفادہ اِس زمانہ کے عرف میں سے ہے اور عرف شریعت کے مخالف نہ ہو تو اُس کی رعایت ضروری ہوتی ہے، عبدالوہاب خلافؒ لکھتے ہیں:

”فمادام لایخالف الشرع، وجبت مراعاته، والشارع راعی الصحیح من عرف العرب فی التشریع“ (علم اصول الفقہ: ص:۱۰۰، ط: قاہرہ) (جب تک شریعت کے خلاف نہ ہو، عرف کی رعایت ضروری ہے، شارع نے عرب کے صحیح عرف کی رعایت کی ہے)۔

بہر حال! مذکورہ وضاحت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اجزائے انسانی سے استفادہ کلیۃً ممنوع نہیں۔

۳- ملکیت اور عدمِ ملکیت کے اعتبار سے:

کسی بھی چیز کے عطیہ دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عطیہ دینے والا اُس چیز کا مالک ہو، اِس لحاظ سے خون کی ملکیت اور عدمِ ملکیت کی وضاحت بھی ضروری ہے، اِس سلسلہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان من وجہٍ اپنے جسم اور اجزائے جسم کا مالک ہے اور من وجہٍ مالک نہیں ہے، گویا انسانی جسم کے ساتھ دو طرح کے حقوق متعلق ہوتے ہیں:

۱- اللہ کا حق: جسمِ انسانی سے اللہ کا حق متعلق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے اوامر کو بجالائے اور نواہی سے اجتناب کرے، اِس کا نفع عام ہوتا ہے اور کسی کو اِس کے ساقط کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، اِس حق کے بارے میں وضاحت قرآن وحدیث اور فقہی جزئیات میں موجود ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لاتقتلوا أنفسکم، إن الله کان بکم رحیماً“ (النساء:۲۹) (اپنے آپ کو قتل مت کرو، بلاشبہ اللہ تم پر مہربان ہے)۔

اِسی طرح حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”من قتل نفسه بحدیدة، فحدیدته فی یده یتوجأ بها فی بطنه فی نارجهنم خالداً مخلداً فیهاأبداً، ومن شرب سما، فقتل نفسه، فهویتحساه فی نارجهنم خالداً مخلداً فیهاأبداً، ومن تردی من جبل، فقتل نفسه، فهویتردی فی نارجهنم خالداً مخلداً فیهاأبداً“ (بخاری، باب شرب السم والدواء بہ......، حدیث نمبر: ۵۷۷۸، مسلم، باب غلظ تحریم قتل الإنسان نفسہ، حدیث نمبر:۱۰۹)۔

مذکورہ آیت وحدیث سے قتل کی حرمت معلوم ہوتی ہے، جس میں لوگوں کی جانوں کی حفاظت کا عمومی نفع ہے۔

۲- بندہ کا حق: اِس سے مراد وہ مفادات اور منافع ہیں، جن میں شریعت نے بندے کی رعایت کی ہے اور اِس کے ساقط کرنے اور عوض لینے کا اختیار بھی بندے کو دیا ہے، قرآن مجید نے بندے کے اِس حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”ولکم فی القصاص حیاة یااولی الألباب“ (البقرۃ:۱۷۹) (قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اے عقل مندو)۔

لیکن اِس بات کی بھی گنجائش دی ہے کہ اگر عفو ودرگزر اختیار کیا جائے تو بہتر ہے، ارشادِ باری ہے:

''**فمن عفی له' من أخیه شئ فاتباع بالمعروف**'' (البقرۃ:۱۷۸)(پھر جس کو اس کے بھائی کی طرف سے معاف کیا جائے تو اسے معروف کی اتباع کرنی چاہئے)۔

بندے کے اِس حق کی وضاحت ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**إن الله اشتری من المؤمنین أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة**'' (التوبۃ:۱۱۱)(بے شک اللہ نے مؤمنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے)۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خریدنے کی بات کی ہے اور کسی چیز کی خریداری اُس وقت ہوتی ہے، جب وہ کسی کی ملکیت میں ہو، لہٰذا اِس آیت سے انسان کی اپنے نفس پر من وجہٍ ملکیت ثابت ہوئی۔

فقہ کا یہ جزئیہ بھی اِس ضمن میں ہے: ''**لو قال لشخص آخر: اقطع یدی، فقطعها، لم یجب علی القاطع شئ**'' (بدائع الصنائع: ۷/۲۳۶، نیز دیکھئے: نھایۃ المحتاج: ۷/۴۹، منح الجلیل: ۴/۳۴۶، شرح المحلی علی المنھاج: ۴/۱۲۷، کشاف القناع: ۳/۳۴۳) (اگر کوئی شخص کسی کہے: میرا ہاتھ کاٹ لو، پھر وہ (اُس کا ہاتھ) کاٹ لے، تو کاٹنے والے پر کچھ (جرمانہ) لازم نہ ہوگا)۔

کاٹنے والے پر کچھ لازم کیوں نہیں؟ اِس کی وضاحت کرتے ہوئے ملک العلماء علامہ کاسانیؒ رقم طراز ہیں:

''**لأن الأطراف یسلک بها مسلک الأموال، وعصمة الأموال تثبت حقاً له'، فکانت محتملة للسقوط بالإباحة والإذن، کمالو قال: اتلف مالی، فأتلفه**'' (بدائع الصنائع: ۷/۲۳۶، نیز دیکھئے: رد المحتار: ۶/۵۹۱) (کیوں کہ اعضائے جسم کے ساتھ اموال کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور اموال کی حفاظت اُس کا حق ہے، لہٰذا اجازت کے ساتھ سقوط کا احتمال رکھتا ہے، جیسے کہ کوئی کسی سے کہے: میرا مال ضائع کر دو اور وہ اُس کا مال ضائع کر دے تو اُس پر کچھ لازم نہیں ہوتا)۔

تینوں لحاظ سے خون کی شرعی حیثیت پر مذکورہ گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ:

۱-خون ناپاک ہے؛ لیکن علاجاً استعمال درست ہے۔

۲-خون انسانی جزء ہے؛ لیکن اُس سے استفادہ کی گنجائش ہے۔

۳-انسان من وجہٍ اپنے جسم کا مالک ہے۔

اب خون کے عطیہ کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ''ایک انسان اپنی ملکیت کی قابلِ انتفاع چیز کو بغیر کسی عوض کے دوسرے انسان کو اُس کے نفع کے لئے دے رہا ہے''، اور ظاہر ہے کہ اِس میں کسی طرح کی کوئی قباحت نہیں؛ کیوں کہ عطیہ کو عربی میں ''تبرع'' کہا جاتا ہے اور تبرع نام ہے ''بغیر عوض کے نیکی کے ارادے سے مکلّف کا فی الحال یا مستقبل میں مال یا منفعت دوسرے کو دینے کا''، موسوعہ فقہیہ میں ہے:

”بذل المكلف مالاً أومنفعة لغيره في الحال، أوالمآل بلاعوض بقصد البروالمعروف غالباً“ (الموسوعۃ الفقھیۃ:۶۵۱۰/۱)۔

جب کہ اُس کے لئے درکار شرطیں (عطیہ کی جانے والی چیز کا قبضہ میں ہونا، مشترک نہ ہونا اور دوسرے کی ملکیت نہ ہونا) بھی پائی جارہی ہیں (البحرالرائق:۴۸۳/۷، مجمع الأنہر:۴۹۰/۳)۔

اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جسمِ انسانی کے کن اجزاء کا عطیہ دیا جاسکتا ہے اور کن اجزاء کا نہیں؟ اِس سلسلہ میں اعضائے انسانی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) وہ اعضاء، جن پر انسان کی موت وحیات کا مدار ہے، جیسے: دل، پھیپھڑا، جگر، گردہ وغیرہ اِن اعضاء کا عطیہ درست نہیں؛ کیوں کہ اِس سے انسان کی موت یقینی ہے اور یہ خودکشی کے مترادف ہے، جس سے اسلام نے سختی کے ساتھ روکا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”لاتلقوا بأيديكم إلى التهلكة“ (البقرۃ:۱۹۵) (اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو)۔

اِسی طرح اصول فقہ کا ایک اصول ہے کہ: ”الضرر لايزال بمثله“ (الاشباہ والنظائر:۹۶/۲، ط: دارالفکر، دمشق) (کسی کو نقصان پہنچا کر نقصان کو دور نہیں کیا جائے گا)۔

نیز علامہ ابن نجیم مصریؒ ”الضرر لايزال بالضرر“ کے تحت ایک مسئلہ یہ لکھا ہے:

”لايأكل المضطرطعام مضطرآخر، ولا شيئا من بدنه“ (حوالۂ سابق) (مضطر دوسرے مضطر کا نہ تو کھانا کھائے گا اور نا ہی اُس کے بدن کا کوئی حصہ)۔

اِس سے معلوم ہوا کہ جن اعضاء کی خود اُس کو ضرورت ہو اور ضرورت بھی ایسی کہ اُس کے بغیر اُس کی موت یقینی ہے، ایسے اعضاء کا عطیہ ہرگز درست نہ ہوگا۔

(ب) وہ اعضاء، جو ایک سے زیادہ ہیں اور ایک کے دینے سے انسان کی کلی منفعت ختم نہیں ہوتی، جیسے: آنکھ، قرنیہ، گردہ وغیرہ، اِن اعضاء کا عطیہ اُس وقت درست ہے، جب کہ ماہر ڈاکٹر یہ واضح کردے کہ ایک عضو سے عطیہ دینے والے کا کام چل سکتا ہے اور مریض کو بھی فائدہ ہونے کا غالب گمان ہے؛ کیوں کہ اصول ہے کہ جب دو مفسدے جمع ہوجائیں تو ضرر میں بڑھے ہوئے مفسدے کی رعایت کرتے ہوئے ہلکے مفسدے کا ارتکاب کرلیا جائے گا:

”إذاتعارض مفسدتان، روعي أعظمهماضرراً بارتكاب أخفهما“ (الاشباہ والنظائر،ص:۹۸)۔

یہاں بھی دو مفسدے جمع ہورہے ہیں، ایک اُس مریض کی جان جانے کا مفسدہ، جس کی دونوں آنکھیں، یا

دونوں قرنیئے، یا پھر دونوں گردے ختم ہیں، دوسرا اُس مریض کا مفسدہ، جس کی یہ چیزیں ایک ایک لی جائیں؛ لیکن یہ بات واضح ہے کہ پہلے مریض کا مفسدہ دوسرے کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے؛ اِس لئے دوسرے مفسدے کو گوارا کرتے ہوئے ماہر ڈاکٹر کی بات مانی جاسکتی ہے۔

(ج) وہ اعضاء، جن میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے، جیسے: خون، کھال اور دودھ وغیرہ------- اِن اعضاء کا عطیہ دینا بھی درست ہے؛ کیوں کہ اِن چیزوں کے عطیہ دینے سے (اگر دینے والا تندرست ہے تو) کوئی نقصان نہیں ہوتا، جب کہ دوسرے انسان (مریض) کا ضرر دور ہو جاتا ہے اور اصول ہے: "الضرر یزال" (الاشباہ والنظائر، ص: ۹۴)۔

اِس سلسلہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کی تجویز حسبِ ذیل ہے:

۱-"یجوز نقل العضو من جسم إلی جسم إنسان آخر، إن کان هذاالعضو یتجددتلقائیا کالدم والجلد".

۲-" تجوز الاستفادة من جزء من العضو الذی استؤصل من الجسم لعلة مرضیةلشخص آخر، کأخذقرنیة العین لإنسان ما عند استئصال العین لعلة مرضیة".

۳-" یحرم نقل عضو تتوقف علیه الحیاة، کالقلب من إنسان إلی إنسان آخر" (بحوالہ: الإسلام الیوم- http://islamtoday.net/bohooth/services/printart-32-5721.htm)۔

رہا مسئلہ مسلم اور غیر مسلم کا، تو ظاہر ہے کہ خون کا عطیہ دینے میں مسلم اور غیر مسلم سے بڑھ کر 'انسانیت' کو دیکھا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اِسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"**من أحیاها، فکأنماأحیاالناس جمیعاً**" (المائدۃ: ۳۲) (جس نے ایک جان کو زندہ کیا تو گویا اُس نے تمام لوگوں کو زندہ کیا)۔

اِس آیت میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں کی گئی ہے؛ بل کہ مطلق لوگوں کی جان بچانے کی بات کی گئی ہے، نیز خون کے اپنے اثرات ہوتے ہیں، جو خون کے ساتھ منتقل ہوتے ہیں، کیا بعید کہ مسلمان کے اِسی خون کی بدولت ایک غیر مسلم کو راہِ راست کی بھی توفیق مل جائے؛ البتہ خون کے عطیہ میں درج ذیل امور کا بھی خیال رکھا جانا چاہئے:

۱-معطی تندرست اور صحت مند ہو، ۲- عاقل وبالغ اور سمجھدار ہو، ۳-عطیہ بخوشی کر رہا ہو، مجبور نہ ہو، ۴-موروثی اور جدید امراض (ایڈز وغیرہ) سے پاک ہو، ۵-معطی کے جسم میں ہیموگلوبین کی صحیح مقدار موجود ہو۔

۲- کیا بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کرسکتے ہیں؟

خون انسان کے اُن اجزاء میں سے ہے، جن کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں؛ تاہم اِس کے اندر نشوونما اور بڑھوتری کی صفت پائی جاتی ہے، اِس کی اِسی صفت کی وجہ سے ضرورتاً ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں داخل کرنے کی اجازت دی گئی ہے کہ خون دینے والے پر (جب کہ وہ تندرست ہو) کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔

جس ضرورت کی بنا پر ایک انسان کے خون کو دوسرے انسان کے جسم میں داخل کرنے کی اجازت دے گئی ہے، بسا اوقات وہ ضرورت اِس طرح اچانک آتی ہے کہ اُس کی تلاش کو کئی سے کم معلوم نہیں ہوتی، پھر بعض دفعہ حادثات کی وجہ سے خون کے ضرورت مندوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے، جب کہ خون اُس مقدار میں میسر نہیں ہو پاتا اور نتیجۃً مریض کی جان بچانا دشوار ترین امر بن جاتا ہے۔

اِس دشوار ترین مرحلہ سے چھٹکارے کے لئے ایک شکل یہ اختیار کی گئی ہے کہ مختلف لوگوں سے خون لے کر ایک جگہ جمع کرلیا جاتا ہے، جسے عرفِ عام میں ''بلڈ بینک'' (Blood Bank) کہا جاتا ہے، جہاں پہلے ہی سے ہر گروپ کا خون مہیا رہتا ہے، پھر اس طرح کے وقت آنے پر مریض کے لئے فی الفور خون مہیا کیا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک جاں بہ لب مریض کی طبیعت بحال ہوجاتی ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوشش انسانیت نوازی کی دلیل اور آج کل کے حالات کے لحاظ سے ایک ضرورت کا درجہ اختیار کرچکی ہے اور فقہ کا ایک اصول ہے: ''الحاجة تنزل بمنزلة الضرورة'' (الأشباہ والنظائر، ص: ۱۰۰) (حاجت کو ضرورت کے درجہ میں اتارد یا جاتا ہے)، یہاں بھی ضرورت اِس بات کی متقاضی ہے کہ اِس طرح کے بلڈ بینکوں میں خون جمع کرکے رکھا جائے؛ تاکہ بروقت مریضوں کی جان بچائی جاسکے۔

رہا اُن بینکوں کو خون عطیہ کرنے کا مسئلہ! تو اِس سلسلہ میں سوال نمبر (۱) کے جواب میں خون کی شرعی حیثیت اور اُس کے عطیہ کے سلسلہ میں تفصیل گزرچکی ہے کہ اِس میں کوئی قباحت نہیں؛ اِس لئے بلڈ بینکوں کو بھی خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے، واللہ اعلم!

۳- کیا مسلمانوں کے لئے بلڈ بینکوں کا قیام جائز ہوگا؟

بلڈ بینک کا قیام وقت کی ایک ضرورت ہے اور ضرورت انسان پر طاری ہونے والی اُس حالت کا نام ہے، جس میں وہ جسمانی، مالی، یا پھر عقلی اعتبار سے تکلیف سے دوچار ہو، ایسے وقت میں بہت سارے حرام امور کے ارتکاب کی بھی گنجائش نکل آتی ہے، ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ اِس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الضرورة:هى أن تطرأ على الإنسان حالة من الخطر،أوالمشقة الشديدة،بحيث يخاف

حدوث ضرر،أو أذى بالنفس،أوبالعضو،أو بالعرض،أوبالعقل،أوبالمال وتوابعها،ويتعين أويباح عندئذارتكاب الحرام،أوترك الواجب ،أوتاخيره عن وقته دفعاً للضررعنه في غالب ظنه ضمن قيود الشرع"(نظریۃ الضرورۃ الشرعیۃ،ص:۶۷-۶۸)۔

(ضرورت انسان پر طاری ہونے والی اُس نازک حالت یا شدید مشقت کو کہتے ہیں،جس میں وہ کسی نقصان،جانی یا کسی عضوی تکلیف، یا عقلی، مالی، یا عزت وناموس کے لحاظ سے دُکھ و پریشانی کا اندیشہ کرے،ایسے وقت میں شرعی قیود کے دائرہ میں رہتے ہوئے نقصان سے بچاؤ کے غلبۂ ظن کی بنیاد پر حرام چیز کا اختیار کرنا اور واجب کو ترک کرنا یا وقت سے مؤخر کرنا یا تو اُس متعین ہوجاتا ہے، یا پھر مباح)۔

اِسی ضرورت کے لئے یہ قاعدہ وجود میں آیا:"**الضرورات تبيح المحظورات**"(الأشباہ والنظائر:۴۹)۔

بلڈ بینکوں کا وجود اِسی ضرورت کی وجہ سے وجود میں آیا،لہٰذا اِس ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے نیز اِس لئے بھی کہ ہر انسان کے خون کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے، جو خون کے ساتھ ہی منتقل بھی ہوتا ہے، اب اگر مسلمانوں کا خون مسلمان کے جسم میں داخل کیا جائے گا تو اسلامی اثرات مرتب ہوں گے اور اگر غیر مسلم کا خون داخل کیا جائے گا تو اسلامی اثرات مرتب نہیں ہوں گے؛اِس لئے مسلمانوں کے لئے بلڈ بینکوں کے قیام کی گنجائش ہونی چاہئے۔

۴- مختلف لوگوں کے خون کا گروپ بھی مختلف ہوتا ہے اور کسی مریض کو خون چڑھانے میں اُس کے گروپ کا خون چڑھانا ضروری ہوتا ہے، تبھی جسم کے اندر موجود خون اور باہر سے پہنچائے جانے والے خون کے درمیان اتصال قائم ہو پاتا ہے اور مریض کی خونی ضرورت کی تکمیل ہو پاتی ہے۔

عمومی طور پر ہر پانچ سے سات انسانوں کا بلڈ گروپ ایک ہی ہوتا ہے؛ لیکن بسا اوقات خون کا ایسا گروپ بھی نکل آتا ہے، جو بہ مشکل دستیاب ہو پاتا ہے، جیسے: او-نگیٹیو(O. N)،اب اگر کسی مریض کا یہ گروپ ہو اور اُسے خون کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں خون دینے والوں کی دو حالتیں ہوسکتی ہیں:

۱-اِس گروپ کا حامل صرف ایک ہی شخص ہو۔

۲-اِس گروپ کے حامل کئی اشخاص ہوں۔

پہلی صورت میں خون کا دینا واجب ہوگا؛ کیوں کہ اِسی پر ایک انسانی زندگی کا مدار ہے، جب کہ اللہ تبارک وتعالی نے ایک جان کے بچانے کو تمام انسانیت کے بچانے سے تعبیر کیا ہے،ارشاد باری ہے:"**ومن أحياها، فكأنما أحيا الناس جميعاً**"(المائدۃ:۳۲)۔

یہ بات اِس پس منظر میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک جان کی حفاظت دوسری چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے، علامہ عزبن عبدالسلامؒ لکھتے ہیں:

"لأن حفظ الحياة أعظم فی نظر الشارع من رعاية الحرمات"(قواعدالأحکام:۱/۱۳۱)۔

نیز اِس کی ایک نظیر قضاء کی بحث میں ملتی ہے کہ جب کسی شہر میں صرف ایک شخص قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہوتو اُس پر قضاء کی ذمہ داری قبول کرنا واجب ہوتا ہے، علامہ رویانیؒ رقم طراز ہیں:

"رجل يكون من أهل الفقه، والأمانة، ولا يوجد فی بلده من يصلح للقضاء غيره من أهله، فانه يتعين عليه فرضه، لأن الفرض على الكفاية إذالم يكن من يقوم به غيره أحد يتيعين عليه"(بحرالمذہب، کتاب القضاء:۱۲۰-۱۱/۱۱۷)۔

البتہ دوسری صورت میں مستحب ہوگا؛ کیوں کہ اِس صورت میں مریض کی جان بچانا اُن تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے، جن کا بلڈ گروپ مریض سے مطابقت رکھتا ہے، اِس کی نظیر بھی قضاء کے باب میں ملتی ہے کہ ایک علاقہ میں کئی ایسی صلاحیت کی حامل شخصیتیں ہوں، جنھیں قضاء کی ذمہ داری تفویض کی جاسکتی ہوتو ہرایک کے لئے اس ذمہ داری کاادا کرنا مستحب ہوگا، علامہ رویانیؒ لکھتے ہیں:

"رجل يكون من أهل الفقه، والأمانة،والاجتهاد، وفی البلد مثله جماعة،إلا أنه فقير لاكفاية له، فيتولى القضاء ليأخذ الرزق، وكذلك اذا كان له كفاية؛ ولكنه خامل الذكر لايعرف، فيريد القضاء، ليعرف فينفع بعلمه، فيستحب له طلبه والدخول فيه"(حوالۂ سابق)۔

۵- یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں حضرت انسان کوفضیلت وبرتری سے نوازا ہےاور اِس فضیلت میں زندہ اور مردہ دونوں طرح کے انسان داخل ہیں؛ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

"كسرعظم الميت ككسره حيا" (ابوداؤد، کتاب الجنائز، حدیث نمبر: ۳۲۰۷، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر: ۱۶۱۶)(مردہ کی ہڈی توڑنا زندہ شخص کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے)۔

یعنی حرمت میں دونوں برابر ہیں، علامہ عینیؒ اِس کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"والمعنىٰ: أن حرمة بنی آدم سواء فی الحالتين، فكمالايجوز كسرعظم الحی، فكذلك لايجوز كسرعظم الميت"(شرح سنن ابی داود:۶/۱۵۸، ط:مکتبۃ الرشید، ریاض ۱۹۹۹ء)(مطلب یہ کہ دونوں (مردہ اور زندہ) حالتوں میں بنوآدم کی حرمت برابر ہے؛ چنانچہ جس طرح زندہ شخص کی ہڈی توڑنا درست نہیں، اُسی طرح مردہ شخص کی ہڈی

توڑنا بھی جائز نہیں)۔

معلوم ہوا کہ جس طرح انسان اپنی حیات میں محترم اور قابل عزت ہوتا ہے، اُسی طرح موت کے بعد بھی لائقِ تکریم ہے؛ بل کہ موت کے بعد تو اِس حق میں اور زیادہ اضافہ ہی ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جنازہ لے جانے میں ایسی سرعت سے روکا گیا ہے، جو میت کے لئے عدم استقلال اور بے قراری کا سبب بنے، مشہور فقیہ ابراہیم حلبیؒ لکھتے ہیں:

"**ويسرعوابه بلاخبب**"(ملتقی الأبحر علی ہامش مجمع الأنہر، کتاب الجنائز: ١/ ٢٧٤، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان)(اور (جنازہ) کو بغیر ہلائے ڈلائے رفتار کے ساتھ لے کر جائیں)۔

انسان کو اپنے جسم پر جو ملکیت حاصل ہے، کیا وہ موت کے بعد بھی حاصل رہے گی؟

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے جاننا چاہئے کہ ملکیت کی دو قسمیں ہیں:

(الف) ایسی ملکیت، جس میں بذاتِ خود تو تصرف کرسکتا ہے؛ لیکن دوسرے کو تصرف کی اجازت نہیں دے سکتا۔

(ب) ایسی ملکیت، جس میں ذاتی تصرف کا اختیار رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے کو بھی تصرف کی اجازت دے سکتا ہے، علامہ قرافیؒ اِس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"**فتمليک الانتفاع نريدبه: أن يباشر هوبنفسه فقط، وتمليک المنفعة، هوأعم وأشمل، فيباشر بنفسه، ويمكن غيره من الانتفاع بعوض كالإجارة، وبغيرعوض كالعارية**"(الفروق، الفرق الثلاثون: ١/ ٣٩٩)۔

'تملیک انتفاع' سے ہماری مراد یہ ہے کہ (آدمی) صرف خود فائدہ اُٹھاسکتا ہے، جب کہ تملیک منفعت اِس سے زیادہ عام اور وسیع ہے؛ چنانچہ خود بھی فائدہ اُٹھاسکتا ہے اور دوسرے کو بھی عوض یا بغیر عوض کے (دونوں طرح سے) فائدہ اُٹھانے کی اجازت دے سکتا ہے، جیسے: اجارہ وعاریت۔

انسان کو اپنے جسم پر یہ دونوں ملکیتیں حاصل ہیں، جہاں تک ذاتی طور پر ملکیت کی بات ہے تو اِس کی وضاحت فقہ کے درج ذیل جزئیہ سے ہوتی ہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"**ولوأرادالمضطرأن يقطع قطعة من فخذه أوغيرها ليأكلها، فإن كان الخوف منه كالخوف في ترک الأكل أوأشد، حرم، وإلاجاز على الأصح**" (روضۃ الطالبین، کتاب الأطعمۃ: ٢/ ٥٥١)(اگر کوئی مضطر اپنی ران یا جسم کے کسی اور حصہ کو کاٹ کر کھانا چاہے تو ایسا کرنے کی گنجائش اُس وقت ہے، جب کہ کاٹنے سے اُس طرح کا (ہلاکت کا) خوف لاحق نہ ہو، جس طرح نہ کھانے کی صورت میں ہے، ورگرنہ حرام ہوگا)۔

مذکورہ جزئیہ میں اِس بات کی وضاحت ہے کہ ایک آدمی بذاتِ خود اپنے جسم سے فائدہ اُٹھاسکتاہے،اب رہی دوسری ملکیت کی بات، تواِس کی توضیح علامہ موفق ابن قدامہؒ کی بات سے ہوجاتی ہے، وہ فرماتے ہیں: "**وسائر أجزاء الآدمي يجوز بيعها**" (المغنی،ص:۹۲۴) (انسان کے تمام اجزاء کی بیع جائز ہے)۔

اور بیع نام ہے: '' دوسرے کواپنی ملکیت سے استفادہ کا حق دینے کا''، اور یہ اُسی وقت ہوتا ہے، جب کہ'' ملکیت ِ تامہ'' حاصل ہو، جس میں شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے آزادانہ تصرف کا اختیار ہوتا ہے، ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

"**ويمنح صاحبه(صاحب الملك التام)الصلاحيات التامة، وحرية الإستعمال، والاستثمار، والتصرف فيمايملك كمايشاء، فله البيع ، أوالهبة، أوالوقف، أوالوصية**" (الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۵۸/۴) (ملکِ تام حاصل ہونے والے شخص کومملوکہ چیز میں اپنی پسند کے مطابق تصرف، اُس سے استفادہ، اُس کے استعمال کی آزادی اور مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے؛ چنانچہ وہ بیع بھی کرسکتا ہے، ہبہ بھی، وصیت بھی اور وقف بھی)۔

مذکورہ باتوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان کواپنے جسم پرمن وجہ جوملکیت حاصل ہے، اُس میں اُسے ملکیت ِ کامل حاصل ہے اور جب ملکیتِ کامل حاصل ہے تووہ اُس کے کسی عضواور جزء کوعطیہ بھی دے سکتا ہے؛ البتہ چوں کہ حق اللہ کا بھی خیال رکھنا ہے؛ اِس لئے عطیہ وہیں دیں گے، جہاں شرعی ضرورت ہو، جیسے: کسی کی زندگی بچانا ہو؛ کیوں کہ زندہ شخص کی زندگی بچانازیادہ اہمیت کی حامل ہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"**وإن اضطر، ووجدآدميامیتا، جاز له أكله؛ لأن حرمة الحی آكدمن حرمة الميت**" (المجموع، کتاب الأطعمۃ: ۴۲/۹) (اگرکسی آدمی کومردہ آدمی مل جائے تواُس کے لئے کھانا جائز ہے؛ کیوں کہ زندہ کی حرمت، میت کی حرمت کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کی حامل ہے)۔

اِسی قبیل سے یہ جزئیہ بھی ہے کہ اگرکسی حاملہ کی موت واقع ہوجائے اور اُس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہوتو پیٹ چاک کرکے بچہ کوباہرنکالا جائے گا، علامہ سمرقندیؒ لکھتے ہیں:

"**ولوأن حاملا ماتت، وفی بطنها ولد يضطرب، فإن كان غالب الظن أنه ولدحی، وهوفی مدة يعيش غالباً، فإنه يشق بطنها؛ لأن فيه إحياء الآدمی بترك تعظيم الآدمی، وترك التعظيم أهون من مباشرة سبب الموت**" (تحفۃ الفقہاء، کتاب الحظر والاباحۃ: ۳۴۵/۳)

(اگرکسی حاملہ کی موت اِس حال میں ہوجائے کہ بچہ پیٹ میں حرکت کررہا ہو، تواگرغالب گمان یہ ہوکہ بچہ زندہ ہے اور ایسی مدت میں ہے، جس میں اکثر حیات پیدا ہوتی ہے، تواُس کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا؛ کیوں کہ ایسا کرنے میں آدمی

کی تعظیم کے ترک کے ذریعہ سے آدمی کو زندگی بخشنا ہے اور تعظیمِ آدمیت کو ترک کرنا (زندہ شخص کی) موت کا سبب بننے کے مقابلہ زیادہ آسان ہے)۔

اس لئے متعین مریض کی جان بچانے کے لئے اپنی موت کے بعد جگر کا عطیہ دے سکتا ہے، اب رہا یہ مسئلہ کہ ایسے ادارے کو عطیہ دے سکتا ہے یا نہیں، جو عضو کو کیمیکل کے ذریعہ زندہ رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت دوسرے کو مہیا کرتا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کسی متعین مریض کے لئے کررہا ہے، جس کے جگر کی خرابی کے سلسلہ میں غالب گمان ہے، تو اِس طرح کا عطیہ بھی اِس حقیر کے نزدیک جائز ہے؛ کیوں کہ غالب گمان یقین کے درجہ میں ہوتا ہے اور احکامِ شریعت میں اِسے معتبر مانا جاتا ہے، مشہور محقق محمد علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

"**وغالب الظن عندهم(أی: عندالفقهاء)ملحق باليقين، وهو الذی تبتنی عليه الأحكام**" (کشاف اصطلاحات الفنون، لفظ: ظن: ۱/ ۱۱۵۴۲)۔

(فقہاء کے نزدیک غلبۂ ظن کو یقین کے ساتھ ملحق کیا جاتا ہے، اور یہ وہ ہے، جس پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے)۔

لیکن اگر مریض متعین نہ ہو یا متعین تو ہو؛ لیکن اُس کے جگر کی خرابی کا گمان غالب نہ ہو تو ایسی صورت میں کسی ادارہ کو محض محفوظ رکھنے کے لئے عطیہ دینے کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے؛ کیوں کہ موت کے بعد اعضاء کے عطیہ کی گنجائش ایک ضرورت کی بنیاد پر ہے، اور ضرورت نام ہے "انسان پر طاری ہونے والی اُس نازک حالت یا مشقتِ شدیدہ کا، جس میں اُسے کسی طرح کا ضرر لاحق ہونے، یا جسمانی وعضوی تکلیف پہنچنے، یا عزت وآبرو پر آنچ آنے، یا عقلی ومالی لحاظ سے نقصان ہونے کا اندیشہ ہو، اِس صورت میں شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے غلبۂ ظن کے موافق (تمام طرح کے) ضرر کو دور کرنے کی غرض سے کسی واجب کو ترک یا مؤخر کرنا، یا حرام کا ارتکاب کرنا مباح، یا متعین ہوجاتا ہے" (نظریۃ الضرورۃ الشرعیۃ مقارنۃ مع القانون الوضعی للزحیلی، ص: ۶۷ - ۶۸) اور ظاہر ہے کہ یہ ضرورت مریض کے عدمِ تعیین یا متعین مریض کے جگر کی خرابی کے عدمِ غالب گمان کی صورت میں نہیں پائی جاتی؛ اِس لئے ایسی صورت میں عطیہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

۶ - پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ "وہ اعضاء، جو ایک سے زیادہ ہیں اور ایک کے دینے سے انسان کی کلی منفعت ختم نہیں ہوتی، جیسے: آنکھ، قرنیہ، گردہ وغیرہ، اِن اعضاء کا عطیہ اُس وقت درست ہے، جب کہ ماہر ڈاکٹر یہ واضح کردے کہ ایک عضو سے عطیہ دینے والے کا کام چل سکتا ہے اور مریض کو بھی فائدہ ہونے کا غالب گمان ہے؛ کیوں کہ اصول ہے کہ جب دو مفسدے جمع ہوجائیں تو ضرر میں بڑھے ہوئے مفسدے کی رعایت کرتے ہوئے ہلکے مفسدے کا ارتکاب کرلیا جائے گا:

"**إذاتعارض مفسدتان، روعی أعظمهماضرراً بارتكاب أخفهما**" (الأشباہ والنظائر، ص: ۹۸)۔

یہاں بھی دومفسدے جمع ہورہے ہیں، ایک اُس مریض کی جان جانے کا مفسدہ، جس کی دونوں آنکھیں، یا دونوں قرنیئے، یا پھر دونوں گردے ختم ہیں، دوسرا اُس مریض کا مفسدہ، جس یہ چیزیں ایک ایک لی جائیں؛ لیکن یہ بات واضح ہے کہ پہلے مریض کا مفسدہ دوسرے کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے؛ اِس لئے دوسرے مفسدے کو گوارا کرتے ہوئے ماہر ڈاکٹر کی بات مانی جاسکتی ہے؛ البتہ یہ عطیہ مکمل طور پر بینائی سے محروم شخص کے لئے ہی ہوسکتا ہے، یک چشم کے لئے نہیں۔

ب- اِس سوال کا جواب تفصیلی طور پر سوال نمبر (۵) کے جواب میں گزرچکا ہے کہ متعین مریض کی جان بچانے کے لئے اپنی موت کے بعد قرنیہ کا عطیہ دے سکتا ہے۔

ج- اِس سوال کے اندر دوشقیں ہیں:

۱- زندہ شخص کی طرف سے محض محفوظ رکھنے کے لئے آئی بینکوں کو آنکھ کا قرنیہ بطورِ عطیہ دینا: یہ درست نہیں؛ کیوں کہ اعضائے انسانی سے استفادہ کی گنجائش ضرورۃً ہوا کرتی ہے (جس کی تفصیل سوال نمبر (۱) میں گزرچکی ہے) اور آئی بینکوں میں محفوظ رکھنا ضرورت میں شامل نہیں؛ اِس لئے محض محفوظ رکھنے کے لئے آئی بینکوں کو قرنیہ عطیہ کرنا درست نہیں۔

۲- مردہ شخص کی طرف سے آئی بینکوں کو قرنیہ محفوظ رکھنے کے لئے عطیہ دینا: یہ بھی درست نہیں؛ کیوں کہ قرنیہ اُن اعضاء میں سے نہیں ہے، جن کے فی الفور عدم استعمال سے مریض کی جان کو کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں؛ اِس لئے "**الأصل بقاء ماکان علی ماکان**" (الأشباہ والنظائر: ۱/۶۲، ط: دارالفکر دمشق ۱۹۸۳ء) پر عمل کرتے ہوئے اعضائے انسانی کی حرمت کو ترجیح دیں گے اور آئی بینکوں میں محفوظ رکھنے کے لئے عطیہ کو نادرست قرار دیں گے۔

۷- جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان کو اپنے جسم پر ملکیت حاصل ہے اور یہ ملکیت ناقص نہیں؛ بل کہ کامل ہے اور اِسی ملکیت کاملہ کی وجہ سے اپنے جسم پر اُس کی ملکیت موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے، جس طرح دیگر ضروری اشیاء پر موت کے بعد بھی ملکیت باقی رہتی ہے؛ چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"**وبہ تبین أن ملک الإنسان لایزول بموتہ فیمایحتاج إلیہ**" (بدائع الصنائع: ۱۰/۴۷۷-۴۷۱) (وصیت کی تعریف سے) یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ضرورت کی اشیاء میں انسان کی موت کے بعد بھی ملکیت باقی رہتی ہے)۔

لہٰذا جس طرح دیگر اشیاء میں وصیت کے لئے اُس کی اجازت کو معتبر مانا جاتا ہے، اُسی طرح اعضاء کی وصیت میں بھی اُسی کی اجازت معتبر سمجھی جائے گی؛ کیوں کہ وصیت موصی ہی کی جانب سے ہوا کرتی ہے اور موصی کی موت کے بعد یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے، علامہ داماد آفندیؒ لکھتے ہیں:

"**ان الوصیۃ من جانب الموصی، وقد تمت بموتہ تماماً لایلحقہ الفسخ من جہتہ**" (مجمع الأنہر،

کتاب الوصایا: ۴۲۱/۴) (وصیت موصی کی جانب سے ہوتی ہے، جو اُس کی موت سے ایسی تکمیل کو پہنچ جاتی ہے، جس میں اُس کی طرف سے فسخ کی گنجائش باقی نہیں رہتی)۔

البتہ اخلاقی طور پر اُن کے وارثین سے بھی اجازت لینی مناسب ہے، واللہ اعلم بالصواب!

۸- اِس سوال کے جواب کے لئے خواتین کے دودھ کے استعمال کے دو طریقوں پر گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے:

۱- عمومی استعمال، جیسے: خواتین کے دودھ کی خرید وفروخت کی عام اجازت، اِس سلسلہ میں فقہائے کرام کی رائیں درج ذیل ہیں:

حنفیہ کی رائے:

خواتین کے دودھ کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں احناف کے یہاں آزاد اور باندی ہونے کے اعتبار سے دو رائیں پائی جاتی ہیں:

۱- خواتین کے دودھ کی خرید وفروخت مطلقاً جائز نہیں، خواہ آزاد خاتون کا دودھ ہو یا باندی کا ----- یہ فقہائے احناف کی عمومی رائے ہے، ابوبکر بن علی الحداد الیمنیؒ لکھتے ہیں:

"**لایجوز بیع لبن بنات آدم**" (الجوہرۃ النیرۃ، باب السلم: ۲۶۸/۱، ط: مکتبہ حقانیہ، ملتان) (بناتِ آدم کے دودھ کی بیع جائز نہیں)۔

۲- آزاد عورت کے دودھ کی بیع جائز نہیں، باندی کے دودھ کی بیع جائز ہے ------ یہ حضرت امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

"**وعن أبی یوسف: یجوز بیع لبن الأمة لجواز ایراد البیع علی نفسها، فکذا علی جزئها**" (البحر الرائق، باب البیع الفاسد: ۱۳۲/۶، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۷ء) (امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ باندی کے دودھ کی بیع جائز ہے؛ کیوں کہ اُس کے پورے جسم کی بیع جائز ہے تو جسم کے جزء کی بیع تو بہ درجۂ اولیٰ جائز ہوگی)۔

دلیل:

۱- عورت کا دودھ مال متقوم نہیں ہے؛ اِس لئے اُس کی بیع جائز نہیں: "**أن لبن الآدمیة لیس بمال متقوم، فلایجوز بیعه**" (المبسوط للسرخسی، باب اجارۃ الظئر: ۱۲۵/۱۵، ط: دار المعرفۃ، بیروت)۔

۲- عورت کا دودھ انسانی اجزاء میں سے ہے اور انسان اپنے تمام اجزاء کے ساتھ مکرم ومحترم ہے، لہٰذا بیع کے ذریعہ سے اُس کی تذلیل نہیں کی جائے گی: "**لأنه جزء الآدمی، وهو بجمیع أجزائه مکرم مصون عن الابتذال**

بالبیع" (البحر الرائق، باب البیع الفاسد:۱۳۲/۶، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۷ء)۔

شوافع کی رائے:

عورت کے دودھ کی بیع کے سلسلہ میں حضراتِ شوافع کے یہاں دو رائیں ملتی ہیں:

۱- جائز ہے؛ کیوں کہ یہ پاک اور قابل انتفاع شیٔ ہے، اسی رائے کو "معتمد" بھی قرار دیا گیا ہے، علامہ خطیب شربینیؒ لکھتے ہیں:

"**ویصح بیع لبن الآدمیات؛ لأنه طاهر منتفع به**"(مغنی المحتاج، کتاب البیوع:۱۸/۲، ط: دارالمعرفہ، بیروت، لبنان۱۹۹۷ء)(عورتوں کے دودھ کی بیع درست ہے؛ کیوں کہ یہ پاک اور قابل انتفاع ہے)۔

۲- جائز نہیں ہے، اِس کے قائلین میں علامہ ماوردی، امام رویانی اور شاشی رحمہم اللہ ہیں، اِن حضرات نے امام ابوالقاسم انماطیؒ سے بھی اِسی رائے کو نقل کیا ہے، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"**بیع لبن الآدمیات جائز عندنا، لاکراهة فیه، هذاهوالمذهب، وقطع به الأصحاب إلاالماوردی، والشاشی، والرویانی، فحکوا وجهاً شاذاعن أبی القاسم الأنماطی من أصحابنا: أنه نجس، لایجوز بیعه، وإنمایربی به الصغیر للحاجة**"(المجموع، باب مالا یجوز بیعہ ومالا یجوز: ۳۰۴/۹، ط: مکتبۃ الإرشاد، جدہ)(عورتوں کے دودھ کی بیع ہمارے نزدیک بلا کراہت جائز ہے، یہی مذہب ہے اور اصحاب نے اِسی کو قطعی قرار دیا ہے، سوائے ماوردی، شاشی اور رویانی کے، انھوں نے ہمارے اصحاب میں ابوالقاسم انماطی کا ایک شاذ قول نقل کیا ہے کہ یہ نجس ہے اور اِس کی بیع جائز نہیں؛ بل کہ اِس کے ذریعہ سے ضرورۃً بچہ کی تربیت کی جاتی ہے)۔

مالکیہ کی رائے:

فقہائے مالکیہ کے نزدیک عورت کے دودھ کی بیع جائز ہے، علامہ ابن حطابؒ لکھتے ہیں:

"**یجوز بیع لبن الآدمیات؛ لأنه طاهر منتفع به**"(مواہب الجلیل، کتاب البیوع،۶۶/۶)۔

حنابلہ کی رائے:

عورت کے دودھ کی بیع کے سلسلہ میں فقہائے حنابلہ کے یہاں تین رائیں ملتی ہیں:

۱- خرید وفروخت جائز ہے ---- یہ بعض اصحابِ حنابلہ کی رائے ہے۔

۲- خرید وفروخت حرام ہے ---- یہ اصحاب حنابلہ کی ایک جماعت کی رائے ہے۔

۳- خرید وفروخت مکروہ ہے ---- یہ خود حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے روایت ہے؛ تاہم قول اول ہی کو صحیح

قول قرار دیا گیا ہے، علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

"فأمابيع لبن الآدميات، فقال أحمد: اكرهه، واختلف اصحابنافي جوازه، فظاهر كلام الخرقي جوازه...... وذهب جماعة من اصحابنا إلىٰ تحريم بيعه......والأول أصح؛ لأنه لبن طاهرمنتفع به" (المغنی لابن قدامہ، کتاب البیوع، فصل: حکم بیع لبن الآدمیات: ۱/ ۹۲۴) (جہاں تک عورتوں کے دودھ کی بیع کا تعلق ہے تو امام احمدؒ فرماتے ہیں: میں اسے ناپسند کرتا ہوں، ہمارے اصحاب کے درمیان اِس کے جواز کے سلسلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے؛ چنانچہ امام خرقی کے کلام سے جواز معلوم ہوتا ہے......اور ہمارے اصحاب کی ایک جماعت اُس کی بیع کو حرام سمجھتی ہے......تاہم قول اول ہی صحیح ہے؛ کیوں کہ یہ پاک اور قابل انتفاع دودھ ہے)۔

۲- خصوصی استعمال: جیسے: دوا کے طور پر استعمال ----- یہ تمام فقہاء کے یہاں جائز ہے، احناف کے یہاں صراحتاً یہ جزئیہ مذکور ہے: **"لابأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء"** (الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۳۵۵) (دوا کے طور پر عورت کے دودھ کا سعوط لینے اور اُس کو پینے میں کوئی حرج نہیں)۔

دیگر فقہاء کے یہاں جب عام حالت میں جائز ہے تو ضرورۃً تو بدرجۂ اولی جائز ہوگا۔

مذکورہ گفتگو سے دودھ کی خرید وفروخت کے بارے میں معلوم ہوا کہ:

۱- شوافع (مفتیٰ بہ قول کے اعتبار سے)، مالکیہ اور حنابلہ (مسلک کے لحاظ سے) کے نزدیک جائز ہے۔

۲- امام ابویوسفؒ کے نزدیک باندی کے دودھ کی بیع جائز ہے۔

۳- احناف اور شوافع میں علامہ ماوردی، امام ابوالقاسم انماطی، امام رویانی اور شاشی رحمہم اللہ کے نزدیک جائز نہیں۔

۴- امام احمدؒ بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق مکروہ ہے۔

قول راجح:

شرعی، عقلی اور سماجی اعتبار سے غور کیا جائے تو اُن حضرات کی رائے زیادہ قرین صواب معلوم ہوتی ہے، جو عورتوں کے دودھ کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں عدم جواز کے قائل ہیں، شرعی اعتبار سے ایک تو اس لئے کہ اُس سے "حرمت رِضاعت" کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ عورت کے دودھ کا استعمال بطور غذا کے جس طور پر ہو، حرمت کو ثابت کرتا ہے؛ چنانچہ صنعانیؒ لکھتے ہیں:

"واستدل به(أى: من حديث"لايحرم من الرضاع إلا مافتق الأمعاء")على أن التغذى بلبن

المرضعة محرم، سواء كان شرباً، أووجوراً، أوسعوطاً، أوحقنةً حيث كان يسد جوع الصبی، وهوقول الجمهور"(سبل السلام، باب الرضاع:۱/ ۵۸۲۳)۔

حدیث:"**لایحرم من الرضاع إلا مافتق الأمعاء**" سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ مرضعہ کے دودھ کو اس طرح غذا کے طور پر استعمال کرنا، جس سے نومولود کی بھوک مٹ جائے، حرمت کو ثابت کرتا ہے، خواہ (یہ استعمال) پی کر ہو، یا ناک اور حلق کے ذریعہ سے ہو، یا پھر حقنہ کے ذریعہ سے۔

دوسرے اِس لئے کہ اِس طرح فسادِ نکاح کا عموم ہوجائے گا؛ کیوں کہ کس عورت کا دودھ کس بچہ کے استعمال میں آرہا ہے؟ اِس کو قلم بند کر کے رکھنا ایک دشوارترین امر ہے، بالخصوص اُن لوگوں کے لئے، جن کے نزدیک دین ودھرم کوئی معنی نہیں رکھتا، نیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک "فساد" ایک ناپسندیدہ عمل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"**واللہ لایحب الفساد**" (البقرۃ:۲۰۵)،"اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا"، اِس لئے دودھ کی خرید وفروخت درست نہیں ہونی چاہئے۔

عقلی اعتبار سے اِس لئے کہ دودھ کا اثر بچہ کے اخلاق پر پڑتا ہے؛ چنانچہ ایک مرسل حدیث میں ہے:

"**نهی رسول الله ﷺ أن تسترضع الحمقاء**"(السنن الکبریٰ للبیہقی، باب ماورد فی اللبن یشبہ علیہ، حدیث نمبر:۱۶۰۹۹)(رسول اللہ ﷺ نے بے وقوف خواتین سے دودھ پلوانے سے منع فرمایا ہے)۔

اِس حدیث کے ضمن میں علامہ صنعانیؒ لکھتے ہیں:"**وو جه النهی أن للرضاع تأثيراًفی الطباع، فيختارمن لاحماقة فيهاو نحوها**"(سبل السلام، باب الرضاع، حدیث نمبر:۱۰۶۷: ۵۹۴/۳)

اور دودھ کی خرید وفروخت کی عام اجازت کی صورت میں یہ معلوم ہی نہ ہوسکے گا کہ دودھ کس خاتون کا ہے؟ نیک خاتون یا بدکردار خاتون کا، پھر اِسی کے ساتھ ساتھ آج کل کے موذی امراض بھی دودھ کے ساتھ منتقل ہوں گے، جو ایک بچہ کے لئے ہی نہیں؛ بل کہ اُس کی آئندہ نسل کے لئے بھی مضر ہوں گے، اب ظاہر ہے کہ ایک عقل مند صاحبِ شعور شخص اِن چیزوں کبھی پسند نہیں کرسکتا۔

سماجی اعتبار سے اِس لئے کہ اِس کے ذریعہ سے خواتین میں بے حیائی پیدا ہوجائے گی، اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی عقل سلیم رکھنے ولا انسان اپنی عورتوں کو بے حیا دیکھنا پسند نہیں کرے گا، اِس لئے عدم جواز کو ہی راجح ہونا چاہئے، واللہ اعلم!

البتہ اگر ضرورت بچہ کی جان کی ہلاکت کی حد تک پہنچ گئی ہو اور اجرت پر دودھ پلانے والی بھی دستیاب نہ ہو رہی ہو تو عورت کے دودھ کی خرید وفروخت کے لئے خصوصی گنجائش اِس شرط کے ساتھ رہنی چاہئے کہ مرضعہ کا نام و پتہ محفوظ رہے، تاکہ فسادنکاح کا مسئلہ پیدا نہ ہوسکے۔

۹- منی انسان کے اُن اجزاء میں سے ہے، جس کے اندر بڑھوتری ہوتی رہتی ہے اور آدمی کی تندرستی کے ساتھ ساتھ اس کے عطیہ کرنے میں بظاہر کوئی جسمانی نقصان بھی نہیں ہے، جب کہ اُس مریض کے لئے، جو نامردی یا بانجھ پن سے متاثر ہے، سراسر نفع بخش بھی ہے، نیز حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، امام داؤد، امام ابوثور، اسحاق بن راہویہ اور ابن منذر رحمہم اللہ کے نزدیک منی پاک ہے، اور پاک ہونے کی وجہ سے اس کی خرید وفروخت بھی اُن حضرات کے اصول کے مطابق جائز ہونی چاہئے، شافعی فقیہ تقی الدین ابوبکر محمد الحسینی لکھتے ہیں:

"**ویصح بیع کل طاهر منتفع به مملوک**" (کفایۃ الأخیار، کتاب البیوع: ۳۲۹، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۲۰۰۱ء)

(ہر پاک، قابل انتفاع، مملوک چیز کی بیع درست ہے)۔

لیکن اگر اس اصول کو اپنایا جائے تو شریعت کے مقاصد اصلیہ میں سے ایک اہم مقصد "حفاظت نسل" کی تفویت لازم آتی ہے؛ حالاں کہ اِسی مقصد کی حفاظت کے لئے شریعت نے "**الولد للفراش، وللعاهر الحجر**" (بخاری، باب الحلال بین والحرام بین وبینهما مشتبهات، حدیث نمبر: ۲۰۵۳) کا حکم سنایا ہے، نیز یہ مقصد "ضروریات خمسہ" میں سے ہے، جس کی رعایت بہر کیف ترجیحی طور پر کی جائے گی، علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں:

"**فأما الضرورية: فمعناها أنه لا بد منها فی قیام مصالح الدین والدنیا بحیث إذا فقدت لم تجر مصالح الدنیا علی استقامة؛ بل علی فساد وتهارج، وفوت حیاة**" (الموافقات، فی بیان قصد الشارع فی وضع الشریعۃ: ۲/۱۸-۱۷)

(جہاں تک ضروریات کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دین ودنیا کی مصلحتوں کے قیام کے لئے اس طرح ضروری ہیں کہ اگر اُن میں کوئی ایک بھی فوت ہوگیا تو دنیاوی مصلحتیں درستگی پر قائم نہیں رہ سکتیں؛ بل کہ فساد و بگاڑ پیدا اور زندگی ختم ہو کر رہ جائے گی)۔

علامہ شاطبیؒ کے اس قول کی تصدیق اس زمانہ کی ایڈز جیسی بیماری سے ہوتی ہے، لہٰذا اس جیسی بیماری، اختلاط نسب اور بے ستری وغیرہ سے بچاؤ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مادۂ منویہ کی خرید وفروخت کی ممانعت ہونی چاہئے، نیز یہ زنا سے مشابہ بھی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ صریح ارشاد ہے:

"**لاتقربوا الزنا إنه کان فاحشة ومقتا، وساء سبیلا**" (الإسراء: ۳۲) (زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بہت ہی بری چیز ہے، اور بہت ہی برا راستہ ہے)۔

اِس لئے نہ تو مادۂ منویہ کی خرید وفرخت درست ہے اور نا ہی بینک کو عطیہ دینا درست ہے۔

اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ سے متعلق مسائل واحکام

مولانا اشتیاق احمد اعظمی ☆

اسلام میں انسانی زندگی کے تحفظ کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ حالت اضطرار میں جان بچانے کے لئے حرام اشیاء کو کھانے اور پینے کی بھی اجازت دی گئی ہے، انسانی زندگی کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ علاج بھی ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے علاج کرانے کی ترغیب دی ہے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جیسے بیماریاں اللہ کی مشیت سے پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح دوائیں بھی اللہ کے حکم سے وجود میں آتی ہیں، لہذا جب بیمار ہوجاؤ تو دوا کا استعمال کیا کرو، خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا علاج کرایا ہے۔

قدیم زمانہ میں عام طور پر نباتات اور جمادات سے علاج کیا جاتا تھا، بعض دوائیں زمین کے اجزاء سے حاصل کی جاتی تھیں جیسے چونا، لوہا، سونا اور چاندی وغیرہ اور نباتات تو بے شمار ہیں، جن کا استعمال دوا کے طور پر ہوتا رہا ہے اور میڈیکل سائنس کی ترقی کے اس دور میں بھی بیشتر دوائیں نباتات ہی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ جمادات اور نباتات کے علاوہ حیوانی اجزاء سے بھی علاج کی صورت زمانہ قدیم سے پائی جاتی ہے، شہد کے شفا کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، فقہاء کے یہاں بعض جانوروں کا دودھ یہاں تک کہ خون سے بھی علاج کا ذکر ملتا ہے، حدیث سے بطور علاج اونٹنی کے پیشاب کا استعمال کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، چنانچہ بعض فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں۔

زمانہ قدیم میں انسانی اجزاء سے علاج کا ایک دو صورتوں کو چھوڑ کر تذکرہ نہیں ملتا، جیسے کتب فقہ میں عورت کے دودھ کو کان کے درد میں بطور دوا کے استعمال کا ذکر موجود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسانی اعضاء اس کے اجزاء سے دوسرے کے جسم میں پیوندکاری کرنا نیز خون کا عطیہ اور اس کا استعمال دوسرے شخص کے لئے جائز ہے یا ناجائز؟

تو جواباً عرض ہے کہ: ضرورت کی بنا پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو خون کا عطیہ دے سکتا ہے، لیکن

☆ دار العلوم مئو، مئو۔

عام حالات میں یہ عطیہ دو علتوں کی بنا پر درست نہیں: ۱-خون نجس ہے اور نجس کی بیع وشراء اور ہبہ جائز نہیں، ۲-خون انسان کا جزء ہے اور جزء انسانی سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ انسان کی تکریم کے خلاف ہے، اور اللہ تعالی نے انسان کو مکرم بنایا ہے، "**ولقد كرمنا بنى آدم**" (سورۂ اسراء:۷۰) (اور ہم نے انسان کو معزز ومحترم بنایا ہے)۔

"**وقد اجتمع فى حرمة الدم سببان: احدهما: نجس، والثانى:هو جزء من اجزاء الإنسان والإنتفاع به ينافى الكرامة الإنسانية**" (خون میں دو سبب حرمت اکٹھا ہیں: نجاست، خون انسانی اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور انسانی جزء سے انتفاع انسانی کرام کے منافی ہے) (نوازل فقہیہ معاصرہ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۱/۱۹۹)، لیکن عندالضرورۃ تداوی بالمحرم کا فتوی اکثر فقہاء نے دیا ہے اور اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی بعض نصوص بھی دال ہیں، جن کی طرف اشارہ اوپر ہو چکا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ احادیث میں عرنین اور قبیلہ عکل کے لوگوں کے لئے اونٹنیوں کے پیشاب اور دودھ کے استعمال کی اجازت رسول اکرم ﷺ کی طرف سے دی گئی ہے:

دوسرے یہ کہ ایک صحابی حضرت عرفجہ کو نبی اکرم ﷺ نے سونے کی ناک بنوا کر لگانے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی؛ حالانکہ سونے کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے۔

نیز قرآن کریم نے مضطر کے لئے خنزیر اور میتہ کے استعمال کی جان بچانے کے لئے رخصت دی ہے، چنانچہ حنفیہ میں سے فقہاء متاخرین نے تداوی بالمحرم کی اجازت دی ہے بالخصوص خون کے استعمال کی گنجائش فتاوی ہندیہ میں مذکور ہے: "**يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوى اذا أخبره طبيب مسلم أن شفاء ه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه**" (فتاوی ہندیہ ۳۵۵/۵، مکتبہ شاملہ)۔

خون کا استعمال دو شرطوں کے ساتھ جواز کی حدود میں مذکور ہوا: ۱-طبیب حاذق مسلم بتائے کہ اس کی شفا اسی خون ہی کے استعمال میں مضمر ہے، ۲-کوئی جائز اور مباح چیز اس علاج کے لئے میسر نہ ہو۔

یہی دونوں شرطیں تداوی بالمحرم کے سلسلے میں علامہ شامیؒ نے بحوالہ نہایہ عن الذخیرۃ بیان فرمائی ہیں: "**يجوز التداوى بالمحرم ان علم فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر**" (ردالمحتار مع الدر ۱/۳۶۵)۔

خون چونکہ دودھ کی بڑی حد تک نظیر ہے اور اس کے استعمال کا جواز قرآن وحدیث سے ثابت ہے باوجودیکہ دودھ بھی انسان کا جزء ہے، اس لئے جس طرح بچے کو دودھ پلانے کے لئے ماں کے علاوہ دوسری عورت حتی کہ مشرکہ کا بھی دودھ پلایا جاسکتا ہے گو کہ خلاف اولی ہے، جیسا کہ مبسوط کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "**لا باس بأن يستاجر المسلم الظئر الكافرة**" (جدید فقہی تحقیقات ۳۱۷بحوالہ مبسوط ۱۵/۱۲۷)، اس جزئیہ سے مشرکہ اور کافرہ کا دودھ مسلم بچہ کو پلانے کا جواز

معلوم ہوا، سوال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیا مسلمان کا خون کسی کافر کو دینا اور کافر کا مسلمان کو دینا جائز ہے؟ بعینہ یہی سوال کویت کی فتوی کونسل میں کیا گیا تھا، سوال کی عبارت یہ تھی: "**ما حکم الشریعة الاسلامیه بنقل دم المسلم لغیر المسلم وبالعکس**" (مسلمان کا خون غیر مسلم کو اور غیر مسلم کا مسلم کو چڑھانا اسلامی شریعت کی رو سے کیسا ہے؟)۔

اس کا جواب کونسل نے یوں دیا: "**بأنه لا باس بذلک ولا یمنع من ذلک ما یتصوره البعض من کون غیر المسلم نجسا لقوله تعالی: "انما المشرکون نجس"، فان هذه النجاسة معنویة**" (مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ الکویتیہ ۲/ ۲۹۵) (اس میں کوئی حرج نہیں اور بعض لوگوں کا یہ تصور کہ مشرک نجس ہوتا ہے، اس سے مسئلہ کے جواز میں کوئی فرق نہیں پڑتا؛ کیونکہ قرآن کریم میں: "**انما المشرکون نجس**" (کہ درحقیقت میں مشرکین نجس ہیں) اس آیت میں ان کی معنوی نجاست کا بیان ہے، تو کافر ومشرک کے خون کے لینے کے جواز میں کوئی کلام نہیں، لیکن جس طرح صلحاء امت نے فاسقہ عورت کا دودھ پلوانا پسند نہیں کیا، اسی طرح کافر اور فاسق انسان کے خون سے حتی الوسع اجتناب بہتر ہوگا (دیکھئے: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۹/ ۱۷۶)۔

۲- چونکہ خون کا استعمال مریض کی جان بچانے کے لئے اضطراری حالت میں جائز ٹھہرا تو خون کا ہبہ اور عطیہ بھی جائز ہوگا، عطیہ کے لئے حالت اضطرار کے انتظار کو ضروری نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لئے خون کا عطیہ پیش کرنا، بلکہ اس کے لئے بلڈ بینک کا قیام بھی جائز ہوگا، جیسا کہ ان امور کی تصریح "فتاوی قاضی" میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ نے فرما رکھی ہے (دیکھئے: الحظر والاباحۃ/ ۲۱۱)۔

۳- اس سوال کا جواب ضمنا جواب ۲ میں آچکا ہے، کہ مسلمان کے لئے بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے، اصولی قاعدہ ہے: "**الشئ اذا ثبت ثبت بجمیع لوازمه**" اسی لئے جب خون کا عطیہ دینا جائز ہے تو اس کی ناگہانی ضرورت کی تکمیل کے پیش نظر بلڈ بینک کا قیام بھی جائز ہوگا۔

۴- مطلوبہ گروپ کے خون کے حامل شخص کو خون کا عطیہ دینا جواز ہی کے حدود میں ہونا چاہئے، کیونکہ اس قسم کے نایاب گروپ والے اشخاص پر وجوب قرار دیا جائے تو وہ حرج میں پڑسکتا ہے، کیونکہ اگر اسے خود خون کی ضرورت پڑ جائے تو اسی گروپ کا خون ملنا، اس کے لئے بھی مشکل ہوگا تو دوسرے کی زندگی بچانے سے زیادہ اس کے لئے اپنی زندگی کی حفاظت ضروری ہے، اس لئے وجوب تو قرار نہیں دیا جاسکتا، ہاں جواز میں کلام نہیں۔

کسی انسان کے عضو سے دوسرے انسان کی پیوندکاری تکریم انسانی کے خلاف ہے، اس کی اجازت سے اعضاء انسانی، متاع بیع وشرا بن کر رہ جائیں گے۔

۵- انسان کا جسم، اس کے پاس اللہ کی امانت ہے، اسی لئے کوئی شخص اپنے کسی عضو کو دوسرے کے لئے مباح کردے، اس کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی (دیکھئے: ادلۃ المانعین رنوازل فقہیہ معاصرہ (اعضاء الانسان وترقیعہا ۲/ ۱۳، ۲۱۲ وجدید فقہی تحقیقات، اعضاء کی پیوندکاری ر ۲۸۹ تا ۲۹۲)۔

دوسرا قول جواز کا ہے: علماء معاصرین کا دوسرا گروہ بوقت ضرورت اور اضطراری حالت میں زندہ و مردہ انسان کے اعضا سے پیوند کاری کے جواز کا چند شرائط کے ساتھ قائل ہے۔

۶- زندہ یا مردہ کے قرنیۃ العین کا حاصل کرنا اور دوسرے کے لئے اس کی پیوند کاری میں بھی وہی اختلاف آراء، معاصر فقہاء کرام کے مابین ہے، جو اس سے پہلے گردہ یا اس جیسے ڈبل اعضا کی پیوند کاری میں نقل ہو چکا ہے، جو لوگ وہاں عدم جواز کے قائل تھے، ان کی یہی رائے آنکھ کے قرنیہ کی پیوند کاری میں بھی عدم جواز کی ہے اور جن معاصر علماء وفقہاء کے یہاں، حالت اضطرات میں زندہ و مردہ کے بعض اعضاء لے کر دوسرے شخص میں پیوندکاری کرنا جائز ہے، گو اس کے لئے کئی شرطیں بھی لگائی گئی ہیں، وہ لوگ آنکھ کے قرنیہ کی دوسرے شخص کے لئے پیوند کاری کے جواز کے بھی قائل ہیں۔

عدم قائلین کی طرف سے نمائندگی کے طور پر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کا ایک اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کریں گے:

مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''لوگ اپنی زندگی میں نہ آنکھوں کا عطیہ دیتے ہیں، نہ گردوں کا، کیونکہ جانتے ہیں کہ اس زندگی میں ان کو خود ان اعضا کی ضرورت ہے، لیکن مرنے کے بعد کے لئے بڑی فیاضی سے وصیت کر جاتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ اس زندگی کو تو زندگی سمجھتے ہیں، لیکن مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے، یوں سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اعضاء گل سڑ جائیں گے، خاک میں مل جائیں گے، اور ان اعضاء کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، یہی عقیدہ کفار مکہ کا تھا اور یہی عقیدہ عام کافروں کا ہے، جو مسلمان ایسی وصیت کرتے ہیں وہ بھی انہی کافروں کے عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے۔

الغرض اعضاء انسانی کی پیوندکاری جائز نہیں اور ان اعضا کے ہبہ کی وصیت باطل ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۹/ ۱۸۱-۱۸۰)۔

دوسری طرف اعضاء انسانی (مردہ یا زندہ) سے پیوند کاری کے جواز کے قائلین ہیں، جنہوں نے مخصوص حالات میں، کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے:

الف- زندہ شخص کسی دوسرے کو اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرے تو اس کے جواز کا فتوی، کویت علماء کونسل کی طرف سے

کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، یہ فتوی اس تفصیل کے ساتھ مرقوم ہے کہ زندہ شخص کی طرف سے کسی ایسے عضو کا عطیہ حرام ہوگا جو اس کی موت پر منتج ہو، خواہ عطیہ دہندہ خود اپنی موت پر راضی کیوں نہ ہو، کیونکہ یہ تو خودکشی کے مترادف ہوگا اور اگر اس کی اجازت کے بغیر ہوگا تو یہ ناحق قتل ہوگا اور یہ دونوں صورتیں حرام ہی ہیں، مثال میں قلب اور دونوں پھیپھڑے کا عطیہ پیش کیا جاسکتا ہے، یہی بات اس فتوے میں بایں الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"**أما إذا كان المنقول منه حيا فان كان الجزء المنقول منه يفضى إلى موته كالقلب أو الرئتين كان النقل حراما مطلقا سواء أذن أو لم ياذن؛ لانه ان كان باذنه فهو انتحار، وان كان بغير اذنه فهو قتل نفس بغير حق وكلاهما محرم**" (مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ، وزارت اوقاف کویت ۲/۲۹۶)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زندہ شخص کی طرف سے جس عضو کا عطیہ دیا جارہا ہے، اس کے لئے جانے سے اس کی موت نہیں ہوا کرتی، بلکہ اس عضو کے بغیر اس کی زندگی اور اس کا جینا ممکن ہے، لیکن اگر اس عضو کے نکل جانے سے اس کے کسی واجب کا تعطل لازم آتا ہو یا جس کو عطیہ شدہ عضو لگایا جارہا ہو، اس کے حق میں کسی حرام کی اعانت لازم آتی ہو تو ان دونوں صورتوں میں بھی زندہ کی طرف سے عطیہ دینا حرام ہوگا، مثلاً کوئی آدمی اپنا دونوں ہاتھ یا دونوں پیر کسی کو عطیہ دے دے تو خود کسب معاش سے عاجز ہو جائے گا یا کوئی غیر شرعی راہ اپنائے گا، یہاں بھی عطیہ دہندہ کی طرف سے اجازت دینے نہ دینے سے مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، بلکہ دونوں صورتوں میں حرام کا فتوی ہوگا، فتوی کی عبارت یوں ہے:

"**وان لم يكن نقل ذلك الجزء مفضيا الى موت المنقول منه ويمكن ان يعيش الانسان، ينظر فإن كان فيه تعطيل له عن واجب أو فيه إعانة المنقول اليه على محرم كان حراما وذلك كاليدين أو الرجلين معا، بحيث يعجز الانسان عن كسب عيش او يسلك سبلا غير مشروعة، ويستوى فى الحرمة الاذن وعدم الاذن**" (مجموعہ فتاوی شرعیہ کویت ۲/۲۹۶)۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زندہ شخص سے اس عضو کے لے لینے سے اس کی موت واقع نہیں ہوتی مگر جس کو اس عضو کی ضرورت ہے، اگر اس کا علاج مصنوعی یا حیوانی عضو سے ممکن ہو تو زندہ یا مردہ انسانی عضو لے کر اس کا استعمال جائز نہ ہوگا، لیکن ضرورت مند کی ضرورت، مصنوعی یا حیوانی عضو سے پوری نہیں ہوتی تو مردہ انسان کے عضو سے اس کی موت کے چند گھنٹوں بعد لے کر اس کا استعمال کرنا جائز ہوگا بایں طور کہ مرنے والے نے خود اس کی وصیت کی ہو یا وصیت نہ کی تو اس کے ورثہ کی اجازت بھی کافی ہوگی، مرنے والے نے کسی خاص شخص کو دینے کی وصیت کی ہوگی تو وہ شخص، دیگر لوگوں پر مقدم ہوگا، ایسے ہی مردہ کے ورثہ جس کے لئے اجازت دیں گے، وہ شخص دوسروں پر مقدم ہوگا۔

مردہ کے علاوہ زندہ شخص کی اجازت سے بھی اس کا عضو لے کر دوسرے کی پیوندکاری کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ پیوندکاری کا عمل، عموماً کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہو، اس کی مثال میں دوگردوں میں سے ایک، یا دوآنکھوں میں سے ایک آنکھ، یا کسی کوایک دانت کا عطیہ یا کچھ خون کا عطیہ پیش کیا جاسکتا ہے، اگر زندہ کی اجازت کے بغیر اس کے اعضاء میں سے کوئی عضو نکال کر کسی اور کو لگایا جائے گا تو عضو کے استعمال کرنے والے سے قصاص یا اس کا عوض لینا واجب ہوگا، جس کی تفصیلات، کتب فقہ کے باب الجنایات والدیات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مجموعہ فتاوی کویتیہ میں تو عندالضرورۃ زندہ کی حیات کو بچانے کے لئے، مردہ کے اعضاء کو بغیر اس کی وصیت کے بھی لینے کی گنجائش مکتوب ہے: "**اذا كان المنقول منه ميتا جاز النقل سواء أوصى أو لم يوص، اذ أن الضرورة في انقاذ حي تبيح المحظور**" (۲/۲۹۵)۔

اوپر کی بیان کردہ تمام صورتوں اور شقوں میں علماء ہند میں سے مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا بدرالحسن قاسمی وغیرہم کی آراء بھی یہی ہیں، لیکن مردہ کے کسی عضو کے لینے میں مرنے سے پہلے اس کی اجازت ووصیت یا بعد مرگ اس کے ورثہ کی اجازت کی شرط ہندوستانی علماء کے یہاں ضروری ہے، جس کی صراحت پہلے آچکی ہے۔

ب- کسی شخص کی قرنیہ، اس کی موت کے بعد بشرطیکہ اس نے خود عطیہ کرنے کی وصیت کر رکھی ہو یا اس کے ورثہ کی اجازت سے کسی بھی متعین شخص کو لگایا جانا جائز ہوگا، جس کی وضاحت (الف/۶) میں ہوچکی ہے۔

ج- Eye Bank کا قیام بھی جائز ہوگا، "**إذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه**" کا اصول اوپر گذر چکا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب آنکھ کے قرنیہ کی پیوندکاری جائز ہے، تو اس کے لئے بینک کا قیام بھی جائز ہوگا اور اس میں زندہ، مردہ کی آنکھوں کا عطیہ بھی درست ہوگا، مردہ کی وصیت یا اس کے ورثہ کی اجازت، مردہ کی آنکھ لینے میں مشروط ہوگی اور زندہ کے عطیہ کی صورت میں اس کی خود اجازت نیز اس عمل کی وجہ سے اسے ضرر شدید کا خوف نہ ہونے کی شرط ملحوظ رکھنا ہوگا۔

۷- مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ وغیرہ حاصل کرنے میں اگر خود مرنے والے نے قبل الموت وصیت کردی ہو تو یہ وصیت کافی ہوگی بصورت دیگر اس کے ورثہ کی اجازت تن تنہا کافی ہوگی، دونوں کی اجازت کی ضرورت فقہاء معاصرین نے ضروری نہیں قرار دیا، بلکہ کویتی علماء کونسل نے تو اپنے فتوی میں مردہ کی وصیت کے بغیر بھی عندالضرورت نقل اعضاء المیت کی اجازت دی ہے، ان کے فتوے کی عبارت اوپر نقل کی جاچکی ہے۔

۸-دودھ بینک(Milk Bank) کا قیام اوراس میں کسی خاتون کا بعوض یا بلاعوض دودھ فراہم کرنے کا حکم:

دودھ کی خریدوفروخت کے بارے میں فقہاءکرام کی آراءمختلف ہیں:

۱-احناف: آدمیات کے دودھ کی بیع ممنوع ہے، بدائع الصنائع میں ہے:”**ولا یجوز بیع لبن المرأة فی قدح عندنا**“(۱۴۵/۵)(ہمارے نزدیک عورت کے دودھ کو پیالے میں بیچنا منع ہے)،بدائع کی عبارت کا مقصود یہ ہے کہ عورت کا دودھ، جب اس سے علاحدہ کرکے کسی برتن وغیرہ میں رکھ کر بیچا جائے تو یہ بیع ممنوع ہوگی،اسی کوعلامہ ابن عابدین شامیؒ یوں تحریرفرماتے ہیں:”**ولا یجوز بیع لبن امرأة ولوفی وعاء**“(عورت کے دودھ کی بیع جائزنہیں،اگرچہ وہ کسی برتن میں کیوں نہ ہو)۔

۲-شوافع:عورت کا دودھ بیچنا جائز ہے، کیونکہ وہ ایک پاک مشروب ہے،”**یجوز بیعه لأنه مشروب طاهر**“(۴۳۳/۱البیوع المحرمۃ والمنہی عنہا/للدکتورعبدالناصرخضرمیلاد،طبع: دارالہدی النبوی،مصرطبع ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۰۰۵ء)۔

توشوافع کےنزدیک بیع لبن مرأة کے جواز کی بنیاداس کا پاک مشروب ہوناہے،جبکہ حنفیہ اس لئے اس کی بیع کے عدم جواز کے قائل ہیں کہ لبن آدمی کا جزہےاورانسان بجمیع اجزاءہ مکرم ہے نہ کہ بکاؤمال ہے”**هو بجميع أجزائه مكرم مصون عن الابتذال بالبيع**“(البیوع المحرمۃ والمنہی عنہا۴۳۳/۱)۔

۳-مالکیہ:حضرات مالکیہ کے یہاں بھی آدمیہ کے دودھ کی منفصلا بیع جائزہے،کیونکہ اس سے انتفاع کے امکان کے ساتھ ساتھ وہ ایک پاک چیزبھی ہے،ہاں مالکیہ کےنزدیک مردہ عورت کے دودھ کی بیع جائزنہیں،کیونکہ مردہ عورت کا دودھ مردہ کی نجاست کی بنا پرنجس ہے اورنجس چیز کی بیع جائزنہیں، مواہب الجلیل میں ہے:”**ولبن الادمی الا الميت**“(البیوع المحرمۃ والمنہی عنہا۴۳۴/۱)۔

۴-حنابلہ:حنابلہ کےکئی اقوال ملتے ہیں:

الف-بیع لبن الادمیات جائزہے،”**بناء علی انه جزو منفصل من جسم آدمی وانه يمكن الانتفاع به شرعا فضلا عن طهارته**“(البیوع المحرمۃ والمنہی عنہا۴۳۳/۱)۔

ب-پہلےقول کے بالکل مقابل حنابلہ سے دوسری رائے مروی ہے:”**بيع لبن الادميات لايصح مطلقا**“، حنابلہ میں کی ایک جماعت اس بیع کی حرمت کے قائل ہیں،”**وهناک جماعة من الحنابلة يذهبون إلى تحريم ذلک البيع**“۔

ج- باندی کے دودھ کی بیع صحیح ہے، آزاد عورت کے دودھ کی نہیں ''يصح من الأمة دون الحرة''۔

د- علی الاطلاق (دونوں کی بیع مکروہ ہے)، بعض حضرات نے اس سلسلے میں حنابلہ کے پانچ اقوال ذکر کئے ہیں۔ ان کے نزدیک ان اقوال میں سب سے صحیح، عورت کے دودھ کی علی الاطلاق بیع کے جواز کا ہے، یہ تھے عورت کے دودھ کی بیع کے سلسلے میں فقہاء کرام کے اقوال۔

رہا دودھ بینک کے قیام کا معاملہ تو یہ مغربی معاشرہ کی دین ہے، جہاں خواتین کو کسب معاش کی جدوجہد میں شامل ہونے کی بنا پر یہ مزاج پروان چڑھا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلانا نہیں چاہتیں، اسی پس منظر میں مغربی ممالک میں دودھ بینک (milk bank) قائم کئے گئے، یہ بینک دودھ فراہم کرنے والی عورتوں کو معاوضہ ادا کرتے ہیں اور ضرورت مند بچوں کو مہیا کر کے ان سے معاوضہ وصول کرتے ہیں، اس طرح یہ انسانی دودھ کی تجارت کی ایک شکل ہے۔

ہندوستان میں اگر اس قسم کا رجحان، عورتوں کی ملازمت کے بنا پر پروان چڑھ رہا ہے تو ہم مسلمانوں کو اس قسم کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کے بے شمار مفاسد ہیں، ضرورت مند بچوں کے لئے دودھ پلانے والی عورتوں کی فراہمی ہی انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے، اجرت لے کر دودھ پلانے کی شریعت نے اجازت دی ہے، اس لئے دودھ کی خرید وفروخت اور اس کے لئے Milk Bank کے قیام کی چنداں ضرورت نہیں، حنفیہ کے یہاں عورت کے دودھ کی بیع کا جواز بھی نہیں، اس لئے اگر ناگزیر حالات میں ضرورت پڑ ہی جائے تو عندالاضطرار خریدنا تو جائز قرار پا سکتا ہے، لیکن بیچنا تو کسی بھی حال میں جائز نہیں ہوسکتا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں: **''ويرى هذا العبد الضعيف أنه لا يجوز بيعها(بيع الأعضاء ومنه اللبن) بحال ويجوز شراؤها عندالاضطرار''** (نوازل فقہیہ معاصرة ۴/۴۴۵)۔

جب دودھ بینک کے قیام کی حاجت وضرورت نہیں، اس لئے اس مخلوط دودھ سے شیر خوار (بچے وبچیوں) کی رضاعت اور رضاعت کے نتیجے میں حرمت کے ثبوت وعدم ثبوت کی بحث کی تفصیلی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

جن ممالک میں اس رجحان کو فروغ مل رہا تھا اب انہی ممالک میں اس کا رواج سکڑتا جا رہا ہے، جدہ اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنی ایک قرارداد میں پاس کیا کہ: **''ان بنوك الحليب تجربة ما قامت بها الأم الغربية ثم ظهرت مع التجربة بعض السلبيات الفنية والعلمية فيها فانكمشت وقل الأهتمام بها''** (دودھ بینک کا تجربہ مغربی قوموں نے کیا پھر اس سلسلے میں تجربہ سے بعض فنی وسائنسی منفی نتائج ظہور پذیر ہوئے جس کے نتیجہ میں یہ تجربہ سکڑتا گیا یہاں تک کہ اس میں دلچسپی بہت کم رہ گئی)۔

جدہ اکیڈمی نے سب سے خطرناک مفسدہ یہ بیان کیا کہ دودھ بینک سے نسب میں اختلاط وشبہ پیدا ہوسکتا ہے اور نسب کی حفاظت شریعت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے اور رضاعت سے وہ سارے رشتے حرام ہوجاتے ہیں جونسب سے حرام ہوا کرتے ہیں۔

قرارداد کے الفاظ یہ ہیں: "**ان الاسلام يعتبر الرضاع لحمة كلحمة النسب، يحرم ما يحرم من النسب باجماع المسلمين ومن مقاصد الشريعة الكلية المحافظة على النسب وبنوك الحليب مودية الى الاختلاط أو الريبة**" (قرداد ۱۰-۱۶ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ، ۲۲-۲۸ دسمبر ۱۹۸۵)، جدہ اکیڈمی نے دودھ بینک کے قیام کی عالم اسلام میں ممانعت کی قرار بھی منظور کی ہے اور ان بینکوں سے دودھ پلانے پر حرمت رضاعت کے ثبوت کو بھی مانا ہے "**الأول: منع انشاء بنوك حليب الأمهات فى العالم الاسلامي-الثاني: حرمة الرضاع منها**"۔

۸-مادہ منویہ کے بینک کا قیام اور مردوخاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورت مردوخاتون کو اس کی قیمتاً فروخت کرنے یا ہدیہ دینے کا حکم:

اسلام میں نسب کی حفاظت کی غیر معمولی اہمیت ہے، اختلاط نسب سے بچانے کے لئے شریعت نے مردوزن دونوں کو پابند کیا ہے، جائز طریقہ پر حصول اولاد کی اسلام نے نہ صرف اجازت دی ہے، بلکہ زیادہ اولاد پیدا کرنے والی عورت سے شادی کرنے پر ابھارا بھی ہے، فرمان رسول اللہ ﷺ ہے:

"**تزوجوا الودود الولود**" (مشکاۃ المصابیح ص ۲۶۷) (خوب محبت کرنے والی اور کثرت سے بچے جننے والی عورت سے شادی کیا کرو)۔

نہ تو شریعت نے عورت کو اجازت دی ہے کہ غیر شوہر کے نطفہ سے پیدا ہونے والے بچہ کو شوہر کی طرف منسوب کرے اور نہ ہی شوہر کو روا ہے کہ وہ دیدہ ودانستہ اپنے نطفہ سے پیدا ہونے والے بچہ کا بلاوجہ انکار کرے، حدیث میں وارد ہے:

"**ايما امرأة ادخلت على قوم من ليس منهم فليس من الله فى شئ ولن يدخلها جنة وايما رجل جحدولده هوينظر اليه احتجب الله منه وفضحه على رؤوس الخلائق فى الاولين والآخرين**" (ابوداؤد والنسائی بحوالہ مشکاۃ ۲/ ۲۸۷) (جو عورت (کسی بچہ کو) ایسے قوم میں داخل کرے جس میں سے وہ نہ تو اللہ کے یہاں (اس کے دینداری کی) کوئی حیثیت نہیں اور اللہ پاک اس کو اپنی جنت میں ہرگز داخل نہیں فرمائیں گے اور جو مرد اپنے بچے کا انکار کردے حالانہ اسے اس بچہ کا اپنی اولاد ہونا معلوم ہے تو اللہ تعالی اس سے (قیامت میں) پردہ فرمالیں گے

اور تمام لوگوں (اولون وآخرون) کے سامنے اسے رسوا فرمائیں گے)۔

باندیوں سے استبراء رحم کا حکم بھی اختلاط نسب سے حفاظت کے پیش نظر ہی شریعت نے دیا ہے، حدیث میں وارد ہے کہ ایک دن حضور ﷺ کا گزر ایک قریب الولادت عورت کے پاس سے ہوا تو آپ نے صحابہ سے پوچھا یہ کون عورت ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: فلاں کی باندی ہے، آپ نے پھر سوال فرمایا: کیا وہ اس سے مجامعت کرتا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا، ہاں! آپ نے فرمایا: کہ میرا ارادہ اس کو ایسی لعنت کرنے کا تھا، جو اس کے ساتھ اس کی قبر میں جاتی پھر فرمایا: "**کیف یستخدمه وهو لا یحل له ام کیف یورثه وهو لا یحل له**" (مسلم شریف بحوالہ مشکاۃ ۲۸۹/) (کیسے وہ اس بچہ کو خادم بنائے گا حالانکہ یہ اس کے لئے جائز نہیں، یا کیسے وہ اس بچہ کو اپنا وارث بنائے گا جبکہ اس کو وارث بنانا بھی حلال نہیں)۔

شریعت کے اس مزاج کے بعد مادہ منویہ کے لئے بینک کا قیام کہ جہاں انسانی مادہ تولید کو اکٹھا کر کے بغیر امتیاز و احتیاط اور بغیر شرعی وقانونی رشتہ کے، بالکل آزادی کے ساتھ عورتوں کو حاملہ بنانے کے لئے اسے استعمال میں لایا جاتا ہو، اس کا جواز کیوں کر پیدا ہوسکتا ہے، اور زنا کاری اور اس عمل بارآوری میں کیا فرق ہوسکتا ہے، سوائے اس کے کہ زنا کاری میں فطری وسیلے کو استعمال میں لایا جاتا ہے اور یہاں نئی نئی مشینوں یا انجیکشنوں کے ذریعہ اس مادہ کو رحم خاتون تک پہنچایا جاتا ہے۔

اس لئے مادہ منویہ کے لئے بینک کا قیام ناجائز ہوگا اور اس بینک میں کسی بھی مرد وزن کا قیمۃ یا ہدیۃ اپنے مادہ منویہ کو دینا بھی حرام ہونا چاہئے۔

قانون فطرت سے لڑ کر اولاد حاصل کرنے والوں کی کوشش کی کسی طرح حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہئے۔

☆☆☆

اجزاءانسانی کا عطیہ

مولانا محمد مغفور باندوی

۱-خون کا تبرع:

خون انسانی جسم کے لئے ایک نہایت ہی اہم چیز ہے، جس کی ایک معتد بہ تعداد جسم میں ہونا ضروری ہے، کمی کی صورت میں جسم کو بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں، اور ختم ہونے کی صورت میں انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں پہلا مسئلہ تو خون کے تبرع کا ہے، اس لئے کہ خون کی خرید وفروخت اعضاء کے مثل ناجائز وحرام ہے۔ "**نهى النبى عليه السلام عن ثمن الدم**" (رواہ البخاری) (اللہ کے رسول ﷺ نے خون کی قیمت (خون فروخت کر کے اس سے مال حاصل کرنے) سے منع فرمایا ہے)۔

اصل خون کی خرید میں حرمت اور تبرع کی ممانعت ہے، لیکن ضرورت وحاجت کی بنیاد پر قواعد شرع کی رو سے خرید و فروخت کے مقابلہ میں تبرع کی شکل کو اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، چونکہ تبرع شراء کے مقابلہ میں اخف ہے۔

"**ان القواعد الشرعية الاسلامية تقتضى جواز التبرع اذمن قواعدها ان الضرورات تبيح المحظورات، والضرر يزال، والمشقة تجلب التيسير، والمريض مضطر ومتصرروقدلحقه المشقة الموجبة للهلاک فيجوز نقل الدم اليه......فانه يجوز نقل الدم والتبريع للغير ويعتبر المتبرع والطبيب محسنا يفعله لما فيه انقاذ النفس المحرمة من الهلاک**" (احکام الجراحۃ الطبیۃ والآثار المترتبۃ علیہا ص ۳۸۵)۔

(قواعد شرع تبرع بالدم کے جواز کا تقاضا کرتے ہیں، چونکہ شریعت کے قواعد میں ضرورت حرام کو حلال کر دیتی ہے، ضرر کو دور کیا جائے گا، مشقت آسانی لاتی ہے، وغیرہ ہیں، اور مریض حقیقتاً ایک شخص مضطر ہوتا ہے جو مشقت کے اس درجہ پر ہوتا ہے کہ خون نہ ملنے کی صورت میں ہلاکت یقینی ہوتی ہے، چنانچہ خون کا نکالنا اور مریض کو خون کا عطیہ دونوں جائز ہیں، اس امر میں خون کا عطیہ کرنے والا اور ڈاکٹر دونوں ہی ایک انسانی جان کو بچانے کی وجہ سے محسن و ماجور عند اللہ ہوں گے)۔

اس عبارت اور وضاحت کے ذریعہ سوال کے پہلے حصہ ''مسلمان کا مسلمان کو خون کا عطیہ'' کا جواب حل ہو گیا کہ ایک مسلمان کا کسی دوسرے مسلمان کو خون کا عطیہ کرنا جائز اور مستحسن ہے، نیز مسلمان کو خون عطیہ کرنے کی ایک اور دلیل:

''ویجوز ان یتبرع الانسان من دمه بما لایضر عند الاحاجة الی ذلک لاسعاف من یحتاج من المسلمین'' (البنوک الطبیہ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ رص ۲۴۹)۔

(انسان کا اپنے خون کی اتنی مقدار کسی ضرورت مند مسلمان کی مدد کرنے کے ارادہ سے تبرع کرنا جتنی مقدار خون کے نکلنے سے اس عطیہ کرنے والے شخص کی ضرورت پڑنے پر نقصان دہ نہ ہو جائز ہے)۔

کسی مسلمان کا کسی ضرورت مند غیر مسلم کو خون عطیہ کرنا:

اللہ رب العزت نے کفار کی امداد کے سلسلہ میں کفار کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ۱-حربی، ۲-غیر حربی (ذمی وغیر) اور دونوں کے الگ الگ احکامات بیان فرمائے ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

''لاینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم وتقسطوا إلیهم إن الله یحب المقسطین، إنما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاهروا علی إخراجکم أن تولوهم ومن یتولهم فأولئک هم الظالمون'' (ممتحنہ: ۹-۸)۔

اس آیت کریمہ میں غیر حربی کافر کے ساتھ احسان کرنے اور ان کو بعض خیر (صدقات) میں شریک کرنے سے منع کیا گیا، بلکہ ان کے ساتھ احسان کرنے اور ان کو عطیہ کرنے کے جواز کو بیان کیا گیا ہے، اور خون کا عطیہ بھی ایک قسم کا احسان ہے، چنانچہ کسی مسلمان کا کسی ایسے کافر کو خون کا عطیہ کرنا جائز ہے، جس سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

''ان الله امرنا بالبروالاحسان الی الکفار غیر المحاربین ومن البر والاحسان الیهم التبرع لهم بالدم اذا احتاجوا الیه اما الحربی فیه خلاف ذلک'' (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ رص ۲۵۲-۲۵۳)۔

(اللہ رب العزت نے ہمیں غیر حربی کافر کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے، اور ان کی ضرورت کے وقت ہمارا ان کو خون عطیہ کرنا بھی ایک احسان ہے، البتہ حربی کا حکم اس کے برخلاف ہے، یعنی جس کافر سے اسلام یا مسلمانوں کو ضرر کا اندیشہ ہو ایسے کسی غیر مسلم کو خون کا عطیہ کرنا جائز نہیں)۔

۲-بلڈ بینک:

بلڈ بینک کی موجودہ شکل: چند دنوں یا چند مہینوں کی کہانی نہیں بلکہ یہ مختلف مراحل اور اصطلاحات پر مبنی ایک صدی پر محیط ہے، جو بتدریج تجربات کے بعد موجودہ شکل میں ہے، میڈیکل سائنس نے جب جسم انسانی میں خون داخل کرنے کا

کامیاب تجربہ کرلیا، اور ایک شخص سے ضرورت کے تحت خون حاصل کر کے جسم میں داخل کرنے میں کامیابی حاصل کر کے دوسرے کے جسم میں داخل کرنے کی شکل اختیار کی گئی، خون کو پہلے سے جمع کرنے کی نہ کوئی شکل تھی اور نہ ہی اس کا کوئی مخصوص ادارہ تھا۔

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جنگوں کی کثرت نے پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۱۹۴۵) اور اسپنی جنگ (۱۹۳۷-۱۹۳۹) میں خون کی ذخیرہ اندوزی کی گئی، جس کا اندازہ صرف اسی بات سے ہوتا ہے کہ تنہا لندن شہر میں ۲۶ ہزار لیٹر خون جمع کیا گیا اور اسی شہر میں زخمیوں پر استعمال ہوا، خون کی اس ذخیرہ اندوزی کے فوائد سامنے آنے کے بعد بلڈ بینک کی راہ ہموار ہوگئی۔

چنانچہ ۱۹۳۱ء میں موسکو شہر میں سب سے پہلا بلڈ بینک قائم ہوا اور ۱۹۳۲ میں کوک کاؤنٹی شکاگو میں ایک عالمی بلڈ بینک کا افتتاح ہوا، اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تو تیزی سے بلڈ بینک کا دائرہ وسیع ہونے لگا، اور اسی زمانہ میں امریکہ اور یورپ کے مختلف شہروں میں اس کا قیام عمل وجود میں آیا (ملاحظہ ہو: البنوک الطبیۃ البشریۃ احکامہا الفقہیۃ للدکتور اسماعیل مرحبا ص ۲۲۹)۔

ان بینکوں کے خون کے حصول کا ذریعہ صرف جسم انسانی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں شرائط کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ دو طرح کی شرطیں ہیں: ۱- فقہاء کے شرائط، ۲- ڈاکٹرس کے شرائط۔

فقہاء کے بیان کردہ شرائط:

۱- حاجت وضرورت متحقق ہو۔

۲- مریض کے لئے اپنے مرض کی شفا میں دوسرے سے خون حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ ہو۔

۳- عطیہ کرنے والے اور جس کو عطیہ کیا جائے اس عمل کی وجہ سے کسی پریشانی کا شکار نہ ہوں، لقولہ علیہ السلام: "لاضرر ولاضرار" (الحدیث)۔

۳- عطیہ کرنے والا اپنے اس عمل پر کوئی عوض نہ حاصل کرے۔

۴- تبرع کا یہ عمل عطیہ کرنے والی کی خوش دلی کے ساتھ ہو (حوالہ سابق)۔

ڈاکٹر کے شرائط:

۱- خون کا عطیہ کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا جسم ان امراض سے پاک ہو جو امراض خون کے ساتھ ہی دوسرے جسم میں منتقل ہوتے ہیں، مثلاً ایڈز وغیرہ۔

۲- متبرع کو کوئی ایسا مرض لاحق نہ ہو جو خون کے نکل جانے سے شدت اختیار کر جاتا ہو، جیسے تنفس وغیرہ دل کے

امراض۔

۳-متبرع اتنی کثرت سے خون عطیہ نہ کرے کہ اس کے ہی جسم میں خون کی مطلوبہ مقدار کم ہوجائے۔

۴-متبرع خون کا عطیہ کرتے وقت اپنی عمر کا بھی خیال کرے، چنانچہ کبرسنی میں خون کا عطیہ نہ کرے۔

۵-ایک بار خون کا عطیہ کرنے کے بعد متبرع دو یا تین مہینوں سے پہلے دوبارہ خون کا عطیہ نہ کرے۔

۶-اگر متبرع کا کوئی بڑا آپریشن ہوا ہو تو چھ مہینوں کی مدت کے درمیان خون عطیہ نہ کرے۔

۷-کوئی حاملہ یا مریضہ اپنا خون عطیہ نہ کرے (حوالہ سابق رص ۲۶۰-۲۶۱)۔

۲- دور حاضر میں جتنے بھی بینک اس ملک میں موجود ہیں خواہ وہ سرکاری نوعیت کے ہوں یا غیر سرکاری سب کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ خون عام طور پر یا رضا کارانہ طور پر عطیہ کی شکل میں حاصل کرتے ہیں اور کبھی کبھی خرید وفروخت کے ذریعہ چنانچہ بلڈ بینک کی تعریف میں دونوں ہی امور کا خیال رکھا گیا ہے، "**ھو عبارة عن مرکز مخصص لجمع الدم من المتبر عین او من الذین معطون دمائھم مقابل ثمن معین**" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ رص ۲۲۳)۔

اور خون دینے کا طریقہ کار ان تمام بینکوں کا یہ ہے کہ وہ مطلوبہ گروپ کا خون کسی بھی گروپ کا خون لے کر اس ضرورت مند شخص کو مطلوبہ خون دے دیتے ہیں، ان کے عوض لینے کی چند معقول وجوہات ہیں:

۱-غیر ضرورت مند کسی فاسد مقصد (بیچنے وغیرہ) یا ضائع کرنے کے ارادہ سے خون حاصل نہ کرسکے۔

۲-خون کی ایک اچھی مقدار ہر وقت بینک میں موجود رہے جو ہنگامی شکل میں کام آسکے۔

۳-خون کے محفوظ رکھنے پر جو اخراجات آتے ہیں ان کو اس کے ذریعہ سے پورا کیا جاسکے، چنانچہ دور جدید کے علماء نے بلڈ بینک کے بدلہ میں خون لینے والے عمل کو جائز قرار دیا ہے، راقم کی بھی یہی رائے ہے کہ عوض کے طور پر خون لینے والے بینکوں کو خون کا عطیہ کرنا جائز اور درست ہے (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیۃ ر ۲۷۰)۔

۳- راقم کی رائے میں درج ذیل دلائل کی بنیاد پر مسلمانوں کا بلڈ بینک قائم کرنا جائز اور مستحسن ہے۔

دلائل:

شریعت اسلامیہ کا مقصد ضرر کو دور کرنا اور مصلحت کا حصول ہے، اور بلڈ بینک کے قیام سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے۔

شریعت کے پانچ مقاصد میں سے ایک مقصد "حفظ نفس" بھی ہے اور بلڈ بینک کے قیام سے بہت سی جانوں کو بچایا جاسکتا ہے، نیز اسماعیل مرحبا فرماتے ہیں:

"یجوز بنک الاسلامی لقبول مایتبرع به الناس من دمائهم وحفظ ذلک لا سعاف ممن یحتاج الیه المسلمین علی ان لا یاخذ البنک مقابلا مالیا من المرضی أو اولیاء امورهم عوضا عما یسعفهم به من الدماء ولا یتخذ ذلک وسیلة تجاریة للکسب لما فیه من المصلحة العامة للمسلمین" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ ص ۲۴۱)۔

۴- O Negative یہ خون کا ایک ایسا گروپ ہے جو کمیاب ہے، اس خون کی خاصیت یہ ہے کہ دوسرے گروپ کے خون کو قبول نہیں کرتا اور دوسرے تمام گروپ اس خون کو قبول کر لیتے ہیں، اور عام طور پر بلڈ بینکوں میں بھی یہ گروپ نہیں ملتا، چنانچہ اس گروپ کے حامل شخص کو اگر خون کی ضرورت پڑتی ہے تو دوسرے اسی گروپ کے حامل شخص کو اپنا خون عطیہ کرنا راقم کی رائے میں "مالایتم الواجب الابه فهو واجب" (روضۃ الناظر لابن قدامہ ۱/ ۸۳) کی بنیاد پر واجب ہوگا، نیز ڈاکٹر اسماعیل فرماتے ہیں: "ان الدم هو فی الشئ الیسیر لامضرة علی صاحبه فی بذله فاذاکان لانقاد حیاة مسلم من الهلاک فهو واجب" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیۃ ص ۲۵۹)۔

۵- جسم کے تمام اعضاء یا اپنے جسم کے کسی حصہ (مثلاً جگر، قرنیہ وغیرہ) کے تبرع کرنے کی وصیت کرنا، اس سلسلہ میں پہلے لفظ وصیت پر مختصر بحث ضروری محسوس ہوتی ہے:

"والوصیة اصطلاحا: هی تملیک مضاف الی ما بعد الموت" (تحفۃ الفقہاء للسمرقندی ۱/ ۳۰۲)۔

وصیت کے لغوی اور اصطلاحی معنی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرعی طور پر وصیت کا نفاذ اموال، منافع، اور دیون میں ہوتا ہے، نیز وصیت کا نفاذ ترکہ میں موصی کے موت کے بعد ہوتا ہے۔

جسم انسانی کا تعلق نہ تو اموال سے ہے اور نہ ہی منافع اور دیون سے، بلکہ جسم انسانی اللہ کی دی ہوئی ایک ایسی امانت ہے جس میں انسان اپنی زندگی میں ایسا کوئی تصرف نہیں کر سکتا جو اس کی موت یا اس کے جسم کے فائدہ کے تلف کا باعث ہو، اور ایسا کرنے والے کے سلسلہ میں قرآن وسنت میں سخت ترین وعیدیں موجود ہیں، نیز جسم انسانی کو اللہ نے ایک خاص تکریم عطا فرمائی ہے، جس کی بنیاد پر اس کے انتقال کے بعد اس کے جسم میں کوئی تصرف (کوئی چیز نکالنا) جائز نہیں، یہی وجہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت تکریم انسانی کی بنا پر اجزاء سے انتفاع کے حرام ہونے (جس کی پوری تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے) پر اجزائے جسم انسانی کے عطیہ کے عدم جواز کی قائل ہے۔

اپنی موت کے بعد اپنے جگر کو کسی ضرورت مند شخص کو عطیہ کرنا:

اس کے جواب سے قبل دلائل کو ذکر کرتا ہوں جو جسم انسانی کے اعضاء کے عطیہ کو جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

تبرع کے جواز کے دلائل:

۱-قال تعالیٰ:"ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا"(مائدہ:۳۲)۔

۲-"قال النبی ﷺ: من استطاع منكم ان ينفع اخاه فليفعل"(صحیح مسلم کتاب السلام، باب استحباب الرقیۃ من العین، رقم:۲۱۹۹)۔

۳-"قال النبی ﷺ:"إذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاثة: صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعوله"(رواہ الترمذی: کتاب الوقف، رقم:۱۳۷۶، ص۶۶۰)۔

عصر حاضر کے بعض وہ فقہاء جو تبرع کے جواز کے قائل ہیں وہ موت کے بعد اعضاء کے عطیہ کو"صدقہ جاریہ" میں شمار کرتے ہیں۔

"ان الصدقة ببعض البدن اعظم اجرا من الصدقة بالمال"(زراعۃ الاعضاء فی الشریعۃ الاسلامیہ ص۵۲-۵۱)۔

ان دلائل کی روشنی میں راقم الحروف کی رائے میں اپنی موت کے بعد وصیۃ اپنے جگر کا کسی ضرورت مند کو عطیہ کرنا جائز ہے، اوراس کا شمار صدقہ جاریہ میں ہوگا۔

۲-آنکھ کا عطیہ:

الف-ان ساتوں میں مرکزی اور اہم کردار Cornea (قرنیہ) کا ہوتا ہے، اور درحقیقت صرف اسی کی پیوندکاری ہوتی ہے،اورسوال بھی قرنیہ سے متعلق ہے۔

"قرنیہ" کا عطیہ زندگی میں جائز نہیں ہے، چونکہ جسم انسانی کا ایک اہم عضو آنکھ ہے جو بے پناہ فوائد رکھتی ہے،اور اعضاء کے عطیہ میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس عطیہ سے متبرع کو کوئی نقصان لاحق نہ ہو،جیسا کہ خون کے عطیہ میں گذرا۔نیز"النقل فی عضو تتوقف عليه حياة المتبرع او يعطل زواله وظيفة اسياسة من حياته وهو محرم بالاتفاق"(البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ ص۷۶۰)۔

اس قاعدہ کے پیش نظر راقم کی رائے میں کسی زندہ شخص کو اپنی دونوں یا ایک آنکھ کا"قرنیہ" عطیہ کرنا جائز نہیں ہے۔

"لايجوز الحی ان يتبرع باحدی قرنية لغيره مع سلامة عينه الاخری"(البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ ص۷۶۰)۔

ب-مردہ شخص سے قرنیہ حاصل کرنا:

میت کی مختلف شکلیں ہیں:

۱-لاوارث اور غیر معروف شخص جس سے نہ تو کوئی اجازت معلوم ہو اور نہ کوئی ممانعت اور اس کا کوئی وارث بھی نہ ہو۔

۲-میت نے اپنی زندگی میں ہی تبرع (عطیہ) سے منع کر دیا ہو۔

۳-میت نے کسی ضرورت مند کو اپنے قرنیہ کے عطیہ کی اجازت دے دی ہو یا اس کے ورثہ نے اجازت دے دی ہو۔

ان تین شکلوں میں فقہاء معاصرین کے الگ الگ اقوال ہیں، اور ہر شکل میں جواز اور عدم جواز دونوں ہی شکلیں موجود ہیں:

''جب میت مجہول النسب ہو اور اس سے اجازت اور ممانعت کسی کا پتہ نہ ہو تو ایسے شخص کے قرنیہ کو کسی ضرورت مند کو لگانے کے سلسلہ میں دو قول ہیں: جواز اور عدم جواز کا ہے''۔

"اذا كان الميت مجهول الهوية أو النسب أو لم يرد عنه الإذن وعدمه ولم يغضب وارثا ففيه قولان جواز النقل وعدم جوازه" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیۃ ص۶۰-۷)۔

راقم الحروف کی رائے میں ایسے شخص (میت) کا قرنیہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ مجہول ہونا اعضاء کے نکالنے یا تبرع کی دلیل نہیں ہے۔

۲-دوسری شق یعنی جبکہ میت نے اپنا قرنیہ اپنی موت کے بعد کسی ضرورت مند کو دینے سے منع کر دیا ہو یا اس کے تمام ورثہ عطیہ کرنے سے مانع ہوں تو اس کے قرنیہ کو کسی ضرورت مند کو لگانے میں بھی دو قول ہیں: جواز، عدم جواز۔

"اذا وجد عدم الإذن من الميت او الاتفاق على عدم الاذن من الورثة ففيه القولان جوازه وعدم جوازه" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیۃ ص۶۱-۷)۔

راقم الحروف کی رائے میں اس شکل میں بھی میت کا قرنیہ نکال کر کسی ضرورت کو لگانا جائز نہ ہوگا، چونکہ اس مسئلہ میں ممانعت موجود ہے جس کا اسے حق ہے۔

۳-میت نے اپنی زندگی ہی میں کسی ضرورت مند کو اپنا قرنیہ دینے کی اجازت دے دی ہو یا عطیہ کر دیا کسی فرد یا ادارہ کو دے دیا تو اس میں بھی دو قول ہیں: جواز و عدم جواز۔

"أووجدالاذن منه اووجدالاتفاق على الإذن من الورثة......ففيه القولان جواز النقل وعدمه" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیۃ ص۶۱-۷)۔

اگر چہ اس شکل میں بھی اکثر فقہاء معاصرین عدم جواز کے قائل ہیں، لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ شکل جائز ہے، یعنی کسی شخص کا اپنی موت کے بعد کسی ضرورت مند کو اپنا قرنیہ عطیہ کرنا جائز ہے، اور اس کے دلائل ماسبق میں جگر کے عطیہ کے جواز میں گذر چکے ہیں، جس طرح جگر انسانی جسم کا ایک حصہ ہے اور اصل اس میں تحریم ہے، ضرورت کی بنیاد پر دور حاضر میں یہ عمل جائز ہے۔

دلائل:

"**ومن أحياها فكأنما أحيان الناس جميعا**" اور "**قال النبی** ﷺ: **من استطاع منکم ان ینفع اخاه فلیفعل**" (صحیح مسلم کتاب السلام، باب استحباب الرقیۃ من العین، رقم: ۲۱۹۹، ص ۱۴۰، مطبوعہ اشرفی آفسیٹ پرنٹرس دیوبند)۔

اور "**الضرورات تبیح المحظورات**" (الاشباہ والنظائر) کی بنیاد پر جگر کا عطیہ جائز ہے، اسی طرح قرنیہ بھی جسم انسانی کا ایک حصہ ہے اور جن دلائل کے رو سے جگر کا عطیہ جائز ہے، قرنیہ کا عطیہ بھی جائز ہے۔

ج- آئی بینک کی تعریف:

"**عبارة عن معمل یتم حفظ العیون المتأصلة بطرق عدیدة لتکون تحت الطلب**" (امراض العیون، ص ۶۰)۔

جس طرح انسانی ضرورت کے پیش نظر خون کا بینک قائم کیا گیا، اسی طرح ۱۹۴۴ء میں آنکھ کو جمع کرنے کے لئے خصوصا قرنیہ کے جمع کرنے کے لئے امریکہ میں "آئی بینک" قائم کیا گیا جس کا مقصد مردہ جسموں سے حاصل شدہ "قرنیہ" (Cornia اور صلبہ Scera) کو جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ محفوظ رکھنا اور ضرورت پڑنے پر قرنیہ کے کسی ضرورت مند کی آنکھوں میں ڈالنا تاکہ بینائی لوٹ آئے، آنکھوں کی پیوندکاری میں اصول تمام ڈاکٹرس کے یہاں حتمی اور لازمی ہے کہ آنکھوں کی پیوندکاری اسی صورت میں ہوسکتی ہے جبکہ قرنیہ سے محروم شخص کے آنکھوں کے دوسرے اجزاء بالکل صحیح سالم ہوں اور کام کر رہے ہوں، ایسا شخص جس کے دوسرے اجزاء آنکھ بھی خراب ہو اس کا علاج قرنیہ کی پیوندکاری سے نہیں ہوسکتا۔

آئی بینک کا حکم:

آئی بینک کے قیام کے سلسلہ میں فقہاء معاصرین جواز کے قائل ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح بلڈ بینک، اسکن بینک قائم کرنا جائز ہے، اسی طرح آئی بینک قائم کرنا بھی جائز ہے۔

"**وقد تکلم فی جواز انشاء بنک العیون قدیما لم ارمن حرمة ولعل الجواز قول جمهور العلماء کما اجازکثیر منهم انشاء بنوک الدم وبنوک الجلد وغیرها**" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا

الفقہیۃ/ص۷۵۷)۔

چنانچہ جب جمہور کی رائے میں آئی بینک کا قیام جائز ہے تو اس میں اپنے قرنیہ کا عطیہ کرنا بھی جائز ہے، راقم کی یہی رائے ہے، اس کی تائید ضمناً حسن مامونؒ سے ۱۹۵۶ء میں پوچھے گئے ایک استفتاء سے بھی ہوتی ہے:

"قال الحسن مامون: نقول ان الابتلاء علی عین المیت عقب وفاته لتحقق مصلحة للحی الذی حرم نعمة البصر، وحفظها فی البنک......لیس فیه اعتداء علی حرمة المیت وهو جائز شرعا لان الضرورة دعت الیه" (فتاوی دار الافتاء المصریۃ الفتوی رقم ۱۰۸۷)۔

۷-میت کے جسم سے اعضاء (جگر، آنکھ وغیرہ) حاصل کرنے میں اجازت کی چند صورتیں ہیں:

۱-میت اپنی زندگی میں اجازت دے دے۔

۲-میت نے اجازت نہ دی ہو، البتہ تمام ورثہ اس (عطیہ) کی اجازت دے دیں۔

۳-میت نے اپنی زندگی میں عطیہ کر دیا ہو اور ورثہ راضی نہ ہوں۔

۴-میت نے منع کیا ہو اور ورثہ عطیہ کرنا چاہیں۔

پہلی، تیسری، اور چوتھی شکل میں میت کی اجازت کا اعتبار ہوگا، کیونکہ کسی کو اپنے اعضاء میں سے کسی عضو کا عطیہ کرنا وصیت کے قبیل سے ہے اور وصیت میں میت کی منشاء (اجازت یا ممانعت) کا اعتبار ہوگا، چنانچہ اگر اس نے جگر یا قرنیہ کا عطیہ اپنی زندگی میں کر دیا ہے تو چاہے ورثہ راضی ہوں، یا نہ ہوں، میت کی اجازت معتبر ہوگی، چنانچہ عطیہ کرنے والے کے لئے بہتر یہ ہے کہ یہ عطیہ تحریری شکل میں ہو، البتہ دوسری صورت میں یعنی جب میت نے نہ تو عطیہ کیا اور نہ ہی اس سے منع کیا جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، تو اس شکل میں اگر ورثہ چاہیں تو اس کے جگر یا قرنیہ کا عطیہ کر سکتے ہیں، انہیں شرعاً اس کا اختیار ہوگا۔

"یجوز نقل عضو من میت الوصی......بشرط أن یاذن المیت أوورثة بعد موته او یشرموافقة ولی المسلمین اذا کان المتوفی مجهول الهویة ولاوراثة له" (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیۃ/۱۸۹)۔

ملک بینک:

شریعت مطہرہ نے حرمت رضاعت کا اسی طرح اعتبار کیا ہے جیسا کہ نسب کا اعتبار کیا، چنانچہ چند استثنائی شکل کے علاوہ رضاعت کی بنیاد پر وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں، جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہوجاتے ہیں: **"یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب الا ام اخته من الرضاع"** (الکتاب/۱۶۸)۔

ملک بینک کا جو طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ عورتوں سے ان کا دودھ رضاکارانہ طور پر (تبرع) یا خرید کر اس کو پانی کی

بھاپ کے ذریعہ جما کر مشینوں میں محفوظ کردیتے ہیں اور پھر ضرورت پڑنے پر اس کو پانی میں گھول کر بچے کو پلادیا جاتا ہے، اگر چہ ملک بینک سے حاصل شدہ دودھ میں پانی یا کسی اور دودھ کی بھی آمیزش ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود حرمت رضاعت کا اعتبار ہوگا۔ ''اذا اختلط اللبن بالماء واللبن هو الغالب يتعلق به التحريم'' (الکتاب ۱۶۹)۔

قواعد فقہ کا ایک قاعدہ ہے: ''الضرر لايزال بالضرر''۔

اس بینک کے قائم کرنے کا مقصد ہے ان بچوں کو دودھ فراہم کرنا جو اپنی ماں کے دودھ سے محروم ہوں، کسی بھی بنیاد پر، اور یہ بات طے شدہ ہے کہ مدت رضاعت میں بچے کو انسانی دودھ اشد ضروری ہے، لہذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مغرب نے بینک کا نظریہ پیش کیا تا کہ ضرر دور ہوجائے، حالانکہ اس بینک کے وجود سے ایک دوسرا ضرر پیش آرہا ہے، اور وہ ہے اختلاط اور شک، چونکہ ان بینکوں میں مختلف عورتوں کا دودھ ایک ساتھ ملادیا جاتا ہے، اور پھر اسے محفوظ کرنے کا عمل کیا جاتا ہے، اس کا فساد تمام فقہاء پر واضح ہے اور یہ ضرر پہلے والے ضرر سے اشد ہے، نیز اسلام میں اس مصلحت کے حصول کا ایک طریقہ (مرضعہ) موجود ہے، چنانچہ اسی پر عمل کیا جائے گا۔

''درء المفاسد اولی من جلب المصالح'' (الاشباہ والنظائر ۹۰)۔

جلب مصلحت: ملک بینک کا قیام اور ان سے دودھ کا حصول ہے، اور مفسدہ کا دور کرنا ہے، حرمت رضاعت میں شک اور اختلاط سے اجتناب، لہذا مفسدہ کو دور کرنے والی شکل کو اختیار کیا جائے گا۔

ان تمام دلائل کی رو سے راقم الحروف کے نزدیک ملک بینک کا قیام جائز نہیں ہے۔

صدر قرار مجمع الفقہ الاسلامی:

۱- ''منع انشاء بنوك حليب الأمهات فى العالم الاسلامى''۔

۲- ''حرمة الرضاع منها والله اعلم'' (البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیۃ ۳۳۲)۔

نیز ان بینکوں سے دودھ حاصل کر کے بچے کو مدت رضاعت میں پلایا گیا تو حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی۔

۹- منی بینک:

منی بینک قائم کرنے کے سلسلہ میں فقہاء معاصرین کی دو طرح کی آراء ہیں:

۱- عدم جواز یہ رائے جمہور کی ہے۔

۲- جواز چند شرطوں کے ساتھ بعض فقہاء نے اس کے قیام کی اجازت دی ہے۔

''القول بتحريمه ومنعه'' (ملاحظہ ہو: المسائل الطبیۃ المستجدہ ۱/ ۲۰۳)۔

جوحضرات جواز کے قائل ہیں ان کے شرائط درج ذیل ہیں:

۱-شوہر اپنی منی کو اس بینک میں جمع کردے اور اپنی ہی بیوی کے رحم میں مدت زواج میں رہتے ہوئے منتقل کروادے۔

۲-شوہر کی منی کو ایسے برتن میں (بینک میں موجود) محفوظ کیا جائے جو اختلاط کے شبہ سے بھی پاک ہو۔

عدم جواز کے دلائل:

"ولقد خلقنا الإنسان من سلالة من طين، ثم جعلناه نطفة فی قرار مکین" (مومنون:۱۲-۱۳)۔

"ألم نخلقکم من ماء مهين فجعلناه فی قرار مکين" (المرسلات:۲۰-۲۱)۔

ان دونوں آیات میں مادہ منویہ کا ایک خاص جگہ پہنچنے کا تذکرہ ہے یعنی صلب سے رحم مادر میں اور مرد کا اپنے مادہ کو بینک میں رکھنا غیر قرار میں ہونے کی وجہ سے عمل عبث ہے۔

۱-راقم کے نزدیک مسلمانوں کی طرف سے ایسے بینک کا قیام جائز نہیں ہے، **"ان فی الغرب اصبح للبیضات المخفة بنوک......اما فی الاسلام فالتحریم"** (موسوعۃ القضایا الفقہیۃ المعاصرۃ ص ۷۲۳)۔

۲-عام حالات میں اب بینکوں میں اپنے مادہ منویہ کو رکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

۳-البتہ کوئی مجبوری کی شکل ہو مثلاً مرد کے عضو تناسل میں قوت باقی نہ رہی، لیکن اس کے مادہ میں اولاد کی صلاحیت موجود ہے اور وہ اپنی بیوی ہی کے رحم میں ان بینکوں کے توسط سے اپنے مادہ کو پہنچادیتا ہے تو جواز کے قائلین کی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے یہ عمل جائز ہوگا۔

☆☆☆

اعضاء انسانی کا عطیہ اور اس کے شرعی احکام

مولانا محمد فرقان فلاحی ☆

خون کا عطیہ:

انسان کے بدن مین خون کا مناسب مقدار میں پایا جانا اس کی صحت مند زندگی کا ضامن ہے، ورنہ اسے فساد خون یا قلت خون کی کمی پر بہت سی بیماریوں کا سامنا پڑسکتا ہے، انسانی بدن میں موجود خون ان خلیات کے مجموعہ سے وجود میاں آتا ہے جو سیال نما مادہ کی شکل میں پائے جاتے ہیں جنہیں ''پلازما'' کہا جاتا ہے، یہ پلازما تین اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے: سرخ خون کے ذرات (Red Blood Cell) جو بدن میں آکسیجن کی ترسیل کا کام کرتے ہیں، سفید خون کے ذرات (White Blood Cell) جو بیماریوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور پلیٹلیٹس (Platelets) جو زخم وغیرہ لگنے کی صورت میں خون کے بہاؤ کو روکتے ہیں، پھر ہر انسان کے بدن میں موجود خون ایک ہی قسم کا ہوا ایسا نہیں ہے بلکہ کبھی کسی شخص کا خون دوسرے سے مختلف ہوتا ہے تو کبھی ایک جیسا بھی ہوتا ہے، خون کی ان مختلف قسموں کو ہم ''بلڈ گروپ'' کے نام سے جانتے ہیں۔

ایک عالمی تحقیقاتی ادارہ کے مطابق اکتوبر ۲۰۱۲ء تک خون کے ۳۳ بنیادی گروپ تشخیص کئے گئے ہیں، خون کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی بدن میں خون کی مقدار انسان کے مجموعی وزن کے سات فیصد کے بقدر ہوتی ہے، جب کہ ایک متناسب الاعضاء بالغ انسان کے بدن میں پانچ لیٹر خون ہوتا ہے، اور خون کی اس مقدار میں 45 فیصد خالص خون ہوتا ہے، 54.03 فیصد پلازما ہوتا ہے اور 0.7 فیصد سفید ذرات ہوتے ہیں (دیکھئے: ویکی پیڈیا Blood and Blood Groups)۔

خون سے متعلق اس تفصیل کو ذکر کرنے کا مقصد اس کی اہمیت وافادیت کو بتانا ہے کہ انسان کی زندگی کو رواں دواں رکھنے میں اس کا کتنا اہم کردار ہے، اور اس کی مطلوبہ مقدار میں کمی واقع ہوجانے کی صورت میں انسان کس قسم کے مسائل سے دوچار ہوسکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

☆ فاضل المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

میڈیکل سائنس اور اس کی ترقی یافتہ نئی دریافتوں کے نتیجہ میں اب ایک ضرورت مند انسان کے بدن میں کسی دوسرے انسان کا خون منتقل کرنا ممکن ہوگیا ہے اور دنیا بھر کے بڑے چھوٹے ہسپتالوں میں یہ بات عام ہوگئی ہے، البتہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ اور پھر اگر دونوں افراد کے دین ومذہب الگ اور جدا ہوں تو کیا اس کی اجازت رہے گی؟ یقیناً یہ مسائل قابل غور ہیں، اس سلسلہ میں کچھ لکھنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہوگی کہ مذہب اسلام نے انسانیت کی فلاح و بہبود کی غرض سے زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی مکمل رہنمائی فرمائی ہے، جو چیزیں انسانیت کے لئے مفید ہیں انہیں حلال قرار دیا اور جو مضر ونقصان دہ ہیں انہیں حرام قرار دیا، قرآن وحدیث میں اس کی دسیوں مثالیں موجود ہیں، اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جو عہد رسالت میں موجود نہیں تھے تو ان کے حل کے لئے شریعت اسلامیہ نے اجتہاد واستنباط کا دروازہ کھلا رکھا تاکہ ان مسائل کو بھی شریعت کی رہنمائی میں حل کیا جاسکے۔

اس پس منظر میں خون کے عطیہ کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس بارے میں دو پہلو قابل توجہ ہیں: اول تو یہ کہ خون کو اللہ تعالی نے قرآن پاک میں حرام قرار دیا ہے، اور جب وہ حرام ہے تو اس سے استفادہ کرنا جائز و درست نہیں ہوگا، لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خود قرآن کریم ہی میں اللہ رب العزت نے مجبوری واضطرار کی حالت میں بقدر ضرورت حرام اشیاء سے انتفاع کی اجازت دی ہے۔ نیز قواعد فقہیہ **"الضرورات تبيح المحظورات"** اور **"الضرورة تتقدر بقدرها"**، **"الضرر يزال"** بھی اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ضرورتاً ہونے پر ممنوع شئی کا ایک محدود حد تک استعمال درست ہوا کرتا ہے تاکہ وہ ضرورت پوری ہوسکے، خون کا عطیہ کرنا اور ضرورت کے وقت ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنا ظاہری بات ہے ایک بڑی ضرورت ہے، بسا اوقات مریض کی جان صرف اس وجہ سے چلی جاتی ہے کہ وقت پر اسے خون نہیں مل سکا تھا، یا کبھی اسے ایسا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہوسکتی ہے، لہذا کسی مستحق مریض کی جان بچانے یا اسے کسی بڑی بیماری سے بچانے کی غرض سے خون کا عطیہ کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہوگا، پھر چاہے وہ مریض مسلم ہو یا غیر مسلم ہو اس کے جواز پر اختلاف مذہب کی وجہ سے کوئی اثر نہیں پڑے گا، خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من استطاع منكم أن ينفع أخاه فليفعل" (مسلم عن جابر بن عبد اللہ برقم ۲۱۹۹، کتاب السلام، باب استحباب الرقیۃ) کہ تم میں سے جو شخص اپنی کسی بھائی کو بھلائی پہنچا سکتا ہو تو اسے ایسا کر لینا چاہئے، اس روایت میں جو عموم ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ بلا لحاظ ملت و مذہب ہر انسان کو دوسرے انسان کی مدد ونصرت کے لئے تیار رہنا چاہئے، اور جب ابن آدم ہونے کے

ناطے تمام انسان آپس میں بھائی ہیں تو مذہب کی تبدیلی کی وجہ سے عطیہ خون کے مسئلہ میں حکم کو مختلف قرار دینا مناسب نہیں ہوگا، البتہ ایسے شخص کو خون کا عطیہ دینا درست نہیں ہوگا جو دین اسلام کا مخالف ومعاند ہو اور اس کا صحت یاب ہونا اسلام و اہل اسلام کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہو، کہ اس صورت میں یہ دشمن اسلام کی مدد کرنا ہوگا جس سے قرآن نے روکا ہے، ”**ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان**“، ہاں اگر اس صورت میں بھی اس بات کا امکان ہو کہ وہ غیر مسلم شخص اسلامی تعلیمات سے اور اسے خون کا عطیہ دینے والے مسلمان شخص کے حسن اخلاق سے متاثر ہوکر ایمان قبول کرسکتا ہے تب شاید اس کی اجازت رہے گی۔

ان سب کے علاوہ ایک اہم بات جس کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ عطیہ خون کے سلسلہ میں ضرورت اسی وقت متحقق ومعتبر ہوگی جبکہ ماہر وحاذق ڈاکٹر کے مطابق مریض کو خون نہ ملنے کی صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہو یا کسی عضو کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو یا پھر بیماری میں شدت ہونے کا ڈر ہو، کہ ان حالات ہی میں مریض کی ضرورت کو معتبر مان کر اس کے لئے خون کا عطیہ کرنا درست ہوگا۔

بلڈ بینک اور بلڈ ڈونیشن کیمپ:

عطیہ خون ایک انفرادی شکل ہوتی ہے جس کا تذکرہ اوپر کی سطروں میں گزرا، اس کی ایک دوسری شکل اجتماعی ہوتی ہے کہ بہت سارے افراد مل کر خون کا عطیہ دیں، جو بسا اوقات ایسی اجتماعی ضرورت کے تحت ہوتا ہے جو کسی حادثہ یا بیماری کے سبب وجود میں آتی ہے یا مستقبل میں کسی ضرورت مند مریض کو خون نہ ملنے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے اس مقصد سے رضا کارانہ طور پر ہوتا ہے، اور اس مقصد کی تکمیل وتشہیر کے لئے کسی اہم مناسبت سے مختلف مقامات پر عطیہ خون کے کیمپ بھی لگائے جاتے ہیں، اس اجتماعی عطیہ خون کی اہمیت وافادیت کا اندازہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے موقع سے ہوا جس میں بکثرت زخمی فوجیوں کی جان بچانے کی خاطر انہیں خون چڑھایا گیا، اسی طرح اسپین کی خانہ جنگی (1939-1937) کے موقع پر بھی خون کو کثیر مقدار میں محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی، جبکہ دوسری جنگ عظیم میں خون کے عطیہ کی ضرورت اور بڑھ گئی اور ایک اندازہ کے مطابق صرف لندن شہر میں دو لاکھ ساٹھ ہزار خون جمع کر کے زخمیوں اور مریض میں منتقل کیا گیا (دیکھئے: دکتور اسماعیل مرحبا کی کتاب: البنوک الطبیۃ البشریۃ واحکامہا الفقہیہ/ ۲۲۴)۔

اس بارے میں اگر شرعی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ہے، کیونکہ شریعت کا مزاج بھی یہی ہے کہ مستحقین کی مدد کی جائے اور یہ کیمپ بھی اسی مقصد کے تحت لگائے جاتے ہیں، نیز یہ رائے رکھنا غلط نہ ہوگا کہ فقہ اسلامی میں ایک باب ”سد ذرائع“ کا بھی ہے کہ ایسے بہت سارے کام جو مستقبل میں نقصان دہ ثابت ہوسکتے ہیں شریعت

اسلامیہ ابتداء ہی میں ان پر روک لگا دیتی ہے، تو جب مستقبل کا خیال کرتے ہوئے نقصان دہ کاموں پر روک لگائی جاسکتی ہے تو مستقبل میں فائدہ مند ثابت ہونے والے کاموں کی اجازت ہونی چاہئے۔

اس سوال کی ایک کڑی بلڈ بینک ہے، عطیہ خون سے حاصل ہونے والے خون کو بگڑنے اور جمنے سے پہلے اسے محفوظ کرنے کی غرض سے بہت سارے ہسپتالوں میں اس کا خصوصی حصہ ہوتا ہے یا مستقل ادارہ کی شکل ہی میں بلڈ بینک قائم کئے جاتے ہیں، جن میں سے بعض رضا کارانہ طور پر خون کے عطیات جمع کرتے ہیں اور مریضوں کو مفت میں خون فراہم بھی کرتے ہیں، اس شکل میں کوئی حرج نہیں، بعض ادارے مفت میں خون ضرور فراہم کرتے ہیں لیکن اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ مریض کا کوئی رشتہ دار وغیرہ اس بلڈ بینک کا عطیہ کرے تا کہ کسی اور مریض کو بھی فائدہ ہو سکے، اس دوسری صورت میں بھی کوئی حرج نہیں کہ اس شرط لگانے کا مقصد بھی انسانیت کی خدمت ہی ہے۔

البتہ بلڈ بینک کا خون کی تجارت کرنا یعنی صحت مند لوگوں کو معاوضہ دے کر ان سے خون حاصل کرنا اور پھر اسے کسی مریض اور مستحق انسان کے ہاتھوں قیمتا فروخت کرنا کیسا ہے؟ اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں: ایک پہلو تو یہ ہے کہ خون حرام شئ ہے جس کی خرید وفروخت درست نہیں، پھر چونکہ انسانی خون جزو انسان ہونے کی بناء پر قابل احترام شئ ہے جس کی خرید وفروخت کرنا اس کی توہین کے مرادف ہے، نیز یہ کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے کہ وہ انہیں فروخت کرنے کا بھی مجاز ہو، بلکہ وہ صرف ولی اور ذمہ دار ہے کہ اپنے اعضاء کا غلط استعمال نہ کرے، ان باتوں کے پیش نظر کسی بھی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا خون قیمتا فروخت کرے اور نہ کسی بلڈ بینک کے لئے روا ہے کہ وہ لوگوں کو قیمتا اپنا خون بیچنے پر ابھارے، جبکہ اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بلڈ بینک خون کے عطیات جمع کرنے کے بعد انہیں کیمیکلز کے ذریعہ فلٹر کرتے ہیں پھر انہیں مخصوص درجہ حرارت میں محفوظ رکھا جاتا ہے جس میں یقینی طور پر کچھ نہ کچھ خرچ تو آتا ہی ہے، اس لئے اگر کوئی بلڈ بینک کسی مریض کو خون فراہم کرتا ہے اور اس خون کی حفاظت وغیرہ پر ہونے والے خرچ کے بقدر رقم لیتا ہے تو اس کی اجازت ہونی چاہئے، البتہ اس صورت میں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہوگا کہ یہ رقم کس چیز کی وصولی جارہی ہے، آیا اس خون کی یا اس پر ہونے والے خرچ کی، رہی بات بلڈ بینک سے خون کے خریدنے کی، تو اگر کسی مریض کو خون کے نہ ملنے کی صورت میں جان کا خطرہ ہو یا کسی بڑی بیماری کا ڈر ہو اور بلاعوض کے خون نہ مل رہا ہو تو مجبوری کی وجہ سے بلڈ بینک سے خون کا قیمتا خریدنا درست ہوگا کہ اب یہ صورت اضطرار کے درجہ کو پہنچ گئی ہے جس میں شریعت خود اجازت دیتی ہے۔

نادر گروپ کے خون کا عطیہ:

پچھلی سطروں میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اب تک خون کے ۳۳ گروپ دریافت ہو چکے ہیں، جس سے یہ بات

سمجھ میں آتی ہے کہ مریض کوجس گروپ کا خون مطلوب ہے اسی گروپ کا خون اسے دیئے جانے میں اس کی شفایابی ممکن ہے ورنہ اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوسکتا ہے، ویکی پیڈیا کے مطابق ان تمام بلڈ گروپس کے علاوہ دوسو سے بھی زائد بلڈ گروپ ایسے ہیں کہ اگر ان کے مریض میں خون منتقل کرنے کے دوران بے احتیاطی برتی جائے تو ایسا کرنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے، ان بلڈ گروپس کو Rare Blood Types یعنی خون کی نادر اقسام کے نام سے جانا جاتا ہے(دیکھئے: ویکی پیڈیا Rare Blood Types)اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھیں کہ اگر کوئی مریض ایسا ہو کہ جس کا خون کسی ایسے گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو کمیاب اور نادر ہو اور وہ ایسی حالت میں ہو کہ اگر اسے خون نہ ملے تو یا تو جان جاسکتی ہے یا کوئی عضو تلف ہوسکتا ہے یا ناقابل تلافی نقصان ہوسکتا ہے، اور اسی گروپ کے خون والا کوئی صحتمند شخص موجود ہو جو اسے خون دینے کے موقف میں ہو تب اس کے لئے واجب ہوگا کہ وہ اس کی جان بچانے کی غرض سے اسے خون دے، فقہاء کرام نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے:"**مالایتم الواجب الا به فهو واجب**"، کہ کسی واجب کی ادائیگی جس امر پر موقوف ہوگی اس امر کی ادائیگی بھی واجب سمجھی جائے گی، کسی انسان کی جان بچانا اور اس کے اسباب مہیا کرنا انسانیت کا ہی تقاضہ نہیں بلکہ مزاج شریعت کے عین موافق ہے اور کتب فقہ میں اس کی دسیوں نظیریں موجود ہیں، اور جب ظاہری اسباب کے درجہ میں کسی انسان کی جان کا بچنا کسی مخصوص شخص سے متعلق ہوجائے تب اس کے لئے ضروری ہوجائے گا کہ وہ اپنی حد تک اس کی پوری کوشش کرے کہ یہی اسلام کا درس ہے۔

جگر کا عطیہ:

انسانی بدن کے اندرونی اعضاء میں سب سے بڑا عضو جگر ہے جو غیر مساوی مقدار کے چار گوشوں پر مشتمل ہوتا ہے، انسانی جگر کا وزن عموماً ایک کلو چوالیس گرام سے لے کر ایک کلو چھیاسٹھ گرام تک ہوتا ہے، یہ بدن میں پیٹ کے اوپری حصہ میں دائیں جانب واقع نچلی پسلیوں کے پیچھے اور سینہ و پیٹ کو جدا کرنے والے ہڈیوں کے ڈھانچہ کے بالکل نیچے واقع ہوتا ہے، طبی تحقیقات کے مطابق اگر کسی انسان کا جگر اپنی کارکردگی بند کردے تو وہ چوبیس گھنٹے سے زائد زندہ نہیں رہ سکتا ہے، اس کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ انسانی بدن میں صرف نظام ہضم کی کارکردگی ہی کو قابو میں نہیں رکھتا ہے، بلکہ انسانی بدن کو غذا میں شامل ہوکر اندر پہونچنے والے زہریلے مواد سے بھی محفوظ رکھتا ہے، ساتھ ہی ساتھ پروٹین کو مرتب کرنے اور انسانی بدن کے لئے نقصان دہ اشیاء کے اثرات کو ختم کرنے یا ان کی تاثیر کو بدلنے کا بھی کام کرتا ہے(دیکھئے: ویکی پیڈیا/Liver)۔

اور جگر کی پیوندکاری کی ضرورت کا احساس ٹائم آف انڈیا میں شائع ہونے والے ایک مضمون سے ہوسکتا ہے جس

کے مطابق صرف ہندوستان میں سالانہ تقریبا دو لاکھ افراد جگر کی بیماریوں کی وجہ سے وفات پاتے ہیں (دیکھئے: Timesofindia.indiatimes.com/aboutorgandonation.cms)۔

میڈیکل سائنس کی موجودہ ترقی سے قبل جگر کی پیوندکاری ناممکن ہی نہیں بلکہ ناقابل تصور تھی، پھر جب یہ ممکن ہوا تو اس کی شکل یہ تھی کہ عطیہ کیا گیا جگر برف کے ساتھ کم از کم چار سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر رکھ کر محفوظ کیا جاتا تھا، مگر اس طریقہ پر بھی جگر کو زیادہ سے زیادہ بیس گھنٹے تک ہی رکھنا ممکن تھا، لیکن اب آکسفورڈ یونیورسٹی اور کنگس کالج اسپتال کی ایک ٹیم نے مل کر Organ OX Metra نامی ایک مشین ایجاد کی ہے جو بدن سے باہر نکالے گئے جگر کو ۲۴ گھنٹے تک اس کے تمام افعال کے ساتھ متحرک رکھ سکتی ہے، جبکہ امید کی جارہی ہے کہ اس مشین کی مدد سے جگر کو ۲۷ گھنٹوں تک بدن سے باہر محفوظ رکھا جاسکے گا (دیکھئے: ویکی پیڈیا Liver transplantation اور وائس آف امریکہ میں شائع نصرت شبنم کا مضمون: جگر کی پیوندکاری میں ایک انقلابی اقدام، مورخہ 18-03-2013)۔

کسی مریض کی جان بچانے کی غرض سے جگر کے عطیہ کا مسئلہ دو طرح سے قابل غور ہے: اول تو یہ کہ جس انسان کی قریبی وقت میں وفات ہوئی کیا عطیہ کی نیت سے اس کا جگر نکال لینا درست ہوگا؟ کیونکہ جس طرح زندہ انسان قابل احترام ہے، اسی طرح ایک انسان اپنی وفات کے بعد بھی قابل احترام ہی رہتا ہے، خود حدیث پاک: "**کسر عظم المیت ککسرہ حیا**" (ابوداؤد عن عائشۃ رضی اللہ عنہا برقم: ۳۲۰۷ کتاب الجنائز) سے تائید ہوتی ہے، بعض علماء کرام نے اسی بات کو بنیاد بنا کر عطیہ اعضاء کی مختلف شکلوں کو ممنوع قرار دیا ہے کہ یہ حرمت انسانی کے خلاف ہے، لیکن غور کرنے پر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ حالت اضطرار میں جس طرح اکل میتہ کی اجازت ہے بلکہ بعض فقہاء کے مطابق مستقبل قریب میں اگر مضطر کو کھانا نہ ملنے کا امکان ہو تو اس میتہ سے ادخار کرنے کی بھی اجازت ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ حالت اضطرار میں ایک میت انسان کے بدن کے بعض اعضاء سے استفادہ کی گنجائش نہ ہو۔

دوسری بات جو بلڈ بینک، آئی بینک اور عطیہ جگر کی غرض سے قائم کئے گئے اداروں سے متعلق کہنا ہے، وہ یہ کہ اگر چہ فی الحال کسی کو خون کی یا آنکھ اور جگر وغیرہ کی ضرورت نہیں لیکن مستقبل میں اس کی ضرورت پڑسکتی ہو تب بھی اسے حالیہ ضرورت کے درجہ میں سمجھ کر اس کا عطیہ کرنا درست سمجھا جائے گا، علامہ عزالدین بن عبدالسلام لکھتے ہیں:

"......**لما غلب وقوع هذه المفسدة جعل الشرع المتوقع كالواقع، والشرع قد يحتاط لما يكثر وقوعه احتياطه لما يتحقق وقوعه**" (دیکھئے: قواعد الاحکام فی مصالح الأنام، فصل فی اجتماع المصالح مع المفاسد ۱/۱۸۷ المکتبہ شاملہ) کہ بسا اوقات شریعت اسلامیہ امور متوقعہ کو امور واقعہ کا درجہ دے دیتی ہے، تو ایسے اعضاء انسانی جو میت کو اب کسی

صورت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچانے والے ہیں لیکن اگر انہیں محفوظ کر کے رکھ لیا جائے تو مستقبل میں ان کی وجہ سے کسی مستحق مریض کی زندگی بچنے کی امکانات ہوں تب ان کے عطیہ کی گنجائش ضرور ہونی چاہئے، کہ میت کے اعضاء مٹی میں رل مل جائیں اس سے تو بہتر یہی ہے کہ کسی مسلم یا غیر مسلم شخص کے کام آجائیں، اگر وہ مسلم ہو تو عبادت وغیرہ کر کے اپنی عاقبت سنوار لے گا اور غیر مسلم ہو تو بہت ممکن ہے اسلام قبول کر لے۔

لہذا میت کے وہ اعضاء جو اس کی وفات کے بعد بھی کچھ دیر تک حیات رکھتے ہوں اور انہیں محفوظ کیا جانا ممکن ہو، انہیں عطیہ کرنے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔

آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بینائی اللہ تعالی کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، یہی وجہ ہے کہ اعضاء انسانی میں سے کسی اور عضو سے محرومی پر انسان کی آزمائش پر وہ بشارت نہیں ہے جو آنکھوں سے محرومی پر ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے:"إن الله قال: إذا ابتليت عبدي بحبيبتيه فصبر عوضته منهما الجنة–يريدعينيه" (بخاری عن انس رضی اللہ عنہ، برقم ۵۳۲۹ کتاب المرضی، باب فضل من ذہب بصرہ) نابینا ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ کوئی انسان مادرزاد نابینا ہو اس کا کوئی علاج نہیں، جبکہ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بیماری یا حادثہ کی وجہ سے بصارت مفقود ہو گئی ہو تو ایسی صورت میں آج کے دور میں اس کا علاج ممکن ہے اور دنیا کے مختلف علاقوں میں ہو بھی رہا ہے، اور وہ اس طرح سے کہ کسی دوسرے انسان کی آنکھ کا قرنیہ نکال کر اس نابینا شخص کی آنکھ میں منتقل کر دیا جائے جس کی وجہ سے وہ دوبارہ دیکھنے کی صلاحیت پا لیتا ہے۔

اس مسئلہ میں دو پہلو قابل غور ہیں: اول تو یہ کہ کیا زندہ شخص کا اپنی کسی آنکھ کا قرنیہ کسی نابینا کو عطیہ کرنا اور یہ سوچنا کہ ہمارا کام تو ایک آنکھ سے بھی ہو سکتا ہے درست ہوگا؟ بہت ممکن ہے کہ اس کے اس جذبہ کو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر درست سمجھا جائے لیکن شرعی اعتبار سے ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ انسان اپنے بدن کے اعضاء کا مالک نہیں ہے کہ وہ اپنے اعضاء میں سے کوئی عضو جس کو چاہے عطیہ کر دے، دوسرا سبب یہ کہ مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ کسی ضرر و نقصان کی تلافی کے لئے اسی قسم کا یا اس سے بڑا ضرر و نقصان برداشت نہیں کیا جائے گا "الضرر لا يزال بضرر مثله"، لہذا ایک زندہ شخص کا اپنی کسی آنکھ کے قرنیہ کا کسی اور مریض کو عطیہ کرنا یقیناً ایک ضرر کو اسی کے مانند ضرر سے دفع کرنے کے مماثل ہے جسے درست قرار نہیں دیا جائے گا اور اس کی اجازت نہ ہوگی۔

البتہ ایک شکل میں اس کی اجازت دی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی انسان کسی انسان کی آنکھ پھوڑ دے یا اس کی کسی حرکت کی وجہ سے کوئی انسان اپنی بصارت سے محروم ہو جائے، تب اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ تعدی کرنے

والے شخص کی آنکھ کا قرنیہ نکال کر اس مظلوم شخص کی آنکھ میں لگا دیا جائے، اس لئے کہ شریعت کے قانون ''العین بالعین'' کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ظالم کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور مظلوم جس تکلیف کا سامنا کر رہا ہے وہ اسے بھی محسوس ہو، تو آنکھ کے بدلہ آنکھ پھوڑنے سے بہتر یہی ہوگا کہ اس ظالم کی آنکھ کا قرنیہ نکال کر مظلوم کو لگا دیا جائے تا کہ اس کی تعدی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی تلافی بھی ہو جائے اور ظالم کو سبق بھی مل جائے۔

دوسرا پہلو اس مسئلہ کا یہ ہے کہ قریبی وقت میں فوت شدہ انسان کی آنکھوں کے قرنیے نکال کر محفوظ کر لینا اور انہیں کسی مستحق مریض کی آنکھوں میں منتقل کرنا کیسا ہے؟ اس سلسلہ میں وہی بات کہنا مناسب ہوگا جو جگر کے عطیہ کے بارے میں کہی گئی ہے کہ میت کے وہ اعضاء جو قابل استعمال ہوں اور ان سے استفادہ ممکن ہو بایں معنی کے وہ کسی مریض کی زندگی کا سہارا بن سکتے ہوں تو انہیں عطیہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح آنکھوں کے عطیہ کی غرض سے قائم کئے گئے آئی بینک کو میت کی آنکھوں کا اس نیت سے عطیہ کرنا کہ کسی مریض کو بصارت مل جائے گی درست ہوگا کہ یہ کسی مریض کو اسباب حیات کی فراہمی کی ایک شکل ہے، اور ''**ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا**'' کے مفہوم میں داخل ہے، کیونکہ اس آیت کے مفہوم میں جہاں مکمل حیات کو بخشنا شامل ہے وہیں اسباب حیات کا بخشنا بھی شامل ہے۔

البتہ واضح ہو کہ زندہ انسان کا آئی بینک میں اپنی آنکھوں کا عطیہ کرنا جائز نہیں ہوگا۔

عطیہ اعضاء میں کسی کی اجازت معتبر ہوگی؟

اعضاء انسانی کے عطیہ کے سلسلہ میں یہ سوال نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ کسی عضو کے عطیہ کرنے میں کس کی اجازت کا اعتبار ہوگا؟ خود میت کی یا اس کے ورثہ کی یا پھر دونوں کی اجتماعی اجازت معتبر ہوگی؟ اس مسئلہ کی متعدد شکلیں ہو سکتی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- میت نے اپنی حیات ہی میں اجازت دی ہو اور ورثہ نے بھی اجازت دے دی ہو۔

۲- میت نے تو اجازت دی تھی لیکن ورثہ اجازت نہ دیں۔

۳- نہ میت نے اجازت دی ہو نہ ہی ورثہ اجازت دیں۔

۴- میت نے تو اجازت نہیں دی تھی لیکن ورثہ اجازت دیں۔

۵- میت کی اجازت کا علم نہ ہو لیکن ورثہ اجازت دیں۔

۶- میت کی اجازت کا علم نہ ہو اور ورثہ اجازت نہ دیں۔

۷- میت کی اجازت کا علم نہ ہو اور بعض ورثہ اجازت دیں اور بعض نہ دیں۔

۸-میت کی اجازت کا علم نہ ہو اور اس کا کوئی وارث نہ ہو۔

۹-میت لاوارث شخص ہو جس کی کوئی شناخت اور پہچان موجود نہ ہو۔

ان تمام حالات میں فقہاء معاصرین میں خود کافی اختلاف ہے کہ کس کی اجازت معتبر ہوگی اور کب معتبر ہوگی، البتہ ان تمام صورتوں میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ جن حالات میں میت کے اعضاء کی دیگر مستحق مریضوں کو کوئی شدید ضرورت نہ ہو ان حالات میں کسی کی اجازت کا اعتبار نہیں ہوگا اور میت کے اعضاء کو نکالنا درست نہیں ہوگا کہ یہ احترام انسانیت کے خلاف اور کرامت انسانیہ کے مغایر ہے، البتہ اگر حالات ایسے ہوں کہ میت کے اعضاء کسی مریض کی زندگی کے لئے سبب بن سکتے ہوں تب حالت اضطرار کو بنیاد بنا کر ضرورت کے تحت میت کے اعضاء نکالنے کی اجازت ہوگی، اور اس ضرورت کا تعین اسی وقت ہوگا جبکہ ماہر طبیب اور علوم شرعیہ سے گہری واقفیت رکھنے والا عالم یا مفتی اس کی تصدیق کرے، ورنہ عام حالات میں اس کی اجازت نہیں ہوگی، اس سلسلہ میں مفصل بحث کے لئے دکتور اسماعیل مرحبا کی ''البنوک الطبیۃ البشریۃ وأحکامہا الفقہیہ'' اور عارف علی عارف القرہ داغی کی ''قضایا فقہیہ فی نقل الأعضاء البشریۃ'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

انسانی دودھ بینک کا قیام اور اس کی تجارت:

سائنسی علوم کی حیرت انگیز تحقیقات نے انسانیت کے لئے بعض ایسے مسائل بھی پیدا کر دیئے ہیں جو مذہبی اعتبار سے پریشان کن ہیں اور اخلاقی طور پر بھی گھناؤنے ہیں، ان ہی میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ انسانی دودھ کو مال تجارت کی شکل دے کر اس سے مادی منافع حاصل کئے جائیں، اور یہی نہیں بلکہ اس مقصد سے قائم کئے گئے مخصوص اداروں (ملک بینک) میں انسانی دودھ کو جمع کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے، یہ چیز مغربی تہذیب کی بگڑی ہوئی سوچ کے نتیجہ میں وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ دنیا بھر کے ترقی یافتہ و ترقی پذیر ممالک میں اس نے اپنی جڑیں پھیلا دی، ویکی پیڈیا کے مطابق ۲۰۰۵ء ہی میں دنیا بھر کے تقریباً ۳۳ ممالک میں ملک بینک کا پروگرام جاری تھا، جب کہ فی الحال صرف برازیل ہی میں ۲۱۰ ملک بینک قائم ہیں جن میں ۲۰۱۱ء میں مجموعی طور پر تقریباً ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار خواتین نے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار لیٹر دودھ عطیہ کیا جس سے کم و بیش ایک لاکھ ستر ہزار بچوں نے استفادہ کیا، یورپ میں ۲۰۳ ملک بینک قائم ہیں، اور ۲۰۱۴ء کے اختتام تک مزید ۱۳ بینک قائم کئے جانے کا منصوبہ ہے، شمالی امریکہ میں ۲۰۱۴ء تک ۱۶ بینک قائم کئے گئے جن میں ۲۰۱۳ء تک تقریباً اٹھاسی ہزار سات سو بیس لیٹر دودھ جمع کیا گیا (دیکھئے: ویکی پیڈیا Human Milk Bank)۔

سوالنامہ میں اس بات کا خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی اس نوعیت کے بینک قائم کئے جائیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۸۹ء ہی میں ممبئی کے ایک اسپتال میں ''ڈاکٹر ارمیڈا فرنانڈس'' نے ہندوستان کا پہلا ملک

بینک قائم کر دیا تھا، اور ابھی قریبی عرصہ میں ادئے پور، کلکتہ اور راجستھان میں بعض غیر حکومتی ادارے اس قسم کے بینک قائم کر چکے ہیں، ماہرین نے تو اس طرح سے حاصل ہونے والے دودھ اور اس سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ کو دیکھتے ہوئے اسے Liquid Gold (سیال سونا) تک کہہ دیا ہے (دیکھئے BBC کی رپورٹ: india's growing breast milk banking network)۔

بہت ممکن ہے کہ دیگر اعضاء انسانی کی طرح انسانی دودھ کا عطیہ اور اس کو جمع کرنے کے لئے قائم کئے گئے بینکوں کو معاشرہ میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان کی تعریف وتوصیف بھی کی جائے کہ یہ بھی ایک طرح کی انسانی خدمت ہے، لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے کیا اس کی اجازت ہوگی یہ اہم سوال ہے، بالخصوص مذہب اسلام جس میں حرمت رضاعت کو اہم بنیاد بنا کر مناکحات کے باب میں مؤثر قرار دیا گیا، کیا اس طرح دودھ کے عطیہ اور ملک بینک سے دودھ حاصل کرنے میں اس باب پر آنچ نہیں آئے گی؟

دیگر جدید مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی دو مکتب فکر ہیں، بعض حضرات نے انسانی دودھ کی تجارت اور اس کے بینک کے قیام کی اجازت دی ہے تو بعض نے اسے حرام قرار دیا ہے اور دونوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں، دراصل اس اختلاف کی بنیادی وجہ یہ بات ہے کہ رضاعت کب معتبر سمجھی جائیگی؟ جو حضرات محض دودھ پینے کو رضاعت قرار دیتے ہیں انہوں نے ملک بینک کے قیام کی مخالفت کی ہے کہ یہ ایک بڑے مفسدہ کا سبب بنے گا اور اس کی وجہ سے رضاعی رشتوں میں اختلاط کا اندیشہ بڑھ جائے گا، ان حضرات کی دلیل وہ تمام آیات وروایات ہیں جن میں رضاعت کو سبب حرمت نکاح بتایا گیا ہے، جبکہ بعض حضرات رضاعت کو اسی وقت مؤثر سمجھتے ہیں جبکہ کوئی شیر خوار بچہ کسی خاتون کے پستان سے براہ راست دودھ پیئے، ورنہ اس کے علاوہ دیگر صورتوں کو وہ مؤثر نہیں گردانتے۔

لیکن اگر مقصد رضاعت اور مزاج شریعت کو دیکھیں تو یہ بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ رضاعت کا مقصد بچہ کی نشو ونما اور اس کی غذا کا سبب بنتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہڈیوں کی پختگی اور گوشت کی نشو ونما کا سبب بننا ہی رضاعت کا مفہوم ہے:

"**لارضاع إلا ما شد العظم وأنبت اللحم**" (ابوداؤد عن ابن مسعودؓ برقم: ۲۰۵۹، کتاب النکاح، باب فی رضاعۃ الکبیر)، ایک دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے:

"**لا يحرم من الرضاع إلا ما أنبت اللحم وأنشز العظم**" (مسند احمد عن ابن مسعودؓ برقم: ۴۱۱۴)، جبکہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: "......**فإنما الرضاعة من المجاعة**" (بخاری عن عائشہؓ برقم ۲۵۰۴، کتاب الشہادات، باب الشہادۃ علی الأنساب

والرضاع)،اور رضاعت کا یہ مقصد جیسے پستان سے پیئے گئے دودھ سے حاصل ہوتا ہے ویسے ہی ملک بینک سے حاصل شدہ دودھ کو پینے سے بھی حاصل ہوتا ہے،توجس طرح وہاں رضاعت کو مؤثر مان کر اس کے احکام نافذ کئے جاتے ہیں اسی طرح یہاں بھی وہی احکام نافذ کئے جائیں گے۔

دوسری بات یہ کہ شریعت اسلامیہ کے مقاصد میں سے جہاں ایک مقصد حفظ جان ہے وہیں دوسرے مقاصد میں سے حفظ نسل وحفظ دین بھی ہے، ملک بینک کے قیام کی اجازت دینے کے لئے ممکن ہے کہ حفظ جان کو سبب و بنیاد بنایا جائے، لیکن وہیں اس کی اجازت دینے کی صورت میں حفظ نسل وحفظ دین کا مقصد فوت ہورہا ہے،مزید یہ کہ شیرخوار بچہ کی جان بچانے کی غرض سے کسی متبادل کا انتظام کیا جاسکتا ہے جیسے کسی جانور کا دودھ یا تبرعا ورنہ اجرت لے کر دودھ پلانے والی خواتین وغیرہ،لیکن باقاعدہ اس کو تجارت کی شکل دے کر خواتین سے دودھ حاصل کر کے اسے جمع کرنا اور پھر فروخت کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہوگا،کہ اس سے مستقبل میں کئی مفاسد پیدا ہونے کا امکان ہے۔

ہاں ایک ممکن شکل یہ ہے کہ کوئی ادارہ متعدد خواتین کے رابطہ نمبر محفوظ کرلے اور ضرورت پڑنے پر ان میں سے کسی خاتون سے رابطہ کر کے اسے دودھ پلانے پر آمادہ کرلے اور وہ مفت میں یا کچھ اجرت لے کر دودھ پلادے تو اس کی اجازت رہے گی، اس صورت میں بھی اس ادارہ کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ دودھ پلانے والی اس خاتون کا اور جس بچہ کو اس نے دودھ پلایا ہے اس کا مکمل نام، پتہ اور ضروری تفصیلات محفوظ رکھے اور فریقین بھی ان تفصیلات سے واقف ہوں تاکہ مستقبل میں کوئی مشکل پیش نہ آئے، نیز ایک مسلمان ہونے کے ناطہ ہر مسلمان کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ضرورتمند افراد کا تعاون کرنے میں فراخدلی کا مظاہرہ کریں تاکہ کسی مسلم بچہ کو کسی غیر مسلم خاتون کا دودھ پلانے کی نوبت نہ آئے، اسی طرح اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ دودھ پلانے والی خاتون کسی مرض وغیرہ میں تو مبتلا نہیں کہ اس کی اثر بچہ میں بھی آسکتا ہے، اس طرح کا اہتمام کرنے کی صورت میں یہ سہولت ہوگی کہ ضرورت مند بچوں کو ضرورت بھی پوری ہوجائے گی اور حرمت رضاعت کا مسئلہ بھی پیش نہ آئے گا۔

مادہ منویہ کے بینک:

اللہ تعالی نے قرآن پاک میں اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا اعلان فرمادیا ہے کہ وہ جسے چاہتے ہیں زنانہ اولاد سے نوازتے ہیں، تو جسے چاہتے ہیں نرینہ اولاد عطا کرتے ہیں، اور کسی کسی کو دونوں دے دیتے ہیں تو کسی کو بانجھ بنا کر اسے کچھ بھی نہیں دیتے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے واضح فرمادیا ہے کہ اولاد عطا کرنا یہ اسی کا وصف امتیازی ہے، سائنسی ترقیات

نے انسانیت کو اس موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے کہ ایک جانب تو خود انسان اپنے ہاتھوں سے اولاد کی نعمت کو ضائع کر دیتا ہے اور جیتے جاگتے حمل کو ساقط کر دیتا ہے، تو دوسری جانب ایک دوسرا انسان ماں یا باپ بننے کی خوشی حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کر لیتا ہے اور اس کی خاطر دولت کے دہانے کھول دیتا ہے، اسی حصول اولاد کی خواہش نے یہ دن بھی دکھائے کہ مرد کے مادہ منویہ کو عورت کے بیضوں کو محفوظ کرنے کی غرض سے مستقل Sperm Bank یعنی مادہ منویہ کے بینک قائم کئے جا رہے ہیں اور مغربی ممالک کی اندھی تقلید کرتے ہوئے ہندوستان میں بھی ایسے ادارے قائم کئے جا رہے ہیں، جہاں پیسوں کے بدلہ یا تبرعا مادہ منویہ اور عورت کے بیضہ جمع کئے جاتے ہیں اور ضرورت مند افراد کو قیمتاً فراہم کئے جاتے ہیں۔

مذہب اسلام کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک اہم امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسلام انسانی نسل کے تحفظ اور اس کی شناخت کی حفاظت پر زور دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر اس شکل اور صورت سے روکا ہے جو نسلی شناخت کو متاثر کرتی ہو، زنا کی اور عہد جاہلیت میں رائج متعہ و نکاح استبضاع کی حرمت، حالت حمل میں نکاح کی ممانعت اور اس جیسے احکام اس بات کی دلیل ہیں، زمانہ ترقی پا کر گویا اسی دور کی طرف جدید تبدیلیوں کے ساتھ لوٹ آیا ہے کہ یہ سب چیزیں نئے لباس میں دوبارہ عود کر آئی ہیں، آج کے دور میں مادہ منویہ کے بینک سے استفادہ کرنے کے متعدد اسباب ہیں، جیسے کوئی موروثی بیماری یا مادہ منویہ میں حیات کا نہ ہونا، یا خاتون کے بیضہ میں تولیدی صلاحیت کا مفقود ہونا وغیرہ جن کی وجہ سے ایک مرد باپ بننے اور ایک عورت ماں بننے سے محروم ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس فطری خواہش کی تسکین کی خاطر کوئی ایسا قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتے جو دین و مذہب سے دور اور انسانیت کے ماتھے پر داغ ہوتا ہے۔

چونکہ شریعت اسلامیہ نے اس پر پہلے ہی روک لگا دی ہے، لہذا اس قسم کے اداروں سے بیضہ کا یا مادہ منویہ کا خریدنا یا انہیں بیچنا جائز نہیں ہوگا، کہ اس کی اجازت دینے سے اختلاط فی النسب کا جو عظیم مفسدہ پیش آئے گا اس کی تلافی ممکن نہ ہوگی، البتہ کچھ شکلیں ایسی ہیں جن میں مادہ منویہ یا بیضہ کو جمع کرنے والے اداروں سے استفادہ کی گنجائش ہوگی، وہ شکلیں یہ ہیں:

۱- میاں بیوی دونوں اولاد چاہتے ہوں لیکن فطری طور پر اولاد کا حصول کسی عذر کی بنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں مرد کے لئے اپنا مادہ منویہ محفوظ کروانے اور اسے اپنی ہی بیوی میں منتقل کروانے کی اجازت ہوگی۔

۲- بیوی کسی ایسے بیماری میں مبتلا ہو کہ اس کے صحت یاب ہونے میں ایک طویل مدت درکار ہو اور شوہر کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ اتنی مدت تک اس میں قوت تولید باقی رہے گی یا نہیں، اور وہ مستقبل میں اپنی بیوی کے لئے اپنا مادہ منویہ محفوظ کروانا چاہتا ہو تو شاید اس کی گنجائش رہے۔

۳-بعض آپریشن ایسے ہوتے ہیں جو براہ راست مرد کی قوت تولید پر اثر انداز ہوتے ہیں، کہ بسا اوقات آپریشن کے بعد تولیدی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مادہ منویہ متاثر ہوجاتا ہے کہ وہ تولید کے قابل نہیں رہتا ہے، ایسی صورت میں بھی آپریشن سے قبل شوہر کا اپنا مادہ منویہ اس نیت سے محفوظ کروالینا کہ اگر مستقبل میں اس کی ضرورت محسوس ہو تو اس کی بیوی میں منتقل کیا جاسکے، تو شاید اس کی بھی گنجائش رہے گی۔

البتہ ان تمام صورتوں میں اس مادہ منویہ کو محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں ہر ممکن احتیاط کا برتا جانا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ خلط ملط نہ ہوجائے اور کسی قسم کا شبہ نہ پیدا ہو، اس بارے میں مزید تفصیلی گفتگو کے لئے ڈکتور اسماعیل مرحبا کی کتاب ''البنوک الطبیۃ البشریۃ وأحکامہا الفقہیۃ'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔

گذشتہ تمام ابحاث کے خلاصہ کے طور پر یہی بات کہنا مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی نے انسان کے بہت سے مسائل کو حل کردیا یا انہیں آسان کردیا لیکن دوسری جانب اسی ترقی نے اسے اخلاقی انحطاط بلکہ اخلاقی تنزل کی شاہراہ پر بھی لگادیا ہے کہ ہر سمت سے نئے نئے فتنوں کا مقابلہ ہے، اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے بالعموم اور علوم اسلامیہ کا حامل ہونے کی حیثیت سے بالخصوص ہم سب کی دینی واخلاقی ذمہ داری ہے کہ ایسے تمام مسائل میں امت اسلامیہ کی رہنمائی ورہبری کریں کہ یہی کار نبوت تھا اور یہی مقصد رسالت تھا۔

☆☆☆

چوتھا باب

مختصر تحریریں

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور شرعی احکام

مفتی شبیر احمد قاسمی☆

سوالات کے جوابات سے قبل تین باتیں بطور تمہید سمجھنا ضروری ہے:

ا-''ماکول اللحم حیوانات'' کے اعضاء سے علاج:

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق میں انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اور انسان جس طرح تمام مخلوق میں سب سے زیادہ اشرف مخلوق ہے، اسی طرح انسان کا ایک ایک عضو بھی انتہائی محترم ہے؛ اس لئے شریعت نے انسانی اعضاء اور اجزاء کی حفاظت کے لئے وسیع ترین انتظام فرمایا ہے، اور انسانی اجزاء اور اعضاء کی حفاظت کے لئے دیگر تمام مخلوق کو انسان کے استعمال کے لئے خادم اور آلہ بنایا ہے، یہاں تک کہ سانپ، بچھو کو بھی انسانی اعضاء کی حفاظت کے لئے بطور علاج استعمال کی گنجائش دی گئی ہے، اسی نقطہ نظر سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں ارشاد فرمایا ہے: ''هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۹) (اللہ تعالیٰ وہ پاک ذات ہے جس نے روئے زمین کی ہر چیز کو تمہاری منفعت کے لئے پیدا فرمایا)، لہٰذا تمام نباتات اور جمادات کو اعضائے انسانی اور اجزائے انسانی کی افزائش اور صحت کے لئے بطور علاج استعمال میں لانا بلاشبہ جائز ہے۔

اب رہے حیوانات، تو حیوانات میں سے ماکول اللحم اور حلال جانوروں کو انسانی اعضاء کی افزائش کی غرض سے استعمال کرنا بلا تکلف جائز ہے اور جن اشیاء کو انسانی اعضاء کی افزائش کے لئے بطور خوراک استعمال کرنا جائز ہے، ان کو بطور علاج استعمال کرنا بھی بلا تردد جائز ہے۔

اب رہا ان ماکول اللحم جانوروں کے فضلات کا استعمال، تو ان جانوروں کے فضلات میں سے دودھ کا استعمال بھی بالاتفاق جائز ہے؛ لیکن انسانی اعضاء کی منفعت کے لئے بطور علاج پیشاب کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں حضراتِ ائمہ ثلاثہ اور امام محمدؒ کے نزدیک چونکہ ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب پاک ہے؛ اس لئے بطور علاج ان جانوروں کا

☆ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مرادآباد۔

پیشاب استعمال کرنا ان کے نزدیک بلا تردد جائز ہے؛ لہٰذا ان کے قول کے مطابق ''آیورویدک دوائیں'' جن میں گائے کا پیشاب پڑتا ہے، ان کا استعمال کرنا بلا تکلف جائز ہے؛ لیکن اس کے برخلاف حضرات شیخین کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب پاک نہیں ہے؛ بلکہ نجاست خفیفہ ہے، اس شدید ضرورت کے وقت بطور علاج بھی ان کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اور حضرت امام ابویوسفؒ کا قول ہے کہ اگر ماہر تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم نے اس میں شفا ہونے کی تائید کی ہو تو ضرورت اور مجبوری کے وقت بطور علاج ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اسی پر حنفیہ کا فتویٰ ہے۔

۲-غیر ماکول اللحم حیوانات کے اعضاء سے علاج:

غیر ماکول اللحم جانوروں کے اعضاء کو انسانی اعضاء کی افزائش کے لئے بطور خوراک استعمال کرنا باتفاق فقہاء جائز نہیں ہے؛ لیکن ان کے اعضاء کا انسانی اعضاء کی حفظانِ صحت کے لئے بطورِ علاج استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو 'الضَّرُورَاتُ تُبِيحُ المَحظُورَات'' کے اصول کے مطابق بطورِ علاج غیر ماکول اللحم جانوروں کے اعضاء کو استعمال کرنا مجبوری کے تحت جائز اور درست ہے، یہاں تک کہ سانپ کا پتہ اور بچھو کا تیل وغیرہ یہ سب انسانی اعضاء کی حفظانِ صحت کے لئے خارجی استعمال میں لانا بلاشبہ جائز ہے، یعنی اعضاء کے اوپر لیپ اور مالش کرنے کے طور پر استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہے، مگر داخلی استعمال علی الاطلاق جائز نہیں ہے؛ بلکہ آیت قرآنی: ''فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ'' (المائدۃ:۳) کے پیش نظر انتہائی ضرورت اور مجبوری میں حرام جانوروں کے اعضاء کو بطور علاج داخلی استعمال میں لانے کی بھی گنجائش ہے، یعنی انتہائی مجبوری میں جان بچانے کی غرض سے علاج کے طور پر منہ کے راستہ سے استعمال کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

۳-انسانی اعضاء کا استعمال:

انسانی اعضاء کو انسان کی حفظانِ صحت کے پیش نظر استعمال میں لانے کا مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور یہ مسئلہ انتہائی اہم بھی ہے اور بہت زیادہ حساس بھی ہے، اس مسئلہ پر قلم اٹھانے سے پہلے بہت زیادہ غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے، پچھلے سمیناروں میں انسانی اعضاء اور اجزاء کے موضوع پر بحث ہو چکی ہے اور اعضاء کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:

انسان کے وہ اجزاء جن میں کمی زیادتی کی وجہ سے انسانی ساخت میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا ہے، وہ اجزاء دوسروں کی ضرورت کے لئے کسی طرح کا عوض اور قیمت لئے بغیر دینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ خون بغیر عوض لئے کسی متعین شخص کو

فوری ضرورت کے تحت دینے کی گنجائش ہے، جس پر علماء نے اتفاق کرلیا ہے، اسی طرح کسی بچہ کی ماں کا دودھ نہیں نکل رہا ہے، تو دوسری عورت اس متعین بچہ کو اپنی پستان سے دودھ پلاسکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ جس بچہ کو دودھ پلایا جائے، اس کا اسی طریقہ سے دھیان رکھا جائے جیسا کہ اپنے بچہ کو یاد رکھا جاتا ہے؛ اس لئے کہ دودھ پلانے کی وجہ سے اس بچہ کے ساتھ حرمت مصاہرت کا تعلق ہو چکا ہے۔

دوسری قسم کے اجزاء:

انسان کے وہ اجزاء جن میں کمی زیادتی کی وجہ سے انسانی ساخت میں فرق آجاتا ہو جیسا کہ آنکھ، کان، ہاتھ، انگلیاں وغیرہ ظاہری اجزاء ہیں، اسی طریقہ سے گردے، دل جگر، معدے، آنت اور پھیپھڑے وغیرہ یہ سب انسان کے وہ اندرونی اعضاء ہیں جن میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی صورت میں اندرونی طور پر قدرتی ساخت میں فرق آجاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کے دو قسم کے اعضاء ہیں: ایک ظاہری اور بیرونی ہیں، دوسرے داخلی اور اندرونی ہیں، تو انسان کی قدرتی ساخت کی بقا کے لئے دونوں قسم کے اعضاء کا اپنی اپنی جگہ پر باقی رہنا لازم اور ضروری ہے، اور ان بیرونی اور داخلی اجزاء کی حفظان صحت کے لئے آیت کریمہ: ''هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَا فِیْ الْاَرْضِ جَمِیْعًا'' (سورۂ بقرہ:۲۹) کے پیش نظر نباتات و جمادات کے ساتھ ساتھ دیگر حیوانات کو بھی بطور علاج استعمال کرنے کی کسی نہ کسی درجہ میں گنجائش ہے؛ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک انسانی اعضاء کا بڑا مقام ہے اور ان میں سے ایک ایک عضو کی طاقت وصحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوق کو پیدا کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے انسان اور اس کے اعضاء کو کس قدر اعزاز واحترام کا مقام دیا ہے، اسی لئے قرآن وحدیث میں کہیں بھی انسانی اعضاء کو دوسری مخلوق کے لئے یا خود انسان کے لئے استعمال کی اجازت کی بات نہیں کہی گئی ہے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد اصل سوالات کے جوابات پیش خدمت ہیں:

انسانی خون کا عطیہ:

مذکورہ اصولوں کے پیش نظر زیر بحث سوالات کے جوابات کو سمجھنا ہے:

۱- اضطراری حالات میں کسی انسان کا دوسرے انسان کو خون کا عطیہ دینا بالاتفاق جائز ہے، نیز ضرورت بمعنی حاجت جس کو ضرورت کا دوسرا درجہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر خون نہ چڑھایا جائے تو سخت مشقت اور دشوار کن حالات سے دو چار ہونا پڑے گا، تو ایسی ضرورت کی وجہ سے بھی اگر چہ کلمہ کفر یہ زبان پر جاری کرنا، مردار کھانا جائز نہیں ہے، مگر خون وغیرہ چڑھانا اور خون کا عطیہ لینا اور دینا بھی جائز ہے۔

۲- سوال نمبر۲ کا جواب یہ ہے کہ حاجت کے درجہ میں جو ضرورت ہوتی ہے اس ضرورت کی وجہ سے خون کا عطیہ کرنا جائز تو ہے؛ لیکن ضرورت مند شخص کا متعین اور متشخص ہونا بھی لازم ہے، مثلاً کسی متعین شخص کو ایمرجنسی طور پر خون کی سخت ضرورت ہے، تو اس متعین شخص کو خون کا عطیہ کرنا جائز ہے؛ لیکن اگر ضرورت مند شخص متعین نہیں ہے اور نہ ہی فی الحال ضرورت مند شخص کا وجود ہے؛ بلکہ آئندہ کبھی کسی شخص کو ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لئے پیش قدمی کرتے ہوئے اس کے لئے پہلے ہی سے خون جمع کر کے رکھنے کی بات ہے، تو یہ ایک امکانی چیز ہے، زیادہ سے زیادہ ظن غالب ہے تو ایسی صورت میں یہ محض ایک امکانی چیز ہے جو ضرورت بمعنی اضطرار اور ضرورت بمعنی حاجت دونوں میں سے کسی ایک کے بھی دائرہ میں نہیں آتی؛ اس لئے آئندہ ضرورت پیش آنے کے تصور کے ساتھ بلڈ بینک میں رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دینا جائز نہیں ہوگا۔

۳- اس تصور کے ساتھ بلڈ بینک قائم کرنا اور اس میں رضا کارانہ طور پر خون جمع کرنے کے لئے لوگوں کو دعوت دینا اور بلڈ بینک میں خون جمع کرنا اور وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت میں کیمپ لگوا کر جمع کروانا، تاکہ برادران وطن پر اس کا اچھا اثر مرتب ہو جائے شرعی طور پر جواز کے دائرہ میں نہیں آتا؛ اس لئے کہ برادران وطن پر اچھا اثر مرتب کرنے کے بہت سے مراتب ہو سکتے ہیں۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلڈ بینک میں رضا کارانہ طور پر خون جمع کرنے کے ذریعہ سے جو اچھا اثر مرتب ہوتا ہے، یہ ضرورت کے کس درجہ میں آتا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ ضرورت کے پہلے درجہ بمعنی اضطرار میں نہیں آسکتا، اسی طرح ضرورت کا دوسرا درجہ بمعنی حاجت کے درجہ میں بھی قطعاً نہیں آسکتا، ہاں البتہ ضرورت بمعنی منفعت کے دائرہ میں آسکتا ہے، اور اس درجہ کی ضرورت کے لئے انسانی اجزاء یعنی خون وغیرہ کو رضا کارانہ طور پر دینا جائز نہیں ہے۔

۴- اگر ایمرجنسی طور پر کسی مریض کو خون کی سخت ضرورت ہو اور اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ملتا ہو، تو اس گروپ کا خون جس شخص میں موجود ہو اس کو اپنا خون دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، نہ اس پر اپنا خون دینا واجب ہے، نہ لازم ہے، ہاں البتہ اگر اس کو اپنی صحت متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہو تو اخلاقاً شخص معین کو ایمرجنسی طور پر خون کا عطیہ پیش کر دینا اس کے لئے صرف مستحب اور افضل ہے، لازم یا واجب نہیں ہے۔

۵- جگر کی پیوند کاری اور اس کا عطیہ:

سوال نمبر۵ میں جو شکل لکھی گئی ہے کہ مردہ انسان کا جگر انسانی اعضاء میں ایسا اہم ترین اور مرکزی عضو ہے کہ انسان کا دیگر کسی عضو کے بغیر زندہ رہنا ممکن ہے، مگر جگر کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں، جب مرنے کے بعد اس اہم ترین اور مرکزی عضو کو

نکال کر دوسرے کو دے دیا جائے یا آئندہ ضرورت پڑنے پر دوسرے کو دینے کے لئے نکال کر رکھ لیا جائے تو مرنے والا انسان ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے انسانی ڈھانچہ کی شکل میں باقی ہے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے دفن کیا جائے گا؛ لیکن حقیقت میں اس انسان کا اصلی عضو اس میں باقی نہیں ہے، تصویر کی شکل میں ظاہری ڈھانچہ ہے، حقیقی عضو اس میں باقی ہی نہیں رہتا؛ اس لئے مرنے کے بعد بھی کسی بھی انسان کے جگر نکال لینے کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم سب کا حکم یکساں ہے اور اس میں مرنے سے پہلے مرنے والے کی اجازت یا اس کے وارثین کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں ہے؛ اس لئے قیمتاً، تحفۃً، ہدیۃً کسی بھی اعتبار سے کسی انسان کا جگر نکالنا جائز نہیں ہے۔

لہٰذا جدید میڈیکل ترقی کرنے والے سائنسدانوں کو بجائے انسانی اعضاء کے ذریعہ سے یہ کام لینے کے دیگر حیوانی اعضاء کے ذریعہ سے یہ کام لینے کا تجربہ کرنا چاہئے؛ اس لئے کہ دیگر حیوانات کے اعضاء کے ذریعہ اگر پیوندکاری ہوتی ہے، تو شریعت کی طرف سے اس پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں ارشاد فرمایا ہے: ''هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِيْ الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۹) اس آیت کریمہ کی رو سے انسان کے علاوہ کسی بھی حیوانی عضو کو انسانوں کے استعمال میں لانا جائز اور درست ہے، اس کے برخلاف انسانی عضو کو استعمال کرنا جائز نہیں جیسا کہ حسب ذیل دلائل سے واضح ہوتا ہے۔ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس موضوع پر مدلل مقالہ تحریر فرمایا ہے، جو ہم سب کے لئے حجت شرعی کا درجہ رکھتا ہے۔

دلائل ملاحظہ فرمائیے:

''ابوداؤد شریف'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''اعضائے انسانی کا احترام حالتِ حیات میں جس طرح لازم ہوتا ہے، مرنے کے بعد بھی اسی طرح لازم ہوجاتا ہے''۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

''عن عائشة –رضى الله عنها– أن رسول الله ﷺ قال: كسر عظم الميت ككسره حيا'' (سنن أبي داود، النسخة الهندية ۲/ ۴۵۸، رقم: ۳۲۰۷)۔

اس کو حضرات فقہاء نے بہت واضح الفاظ سے نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ایک ایک عضو کو محترم بنایا ہے، اسی احترام کا تقاضہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور محفوظ طریقہ سے اسے دفن کیا جاتا ہے۔ صاحب بدائع نے اس مسئلہ کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

''ولو سقط سنه يكره أن يأخذ سن ميت فيشدها مكان الأولى بالإجماع، وكذا يكره أن يعيد

تلک السن الساقطة مکانها عند أبي حنیفة ومحمد، ولکن یأخذ سن شاة ذکیة، فیشدها مکانها'' (بدائع الصنائع، زکریا ۴/ ۳۱۶)۔

اور'' مبسوط'' کے اندر الفاظ کے فرق کے ساتھ مزید وضاحت فرمائی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''**ألا تری! أن شعر الآدمي لا ینتفع به إکراماً للآدمي بخلاف سائر الحیوانات، وإن غائط الآدمي یدفن وما ینفصل من سائر الحیوانات ینتفع به**'' (المبسوط للسرخسي ۱۵/ ۱۲۵)۔

اور'' ہندیہ'' میں اسی کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے کہ انسانی اجزاء سے انتفاع اس کی کرامت اور احترام کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

''**الإنتفاع بأجزاء الآدمي لم یجز، قیل: لکرامة هو الصحیح، کذا في جواهر الأخلاطی**'' (ہندیہ ۵/ ۳۵۴، زکریا)۔

مذکورہ تمام دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی انسان کے جگر جو مرکزی عضو ہے اس کو دوسروں کے واسطہ نکالنا جائز نہیں۔

۶-'' آئی بینک'' (آنکھوں کا عطیہ):

سوال نمبر ۶ میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ دوسرے کی آنکھ کے ذریعہ سے نابینا کی آنکھ میں روشنی آجاتی ہے؛ اس لئے فوری مرنے والے شخص کی آنکھ کو فوری طور پر نکالی جائے، تاکہ دوسرے نابینا شخص کے کام آجائے۔ سوال ۷ میں یہ پوچھا گیا ہے کہ جگر یا آنکھ حاصل کرنے کے لئے مرنے والے کی وصیت یا ورثاء کی اجازت ضروری ہوگی اور اس کام کے لئے آئی بینک قائم ہونے کا ذکر آیا ہے، دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے کہ: اس سلسلہ میں سب کو معلوم ہے کہ آنکھ انسان کے اعضاء میں سے اہم ترین عضو ہے، ایک آنکھ کے دینے کی وجہ سے انسان کی وہ ساخت باقی نہیں رہتی ہے، جس کو قدرت نے انسان کے وجود کے لئے اور اس کی ضرورت کے لئے بنایا ہے؛ اس لئے ماقبل میں ذکر کردہ اصول کے مطابق مرنے والے آدمی کی آنکھ نکال کر دوسرے کے استعمال کے لئے رکھ لینا آئی بینک میں یا کسی متعین شخص کو فوری طور پر دے دینا شرعاً جائز نہیں ہے، چاہے مرنے والے نے مرنے سے پہلے اپنی آنکھ دوسروں کو دینے کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، دونوں صورتوں میں جائز نہیں ہے، اسی طرح اس کے وارثین کی اجازت سے بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ انسان کے اعضاء انتہائی محترم ہیں متبذل نہیں (مستفاد: جواہر الفقہ ۷/ ۵۷)۔

اور سوال نامہ میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ کوئی زندہ شخص جس کی دونوں آنکھیں صحیح ہیں، وہ رضا کارانہ طور پر

اپنی ایک آنکھ یہ سوچ کر دے دے کہ میرا کام ایک آنکھ سے چل جائے گا، تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اس لئے کہ آدمی خود اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے اور کسی بھی عضو میں مالکانہ تصرف بھی جائز نہیں، اس کو نہ یہ حق ہے کہ اپنے کسی عضو کو دوسرے کے ہاتھوں فروخت کر دے، یا دوسروں کو تحفہ اور ہدیہ میں دے؛ اس لئے کہ انسان خود اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہوتا، جب چاہے اس میں مالکانہ تصرف کر کے اسے فروخت کرے یا ہدیہ میں دے۔

لہٰذا دو آنکھ والا آدمی اپنی دونوں آنکھوں میں سے ایک آنکھ دوسروں کو دے دے قطعاً جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ اپنی آنکھ کا خود مالک نہیں ہے، نیز کوئی بھی سرمایہ دار اپنی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ دوسروں کو نہیں دے گا؛ لہٰذا یہ مصیبت صرف غریب اور تنگدست لوگوں پر آئے گی کہ غریب انسان اپنی تنگدستی کی وجہ سے دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ دینے کے لئے تیار ہو جائے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داروں کی دو آنکھیں ہوں گی اور غریبوں کی ایک آنکھ اور غریبوں کی آنکھوں کی دکان لگ جائے گی اور ایک آنکھ والا سرمایہ دار خریدار بن جائے گا اور دو آنکھ والا غریب آدمی بائع بنے گا، ایسا کہیں نہیں ہوگا کہ آنکھوں کے خریدار غریب آدمی بن جائیں یا کسی غریب اور تنگدست آدمی کو کسی سرمایہ دار کی آنکھ مل جائے اس کا امکان ہی نہیں ہے، شریعت کے نزدیک سارے انسان یکساں ہیں؛ اسی لئے زندہ انسان کا اپنی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ دینا جائز نہیں ہے۔

۸،۹- ''دودھ بینک'' اور اس کا عطیہ:

سوال نمبر: (۸-۹) کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ جس بچہ کی ماں کے پستان سے اس کو پیٹ بھر کر دودھ نہیں ملتا ہے اور دوسری عورت کے پستان میں دودھ زیادہ ہے، تو جس کے پستان میں دودھ زیادہ ہے اس کے پستان سے اس بچہ کو دودھ پلانا جائز اور درست ہے، جس کا پیٹ اپنی ماں کے دودھ سے نہیں بھرتا ہے، اسی طرح جس کے پستان میں دودھ زیادہ ہے، وہ اتنا دودھ نکال کر کے دوسرے متعین بچہ کو پلائے؛ لیکن ساتھ ساتھ اس کے اوپر شریعت کی طرف سے یہ حکم بھی لاگو ہو جاتا ہے کہ اس بچہ اور اس عورت کے درمیان حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے کہ اس بچہ کے لئے اس عورت کے اصول وفروع حرام ہو جاتے ہیں، اس کے اصول وفروع میں سے کسی سے وہ نکاح نہیں کر سکتا، اسی طرح اس عورت کے لئے اس بچہ کی اولادوں سے نکاح کرنا جائز نہیں، یہ ایک نازک اور حساس ترین مسئلہ ہے کہ جس بچہ کو بھی دودھ پلایا جائے گا تو دودھ پلانے والی عورت اس بچہ کے لئے حقیقی ماں کے درجہ میں ہو جاتی ہے اور آئندہ چل کر اس عورت کے کسی فروع سے اس بچہ کا نکاح ناجائز اور حرام ہوگا؛ اس لئے دودھ پلانے والی عورت اور دودھ پینے والے بچہ کا متعین ہونا لازم ہے، تاکہ آئندہ چل کر کے ناواقفیت اور بے خبری میں رضاعت کی حرمت کے باجود رضاعی بھائی بہن کا نکاح نہ ہو جائے،

شریعت میں رضاعی ماں ورضاعی باپ، رضاعی چچا، بھائی، رضاعی بھانجہ میں سے کسی کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں ہے، اور دودھ بینک میں دودھ جمع کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ حرمت رضاعت کا مسئلہ ہی نہ رہے گا اور شریعت کے قائم کردہ قانون اور ضابطہ کے ڈھانچہ کی دیوار ہی باقی نہیں رہے گی؛ اس لئے دودھ بینک میں رضا کارانہ طور پر عورتوں کے لئے اپنی پستان کا دودھ پیش کرنا جائز نہیں۔

حرمت رضاعت کے بارے میں قرآن وحدیث میں بے شمار دلائل ہیں، قرآن کی نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے، جیسا کہ ''سورۂ نساء'' آیت ۲۳ میں حرمت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ تمہارے لئے وہ مائیں حرام کردی گئیں ہیں، جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور ان بہنوں کو حرام قرار دیا گیا ہے جو از قبیل رضاعت ہیں۔

آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیے: **"حرمت عليكم (إلى قوله تعالىٰ) وامهاتكم اللاتى ارضعنكم واخواتكم من الرضاعة"** (النساء:۲۳)۔

حدیث شریف میں بے شمار روایات موجود ہیں۔ ''بخاری شریف'' کی دو روایت ہم یہاں پیش کردیتے ہیں:

''قال النبي ﷺ: في بنت حمزة: لا تحل لي يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب، هي بنت أخي من الرضاعة'' (بخاری ۱/۳۶۰، رقم: ۲۵۷۱، ف: ۲۶۴۵)۔

اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **"إن الله حرم من الرضاع ما حرم من النسب"** (سنن ترمذی، باب الرضاعۃ ۱/۲۱۷، رقم: ۱۱۵۶)۔

نیز حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کردی ہے کہ پستان سے دودھ پلانے کے طور پر دوسرے کے بچہ کو دودھ پلانا جائز ہے، مگر کسی عورت کے دودھ کو اس کی پستان سے نکال کر کے الگ سے جانوروں کے دودھ کی طرح فروخت کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، یہی حنفیہ کا مسلک ہے۔ عبارات ملاحظہ فرمائیے۔

''مبسوط سرخسی'' میں اس حکم کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

''لا يجوز بيع لبن بني آدم على وجه من الوجوه عندنا، ولا يضمن متلفه أيضا، وقال الشافعي: يجوز بيعه ويضمن متلفه ...... وحجتنا في ذلک أن لبن الآدمي ليس بمال متقوم، فلا يجوز بيعه ولا يضمن متلفه، كالبزاق، والمخاط، والعرق'' (المبسوط للسرخسي، بيروت ۱۵/۱۲۵)۔

صاحب بحر نے مزید وضاحت کے ساتھ ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے ملاحظہ فرمائیے:

''قوله: لبن امرأة بالجر، أي لم يجز بيع لبن المرأة؛ لأنه جزء الآدمي، وهو بجميع أجزائه مكرم

مصون عن الابتذال بالبیع" (البحر الرائق، زکریا ۶/ ۱۳۲، کوئٹہ ۶/ ۸۰)۔

مقالہ کا خلاصہ:

(۱) اضطراری حالات میں کسی انسان کا دوسرے انسان کو خون کا عطیہ دینا بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) اگر اضطراری حالت نہ ہو؛ لیکن ضرورت کا دوسرا درجہ ہے، یعنی ضرورت بمعنی حاجت کے درجہ میں ہے، تو ایسی صورت میں خون کا عطیہ دینا تو جائز ہے؛ لیکن ضرورت مند شخص کا متعین اور مشخص ہونا بھی لازم ہے، ایسے شخص کو ایمر جنسی طور پر خون کا عطیہ کرنا جائز ہے۔

(۳) اس تصور کے ساتھ بلڈ بینک قائم کرنا اور اس میں رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دینا کہ برادرانِ وطن پر اس کے ذریعہ سے اچھا اثر پڑے گا جواز کے دائرہ میں نہیں آتا؛ اس لئے کہ برادران وطن پر اچھا اثر مرتب کرنا ضرورت کے پہلے اور دوسرے درجہ میں داخل نہیں ہے۔

(۴) اگر ایمر جنسی طور پر کسی مریض کو خون کی سخت ضرورت ہو اور اس کا خون ایسے گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ملتا ہو اور جس شخص میں اس گروپ کا خون موجود ہو، اس کا اپنا خون دینا اس کے اوپر واجب نہیں ہے اور نہ ہی مستحب ہے؛ بلکہ صرف اباحت اور جواز کے دائرہ میں آسکتا ہے۔

(۵) جگر کا عطیہ دینا انتہائی حساس مسئلہ ہے اور انسانی اعضاء میں جگر اہم ترین اور مرکزی عضو ہے، اس کے بغیر صرف انسانی تصویر ہوسکتی ہے، وہ انسان نہیں ہوسکتا؛ اس لئے مرنے والے شخص کا اپنا جگر دینے کی وصیت کرنا یا مرنے کے بعد وارثین کی اجازت سے جگر کا عطیہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۶) آنکھوں کا عطیہ کرنا بھی شرعی طور پر جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ کوئی بھی سرمایہ دار اپنی آنکھوں کا عطیہ نہیں کرے گا، بلکہ صرف غریب اور نادار انسان روزگار کی مجبوری میں آنکھوں کا عطیہ کرنے کے لئے تیار ہوسکتا ہے، ایسے حالات میں سرمایہ داروں کی دو آنکھیں ہوں گی اور غریبوں کی ایک آنکھ اور شریعت اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔

(۷) دودھ بینک اور اس کا عطیہ یہ اس لئے جائز نہیں ہے کہ حرمت رضاعت کا مسئلہ شریعت میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اور دودھ بینک میں دودھ جمع کرنے کی صورت میں قانون شریعت کے ڈھانچہ کی دیوار ہی باقی نہ رہے گی، اور حرمت رضاعت کا مسئلہ جڑ سے ختم ہوجائے گا؛ اس لئے کہ رضاعی بھائی، رضائی ماں، رضاعی باپ، رضاعی چچا وغیرہ کی تعیین لازم ہے، تاکہ حرمت رضاعت کی رعایت کی جاسکے، اور دودھ بینک کی شکل میں یہ سارے رشتے ختم ہوجائیں گے۔

☆☆☆

اعضاء و اجزاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی☆

فضائی آلودگی، غذائی اجناس میں کیمیکل کی آمیزش اور دوسرے نت نئے اسباب ووجوہات کی وجہ سے انسانی اجسام میں امراض کثرت سے پیدا ہورہے ہیں، چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، اس لیے ان امراض کے علاج کے لیے نت نئے طریقے بھی ایجاد ہورہے ہیں، پہلے انسانی اذہان میں جن چیزوں کا تصور نہیں ہوتا تھا اور جس طرح کے علاج کے بارے میں سوچا نہیں جاسکتا تھا، آج علمی انکشافات اور سائنسی تحقیقات نے اسے آسان، مفید، کارآمد اور زندگی کی بقا کے لئے لازم قرار دیدیا ہے، بہت سارے اجزاء اور اعضاء کا علاج پیوندکاری کے ذریعہ کیا جارہا ہے، ایک کا عضو دوسرے میں لگادیا جاتا ہے اور زندگی کے ماہ وسال اسباب کے درجہ میں بڑھ جاتے ہیں، اور کم از کم مریض وقت موعود تک کے لیے آرام وعافیت محسوس کرنے لگتا ہے۔

ایک کا خون دوسرے کے جسم میں داخل کرنا، ایک عورت کا دوسرے کے بچوں کو دودھ پلانا، تو عام سی بات ہے، مغرب کی تیز ہواؤں نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا، وہاں مادہ منویہ اور بیضۃ المرأۃ تک دوسری عورت میں داخل کرنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے، ایسے میں ضرورت یہ ہے کہ ان امور کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر واضح کیا جائے تاکہ ضرورت کی بنیاد پر جو سہولتیں مل سکتی ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہوسکے۔ بحث کا آغاز اجزاء انسانی، خون، دودھ، مادۂ منویہ کے عطیہ سے کرتے ہیں، اس کے بعد اعضاء انسانی سے متعلق مسائل زیر بحث آئیں گے۔

خون کا عطیہ:

۱- خون دینا اضطراری حالت میں جائز ہے، یہ اضطرار دینے والے کو بھی لاحق ہوسکتا کہ اس کے جسم میں خون کی تولید اس قدر ہوگئی ہو کہ اس کا نکالنا اس کی صحت کے لیے ضروری ہو، ایسے میں اپنی صحت کے لیے وہ خون کا عطیہ دے سکتا ہے، ایسا

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

شاذونادر ہی ہوتا ہے، لیکن وقوع سے انکار نہیں کیا جاسکتا، فصد کھلوانے کی مشروعیت اسی بنیاد پر ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ دینے والا، حالت اضطرار میں نہیں ہے، لیکن کسی انسان کی جان بچانے کے لئے ایسا ضروری ہے اور خود دینے والے کی صحت اس کی متحمل ہے اور بادی النظر میں خون کے اس عطیہ سے معطی کی صحت کے متاثر ہونے کا امکان نہیں ہے تو اس شکل میں بھی خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے، کیونکہ خون کوئی عضو نہیں ہے اور نئے خون کی قدرتی تولید سے نکالے ہوئے خون کی تلافی ہوجاتی ہے، اس مسئلہ میں مسلم، غیر مسلم کی تفریق درست نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ کافر ہر حال میں مباح الدم نہیں ہوتا، ایسے میں معاملہ خون دینے کا صرف انسانی بنیادوں پر باقی رہتا ہے اور انسانیت میں دونوں برابر ہیں۔

۲- بینک میں خون جمع کرانا ضرورت کے اعتبار سے قبل از وقت ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، اصول یہ ہے کہ **''ما أبیح للضرورۃ یتقدر بقدرھا''** اس کی آسان شکل یہ ہے کہ جب خون کی ضرورت ہو تو بلڈ بینک جاکر اپنا خون دیدے اور اس کے بدلے میں متعلقہ گروپ کا خون لے لے۔

۳- انہیں بنیادوں پر بلڈ بینک کا قیام شرعاً درست نہیں ہوگا، کیونکہ شریعت نے جس ضرورت کا اعتبار کیا ہے وہ وقتی ہے نہ کہ مستقبل کے لیے۔

۴- اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو، لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ہی ملتا ہو اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو تو بھی خون کا عطیہ کرنا اس کے اوپر لازم نہیں ہوگا، اس خصوصی حالت میں مستحب ہوگا کہ وہ اس عطیہ کے ذریعہ ایک آدمی کی جان بچانے کی کوشش کرے۔

دودھ پلانا اور دودھ فراہم کرانا:

۸- شریعت میں انسانی اعضاء واجزاء عموماً مال متقوم نہیں ہیں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، لیکن بعض چیزوں کے بارے میں صراحت ہے کہ اس کی حیثیت یک گونہ مال متقوم کی ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے لیے اجرت لے کر دودھ پلانا جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن دودھ نکال کر اسے بیچنے کی اجازت بھی ہو، اس کے لیے کوئی جزئیہ احناف کے یہاں دستیاب نہیں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ دودھ انسان کا جز ہے اور انسان کے تمام اجزاء قابل تکریم ہیں، اس لیے اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، **"لم یجز بیع لبن المرأۃ، لأنہ جزء الآدمی وھو بجمیع أجزائہ مکرم عن الابتذال بالبیع"** (البحرالرائق ۶/ ۱۸، عالمگیری ۳/ ۱۱۴)۔

(عورت کے دودھ کی فروخت جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ وہ آدمی کا جز ہے اور وہ اپنے تمام اجزاء کے ساتھ بیع کے

ذریعہ اہانت سے بالاتر ہے)۔

سرخسی کا بیان ہے: ”**ولا يجوز بيع لبن بنى آدم على وجه من الوجوه عندنا ولا يضمن متلفه أيضا**“ (المبسوط ۱۲۵/۱۵) (عورتوں کے دودھ کا کسی بھی حال میں فرخت کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے اور اس کے تلف کرنے والے پر ضمان بھی نہیں ہے)۔

البتہ امام شافعیؒ کے یہاں دودھ کی خرید وفروخت جائز ہے؛ کیونکہ یہ غذا ہے، اس لیے دوسرے غذائی اجناس کی طرح اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی، ان کے نزدیک دودھ مال متقوم ہے؛ کیونکہ کسی چیز کا مال اور متقوم ہونا اس کے شرعا اور عرفا قابل انتفاع ہونے پر موقوف ہے اور دودھ ہر اعتبار سے قابل انتفاع ہے۔

امام سرخسی لکھتے ہیں: ”**وقال الشافعي رحمه الله : يجوز بيعه ويضمن متلفه لان هذا لبن طاهر اومشروب طاهر كلبن الانعام ولانه غذاء للعالم فيجوز بيعه كسائر الاغذية وبهذا تبين انه مال متقوم فان المالية والتقوم بكون العين منتفعابه شرعا وعرفا**“ (المبسوط ۱۲۵/۱۵) (امام شافعیؒ نے فرمایا: دودھ کی بیع جائز ہے اور اس کے تلف کرنے والے پر ضمان ہے، اس لیے کہ یہ پاک دودھ یا مشروب ہے مثل چوپایوں کے اور یہ دنیا والوں کی غذا ہے تو اس کا بیچنا دوسرے غذائی اجناس کی طرح جائز ہوگا، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ مال متقوم ہے؛ کیونکہ مالیت اور اس کا متقوم ہونا اس کے شرعا اور عرفا قابل انتفاع ہونے کی وجہ سے ہی ہوتا ہے)۔

ابن قدامہ نے جو حنبلی مسلک کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں، ترجیح اس کو دیا ہے کہ دودھ کی خرید وفروخت جائز ہے (المغنی ۱۷۷/۴)۔

احقر کا رجحان ہے کہ عورت کے دودھ کا اجرت پر پلانا تو جائز ہے، لیکن اس کو نکال کر بیچنا عورتوں کو جانور کی سطح پر لے آنا ہے، اس سے تکریم انسانیت متاثر ہوتی ہے، لہذا انسانی دودھ فراہم کرنے والے بینکوں کو ددھ بیچنا شرعا جائز نہیں ہوگا اور خواتین کے اندر کسب معاش کے بڑھتے رجحانات اور ان کا بچوں کو دودھ پلانے سے اجتناب کو شرعی عذر نہیں قرار دیا جاسکتا، نہ یہ ضرورت ہے اور نہ حاجت، خصوصا اس شکل میں جب کہ اجرت پر عورتوں کو رکھ کر دودھ پلوانا ممکن ہے۔

”**لأن الآدمى مكرم غير مبتذل فلا يجوز أن يكون شئى من أجزاء مهانا مبتذلا**“ (البحر الرائق ۷۸/۶ ہندیہ ۱۱۴/۳)۔

(آدمی شرعا قابل اکرام ہے، قابل اہانت نہیں، اس لیے اجزاء انسانی میں سے کسی جز کو مبتذل اور بے وقعت کرنا درست نہیں ہے)۔

ایسا اس لیے بھی ضروری ہے کہ بینک سے حاصل ہونے والے دودھ کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلے گا کہ کس عورت کا دودھ ہے، ایسے میں حرمت رضاعت سے متعلق بہت سارے مسئلے کھڑے ہوں گے اور اس کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ رہ گئی بات اجرت پر دودھ پلانے والی عورت کی تو وہ متعین ہوتی ہے، اور اس میں رضاعت کی تعیین آسان ہے، بہت شدید ضرورت ہو اور عورت کے لیے دودھ پلانے کے بجائے نکال کر دینا ہی ممکن ہو اور عورت کے بارے میں ساری جانکاری محفوظ کر لی جائے تو یہ شکل ضرورت کی قید کے ساتھ جائز ہو سکتی ہے۔

۹- بچوں کے حصول کی خواہش فطری ہے اور عموماً اللہ رب العزت شادی شدہ مرد و عورت کی اس خواہش کی تکمیل فرماتے ہیں، بعض جوڑے اس سے محروم رہ جاتے ہیں، جس میں خود ان کی بے احتیاطی، تاخیر سے شادی، معاشی اور سماجی فکر سے آزادی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، تاخیر کے باعث مادہ منویہ کی تولیدی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، ایک عمر کے بعد عورت کے اندر بیضۃ بننا بند ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اولاد کے حصول کے لیے لوگ پریشان رہتے ہیں، اس کے حل کے لیے مادہ منویہ اور **بیضة المرأة** کے بینک قائم ہیں، جو ضرورت مندوں کو قیمتاً یہ چیزیں فراہم کرتے ہیں۔

اسلام کی نظر میں یہ کام حلال نہیں ہے؛ کیونکہ دوسرے مرد کے مادہ منویہ کو بیوی کے رحم میں ڈالنا، زنا کے قبیل سے ہے، اس سے نسب کے مسائل کھڑے ہوتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ اور آخرت پر یقین رکھنے والے کے لیے اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی سیراب کرنا درست نہیں۔

"**لا يحل لامرئ يومن بالله واليوم الآخر أن يسقى ماءه زرع غيره**" (ابوداؤد ۱/ ۲۹۳)۔

اس نص کی موجودگی میں ایسے بینک قائم کرنا کسی مرد یا خاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورت مند مرد یا خاتون کو مادہ منویہ کا فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا قطعاً جائز نہ ہوگا۔

۵ تا ۷- انسان اپنے اعضا کا مالک نہیں ہے، اس لیے وہ اس میں کوئی ایسا تصرف کرنے کا مجاز نہیں ہے، جس سے اس کے اعضا کی تعداد گھٹ جائے یا اس عضو کے کام کرنے کی صلاحیت متاثر ہو جائے، اسی بنیاد پر اعضاء کی فروخت یا ان کا عطیہ کرنا درست نہیں ہے، خواہ معاملہ اضطرار کا ہی کیوں نہ ہو اس کی بہت ساری نظیریں فقہاء کے یہاں ملتی ہیں، فتاویٰ قاضی خاں کے حوالہ سے ہندیہ میں ہے:

"**مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع يدى وكلها أو قال اقطع منى قطعة فكلها لا يسعه ان يفعل ذالک ولا يصح امره به كما لا يسع للمضطر أن يقطع قطعة من لحم نفسه فيا كل**" (کتاب الحظر والاباحۃ ۵/ ۳۰۱۰)۔

(یعنی ایسا مضطر جو حالت اضطرار کے باوجود مردار نہ پائے جسے کھا کر وہ اپنی جان بچا سکے اور ہلاکت کا خوف ہو ایسی حالت میں کوئی آدمی اسے پیش کش کرے کہ میرا ہاتھ کاٹ کر کھا لو یا ایک لوتھڑا گوشت میرے جسم سے کاٹ کر کھا لو، تو مضطر کے لیے ایسا کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس کے لئے اس کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے ہی جسم کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر کھا لے تا کہ اس کی جان بچ جائے)۔

اس معاملہ میں شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کسی حیوان کو تکلیف پہونچائی جائے، البتہ خود اس کی ذات اس تکلیف کی متقاضی ہو تو دوسری بات ہے۔ بحر الرائق میں ہے:

”ان ایصال الألم الی الحیوان لا یجوز شرعا الالمصالح لتعود الیه“ (۲۵۵ مسائل شتی) (حیوان کو تکلیف پہونچانا سوائے اس شکل کے جائز نہیں کہ اس کے مصالح اس جانور کو ہی لوٹ جائیں)۔

یہاں پر ہمیں اس فقہی اصول کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ”الضرر لا یزال بالضرر“ (الاشباہ ۱۰۹)، (ضرر کو ضرر سے دفع نہیں کیا جائے گا)، عطیہ گردے کا ہو یا آنکھ کا، یہ بغیر ضرر پہونچائے ممکن نہیں، کبھی تو قوت وصلاحیت میں کمی ہوگی اور کبھی لاش کے چیر پھاڑ اور زندہ ہو تو آپریشن کا ضرر برداشت کرنا ہوگا، اسی بنیاد پر گردہ، جگر اور آنکھ کے قرنیہ کا عطیہ دینا درست نہیں ہوگا، اور دوسرے فقہی سیمینار کی تجویز کے مطابق اگر کسی شخص نے ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوند کاری کے لیے استعمال کیے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جا سکتا ہے اور ایسی وصیت اور خواہشیں شرعاً قابل اعتبار نہیں ہے۔

فتاویٰ رحیمیہ (۶/ ۲۸۵)، نیز فتاوی محمودیہ (۵/ ۱۷۰) میں بھی دوسرے کی آنکھ لگوانے کو ناجائز لکھا ہے، جہاں تک مردے سے اس کے اعضاء اور قرنیہ کے حصول کا مسئلہ ہے، یہ تو عرفا بھی مردے کی توہین ہے، بھلا تصور کیجئے کہ انسان حالت نزع میں ہے، اور ڈاکٹر اوزار لے کر اس کے جسم کے قطع و برید کے لیے کھڑے ہوئے ہیں، گھر والوں پر غم طاری ہے اور مرنے کے فورا بعد اس کے اعضاء کاٹے جا رہے ہیں، اس کا مثلہ کیا جا رہا ہے، اور جس جنازے کو عزت واکرام کے ساتھ دفن کیا جانا تھا وہ آپریشن تھیٹر میں آنکھ، جگر، گردہ اور اعضاء رئیسہ کو نکالنے کے لیے لے جایا گیا، اس سے بڑی اہانت مردے کی نہیں ہو سکتی۔

شریعت کا مطمح نظر اس معاملے میں اس قدر واضح ہے کہ وہ انسان کے ان اجزاء کے استعمال کو بھی پسند نہیں کرتا جس میں ضرر کا کوئی شائبہ نہیں ہے، جیسے کسی عورت کے لیے دوسرے کے بال اپنے سر میں لگانا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے جو اپنے بالوں میں دوسری عورت کے بال لگاتی ہے، ارشاد فرمایا: ”لعن الله الواصلة والمستوصلة“ (مشکوۃ شریف ۳۸۱)۔

شامی میں ہے: "**وفی الاختیار ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام سواء کان شعرها او شعر غیرها لقوله صلی الله علیه وسلم لعن الله الواصلة والمستوصلة**" (۳۲۸/۵ کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی النظر واللمس)۔

انہی بنیادوں پر حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے کہ: "اسلام نے ایک انسان کے اعضاء کو دوسرے انسان کے لیے استعمال کرنا اس کی رضامندی اور اجازت کے ساتھ بھی جائز نہیں رکھا اور نہ کسی انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا کوئی جزو دوسرے کو معاوضہ پر یا بلا معاوضہ دیدے (۴۳ جواہر الفقہ جلد دوم)۔

خصوصاً اس شکل میں جبکہ اس کا متبادل بھی موجود ہو، یہ متبادل مصنوعی اعضاء اور جانوروں کے اعضاء کے استعمال کی صورت میں ممکن ہے، اسی طرح گردوں کے خراب ہونے کی شکل میں ڈائیلاسس (مشینوں کے ذریعہ خون صاف کرنے کا عمل) جو ہیموڈائلاسس یا پیری ٹونیل ڈائیلاسس ہوسکتا ہے، اور گردے کی پیوندکاری کی بہ نسبت آسان، سہل الحصول ہے یک مشت اخراجات اس پر نہیں آتے، رہ گئی خوش گوار زندگی کے تصور کی تو اس کے بارے میں ہر دو صورت میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

پیوندکاری کے لیے اعضاء کے عطیہ کے عدم جواز کے سلسلے میں پاکسانی علماء میں مولانا یوسف بنوریؒ، مولانا رشید احمد ٹونکی، مولانا ولی حسن ٹونکی مولانا سحبان محمود، مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا عاشق الٰہی بلندشہری کی رائے بھی مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے فتویٰ کے موافق ہے، جیسا کہ جواہر الفقہ میں تصدیقات شرکاء مجلس سے معلوم ہوتا ہے، ہندوستانی علماء میں مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا شمس پیرزادہؒ، مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ، مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ، مولانا مفتی شکیل احمد ستیاپوری، مولانا تاج الدین، مفتی خلیل احمد صاحب، مولانا محمد آدم پالن پوری، وغیرہ کی رائے بھی عدم جواز کی ہے، البتہ دوسرے فقہی سیمینار میں بحث و تمحیص کے بعد عمومی عطیہ نہیں بلکہ اپنے رشتہ دار مریض کے لیے گردہ کے عطیہ کو جائز قرار دیا گیا، جس کے لیے کوئی متبادل موجود نہ ہو۔

☆☆☆

اعضاء انسانی کا عطیہ اور اسلام کا موقف

مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی☆

۱- کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو یا غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بناء پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے؟

مریض کو خون دینے کے حکم میں یہ تفصیل ہے:

(۱) جب خون دینے کی ضرورت ہو یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطر ہو، اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو خون دینا جائز ہے۔

(۲) جب ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دینے کی حاجت ہو، یعنی مریض کی ہلاکت کا خطرہ تو نہ ہو لیکن ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دیئے بغیر صحت کا امکان نہ ہو اس وقت بھی خون دینا جائز ہے، خون اگر چہ جزء انسانی ہے مگر اسکو دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کیلئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ انجکشن کے ذریعے خون نکالا جاتا ہے، اس لئے اس حیثیت سے اسکی مثال انسانی دودھ کی ہوگئی جو بدن انسانی سے کسی کاٹ چھانٹ کے بغیر نکلتا ہے اور دوسرے انسان کے بدن کا جز بنتا ہے، شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے اور بچوں کو ماں کا دودھ پلانا صرف جائز نہیں بلکہ عام حالات میں واجب قرار دیا گیا ہے۔

بچوں کے علاوہ بڑوں کیلئے بھی دواء علاج کیلئے عورت کے دودھ کو حضرات فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔

عالمگیری میں ہے: ”**ولابأس بأن یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشرب بہ للدواء**“ (عالمگیری مصری ۴/ ۱۲)۔

اس لئے جزء انسانی ہونے کی حیثیت سے اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید نہیں، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح شریعت اسلام نے عورت کے دودھ کو جزء انسانی ہونے کے باوجود ضرورت کی بناء پر بچوں کے لئے جائز کر دیا ہے، اسی طرح ضرورت کی بنا پر خون دینا بھی جائز ہو اور اس معاملہ میں مسلم و کافر کا حکم یکساں ہے، کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے۔

☆ شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ (یوپی)۔

۳-بلڈ بینک کا قیام:

ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی محمود گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں:

س:- ایک تندرست آدمی اپنا خون بینک میں جمع کرواسکتا ہے یا نہیں یا اگر کسی کی جان خطرہ میں ہو تو اپنا خون دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- حامداً و مصلیاً و مسلماً: خون کی خرید و فروخت جائز نہیں یہ بیع باطل ہے۔ اگرچہ ایسی حالت ہو کہ جان بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو مجبوراً بقدر ضرورت خون کا ایثار کرنا درست ہے۔ **فقط واللہ سبحانہ وتعالی اعلم** (فتاوی محمودیہ ادارہ ڈابھیل ۱۶/ ۸/ ۷، درمختار مع رد ۵/ ۵۱۵/ سعید، الہدایہ ۳/ ۵۰ نعیمہ دیوبند، فتاوی عالمگیریہ ۲/ ۳۳۱، بحوالہ مجمع الانہر ۳/ ۷۷، البدائع الصنائع ۶/ ۵۴۹، تبیین الحقائق ۴/ ۳۶۲، بحر الرائق ۶/ ۱۱۲، بحوالہ حاشیہ فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۷۸)۔

اگرچہ اس جواب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ناگہانی حادثات، ایکسیڈینٹ، زلزلہ وغیرہ کی ضرورت کیلئے پیشگی طور پر خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں، لیکن مستقبل کے حادثات میں ضرورت کی وہی نوعیت یقیناً سامنے آتی ہے جو حال کی ضرورت میں پیش آتی ہے، اس لئے مستقبل کی ضرورت کو حال کے درجہ میں مان کر مسلمان کے لئے بلڈ بینک میں خون کا عطیہ دینا جائز ہوگا، البتہ بلڈ بینک کی طرف سے متاثر شخص کے متعلقین سے عطیہ خون کی خواہش کرنا درست نہیں، کیونکہ عطیہ بغیر بدل ہوتا ہے اور یہ خواہش بدل کے ہم معنی ہے جو درست نہیں۔ متعلقین از خود خون کا عطیہ پیش کریں تو حرج نہیں۔

مفتی احمد صاحب خان پوری لکھتے ہیں:

''بینک میں خون جمع کرانا قبل از وقت ہونے کی وجہ سے جائز نہیں: ''**وما ابیح للضرورۃ یتقدر بقدرہ**''، حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ (مفتی دار العلوم دیوبند) نے اسکی اجازت دی ہے۔'' **فقط واللہ اعلم** (محمود الفتاوی ص ۶۷۷ ج ۵ گجرات)۔

جب بلڈ بینک میں خون جمع کرنا جائز ہوگیا تو بوقت ضرورت اس سے کام لینے کے لئے اس کی حفاظت بھی ضروری ہوگئی اور اسی سے مسلمانوں کے لئے بلڈ بینک کے قائم کرنے کا جواز بھی نکل آیا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی ترغیب پر عورتوں کا صدقہ میں بالیاں دینا بخاری شریف (ص ۲۰/ ج ۱) کی روایت میں ثابت ہے تو اسی سے کان چھدوانے کا جواز بھی ثابت ہوگیا۔

۴- کسی شخص کا دوسرے کو خون دینا محض ایک تبرع اور خالص احسان ہے، لہٰذا اس کا عطیہ دینا کسی بھی حال میں واجب نہیں ہوگا صرف مباح اور جائز ہوگا۔

۵-جگر کا عطیہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرکزِ کائنات بنایا ہے وہ ساری چیزوں سے انتفاع کا حق رکھتا ہے، لیکن وہ دوسروں کے لئے بلکہ خود اپنے آپ کے لئے مالِ منتفع یا مال متقوم نہیں ہے، کیونکہ اِس سے اس کی کرامت وشرافت اور مخدومیت داؤ پر لگ جائے گی اور یہ ارشاد ربانی ''لقد کرمنابنی آدم'' اور ''خلق لکم مافی الارض جمیعاً'' کے سراسر خلاف ہوگا۔

نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کے اعضاء واجزاء انسان کی اپنی ملکیت نہیں ہیں جن میں وہ مالکانہ تصرفات کر سکے اسی لئے ایک انسان اپنی جان یا اپنے اعضاء وجوارح کو نہ بیچ سکتا ہے نہ کسی کو ہدیہ اور ہبہ کے طور پر دے سکتا ہے اور نہ ان چیزوں کو اپنے اختیار سے ہلاک وضائع کرسکتا ہے۔ شریعت اسلامیہ کے اصول میں تو خودکشی کرنا اور اپنی جان یا اعضاء رضا کارانہ طور پر یا بقیمت کسی کو دے دینا قطعی طور پر حرام ہی ہے جس پر قرآن وسنت کی نصوص صریحہ موجود ہیں، تقریباً دنیا کے ہر مذہب وملت اور عام حکومتوں کے قوانین میں اس کی گنجائش نہیں، اس لئے کسی زندہ انسان کا کوئی عضو کاٹ کر دوسرے انسان میں لگا دینا اس کی رضامندی سے بھی جائز نہیں۔ حضرات فقہاء کی تصریحات اس کے متعلق درج ذیل ہیں:

''مضطر لم یجد میتة وخاف الھلاک فقال له رجل: اقطع یدی وکلھا، اوقال: اقطع منی قطعة فکلھا لایسعه أن یفعل ذلک ولا یصح امره به کمالایسع للمضطر ان یقطع قطعة من نفسه فیأکل''

(فتاویٰ قاضی خان ومثلہ فی اکراہ البزازیہ علی ھامش الھندیۃ ۱۱۶/۲ ومثلہ فی خلاصۃ الفتاویٰ ۳۳/۲)۔

اور شرح سیر کبیر میں ہے: **''ألاتری أنه لو ابتلی بمخمصة لم یحل له أن یتناول أحدامن أطفال المسلمین لدفع الھلاک عن نفسه''** (۲۶۹/۳، ۲۷۰ مطبوعہ دکن)۔

مگر اس وقت تک ڈاکٹروں اور سرجنوں نے بھی زندہ انسان کے اعضاء کا استعمال کہیں تجویز نہیں کیا، اس لئے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں بحث طلب دو مسئلے ہیں جو آج کل ہسپتالوں میں پیش آرہے ہیں اور جس کے لئے اپیلیں کی جارہی ہیں وہ یہ کہ جو انسان دنیا سے جارہا ہے، خواہ کسی عارضہ کے سبب یا کسی جرم میں قتل کئے جانے کی وجہ سے اس کی اجازت اس پر لی جائے کہ مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو قطع کرلیا جائے اور کسی دوسرے انسان میں لگایا جائے۔

یہ صورت بظاہر مفید ہی مفید ہے کہ مرنے والے کے تو سارے ہی اعضاء فنا ہونے والے ہیں، ان میں سے کوئی عضو اگر کسی زندہ انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے، یہ ایسا معاملہ ہے کہ عام لوگوں کی نظریں صرف اس کے مفید پہلو پر جم جاتی ہیں اور اس کے وہ مہلک نتائج نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں جن کا کچھ ذکر شروع بحث میں آچکا ہے، مگر شریعت اسلام جو انسان اور انسانیت کے ظاہری اور معنوی صلاح وفلاح کی ضامن ہے، اس

کے لئے مضر اور مہلک نتائج سے صرف نظر اور صرف ظاہری فائدہ کی بناء پر اس کی اجازت دے دینا ممکن نہیں۔ شریعت اسلام نے صرف زندہ انسان کے کارآمد اعضاء ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بیکار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے اور مردہ انسان کے کسی عضو کی قطع و برید کو بھی ناجائز کہا ہے اور اس معاملہ میں کسی کی اجازت اور رضامندی سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی اور اس میں مسلم و کافر سب کا حکم یکساں ہے، کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے، تکریم انسانی کو شریعت اسلام نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ کسی وقت کسی حال میں کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی طمع دامن گیر نہ ہو اور اس طرح یہ مخدوم کائنات اور اس کے اعضاء عام استعمال کی چیزوں سے بالاتر رہیں جن کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں اور دواؤں اور دوسرے مفادات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پر ائمہ اربعہ اور پوری امت کے فقہاء متفق ہیں اور نہ صرف شریعت اسلام بلکہ شرائع سابقہ اور تقریباً ہر مذہب وملت میں یہی قانون ہے۔

۲- آنکھ کا عطیہ:

یہ بھی انھیں دلائل سے ناجائز ہے جن کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ دوسرے کی آنکھ روشن کرنے کے لئے اپنی آنکھ کو خطرے میں ڈالنا جائز نہیں، آج نھیں تو کل امکان ہے کہ اسکی آنکھ کسی حادثہ کا شکار ہوجائے، یا بیمار ہو کر روشنی سے محروم ہوجائے تو وہ خود کس سے آنکھ کا عطیہ مانگے گا، اور اگر مل جائے بھی تو اسکے خرچ کا تحمل نہ ہونے کی صورت میں کیا کریگا، اسی کو کہتے ہیں، اندھے کے آگے رویئے اپنے نین کھویئے۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لکھتے ہیں کہ: کسی انسان کی قوت بینائی یا قوت مردمی کا نقص یا فقدان بدستور باقی رہنے میں زیادہ ضرر ہے یا یہ کہ اسکی خاطر دوسرے انسان کی تذلیل وتحقیر، قطع و برید اور آنکھیں نکالنے میں ایک شخص کے فائدہ کیلئے دوسرے کو تکلیف میں ڈالنا کس طرح جائز ہوسکتا ہے، جلب منفعت سے دفع مضرت اولیٰ ہے، یا یوں کہا جائے کہ احداثِ ضرر سے ابقائے ضرر اہون ہے (احسن الفتاوی ص ۲۷۷ ر ج ۸ دار الاشاعت دہلی)۔

(ب) کسی شخص سے اس کی موت کے بعد بھی قرنیہ حاصل کرنا جائز نہیں، اوپر حوالہ میں گذر چکا ہے۔ **والآدمی محترم بعدموته علی ماکان علیه فی حیاته ان الاتفاق علی ان حرمة المسلم میتاً کحرمته حیاً۔**

(ج) زندہ یا مردہ شخص کی آنکھ کا عطیہ آئی بینک میں دینا جائز نہیں، اسکے دلائل بھی وہی ہیں جو پیچھے لکھے جاچکے ہیں۔

۵، ۶- کسی فوت شدہ انسان کا جگر، آنکھ، دل، دوسرے انسان کے جسم میں نہیں لگا سکتے، اگر کوئی آدمی ایسی وصیت کرتا ہے جیسا کہ سوال میں درج ہے تو یہ وصیت کرنا جائز نہیں اور ناقابلِ نفاذ ہے (فتاوی محمودیہ ۳۳۶ ر ج ۱۸ ر شیخ الاسلام دیوبند)۔

"والثانی بالاتفاق وھوما إذا أوصی بما لیس قربةً عندناوعند ھم کما اذااوصی للمغنیات والنائحات" (ردالمحتار ص۶۹۶ ج۶ فصل فی وصایاالذمی، مطبوعہ سعید کمپنی)۔

(جو چیز نہ ہمارے نزدیک عبادت ہو نہ غیر مسلموں کے نزدیک اسکی وصیت کرنا بالاتفاق باطل ہے، جیسے کوئی گانے والی عورت یا مردہ پر رونے چلانے والی عورت کے لئے وصیت کرے)۔

اس سے ظاہر ہے کہ جب خود صاحب جسم اجازت نہیں دے سکتا تو اسکے وارث کی اجازت چہ معنی دارد، خلاصہ یہ کہ مردے کی اجازت معتبر ہوگی نہ وارث کی۔ یہاں واضح رہے کہ اعضاء انسانی کی پیوندکاری کی افادیت اسکی مضرتوں سے کہیں زیادہ ہے اسکے نتیجہ میں بچوں کا اغواء، خرید وفروخت قتل وغارت گری عام ہوتی جارہی ہے، اس کے علاوہ یہ طریقۂ علاج صرف مالداروں کی خواہشاتِ حیات وتعیش کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا ہے، جبکہ ایک دو فیصد بھی غریب اسکے مصارف کا تحمل نہیں کر پاتا ہے، الٹاوہ اپنی غربت کے علاج کے طور پر اپنے اعضاء کو مالِ تجارت سمجھ کر فروخت کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیوندکاری کے عدم جواز کی اصل علت تکریم انسانی ہے جسے کچھ اباحت پسند اہل علم نے حاملہ مردہ کے پیٹ سے زندہ بچہ کو چیر کر نکالنے کے جواز پر قیاس کرکے پیوندکاری کے جواز پر یہ کہہ کر استدلال کیا ہے: **"لانّ فیه احیاء الآدمی فترک تعظیمهٖ أھون من مباشرة سبب الموت"** (کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے کہ آدمی کی تعظیم وتکریم کے تقاضے کو چھوڑ دیا جائے) (علامہ سمرقندی، تحفۃ الفقہاء ص ۳۴۳ ج ۳ جدید فقہی مسائل ص ۷۷ ج ۵)۔

اس قیاس میں ایک کمزوری یہ ہے کہ یہ نصِ قرآنی کے مقابلہ میں قیاس ہے لہذا اسکا اعتبار نہیں ہوگا، دوسرے یہ کہ ایک انسان کی جان بچانے کے لئے لاکھوں کی جانوں کا خطرہ پیدا کرنا درست نہیں ہوسکتا اس قیاس پر مفتی رشید احمد صاحب کی تنقید بھی قابلِ غور ہے۔

(۱) اس قیاس سے تو صرف جواز قطع المیت بلکہ شق المیت ثابت ہوا نہ کہ استعمال جزء کا جواز۔

(۲) شق المیت بھی احیاء نفس کے لئے ہے نہ کہ محض تداوی کے لئے۔

(۳) یہ حادثہ نجات دلانے کے قبیل سے ہے جو مضطر کے اکل میتۃ کی طرح فرض ہے جبکہ تداوی فرض نہیں۔

(۴) علاوہ ازیں یہ بھی تولید کا ایک متبادل طریق ہے (احسن الفتاوی ص ۲۷۵ ج ۸ دارالاشاعت دیوبند)۔

اور یہاں تک تو صرف تکریم انسانی کو نظرانداز کرنے کی بات تھی مگر اس سے آگے بڑھ کر بعض فقہاء کی جرأتِ رندانہ کو کیا کہئے کہ انھوں نے تو احترام قرآن کو بھی نظرانداز کردیا۔ یہی علامہ سمرقندی لکھتے ہیں:

"والذی رعف فلا یرقاء دمه فارادان یکتب ذمه علی جبهتهٖ شیأًمن القرانٰ، قال

ابوبکرؒیجوز،وقیل له لوبہ کتب بالبول قال لوکان شفاء لابأس به قیل لوکتب علی جلدِ میتة قال ان کان منه شفاء جاز"(خلاصۃ الفتاوی ص ۳۶۱ ج ۴)۔

(جس شخص کونکسیر ہواور خون بند نہ ہوتا ہووہ اپنے خون سے اپنی پیشانی پر قرآن کا کوئی حصہ لکھنا چاہے تو ابوبکر کہتے ہیں کہ جائز ہے، ان سے سوال کیا گیا اگر پیشاب سے لکھے، تو کہا، اگر اس سے شفاء ہوتی ہوتو کوئی حرج نہیں، ان سے سوال کیا گیا، اگر مردار کے چمڑے پر لکھے تو کہا شفاء ہو جائز ہے)(جدید فقہی مسائل ص ۷۷ ج ۵)۔

مجوزین کے گیارہ دلائل جواز کے رد میں حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ کی تنقیدات ملاحظہ فرمالی جائیں تو عدم جوازِ پیوندکاری پر علمی تشفی ممکن ہے یہ رسالہ" توقیع الاعیان علی حرمتہ ترقیع الانسان" کے نام سے" احسن الفتاوی" کے (ص ۲۷۰ سے ۲۸۶ تک ج ۸) میں شامل ہے۔

۸- ملک بینک کا شرعی حکم:

معاوضہ دیکر بچوں کو دودھ پلوانے کا جواز قرآن مجید سے ثابت ہے،" فإن أرضعن لكم فأتوهنّ أجورهنّ وإن تعاسرتم فسترضع له اخرى"(سورۃ الطلاق آیت ۶)(اگر تمہاری بیویاں تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو تم ان کو ان کی اجرت دو(اگر وہ مطالبہ کریں) اور اگر ان کے مطالبہ کے مطابق تم نہ دے سکو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائیگی)۔

خود رسول ﷺ نے اجرت پر حلیمہ سعدیہ کا دودھ پیا۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی دایہ کو اجرت پر لینا درست ہے۔ چنانچہ علامہ عمرانی شافعی لکھتے ہیں:" وان استاجرامرأة علی ارضاع صبی صحت الاجارہ"(البیان ص ۳۱۷ ج ۷، مواھب الجلیل ص ۵۷۵ ج ۷، المغنی ص ۲۷ ج ۸ المدونۃ الکبری ص ۴۱۲ ج ۳)۔

اگر کسی عورت کو بچہ کو دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھا تو یہ عقد اجارہ صحیح ہے۔

اسی سے دودھ کی فروخت کا جواز بھی ثابت ہوگیا۔ اسی کے ساتھ فقہاء کے نزدیک متفقہ مسئلہ ہے کہ دودھ پلانے کی حرمت کا تعلق صرف ماں کی چھاتی سے نہیں ہے بلکہ اگر وہ کسی برتن میں دودھ نکال کر پلائے تب بھی حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی، جیسے آج کل چوسنی سے پلانے کا رواج عام ہے۔

"کمایحصل الرضاع بالمص فی الثدی یحصل بالوجور" (اور جس طرح رضاعت پستان سے چوسنے سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح وجور (چوسنی جیسی چیز) سے پینے میں ثابت ہوجاتی ہے)(خانیہ علی ھامش الھندیہ ص ۴۱۶ ج ۱، فتاویٰ ھندیہ ص ۳۴۴ ج ۱، بدائع الصنائع ص ۴۰۸ ج ۳)۔

اس سے دودھ بینک کو دودھ کی فروختگی یا عطیہ دینے کا جواز بھی ثابت ہوسکتا ہے لیکن حرمت رضاعت کے سلسلہ

میں اس سے جو مشکلات پیش آئینگی ان کو سامنے رکھتے ہوئے اس سسٹم کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہور فقہاء نے ثبوتِ حرمتِ رضاعت کا دائرہ اتنا وسیع الجہات کر دیا ہے کہ تمام جہتوں کو معلوم کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے، ان حضرات کی دلیل حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے: "**لارضاع الاماانشز (وفی روایه شد) العظم وابنت اللحم**" (ابوداؤد حدیث ۲۰۵۹ و ۲۰۶۰، سنن بیہقی ص ۲۶۰، ۴۶۱ ج ۷، سنن دار قطنی حدیث ۴۳۱۵، مسند احمد ص ۴۳۲ ج ۱)۔

معتبر ہر وہ رضاعت ہے جس سے ہڈی مضبوط ہو اور گوشت پیدا ہو (یعنی غذا کا کام کرے)۔

اسی سے فقہاء نے استنباط کیا ہے کہ اگر ناک یا حلق کے راستے دودھ ٹپکایا جائے اس سے بھی رضاعت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح تغذیہ فراہم ہوتا ہے (البحر الرائق ص ۲۲۱ ج ۳، ردالمحتار مع الدر المختار ص ۲۰۹ ج ۳، مواہب الجلیل ص ۲۲۴ ج ۳ و ص ۴۱۹ ج ۲، معنی المحتاج ص ۴۱۴ ج ۷، کشاف القناع ص ۴۲۲ ج ۵، المغنی لابن قدامہ ص ۳۱۰، ۳۱۱ ج ۱۱)۔

البتہ امام لیث اور اصحاب ظواہر کے نزدیک اس معاملہ میں تنگی ہے، امام لیث کا کہنا ہے کہ اسی رضاعت کا اعتبار ہے جو براہ راست چھاتی سے بچہ دودھ پئے۔ اہل ظاہر کا مسلک بھی یہی ہے (المحلی لابن حزم ص ۱۸۶ ج ۱۰ دار الکتب العلمیہ، احکام ومسائل ص ۲۱۷)۔

چونکہ دودھ بینک میں عموماً یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کس عورت کا دودھ ہے اس سے خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کوئی اپنی رضاعی بہن، رضاعی خالہ، پھوپھی بلکہ رضاعی ماں سے نکاح نہ کر بیٹھے، اور اس طرح حرمت رضاعت کا قرآنی حکم پامال ہوجائے۔

اسی کو دیکھتے ہوئے عصر حاضر کے علماء نے اس طرح کے بینک کو قائم کرنے اور فائدہ اٹھانے کو ممنوع قرار دیا، اس لئے کہ اس سے رضاعی رشتوں میں گڈمڈ ہونے کی وجہ سے بہت سے مفاسد پیدا ہوسکتے ہیں (جن کا ازالہ ممکن نہیں) اور حرمتیں پامال ہوسکتی ہیں۔ تنظیم الاسلامی کانفرنس کے زیر انتظام مجمع الفقہ الاسلامی نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا، لیکن علامہ یوسف القرضاوی اور دیگر بعض علماء نے اس کی اجازت دی ہے انھوں نے اس سلسلہ میں امام لیث اور ظاہریہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے فتوی دیا ہے کہ اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ ان کے نزدیک عورت کی چھاتی سے براہ راست دودھ پینا ضروری ہے۔

بعض علماء نے اس کے اسلامائزیشن (یعنی اسلامی دائرے میں لانے کی بات) کہی ہے۔

(۱) کن کن عورتوں سے دودھ حاصل کیا گیا ہے ان کا پورا ریکاڈ تیار کر کے رکھا جائے، ایک عورت کا دودھ دوسرے عورت کے دودھ میں نہ ملایا جائے، اور شیشی یا ڈبے پر نام لکھا جائے کہ یہ فلاں عورت کا دودھ ہے۔

(۲) کسی کھانے کی چیز میں اس کو اس طرح شامل کیا جائے کہ فطری دودھ کی صفت ختم ہو جائے یعنی وہ دودھ دودھ نہ رہے مگر اس کے فوائد باقی رہیں، اس طرح احتیاط کے ساتھ ایسے بینک قائم کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے (المسائل الطبیۃ المستجدۃ فی ضوء الشریعۃ الاسلامیہ ص ۳۹۷، ۳۹۹ ج ۲، احکام و مسائل ص ۲۱۸، ۲۱۹)۔

لیکن انتہائی قابل غور بات یہ ہے کہ ہر نئی ''یافت'' میں دوسرے مسلک کی ''دریافت'' پر بلا جھجک فتویٰ جاری کیا جانے لگے تو اپنے مسلک کی خصوصیات وراجحیت برقرار نہیں رہ سکتی اور اس سے ''تلفیقِ ممنوع'' کا دروازہ کھل جائے گا جس کی اجازت کوئی مسلک نہیں دیتا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ مغربی تہذیب کے تمام درآمدات کو شریعت کے دامن میں جگہ دی جاتی رہی تو شریعت دانشوران فرنگ کی غلام بن جائے گی اور اسلام ایک ماڈرن اسلام بن جائے گا۔

۹- سوال میں جو صورت مذکور ہے یہ بیرونی بارآوری (In Vitro Fertilization.(I.V.F)) کی قسم ہے جسے عربی میں ''الاخصاب خارج الجسم یا الاخصاب الصناعی'' کہتے ہیں۔ جس میں مرد کے نطفے یا منی (SEMEN) اور عورت کے بیضے یا انڈے (OVUM) کو ملا کر ایک شیشے کی نلکی (TEST TUBE) میں کسی طبی لیبارٹری میں بارآوری کی جائے، اس مصنوعی طریقہ سے جو بچہ حاصل کیا جائے اس کو ٹیسٹ ٹیوب بے بی (Test Tube Baby) کہتے ہیں۔ جس کا عربی نام طفل الانابیب ہے، اس کی پانچ مختلف صورتیں ہیں۔ یہ سب شکلیں حرام ہیں اور اسلام میں اس کی کوئی اجازت نہیں۔

یہاں جو صورت زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ ایک عورت کا بیضہ دوسرے مرد کے نطفہ سے جو اس کا شوہر نہیں ہے مصنوعی حمل کاری کے ذریعہ دوسری عورت کے رحم میں داخل کیا جائے۔ اس صورت میں یہ زنا کی اولاد کی طرح ہوگا۔ اس لئے کہ ایک مرد کا نطفہ ایسی عورت کے پیٹ میں داخل کیا جا رہا ہے جو اس کی بیوی نہیں ہے، اس لئے جس کے نطفے سے پیدا ہوا ہے وہ اس کا باپ نہیں ہوگا، اور کرائے کی ماں کا شوہر بھی اس کا باپ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ اس کے نطفے سے پیدا نہیں ہوا۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا بچہ ہونے کی نفی کرے (دراسات فقہیہ فی قضایا معاصرۃ ص ۸۱۷ ج ۲ مولانا فیض احمد ندوی بھٹکلی، بچوں کے احکام و مسائل ص ۲۰۲)۔

اس طرح کے چندہ کی اولادیں بہت سے نازک شرعی مسائل پیدا کر دیں گی جن کا تشفی بخش جواب فراہم ہونا سخت دشوار ہوگا، مثلاً ثبوتِ نسب، حرمت نکاح، حرمت رضاعت اور وراثت کے مسائل کی پیچیدگی تقریباً ناقابل حل ہوگی۔ اسی لئے جدید محققین جن میں شیخ مصطفیٰ زرقاء اور الدکتور محمد بن عبدالجواد حجازی النتشہ قاضی الشرعی بالاردن۔ اور مشہور عالم دین ڈاکٹر یوسف قرضاوی وغیرہ کی رائیں بالکل الگ الگ ہیں، خود المجمع الفقہی رابطۃ العالم الاسلامی نے اپنے ساتویں سیمینار

منعقدہ ۱۴۰۴ھ میں اس کی مشروط اجازت دی تھی مگر آٹھویں سیمینار منعقدہ ۱۴۰۵ھ میں احتیاط کے پیش نظر اس کو ممنوع قرار دیا۔

ادھر ''الرحم المستاجر'' یا ''ام المستاجرہ'' (Surrogate) محض ایک کاروبار اور بزنس بن چکا ہے۔ طلب اولاد کی فطری خواہش کی تکمیل کا ذریعہ نہیں رہا ہے۔ یورپ وامریکہ میں اس کے لئے بڑی خطیر رقم ادا کی جاتی ہے، کبھی تو یہ رقم پچاس ہزار ڈالر سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، اس کے لئے دکانیں کھل گئی ہیں، باقاعدہ ایجنسیاں قائم ہیں جو خوب پیسے کمارہی ہیں۔ اس صورت حال میں ٹیسٹ ٹیوب بینک قائم کرنا، کسی مرد یا خاتون کا بینک کو یا بینک کا کسی ضرورت مند مرد یا عورت کو مادہ منویہ کا فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا قطعی حرام ہے۔ جن علماء نے احتیاط کی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے وہ خود احتیاط کے خلاف اور اصول فقہ کے معاند ہے۔

☆☆☆

انسانی اعضاء کا عطیہ اور اسلام

ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی ☆

اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اور دنیا کی ساری چیزیں اس کے فائدے کے لئے پیدا کی ہیں، لیکن مغرب نے اپنے مادہ پرستانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے تحت انسان اور انسانی اعضاء واجزاء کو اشیاء کے درجہ میں لا کھڑا کیا ہے، چنانچہ جدید میڈیکل سائنس نے علاج ومعالجہ، آپریشن، سرجری اور تولید وافزائش کے معاملہ میں انسانی جسم کو مشین کے کل پرزہ کی طرح استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔

ذیل میں جدید طریقہ علاج میں استعمال ہونے والی انسانی اعضاء واجزاء ان کی خرید وفروخت اور غیر فطری طریقہ تولید وافزائش سے متعلق شریعت کی روشنی میں جائزہ لینے کی طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے۔

۱-خون کا عطیہ:

اصولی طور پر تو خون کا عطیہ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ عطیہ وہبہ کے لئے کسی چیز کا قیمی ہونا اور ملکیت میں ہونا ضروری ہے، جبکہ انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کا عطیہ اور امانت ہے، اور فقہاء نے اسے ''مال متقوم'' شمار نہیں کیا ہے (دیکھئے بدائع الصنائع ۶/۱۱۹)۔

لیکن اس کے باوصف اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خون ایک توانائی بخش سیال مادہ ہے، جو انسانی زندگی کے لئے ناگزیر شئی ہے، یہ وہ انسانی جزء ہے جو انسانی جسم سے الگ کیا جاتا رہا ہے، جیسے حدیث میں پچھنہ لگانے کا ذکر کثرت سے آیا ہے، جسمیں زائد خون نکال کر ضائع کردیا جاتا تھا۔

قدیم زمانہ میں مریض کی رگوں سے خون چڑھانے کی تکنیک دریافت نہیں ہوئی تھی، چونکہ آج یہ تکنیک آسانی سے دستیاب ہے، لہذا دوسرے شخص کی جان بچانے کی خاطر خون کا عطیہ دینا جائز ہوگا، بشرطیکہ ڈاکٹر نے چیک اپ کرکے بتا دیا ہو کہ اپنے خون کا عطیہ دینے سے عطیہ دینے والے کی صحت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔

☆ لکچرر گورنمنٹ جونیئر کالج شادنگر، حیدرآباد۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے بخاری وغیرہ کی اس حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے جس میں مریض کے لئے اونٹ کا پیشاب پینے کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھئے: صحیح بخاری ۲/ ۸۴۸، کتاب الطب باب الدواء بابوال الابل)۔

نیز اس سلسلہ میں فقہاء کی ان عبارات سے استدلال کیا جاسکتا ہے، جن میں مریض کے ناگزیر حالت میں خون، پیشاب، مردار عورت کا دودھ پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

"**يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوي إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه، ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه**" (الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۵۵) (مریض کے لئے بطور دوا خون اور پیشاب کا پینا اور مردار کا کھانا جائز ہے، جبکہ مسلمان معالج نے اسے بتایا ہو کہ اس میں شفاء ہے، اور اس کا متبادل کوئی حلال چیز نہ ہو)۔

یہ حقیقت ہے کہ خون کی شدید کمی والے مریض کی جان بچانے کے لئے خون چڑھانے کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔

۲- بلڈ بینک کو خون کا عطیہ:

پچھلی بحث میں خون کا عطیہ دینے کے جواز پر بحث کی جاچکی ہے، تو جب خون کا عطیہ جائز ہے تو یہ شخص کو بھی دیا جاسکتا ہے اور ادارہ کو بھی، بلڈ بینک کو خون کا عطیہ دینے سے ضرورت مندوں کے لئے اس سے استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔

آج کل سڑک، ریل اور ہوائی جہاز کے حادثات، زلزلے، بم دھماکے اور جنگ روز کا معمول بن گئے ہیں، ایسی صورت میں رضا کارانہ طور پر بلڈ بینک کو خون کا عطیہ دینا انسانیت کی بہترین خدمت میں شامل ہے، کیونکہ خون پیسے دے کر بھی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے، انسانیت کا درد اور رحم دلی کا جذبہ ہی خون دینے پر آمادہ کرسکتا ہے، اس بارے میں فقہاء کی اس عبارت سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے:

"**ولابأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء**" (فتاوی عالمگیری ۵/ ۳۵۵) (دوا علاج کے لئے آدمی کی ناک میں عورت کا دودھ چڑھانے اور اسے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

۳- بلڈ کیمپ کا قیام:

مغرب نے اپنی شاطرانہ پالیسی کے تحت زخم لگانے کے ساتھ ساتھ مرہم رکھنے کا طریقہ بھی جاری رکھا ہے، اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں میں 'ریڈ کراس سوسائٹی لائنس کلب' اور اس طرح کی بہت سی سوسائٹیاں قائم ہیں، یہ سوسائٹیاں اور تنظیمیں سماجی و رفاہی خدمت کے ساتھ ساتھ مغربی ممالک کے لئے جاسوسی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں، اور عوام سے اپنی

خدمات کا عوض جاسوسی کی شکل میں نقد وصول کرنے کے ساتھ عوام میں اپنا اچھا امیج بنانے کی کوشش کرتی ہیں، بلکہ اپنی ظالمانہ پالیسیوں، مکاریوں اور تباہ کاریوں کے باوصف سماج میں ایک مہذب، لائق تقلید اور قابل رشک قوم کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، اور میڈیا کے ذریعہ مسلم قوم کو ظالم وجابر، بے رحم، خودغرض اور ناکارہ قرار دینے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔

ایسے حالات میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغربی اقوام کے رفاہی کاموں سے مرعوب اور مغرب کی تقلید سے متاثر ہوئے بغیر خالص انسانی ہمدردی کے جذبہ وخلوص کے ساتھ رفاہی، فلاحی اور سماجی خدمات انجام دیں، جن میں ایک بلڈ بینک اور بلڈ کیمپ کا قیام بھی ہے۔

لیکن تاریخ میلاد کے موقع پر بلڈ کیمپ کا قیام بھی مغربی تقلید کا ایک حصہ ہے، اسلام میں کسی بھی شخصیت کی پیدائش اور موت کی تاریخ پر تقریب کے انعقاد کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اس لئے میلاد النبی ﷺ کے موقع پر بلڈ کیمپ قائم کرنے کے بجائے آفت ناگہانی اور بڑے حادثات کے وقت بلڈ کیمپ قائم کئے جائیں تاکہ برادران وطن اور عالمی برادری پر اچھا اثر قائم ہو۔

۴-خون کا عطیہ کب واجب ہے؟

اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو اور اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بڑی مشکل سے ملتا ہے، اور اسی گروپ کے خون کا حامل شخص مریض کے پاس موجود ہو، تو اس کے لئے مریض کی جان بچانے کی خاطر اپنے جسم کا کچھ خون دینا واجب ہوگا، کیونکہ جان کی حفاظت شریعت کا ایک اہم مقصد ہے، اور ایک انسان پر دوسرے انسان کی جان بچانا واجب ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**'' (مائدہ: ۳۲) (اور جس نے ایک شخص کو مرنے سے بچالیا اس نے گویا سب آدمیوں کو بچالیا)۔

''**ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة**'' (حشر: ۹) (اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو فاقہ ہو)۔

نیز فقہاء نے نماز توڑ کر ہلاک ہونے والے شخص کو بچانے کو واجب قرار دیا ہے۔

۵-جگر کا عطیہ:

اللہ تعالی نے ہر انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کو زندہ رہنے کے لئے مختلف اعضاء سے نوازا ہے، لیکن انسان ان اعضاء کا مالک نہیں ہے کہ اپنی زندگی میں کسی کو ہبہ کردے یا مرنے کے بعد ہبہ کرنے کی کسی کو وصیت کر جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ألهم أرجل يمشون بها أم لهم أيد يبطشون بها،أم لهم أعين يبصرون بها،أم لهم أذان يسمعون بها"(اعراف:۱۹۵)(کیاان کے پاؤں ہیں؟ جن سے وہ چلیں، یاان کے ہاتھ ہیں؟ جن سے وہ پکڑیں، یاان کی آنکھیں ہیں؟ جن سے وہ دیکھیں، یاان کے کان ہیں؟ جن سے وہ سنیں)۔

محل استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہرانسان کے لئے اعضاخاص اس کے استعمال کے لئے بنائے ہیں،لہذاان سے دوسرے کااستفادہ کرناجائزنہیں ہوگا،علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"ومنها أن يكون مالامتقوما، فلا تجوز هبة ما ليس بمال أصلا كالحروالميتة"(بدائع الصنائع:۶/۱۱۹)(ہبہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ قیمت والی چیز کا ہبہ ہو،لہذاایسی چیز کا ہبہ جائزنہیں ہوگا جوسرے سے مال ہی نہ ہو،جیسے آزادشخص اورمردارکاہبہ)۔

۶-الف:زندگی میں آنکھ کاعطیہ:

اللہ تعالی نے ہرانسان کودوآنکھیں عطا کی ہیں،اور یہ دونوں ہی انسان کے لئے ضروری ہیں ان سے انسان دونوں طرف آسانی سے دیکھ سکتاہے،اوراس کے چہرہ کی خوبصورتی باقی رہتی ہے،اللہ تعالی نے اس عظیم نعمت کا ذکراس طرح کیا ہے:"ألم نجعل له عينين ولساناوشفتين"(البلد۸-۹)(کیا ہم نے اس کودوآنکھیں،زبان اورہونٹ نہیں دیئے)۔

کسی زندہ شخص کے لئے اپنی زندگی میں اپنی ایک آنکھ عطیہ کرنا جائزنہیں ہوگا،تاکہ اس کی ایک آنکھ سے کسی نابینا شخص کو بینائی حاصل ہوجائے،کیونکہ انسانی اعضاءکااستعمال انسانی تکریم کے خلاف ہے۔

"ولقد كرمنا بنى آدم"(بنی اسرائیل:۷۰)(یقیناً ہم نے آدم کی اولاکوبزرگی عطا کی)۔

چنانچہ فقہاء کہتے ہیں:"الانتفاع بأجزاء الآدمى لم يجز"(الفتاوی الہندیہ ۵/۳۵۴)(آدمی کے اجزاء سے نفع اٹھاناجائزنہیں ہے)۔

البتہ اگرآئندہ سائنسی تحقیقات کے ذریعہ اسٹیم سیل سے آنکھوں کی تیاری یا جانوروں کی آنکھوں کی انسانی آنکھوں کے قرنیوں میں سرجری ممکن ہوتواس کی کوشش اورحوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

ب-مرنے کے بعدآنکھ کاعطیہ:

جس طرح زندگی میں آنکھ کا عطیہ کرنا جائزنہیں ہے،اسی طرح مرنے کے بعدآنکھ کا عطیہ کرنااوراس کی وصیت کرناجائزنہیں ہوگا،فقہاء لکھتے ہیں:

"وإذا كان برجل جراحة تكره المعالجة بعظم الخنزير والإنسان، لأنه يحرم الانتفاع

به"(فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۵۴) (جب کسی آدمی کو زخم ہوتو اس کے لئے خنزیر اور انسان کی ہڈی سے علاج کرنا مکروہ ہوگا، کیونکہ ان سے نفع اٹھانا حرام ہے)۔

ج- آئی بینک کا حکم:

آج کل آنکھوں کے دواخانوں میں نابینا اور آنکھ سے محروم افراد کی مدد کے لئے آئی بینک قائم کئے گئے ہیں، تاکہ جو لوگ اپنی زندگی میں یا مرنے کے بعد اپنی آنکھوں کا عطیہ کرنا چاہیں، وہ اس ادارہ سے رجوع ہوں، بہ ظاہر اس میں مدد کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں اس طرح کے بینک کا قیام انسانی جان کی بے احترامی، انسانی اعضاء کی خرید وفروخت اور اسمگلنگ کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ ہے، ایسے بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ دینا درست نہیں ہوگا۔

۷- سوال نمبر ۵ اور ۶ کا جواب راقم کے نزدیک نفی میں ہے، اس لئے سوال نمبر ۷ کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔

۸- ماں کے دودھ کی خرید وفروخت:

اللہ تعالی نے بچوں کو بہترین غذا فراہم کرنے کے لئے ان کی ماؤں کے سینوں میں مقوی، محفوظ اور غذائیت سے بھرپور دودھ مہیا کیا ہے، لیکن کچھ مائیں مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے بچوں کو یہ قدرتی غذا فراہم کرنے سے قاصر رہتی ہیں، اور اپنے بچوں کے دودھ کے لئے متبادل انتظام کرتی ہیں، حالیہ زمانہ تک اس کے لئے دائی کی خدمت لی جاتی تھی، اور انہیں بچہ کی رضاعی ماں کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جاتا تھا۔

مغرب نے اپنی معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے ہر میدان میں عورتوں کو لا کھڑا کیا اور نفسیاتی حربہ اختیار کرتے ہوئے عورتوں کے امور خانہ داری کو حقیر اور باہر کے امور کو روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت قرار دیا، باہر کی تگ ودو میں رہنے کی وجہ سے بچے ماں کا دودھ اور ماں کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔

مغرب نے مادہ پرستانہ ذہنیت، انسانی احترام اور اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ماں کے دودھ کو کاروباری شکل دے دی ہے، گزشتہ چند دہائیوں سے مغرب میں گائے، بھینس کے دودھ کی طرح ماں کا دودھ بھی فروخت ہونے لگا ہے۔

امام شافعیؒ کے برخلاف اکثر فقہاء کے نزدیک اجزاء انسانی کی حرمت کے پیش نظر عورت کے دودھ کی خرید وفروخت ناجائز ہے: "**ولم يجز لبن امرأة، ولو في قدح، حرة كانت أو أمة، ولم يضمن متلفه، كذا في الكافي**" (الفتاوی الہندیہ ۳/ ۱۱۶) (عورت کے دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ پیالہ میں ہو، خواہ آزاد عورت کا دودھ ہو یا باندی کا، اور اس کو ضائع کرنے والا ضامن نہیں ہوگا، جیسا کہ "الکافی" میں ہے)۔

علامہ برہان الدین مرغینانیؒ مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

"ولا بیع لبن امرأة فی قدح وقال الشافعیؒ: یجوز بیعه، لأنه مشروب طاهر، ولنا أنه جزء الآدمی، وهو بجمیع أجزاءه مکرم" (ہدایہ مع الفتح ۶/ ۴۲۳) (پیالہ میں عورت کے دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی خرید وفروخت جائز ہے، کیونکہ یہ پاک مشروب ہے، ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ آدمی کا جزء ہے، اور آدمی اپنے تمام اجزاء سمیت قابل احترام ہے)۔

علامہ ابن ہمامؒ نے عورت کے دودھ کی خرید وفروخت کو بہرصورت ناجائز قرار دیا ہے، اور امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب دیتے ہوئے انسانی حرمت کے پہلو کو واضح کیا ہے:

"بل علی سائر أحواله لایجوز، ولا یضمن متلفه، وهو مذهب مالک وأحمد......ونحن نمنع أنه مشروب مطلقا، بل للضرورة، حتی اذا استغنی عن الرضاع لا یجوز شربه، والانتفاع به یحرم" (فتح القدیر ۶/ ۴۲۳) (تمام صورتوں میں اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، اور اس کو تلف کرنے والا ضامن نہیں ہوگا، یہی امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے، ہم اسے عام مشروب نہیں مانتے، بلکہ یہ ضرورۃً جائز ہے، یہاں تک کہ دودھ پینے کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کا پینا جائز نہیں ہے، اور اس سے نفع حاصل کرنا حرام ہے)۔

علامہ ابن ہمامؒ کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا دودھ ایسی چیز نہیں ہے، جسے خرید وفروخت کا سامان بنالیا جائے، بلکہ اس سے استفادہ صرف بچوں کے لئے خاص مدت تک جائز ہے، ورنہ بلاضرورت اس سے استفادہ ناجائز ہے۔

صاحب عنایہؒ نے بھی انسانی تکریم کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورت کے دودھ کی خرید وفروخت کو انسانی حرمت کے مغائر قرار دیا ہے: "الآدمی بجمیع أجزاءه مکرم مصون عن الابتذال، وما یرد علیه البیع لیس بمکرم ولا مصون عن الابتذال" (العنایہ مع الفتح ۶/ ۴۲۴) (آدمی اپنے تمام اجزاء کے ساتھ قابل احترام ہے، اور اہانت سے محفوظ ہے، جب کہ خرید وفروخت کی جانے والی اشیاء نہ قابل احترام ہوتی ہیں، اور نہ اہانت سے محفوظ ہوتی ہیں)۔

اس مسئلہ کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اجنبی عورت کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت کا حکم لگانا بے حد دشوار ہوجاتا ہے، نظر انداز کرکے ایسے دودھ کے استعمال کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی ہے، کیونکہ رضاعت کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وأمهاتکم الاتی أرضعنکم وأخواتکم من الرضاعة" (النساء:۲۳) (اور وہ مائیں تمہارے لئے حرام ہیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری رضاعی بہنیں)۔

اورحدیث میں ہے:"یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب"(دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جونسب کی بنا پر حرام ہوجاتے ہیں)۔

کسی عورت کا دودھ پینے کے بعد اس عورت کا جزء بچہ کا جزء بدن بن جاتا ہے، اوراس کے جسم کا دائمی حصہ بن جاتا ہے، اس لئے دودھ پلانے والی عورت بچہ کی رضاعی ماں بن جاتی ہے، اوراس سے اوراس کی اولاد سے نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتا ہے، صاحب عنایہ فرماتے ہیں:

"انه جزء الآدمی، لأن الشرع أثبت حرمة الرضاعة لمعنی البعضیه"(العنایہ مع الفتح ۶/۴۲۳)(یہ آدمی کا جزء ہے، کیونکہ شریعت نے رضاعت کی حرمت جزئیت کی بنا پر ثابت کی ہے)۔

البتہ اجنبی عورت کا دودھ پینے والے بچے کی رضاعت کا رشتہ شبہ کی بنیاد پر کسی عورت سے جوڑا نہیں جاسکتا ہے۔

۹-منی بینک کا حکم:

مغربی ممالک میں جنسی بے راہ روی، شادی سے گریز اور تاخیر سے شادی کی وجہ سے بہت سے مردوں اور عورتوں میں بانجھ پن بڑھتا جارہا ہے، مغرب نے خالص تاجرانہ وسرمایہ دارانہ ذہنیت، فطرت اور اخلاق واقدار سے بغاوت کے اپنے منصوبہ کے تحت مردوعورت کے مادہ منویہ کی تجارت شروع کردی ہے، اوراس بات کو ممکن بنادیا ہے کہ مردوعورت بغیر شادی کے، یا زوجین کے فطری توالدوتناسل کے بجائے کسی اجنبی مرد یا عورت کا مادہ منویہ لے کر اوراجنبی عورت کا رحم کرایہ پر لے کر اولاد حاصل کرسکتے ہیں۔

اس غیرفطری طریقہ میں خاص طور پر تین مفاسد پائے جاتے ہیں:

۱-مردوعورت کے مادہ منویہ کی خریدوفروخت۔ فقہاء نے مردوعورت کے مادہ منویہ کی خریدوفروخت کے ناجائز ہونے کی صراحت کی ہے:"ولا ینعقد بیع الملا قیح والمضامین والمقلوح ما فی رحم الأنثی" (الفتاوی الہندیہ ۳/۱۱۶)(مردوعورت کے مادہ منویہ اوررحم مادر میں جنین کی خریدوفروخت جائز نہیں ہوگی)۔

۲-اس میں اجنبی مرد کا نطفہ اجنبی عورت کے رحم میں داخل کیا جاتا ہے، یا ایک عورت کا بیضہ دوسری عورت کے رحم میں داخل کیا جاتا ہے۔

اس میں توالدوتناسل کے فطری اورقدرتی نظام سے چھیڑ چھاڑ کیا جاتا ہے، جوشیطانی منصوبہ کا ایک حصہ ہے، جسے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے:

"وقال: لأتخذن من عبادک نصیبا مفروضا ولأضلنهم ولامنینهم ولأمرنهم فلیبتکن آذان

الأنعام، ولآمرنهم فليغيرن خلق الله، ومن يتخذ الشيطان وليامن دون الله فقد خسر خسرانا مبينا"(نساء:۱۱۸-۱۱۹)(شیطان نے (اللہ تعالی سے) یوں کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے ضرور ایک مقررہ حصہ لوں گا، اور میں ان کو ضرور بہکاؤں گا، اور انہیں باطل آرزؤں میں مبتلا رکھوں گا، اور انہیں حکم دوں گا کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدل ڈالیں، اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے گا، وہ یقیناً کھلی تباہی میں پڑے گا)۔

حدیث کے مطابق بھی یہ عمل ناجائز قرار دیا جاسکتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"**لا يحل لأمرء أن يؤمن بالله واليوم الآخر أن ليسقي ماء ه زرع غيره**" (سنن ترمذی ۱/۱۳۴)(اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان رکھنے والے کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی سیراب کرے)۔

ایک حدیث میں اس طرح ممانعت کی گئی ہے:

"**من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يسقى ماء ه ولد غيره**"(ترمذی ۲/۲۱۴)(جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پانی سے دوسرے کے بچہ کو سیراب نہ کرے)۔

ان احادیث کے ظاہر سے یہ ممانعت معلوم ہوتی ہے کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کھیتی یعنی رحم کو سیراب کیا جائے، یا دوسرے کو صاحب اولاد بنانے کے لئے اپنا نطفہ فراہم کیا جائے، اس سلسلہ میں صاحب عنایہ کی ذیل عبارت سے بھی رہنمائی ملتی ہے:"**ان الوطى سبب الجزئية بواسطة الولد، والوطي محرم من حيث أنه سبب الولد**"(العنایہ علی ہامش فتح القدیر ۲/۳۶۵)(مباشرت بچہ کے واسطہ سے جزئیت کا سبب ہے اور مباشرت اس وجہ سے حرام ہے کہ یہ بچہ کا سبب ہے)۔

اس توجیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طرح اجنبی مرد و عورت کے لئے مباشرت حرام ہے، اسی طرح مباشرت کے بغیر ان کے نطفہ کے اختلاط سے بچہ حاصل کرنا بھی حرام ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**والذين هم لفروجهم حافظون إلا على أزواجهم أوماملكت أيمانهم فإنهم غير ملومين، فمن ابتغى وراء ذلك فاؤلئك هم العادون**"(مومنون ۵،۷)(اور وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے یا (شرعی) باندیوں کے کہ (اس صورت میں) ان پر ملامت نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ کے خواہش مند ہوں تو وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں)۔

۳-اس غیر فطری عمل میں نسب اور والدین کی شناخت ناپید ہوجاتی ہے، بچہ کی پیدائش میں کس مرد اور عورت کا نطفہ لیا گیا ہے، یہ معلوم نہیں ہو پاتا، نیز کرایہ پر رحم دینے والی ماں کو کرایہ کی ماں کا درجہ ہی دیا جاتا ہے، اور اسے بچہ کی صورت

بھی دیکھنے نہیں دی جاتی ہے، جبکہ ہر بچہ کے لئے والدین کی ناموجودگی بے شمار نعمتوں سے محرومی اور سماج میں اس کی بے توقیری کی موجب ہوتی ہے، اللہ تعالی نے اس نعمت کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

”وهو الذى خلق من الماء بشرا فجعله نسبا وصهرا “(فرقان:۵۴)(اور وہی تو ہے جس نے پانی (نطفہ) سے آدمی کو پیدا کیا، پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا)۔

جوابات کا خلاصہ:

۱- ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے۔

۲- بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کر سکتے ہیں۔

۳- مسلمانوں کے لئے رضا کارانہ طور پر بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے۔

۴- مریض کی جان بچانے کے لئے مریض کے خون گروپ کے حامل موجود شخص کو خون کا عطیہ دینا واجب ہوگا۔

۵- جگر وغیرہ کا عطیہ کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۶-الف: زندہ شخص کے لئے ایک آنکھ کا عطیہ کرنا جائز نہیں ہوگا۔

ب-موت کے بعد بھی آنکھ کا عطیہ جائز نہیں ہوگا۔

ج-آئی بینک میں آنکھ کا عطیہ کرنا درست نہیں ہے۔

۷- جواب کی ضرورت نہیں ہے۔

۸- خاتون کے دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی، نامعلوم عورت کا دودھ پینے کے بعد شبہ کی بنا پر حرمت رضاعت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

۹- مادہ منویہ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کی پیوند کاری

مولانا محمد ذکوان بن مولانا عمران☆

انسانی معالجات جس کے بارے میں سوالات مذکور ہیں، اس کے بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہیں، قرآن و سنت اوران سے مستنبط اصول کی روشنی میں جن کے اقوال پر اطمینان ہیں، ان کی تقلید میں کچھ باتیں عرض کررہا ہوں۔ اولا بطور تمہید کے چند باتیں قابل لحاظ ہیں:

۱- اللہ تبارک و تعالی نے فرمایا: "**ولقد کرمنا بنی آدم وحملناهم فی البر والبحر**"، دوسری جگہ فرمایا: "**لقد خلقنا الإنسان فی احسن تقویم**"، نیز فرمایا: "**علم الإنسان مالم یعلم**"۔

الغرض اللہ تبارک وتعالی نے زمین وآسمان کی مخلوقات میں انسان کو ایک خاص شرف بخشا ہے، اوراس کو ایک ممتاز درجہ دیا ہے، اسی بنیاد پر تمام فقہاء نے اپنی کتابوں میں کہا ہے: "**الانتفاع بجزء الآدمی حرام**"۔

۲- جب انسان معظم ہے تو اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالی نے بڑے سامان بھی تیار کئے ہیں، بیماروں کے لئے دوا پیدا فرمائی، جیسا کہ حدیث میں ہے: "**ما أنزل الله داء إلا أنزل له شفاء**" (مشکوۃ، کتاب الطب)، حتی کہ حالت اضطرار میں بھی شرائط کے ساتھ حرام چیزوں کو بھی مضطر کے لئے حلال قرار دیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "**فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه**"۔

۳- اضطرار ضرورت سے ماخوذ ہے، اور ضرورت کہتے ہیں کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہوجائے، یعنی کہ ہلاکت کا خطرہ یقینی ہو، اگر یقینی نہ ہوتو وہ ضرورت نہ کہلائے گا، چنانچہ حاشیہ حموی میں ہے: "**الضرورة بلوغه هذا إن لم یتناول الممنوع هلک أو قارب وهذایبیح تناول الحرام والحاجة: کالجائع الذی لولم یجد ما یأکله لم یهلک غیر أنه یکون في جهد ومشقة وهذا لا یبیح**

☆ مدرسہ اسلامیہ دار العلوم چھاپی، گجرات۔

الحرام ویبیح الفطر فی الصوم"۔

صاحب ہندیہ نے اضطرار کے احکام میں اکثر یہ فرمایا ہے:"**إذا خاف علی نفسه الموت من الجوع**"، پھر آگے فرمایا:"**اذا خاف علی نفسه الموت من العطش**"، پھر آگے فرمایا:"**مضطر لم یجد المیتة وخاف الهلاک**"۔

جس طرح بھوک و پیاس کی وجہ سے انسان مضطر ہوتا ہے، اسی طرح مرض سے بھی مضطر ہوتا ہے، لیکن مرض کے سبب جان کا خطرہ یقینی ہے یا نہیں، اس میں ہر شخص کا فیصلہ معتبر نہیں ہے، بلکہ کسی ماہر فن معتمد حکیم یا ڈاکٹر ہی کا فیصلہ معتبر ہے، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں مرض کے بیان کے موقع پر (مریض کے لئے کب تیمّم درست ہے، مریض کے لئے افطار کی رخصت وغیرہ) فقہاء نے اخبار طبیب حاذق کی قید لگائی ہے۔

الغرض حرام کا حلال ہونا تین شرطوں کے ساتھ ہے:

الف- حالت اضطرار ہو، یہ خطرہ موہوم نہ ہو، کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کی تجویز سے ہو۔

اس سے بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں، وہ جزئیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- شرح السیر الکبیر میں ہے:"**ان المسلم لا یحل له ان یقي روحه بروح من هو مثله في الحرمة کمالو أکره بوعید القتل علی أن یقتل مسلما ولأنهم یتعجلون فی هذا قتل المسلمین والمسلمات، ولا رخصة في ذلک لمن یخاف الهلاک علی نفسه، ألا تری أنه لوابتلی بمخصصة لم یحل له أن یتناول أحدا من أطفال المسلمین لدفع الهلاک عن نفسه**"(باب ما یحل للمسلمین أن یفعلوہ بالعدو ومالا یحل)۔

البحر الرائق میں ہے:"**امرأة حامل اعترض الولد في بطنها ولا یمکن إلا بقطعها أرباعا ولولم یفعل ذلک یخاف علی أمه من الموت فإن کان الولد میتا فی البطن فلا بأس به، وإن کان حیا لایجوز، لأن إحیاء نفس بقتل نفس أخری لم یرد في الشرع**"(کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع)۔

فتاوی ہندیہ میں اجزاء حیوان سے انتفاع کے جواز کی تفصیل کے بعد لکھا ہے،"**الانتفاع بأجزاء الآدمی لم یجز**"(۴۰۹/۵، طبع اتحاد بکڈپو دیوبند) اسی کے صفحہ (۳۹۱) پر ہے:"**مضطر لم یجد میتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع یدی وکلها أو قال: اقطع منی قطعة وکلها، لا یسعه أن یفعل ذلک ولا یصح أمره وهکذا فی فتاوی قاضی خاں**"(۳۹۳/۳ طبع اتحاد بکڈپو دیوبند)۔

عالمگیری کے صفحہ (۵۰) پر ہے:"**ولو أكره على أن يقتل مسلما أو يزني، ليس له أن يفعل أحدهما، لأن قتل المسلم والزنا لا يباح عند الضرورة**"۔

ان جزئیات سے یہ بات منقح ہوگئی کہ جزءانسانی سے انتفاع کسی حال میں جائز نہیں ہے، خواہ اضطرار ہی کی حالت کیوں نہ ہو۔

۴- جزءانسان سے انتفاع میں اگرچہ فوائد ہیں کہ اس سے بیمار اور معذور شخص کی بیماری دور ہو جاتی ہے، مگر جس فائدہ کے پیچھے قومی مضرتیں ہوں ان فوائد کو کوئی عقل مند مفید نہیں سمجھتا ہے، جیسے چوری، ڈاکہ زنی وغیرہ، تو اس کو جائز قرار دینے میں قومی مضرتیں بھی ہیں کہ اس کی وجہ سے غرباء کے اعضاء ایک مال کی طرح بازار میں بکا کریں گے، بہت سے لاوارث مردے اعضاء سے خالی ہوکر دنیا سے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح اللہ تعالی نے انسان کو اعضاء کا مالک نہیں بنایا ہے، بلکہ بطور ودیعت استعمال کے لئے دیا ہے، وہ جیسے چاہے استعمال کا مالک نہیں ہے، اور شریعت نے مضطر کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ کسی کے عضو کو کھائے، نیز یہ تکریم انسانی کے بھی خلاف ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالی نے ہر چیز کو انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کیا، نہ یہ کہ ہم انسانی اعضاء کو ہی دوسری اشیاء کی طرف استعمال کرنے لگیں۔

مذکورہ تفصیل کے بعد سوالات کے جواب بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اس مسئلہ میں خون کو دودھ پر قیاس کیا گیا ہے، کہ جس طرح جزءانسانی ہونے کے باوجود ضرورت کی بناء پر عورت کے دودھ سے علاج درست ہے، جیسا کہ فتاوی ہندیہ میں ہے:"**ولا بأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء**"(۴۱۰/۵)۔

اسی طرح خون سے بھی علاج درست ہے، جیسا کہ ہندیہ میں کچھ سطروں کے بعد صراحتا فرمایا ہے:"**يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه ولم يجد من المباح مايقوم مقامه**"(۴۱۰/۵، اتحاد بک ڈپو)۔

لہذا جزءانسانی ہونے کے باوجود ضرورت وحاجت دونوں صورتوں میں خون سے دواء وعلاج درست ہوگا، ہاں اگر لینے والے کو محض قوت مقصود ہو تو اس صورت میں خون دینا جائز نہ ہوگا۔

خون چاہے مسلمان کو دے یا کافر کو دونوں جائز ہے، اسی طرح لینا بھی، البتہ باطنی اعتبار سے کافر کا لینا پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں کافر وفاجر کے خون میں جو اثرات ہیں، ان کے منتقل ہونے کا خطرہ ہے، جیسا کہ صلحاء امت نے فاجر

عورت سے دودھ پلوانے کو پسند نہیں فرمایا۔

۲- چونکہ یہ خون ضرورت وحاجت ہی کی صورت میں استعمال ہوتا ہے، لہذا ایسے بلڈ بینکوں میں خون دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۳- مسلمانوں کے لئے بھی ایسے بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہوگا۔

آخری دوفقرے قاعدہ ''ذریعہ حرام بھی حرام ہے وعکسہ'' پر متفرع ہے۔

۴- اخلاقی اعتبار سے اس شخص کے لئے خون دینا استحباب کے درجہ میں ہوگا، واجب نہ ہوگا، لہذا کسی کو بھی اس پر جبر کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

۵- مذکورہ تمہید کی روشنی میں دینا جائز نہ ہوگا، نیز اس سے شفاء کا ہونا موہوم ہے، اور موت یقینی ہے، ''**فإذا جاء أجلهم لا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون**''، لہذا متیقن سے بچنے کے لئے ایسے موہوم کا استعمال درست نہ ہوگا، اگرچہ یہ بھی ایک علاج ہے، جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، مگر علاج کا یہ طریقہ شریعت کے یقینی طور پر جواز کی صورتوں میں داخل نہیں ہے۔

۶- تینوں صورتیں ناجائز ہیں، جیسا کہ تفصیل پہلے گزرچکی۔

۷- خود انسان کی اپنی اجازت معتبر نہیں ہے، چہ جائیکہ کسی اور کی اجازت کو اس کے حق میں روا رکھا جائے۔

۸- بچوں کے لئے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ ماں کا دودھ پئے یا متعینہ خاتون کا، تاکہ حرمت نکاح کے سلسلہ میں شکوک و شبہات سے محفوظ رہے، لیکن اگر کوئی خاتون بھی نہیں ملتی، اور نہ جانور کا دودھ بچہ ہضم کر رہا ہے، اور بچہ بیتاب ہے تو حفظان صبیان کی ضرورت کی وجہ سے ایسے بینکوں سے دودھ وصول کر کے بچوں کو پلانا درست ہوگا، اور جب تک ثابت نہ ہو کہ یہ دودھ اس عورت کا ہے تب تک شک کی وجہ سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی، چنانچہ اشباہ والنظائر میں ہے:

''**صبية أرضعها قوم كثير من أهل القرية أقلهم لو أكثرهم ولا يدرى من أرضعها وأرادواحد من أهل تلك القرية أن يتزوجها، قال ابو القاسم الصفار إذا لم تظهر له علامة، ولا يشهد أحدله بذلك يجوز نكاحها وهذا من باب الرخصة كى لا ينسد باب النكاح**'' (القاعدہ الثالثۃ الیقین لا یزول بالشک)۔

البتہ عورت کے لئے بالعوض دینا درست نہ ہوگا، جیسا کہ ہدایہ میں ہے: ''**ولا يجوز بيع لبن امرأة في**

قدح“، پھر آگے فرمایا: ”ولا فرق في ظاهر الرواية بين لبن الحرة والأمة“ (۳/ باب البیع الفاسد)۔

☆☆☆

اجزاءانسانی کا عطیہ-اسلام کی روشنی میں

مفتی محمد ابوبکر قاسمی☆

۱-ایک مسلمان کا بوقت ضرورت دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کوخون کا عطیہ دینا:

بوقت ضرورت ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کوخون کا عطیہ دینا انسانی جان کے تحفظ کی خاطر جائز ہے بشرطیکہ وہ کافرکسی مسلمان سے برسرپیکار نہ ہو کیونکہ برسرپیکار ہونے کی صورت میں وہ قابل رحم نہیں بلکہ واجب القتل ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے:

"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم ان تبروهم وتقسطوا إليهم"(ممتحنہ:۸،۹)۔

۲-علاج کی خاطر قائم کئے گئے بلڈ بینکوں کو مسلمانوں کا خون عطیہ کرنا:

قدرتی اور غیر معمولی حادثات مین خون کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے، لہذا اس کو ملحوظ رکھ کر بلڈ بینک قائم کرنا اور اس غرض سے قائم کئے گئے بلڈ بینکوں کوخون کا عطیہ دینا بلا شبہ جائز ہے، **"لأن الأمور بمقاصدها قال النبي ﷺ: إنما الأعمال بالنيات وإنما اكل امرأ مانوى"**(رواہ بخاری ۲/)۔

لیکن یادرہے کہ انسانی خون کا استعمال صرف انسانی جان کے تحفظ ہی کی خاطر کیا جائے محض قوت بڑھانے یا حسن میں اضافہ کی غرض سے کسی کو اپنا خون دینا یا اس غرض کے لئے انسانی خون کا استعمال کرنا شرعا جائز نہیں ہے، چنانچہ ''جواہر الفقہ''میں ہے: جب خون دینے سے محض منفعت یا زینت مقصود ہو یعنی جب ہلاکت یا مرض کی طوالت کا اندیشہ نہ ہو بلکہ محض قوت بڑھانا یا حسن میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں خون دینا ہرگز جائز نہیں (جواہر الفقہ ۷/۴۷)۔

☆ مہتمم جامعہ رحیمیہ، اسلام آباد، رحمت نگر، برہم پور دربھنگہ۔

۳-انسانی جان کے تحفظ کی خاطر رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا:

مسلمانوں کا علاج کی غرض سے انسانی جان کے تحفظ کی خاطر رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا شرعاً جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**تعاونوا علی البر والتقوی**" (سورۂ مائدہ:۲)۔

۴-شدید ضرورت کے وقت نادر گروپ سے تعلق رکھنے والے مریض کو خون کا عطیہ دینا:

اگر کوئی مریض ایسا ہے جس کا خون نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہے جو عام طور سے دستیاب نہیں ہوتا، اور اس مریض کو خون کی شدید ضرورت ہے، دوسری طرف اسی گروپ کا خون والا دوسرا شخص موجود ہے تو ایسی صورت میں اگر اس کے خون دینے سے خود اس کی جان خطرہ میں نہ پڑے تو ایسے شخص کے لئے مذکور ہر نادر گروپ والے مریض شخص کو خون کا عطیہ دینا واجب ہوگا، تاکہ مریض شخص کی جان بچائی جاسکے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (سورۂ مائدہ:۳۲) (اور جس شخص نے کسی شخص کو زندہ رکھا گویا اس نے تمام لوگوں کو زندہ رکھا)۔

۵-کسی مردہ شخص کا جگر کسی مریض کے علاج کے لئے حاصل کرنا ہبہ ہے:

کسی مردہ شخص کے جگر سے اگر کسی زندہ شخص کے جگر کو بدل کر علاج کرنا مفید وضروری ہو تو ایسی صورت میں اس مردہ شخص کے اولیاء کی اجازت سے یا کسی حادثاتی موت میں پوسٹ مارٹم کے وقت سرکار کے حکم سے مردہ شخص کا جگر حاصل کرنا شرعاً درست ہے، "**لأن السلطان ولي من لا ولي له كما رمله ابوداؤد** (۲۰۸۳، ترمذی وابن ماجہ ۱۸۷۹)، **عن عائشة مرفوعا**" (ہدایہ ۳۱۹/۲)۔

۶-کسی زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا قرنیہ کسی آنکھ کے مریض کو عطا کرنا:

اگر کوئی شخص آنکھ کا مریض ہے اگر کسی دوسرے شخص کے آنکھ کے قرنیہ کی اس آنکھ کے مریض نابینا شخص کے حلقہ چشم میں پیوند کاری کردی جائے تو اس سے اس کی بینائی لوٹ آئے تو شرعاً ایسا کرنا جائز ہے بشرطیکہ آنکھ کا قرنیہ کسی زندہ شخص کے بجائے کسی دوسرے مردہ شخص کے قرنیہ سے حاصل کیا جائے کیونکہ جو مر گیا وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ گیا، اب اگر اس کی آنکھ یا اس کے جسم کے کسی دوسرے حصہ سے کسی زندہ شخص کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ زندہ شخص بہ سبب انسان کا خلیفہ ہونے کے مردہ شخص کے اعضاء واجزاء سے فائدہ اٹھالے، اگر کوئی زندہ شخص فائدہ نہ اٹھائے گا تو قبر میں کیڑے مکوڑے اس کے گوشت اور ہڈیوں کو غذا بنالیں گے، رہا کسی مریض کے علاج کی خاطر کسی زندہ شخص کی آنکھ نکال کر اس کو مریض بنانا تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

یاد رہے کہ جس طرح کسی مردہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ کسی زندہ مریض کی آنکھ کے علاج کی غرض سے کسی شخص کو رضا کارانہ دینا جائز ہے اسی طرح اس غرض سے قائم آئی بینک کو بھی کسی مردہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ بطور عطیہ کے دینا جائز ہے، تا کہ بوقت ضرورت کسی مستحق شخص کا اس کے ذریعہ علاج کیا جا سکے۔

۷-مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ کے عطیہ کے حصول کے لئے کیا اجازت ضروری ہے؟

چونکہ حصول ثواب کے لئے شرعا نیت کا ہونا ضروری ہے، لہذا مردہ شخص سے قبل وفات اور اس کے ورثہ سے بعد وفات اجازت لینے سے دونوں کو ثواب ملے گا، اور اس کے خلاف کرنے کی صورت میں فتنہ بھڑکنے کا خطرہ ہے، اور اگر کہیں فتنہ کے بھڑکنے کا خطرہ نہ ہو تو صرف ورثہ کی اجازت بھی شرعا کافی ہوگی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”**ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطانا**“ (سورۂ نساء: ۳۳)۔

۸-انسانی دودھ کے حصول کے لئے دودھ بینک قائم کرنا:

چونکہ مذہب اسلام نے مدت رضاعت میں رضاعت کے سبب حرمت نکاح کے اہم مسئلہ کو متعلق کیا ہے لہذا حصول دودھ کے لئے بینک قائم کرنا فتنہ اور فساد کا پیش خیمہ ہوگا، اس لئے رضاعت کی غرض سے بینک قائم کرنے کے بجائے شخصی طور سے مرضعہ کا انتظام کیا جائے اگر ایسا نہ ہو سکے تو انسانی دودھ کے بجائے جانوروں کے دودھ یا ڈبہ کے دودھ ہی پر اکتفا کیا جائے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”**دع ما یریبک إلی ما لا یریبک**“ (ترمذی ۲، حدیث ۲۵۱۸)۔

۹-مرد یا عورت کے مادہ منویہ کا فروخت کرنا اور ہدیہ دینا یا بینک قائم کرنا:

مرد یا عورت کے مادہ منویہ کا فروخت کرنا اور ہدیہ دینا یا بینک قائم کرنا شرعا جائز نہیں ہے، یہ بے حیائی کو فروغ دینا اور اسلامی قانون کو ختم کرنے کی مکمل تیاری ہے جو سراسر ہلاکت وخسران اور تباہی وبربادی کا پیش خیمہ ہے۔

اور جدہ فقہ اکیڈمی ہی کے دوسرے فقہی سمینار (مؤرخہ ۱۰-۱۶/ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۲-۲۸/ دسمبر ۱۹۸۵ء کی قرارداد ۶) میں دودھ بینک سے متعلق حسب ذیل امور کو ذکر کیا گیا ہے:

اول۔ دودھ بنک کا تجربہ مغربی اقوام نے کیا، لیکن فنی اور سائنسی اعتبار سے اس کے بعض منفی نتائج سامنے آنے کے بعد اس تجربہ سے گریز کا راستہ اختیار کیا گیا اور اس سے دلچسپی کم ہوگئی۔

دوم۔ اسلام میں رضاعت کا رشتہ نسب کے رشتہ کی مانند ہے، اور مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ رضاعت سے بھی وہ سارے رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، اور نسب کی حفاظت شریعت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہیں، دودھ بنک سے نسب میں اختلاط وشبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

سوم۔عالم اسلام میں ایسے سماجی تعلقات ہیں جو ناقص الخلقت، کم وزن والے یا مخصوص حالات میں انسانی دودھ کے ضرورت مند بچوں کے لئے دودھ پینے کا فطری انتظام فراہم کرتے ہیں، اس لئے دودھ بنک کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

چنانچہ اکیڈمی طے کرتی ہے کہ:

اول: عالم اسلام میں ماؤں کے دودھ بنک قائم کرنا ممنوع ہے۔

دوم: دودھ بنک کے دودھ سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی (شرعی فیصلے ص ۸۵)۔

یورپین افتاء کی جانب سے منعقد کئے گئے بارہویں سمینار (۲۰۰۴ء) آئرلینڈ کے اجتماعی فیصلے میں فقہ اکیڈمی جدہ کے مذکورہ فیصلہ کے خلاف حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی:

مغربی ممالک میں قائم دودھ بینکوں سے فائدہ اٹھانا:

کونسل کے ارکان نے اس موضوع پر بحث کی کہ کیا ان مسلمان بچوں کو جو پیدائش کے وقت زیادہ لاغر اور ناقص الخلقت ہوں مغربی معاشرہ میں رائج دودھ بینکوں سے دودھ پلایا جاسکتا ہے جیسا کہ ان بچوں کو زندگی کی حفاظت کے لئے اسکی ضرورت بھی پڑتی ہے، عالم اسلامی فقہ اکیڈمی کے فیصلہ (۲/۶) سے واقفیت کے بعد جس کی رو سے عالم اسلام میں دودھ بینکوں کا قیام اور ان سے دودھ پلانا حرام ہے، کونسل کے بعض ارکان نے اس قسم کے بارے میں فنی تحقیقاتی مقالے پیش کئے، عالم اسلامی فقہ اکیڈمی نے دلیل کے طور پر جن چیزوں کو سامنے رکھا تھا ان میں تبدیلی واقع ہوگئی ہے، اسی طرح مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کے حالات بھی بدل گئے ہیں کہ ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے اور دودھ بینک بھی ہر ملک میں زیادہ سے زیادہ پھیل گئے ہیں، پھر عام مسلم دنیا میں جس طرح دایہ ملتی ہیں وہاں ایسا نہیں لہذا کونسل مندرجہ ذیل فیصلہ کرتی ہے:

اول: ضرورت کے وقت دودھ بینکوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی شرعی مانع نہیں۔

دوم: ان سے فائدہ اٹھانے کے نتیجہ میں حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ دودھ کی مقدار نامعلوم ہے، علاوہ ازیں اس قسم کے بینکوں میں دودھ پیش کرنے والیوں کے نام ظاہر نہ کئے جانے کا قانون نافذ ہونے کی وجہ سے مرضعات نامعلوم ہیں جبکہ ان کی تعداد بے شمار ہوتی ہے، اس بارے میں فقہاء کے اس فیصلہ سے استنباط کیا جارہا ہے کہ اگر گاؤں میں کوئی نامعلوم عورت دودھ پلادے تو تحدید نہ ہونے کے باعث حرمت نہ پھیلے گی، اس کے جواز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دودھ مخلوط ہے اور اس میں غالب تناسب کس کا ہے یہ معلوم کرنا بھی ممکن نہیں (اجتماعی فیصلے اور فتاوی یورپین علماء کونسل ص ۲۱۹، ۲۲۰، مطبوعہ آئی او ایس، نئی دہلی)۔

انسانی اعضاء واجزاء کا عطیہ-شرعی تناظر میں

مفتی جنید بن محمد پالنپوری☆

۱- خون جسم کا ایک ناپاک جز ہے، اس لئے عام حالات میں اس کا جسم میں چڑھانا درست نہیں، ایک تو وہ ناپاک ہے، دوسرے اس لئے کہ وہ انسان کا جز ہے اور انسانی اعضاء واجزاء سے ان کی تکریم کی وجہ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں، ”**ولقد کرمنا بنی آدم**“۔

جہاں تک پہلی وجہ یعنی اس کے ناپاک ہونے سے متعلق ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے اضطراری حالت میں تداوی بالمحرم کی اجازت دی ہے۔

”**یجوز للعلیل شرب الدم والبول وأکل المیتة للتداوی إذا أخبره طبیب مسلم أن شفاءہ فیه ولم یجد من المباح ما یقوم مقامه**“(ہندیہ ۵/۳۵۵)۔

”**الإستشفاء بالمحرم إنما لا یجوز إذا لم یعلم أن فیه شفاء، أما إذا علم أن فیه شفاء ولیس له دواء أخر غیرہ، فیجوز الإستشفاء به**“(المحیط البرہانی، کتاب الإستحسان، الفصل التاسع عشر فی التداوی والمعالجات ۶/۱۱۶)۔

خون کے استعمال کے حرام ہونے کی دوسری وجہ یعنی اس کے جزءِ انسان ہونے کا تعلق ہے، اس میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خون اگرچہ جزءِ انسانی ہے مگر اس کو دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے بدن میں ڈالا جاتا ہے اس لئے اس حیثیت سے اس کی مثال انسانی دودھ کی سی ہوگئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے نکلتا ہے اور دوسرے انسان کے بدن کا جز بنتا ہے اور شریعت نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے اور بچوں کو ماں کا دودھ پلانا صرف جائز نہیں بلکہ عام حالات میں واجب قرار دیا ہے۔

☆ دار الافتاء والارشاد، مدرسہ انور محمدی، ملاڈ ممبئی۔

بچوں کے علاوہ بڑوں کے لئے بھی دوا اور علاج کے لئے عورت کے دودھ کو حضرات فقہاء نے جائز قرار دیا ہے،"ولا بأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء" (ہندیہ ۱۱۲/۴)۔

اس لئے جزءِ انسانی ہونے کی حیثیت سے اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید قیاس نہیں، لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح شریعت اسلام نے عورت کے دودھ کو جزءِ انسانی ہونے کے باوجود ضرورت کی بنا پر بچوں کے لئے اور کبھی بڑوں کے لئے جائز قرار دیا ہے، اسی طرح ضرورت کی بناء خون دینا بھی جائز ہے (مستفاد از جواہر الفقہ ۴۰/۷ تا ۴۶، کتاب الفتاوی ۲۱۲/۶، ۲۱۳)۔

غیر مسلم کا خون مسلمان کے بدن میں داخل کرنے کے نفس جواز میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ کافر یا فاسق فاجر انسان کے خون میں جو اثرات خبیثہ ہیں ان کے منتقل ہونے اور اخلاق پر اثر انداز ہونے کا خطرہ قوی ہے، اسی لئے صلحاء امت نے فاسق فاجر عورت کا دودھ پلوانا بھی پسند نہیں کیا، بناعلیہ کافر اور فاسق فاجر انسان کے خون سے تا بمقدور اجتناب بہتر ہے (جواہر الفقہ ۴۹/۷)۔

۲- دوسروں کا خون استعمال کرنا ظاہر ہے کہ اضطراری حالت میں جائز ہے، جب خون کا استعمال جائز ہے تو خون کا ہبہ کرنا بھی جائز ہے، "لأن الشيء إذا ثبت ثبت بجميع لوازمه"، ہبہ کرنے کے لئے حالت اضطرار کا انتظار ضروری نہیں، حادثہ پیش آنے میں بروقت خون نہیں ملا، یا خون ایک دوسرے کے موافق ثابت نہیں ہوا تو جب تک گروپ ملایا جائے گا اور گروپ والے آدمی کو تلاش کیا جائے گا مریض کی جان چلی جائے گی، لہذا خون کا عطیہ دینا اور مسلمانوں کی طرف سے بینک قائم کرنا اور اس اچھے کام کے لئے کیمپ لگانا جائز اور درست ہے (فتاوی قاضی ص ۲۱۱، منتخبات نظام الفتاوی ۳۵۵/۱)۔

البتہ خون کے عطیہ کیمپ لگانے کے لئے کسی خاص تاریخ کا تعین نہ کیا جائے جیسا کہ سوال میں حضور ﷺ کی تاریخ پیدائش پر بلڈ کیمپ لگانے کا تذکرہ ہے، رفتہ رفتہ بدعات اسی طرح در آئی ہیں۔

۴- ایسے موقع پر خون دینا مستحسن ہوگا کہ کسی کی جان بچ جائے، البتہ اسے واجب کہنا مشکل ہے بایں معنی کہ یہ نہ مطلقا مال متقوم ہے کہ اس کو فروخت کرنا جائز ہو اور نہ کھانے پینے کی اشیاء کی طرح ہے کہ مضطر کے لئے زبردستی لینے کی اجازت اور گنجائش ہو۔

۵- ہمارے بہت سے اکابر مفتیان کرام انسانی اعضاء کی پیوندکاری کو اس کے ہزار تر فوائد کے باوجود ناجائز لکھ چکے ہیں اور آج بھی لکھ رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ انسانی اعضاء بازار میں بکرے کے گوشت کی طرح فروخت ہونے

شروع ہوجائیں اور لوگ مالی آسودگی کی خاطر اپنے اعضا بیچنے لگیں۔

اور یہ اندیشے آج حقیقت میں تبدیل ہونے لگے، حال میں ایک ایک استفتاء احقر کے دارالافتاء میں آیا کہ ایک صاحب نے بوڑھاپے میں مالی تنگی سے بچنے کی خاطر اپنا ایک گردہ ساڑھے پانچ لاکھ روپیوں میں بیچ دیا اور اب سوال یہ کر رہے ہیں کہ ان روپیوں کے آنے کی وجہ سے ان پر حج فرض ہوگا یا نہیں؟ ان پیسوں کو بینک میں رکھنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر رکھ دے تو ان پر جو انٹرسٹ ملے گا اس کا کیا حکم ہے؟ (ان صاحب کا پورا پتہ محفوظ ہے)۔

البتہ بعض اکابر مفتیان کرام نے انسانی فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اعضاء کے پیوندکاری کی اجازت دی ہیں مگر صورت مسئولہ میں تو ان کے نزدیک بھی جائز نہ ہوگا کیونکہ جگر تو انسان کے بدن سے اس کی موت کے بعد ہی نکالا جائے گا ورنہ اس کی موت یقینی ہے تو گویا یہ موت کے بعد جگر دینے کی وصیت ہوئی اور اعضاء کی وصیت کے تو یہ حضرات بھی قائل نہیں۔

دوسرے فقہی سمینار (دہلی) منعقدہ ۱، ۲، ۱۳ اپریل ۱۹۸۹ میں اعضاء کی پیوندکاری کے مسئلہ پر جو تجاویز طے پائیں اس کی آخری شق اس طرح ہے:

''اگر کسی شخص نے ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوندکاری کے لئے استعمال کئے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع اسے اصطلاحی طور پر وصیت نہیں کہا جاسکتا اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابل اعتبار نہیں''۔

خلاصہ یہ کہ جگر دینے کی وصیت کرنا جائز نہیں۔

۶-الف: آج کل سرجری کی حیرت انگیز ترقیات نے اس معاملہ میں عجیب عجیب کرشمے دکھلائے ہیں اور ایک انسان کے عضو سے دوسرے بیمار یا معذور انسان کی تکلیف دور کرکے علاج ومعالجہ کا بہ ظاہر ایک نہایت مفید باب کھول دیا ہے۔

لیکن ہر فائدے کی چیز کو مفید اسی وقت کہا جاسکتا ہے جبکہ اس کے پیچھے فائدہ سے زیادہ نقصان اور شخصی یا قومی مضرتیں نہ ہوں، ورنہ مطلقاً فائدے سے تو دنیا کا کوئی جرم خالی نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تبادلہ اعضاء انسانی کے مفید پہلو کے ساتھ اس کے مضر پہلوؤں کو نظرانداز نہ کیا جائے۔

اگر انسان کے ساتھ بھی معدنیات، نباتات والا معاملہ ہو کہ اس کی کھال اور بال اور اعضاء کو قطع و برید کر کے استعمال کیا جائے تو یہ انسانی شرافت وتکریم اور منشاء تخلیق کائنات کے بالکل منافی ہے، اس لئے انسانی اعضاء کی خرید و فروخت، کاٹ تراش کر استعمال کو سنگین جرم اور سخت جرم قرار دیا ہے اور دنیا کے ہر دور میں اور عقلاء وحکماء نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی مختلف شریعتوں کا بھی اس پر اتفاق رہا ہے۔

انسان کے اعضاء واجزاء انسان کی اپنی ملکیت نہیں ہیں جن میں وہ مالکانہ تصرفات کرسکے اسی لئے ایک انسان اپنی جان یا اپنے اعضاء وجوارح کو نہ بیچ سکتا ہے، نہ کسی کو ہدیہ اور ہبہ کے طور پر دے سکتا ہے اور نہ ان چیزوں کو اپنے اختیار سے ہلاک وضائع کرسکتا ہے۔

شریعت اسلامیہ کے اصول میں تو خودکشی کرنا اور اپنی جان یا اعضاء رضا کارانہ طور پر یا بالقیمت کسی کو دینا قطعی طور پر حرام ہے جس پر قرآن وسنت کی نصوص صریحہ موجود ہیں۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: "**مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاک فقال له رجل اقطع يدی وكلها أو قال اقطع منی قطعة وكلها لا يسعه أن يفعل ذلک ولا يصح أمره به كما لا يسع للمضطر أن يقطع قطعة من نفسه فياكل كذا فی فتاوی قاضی خان ومثله فی اكراه**" (البزازیۃ علی ہامش الہندیہ ۶/۱۱۶، ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوی ۲/۳۳)۔

شرح کبیر میں ہے: "**ألاترى أنه لوابتلى بمخمصة لم يحل له أن يتناول احدا من اطفال المسلمين لدفع الهلاک عن نفسه**" (۳/۲۶۹، ۲۷۰ جواہر الفقہ ملخصا)۔

ب، ج – شریعت اسلام نے صرف زندہ انسان کے کارآمد اعضاء ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بیکار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے اور مردہ انسان کے کسی عضو کی قطع وبرید کو بھی ناجائز کہا ہے اور اس معاملہ میں کسی کی اجازت اور رضامندی سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی اور اس میں مسلم اور کافر سب کا حکم یکساں ہے، کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے، تکریم انسانی کو شریعت اسلام نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ کسی وقت اور کسی حال میں کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی طمع دامن گیر نہ ہو، اور اس طرح یہ مخدوم کائنات اور اس کے اعضاء واجزاء عام استعمال کی چیزوں سے بالاتر ہیں، جن کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں اور دواؤں اور دوسرے مفادات میں استعمال کیا جاتا ہے، اس پر ائمہ اربعہ اور پوری امت کے فقہاء متفق ہیں (جواہر الفقہ)۔

۷- وصیت کی شرائط میں سے ہے کہ جس شئی کی وصیت کی جائے وہ مال متقوم ہو اور وہ چیز وصیت کرنے والے کی ملک ہو، چنانچہ عالمگیری میں ہے: "**وشرطها كون الموصى اهلا للتمليک والموصى له أهلا للتملک والموصى به يعد الموصى مالا قابلا للتمليک**" (ہندیہ ۶/۹۰، کتاب الوصایا)۔

اسی طرح بدائع الصنائع اور شامی میں ہے: چونکہ انسانی اعضا مال نہیں ہیں اور نہ انسان اپنے اعضاء کے مالک ہیں، اس لئے اپنے اعضاء میں سے نہ کسی عضو کو ہبہ کرسکتا ہے نہ عطیہ دینے کی وصیت کرسکتا ہے، اگر وصیت کرجائے تو اس کی

تنفیذ جائز نہیں (فتاوی بینات ۴/ ۳۵۲-۳۵۳ ملخصا)۔

ہمارے اکابر مفتیان کرام نے حیات میں اعضاء کے عطیہ پر جواز کا فتوی دینے میں جن خدشات کا اظہار فرمایا تھا کہ انسانی اعضاء بھی کہیں بکاؤ مال کی طرح بازار میں بکنے نہ لگے، یقیناً آج وہ دور آ گیا ہے جیسا کہ راقم نے جواب نمبر ۵ میں اپنے یہاں آئے استفتاء کے حوالہ سے لکھا ہے۔

پس اسی طرح اعضاء انسانی کی موت کے بعد عطیہ کی وصیت کے چلن کے عام ہونے پر اس بات کا خدشہ ہے کہ مورث اپنے ورثاء کی مالی تنگی کو دور کرنے کی خاطر اپنی موت کے بعد اپنے اعضاء کو فروخت کر کے آئی رقم کو ورثاء میں تقسیم کرنے کی وصیت کر دے، انسان بڑا حریص ہے، مال کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہے کہیں اپنے مورث سے زبردستی لکھوا کر اس کی موت کے بعد اس کے دوسرے مال کی طرح اعضاء کی بھی ورثاء کے بیچ تقسیم نہ کر دے۔

انسان کی حیات میں چند شرطوں کے ساتھ اعضاء کے عطیہ کے جواز کے قائلین بھی وصیت کو نا جائز ہی لکھتے ہیں، جیسا کہ جواب نمبر ۵ میں دوسرے فقہی سمینار (دہلی) کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

۸- اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ ماں کا دودھ نومولود بچے کے لئے غذائیت سے بھرپور اور تقویت بخش ہوتا ہے۔

اسلام اصولی طور پر اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک خاتون اپنے بچے کے علاوہ دوسرے بچوں کو دودھ پلائے، حدیث کی کتابوں میں بہ کثرت اس کی نظیریں ملتی ہیں، اور نکاح میں حرمت رضاعت کے تمام احکام اسی پر مبنی ہیں۔

البتہ دودھ بینک قائم کرنے میں دو مسئلے پیدا ہوں گے، ایک دودھ کی خرید و فروخت کا اور دوسرا رضاعت کا۔

اس پر تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ دودھ پلانے والی دودھ پلائی کی اجرت لے سکتی ہے اور اس کی بھی خود قرآن مجید میں صراحت موجود ہے کہ جو اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہیں انہیں چاہئے کہ اس کی اجرت ادا کریں، فقہاء نے بھی اس کی وضاحت فرمائی ہے (خلاصہ الفتاوی ۳/ ۱۴۷)۔

لیکن بیع اور اجارہ کے درمیان فرق ہے، حنفیہ کے یہاں دودھ کے اجزاء انسانی میں سے ہونے کی وجہ سے اس کی بیع جائز نہ ہوگی۔

"قال في الهداية: لا يجوز بيع شعور الإنسان ولا الانتفاع به، لأن الأدمي مكرم ولا مبتذل فلا يجوز أن يكون شئ من أجزاءه مهانا مبتذلا" (ہدایہ ۳/ ۳۹)۔

البتہ امام شافعیؒ کے یہاں دودھ کی بیع درست ہے اور یہی رائے امام احمدؒ کی ہے، "ومن ذلك قول الشافعي وأحمد بجواز بيع لبن المرأة مع قول ابى حنيفة و مالك لا يجوز بيعه" (المیزان الکبری ۲/ ۷۴، مستفاد از جدید فقہی

مسائل ۱/۹۷۳،۳۸۰)۔

حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ نے بغیر ضرورت اور بہ قدر ضرورت دودھ کو مہیا رکھنے کی گنجائش دی ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/۴۰۳)۔

آج کے دور میں دودھ پلانے والی عورتوں کا ملنا بہت مشکل ہے چونکہ اس کا رواج ہی نہیں رہا نیز بہت سی عورتوں کو تو دودھ ہی نہیں اترتا، بعض عورتوں کو ان کی بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر بچہ کو دودھ پلانے سے منع کر دیتا ہے اور بچہ ہے کہ باہر کے دودھ کو ہضم نہیں کر پاتا، ایسی صورت میں دودھ کے بینک کا قیام مفید معلوم ہوتا ہے، مگر چند شرطوں کے ساتھ۔

پہلی شرط یہ کہ عورت اپنا دودھ بہ طور ہدیہ اور بخشش، بینک میں جمع کرائیں چونکہ اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے (ہدایہ ۳/۳۹)۔

دوسری شرط عورت کا دودھ اس کے نام مع ولدیت اور مکمل پتہ کے ساتھ محفوظ رکھا جائے، تاکہ رضاعی رشتوں کی تمیز ممکن رہے، اور جب کسی بچہ کو بینک سے دودھ دیا جائے تو اس صورت میں بچہ کے والدین اور جس عورت کا دودھ ہے ان کا آپس میں مکمل تعارف کرایا جائے کہ ان لوگوں کو حرمت رضاعت کا علم ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ بینک بھی اس دودھ کو مفت ہی دیں، فروخت کرنا جائز نہ ہوگا، البتہ دودھ کو محفوظ رکھنے کا خرچ فارم بھروانے کے نام پر لینے والے سے وصول کرنے کی گنجائش ہوگی۔

حاصل کلام یہ کہ ان شرائط کے ساتھ دودھ کا بینک قائم کرنا درست ہوگا، مگر فی الواقع ان شرائط پر عمل بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، کون عورت ہے جو اپنا دودھ بلا قیمت دے گی، کون اس کو محفوظ رکھ کر خدمت خلق کا جذبہ رکھتا ہے، اور سب سے اہم اور مشکل بات کہ کہیں حرمت رضاعت کا علم ہو پایا تو رضاعی رشتہ والوں کا آپس میں نکاح انجانے میں ہوگا مگر ہوگا تو حرام ہی، لہذا احتیاط بہتر ہے۔

۹- حدیث شریف میں آیا ہے: **"لا یحل لا مری یؤمن باللہ والیوم الآخر أن یسقی ماء ہ زرع غیرہ"** (مشکوۃ المصابیح ۲/۲۹۰)۔

حاصل یہ کہ قرآن وحدیث میں حصول اولاد کے لئے جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنی منکوحہ بیوی سے فطری طریقہ سے جماع کرے، ارادہ اولاد کی پیدائش کا کرے، اس کے بعد عورت اس سے حاملہ ہو کر بچہ جنے (فتاوی بینات ۴/۳۲۲،۳۲۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مادہ منویہ کا بینک قائم کرنا اور مرد و خواتین کا اس میں اپنا مادہ منویہ جمع کرانا یا حاصل کرنا سب

ناجائز اور حرام ہے۔

اس طرح کنواری ماں بننے کا چلن عام ہوگا اور نسب بھی محفوظ نہ رہے گا، یہ عمل بہت سے احکام شریعت کو منہدم کرنے والا ہے۔

وہ اجنبیہ عورت جس کے رحم میں کسی غیر مرد کا مادہ منویہ پہنچایا گیا ہو وہ عورت عقل سلیم کے نزدیک مزنیہ اور فاحشہ قرار پائے گی اور اس کی شناعت عقل سلیم کے نزدیک زنا و لواطت سے بھی زیادہ قبیح و مذموم ہوگی (مستفاد از منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۳۱۰، ۴۲۲)۔

☆☆☆

اعضاء انسانی کا عطیہ

مفتی محمد سلطان کشمیری☆

تمہید:

قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق اللہ نے انسان کو افضل المخلوقات بنایا ہے، اور مکرم بنایا ہے، اور اس دنیا کے اندر ممتاز درجہ عطا کیا ہے۔

سورہ ''تین'' میں اللہ کا ارشاد ہے: ''**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**''، اسی طرح سورہ علق میں فرمایا: ''**علم الانسان مالم یعلم**'' اور دیگر کئی مقامات پر اللہ نے انسان کی فضیلت اور اس کی افضلیت کو واضح فرمایا ہے، اللہ نے دنیاوی اشیاء کو انسانی نفع کے لئے ہی پیدا کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جانوروں کے دودھ سے لے کر گوشت اور ہڈیاں تمام انسانی نفع کے لئے ان کے استعمال کو شریعت نے درست قرار دیا ہے۔

وہ اشیاء جو اصلا انسان کے لئے حرام ہیں حالت اضطراری میں شریعت مطہرہ انہیں بھی استعمال کی گنجائش دے دیتی ہے۔

گویا کہ انسان اپنی جان حفاظت کی خاطر بطور علاج کے انسان کے علاوہ تمام اشیاء کا استعمال ضرورت کے تحت کر سکتا ہے، لیکن انسانی اجزاء کا استعمال شرعا درست نہیں اس لئے کہ یہ انسانی تکریم کے خلاف ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: ''اس ناحیہ سے علماء اسلام کی ایک معتبر جماعت اس طرف چلی گئی ہے کہ انسانی اجزاء کا دوسرے انسان کے علاج معالجہ کے لئے استعمال کرنا درست نہیں ہے، البتہ جمادات و نباتات بلکہ حیوانی اجزاء کا استعمال انسانی نفع کے لئے اور انسانی بقاء کے لئے یقیناً درست اور جائز ہے'' (نوازل فقہیہ معاصرہ ۲/۲۱۱)۔

☆ سراج العلوم سری نگر، کشمیر۔

خون کا عطیہ، بلڈ بینک اور بلڈ کیمپ کی شرعی حیثیت:

فقہاء اسلام کی طرف سے جو اصطلاحیں کتب فقہ میں درج ہیں، ان میں ایک اصطلاح ''ضرورت'' کی ہے، ضرورت کی تعریف کرتے ہوئے حضرت مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

''اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب المرگ ہوجائے گا''۔

فقہاء اسلام نے ضرورت کو اضطرار سے ماخوذ مانا ہے، اور حالت اضطرار میں قرآن نے حرام اشیاء کے ذریعہ انسانی جان کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے کو درست قرار دیا ہے، سورہ بقرہ میں اللہ کا ارشاد ہے:

"**فمن اضطر فى مخمصة غير متجانف لاثم فإن الله غفور الرحيم**"اس آیت کریمہ سے فقہاء نے جو استدلال کیا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء محرمہ سے اس وقت علاج انسانی درست ہے جبکہ انسانی جان کو بچانے کے لئے کوئی جائز اور مشروع صورت نہ ہو، مزید حاجت کو ضرورت کا درجہ نہ دیا گیا ہو، گویا کہ صرف اندیشہ اور ظن کی بناء پر حرام اشیاء کا استعمال بطور علاج درست نہ ہوگا۔

احادیث مبارکہ میں حرام اشیاء سے علاج ثابت ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ضرورت کی بنا پر انسانی جان بچانے کے لئے ان کا استعمال کرنا چاہئے، نبی علیہ السلام نے اصحاب عرینہ کو ازراہ علاج اونٹ کے پیشاب کے پینے کی اجازت دی تھی، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"**عن أنس ان ناسا اجتووا فى المدينة فأمرهم النبى ﷺ أن يلحقوا براعيه يعنى الابل فيشربوا من ألبانها وأبوالها فلحقوا براعيه فشربوا من ألبانها وأبوالها حتى صلحت أبدانهم**''(بخاری ۲/ ۸۴۸)۔

حضرت عرفجہؓ کے لئے سونے کی ناک بنوانے کی اجازت دی گئی جبکہ مردوں کے لئے سونے کا استعمال حرام ہے، قرآن کریم میں مردار اور سور کا گوشت کھانے کی اجازت موجود ہے جبکہ اس کا حرام ہونا قطعی اور صریح ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی "**الضرر يذال**"، "**الضرورات تبيح المحظورات**" اور "**اذا تعارضت مفسدتان روعى اعظمها ضررا بارتكاب اخفهما**'' کی روشنی میں فرماتے ہیں:

''بلڈ بینک اس وقت ایک ضرورت ہے صورت حال یہ ہے کہ انسان کبھی بھی کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوسکتا ہے، اور اسے خون کی ضرورت پڑسکتی ہے، پھر ہر آدمی کا خون ہر آدمی کے جسم کے لئے موزوں نہیں ہوتا، بلکہ ضروری ہے کہ اجزاء کے لحاظ سے خون کا گروپ یکساں ہو، اس کے بغیر جسم دوسرے خون کو قبول نہیں کرتا، بلڈ بینک پہلے سے مختلف نوعیت کے خون

علاحدہ علاحدہ رکھتا ہے، جن سے یہ سہولت مریض کے مناسب حال خون لیا جا سکتا ہے‘‘۔

مولانا لکھتے ہیں: ’’ایسے بینک ایک طبی ضرورت بن گئے ہیں اور ’’الضرورات تبیح المحظورات‘‘ کے تحت اس کی اجازت دینی چاہئے‘‘ (جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۳۶)۔

جہاں تک خون کی خرید وفروخت کا مسئلہ ہے تو اس سے نبی علیہ السلام نے صراحتاً منع فرمایا ہے، خون کی تجارت کا عام کرنا، اور اس کی عمومی اجازت یقیناً نبی علیہ السلام کے صریح ارشاد گرامی کی مخالفت ہوگی، اور حدیث رسول علیہ السلام پر زیادتی، جو قطعاً ناجائز ہے، البتہ خون جو بلڈ بینک کی صورت میں جمع ہے انتہائی مجبوری اور اضطراری حالت میں اس کا خریدنا درست ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی انسان کی جان کو ایک ظالم کے پنجوں سے بعوض مال ہلاک ہونے سے بچانا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے مجمع الفقہ الاسلامی منعقدہ ۱۳ تا ۲۰ رجب ۱۴۰۹ کے اجلاس کے حوالہ سے اپنی بات کو استحکام بخشا ہے، اور خرید وفروخت کی ضرورت کی حرمت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ صرف خریدنے کی حلت کو بیان فرمایا ہے (حوالہ مذکورہ ۱/ ۳۳۶)۔

خون کے یکساں گروپ ہونے کی صورت میں دینے والے کا شرعی حکم:

یہ بہت ممکن ہے کہ مریض کا خون کسی نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو اور اس کا حصول نہایت مشکل ہو، لیکن جب ملے اور مریض کو اس کی اشد ضرورت بھی ہو تو دینے والے کے لئے شرعی احکام کیاں ہوں گے آیا اس پر واجب اور لازم ہوگا کہ وہ مریض کے لئے خون مختص کرے اور اسے ہلاکت سے بچانے کی حتی المقدور کوشش کرے۔

انسانی جان بچانا دوسرے انسان پر ہر اعتبار سے لازم کے درجہ میں ہے، اور اسباب و ذرائع مہیا ہونے کے باوجود انسانی جان کا ضیاع ہر طرح سے جرم عظیم کہلاتا ہے، مخلوقات میں اعلی و افضل مخلوق انسان ہے، اور انسان کو اللہ نے مکرم بنایا ہے، مکرم مخلوق کی حفاظت کے انتظامات بھی یقیناً اعلی ہوتے ہیں، اس لئے خالی گروپ کے حامل انسان پر واجب ہوگا کہ وہ مریض کو ہلاکت سے بچانے کے لئے خون کا عطیہ کرے۔

راقم کی رائے واجب کی اس لئے بنی کہ مریض کو ہلاکت سے بچانا اہم اور لازم ہے، خون کے عطیہ کے بعد جب یہی یقینی ہے کہ دونوں اشخاص کی جانیں محفوظ رہیں گی تو قاعدہ فقہیہ کے تحت خون کا عطیہ واجب ہوگا۔

فقہاء نے دو قاعدے اس کے لئے اپنی کتب میں درج کئے ہیں۔

حضرت مفتی شفیع صاحب نے بھی ان احوال کو حالت اضطراری پر محمول فرمایا ہے اور اضطراری صورت میں اشیاء

ممنوعہ کے استعمال پر تقریباً تمام فقہاء کا اتفاق ہے اور واجبی صورت ہی کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہیں۔

جگر کی پیوندکاری اور اس کی شرعی حیثیت:

جگر اور آنکھ کی دوسرے انسان کی جانی حفاظت کے لئے منتقلی یقیناً بظاہر ایک مفید عمل ہے اور یہ فائدہ ہے کہ زندہ انسان کی حیات کا ذریعہ بنے، لیکن یہاں پر ہماری یہ ذمہ داری بھی ہے کہ ہم اس کے نقصانات بھی مدنظر رکھیں، موجودہ دور یقیناً فتنے کا دور ہے، راقم کے نزدیک جگر اور آنکھ کی منتقلی کے جواز کو اپنانے کے باوجود احتیاط یہی ہے کہ عدم جواز ہی کا فتویٰ عام کیا جائے۔

اور اس بارے میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کی تحریر واضح ہے۔

''یہ صورت بظاہر مفید ہی نہیں مفسد ہے کہ مرنے والے کے سارے ہی اعضاء فنا ہونے والے ہیں ان میں سے کوئی عضو اگر کسی زندہ انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے، یہ ایسا معاملہ ہے کہ عام لوگوں کی نظریں صرف اس کے مفید پہلو پر جم جاتی ہیں اور اس پر وہ مہلک نتائج نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں مگر شریعت اسلام جو انسانی اور انسانیت کے ظاہری اور معنوی صلاح وفلاح کی ضامن ہے اس کے لئے مضر اور مہلک نتائج سے صرف اور صرف ظاہری فائدہ کی بناء پر اس کی اجازت دینا ممکن نہیں، شریعت اسلام نے صرف زندہ انسان کے کارآمد اعضا ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بیکار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے اور مردہ انسان کے کسی عضو کی قطع وبرید کو بھی ناجائز کہا ہے اور اس معاملے میں کسی کی اجازت اور رضامندی سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی اور اس میں مسلم وکافر اس کا حکم یکساں ہے، کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے، تکریم انسانی کو شریعت اسلام نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ کسی وقت کسی حال میں کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی طمع دامن گیر نہ ہو اور اس طرح یہ مخدوم کائنات اور اس کے اعضاء عام استعمال کی چیزوں سے بالاتر رہیں جن کو کانٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں اور دواؤں اور دوسرے مفادات میں استعمال کیا جاتا ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۵۰)۔

مذکورہ تحریر کی روشنی میں (عصر حاضر کے منتخب علماء) کا رجحان جواز کی طرف ہونے کے باوجود عدم جواز کی رائے احتیاط پر مبنی ہے۔

انسانی دودھ کی تجارت اور حرمت رضاعت:

رضاعت کے سلسلے میں قرآن کریم اور حدیث رسول اللہ ﷺ میں حکم موجود ہے کہ جس طرح نسبی اولاد کا آپسی

نکاح غیر درست ہے اسی طرح رضاعت کے پائے جانے کے بعد یہی حکم ہوگا،''وأمهاتكم التي ارضعنكم وأخواتكم من الرضاعة''، نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی:''يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب''(بخاری)،رضاعت کے ثبوت میں ایک تو شوہر کا اقرار واعتراف ہے اور دوسرا گواہوں کی شہادت پر،اور رضاعت کے ثبوت کے لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کوئی خاصی مقدار متعین نہیں ہے۔ہدایہ حاشیہ نمبر ۸ پر موجود ہے:''والرضاعة تحصل يمص ولاحاجة الى الشبع''،یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ بچوں کے لئے ماں ہی کا دودھ انفع ہے جبکہ عصر حاضر میں تقریبا پورے عالم کی نوعیت یہ ہے کہ خواتین کے پاس دیگر مصروفیات کی بنا پر اپنے بچوں کے لئے دودھ پلانے کا وقت میسر نہیں ہے،آئے دن یہ صورت حال اور بھی نازک بنتی جارہی ہے،یہی وجہ ہے کہ کافی مقامات پر دودھ بینک قائم کئے گئے ہیں اور مخصوص خواتین سے بچوں کے لئے دودھ فراہم کیا جاتا ہے۔گویا یہ موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت بنتی جارہی ہے۔

قرآن وحدیث اور فقہاء کی تشریحات کے مطابق راقم کی رائے یہ بنتی ہے کہ رضاعت کے ثبوت کے لئے یقینی ثبوت ہو،وہ صرف دو ہی صورتوں میں ممکن ہے ایک تو خود اقرار زوج،اور دوسرا گواہوں کی شہادت۔

دودھ بینک کے قیام کی صورت میں اگر کوئی ایسی شکل بنتی ہے کہ ہر عورت کا دودھ متعین اور واضح ہو اور اس کے بارے میں اطلاعات فراہم ہوں تو بچے کے دودھ کے استعمال کے بعد حرمت رضاعت یقینی ہے،شرعا اس پر رضاعت کا حکم نافذ ہوگا۔

دودھ بینک میں اگر کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے،اور ہر خاتون کے دودھ کو ایک ہی جگہ جمع رکھا گیا ہے تو ایسی صورت میں معاملہ مشتبہ ہونے کی بنا پر شبہ رضاعت کا ثبوت بھی مشکل ہوگا۔اس صورت میں نہ اقرار ممکن ہے نا ہی گواہوں کی شہادت، اس لئے ممکنہ حد تک گواہی کے بعد رضاعت کے احکام جاری ہوں گے اور بچوں کی زندگی کے لئے حفاظت کے طور پر دودھ بینک کے قیام کی اجازت بھی ضرور ہونی چاہئے،اور دودھ کی بیع درست ہوگی،یہ اس صورت میں جبکہ اس کی ضرورت ہے،حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک عورت کے دودھ کی بیع کی اجازت ہے،یہی خیال حضرات حنابلہ کا بھی ہے۔

مادہ منویہ بینک اور اس کی شرعی حیثیت:

شریعت اسلام نے نکاح کی صورت میں اہل اسلام کو ایک اعلی اور خوبصورت نظام عطا کیا ہے،نبی علیہ السلام نے خود اس پر عمل کر کے امت کے لئے بہتری نمونہ پیش کیا،قبل از نکاح شرعی نقطہ نگاہ سے ایک مرد،خاتون کو دیکھ بھی نہیں سکتا، چہ جائیکہ بات اور گفتگو کرے،نکاح سے قبل اگر مرد وزن آپسی اختلاط اختیار کریں تو ملعون کہلاتے ہیں اور جرم عظیم میں مبتلا ہو

کر حیران و پریشان نظر آتے ہیں، یہ جہاں اسلامی قوانین کی خلاف ورزی اوران کی بغاوت ہے وہی پر دنیوی عدالتوں میں یہ مجرم کہلاتے ہیں اور سزا کے مستحق قرار دیئے جاتے ہیں۔

شریعت مطہرہ نے عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے کے لئے ایجاب وقبول وشہادت کے ساتھ ساتھ مرد کے لئے مہر کی ادائیگی کو عورت کی طرف لازم کیا بلکہ عورت کو یہ حق بھی دیا کہ وہ مرد کے ٹال مٹول پر اپنی ذات کو اس کے سامنے پیش کرنے سے روکے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

”ولا جل الحفاظ على النسب قداوجبت العدة على المرء ة بعد انفصالها من زوج الى آخر فيقول العلامة الشاه ولى الله الدهلویؒ: منها معرفة براء ة رحمها من مائه لئلا تختلط الأنساب، فالنسب أحدمايتشاح به، ويطالبه العقلاء وهو من خواص نوع الانسان ومما امتازجه من سائر الحيوان“(نوازل ۲؍۱۷۴)۔

☆☆☆

اعضاء انسانی کا عطیہ-فقہ شافعی کی روشنی میں

مفتی رجیب قاسمی، کیرالا

عصر حاضر کی ترقی ایک ہوش ربا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی بیماریوں کا سیلاب بھی امڈ آیا ہے اور ہر دن نئی بیماریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کے علاج ومعالجہ کے مختلف طریقے بھی وجود میں آرہے ہیں، ان بیماریوں کے ظاہری اسباب کسی سے مخفی نہیں ہیں، غذا اور اجناس کی زیادتی وبڑھوتری بشکل کھاد مختلف قسم کے کیمکل سے جو کچھ ہورہا ہے اور اس سے جو بیماریاں پیدا ہورہی ہیں اس کا قدیم زمانے میں تصور بھی نہ تھا، اور بیماریاں اس طرح سے بڑھتی ہیں کہ ایک بیماری کے علاج کا طریقہ ابھی دریافت بھی نہ ہو پاتا ہے کہ دو بیماریاں سامنے آ کھڑی ہوجاتی ہیں اور کچھ بیماریاں تو ایسی ہیں کہ ابھی تک موجودہ سائنس وفن طب کی دریافت وہاں تک نہیں پہنچ سکی ہے، حالانکہ آپ ﷺ کی حدیث پاک "**عن جابر عن رسول الله ﷺ انه قال: لكل داء دواء فاذا اصيب دواء الداء برأباذن الله عز و جل**" (مسلم)۔ برحق ہے لیکن حق یہ ہے کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہوچکا ہے پس دوا کی دریافت کا دارومدار قیاس پر ہوگا۔

زیر موضوع مسئلہ پر اگر غور کیا جائے تو اول مرحلہ میں سمجھ میں آتا ہے کہ اعضاء کی پیوندکاری درحقیقت علاج کا بدل ہے، نہ خود علاج وہ ہے جو عضو ناکارہ کو داؤں کے ذریعہ کارآمد بنایا جائے، لیکن اگر انسان کی جان بچانے کے لئے اگر یہی ایک راستہ ہو تو اس کو اپنانا ہی پڑے گا اور اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

اعضاء کی پیوندکاری کے سلسلہ میں دو شخص زیر بحث آتے ہیں، ایک عطیہ دینے والا اور دوسرا عطیہ لینے والا، جہاں تک مسئلہ ہے عطیہ لینے والے کا تو وہ مضطر ہے یا محتاج ہے علاج کے واسطے حرام اشیاء بھی اس کے لئے حلال ہوجاتا ہے۔

لقوله تعالى:" فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه ان الله غفور رحيم"، اسی طرح حضرت عرفجہ کے واقعہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ علاج کے واسطے اگرچہ مضطر نہ ہو بلکہ محتاج ہو تب بھی حرام اشیاء کا استعمال جائز ہے کیونکہ عدم اضطرار کے باوجود سونے کی ناک رکھنے کی اجازت حضور ﷺ نے مرحمت فرمائی ہے۔

چنانچہ عطیہ دینے والے شخص کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:ا-Alive Doner(زندہ عطیہ

کنند)، ۲-Dead Doner (میت عطیہ کنند)۔

میت کے اعضاء سے پیوندکاری کا مسئلہ:

جہاں تک مسئلہ مؤخر الذکر مردار عطیہ کنندہ کا ہے تو فقہ حنفی کی رو سے مرے ہوئے انسان کا اعضاء نکال کر دوسرے پر پیوند کرنا جائز نہیں، چنانچہ:

"والآدمی محترم بعد موته علی ما کان علیه فی حیاته وکما لا یجوز التداوی بشئ من الآدمی الحی اکراما له فکذلک لا یجوز التداوی بعظم المیت وفی البزازیة وان قال له (المضطر) آخر: اقطع یدی وکلها لا یحل، لأن لحم الانسان لا یباح فی الاضطرار لکرامته" (الشامی ۹/۴۸۸)۔

"وفی التاتارخانیة وأما الآدمی فقال بعض مشائخنا: انه لم: بجز الانتفاع باجزائه لنجاسته وقال بعضهم لم یجز لکرامته هو الصحیح وروی عن محمد اذا صلي وفی کمه عظم الانسان لا یجوز وهذا یدل علي نجاسته وأما عظم الکلب فیجوز التداوی به هکذا قال مشائخنا، قال حسن بن زیاد رحمه الله: لایجوز التداوی به"۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انتفاع بأ جزاء میت کی حرمت کی علت دو ہے: ایک احترام آدمیت دوسری نجاست جیسا کہ فتاوی ہندیہ **"باب التداوی من الحظر والإباحة"** میں اور فتاوی تاتارخانیہ میں مذکور تفصیل سے پتہ چلتا ہے (ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ ۵/۳۹۰)۔

اگر مؤخر الذکر علت یعنی نجس کو مان لیا جائے تو پھر ضرورت کے وقت دوسری تمام نجس اشیاء پر قیاس کرتے ہوئے اعضاء انسان کی پیوندکاری کی گنجائش ملنی چاہئے، لیکن حنفیہ کا مفتی بہ قول پہلی علت یعنی احترام آدمیت ہی کا ہے، جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں صراحت ہے۔

لیکن فقہ شافعی کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ضرورت کے وقت انتفاع اجزاء میت جائز ہے، **"انه لو لم یجد نجسا یصلح جاز بعظم الآدمي"** (حاشیۃ الشروانی علی التحفۃ ۲/۱۳۵، وکذا فی مغنی المحتاج ۱/۱۹۱)۔

پس ضرورت کے وقت فقہ شافعی کا سہارا لے کر جواز کا فتوی دینا مناسب سمجھ میں آتا ہے، جبکہ مسائل مجتہد فیہا ہو اور دلائل بھی عقلی ہو۔

مذکورہ بحث کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ میت کے اعضاء زندہ انسان کے لئے اضطرار کی حالت میں پیوندکاری کی شکل میں بطور علاج فقہ شافعی پر اعتماد کرتے ہوئے جواز کا فتوی دیئے جانے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

زندہ انسان کا اپنے عضو کا عطیہ کرنا:

دراصل ایک انسان کا دوسرے کی مدد کرنا شریعت کا مطلوب اور پسندیدہ صفت ہے، خصوصا جب ایک مومن ایک مصیبت میں پڑ جائے، حدیث شریف میں ہے:

"**من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة ومن يسر على معسر يسر الله عليه فى الدنيا والآخرة فمن ستر مؤمنا ستره الله وفى الدنيا والآخرة والله فى عون العبد ما كان العبد فى عون اخيه**" (مسلم)۔

حدیث شریف میں ذکر کردہ مصیبت عام ہے اس کا تعلق مال سے بھی ہوسکتا ہے، جسم اور جان، اہل وعیال سے بھی ہوسکتا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی کی تکلیف دور کرنے کے واسطے خود کو تکلیف میں ڈالنا بھی ہوسکتا ہے، اور اسی کی بنا پر وہ آخرت میں ثواب کا مستحق بھی بنتا ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ تکلیف کہاں تک برداشت کرنا جائز ہے، کیا اپنے ایک عضو کو تلف کر کے یا جان دے کر کسی کی مدد کرنا شریعت کا پسندیدہ عمل ہے یا نہیں؟

فقہاء کرام کی عبارت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کام جائز نہیں ہے، چنانچہ علامہ رملی شافعیؒ رقم طراز ہیں: "**ويحرم قطعه اي البعض من نفسه ولو مضطرا مالم يكن ذلك الغير نبيا**" (نہایہ ۸/ ۱۶۳)، اسی طرح تحفہ میں ہے: "**ويحرم قطعه اي البعض من نفسه لغيره لو مضطرا لفقد استقاء الكل هنا**" (تحفہ ۹/ ۴۶۱)۔

اس کی نظیر فقہاء حنفیہ کے کتابوں میں بھی ملتی ہے۔

چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے: "**مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاك فقال له رجل: اقطع يدى وكلها أو قال اقطع منى قطعة وكلها لا يبيحه أن يفعل ذلك ولا يصح امره به كما لا يصح للمضطر اي يقطع قطعة من نفسه فيأكل**" (کذا فی فتاوی قاضی خان ومثلہ فی اکراہ البزازیۃ علی ہامش الہندیہ)۔

مندرجہ بالا عبارت دلالت کرتی ہے کہ جب انسان اپنے اعضاء کو کھا کر جان نہیں بچا سکتا ہے، تو پھر چہ جائے کہ دوسروں کے اعضاء کو کھا کر جان بچانا، فقہاء حنفیہ کے یہاں خود اپنے اعضاء کا بھی کھانا اسی طرح حرام ہے جس طرح دوسروں کا کھانا۔

لیکن فقہاء شافعیہ کے نزدیک خود اپنے اعضاء کا کچھ حصہ کاٹ کر تو کھا سکتا ہے، لیکن کسی دوسرے کے اعضاء جبکہ وہ معصوم الدم ہو تو کھا نہیں سکتا ہے۔

مذکورہ مسئلہ اور اقوال فقہاء کو سامنے رکھنے سے مندرجہ مسئلہ پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے، جس کی تفصیل پیش ہے:

خون دے کر کسی کی جان بچانا:

یہ حق ہے کہ کسی کی جان بچانے کے لئے خون کا عطیہ دینے میں غیر معمولی تکلیف برداشت نہیں کرنی پڑتی ہے، اس لئے کہ خون نکالے جانے میں متعینہ مقدار کا لحاظ کیا جاتا ہے، کہ عطیہ کنندہ کو تکلیف نہ ہو، بلکہ بعض اوقات خون کا نکالنا طبی اعتبار سے مفید ہوتا ہے، چنانچہ Blood Donation Wikipidia کی رپورٹ ہے کہ خون نکالنے سے خون میں موجودہ لوہا (Iron) میں اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔

۲- دل کے بیمار مریض کے لئے وہ مفید ہے۔

۳- Blood Pressure, Blood Glucose, H6AIc, Low Density Lipoprotein, High Density Lipoprotien and Heart Rate اتنے بیماریوں کے لئے بھی مفید ہے۔

تحقیق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بغیر کسی سبب کے بھی انسان کا اپنا خون نکالنا جائز ہے، پس جب نکالنا جائز ہوگا تو مجبور اور مضطر اس کو استعمال بھی کرسکتا ہے، اس لئے کہ حالت اضطرار میں حرام اور نجس چیز بھی اس کے حق میں جائز ہے، بلکہ بطور حاجت (نہ کہ ضرورت) بھی انسان کے لئے جائز ہوتا ہے، مسئلہ ہذا سے دوسرا مسئلہ بھی متفرع ہوجاتا ہے کہ جب خون کا عطیہ دینا جائز ہے اور نکالنا بھی جائز ہے بلکہ مفید ہے تو پھر اس کو دفن کرنے کے بجائے بلڈ بینک میں جمع کرنا بھی جائز ہوگا تاکہ کوئی محتاج استعمال کرسکے، لیکن بلڈ بینک میں محفوظ شدہ خون کا استعمال اگرچہ جائز ہے، لیکن احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ حتی الامکان اس سے بچا جائے، چونکہ خون محفوظ کرتے وقت خون کی بعض خصوصیات ہی کی تفتیش پر اکتفاء کیا جاتا ہے، اس کے تمام اوصاف وخصوصیات پر مکمل رپورٹ نہیں بنائی جاتی، جس سے بعض مہلک بیماریوں کے خلیات واثرات اس میں چھپے رہنے کا امکان ہوتا ہے۔

مثلاً طبی رپورٹ ہے کہ ایڈز کی بیماری کے جراثیم جس کو HIV کہا جاتا ہے وہ انسانی جسم کے اندر خون میں سرایت کرنے کے بعد ایڈز میں تبدیل ہونے کے لئے آٹھ تا دس سال کا وقت لگتا ہے، جب یہ جسم میں داخل ہوتا ہے تو اس کے اینٹی بوڈی Anty Body کا خون میں سرایت کرنے کے لئے چھ ماہ لگتا ہے، اس دوران جب خون کا جانچ کیا جاتا ہے تو نتیجہ منفی (Negative) ہی آتا ہے، حالانکہ ان کے جسم میں HIV داخل ہوچکا ہوتا ہے، اس وقفے کو طبی اصطلاح میں (Window Period) کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس دوران کا نکلا ہوا خون بلڈ بینک کے ذریعہ سے کسی انسان کے جسم میں اگر داخل کیا جائے تو HIV کا قوی امکان ہے، چنانچہ احتیاط کرتے ہوئے کسی بھی مجہول شخص کا خون لینے سے گریز

کرنا حفظ ماتقدم کے طور پر مناسب ہوگا۔

جگر کے عطیہ کا مسئلہ:

جگر کے مسئلہ پر شرعی بحث میں جانے سے پہلے بطور تعریض کچھ گزارش ہے کہ فقہ اکیڈمی کا قائم کردہ سوال برائے عطیہ جگر کہ ''ایک زندہ انسان کا جگر دوسرے انسان کو لگا نہیں جاسکتا ہے، یہ واقعہ کے بالکل خلاف اور طبی رپورٹ کے بھی خلاف ہے۔

زندہ انسان کا جگر دوسرے انسان کو لگانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پورے جگر کاٹ کر لگایا جائے بلکہ زندہ شخص کے جگر کا ایک ٹکڑا دوسرے کو لگایا جاتا ہے اور ایسا ممکن ہے اور طب کی دنیا میں ہوتا رہا ہے اور ہو بھی رہا ہے، اس کے کامیاب آپریشن خود ہمارے ہندوستان میں کئی بار ہوا اور ہو رہا ہے، اور سب سے پہلے یہ آپریشن ۱۹۸۹ء میں چیکا گو میڈیکل سینٹر میں Dr. Christoph Broelsch نے کیا تھا، اور ۲۰۰۶ء میں اس سلسلہ میں انگلینڈ میں اس کی قانونی اجازت مل چکی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ زندہ شخص کے جگر کا ستر فیصد حصہ کاٹنے سے اس کو کچھ نقصان نہیں ہوتا، اور آپریشن کے بعد چار چھ ہفتے میں دونوں جگر مکمل سو فیصد کام کرنے لگتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد یہ دونوں بڑھ کر اپنے اصل حجم میں لوٹ آتے ہیں، اس کے ثبوت کے لئے احقر نے انٹرنیٹ سے Liver Transplant سے متعلق Wikipedia دیکھا ہے۔

عطیہ جگر کا شرعی حکم:

مردہ انسان کے اعضاء و جگر کا عطیہ کا حکم ماقبل میں گذر چکا ہے، کہ مسئلہ شافعی کے مطابق اس کی گنجائش ہے اور ضرورت کے وقت اس کے مطابق جواز کا فتوی دیا جاسکتا ہے، رہا زندہ شخص کا جگر کاٹ کر کے مریض کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس پر غور کریں کہ جگر کاٹنے سے جو تکلیف زندہ انسان کو ہوتی ہے یہ ایک وقتی تکلیف ہے یعنی تقریبا دو مہینہ کی تکلیف جیسا کہ Wikipedia سے معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد اس کا جگر سو فی صد کام کرنا شروع کردیتا ہے اور اگلے کچھ ہی دنوں میں اپنے اصل حجم پر لوٹ آتا ہے، البتہ آپریشن کی تکلیف اور ایک دو مہینہ کا آرام اور دوائیں وغیرہ ایک غیر معمولی تکلیف ہے لیکن اس معاملہ میں میڈیکل سائنس اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ یہ پرانے زمانے کی ایک دانت نکالنے کے تکلیف جیسی رہ گئی ہے، اور اس میں ناکامی کا اندیشہ ایک فیصد سے بھی کم ہے جو النادر کالمعدوم درجے میں ہے۔

یہ سب امور سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو ایک مسلمان بھائی کی جان بچانے کے لئے یہ تکلیف اٹھانے کے لئے کوئی شخص اگر آمادہ ہوجائے تو انشاء اللہ اس کی گنجائش ہونی چاہئے، اور خون کے عطیہ کا حکم میں اس کو شامل کرنا چاہئے۔

آنکھ کا قرنیہ:

مسئلہ مذکورہ پر قیاس کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آنکھ اللہ کی بیش بہا نعمت ہے جس کا عطیہ کرنے سے عطیہ کنندہ کو دو چار ہونا پڑے گا اس کی تلافی ناممکن ہے، لہذا مضطر کسی میت کا قرنیہ سے اپنی ضرورت پوری کرے، زندہ انسان کا قرنیہ نہ لیں، جیسا کہ فقہاء حنفیہ و شافعیہ کی عبارتیں اس کی طرف مشیر ہیں (ملاحظہ ہو: فتاوی شامی ۹/ ۴۸۸، تاتارخانیہ ۱۶/ ۲۲۴، ۲۲۳، تحفہ ۹/ ۴۶۱، نہایۃ ۸/ ۱۶۳)۔

دودھ بینک قائم کرنا:

رشتہ ازدواجیت کی طرح رشتہ رضاعت بھی ایک اہم محترم رشتہ ہے، رضاعی ماں باپ کا درجہ بھی اکثر و بیشتر چیزوں میں حقیقی والدین کے درجہ جیسا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وأمهاتكم اللاتي ارضعنكم"، ایسی صورت میں دودھ بینک قائم کرنے اور اس کے جواز سے بہت سے احکام کی پامالی لازم آتی ہے، بسبب چند وجوہ کے جو مندرجہ ذیل ہے:

الف- دودھ ایک انسانی غذا کے ساتھ اجزاء انسانی کے مانند ہے جس کی بیع وشراء ناجائز ہے۔

"......ولبن امرأة في وعاء ولوامة على الأظهر لأنه جزء آدمي" (الدرالمختار ۱/ ۲۱۲)۔

ب- دودھ بینک کا دودھ لینے کی صورت میں اس کی رضاعی ماں کا پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ کون ہے، رضاعت جیسی پاکیزہ رشتہ کی پامالی ہوگی۔

اور یہ کہنا مجبوری کی حالت میں ہے، صحیح نہیں کیونکہ ایسے دودھ کا پلانا کوئی مجبوری نہیں خصوصا آج کل کی ترقی یافتہ دور میں کہ دودھ کی جگہ پر ایسی غذائیں دستیاب ہے کہ اس کی وجہ سے ایک حد تک دودھ کی تلافی بھی ہو جاتی ہے۔

البتہ کسی خاص عورت کا وہ بھی مسمی معلوم ہو دودھ نکال کر کے محفوظ رکھ کسی بچہ کو پلایا جائے تو پھر اس کو جائز قرار دیا جائے گا، اور اس سے حرمت رضاعت بھی ثابت ہوگی۔

"والحق بالمص الوجور والسعوط" (درمختار ۱/ ۲۱۲)۔

نیز اگر اس عورت کا انتقال بھی ہو چکا ہو تو بھی حرمت رضاعت کا حکم باقی رہے گا، "وكذا يحرم لبن ميتة ولو محلوبا فيصير ناكحها محرما للميت" (شامی ۴/ ۳۸۹)۔

مادہ منویہ کا بینک قائم کرنا:

اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کی نسل و بقا کیلئے ایک بہترین نظام و قانون عطا کیا ہے، نکاح شادی بیاہ کے ذریعہ سے اس نظام کو مستحکم و مضبوط بنایا ہے، اس سے صرف دو انسان نہیں بلکہ دو خاندان کے درمیان

مودت ومحبت کا مضبوط رشتہ قائم ہوجاتا ہے، اللہ تعالی کا اسی رشتہ کی اہمیت وفضیلت جتانے کے لئے ارشاد ہے:"**وجعلناه نسبا و صهرا**"، رشتہ ابوت معاشرہ میں ایک ایسا رشتہ ہے جس سے انسان کے اندر احساس برتری، عظمت ورفعت، شرافت نسب قائم ہوتا ہے جیسا کہ اصول فقہ کا ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ "**الانسان من قوم ابيه**"، لہذا رشتہ ابوت واز دواجیت بقاء معاشرہ کا ایک جزء لاینفک ہے جس کی حفاظت ہر فرد انسانی پر ہے۔

لیکن موجودہ مغربی تہذیب کی لعنت مادہ منویہ اور بیضہ کا تبادلہ اس کو بینک محفوظ کر کے کارآمد بنا کر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا طریقہ ہماری اسلامی شریعت ہی نہیں بلکہ شرافت انسانیت کے بھی مغائر ہے اور اس میں انسانی معاشرہ کے مذکورہ دوستون" رشتہ ازدواجیت، رشتہ اموت" بھی منہدم نظر آتے ہیں۔

ایک ناحیہ سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زنا خفی ہے، غور کیجئے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت آپ ﷺ سے عزل کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی اور اس کو" وأد خفی" سے تعبیر کیا، "**ذلک الوأد الخفی**" (رواہ مسلم)، حالانکہ دیکھا جائے تو" وأد" اور" عزل" میں بہت ہی دور کا واسطہ ہے، لیکن اس کو بھی آپ نے اسی ضمن میں شامل کیا، پس ظاہر ہوجاتا ہے کہ مادہ منویہ کا اس طرح سے حفاظت اور اس کی خرید وفروخت یا مفت فراہم کرنا زنا کے ضمن میں آتا ہے۔

ایک اور ناحیہ سے جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ماڈرن زنا ہے، حدیث پاک میں ہے:"**لا يحل لامرء يؤمن بالله واليوم الآخر أن يسقى ماءه زرع غيره**" (ابوداؤد) کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی کھیتی کو سیراب نہ کرے، حدیث مذکور نبوی دور میں ایک مجازی معنی میں مستعمل سمجھا جاتا ہے، لیکن آج کی مغربی تہذیب میں یہی حدیث بالکل حقیقی معنی میں صادق آرہی ہے، لہذا کسی کا مادہ منویہ عطیہ کرنا یا بینک میں جمع کرنا اور اسے ضرورت مندوں کو فراہم کرنا یہ حدیث کے الفاظ میں یسقی ماءہ زرع غیرہ کا مصداق ہے، اور آج کے الفاظ میں ایک ماڈرن زنا جس کی حرمت قرآن پاک سے صراحت ہے"**والذی لفروجهم حافظون**"۔

پس ثابت ہوتا ہے کہ رشتہ ازدواجیت کی شرافت واہمیت اور رشتہ ابوت کی پاسداری کے پیش نظر اور سقاء ماء زرع غیر کی سخت ترین وعید کی بنا پر مادہ منویہ یا بیضہ کا عطیہ کرنا یا بینک کو فراہم کرنا یا بینک کے واسطے سے حاصل کرنا اس طرح کی کوئی بھی شکل جائز نہیں قرار دیا جاسکتا، حرمت اور ممنوع قرار دیا جائے گا۔

☆☆☆

اعضاءانسانی کے عطیہ کا حکم شرعی

مفتی جسیم الدین قاسمی☆

۱- ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں، بنیادی طور پر اس کی دو وجوہات ہیں:

الف-خون ناپاک اور حرام ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "**حرمت عليكم الميتة والدم**" (مائدہ:۳)۔

ب-خون انسان کا جز ہے اور جزء انسانی سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، انسانی جسم کے اکرام کی وجہ سے ارشاد ہے: "**ولقد كرمنا بني آدمي**" (سورۂ اسراء:۷۰)، "**وفي الهندية: الانتفاع بأجزاء الادمي لم يجز قيل للنجاسة وقيل للكرامة هو الصحيح**" (۳۵۴/۵)۔

لیکن اضطرار اور ضرورت شدیدہ کے وقت حرام چیز کو بھی استعمال کرنے کی اجازت شریعت مطہرہ میں ہے، اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالی نے فرمایا: "**وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا مااضطررتم إليه**" (انعام:۱۱۹)، اسی طرح سے حدیث عرینہ میں حضور ﷺ نے بطور علاج پیشاب پینے کا حکم دیا، "**عن أنس ؓ أن ناسا، اجتووا فى المدينة فأمرهم النبى ﷺ أن يلحقوا براعيه يعنى الإبل فيشربوا من ألبانها وأبوالها**" (بخاری حدیث نمبر ۵۶۸۶)۔

انہی نصوص کی روشنی میں فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: "**الضرورات تبيح المحظورات**" (الاشباہ والنظائر ص ۸۵)۔

اسی اصول کی بنیاد پر فقہاء نے ضرورت کے وقت حرام اور ناپاک چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانی اجزاء سے بھی علاج کی اجازت دی ہے، چنانچہ ردالمحتار وغیرہ میں عورت کے دودھ اور شراب سے علاج کا جواز موجود ہے، بشرطیکہ ان چیزوں سے شفا کا حاصل ہونا معلوم ہو اوران کے علاوہ کوئی دوسری حلال دوائی موجود نہ ہو۔

"**مطلب فى التداوي بالمحرم (قوله ورده في البدائع الخ) قدمنا في البيع الفاسد عند قوله: ولبن امرأة أن صاحب الخانية والنهاية اختارا جوازه إن علم أن فيه شفاء ولم يجد دواء غيره قال فى**

☆ مفتی واستاذ مرکز المعارف للبحوث والتعلیم، جوگیشوری ویسٹ، ممبئی۔

النهاية:وفی التهذيب: يجوز للعليل شرب البول والدم والميتة للتداوي إذا أخبره طبيب مسلم أن فيه شفاء ه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه، وإن قال الطبيب يتعجل شفاؤک به فيه وجهان، وهل يجوز شرب العليل من الخمر للتداوی فيه وجهان، وكذا ذكره الإمام التمرتاشی وكذا فی الذخيرة وما قيل ان الاستشفاء بالحرام حرام غير مجرى علی إطلاقه وان الاستشفاء بالحرام إنما لا يجوز إذا لم يعلم أن فيه شفاء أما إن علم وليس له دواء غيره يجوز ومعنى قول ابن مسعودؓ لم يجعل شفاؤكم فيما حرم عليكم يحتمل أن يكون قال ذلک فی داء عرف له دواء غير المحرم لانه حينئذ يستغني بالحلال عن الحرام ويجوز أن يقال تنكشف الحرمة عند الحاجة فلا يكون الشفاء بالحرام وإنما يكون بالحلال"(ردالمحتار، کتاب البیوع، مطلب فی التداوي بالمحرم)۔

لہذا ایسے ضرورت مند مریض کو جس کی زندگی خطرہ میں ہو یا خون کے بغیر اس کی شفایابی کی امید نہ ہو بلا معاوضہ خون عطیہ کرنے کی اجازت ہے چند شرائط کے ساتھ: الف-خون عطیہ کرنے والا عاقل بالغ ہو، ب-اپنی مرضی سے خون دے رہا ہو، ج-خون عطیہ کرنے والے کی صحت وجان کو کوئی شدید خطرہ نہ ہو۔

مسلم اور غیر مسلم دونوں کو خون دینے کی اجازت ہے، اس لئے کہ یہ ایک قسم کا تبرع ہے اور غیر مسلم کے ساتھ جو بھی تبرع جائز ہے، بشرطیکہ وہ معاندین اسلام میں سے نہ ہوں، "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (مائدہ:۲)۔

۲- بلڈ بینک جو بلا معاوضہ مریضوں کو خون دیتا ہے ایسے بینک کو خون دینا جائز ہے، لیکن اگر کوئی بینک اس کو اپنی تجارت بنالے اور لوگوں سے مفت خون لے اور مریضوں کو معاوضہ لے کر دے تو ایسے بینک کو خون دینا جائز نہیں، وفی الہدایۃ "لا يجوز بيع شعور الانسان والانتفاع به لأن الآدمی مكرم لا مبتذل فلا يجوز ان يكون شئ من أجزائه مهانا مبتذلا"۔

۳- رضاکارانہ بلڈ بینک قائم کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے تاکہ حادثات وغیرہ میں متاثرین کی جان بچائی جاسکے۔

۴- کوئی مریض خون کا سخت محتاج ہو حتی کہ جان اس کی خطرے میں ہو تو ایسی صورت میں اگر ایک ہی شخص خون دینے والا ہے تو اس کے لئے مستحب اور اخلاقا ضروری ہوگا کہ مریض کو خون دے کر اس کی جان بچالے، اگر خون دینے سے دینے والے کی جان کو خطرہ نہ ہو، شرعا واجب اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک تبرع ہے اور تبرع کرنا مستحب ہے واجب نہیں۔ اسی طرح سے اگر مریض کی جان کو خطرہ نہیں ہے تو بھی خون دینا مستحب ہوگا اور اگر خون دینے کی وجہ سے خود اس کی جان کو خطرہ لاحق ہوجائے تو ایسی صورت میں خون دینا جائز نہیں ہوگا۔

۵- قرآن کریم میں سورہ نساء ۵۸ میں ہے کہ "إن الله يامركم أن تؤدوا الأمانات الى اهلها"، جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابو ہریرہؓ کے مطابق حضور ﷺ نے اپنی انگلیوں کو کان اور آنکھ پر رکھا، مقصد یہ تھا کہ آنکھ کان وغیرہ سارے اعضاء اللہ کی امانت ہیں، بہر حال امانت پر حق ملکیت قائم نہیں ہوسکتی، ہبہ، بیع اور وصیت وغیرہ مالکانہ تصرفات ہیں، اعضاء میں انسان کی ملکیت معدوم ہے، لہذا انسان کسی دوسرے کو اس چیز کا مالک کیسے بنا سکتا ہے جس کا وہ خود مالک نہیں، "تملیک مالیس بمملوک" محال ہے، پس اس میں کسی طرح کا ایسا تصرف جس میں جان کو خطرہ ہو یا کسی عضو کا اتلاف ہو جائز نہیں ہے، خواہ یہ تصرف اس کی اپنی ذات سے ہو یا کسی دوسرے کی جانب سے حتی کہ اگر انسان مرجائے تب بھی اس کی لاش کے ساتھ تصرف کرنا جائز نہیں ہے، فقہاء کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مردہ جسم کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے، خواہ وہ جسم مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا۔

اسی طرح کسی انسان کا عضو اس کے جسم سے علاحدہ کرنا جس میں خود اس انسان کی کوئی منفعت نہ ہو اس کے مکروہ یا حرام ہونے پر پوری امت کے اہل علم متفق ہیں، ابوداؤد حدیث نمبر (۳۲۰۷) میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ: "**كسر عظم الميت ككسره حيا**" (یعنی کہ مردہ انسان کی ہڈی توڑنے میں ایسا ہی گناہ ہے جیسا کہ زندہ انسان کی ہڈی توڑنے میں ہے)۔

ملا علی قاریؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: "**قوله ككسره حيا يعنى فى الاثم كما فى رواية قال الطيبي:اشارة الى انه لايهان ميتا كما لا يهان حيا، قال ابن ملك: إلى أن الميت يتألم، وقال ابن حجر: ومن لازمه انه يستلذ بما يستلذبه الحى......وعن ابن مسعود قال: اذى المومن فى موته كأذائه فى حياته**" (مرقاۃ ۴/ ۱۹۵ رشیدیہ) کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے فرمان "**ككسره**" کا مطلب یہ ہے کہ زندہ آدمی کی ہڈی توڑنا جس طرح معصیت ہے اسی طرح مردہ کی ہڈی توڑنا بھی معصیت ہے، یعنی حکم میں دونوں برابر ہیں۔

طیبی شارح مشکوۃ نے کہا کہ حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح زندہ انسان کے اعضاء کو نقصان پہنچا کر اس کی توہین وتذلیل نہیں کی جائے گی، اسی طرح مردے انسان کی قطع و برید کر کے اس کی توہین وتذلیل نہیں کی جائے گی، نیز مصنف ابن شیبہ میں ہے کہ "**عن ابن مسعودؓ قال أذى المؤمن في موته كأذاه في حياته**" (حدیث نمبر: ۱۱۹۹۰) یعنی مردے کو تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کو تکلیف دینا۔

شرح سیر الکبیر میں واضح ہے کہ "**والآدمي محترم بعد موته على ما كان عليه في حياته فكما يحرم التداوي بشيء من الآدمي الحي إكراما له فكذلك لا يجوز التداوي بعظم الميت قال** ﷺ: "**كسر**

عظم المیت ککسر عظم الحي"(۱/۶۹)۔

اسی طریقے سے حدیث شریف میں مثلہ کی ممانعت آئی ہے، اس لئے مردہ کے جسم سے کوئی عضو نکالنا جائز نہیں، وفی البدائع: "**ولو سقط سنه یکره ان یاخذ سن میتة فیشدها مکان الاولی بالاجماع**" (۵/۱۲۳)، نیز جسم کا جو حصہ جسم سے علاحدہ ہوجائے وہ نجس اور ناپاک ہوجاتا ہے اب صرف اسی جسم میں اس کا استعمال ہوسکتا ہے جس جسم سے علاحدہ ہوا ہے، دوسرے جسم میں اس کا استعمال ناپاک اور حرام کا استعمال ہے، اور حرام میں مومن کے لئے شفا نہیں۔

لہٰذا نہ تو کسی متعین مریض کو اس کی جان بچانے کے لئے اور نہ کسی طبی ادارے کو مردہ جسم سے کوئی عضو دیا جاسکتا ہے۔

۶- زندہ یا مردہ شخص کی آنکھ سے قرنیہ نکالنا جائز نہیں ہوگا، چونکہ آنکھ کوئی ایسا عضو نہیں ہے کہ اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، زندہ شخص سے اس لئے نہیں نکالا جاسکتا کہ انسان کے اعضاء مکرم ہیں اسے بلاضرورت شدیدہ کے دوسرے کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ جواب نمبر ایک میں اور مردہ سے نہ نکالنے کے دلائل جواب نمبر ۵ کے ذیل میں آگئے، حدیث شریف میں تو بال تک دوسرے کو عطیہ کرنے کی ممانعت آئی ہے، چنانچہ مسلم شریف کی روایت "**واصلة أو مستوصلة**" پر لعنت آئی ہے، یعنی وہ عورت جو اپنے بال دیتی ہیں، اور وہ عورت جو ان بالوں کو اپنے بالوں کے ساتھ استعمال کرتی ہیں، حالانکہ بال کاٹنے سے نہ تو تکلیف ہوتی ہے اور نہ جسم کی کارکردگی پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

۷- اگر مردہ کے کسی عضو کے عطیہ کے جواز کی کوئی شکل نکلتی ہے تو لاش کی بے عزتی چونکہ دراصل اس کے متعلقین ہی کی بے عزتی ہوتی ہے، اس لئے خود صاحب عضو کے ساتھ ساتھ اس کے ورثہ کی اجازت بھی ضروری ہے۔

۸- جس طرح آزاد آدمی کی بیع جائز نہیں اسی طرح انسانی جسم کے کسی بھی حصے وجزء کو فروخت کرنا بھی ناجائز ہے، وفی الہدایہ: "**لا یجوز بیع شعور الانسان والانتفاع به، لأن الآدمی مکرم لامبتذل فلا یجوز أن یکون شئ من أجزائه مهانا مبتذلا، وفی الهندیة: الانتفاع بأجزاء الادمی لم یجز قیل للنجاسة وقیل للکرامة هو الصحیح**" (۵/۳۵۴)، لہٰذا دودھ کو فروخت کرنا جائز نہیں، اس لئے تفسیر کبیر کی حدیث (۲/۹۹۱) میں آتا ہے: "**قال الصادق والمصدوق: لیس لأ بدانکم ثمن إلا الجنة، فلا تبیعها الا بها**" (یعنی نبی صادق ومصدوق ﷺ نے یوں فرمایا کہ جنت کے علاوہ تمہارے جسموں کی کوئی قیمت نہیں ہے، اس لئے اپنے بدنوں کو جنت کے سوا کسی چیز کے بدلے میں فروخت نہ کرو) شریعت میں رضاعت کی جو اجرت جائز ہے وہ دراصل دودھ کی قیمت نہیں بلکہ دودھ پلانے اور اس میں وقت دینے کی اجرت ہے۔

اور نہ ہی عورت خود دودھ عطیہ کرسکتی ہے، اس لئے کہ خون کی طرح یہ ایسا ضروری نہیں کہ اس کے بغیر ضرورت مند کی جان بچ نہ سکے بلکہ مارکیٹ میں مصنوعی دودھ موجود ہے جس سے ضرورت مند بچے کو غذا فراہم کی جاسکتی ہے، نیز رضاعت سے حرمت موبدہ ثابت ہوتی ہے، اس لئے اس صورت میں جبکہ یہ معلوم نہیں ہوسکے گا کہ کس عورت کا دودھ ہے ایسی صورت میں اس کا بھی امکان ہے کہ کسی کی شادی رضاعی بہن یا ماں سے ہوجائے جو شرعاً حرام ہے۔

۹- مادہ منویہ کی بیع وشرا تو کجا بلاعوض بھی نہ تو لینا جائز ہے نہ دینا، یہ شرعاً قطعاً ناجائز ہے، ایک تو اس سے نسب میں اختلاط ہوگا، دوسرے مادہ منویہ کو نکالنے کے لئے کشف ستر اور استمناء بالید کا ارتکاب بھی کرنا پڑے گا، تیسرے یہ کہ اس میں انسانی جزء کی بے حرمتی بھی ہے، لہذا نہ تو ایسے بینک کا قائم کرنا جائز ہے اور نہ اس میں کسی طرح کا تعاون پیش کرنا اور نہ ہی اس سے استفادہ کی کوئی گنجائش ہے۔

☆☆☆

اجزاءانسانی کا عطیہ-اسلامی تناظر میں

مفتی عبدالرشید قاسمی☆

۱- ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو خون کا عطیہ دے سکتا ہے:

خون دینے کے جواز میں اب کسی کا اختلاف نہیں رہ گیا مانعین بھی اسے جائز کہتے ہیں اور مسلمان وغیر مسلم کا فرق بھی مناسب نہیں کیونکہ کفر کی خباثت اعتقاد میں ہوتی ہے اجزاء میں نہیں۔انبیاء کرام ورسل عظام علیہم السلام میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے کافر عورتوں کا دودھ پیا ہے اور خون کو دودھ ہی پر قیاس کیا گیا ہے۔

۲،۳-بلڈ بینک میں یا ایمر جنسی حالات میں خون کے عطیہ کا جواز:

بلڈ بینک کے قیام پر بھی اتفاق ہو چکا ہے چنانچہ مولانا یوسف صاحب لدھیانوی (آپ کے مسائل اور ان کا حل ص ۲۴۳ ج ۴) میں ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں سوال طویل ہے ہم صرف سوال سے مطلوبہ جز نقل کر کے مولانا کا جواب لکھتے ہیں:

سوال……اب ہماری اس انجمن نے اپنے کالج میں ''بلڈ بینک'' بنانا شروع کیا ہے،……کیا اس طرح ہم لوگوں کا مریضوں کیلئے خون جمع کرنا اور پھر مریضوں کو مہیا کرنا شریعت کے مطابق درست ہے یا نہیں؟اور ہم طلبہ کو اس کام میں ثواب ملے گا؟

جواب……''اضطرار کی حالت میں مریض کی جان بچانے کے لئے خون دینا جائز ہے،اور اس ضرورت کے پیش نظر خون کا مہیا رکھنا اور اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہے اور خدمت خلق جبکہ حد جواز کے اندر ہو،ظاہر ہے کہ بڑے ثواب کا کام ہے'' یہ حوالہ ہم نے صرف سوال میں ''بلڈ بینک'' کی وجہ سے ذکر کیا ہے حضرت نے جواب میں اگر چہ بلڈ بینک کا ذکر نہیں کیا،لیکن جواب سے بلڈ بینک کا جواز ظاہر ہے۔

☆ مدرسہ جامعہ العلوم جامع مسجد پٹکا پور،کانپور۔

نیز فی الفور ضرورت نہ ہونے کے باوجود ایمرجنسی ضرورت پیش نظر خون کا عطیہ بھی جائز ہوگا، کیونکہ یہاں بھی ضرورت متحقق ہے، ویسے فقہاء نے مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں کی اور اگر بالفرض کی بھی ہوتو اب یہ تفریق مناسب نہیں، کیونکہ مسلمان بھی غیر مسلم معطیین سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسلام کا مزاج تو" **الید العلیا**....." ہے، ہاں اگر خود کوئی مسلمان یہ چاہتا ہے کہ میرے جسم میں کسی مومن کا ہی خون چڑھے تو یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے لہٰذا سوال کے تینوں اجزاء تقریباً متفق علیہ ہوگئے: (۱) بلاتفریق ملت خون کا عطیہ دینا (۲) بلڈ بینکوں میں مسلمانوں کو خون کا عطیہ دینا (۳) مسلمانوں کا از خود بلڈ کیمپ یا بلڈ بنک قائم کرنا اور یہ نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہوگا تاکہ اسلام کے اعلی اخلاق کا مظاہرہ ہو سکے۔ جب خون دینے کا جواز ہوا تو اس کے لوازمات بھی جائز ٹھہریں گے: "**اذا ثبت الشئی ثبت بلوازمه**" علماء عرب بلڈ بینک سے آگے بڑھ کر انسانی دیگر اجزاء کی بینکنگ کی اجازت دے چکے۔ "**یجوز انشاء بنک لحفظ الجلد الآدمی مع مراعاة**......" (الفقہ الاسلامی ص ۵۲۶۳ ج ۷) (مخصوص شرطوں کیساتھ انسانی کھال کو محفوظ رکھنے کیلئے بنک کا قیام جائز ہے)۔

۴- نادر گروپ کی صورت میں خون دینا واجب نہیں!

اگر مریض کے خون کا گروپ نادر ہے اور کوئی شخص ایسے گروپ والا موجود ہے تو اس کا خون دینا مستحب ہوگا، کیونکہ نفس علاج ہی واجب نہیں اور جب نفس علاج ہی واجب نہیں تو خون دینا کیونکر واجب ہوگا؟ مزید یہ کہ خون دینے سے بسا اوقات خون دینے والے کو کافی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ تجرباتی مسئلہ ہے، لہٰذا واجب کہہ کر اسے شرعاً کیوں پابند کیا جائے، پھر اگر فرض کیجئے کہ اس طرح کے کئی مریض ہیں اور سبھوں کو اسی خاص بلڈ گروپ کی ضرورت ہو تو اس شخص سے کس حد تک خون نچوڑا جائے، لہٰذا زیادہ سے زیادہ اس کے لئے خون دینے کا مسئلہ استحبابی ہوگا۔

۵- جگر کی پیوندکاری:

"**یجوز عند الجمهور نقل بعض اعضاء الانسان لآخر کاالقلب والعین والکلیة......لأن الحی أفضل من المیت ،وتوفیر البصر أوالحیا ة لانسان نعمة عظمی مطلوبة شرعاًوانقاذ الحیاة من مرض عضال ......امر جا ئز للضرورة**" (الفقہ الاسلامی ۲۶۰۸/ج ۴)۔

(جمہور کے نزدیک انسان کے اعضاء دل، آنکھ، گردہ دوسرے میں منتقل کرنا جائز ہے۔ وجہ یہ ہے زندہ مرے ہوئے انسان سے افضل ہے اور انسان کو بصارت یا زندگی مہیا کرنا بہت بڑی نعمت ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے انسان کو مہلک امراض سے بچانا بوجہ ضرورت جائز ہے)۔

ڈاکٹرس کہتے ہیں مصنوعی جگراور مصنوعی دل کی ایجاد ہوچکی ہے، اس میں کس حد تک کامیابی ملی ہے یہ کہہ پانا مشکل ہے، لہٰذا اگر مصنوعی جگر کی دریافت ہوچکی ہے تو اسی کو ترجیح دی جائے گی، گردہ کی پیوندکاری اور زندہ شخص سے گردہ لینے کے جواز سے متعلق فقہ اکیڈمی کا فیصلہ اتفاق آراء کے ساتھ (سوائے مولانا برہان الدین صاحب کے) آچکا ہے علماء عرب پہلے ہی جائز قرار دے چکے ہیں۔

مجوزین کے دلائل تفصیل سے آچکے ہیں، دیکھئے: مقالہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اعضاء کی پیوندکاری جدید فقہی تحقیقات (ص ۳۰۸رج ا)، اس لئے قصداً عبارات فقہیہ حذف کی جارہی ہیں تا کہ بلا وجہ تکرار اور مقالہ طویل نہ ہو، مانعین کے دلائل کا جائزہ بعد میں لیا جائے گا البتہ گردے اور جگر میں فرق یہ ہے کہ گردہ دو ہوتے ہیں اور جگر ایک، علماء نے دلائل میں یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ گردے دو ہوتے ہیں اس لئے ایک گردہ دینے کی گنجائش ہے لیکن یہ فرق زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اب ایسا بھی ممکن ہوگیا ہے کہ عطیہ دینے والے زندہ انسان سے جگر کے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر مریض کی پیوندکاری کردی جائے لہٰذا گردہ دو عدد اور جگر ایک عدد کا فرق ختم ہوگیا، جب زندہ شخص سے ایک گردہ لے کر پیوندکاری کی اجازت علماء نے دیدی تو مردہ انسان سے جگر لے کر پیوندکاری کا جواز بطریق اولیٰ ہونا چاہئے، زندہ انسان کو دونوں گردوں کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ مردہ انسان کو جگر کی اب کوئی ضرورت نہیں، رہا مسئلہ کسی مریض کی جان بچانے یا محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارے کو عطیہ دینا تو بعض شرائط کے ساتھ اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

"وانما يجوز التبرع بدفع عوض مالی علی سبيل الهبة اوالمكافاة عند نقل العضو أوالتبرع بالدم فی حالة التعرض لهلاک أو ضرر بالغ. فان تحتم دفع العوض ولا يوجد متبرع من الاقارب أو غيرهم ،جاز للدافع الدفع للضرورة" (الفقہ الاسلامی ص ۲۶۰۹)۔

(اعضاء کی پیوندکاری میں ہبہ اور مکافات کے طور پر تبرع جائز ہے۔ اسی طرح اگر ہلاکت یا کسی شدید نقصان کا خطرہ ہو تو خون کا تبرع بھی جائز ہے۔ اگر حتمی طور پر عوض دینا ہی پڑے اور رشتے داروں وغیرہ مین کوئی تبرع کرنے والا نہ ہو تو ضرورت کی وجہ سے مالی عوض دینا جائز ہے)۔

شروع میں عرض کیا گیا کہ اگر لینا جائز رہا، دینا نہیں، تو اغیار ہمارے مذہب پر اعتراض کریں گے۔

۶-(الف) زندہ انسان سے قرنیہ کا عطیہ:

یہ مسئلہ اس وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے کیونکہ جسم کے دیگر اعضاء کا بدل مصنوعی اعضاء کی شکل میں ایک حد تک

ہو چکا ہے لیکن قرنیہ کا بدل پیش کرنے سے سائنس داں قاصر رہے ہیں اور مبتلی بہ بھی اس میں زیادہ ہیں، تبدیل قرنیہ کے ایک بہت مشہور ڈاکٹر ڈاکٹر محمود رحمانی جواب تک ۵۰ ۳ رقرنیوں کا آپریشن کر چکے ہیں بتایا کہ صرف ہندوستان میں ایک کروڑ سے زیادہ لوگ قرنیہ کے محتاج ہیں اگر ان کی آنکھیں روشن کردی جائیں تو نہ صرف ان کو در در کی ٹھوکروں سے بچایا جاسکتا ہے بلکہ انہیں روزگار فراہم کر کے اپنے پیروں پر کھڑا کیا جاسکتا ہے جس سے وہ نہ صرف اپنی محتاجگی بلکہ اپنے اہل وعیال کی محتاجگی دور کر سکتے ہیں۔

زندہ شخص کا اپنی قرنیہ عطا کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ جسم اللہ کا عطیہ ہے اور انسان کو اپنے جسم میں تصرف کی ایک حد تک اجازت ہے بس، اور یہ دووجہ سے جائز نہ ہوگا: اول اس کے تزین میں فرق واقع ہوگا ساتھ ہی تغییر خلق اللہ ہے جو کسی طرح جائز نہیں دوم انسان کو دونوں آنکھوں کی ضرورت ہے ایک آنکھ سے انسان بائک (دو پہیا گاڑیاں) تو چلا سکتا ہے لیکن موٹر کار وغیرہ بڑی گاڑیاں نہیں چلا سکتا کیونکہ چار پہیا گاڑیوں میں دونوں طرف سائڈ دیکھنا پڑتا ہے جو ایک آنکھ سے ممکن نہیں اسی لئے ایک آنکھ سے دیکھنے والے ڈرائیور اکسیڈینٹ کر دیتے ہیں نیز ایک آنکھ عطیہ کے بعد اگر اس کی دوسری آنکھ ضائع ہو جائے تو وہ خود محتاج ہو جائے گا۔ اس لئے تزین میں فرق، تغییر خلق اللہ اور خود اس کی اپنی ضرورت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قرنیہ عطا کرے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے زندہ انسان سے دونوں قرنیوں کو منتقل کرنے کو تو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن اگر زندہ انسان اپنی ایک قرنیہ دینا چاہے تو اس پر فیصلہ نہیں کیا بلکہ محلّہ نظر قرار دیتے ہوئے آئندہ پر موقوف کر دیا۔

"خامساً:یحرم نقل عضو من انسان حی یعطل زواله وظیفة اساسیة فی حیا ته وان لم یتوقف سلامة اصل الحیاة علیها کنقل قرنیة العینین کلتیهما ،أما ان کان النقل یعطل جزء أ من وظیفة اساسیة فهو محل بحث ونظر" (الفقہ الاسلامی ص ۵۱۴۲ رج ۷)۔

(پنجم: کسی زندہ انسان کے ایسے عضو کا منتقل کرنا جس پر اگر چہ اصل زندگی کا دارومدار تو نہ ہو لیکن اس کی عدم موجودگی سے زندگی کا ایک بنیادی وظیفہ موقوف ہو جاتا ہو، یہ جائز نہیں ہے، جیسے دونوں آنکھوں کے قرنیوں کا منتقل کرنا، اگر اس منتقلی سے کسی بنیادی وظیفے کا ایک حصہ متأثر ہوتا ہو تو اس کا حکم قابل غور ہے) (اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے ص ۱۲۰) لیکن بندہ کی رائے یہ ہے کہ ایک قرنیہ کا عطیہ بھی مذکورہ بالا وجوہ سے جائز نہ ہونا چاہیے۔

(ب) مردہ انسان سے قرنیہ کا حصول:

ویسے تو بینائی کے مقابلے میں اندھا پن کوئی اضطرار نہیں، کتنے لوگ آنکھ کی روشنی سے محروم ہوتے ہیں اور زندگی

گذارنے میں بظاہر کوئی خاص زحمت محسوس نہیں کرتے ، روشنی سے محروم افراد حافظ بھی بنتے ہیں عالم بھی اور مفتی بھی، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ روشنی کا حصول کوئی حاجت یا ضرورت کے قبیل سے نہیں کہ اس کے لئے ممنوع اور حرام چیز کا ارتکاب کیا جائے بلکہ یہ تو تحسینیات کے قبیل سے ہے لیکن اس کے باوجود آنکھوں کی نعمت اور اہمیت کا انکار کون کرسکتا ہے اور بسا اوقات کسی ایسی چیز کے حصول کے لئے جس کا تعلق حاجیات یا ضروریات سے نہیں بلکہ تحسینیات سے ہے اس کے باوجود اس حصول کے لئے ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جب کہ ضابطہ یہ ہے کہ تحسینیات کے حصول کے لئے محرمات کا ارتکاب نہیں کیا جانا چاہئے، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس تحسینیات کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی عورت کے چہرے پر تیزاب ڈالا گیا، چہرہ بری طرح جھلس گیا اور دیکھنے میں بڑا بھیانک اور ڈراؤنا لگتا ہے، اس کی اصلاح کے لئے اسے پلاسٹک سرجری کی ضرورت ہے جس میں اس کی ران سے کھال لے کر چہرے پر سرجری کردی جائے گی، چہرے کی بدصورتی اور ڈراؤنا پن ختم ہوجائے گا یا کم ازکم بہت حدتک کم ہوجائے گا، تو کیا اب صرف اس لئے اسے شرعاً اجازت نہ دی جائے گی کہ ڈاکٹر اس کی ران دیکھیں گے اور مس کریں گے اور اس کا کیس ضروریات یا حاجیات کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ تحسینیات کے قبیل سے ہے؟ یا مثلاً ایک عورت کے ایک دو بچہ آپریشن سے ہوچکے ہیں میاں بیوی کو مزید بچوں کی چاہت ہے جو اسلامی نظریہ سے ہم آہنگ ہے تاہم ضرورت کے قبیل سے نہیں، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اب اس کے لئے بغیر آپریشن ولادت ممکن نہیں اور آپریشن عموماً مرد ڈاکٹر کرتے ہیں یا وہاں سرجن صرف مرد ہی ہیں عورتیں نہیں ہیں، اب آپریشن کے لئے عورت کے جسم کو اجنبی ڈاکٹروں کے سامنے کھولنا پڑے گا جو حرام ہے تو کیا اس لئے کہ اب بچوں کا حصول جو اس کے لئے ضروریات یا حاجیات کے قبیل سے نہیں ہے مزید بچوں سے اسے روک دیا جائے گا؟ ظاہر ہے ایسا نہیں، ورنہ اس حدیث پر کیسے عمل ہوگا **"تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم"** معلوم ہوا کہ بعض تحسینیات کا حصول اتنا اہم ہوجاتا ہے کہ اِس کے لئے بھی اُن ہی محرمات کا ارتکات ناگزیر ہوجاتا ہے جن کا ارتکاب صرف ضروریات ہی کے حصول کے لئے کیا جاتا ہے، آنکھوں کے مسئلے کو اسی تناظر میں سمجھنا چاہئے۔

اس مختصر سی وضاحت کے بعد مردہ انسان سے قرنیہ کا حصول اور کسی شخص کو بینائی فراہم کرنے کے مسئلے کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے، اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ بینائی کا حصول ضروریات سے نہیں تو بھی بینائی کے اہمیت پیش نظر اس کی گنجائش ہونا چاہئے بقیہ دلائل وہی ہیں جو اعضاء کی پیوندکاری خصوصاً گردہ لین دین کے متعلق لکھے گئے۔

"یجوز عند الجمهور نقل بعض أعضاء الانسان لآخر کاالقلب والعین والکلیة ......لأن الحی افضل من المیت،وتوفیر البصر أوالحیاة لانسان نعمة عظمیٰ مطلوبة شرعاً،وانقاض الحیاة من مرض

عضال أو نقص خطير امر جائز لضرورة "(الفقہ الاسلامی ص ۲۶۰۹/ج ۴)۔

(جمہور کے نزدیک انسان کے اعضاء دل آنکھ گردہ دوسرے میں منتقل کرنا جائز ہے اور وجہ یہ ہے کہ زندہ مرے ہوئے انسان سے افضل ہے اور انسان کو بصارت یا زندگی مہیا کرنا بہت بڑی نعمت ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے، انسان کو مہلک امراض اور معذوریوں سے بچانا بوجہ ضرورت جائز ہے)۔

مزید تفصیل کیلئے دیکھئے جدید فقہی تحقیقات (ص ۱۴ ۳/ج ۱) طوالت اور تکرار سے بچتے ہوئے عبارت نقل نہ کر کے ہم نے صرف حوالہ دینے پہ اکتفاء کیا ہے۔

اس سلسلے میں علماء عرب کا ایک فتویٰ دستیاب ہوا جو آنکھوں (خصوصاً قرنیہ لگانے کے) ایک مشہور ڈاکٹر جن کا تذکرہ اوپر گذرا انہوں نے علماء عرب سے استفتاء کیا تھا فتویٰ عربی زبان میں تھا اور اس کا اردو ترجمہ بھی عربی کے ساتھ منسلک وہیں سے آیا لیکن عربی عبارت دستیاب نہ ہوسکی اردو ترجمہ یہ ہے:

سوال: کیا فوت شدہ شخص کی آنکھ نکال کر دوسرے زندہ شخص کو لگانا جائز ہے؟

جواب: مذکورہ سوال سپریم علماء کونسل (سعودیہ عربیہ) کے سامنے رکھا گیا تو کونسل نے بحث ومباحثہ اور باہمی تبادلہ خیال نیز آنکھ کے اسپشلیسٹ ڈاکٹروں کے معروضات (جس میں ۵۰/سے ۷۵/فیصد تک کامیاب ہونے کی تصدیق تھی) پر غور کرنے کے بعد کثرت رائے سے درج ذیل فتویٰ صادر فرمایا:

فوت شدہ انسان کی آنکھ اس کے ولی کی اجازت ورضامندی کے بعد کسی دوسرے مسلمان شخص (جسے اس کی سخت ضرورت ہو) کو لگانا جائز ہے جبکہ کامیابی ظن غالب ہو کیونکہ شرعی اصول کے مطابق جب دو مصلحتیں باہم متعارض ہوں تو بڑی مصلحت پر عمل کرنا......اور دو ضرر اکٹھا ہوں تو ان میں ہلکے اور چھوٹے کا ارتکاب کرنا، اور زندہ کی مصلحت کو مردہ کی مصلحت پر ترجیح دینا چاہئے۔ اور اس طرح کرنے میں زندہ کی بینائی متوقع ہے جس سے وہ خود بھی مستفیض ہوگا اور دوسرے لوگ بھی، جبکہ میت کی آنکھ نکالنے سے اس کی کوئی چیز فوت نہیں ہوتی، کیونکہ میت کی آنکھ بھی اس جسم کے دیگر اعضاء کے ساتھ سڑ گل کر مٹی میں تحلیل ہوجائے گی اور وفات کے بعد اس کی آنکھ کا نکالنا ظاہری طور پر مثلہ بھی نہیں ہے کیونکہ اس کی آنکھ بند کر دی جاتی اور اوپر نیچے کا پپوٹہ ملا دیا جاتا ہے (سپریم علماء کونسل (سعودیہ عربیہ) فتاویٰ اسلامیہ ج ۴/ص ۱۴ ۴/ص)۔

علماء عرب نے مسلمان شخص کی قید لگائی ہے لیکن مناسب ہے کہ خون یا اعضاء کے لین دین میں اسے عام رکھا جائے دیکھئے (تحقیقات فقہیہ ص ۱۸ ۳/ج ۱)۔

(ج) "اذا ثبت الشی ثبت بلوازمہ" اگر آنکھوں کا عطیہ جائز ہوگا تو آئی بنک قائم کرنا بھی جائز ہوگا "یجوز انشاء البنک......" (الفقہ الاسلامی ص ۵۲۶۳ رج ۷)، البتہ زندہ آنکھوں کا عطیہ درست نہ ہوگا اور اسے گردے پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی وجہ اور فرق ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، نیز زندہ شخص کی آنکھوں کی عطیہ میں حسن و جمال میں بھی فرق آئے گا، تغییر خلق اللہ بھی ہے جس کی بندوں کو اجازت نہیں۔

۷- عطیہ میں معطی اور ورثہ دونوں کی اجازت ضروری ہوگی:

جگر یا آنکھوں کے عطیہ میں دونوں کی یعنی خود اس شخص کی اور اس کے ورثہ کی اجازت ضروری ہوگی۔ بندہ اپنے جسم کا مالک نہیں لیکن امین ہے اور کچھ نہ کچھ تصرف کا حق اسے حاصل ہے، اسی تصرف کا لحاظ کرتے ہوئے اگر وہ قاطع اعضاء سے قصاص لے، دیت لے یا معاف کر دے تو اسے اختیار رہتا ہے، اسی طرح اگر وہ اپنی خوشی سے اپنی زندگی میں مریض کو اپنا ایک گردہ دینا چاہے تو یہ اس کے لئے جائز ہے جیسا کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے (ص ۲۱۰) میں متفقہ آراء کے ساتھ (سوائے مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب کے) یہ تجویز آچکی ہے۔ تجویز کے الفاظ یہ ہیں: "......تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دیکر اس کی جان بچالے" (اسلامی فقہ اکیدمی کے فیصلے ص ۲۱۰) اور جب زندگی میں اجازت ضروری ہے تو بعد الموت بھی اس کی سابقہ اجازت ضروری ہوگی نیز بعد الموت ولی کی اجازت ضروری ہوگی کیونکہ شریعت نے ورثہ اور ولی کو بھی بعض اختیارات دیئے ہیں مثلاً اگر میت پر نماز جنازہ ہو چکی ہو اور ولی نے نماز جنازہ نہیں پڑھی تو وہ دوبارہ نماز جنازہ میت پر پڑھ سکتا ہے اسی طرح مورث کے مقتول ہونے کی صورت میں ورثہ کو قاتل سے قصاص، صلح عمد، دیت یا معافی کا پورا اختیار ہوتا ہے، اس میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ میت کے جسم پر ورثہ کو کسی نہ کسی درجہ اختیار رہتا ہے نیز آنکھوں کے عطیہ سے متعلق عربی کے مذکورہ فتوے میں بھی ولی کی اجازت شرط قرار دی گئی ہے۔

"یجوز نقل عضو من المیت الی حی......بشرط ان یأذن المیت اور ورثته بعد موته" (الفقہ الاسلامی ص ۵۱۲۴ رج ۷) (میت کا عضو زندہ کو منتقل کرنا جائز ہے...... بشرطیکہ خود میت نے اپنی موت سے پہلے یا موت کے بعد اس کے ورثہ نے اجازت دی ہو)۔

۸، ۹- انسانی دودھ اور مادۂ منویہ بنک وغیرہ کا حکم:

حرمت مصاہرت، حرمت رضاعت اور محرمیت کے سارے ہی رشتے اس سے متاثر ہوں گے۔ نسل، نسب کی حفاظت انسانی تمام ضرورتوں سے بڑھ کر ہے اور شریعت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے اگر اس کی حفاظت نہ ہوئی تو انسانی

بھیڑ اور جانوروں کی بھیڑ میں فرق ہی کیا جائے گا، جانوروں میں بھی ان کے بچوں کا نسب ماں سے ثابت ہوتا ہے اور پھر انسانوں میں بھی یہی ہوگا۔ مغربی اور شیطانی تہذیب کی یہی کرم فرمائی ہے کہ انسانوں کو انسانیت سے نکال کر حیوانوں کی صفوں میں داخل کر دینا۔ نسل، نسب، محرمیت کا تحفظ خود اتنی بڑی ضرورت ہے کہ کوئی دوسری ضرورت شرعاً اس پر غالب نہیں آسکتی۔ دودھ سے حرمت نص قطعی سے ثابت ہے اور اگر کئی عورتوں کا دودھ ایک ساتھ مل جائے تب بھی حرمت ثابت ہو جاتی ہے، اولاً تو احناف کے یہاں عورتوں کی دودھ کی فروختگی کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ (البحر الرائق ص۸۱ ج۶، عالمگیری ص ۱۱۴ ج ۳) اور اگر بالفرض جائز بھی ہو جائے تو دودھ کی فراہمی سے لے کر بنک تک پہنچنے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں: (۱) دودھ میں دوا یا غذا مکس ہو (۲) اس میں جانورں کے (گائے بھینس وغیرہ کے) دودھ کی ملاوٹ کی جائے (۳) خالص ایک عورت کا دودھ اس کے نام پتے کے ساتھ ہو (۴) کئی عورتوں کا دودھ ایک ساتھ ہو ان چاروں صورتوں میں اول کی دو صورتیں ہماری بحث سے خارج ہیں، تیسری صورت عملاً ممکن نہیں کہ کسی عورت کا دودھ اس کے پورے بایوڈاٹا کے ساتھ فروخت کیا جائے تا کہ رضاعت کے احکام کی رعایت ہو سکے۔ دودھ کی فراہمی اور بنک کے نظام میں چوتھی شکل ہی ممکن ہو سکتی ہے وہ بھی بغیر تشخیص وتعیین کے اور اگر بالفرض تعیین وتشخیص کو ملحوظ رکھا جائے تو اب اگر کسی ایک عورت کا دودھ غالب ہو اور صرف حرمت اسی سے ثابت کی جائے جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں تو یہ شکل بھی عملاً ممکن نہیں اور اگر ساری ہی عورتوں سے حرمت ثابت کی جائے جیسا کہ امام محمدؒ کہتے ہیں تو ایک بچے کا نسب ہزاروں لاکھوں عورتوں سے بیک وقت ثابت ہو جائے گا "**واذا اختلط لبن امرأتين تعلق تحريم باغلبهما عند ابی يو سف ......وقال محمد و زفر: يتعلق التحريم بهما ......**" (ہدایہ ص ۳۳۲ رج ۲ ررشیدیہ) اور پھر حرمت رضاعت کا سلسلہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا، ایک عقلمند کو حیران کرنے کیلئے صرف اس کا تصور ہی کافی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس سلسلہ میں ذرا سی لوچ ایمان کا بیڑا غرق کر دے گی اور اس کی کوئی بھی ایسی شکل عملاً ممکن نہیں ہے جس میں دودھ والی عورتوں کا تعیین ہو سکے جس سے رضاعت کا ریکارڈ رکھا جا سکے تا کہ حرمت رضاعت کے حدود پامال نہ ہوں۔

"**ان الاسلام يعتبر الرضا عة لحمة كلحمة النسب يحرم به ما يحرم من النسب باجما ع المسلمين ،ومن مقاصد الشرعية الكلية المحافظة على النسب ،و بنو ک الحليب مؤدية الى الاختلاط أوالريبة۔وبنا ء على ذالک قرر:**

أولاً:منع انشاء بنوک حليب الأمهات فی العالم الاسلامی ۔

ثانياً:حرمت الرضا ع منها" (الفقہ الاسلامی ص ۵۰۸۵ رج ۷)۔

’’اسلام میں رضاعت کا رشتہ نسب کے رشتہ کی مانند ہے اور مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ رضاعت سے بھی وہ سارے رشتہ حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں اور نسب کی حفاظت بنیادی مقاصد میں شامل ہے، دودھ بنک سے نسب میں اختلاط وشبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اکیڈمی طے کرتی ہے کہ:

اول: عالم اسلام میں ماؤں کے دودھ بنک قائم کرنا ممنوع ہے۔

دوم: دودھ بنک کے دودھ سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی‘‘۔

امام شافعی اور حنابلہ کے یہاں اگرچہ انسانی دودھ کی بیع جائز ہے دیکھئے (جدید فقہی تحقیقات ص ۳۲۱/ج ۱) لیکن دودھ کی بنک کاری میں تمیز ممکن نہیں۔ چنانچہ فقہ اکیڈمی جدہ عدم جواز کا فیصلہ کرچکی ہے۔

مادۂ منویہ بنک:

مادۂ منویہ کا مسئلہ رضاعت سے زیادہ نازک ہے، کیونکہ یہاں نسل، نسب اور محرمیت دونوں کا تعلق ہے، ظاہر ہے اس سے نسب خلط ملط ہوگا اور ممکن ہے ایک شخص شادی اپنی ہی محرم سے کر بیٹھے، زنا کاری عام ہوگی اور زنا اتنا سنگین گناہ ہے کہ مضطر کیلئے بھی اس کی گنجائش نہیں ہے جبکہ مضطر کیلئے بہت سے محرمات مباح ہوجاتے ہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

”وان أكرهه على الزنا وجب عليه الحد عند ابى حنيفة ‘‘(ہدایہ ص ۳۵۱/ج ۴/اشرفی) (اگر زنا پر مجبور کیا گیا (اور اس نے زنا کرلیا) تو امام صاحب کے نزدیک اس پر حد زنا لگے گی)۔

حاصل یہ کہ اولاً تو یہاں ضرورت متحقق نہیں اور اگر بالفرض ضرورت متحقق بھی ہوجائے تو بھی یہاں ایسی گنجائش نہ ہوگی، کیونکہ نسل ونسب وغیرہ کی حفاظت حصول اولاد سے زیادہ ضروری ہے بلکہ اولاد ہونا ہی صحیح نسب پر موقوف ہوتا ہے، لہٰذا ان دونوں صورتوں میں حرمت اور رضاعت کے جملہ احکام ثابت ہوں گے اور مادۂ منویہ کے بنک قائم کرنا، کسی مرد یا خاتون کو بنک کو، اور بنک کا کسی ضرورت مند مرد یا خاتوں کو، مادۂ منویہ فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے عطیہ کے طور پر دینا بنص قطعی حرام ہوگا۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ-خطرات واندیشے

مولانا محمد نعمت اللہ قاسمی ☆

حیوانات، نباتات اور جمادات کے ذریعہ مریضوں اور معذوروں کے علاج ومعالجہ کا سلسلہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے اور شریعت اسلامیہ نے بھی کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دے رکھی ہے، لیکن اب سوال اعضاء انسانی سے علاج ومعالجہ کا ہے کہ ایک انسان کے دل گردے، جگر اور آنکھ دوسرے ضرورت مند انسانوں کے جسم میں پیوست کرنا شرعا جائز ہے یا نہیں، اور یہ سوال صرف مذکورا اعضاء تک محدود نہیں رہے گا بلکہ آج یا کل پورے انسانی اعضاء سے متعلق یہ سوال سامنے آجائے گا اور پوچھنے والا پوچھے گا کہ حیوانات، نباتات اور جمادات کی طرح پورے انسانی ڈھانچہ کا استعمال علاج و معالجہ کے لئے درست ہے یا نہیں، جیسا کہ پہلے ہم سے خون چڑھانے سے متعلق سوال کیا گیا کہ ایسی ایسی ضرورت میں ایک انسان کا خون دوسرے انسان کو چڑھایا جاسکتا ہے یا نہیں۔

پھر ہم سے آنکھ، گردے اور جگر کے متعلق سوال کیا گیا اور ایسا بھی کیا جارہا ہے، اس طرح پورے انسانی اعضاء سے متعلق ہم سے پوچھا جائے گا اور اگر ہم نے بر بنائے ضرورت چند اعضاء کے استعمال کی اجازت دے دی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ بر بنائے ضرورت دیگر اعضائے انسانی کے استعمال کی اجازت نہ دیں، اس لئے ہمیں مستقبل سے صرف نظر کر کے ایک ایک عضو پر غور نہیں کرنا ہے پورے انسانی ڈھانچہ کو سامنے رکھ کر غور کرنا ہے، کہ زندہ یا مردہ اور اگر زندہ نہیں تو کم از کم مردہ انسان کا پورا ڈھانچہ علاج ومعالجہ کے لئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں اور ضرورت وحاجت تو موجود ہی ہے کہ ایک زندہ انسان کو مرنے سے بچانا ہے یا کسی معذور سے معذوری کو دور کرنا ہے اور ڈھانچہ مردہ انسان کا ہے جس کی اہمیت بہر صورت زندہ انسان سے کم ہے۔

میرے خیال میں اگر انسانی ڈھانچہ کو حیوانات ونباتات وغیرہ کی طرح ضرورت وحاجت میں مباح الاستعمال قرار دے دیا جائے گو مردہ یا اس کے وارث کی اجازت کے بعد ہی سہی تو پھر ہمیں تجہیز وتکفین کے مسائل پڑھنے کی حاجت

☆ خادم جامعہ اسلامیہ دار العلوم ملیا، ضلع کھگڑیا، بہار۔

بھی باقی نہیں رہے گی بلکہ تجہیز وتکفین کے نصوص اور مسائل سے کتابوں کو بوجھل کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہ جائے گی، یہاں تک کہ مسلم لاشوں کو قبرستان اور غیر مسلم لاشوں کو شمشان گھاٹ لے جانے سے بھی ہمیں بے فکری ہوجائے گی کہ دوا ساز فیکٹری کے عملہ خود آ کر لاش اٹھالے جائیں گے، کیا خیال ہے فقہائے امت کا؟ آیا اس اتفاقی نہیں بلکہ غیر متناہی ضرورت کی تکمیل کے لئے حیوانات، نباتات اور جمادات کی طرح علاج ومعالجہ اور دوا سازی کی ضرورت کے لئے انسانی ڈھانچہ کے استعمال کی اجازت دے دی جائے؟

حضرات علماء کرام! نصوص میں غور وفکر کا دروازہ نہ پہلے بند تھا اور نہ اب بند ہے، لہذا اکل میتۃ وغیرہ کے نصوص میں غور وفکر کرنے سے جس طرح وہ شرائط متبادر ومستفہم ہیں جن شرائط کے ساتھ اکل میتۃ وغیرہ کا جواز مشروط ہے، مثلاً یہ کہ حالت حالت اضطرار ہو، جان کا بچ جانا یقینی ہو یا کم از کم مظنون بظن غالب ہو اور استعمال بقدر ضرورت ہو، اسی طرح ان نصوص میں غور کرنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خود انسان جو نصوص کا مخاطب ہے وہ میتۃ وغیرہ کے درجہ میں نہیں ہے، یعنی حالت اضطرار میں جن چیزوں کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے ان چیزوں میں خود انسان شامل نہیں ہے ورنہ مامور اور مامور بہ یا منہی اور منہی عنہ کا شئ واحد ہونا لازم آئے گا، اور اگر کسی اہل علم کے ذہن میں یہ نکتہ آئے کہ مخاطب زندہ انسان ہے مردہ انسان نہیں، لہذا مردہ انسان میتۃ وغیرہ کے حکم میں شامل ہوسکتا ہے اور زندہ انسان بوقت اضطرار اس مردہ انسان کو اپنے مصرف میں لاسکتا ہے۔

تو اس نکتہ کے سلسلہ میں ادب کے ساتھ عرض ہے کہ نص کا ایسا مفہوم لینا جس سے دوسرے نص کا اہدام لازم آئے درست نہیں ہے اور یہاں ایسا ہی ہے کہ اس نکتہ یا دوسرے مفہوم کا اگر اعتبار کیا جائے تو دوسرے نصوص جو تکفین وتدفین کے سلسلہ میں وارد ہیں ان کا اہدام لازم آتا ہے، اس لئے یہ دوسرا مفہوم اکل میتۃ وغیرہ کے نصوص کا نہیں ہوسکتا۔

یہاں یہ واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو (مردہ کے اعضاء سے پیوندکاری کے مسئلہ کو) فقہاء کرام کے بیان کردہ ان جزئیوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ حاملہ میت کا پیٹ چاک کرکے اس سے مردہ بچہ کو نکالا جاسکتا ہے اس لئے کہ کہاں پیٹ کا چاک کیا جانا اور کہاں تجہیز وتکفین کا قصہ ہی ختم ہوجانا، کیا جوڑ اور کیا مابہ الاشتراک ہے دونوں مسئلہ میں غور فرمائیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مردہ اور زندہ واجب القتل شخص کو مار کر اس کا گوشت کھانے کی اجازت مضطر کو شافعیہ اور بعض حنفی، مالکی اور حنبلی فقیہ نے دی ہے اس لئے حالت اضطرات میں اعضائے انسانی کا استعمال علاج ومعالجہ کے لئے جائز ہے، غور فرمائیں۔

کہاں جمہور فقہاء حنفیہ، جمہور فقہائے مالکیہ، جمہور فقہاء حنابلہ اور کہاں ان میں کے بعض فقیہ اور صرف حضرات شوافع، کیا جمہور فقہاء امت کا ذہن حالت اضطرار میں مردہ انسان کا گوشت کھانے یا نہ کھانے کے مسئلہ کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا؟ کیا یہ کوئی مسئلہ تھا جو جمہور فقہاء امت کے زمانہ کے بعد پیدا ہوا پھر یہ کہ حضرات شوافع اور دیگر بعض فقہاء نے مردہ انسان کا گوشت سدرمق کے طور پر کھانے کی اجازت دی ہے یا علاج ومعالجہ کے نام پر پوری نقش ہضم کر کے تجہیز وتکفین کا قصہ ختم کر نے کی اجازت دی ہے، غور فرمائیں کیا قیاس ہے!

اس گفتگو کے بعد اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ **"ماأهل لغير الله"**، خنزیر اور میتة کی ساری قسموں میں سے ان کے کن کن اعضاء کا استعمال اور کس طرح کا استعمال حالت اضطرار میں جائز ہے؟ اور اگر دل گواہی دے تو حاجت کو بھی ضرورت میں شامل کرلیں کہ مبادی وہ حاجت مفضی الی الاضطرار ہوجائے اور یوں بھی کہ لینے کی حاجت کی صورت میں میتة، خنزیر اور ما اہل لغیر اللہ کے کن کن اعضاء کا استعمال جائز ہے؟ اس سوال کا جواب احقر کے خیال میں یوں ہے کہ میتة کے جو اعضاء پاک ہیں مثلاً ہڈی تو ان اعضاء کے استعمال کے لئے اضطرار کی بھی قید نہیں ہے اور جو اعضاء ناپاک ہیں اور خنزیر تو پورا کا پورا ہی ناپاک ہے ان اعضاء کا استعمال ضرورت وحاجت میں محض اس طور پر جائز ہے کہ وہ جسم میں جا کر تحلیل ہوجائے، مثلاً میتة اور خنزیر کا گوشت بوقت حاجت وضرورت کھایا جاسکتا ہے اور اگر میتة، خنزیر اور ما اہل لغیر اللہ کا خون انسانی بدن کو موافق آئے تو وہ خون بھی بوقت حاجت وضرورت چڑھایا جاسکتا ہے لیکن میتة کے ناپاک اعضاء اور خنزیر کے کسی عضو کی پیوندکاری جسم انسانی میں نہیں کی جاسکتی۔

دلیل یہ ہے کہ حالت اضطرار میں اکل میتة وغیرہ کا ذکر سورہ بقرہ میں بھی ہے، سورہ مائدہ میں بھی ہے اور سورہ انعام میں بھی، سورہ بقرہ اور سورہ انعام میں اضطرار عام ہے لیکن سورہ مائدہ میں اضطرار کو مخمصہ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، جس کا مطلب **"القرآن يفسر بعضه بعضا"** کے تحت یہ ہوا کہ مردار، خون اور خنزیر کے استعمال کی اجازت صرف اس شخص کو ہے جو بھوک کی شدت سے جان بلب ہو، اس کے علاوہ دوسری ضرورت کے لئے یا یوں کہا جائے کہ بھوک کی شدت کے علاوہ اضطرار کی دوسری صورتوں میں میتة وغیرہ کا استعمال جائز نہیں ہے یعنی میتة، خنزیر اور ما اہل لغیر اللہ کے ذریعہ پیوندکاری جائز نہیں ہے، اسی کو احقر کے علاوہ بعض دوسرے علماء نے بھی اس طرح فرمایا ہے کہ مردار وغیرہ کا استعمال صرف اس طرح پر جائز ہے کہ وہ جسم میں جا کر تحلیل ہوجائے، اس تعبیر میں تھوڑا سا عموم ہوگیا ہے کہ خون چڑھانا گرچہ اکل معتاد نہیں ہے لیکن اکل معتاد کی طرح خون جسم میں جا کر تحلیل ہوجاتا ہے، اس لئے خون چڑھانا بھی جائز ہوگیا، اگر جسم انسانی کو موافق آئے بہرصورت مردار، خنزیر اور ما اہل لغیر اللہ کے ذریعہ پیوندکاری کی اجازت نہیں نکل رہی ہے۔

ہاں اضطرار فی المخمصہ کو معلول بالعلت قرار دیا جائے کہ اضطرار فی المخمصہ کی علت کسی مرنے والے کی جان بچانا خواہ وہ جس طرح بھی ہو کھا کر یا کسی اور طریقہ استعمال میں لاکر پھر اسی علت کی بنیاد پر مردار اور خنزیر اور ما اہل لغیر اللہ کے ذریعہ پیوندکاری کی اجازت نکل سکتی ہے! غور کر لیا جائے! زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ مریض یا مضطر حامل نجاست ہوگا جس طرح سلسل بول کا مریض حامل نجاست ہوتا ہے اور اسی حال میں وہ نماز وغیرہ پڑھتا ہے۔

۳- زندہ انسان کے اعضاء واجزاء کے عطیہ کا مسئلہ بحالت زندگی:

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ کوئی زندہ انسان اپنے جسم سے کوئی عضو علاحدہ کر کے کسی مضطر کو دے سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ نصوص ہر دو قسم کے ہیں، بعض نصوص کے اندر جہاں جان و مال کے ذریعہ ایثار و ہمدردی کی ترغیب دی گئی ہے وہیں بعض دوسرے نصوص کے اندر اپنے آپ کو ہلاکت و بربادی میں ڈالنے سے روکا بھی گیا ہے، ضرورت ہے کہ ان دونوں قسموں کے نصوص کے درمیان تطبیق کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔

غور کرنے سے میرے سمجھ میں یوں آتا ہے کہ خالق کائنات کی مشیت کے مطابق جان و مال کو صرف کیا جائے تو وہ محمود ہے اور اگر خالق کائنات کی مشیت کے خلاف جان و مال کو صرف کیا جائے تو وہ مذموم اور ممنوع ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ میں آدمی جانوں سے کھیلتا ہے اور اپنی سب سے زیادہ قیمتی شئ کو خطرہ میں ڈالتا ہے، لیکن حسن نیت کے ساتھ یہ عمل اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے، اس کے برخلاف جب انسان خودکشی کرتا ہے جس کی اجازت نہیں ہے تو وہ مذموم اور ممنوع ہے اور اللہ کے غضب کا ذریعہ ہے، پس غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایثار و ہمدردی کے جذبہ کے تحت کسی مضطر کو اپنا کوئی عضو دے کر اس کی جان بچانے کی کوشش کرنا اور اپنے آپ کو مشقت و پریشانی میں ڈالنا یہ عنداللہ محمود ہوگا یا مذموم؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمیں کلام فقہاء میں غور کرنا چاہئے جو قرآن وسنت کے ماہر اور رمز شناس ہیں، فقہ حنفی میں غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایثار و ہمدردی کے جذبہ کے تحت اپنے آپ کو پیش کرتا ہے اور کسی مضطر سے کہتا ہے کہ تم میرے جسم کا گوشت کاٹ لو اور کھا کر اپنی جان بچالو تو اس کی یہ ہمدردی قابل قدر ضرور ہے، لیکن خود مضطر کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنی جان بچانے کے لئے اس پیش کش کرنے والے کو مشقت و پریشانی میں ڈالے لیکن تعجب ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ خود مضطر بھی اپنے آپ کو بچانے کے لئے اپنے ہی جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر نہیں کھا سکتا۔

"مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاک فقال له رجل: قطع يدی وكلها أو قال: اقطع منی قطعة وكلها لايسعه ان يفعل ذلک ولا يصح أمره به كمالايسع للمضطر ان يقطع قطعة من نفسه فيأكل كذا فی فتاوی قاضی خان" (ہندیہ ۵/ ۳۳۸، قاضی خاں علی ہامش ۳/ ۴۰۴)۔

جبکہ دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہوا ملتا ہے کہ اگر جسم کا کوئی حصہ ناکارہ ہوجائے اور جان بچانے کے لئے اس کو کاٹنا ضروری ہو تو اس ناکارہ حصہ کو کاٹ کر جسم سے علاحدہ کردے۔

"قال رجل لآخر: اقطع یدی فان کان بعلاج کما اذا وقعت فی یدہ أکلة فلا بأس به وان من غیر علاج لا یحل ولو قطع فی الحالین فسری الی النفس لا یضمن" (شامی کتاب الجنایات ۱۰/ ۱۹۴)۔

ان دونوں مسئلوں میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ غور کرنے سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ جسم کے صحت مند حصے کو کاٹنے سے غالباً اس لئے منع کیا گیا ہے کہ کہیں وہ کاٹنا مفضی الی الہلاکت نہ ہوجائے اور ناکارہ حصے کا موجود رہنا مفضی الی الہلاکت ہے، اس لئے اس کو کاٹ کر علاحدہ کرنا ضروری ہے اور اسی کے ساتھ کتاب الجنایات میں بیان کردہ ان مسائل کو ملالیا جائے جن میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے "مجھے قتل کردو" تو دوسرے کے لئے اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ جان میں اباحت نہیں چلتی یعنی جان کی پیشکش درست نہیں ہے، اس لئے یہ اباحت واجازت معتبر نہیں اور اگر کوئی دوسرے سے یوں کہے کہ میرے اطراف یعنی ہاتھ پیر کاٹ دو تو اس صورت میں بھی اطراف کو کاٹنا مخاطب ومامور کے لئے جائز نہیں ہے، لیکن اگر اس نے کاٹ دیا تو اس پر کوئی ضمان نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اطراف مثل اموال کے ہیں، اس لئے اطراف میں اباحت واجازت آمر کے حق میں معتبر ہے اور مامور پر کوئی ضمان لازم نہیں ہوگا۔

"(ولو قال اقتلنی فقتله)......(فلا قصاص وتجب الدیة)......لأن الاباحة لاتجری فی النفس وسقط القود لشبهة الاذن......(لو قال اقتل عبدی أو اقطع یدہ ففعل فلا ضمان علیه)اجماعا کقوله: اقطع یدی أورجلی وإن سری لنفسه ومات، لان الاطراف کالأموال فصح الأمر"(الدرالمختار متن ردالمحتار ۱۰/ ۱۹۳، ۱۹۴)۔

ان دونوں مسئلوں سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ جان کی پیش کش تو جائز ہی نہیں ہے، یعنی ان اعضائے رئیسہ کی پیشکش کرنا جن پر جان کا مدار ہے جائز نہیں ہے، لیکن جو اعضاء رئیسہ نہیں ہیں ان کی پیش کش کرنا جائز ہے تاہم اس پیش کش کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا، اضطرار اور جنایت والے دونوں جزئیوں کے پیش نظر مامور کے لئے پھر بھی جائز نہیں ہے، اور بندہ کے خیال میں غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ گوشت یا اطراف کو جسم سے علاحدہ کرنا مبادا آمر کی ہلاکت کا سبب ہوجائے اس لئے ناجائز قرار دیا گیا، لیکن اگر جسم کا وہ حصہ جس پر جان کا مدار نہیں ہے اس کو جسم سے علاحدہ کرنے کی کوئی ایسی تدبیر ہوجائے

جو مفضی الی الہلاکت نہ ہو تو پھر بے ضرورت تو نہیں، لیکن اضطرار کے مواقع میں ایسی پیش کش کو قبول کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

فقہ حنبلی میں اطراف کو کاٹنے سے منع کی علت یہی بیان کی گئی ہے کہ مبادا وہ مفضی الی الہلاکت ہو جائے، مغنی کی عبارت اس طرح ہے:"ولنا إن أكله من نفسه ربما يقتله فيكون قاتلا لنفسه ولا يتعين حصول البقاء بأكله" (۳۳۵/۹)۔

انسانی خون اور دودھ کا مسئلہ:

گوشت یا جسم کے دوسرے اطراف کی پیش کش قبول نہ کرنے کی علت اگر یہی مفضی الی الہلاکت ہوتا ہے تو پھر خون کی پیش کش کے مسئلہ کو بھی اسی پر قیاس کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص کے جسم سے خون کا نکالا جانا اس کے لئے خطرہ کا باعث ہو اس کے خون کی پیش کش درست نہیں ہے اور جب پیش کش درست نہیں ہے تو قبول کرنا کہاں جائز ہوگا، اسی طرح خون کی اتنی زیادہ مقدار کسی کے جسم سے نکال لینا کہ وہ اس کے لئے خطرہ کا باعث ہو جائے یہ بھی جائز نہیں ہوگا۔

اور یہیں پر اس مسئلہ کو بھی صاف کر لیا جائے کہ مفضی الی الہلاکت ہونے کی صورت میں خون نکالے جانے کا جواز محض ایثار و ہمدردی کے جذبہ پر مبنی ہے اس لئے جو کچھ بھی ہونا چاہئے ایثار و ہمدردی کے جذبہ کے تحت ہونا چاہئے، خرید و فروخت کی صورت میں نہیں ہونا چاہئے اور دودھ کے مسئلہ پر خون کے مسئلہ کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کہ دودھ کی تولید ہی جسم سے نکالے جانے کے لئے اور اس کے نکلنے ہی سے جسم کو راحت ہوتی ہے برخلاف خون کے کہ اس کی تولید نکالے جانے کے لئے نہیں ہے اور اس کے نکالے جانے سے جسم کو راحت نہیں نقصان ہی ہوتا ہے سوائے بطور علاج، مانند جسم ناکارہ کے اس لئے دودھ کے مسئلہ پر خون کے مسئلہ کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے (پہلے مجلّے کے ایک مقالہ میں خون کو دودھ پر قیاس کیا گیا ہے)۔

پس جسم سے خون کو نکال کر فروخت کرنا ہرگز جائز نہیں ہوگا اور دودھ کو جسم سے نکال کر فروخت کرنا جائز ہو سکتا ہے، لیکن اس طور پر کہ اختلاط نسب کا باعث نہ ہو، جیسا کہ متعین بچہ کو دودھ پلانا اختلاط نسب کا باعث نہیں ہے۔

جان کی پیش کش کے عدم جواز پر کچھ خلجان:

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کلام فقہاء سے جان کی پیش کش کے عدم جواز کا ذکر جو اوپر ہوا اس تعلق سے یہ خلجان پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام نے سرکار دو عالم ﷺ پر اپنی جانوں کو نثار کیا، اسی طرح جہاد میں اپنی قیمتی جانوں کو شہید کرایا تو پھر جان کی پیش کش کا عدم جواز قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے، اس خلجان کا جواب یہ ہے کہ حضرات

صحابہ کرامؓ نے جو کچھ کیا وہ اعلاء کلمہ اللہ اور خلاصہ کائنات ﷺ کے لئے کیا اور کہاں خلاصہ موجودات ﷺ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جان کی قربانی اور کہاں شخص واحد کے لئے جان کی قربانی دونوں میں کافی فرق ہے۔

اسی طرح یہ خلجان کہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے اگر کوئی شخص مارا گیا ہے تو وہ شہید ہے، گویا خود اپنی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر جان کو خطرہ میں ڈالنا ماذون من اللہ لہذا دوسرے کے لئے بھی اپنی جان کی پیش کش درست ہونے کا قیاس بھی صحیح نہیں ہے، کہاں اپنی جان کی حفاظت کی ذمہ داری اور کہاں دوسروں کی جان کی حفاظت کا بوجھ۔

زندہ انسان سے لئے ہوئے اعضاء کی پیوندکاری پر کچھ شبہات کا جواب:

بہرصورت کلام فقہاء سے احقر نے جو کچھ سمجھا پیش کر دیا، باقی اطراف یعنی وہ اعضاء جن پر جان کا مدار نہیں ہے ان اعضاء کی پیش کش قبول کرنے کے سلسلہ میں احقر نے جو اپنی رائے پیش کی ہے کہ اگر وہ قبول کرنا ایسی حکمت و تدبیر کے ساتھ کہ پیش کش کرنے والے کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو تو اس قبولیت کی گنجائش ہے، اس گنجائش پر مثلہ کے مسئلہ سے نقض وارد کرنا مناسب نہیں ہے کہ یہ مثلہ بے ضرورت اور خواہ مخواہ نہیں ہے اور نہ عام حالات میں اس کی اجازت ہے بلکہ خاص اضطرار و حاجت کی صورت کے ساتھ یہ گنجائش مشروط ہے، اور مستثنیات کہاں نہیں ہیں؟ ہر جگہ کچھ نہ کچھ مستثنیات آپ کو مل جائیں گے۔

اسی طرح کٹے ہوئے اعضاء کے ناپاک ہونے والے مسئلہ سے نقض وارد کرنا مناسب نہیں ہے کہ مضطر جس کے جسم میں یہ اعضاء جوڑے جائیں گے وہ زیادہ سے زیادہ سلسل بول کے مریض کے مانند حامل نجاست ہوگا۔

تاہم بالاختصار اظہار رائے کے لئے سوال کے تمام اجزاء کا الگ الگ جواب دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱- صرف عطیہ دے سکتا ہے، فروخت نہیں کر سکتا ہے۔

۲- مفت خون فراہم کرنے کے ساتھ متاثر شخص کے متعلقین کو بدلہ میں خون دینے کے لئے پابند کرنا درست نہیں ہے، بدلہ میں اگر خون دینے کی پابندی ہو تو یہ خون کی خرید و فروخت ہے جو جائز نہیں ہے، پھر ایسے بلڈ بینک کو خون کا عطیہ دینا بھی جائز نہیں ہوگا اور اگر بدلہ میں خون دینے کی شرط نہ ہو محض ترغیب ہو تو پھر ایسے بلڈ بینک میں خون کا عطیہ دینا جائز ہوگا۔

۳- بلڈ بینک قائم کرنا اس ادارہ یا تنظیم کے لئے جائز ہے جو خون کی خرید و فروخت نہ کرتی ہو۔

۴- مستحب ہوگا بشرطیکہ خون دینے سے خود اس کی (خون دینے والے کی) صحت متاثر نہ ہو۔

۵- مردہ کے کسی عضو کو جگر ہو یا کچھ اور اس کے جسم سے کاٹ کر علاحدہ کرنا جائز نہیں ہے خواہ مردہ نے زندگی میں اس کی

اجازت ہی کیوں نہ دے دی ہو۔

۶-الف: زندہ شخص اپنی زندگی میں اپنی ایک آنکھ کا قرنیہ نکلوا کر دوسرے ضرورت مند کو دے سکتا ہے۔

ب: لیکن مردہ کی آنکھ نکالنا جائز نہیں خواہ مردے نے زندگی میں اس کی اجازت ہی کیوں نہ دے دی ہو۔

ج: زندہ شخص ایسے آئی بینک میں اپنی آنکھ کا عطیہ دے سکتا ہے، لیکن مردہ کی آنکھ نکالنا جائز نہیں ہے۔

۷- اس سوال کا جواب سوال ۵، ۶ کے جواب میں گذر چکا۔

۸- کسی خاتون کا متعین بچہ کے لئے دودھ فروخت کرنا جائز ہے، لیکن دودھ بینک میں اپنا دودھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے کہ یہ صورت حرمت رضاعت جس کا ثبوت نص قطعی سے اس کے اہدام کا سبب ہے۔

۹- مادہ منویہ بینک قائم کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس بینک میں قیمتا یا بلا قیمت مرد یا عورت کا اپنا مادہ منویہ جمع کرنا جائز ہے اور نہ ہی اس بینک سے قیمتا یا بلا قیمت مادہ منویہ حاصل کرنا جائز ہے، کہ یہ ایسا عمل ہے جو بے حیائی، بدکاری اور اختلاط نسب کا ذریعہ ہے اور انسانوں کو انسان کے صف سے نکال کر جانوروں کے صف میں کھڑا کرنے والا ہے۔

☆☆☆

اعضاءانسانی کا عطیہ-اسلامی تناظر میں

مفتی شبیر یعقوب دیولوی☆

۱- مسلمان کا مسلمان کو یا غیر مسلم کو خون کا عطیہ دینے کے بارے میں سب سے پہلے تو یہ ہے کہ انسانی خون یا اجزاء کے باب میں گفتگو کرتے ہوئے اہل علم کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ تمام اجزاء انسانی کے استعمال کا حکم خواہ وہ انسان مسلم ہو یا غیر مسلم دوسری سب چیزوں کے احکام سے مختلف ہے، یعنی احترام انسانیت کی وجہ سے عام حالات میں انسان کے تمام اجزاء کا استعمال شرعاً ممنوع ہے، اسی بنیاد پر فقہاء نے انسانی جسم کے بعض اجزاء کا بھی استعمال اوران کی خرید وفروخت کو ناجائز بتایا ہے، فقیہ ابن ہمام جیسے محقق فرماتے ہیں:

”**لایجوز بیعه اذا استغنی عن الرضاع لا یجوز شربه، والانتفاع به یحرم**“ (فتح القدیر ۲/ ۲۰۱) جب پاک اجزائے انسانی کا یہ حکم بتایا گیا ہے تو وہ اجزاء جو ناپاک ہیں (مثلاً خون) ان کے استعمال سے تو اور بھی زیادہ سختی کے ساتھ روکا جانا چاہئے پھر بظاہر اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ کسی بھی حالت میں انسانی خون کے استعمال کی اجازت نہ ہو، لیکن چونکہ فقہاء متاخرین نے انسانی دودھ کے دوا استعمال کی اجازت دے دی ہے، اس پر قیاس کرتے ہوئے عصر حاضر کے اکثر ممتاز علماء نے مثلاً مشہور فقیہ و محقق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (سابق مفتی اعظم پاکستان) نے بحالت اضطرات صرف مریض کی جان بچانے کی غرض سے کچھ شرطوں کے ساتھ جن میں دو اہم شرطیں یہ ہیں کہ: ۱- اس سے خون دینے والے کی جان یا صحت کو خطرہ پیش نہ آئے، ۲- اور اس سے انسانی خون کی ارزانی (بیع وشراء کا دروازہ کھل جانے) کا اندیشہ بھی نہ ہو، انسانی خون مریض کے بدن میں منتقل کرنے کو بھی جائز بتایا ہے (معارف القرآن ۱/ ۴۱۹ مطبوعہ دیوبند)۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ جن احادیث وآثار میں حرام سے شفا نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے، مثلاً شراب کو حدیث میں دواء کے بجائے داء (بیماری) بتایا گیا ہے، اس میں فقہاء کے اس فیصلے کے درمیان بظاہر تضاد اور تخالف نظر آتا ہے، مگر اللہ تعالی جزاء خیر عطا فرمائے علماء امت کو کہ انہوں نے اس کا حل بھی بتادیا اور تضاد رفع کردیا ہے۔

☆ دارالافتا، جامعہ قاسمیہ، کھروڈ، بھروچ۔

اس بارے میں سب سے زیادہ سیر حاصل بحث علامہ ابن حزم ظاہری اندلسی احقر کے مطالعہ میں آئی، اس کے بعض ضروری حصوں کو پیش کردینا شاید مناسب ہوگا۔

"والتداوی بمنزلة ضرورة وقد قال الله تعالی: "وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم اليه" فما اضطر المرأاليه فهو غير محرم عليه من المأكل والمشرب وماروی عن النبی ﷺ: "ان الله لم يجعل شفاء كم فيما حرم عليكم" لو صح لم يكن فيه حجة لان الخمر ليست دواء وإذ ليست دواء فلا خلاف بيننا فی ان ماليس دواء فلا يحل تناوله إذا كان حراما وما اباحة الميتة والخنزير عند خوف الهلاک من الجوع فقد تعالی شفاء نا من الجوع المهلک فيما حرم علينا فی غير تلک الحال...... فاذا اضطررنا إليه فلم يحرم علينا حينئذ بل هو حلال فهو لما حينئذ شفاء" (المحلی ۱/۲۳۱، ۲۳۴ مکتبۃ الجمہوریۃ العربیۃ)۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ فقہاء نے اشیاء محرمہ کی دوا استعمال کی بضرورت اجازت قرآن مجید کی ان آیات کی بنیاد پر دی ہے جن میں حرام اشیاء کے استعمال کی مضطر کے لئے اجازت دی گئی ہے۔

اس طور پر کہ ان آیات کے اندر بھوک سے موت کا یقینی خطرہ پیدا ہوجانے کی حالت میں جان بچانے کے لئے میت (مردار) خنزیر، خون وغیرہ حرام اشیاء کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، تو بیماری کی وجہ سے جان ختم ہوجانے کا یقینی خطرہ پیدا ہوجانے کی حالت میں کسی حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنے کا جواز بھی دلالۃ ثابت ہوتا ہے، نیز بعض فقہاء نے حدیث عرنیین سے بھی (صحیح مسلم ۲/۵۷، صحیح بخاری ۲/۶۰۲) تداوی بالمحرم کا جواز اخذ کیا ہے (چنانچہ ان فقہاء کے نزدیک حالت اضطرار کے بغیر بھی دوائے حرام کے استعمال کی اجازت ہے)۔

ان تفصیلات کا حاصل یہ ہوا کہ حالت اضطرار میں یعنی جب کہ کوئی حلال دوا مؤثر نہ ہو یا میسر نہ ہو تو صرف جان بچانے کے لئے حرام شئ (بشمول انسانی خون) کی صرف اتنی مقدار کی دوا استعمال کرنا جائز ہے، جس سے عادۃ جان کا بچنا یقینی ہو۔

"لأن ما ابيح للضرورة يقتدر بقدرها" (الأشباہ والنظائر ۱۲۲) ظاہر ہے کہ اصولاً مسلم اور غیر مسلم دونوں کے خون کا حکم یکساں ہے، لیکن یہ الگ بات ہے کہ کسی دیندار شخص کے جسم میں بے دین کا خون داخل کردینے کے نتیجہ میں غلط اثرات مرتب ہونے کا خطرہ ہو (جیسا کہ بعض واقعات سننے میں آئے ہیں) تو پھر اس وجہ سے اسے ناپسندیدہ قرار دیا جانا ہی شریعت کا تقاضہ ہوگا، اضطرار کی حالت اور حرام شئ میں شفا کے منحصر ہونے کا علم خواہ طبیب مسلم کے بتانے سے ہو یا غیر مسلم

طبیب کے کہنے سے یا ایسے ہی کسی اور قابل اعتماد ذریعہ سے جو مفید علم یقینی ہو یا موجب ظن قوی اس صورت میں خون کا استعمال جائز ہوگا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جن حالتوں میں انسانی خون کے استعمال کی اجازت ہے، کیا ان میں سے اس کے خون کی خرید وفروخت بھی جائز ہے؟ اس کا جواب ذیل میں دیا جارہا ہے، یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ کسی چیز کا استعمال جائز ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کی اس کا خرید وفروخت بھی جائز ہو جیسا کہ اس جزئیہ (مسئلہ) سے معلوم ہوتا ہے:

"لایجوز بیع شرعا لخنزیر لانه نجس العین فلا یجوز بیعه اهانة له ویجوز الانتفاع للضرر"، اور علامہ شامیؒ (جن کی ایک عبارت سے جواز انتفاع اور بیع کے جواز میں تلازم کا گمان ہوتا ہے) نے بھی یہ جزئیہ ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات اس بارے میں ملتی ہیں، مثلاً: **"عن الإمام ان الاانتفاع بالعذرة الخاصة جائز مع انه لا یجوز بیعها"** (شامی ۴/ ۱۱۳)۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہوا کہ ضرورت کے طور پر جن چیزوں کے استعمال کی گنجائش شریعت میں دی گئی ہے ان کی بیع کا جواز لازمی نہیں ہے، ہاں اگر یہ چیز ضرورت کے وقت بغیر قیمت دئے نہ ملتی ہو تو اضطرار کی حالت میں مضطر کے لئے اسکی قیمت دینا تو جائز ہوگا، مگر لینے والے کے وہ قیمت حلال نہ ہوگی، جیسا کہ خنزیر کے بال کے سلسلہ میں فقیہ ابواللیثؒ نے فرمایا: **"فلولم یوجد الا بالشراء جاز شراء ہ"** (فتح القدیر ۵/ ۲۰۲، مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ) اور درمختار میں اس پر ایک بہت مفید اور اہم اضافہ ملتا ہے **"لولم یوجد بلاثمن جاز الشراء للضرورۃ وکرہ البیع فلا یطیب ثمنه"** (درمختار مع ردالمحتار ۴/ ۱۱۳) اس پر قیاس کرتے ہوئے صورت مسئولہ کا بھی حکم یہی معلوم ہوتا ہے کہ اضطرار کی حالت میں انسانی خون اور اس جیسی دیگر اشیاء محرمہ کا استعمال تو جائز ہے مگر خرید وفروخت جائز نہیں۔

البتہ بوقت ضرورت یہ اشیاء اگر بلا قیمت نہ مل سکیں تو ضرورت مند کے لئے قیمت دے کر بھی ان کا استعمال جائز ہوگا، مگر قیمت لینا درست نہ ہوگا، اس حکم سے ان بے اعتدالیوں کا بھی ایک حد تک انسداد ہو سکے گا جو خون انسانی کے کاروبار کی شکل میں ہر جگہ پھیلتی جارہی ہے کہ چند پیسوں کی خاطر غریب اور مفلس لوگ اپنا خون فروخت کرتے اور بسا اوقات جان تک کو خطرہ میں دال دیتے ہیں کیونکہ خون کی معتد بہ مقدار کے جسم سے نکل جانے کیوجہ سے بعض افراد سنگین امراض (مثلاً ٹی بی) میں مبتلا ہو کر بسا اوقات زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، اور اوپر یہ بات گذر ہی چکی ہے کہ کسی انسان کا خون لے کر دوسرے کے لئے استعمال کرنا اسی وقت جائز ہوگا، جبکہ خون دینے والے کی صحت خطرہ میں پڑ جانے کا گمان نہ ہو، ورنہ جائز نہ ہوگا **"لان الضرر لایزال بالضرر"**، یہاں اس مسئلہ کا ذکر کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ اگر میاں بیوی میں سے کسی ایک نے دوسرے کو اپنا خون دیا ہے تو اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا (جواہر الفقہ ۵/ ۱۸۲، مطبوعہ دیوبند، موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی

حل رص ۱۸۹ تا ۱۹۸)۔

فقہاء نے اجزاء انسانی سے انتفاع کو بے شک منع کیا ہے، لیکن یہ ممانعت اس لئے تھی کہ اس زمانہ میں انسانی اعضاء سے انتفاع کو اس کی توہین تصور کیا جاتا تھا، اور اس دور میں ایسے طریقے بھی رائج نہیں تھے کہ شائستہ طور پر انسانی اجزاء سے انتفاع کیا جا سکے، ہمارے زمانے میں اس عمل کو انسان کی توہین نہیں سمجھا جاتا اگر کوئی شخص اپنا عضو کسی کو دے دے تو نہ خود وہ اپنی اہانت کا احساس کرتا ہے نہ لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوجاتا ہے، اسی لئے بڑے بڑے قائدین اور زعماء اپنے اعضاء کے سلسلہ میں اس قسم کی وصیت کر جاتے ہیں اور یہ چیز ان کے لئے نیک نامی کا باعث ہوتی ہے، اور انسانیت نوازی کی دلیل سمجھی جاتی ہے، ایک انسان کے جسم کا خون دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے، اب اس پر قریب قریب اتفاق ہو چکا ہے حالانکہ جزء انسانی سے انتفاع کو مطلقا توہین انسانی باور کیا جائے تو اسے بھی ناجائز ہونا چاہئے کہ جزء انسانی ہونے میں دونوں کی حیثیت یکساں ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بعض بزرگوں نے خون اور کسی عضو سے انتفاع میں فرق کیا ہے، اور خون کو دودھ پر قیاس کیا ہے مگر استدلال محل نظر ہے، کیونکہ دودھ انسان جسم میں رکھا ہی اس لئے گیا کہ وہ جسم سے خارج ہو اور اس کا استعمال ہو اس کا استعمال نہ کیا جانا صحت انسانی کے لئے مضر ہے، جبکہ خون قوام حیات ہے اور اس کو جسم میں باقی رکھنے پر ہی حیات انسانی موقوف ہے۔

فقہی اصطلاح کے مطابق ضرورت واضطرار کی حالت میں کہ جب کسی انسان کی جان جانے کا خطرہ ظن غالب کے درجے میں ہو تو دوسرے انسان، خواہ زندہ ہو یا مردہ کے عضو سے پیوندکاری کی گنجائش ہے، اور اس سلسلے میں مختلف مسالک کے ان فقہاء کرام کے اقوال کو مدار بنایا جا سکتا ہے جو المغنی (۸ر۶۰۱، ۶۰۲) اور شرح المہذب للنووی (۹ر۴۴، ۴۵۰) میں منقول ہیں جن میں حربی، مرتد کو قتل کر کے اس کا گوشت کھا کر جان بچانا یا مردہ ہو تو بھی اس کا گوشت کھا کر جان بچانے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اضطرار کی قید ضروری ہے ورنہ انسانوں کو مال مبتذل بنانے سے حکومت کا سخت سے سخت قانون بھی نہ روک سکے گا، اور فساد انسانیت کا خطرہ موہومہ کے بجائے واقعہ بن جائے گا، بلکہ جہاں بلا قید یہ کام ہو رہا ہے وہاں انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کاروبار بن چکی ہے، اور تکریم انسانی کا تصور فنا ہوتا جا رہا ہے۔

۷- کسی میت کا ایسا عضو کسی زندہ انسان کے اندر منتقل کرنا جائز ہے جس عضو پر زندگی کی بقا یا کسی بنیادی وظیفہ کی سلامتی منحصر ہو بشرطیکہ خود میت نے اپنی موت سے پہلے یا اس کی موت کے بعد اس کے ورثہ نے اگر میت کی شناخت نہ کی ہو یا لاوارث ہو تو مسلمانوں کے سربراہ نے اس کی اجازت دی ہو، یہ بات واضح رہے کہ جن صورتوں میں اعضاء کی منتقلی کے جواز کے طور پر اتفاق ہوا ہے وہ اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کے اعضاء کا حصول خرید وفروخت کے بغیر ہوا ہو، کیونکہ

کسی بھی حال میں اعضاء انسانی کی خرید وفروخت جائز نہیں (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے فیصلے)۔

۸- ماں کے علاوہ دوسری عورت کا دودھ بچے کو مدت رضاعت کے اندر پلانا بالاتفاق جائز ہے، بلکہ بعض شکلوں میں واجب ہے، مثلاً جبکہ بچہ کی ماں کے دودھ نہ ہو، یا بچہ ماں کا دودھ قبول نہ کرتا ہو یا ماں کا دودھ پینے سے بچہ یا اس کی ماں کے شدید بیمار ہوجانے کا خطرہ ہو، لیکن اس سے حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے یعنی دودھ پلانے والی عورت بچے کے حقیقی ماں کے بمنزل ہوجاتی ہے اور اسکی اولاد وغیرہ بچے کی حقیقی ماں کی اولاد وغیرہ کے حکم میں یعنی رضاعی بھائی بہن بن جاتے ہیں، یہی جمہور علماء کا متفقہ فیصلہ ہے، قرآن وسنت اور ائمہ مجتہدین کے اقوال کی روشنی میں رضاعت کا رشتہ صرف چھاتیوں سے دودھ پینے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ برتن میں نکالے ہوئے دودھ سے بھی یہ رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔

لہذا دودھ کے بینک قائم کرنا اس لئے درست نہیں کہ اس میں رضاعی رشتوں کی تمیز ناممکن ہوگی اس کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی یہ تجربہ کامیاب نہ رہا، اور عالم اسلام میں عمومی طور پر ضرورت مند بچوں کو متعین خواتین کا دودھ طبعی طور پر میسر آجاتا ہے اس لئے ایسے بینک کے قیام کی چنداں ضرورت نہیں، مذکورہ تفصیل کے بعد بچوں کے لئے دودھ کے بینک کے قیام کی بظاہر تو کوئی ضرورت نہیں نظر آتی، جیسا کہ اوپر گذرا۔

مزید یہ کہ دودھ کے بینک کے قیام سے قیمتاً دودھ خریدنے بلکہ اسے باقاعدہ کاروبار بنانے کی تشجیع اور حوصلہ افزائی ہوگی جو شرعاً ممنوع ہے (انسانی اجزاء میں چونکہ دودھ بھی شامل ہے اس لئے اس کی بیع ممنوع ہے)، لیکن ماں کے علاوہ بچہ کو کسی اور عورت کا دودھ پلانا ضروری ہو اور وہ بلا قیمت نہ مل سکے تو خریدنا بھی ضرورۃ جائز ہوگا مگر اس کی قیمت کا استعمال ہرگز جائز نہ ہوگا۔

اگر دودھ کے بینک اس کے باوجود قائم ہوجائیں تو پھر یہ مسئلہ پیدا ہوگا کہ جتنی عورتوں کا دودھ کوئی بچہ پئے گا اگر تعیین کے ساتھ معلوم ہوجائے تو اس بچہ کی وہ سب عورتیں رضاعی مائیں بن جائیں گی، امام محمدؒ کے نزدیک ہر صورت میں (اور یہی راجح قول ہے) لیکن اگر تعیین نہ ہوسکی اور نہ کوئی ایسی علامت ہی ملی جس سے نشاندہی ہوسکے تو حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی، واضح رہے کہ اصل اہمیت رضاعت کے شرعی احکام بچہ سے متعلق ہونے نہ ہونے میں دودھ کے معدہ کے اندر جانے اور مدت رضاعت کی ہے اگر مدت کے اند پلایا گیا تو جائز ہے اسی مدت میں دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی ورنہ نہیں، دودھ پینے یا پلانے سے مراد بچہ کے معدہ میں مدت میں دودھ کا پہنچنا ہے چاہے جس طریقہ سے پہنچایا جائے (موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل)۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

مولانا ارشد علی رحمانی ☆

۱- ایک انسان کے خون کا استعمال دوسرے انسان کے لئے دو وجہوں سے حرام بتایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ یہ اجزاء انسانی میں سے ایک جز ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کے کسی جز سے انتفاع اسکی کرامت وشرافت کے مغایر ہے لہٰذا یہ درست نہیں ہوسکتا، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "**وحرمة الانتفاع بأجزاء الآدمی لکرامته**" (ھدایہ، باب الماء الذی یجوز بہ الوضوء: ۱/۴۱)، دوسری وجہ یہ ہے کہ خون بذاتہ ناپاک ہے اور شئی نجس سے علاج کرانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی، اور اسی بناء پر امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اگر کسی نے دوسرے کا خون اپنے جسم میں داخل کروایا تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اس خون کو نکلوائے اور جتنی نمازیں خون داخل کرنے کے بعد پڑھی ہیں اس کا اعادہ کرے، "**قال الامام الشافعیؒ فی الام: وان أدخل دماً تحت جلده فنبت علیه فعلیه ان یخرج ھٰذالدم ویعید کل صلوٰۃ صلاھابعد إد خاله الدم تحت جلده**" (کتاب الأم: ۱/۵۴)، عالمگیری میں ہے: "**الانتفاع باجزاء الآدمی لم یجز قیل للنجاسة وقیل للکرامة**" (ہندیہ: ۵/۳۵۳)، "**وأما الآدمی فقد قال بعض مشائخنا أنه لم یجز الانتفاع بأجزائه لنجاسته وقال بعضهم لکرامته وهو الصحیح**" (تاتارخانیۃ، باب الکراھیۃ: ۱۸/۱۹۸، کذا فی تبیین الحقائق: باب الکراھیۃ: ۷/۳۷، مجمع الانھر: ۱/۵۱، البحرالرائق: ۱/۱۰۰)۔

لیکن حضرات فقہاء کے عدم جواز کا قول عام حالات میں ہے ضرورت کے وقت حضرات فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں، البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ماہر طبیب یہ کہے کہ بغیر خون کے استعمال کے اس کی جان کو خطرہ ہے، عالمگیری میں ہے: "**ویجوز للعلیل شرب الدم والبول وأکل المیتة للتداوی اذا أخبره طبیب مسلم أن شفائه فیه ولم یجد من المباح مایقوم مقامه**" (عالمگیری: باب الکراھیۃ ۵/۳۵۴)۔

☆ قاضی شریعت: محکمہ شرعیہ امارت شرعیہ، جودھپور، راجستھان۔

مفتی نظام الدین اعظمیؒ لکھتے ہیں: ''جان بچانے کے لئے مجبوری واضطرار کی صورت میں انسانی خون کو استعمال کر لینے کی اور اس کا انجکشن لگا دینے کی تداوی بالمحرم کے قاعدہ کے مطابق شرعاً گنجائش ہے'' (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۳۵۶)، مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں: ''اگر اضطراری کیفیت ہو کہ بغیر انسانی خون کے جان بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے'' (فتاویٰ محمودیہ: ۱۸/۳۲۸)، فقیہ العصر حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں: ''دوسروں کا خون استعمال کرنا ظاہر ہے کہ اضطراری حالت میں جائز ہے، جب خون کا استعمال جائز ہے تو خون کا ہبہ کرنا بھی جائز ہے'' (فتاویٰ قاضی ر۲۱۱)۔

۳- پہلے دونوں سوال کے جواب میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جو چیز بطور ضرورت جائز ہوتی ہے وہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ جائز ہوتی ہے، لہٰذا جب خون کا عطیہ کسی ناگہانی حادثات کے لئے بلڈ بینک میں کرنا درست ہے، تو ہندوستان جہاں مسلمانوں کی آبادی بیس فیصد ہے اور حکومت کی متعصّبانہ نگاہ مسلمانوں پر مرکوز رہتی ہے، بالخصوص موجودہ حکومت جو کھلم کھلا مسلمانوں کی مخالفت پر تلی ہوئی ہے اور مختلف زاویہ سے مسلمانوں کو مجبور کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہے، جس کی ایک بڑی دلیل اقتدار میں آتے ہی دینی ادارے بالخصوص شعبہ افتاء وقضاء پر حد بندی کا نفاذ کرنا ہے، اس لئے ان حالات میں جبکہ خون کا عطیہ بطور ضرورت جائز ہے ہی تو پھر حکومت کی نگاہ میں ملک وملت کے جذبہ قربانی کے اظہار کے لئے رضا کارانہ بلڈ بینک کا قائم کرنا نہ صرف مباح ہے بلکہ میری حقیر رائے کے مطابق ایک اچھا قدم بھی ہے جس کی شرعاً گنجائش ہونی چاہئے۔

۴- رحمۃ للعلمین ﷺ نے انسانی ہمدردی اور ایک دوسرے کیلئے قربانی پیش کرنے پر بڑا زور دیا ہے، اور مفلس ومحتاج کی خبر گیری کو مسلمانوں کا شعار بتایا ہے، اور اس سلسلے میں آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے بہت سارے واقعات دلائل ہیں کہ آپ ﷺ نے انسانی ہمدردی کے لئے بڑے ایثار کا معاملہ فرمایا، چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابیہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چادر پیش کی، آپ ﷺ کو اس کی ضرورت بھی تھی تو آپ ﷺ نے چادر لے لیا اور اسے اپنے جسم اطہر پر ڈال لیا، آپؐ کو دیکھ کر ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ چادر بہت خوبصورت ہے، یہ مجھے عطا فرما دیں چنانچہ آپ ﷺ نے باوجود ضرورت کے وہ چادر ان کو دیدی (دیکھئے الصحیح البخاری)، اسی طرح مشہور انصاری صحابی حضرت ابو طلحہؓ کا واقعہ ہے کہ ان کے گھر میں صرف ان کے بچوں کا کھانا تھا ان کا اور ان کی اہلیہ کا بھی کھانا نہیں تھا لیکن ایک محتاج بھوکا آدمی اللہ کے نبیؐ کے دربار میں آیا اور اپنی بھوک وحاجت کا تذکرہ کیا تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس کی

مہمان نوازی کون کرے گا یہ سن کر حضرت ابوطلحہؓ کھڑے ہوئے اور اس آدمی کولیکر اپنے گھر گئے اور بیوی سے کہا کہ بچوں کوکسی طرح بہلا کر سلا دو پھر اس محتاج کو بچوں کا سارا کھانا کھلا دیا (دیکھئے: بخاری ومسلم)، اور مسلمانوں کے بارے میں تو آپ ﷺ کا واضح ارشاد موجود ہے: کہ مسلمان آپس میں ایک جسم کے مانند ہیں کہ اگر جسم کے ایک حصہ آنکھ کو تکلیف ہوتی ہے تو سارے جسم میں تکلیف ہوتی ہے اور اگر سر میں تکلیف ہو تو سارے جسم میں تکلیف ہوتی ہے (مشکوٰۃ: ۴۲۲)۔

لہذا رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات اور آپ کی مبارک زندگی کے ایثار و ہمدردی کے واقعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی انسان کو خون کی ضرورت ہو اور اس کے خون کا گروپ کسی کے خون کے گروپ سے نہ مل رہا ہو صرف ایک ہی آدمی ایسا ہو جس کے خون کا گروپ اس کے خون کے گروپ سے مل رہا ہو اور اس کے خون دینے سے اس کو کسی ضرر کا خطرہ بھی نہ ہو تو میری حقیر رائے کے مطابق اس شخص کے لئے خون کا دینا نہ صرف جائز بلکہ باہمی امداد اور جذبہ ایثار کی بنیاد پر مستحب ہوگا۔

۵- اعضاء انسانی سے انتفاع کی ممانعت کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ دراصل جسم سمیت انسان کا پورا وجود اللہ کی امانت ہے اور اس میں کسی بھی طرح کے تصرف کی اس کو اجازت نہیں ہے، یعنی انسان اپنے جسم میں کسی قسم کے تصرف کرنے میں اللہ کا محتاج ہے، ارشاد باری ہے: ”**ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک عنه مسؤلاً**“، (بنی اسرائیل/۳۶)، دوسری جگہ ارشاد ہے: ”**ألم نجعل له عينين ولساناً وشفتين** “(البلد/۸)، لہذا اگر کوئی انسان اپنے جسم کے کسی حصہ کا عطیہ کرنا چاہے تو وہ اس ارشاد کی روشنی میں درست نہیں ہوگا، پھر یہ کہ ہر عضو کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے مصلحت رکھی ہے، ارشاد باری ہے: ”**الذی خلقک فسواک فعدلک فی ای صورة ماشاء رکبک**“(الانفطار/۷)، دوسرے مقام پر ہے: ”**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**“(التین/۴)، اب ظاہر ہے کہ کسی بھی عضو کا اگر عطیہ کیا جائے تو یہ اس مصلحت کے خلاف ہوگا جو اللہ نے اس کی تخلیق میں رکھی ہے۔

دوسری وجہ انسان کی تکریم و تعظیم ہے، ارشاد باری ہے: ”**ولقد کرمنا بنی آدم**“(بنی اسرائیل)، اور ظاہر ہے کہ اعضاء انسانی کی کتر بیونت یہ تکریم انسانی کے خلاف ہے، حضرات فقہاء نے بھی اسی بنیاد پر اعضاء انسانی سے انتفاع کو ناجائز لکھا ہے: ”**وشعر الانسان والانتفاع به أى لم يجز بيعه والانتفاع به، لأن الآدمى مكرم غير مبتذل فلايجوز أن يكون شئى من أجزائه مهانامبتذلا**“(البحر الرائق: ۸۱/۶)، یعنی انسان کے بال سے انتفاع ناجائز ہے اس کی بیع بھی ناجائز ہے، اس لئے کہ آدمی مکرم ہے نہ کہ قابل صرف کوئی چیز، لہذا اس کے کسی جز سے فائدہ اٹھا کر

اس کو ذلیل کرنا درست نہیں: ''ان شعر الآدمی لاینتفع به اکراماًللآدمی''(المبسوط:۱۵/۱۲۵)، ''قیل الانتفاع بأجزاء الآدمی لم یجز للنجاسة وقیل للکرامۃو ھوالصحیح''(عالمگیری:۵/۳۵۴)،اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حرمت وکرامت میں زندہ ومردہ دونوں مساوی ہیں جیسا کہ فرمان نبوی ﷺ ہے:''کسرعظم المیت ککسرعظم الحی''(مؤطا)۔دوسری جگہ ارشاد ہے:''أذی المؤمن فی مماته کأذاہ فی حیاته''(مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الجنائز)،لہٰذا انسان خواہ زندہ ہو یا مردہ اس کے اعضاء سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہوگا،حضرات فقہاء نے اس کی صراحت فرمائی ہے، ملاحظہ کریں:''والآدمی محترم بعدموته علی ماکان علیه فی حیاته فکمالایجوزالتداوی بشئی من الآدمی الحی اکراماًله فکذ لک لایجوزالتداوی بعظم المیتة''(شرح السیر الکبیر)،اوراس سے بڑی بات یہ ہے کہ مضطرجس کے لئے حضرات فقہاء نے مردار کے کھانے کی اجازت دی ہے اس کیلئے بھی انسان کے اجزاء سے انتفاع کو ناجائز ہی لکھا ہے، چنانچہ کتب فقہ میں یہ جزئیہ بصراحت ملتا ہے کہ اگر کسی مضطر سے کوئی آدمی کہے کہ تو میرا ہاتھ کاٹ کر کھالے تو اس کے لئے کھانا درست نہیں ہوگا،''مضطر لم یجدمیتة فخاف الھلاک فقال له رجل اقطع یدی وکلھا أوقال منی قطعة وکلھا لایسعه أن یفعل ذلک ولایصح الأمربه کمالایسع للمضطر أن یقطع قطعة من نفسه فیأکل'' (عالمگیری:۵/۳۵۵)،اس عبارت میں یہ وضاحت بھی ہے کہ خود مضطر کا اپنے جسم سے فائدہ اٹھانا بھی درست نہیں ہے۔بہر حال ان دلائل سے لگتا ہے کہ اعضاء انسانی سے پیوند کاری درست نہیں ہے۔

لیکن جب ہم دوسرے پہلو سے غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا شریعت مطہرہ میں حرام ومحترم اشیاء سے انتفاع کی اجازت دی گئی ہے یا نہیں تو ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے کہ قرآن کریم جسکی حرمت وشرافت تمام چیزوں سے بڑھی ہوئی ہے ضرورت شدیدہ کے وقت خون اور پیشاب سے بھی اس کے لکھنے کی اجازت دی گئی ہے، ملاحظہ کریں:''والذی رعف فلا یرقأ د مه فأرادأن یکتب بد مه علی جبھته شیئاً من القرآن قال ابوبکریجوز،وقیل لوکتب له بالبول قال لوکان به شفاء لابأس به قیل لوکتب علی جلد میتة قال ان کان منه شفاء جاز''(خلاصۃ الفتاوی ۴/۳۶۱)۔

اسی طرح انسان اپنے کٹے ہوئے اجزاء کی پیوند کاری اپنے جسم میں کرسکتا ہے یا نہیں اگر چہ اس سلسلے میں اختلاف ہے،حضرات طرفینؒ عدم جواز کے قائل ہیں لیکن حضرت امام ابویوسفؒ اس کو جائز سمجھتے ہیں اسی پر فتویٰ بھی ہے،اورحضرات علماء نے بھی اس کو جائز لکھا ہے۔

''فاذاانفصل استحق الدفن ککله والاعادۃ صرف له عن جهة الاستحقاق ....ولااهانة

فی استعمال جزء منه"(بدائع:۵/۱۳۲)،اور یہ بات تو بہت مشہور ہے کہ اگر حاملہ عورت کا انتقال ہوجائے اوراس کے بطن میں بچہ زندہ ہوتو اس کے پیٹ کو چیر کر بچہ نکالا جائے گا،تقریباً تمام کتب فقہ میں یہ جزئیہ ملتا ہے،دیکھئے:"**لوأن حاملاًماتت فی بطنها ولد یضطرب فان کان غالب الظن أنه ولدحی وهوفی مدة یعیش غالباًفانه یشق بطنها لأن فیه احیاء الآدمی فترک تعظیم الآدمی اهون من مباشرة سبب الموت**"(تحفۃ الفقہاء:۳/۳۴۳)(اگر کوئی حاملہ مرجائے اوراس کے پیٹ میں بچہ ہو جو حرکت کرتا ہواگر غالب گمان ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے اوراس مدت کا ہے جس میں بچہ عام طور پر زندہ رہ جاتا ہےتو اس حاملہ کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا،اس لئے کہ اس میں ایک انسان کو زندگی بخشنا ہےاور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے کہ آدمی کی عظمت کے تقاضا کو چھوڑ دیا جائے)۔

مذکورہ صورت میں حضرات فقہاء آپریشن کی اجازت اس طرح استدلال کرتے ہوئے دی ہے کہ یہاں تعظیم میت کوایک زندہ انسان کی بقاء کے لئے ترک کردیا جائے گا،"**لأن ذلک تسبب فی احیاء نفس محترمة بترک تعظیم المیت**" (البحرائق:۸/۲۰۵)،اسی اصول سے یہ مسئلہ بھی تعلق رکھتا ہے کہ مضطر کسی مردہ انسان کو اپنی جان بچانے کیلئے کھا سکتا ہے یانہیں۔

مالکیہ اورحنابلہ کی رائے یہ ہے کہ نہیں کھا سکتا،جبکہ شوافع اور بعض احناف کی رائے ہے کہ کھا سکتا ہے،اس لئے کہ زندہ کی حرمت مردہ سے بڑھ کر ہے،دیکھئے:"**وقال الشافعی وبعض الحنفیة یباح وهوأولیٰ لأن حرمة الحی أعظم**" (المغنی:۹/۳۳۵)،فقہاء حنابلہ میں ابوالخطاب کی رائے بھی یہی ہے،:"**واختار ابوالخطاب أن له أکله**"(المغنی:۹/۳۳۵)۔

اوراس سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا موتی نگل جائے اور پھراس کی موت واقع ہوجائے تو بعض صورتوں میں فقہاء نے اس کے پیٹ کو چیرنے کی اجازت دی ہے:"**رجل ابتلع درة لرجل فمات المبتلع ولم یدع مالا قال لایشق وعلیه القیمة وذکر فی اول فصل الثانی من کتاب الحیطان أنه یشق بطن المبتلع**"(فتاوی تاتارخانیہ۱۸/۲۲۱)۔

دونوں طرح کی دلیلوں کا جائزہ لینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جن حضرات نے اعضاء انسانی سے پیوندکاری کوناجائز قرار دیا ہےان کے پیش نظر ایک تو وہ حدیث ہے(**کسر عظم المیت ککسر الحی**)جس کا جواب یہ ہے کہ حدیث مذکور عام حالات پر محمول ہے،چنانچہ ضرورت کے وقت حضرات فقہاء نے جنین کی جان بچانے کیلئے مردہ ماں کا پیٹ

چیرنے کی اجازت دی ہے، اسی طرح موتی نگل کر مرجانے کی صورت میں بھی پیٹ چاک کرنے کی اجازت دی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ محدثین نے اس حدیث کوضعیف قرار دیا ہے، چونکہ اس کی سند میں ایک راوی سعد بن سعید انصاری ہیں جن کے بارے میں ابن حزم لکھتے ہیں: "**ھو ضعیف جداً لایحتج به لاخلاف فی ذلک**" (المحلی :۱۱/۴۰، بحوالہ جدید فقہی مسائل: ۵/۸۱،۸۲)۔

لہٰذا ان تمام تر مباحث آیات واحادیث اور فقہی اصول وجزئیات کی روشنی میں احقر کے نزدیک درج ذیل شرائط کے ساتھ جگر کا عطیہ کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

(۱) عضو کے لینے سے اس شخص کی طبعی زندگی کو کوئی نقصان نہ پہونچے جو اسے دے رہا ہے، کیونکہ شریعت کا اصول ہے کہ کسی نقصان کے ازالہ کیلئے اسی جیسے یا اس سے بڑے نقصان کو گوارا نہیں کیا جائے گا، نیز اس لئے بھی کہ ایسی صورت میں عضو کی پیشکش اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مرادف ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے، (۲) عضو دینے کا عمل دینے والے کی طرف سے رضا کارانہ طور پر ہو اور بغیر کسی دباؤ کے ہو، (۳) ضرورت مند مریض کے علاج کے لئے عضو کی پیوندکاری ہی طبی نقطہ نظر سے واحد ذریعہ رہ گیا ہو، دوسری کوئی صورت باوجود کوشش کے ممکن نہ ہو۔ بہر حال ان تین شرطوں کے ساتھ احقر کے نزدیک پیوندکاری کی گنجائش ہے۔

۴- حامداً ومصلیاً ومسلماً: اس سے ماقبل کے جواب میں تفصیل کے ساتھ یہ بات آچکی ہے کہ اصلاً انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، بلکہ سارا جسم اللہ کی امانت ہے جس میں تصرف کا حق انسان کو حاصل نہیں ہے، لیکن کسی حد تک بوقت ضرورت وہ اس میں تصرف کرسکتا ہے، مثلاً: اگر خود کسی انسان کو اپنے جسم کے کسی اعضاء کے استعمال کی سخت ضرورت ہو تو وہ ایسا کرسکتا ہے: "**ولا اھانة فی استعمال جزء منه**" (بدائع: ۵/۱۳۲)، اسی طرح اگر ایسے اعضاء کے عطیہ کی ضرورت پڑے جس کے عطیہ کرنے سے عطیہ کرنے والے کو ہلاکت یا ضرر شدید کا خطرہ نہ ہو تو وہ اس عضو کا عطیہ کرسکتا ہے، لہٰذا اس تفصیل کے بعد عرض ہے کہ اگر کوئی زندہ شخص اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرے اور طبیب ماہر کی رائے میں اس سے اسے کسی طرح کی ہلاکت یا ضرر شدید کا خطرہ نہ ہو تو احقر کی رائے یہ ہے کہ اس کے لئے ایسا کرنا درست ہوگا، جہاں تک تعظیم انسانی کی بات ہے تو یہ پہلے مفصل ذکر ہو چکا ہے کہ بعض حالات میں اس کے ترک کرنے کی گنجائش ہے۔

ب- کسی شخص سے اس کی موت کے بعد قرنیہ حاصل کرنا اصلاً تو درست نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ حدیث پاک سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے: "**کسر عظم المیت ککسر الحی**" (الحدیث) کہ مردہ کی ہڈی

کوتوڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حدیث عام احوال پر مبنی ہے، بوقت ضرورت میت کی تعظیم کوترک کیا جاسکتا ہے، چنانچہ مردہ حاملہ عورت کے پیٹ میں اگرزندہ بچہ ہوتواس زندہ بچہ کو بچانے کیلئے ماں کے آپریشن کی شرعاً اجازت ہے، اسی طرح اگرکوئی آدمی کسی کا موتی نگل کرمرجائے تو بعض صورتوں میں اس کے پیٹ کو چیر کربھی موتی نکالنے کی گنجائش ہے(تحفۃ الفقہاء:۳/۳۴۳، تاتارخانیہ:۲۲۱/۱۸)، اس کے علاوہ کتب فتاوی میں یہ بات ملتی ہے کہ بعض علماء نے ڈاکٹری تعلیم کیلئے مردہ لاشوں کواستعمال کرنے کی اجازت دی ہے(دیکھئے: علاج ومعالجہ کے شرعی احکام)، اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹری تعلیم جومقصودتک پہنچنے کاایک ذریعہ ہے جب اس کیلئے مردہ کی تعظیم کوترک کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے تو پھر مقصود کے لئے گنجائش کیوں نہیں ہوسکتی، لہٰذاان مباحث کی روشنی میں اورفقہ کے ان اصول "الضرورات تبیح المحظورات"، "الضرر یزال"(الاشباہ والنظائر) کے پیش نظر احقر کی نگاہ میں مردہ کی آنکھ سے بھی بضرورت شدیدہ قرنیہ حاصل کرنے گنجائش ہے۔

ج-یہ بات پہلے سوالوں کے جوابات میں آچکی ہے کہ جب کوئی چیز جائز ہوتی ہے تواپنے تمام لوازمات کے ساتھ جائز ہوتی ہے، لہٰذا جب بوقت ضرورت آنکھ کے عطیہ کی اجازت ہے تومیری حقیر رائے کے مطابق رضا کارانہ طور پرآئی بینک کوعطیہ کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہئیے، البتہ احقر کا اپنا تجربہ یہ ہے کہ آنکھوں کی بیک وقت اتنی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے آنکھوں کے آئی بینک کوعطیہ کرنے کے سلسلے میں احتیاط بہرحال ضروری ہے۔

۵،۶- حامداًومصلیاً ومسلماً: مردہ شخص کے جسم سے کسی بھی عضو کے لینے کے لئے اولاً توخوداس شخص کی اجازت (وصیت) ضروری ہوگی، اگرچہ جسم کے اللہ کی امانت ہونے کی بنیاد پر وصیت کے صحت میں اختلاف ہے، لیکن بہرحال وہ ایک حدتک اپنے جسم پر تصرف کا حقدار ہے، ثانیاً اس کے ورثہ کی اجازت بھی لازمی ہوگی اس لئے کہ اس کی موت کے بعد اس کے تمام ترملکیت یہاں تک کہ حدودوقصاص کا اختیار بھی ورثہ کو ہوتا ہے، لہٰذا اس تصرف کے لئے بھی ورثہ کی اجازت ضروری ہے، مولانا خالدسیف اللہ رحمانی نے بھی کچھ ایسی ہی وضاحت فرمائی ہے(دیکھئے جدیدفقہی مسائل:۸۹/۵)۔

۷- حامداًومصلیاًومسلماً: حضرات فقہاء احنافؒ نے دودھ کی بیع وشراء سے منع فرمایا ہے، اوردلیل یہ پیش کی ہے کہ دودھ بھی اعضاء انسانی اوراس کے اجزاء میں سے ایک جز ہے، اورانسانی اجزاء کی بیع وشراء اس کی ذلت واہانت کے مرادف ہے، لہٰذااس کی اجازت شرعاً نہیں دی جاسکتی، البتہ حضرات شوافع کے نزدیک اس کی بیع وشراء درست ہے ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ دودھ ایک پینے والی پاک چیز ہے لہٰذااس کی خریدوفروخت درست ہے، "ولابیع لبن امرأۃ فی قدح وقال

الشافعیؒ: یجوز بیعه لأنه مشروب طاهر ولنا أنه جزء الآدمی وهوبجمیع اجزائه مکرم مصون عن الابتذال بالبیع"(ھدایہ ۳/۵۵)۔

مولانا خالدسیف اللہ رحمانی صاحب رقمطراز ہیں: احناف کے یہاں دودھ کے اجزاء انسانی میں سے ہونے کی وجہ سے اس کی بیع جائز نہ ہوگی، البتہ امام شافعیؒ کے یہاں دودھ کی بیع درست ہے اور یہی رائے امام احمدؒ کی ہے، "**ومن ذلک قول الشافعی وأحمدبجواز بیع لبن المرأة مع قول ابی حنیفة ومالک لایجوزبیعه**"(المیزان الکبریٰ ۲/۷۴، جدید فقہی مسائل ۱/۳۸۰)۔

بہرحال حضرات شوافع وحنابلہ نے دودھ کی بیع کو اجارہ پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اجرت لیکر دودھ پلانا احادیث سے ثابت ہے، البتہ فقہاء احناف نے اسے یہ کہتے ہوئے رد کیا ہے کہ دودھ پلانے کی صورت میں جو اجرت دی جاتی ہے وہ دراصل عورت کے عمل کی اجرت ہے نہ کے دودھ کی اسلئے اجارہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کی بیع کو درست قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا، مولانا خالدسیف اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے کہ احناف کا مذہب فطرت سے ہم آہنگ عقل کے تقاضوں کے مطابق اورنصوص کے موافق ہے(جدید فقہی مسائل:۱/۳۸۰)، بہرحال مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں احقر کے نزدیک دودھ کی بیع بہرصورت درست نہیں، البتہ دودھ کا خریدنا بوقت ضرورت جائز ہوگا۔

☆☆☆

اجزاءانسانی کا عطیہ

مولانا اشرف عباس قاسمی☆

اجزاء یا اعضاء انسانی میں عموم ہے، خواہ عضو کامل ہو جیسے گردہ اور جگر وغیرہ، یا عضو کا جزء ہو، جیسے آنکھ کا قرنیہ یا وہ نسیج یا خلیے ہوں، جیسا کہ خون اور ہڈی کے گودے کی صورت میں ہوتا ہے، غرضیکہ یہاں عضو سے مراد انسان کے نسیجوں، خلیوں اور خون وغیرہ میں سے کوئی بھی جزء ہے، خواہ وہ جز منفصل ہو یا جسم انسانی سے الگ ہو، اس لئے بعض عرب علماء نے اس پورے عمل کو اس طرح تعبیر کیا ہے۔

"يقصد به نقل عضو سليم أو مجموعة من الأنسجة من متبرع إلى مستقبل ليقوم مقام العضو أو النسيج التالف" (الموقف الفقهي والأخلاقي من قضية زرع الأعضاء/ص ۸۹، البنوك الطبية/ ۶۴)۔

(جس کا مقصد کسی صحیح سالم عضو یا نسیجوں کو متبرع (عطیہ کنندہ) سے مستقبل (عطیہ قبول کرنے والا، متاثر شخص) کی طرف منتقل کرنا ہوتا ہے تا کہ یہ نا کارہ عضو یا نسیج کی جگہ لے سکے)۔

اسلامی تصور:

آیات کی روشنی میں اسلام کا بنیادی تصور واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کا جسم انسان کی ملک نہیں ہے کہ وہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کرے، اسی تصور کی وجہ سے اپنی جان لینے اور خودکشی کرنے کو اکبر الکبائر قرار دیا گیا ہے، بلکہ جسم انسانی خالص ملک خداوندی ہے، انسان اپنی مرضی سے اس کے کسی جز کو نہ تو بیچ سکتا ہے اور نہ کسی کو ہبہ کر سکتا ہے، نہ اس میں قطع و برید کر سکتا ہے اور نہ بے جا استعمال کر سکتا ہے، خالق حقیقی کی طرف سے جہاں اور جس قدر استعمال کی اجازت دی گئی ہے، اس سے زیادہ استعمال اس کی طرف سے تعدی خیال کی جائے گی اور اس کا اسے جوابدہ ہونا پڑے گا۔

قدیم کتب فقہ کے مطالعہ سے واضح ہو چکا ہے کہ چاروں مذاہب فقہیہ متبوعہ میں کسی میں اجزاء انسانی کے ہبہ یا نقل کی اجازت نہیں دی گئی ہے، بلکہ چاروں مذاہب نقل اعضاء کی تحریم کے قائل ہیں۔

☆ دارالعلوم دیوبند، سہارنپور۔

جواز وعدم جواز کے سلسلے میں علماء کے اقوال:

علماء ہندو پاک کے علاوہ ۲۴ معاصر عرب علماء کے اسامی ذکر کئے گئے ہیں جو اجزاء انسانی کے عطیہ کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان حضرات نے عموما جسم انسانی کے مملوک خداوندی ہونے، آیت: "**ولا تلقوا بأيدكم إلى التهلكة، ولقد كرمنا بني آدم، لقد خلقنا الانسان في أحسن تقويم**"، اعضاء میں قطع و برید اور خودکشی کی حرمت پر دلالت کرنے والی روایات اور انسان کے مملوک ومتقوم نہ ہونے کی فقہی عبارات سے استدلال کیا ہے، قائلین جواز نے ان دلائل کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن ان جوابات کا رد اصول فقہ ومقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ مشکل نہیں ہے، قائلین جواز نے دلیل کے طور پر آیت "**إن الله اشترى من المومنين انفسهم**"، بنی اسرائیل کے ایک شخص کی وصیت والی حدیث، دیت کی نصوص، اور ہدایہ کی ایک عبارت اور عورت کے دودھ سے علاج کے جواز پر قیاس کو پیش کیا ہے، لیکن یہ سارے دلائل اپنے مدعی پر غیر واضح اور احتمالات بعیدہ کے درجے میں ہیں، چنانچہ ہر دلیل کا رد واضح طور پر تحریر کر دیا گیا ہے، اور دکتور عبد السلام اسکری کا یہ قول بھی "**انه على حين يقدم القائلون بتحريم نقل الاعضاء الادمية الادلة الشرعية على التحريم فان القائلين بالاجازة لايقدمون دليلا فقهيا واحدا على ذلك**"۔

انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ نے چند شرائط کے ساتھ اجازت دیتے ہوئے کہا ہے کہ کسی انسان کے جسم کا کوئی عضو اسی انسان کے جسم میں دوسری جگہ لگانا اس اطمینان کے بعد جائز ہوگا کہ پیوندکاری سے متوقع فائدہ اس پر مرتب ہونے والے نقصان سے زائد ہو، مکہ مکرمہ فقہ اکیڈمی کے فیصلے میں کہا گیا ہے کہ کسی زندہ انسان کے جسم سے کوئی عضو لینا اور اسے اس دوسرے انسان کے جسم میں لگا دینا جو اپنی زندگی بچانے کے لئے یا اپنے بنیادی اعضا کے عمل میں سے کسی عمل کو بحال کرنے کے لئے اس کا ضرورتمند ہو ایک جائز عمل ہے۔

شرائط جواز:

جن فتاوی یا اکیڈمی کی تجاویز میں اعضاء کے نقل یا عطیہ کی اجازت دی گئی ہے، ساتھ ساتھ چند شرائط کا بھی ذکر کیا گیا ہے، بعض کا تعلق زندہ سے اور بعض کا مردہ سے ہے، اور بعض شرائط دونوں کے درمیان مشترک ہیں، مجموعی اعتبار سے وہ شرائط درج ذیل ہیں:

۱- اپنے جسم کے کسی جز کا ہبہ کرنے والا شخص متبرع ہو یعنی یہ عطیہ بلاعوض ہو، کسی مادی منفعت یا نفع کے بدلے میں نہ ہو۔

۲- یہ عطیہ متبرع کے اختیار اور کامل رضامندی سے ہو، اس پر کوئی جبر واکراہ نہ ہو۔

۳-اس بات کا ظن غالب ہو کہ عطیہ دینے کے بعد عطیہ دہندہ ضرر عظیم یا ہلاکت کا شکار نہیں ہوگا، لہذا ایسے کسی بھی عضو کا عطیہ حرام قرار پائے گا جس پر زندگی موقوف ہو یا جس کے نہ ہونے سے زندگی دوبھر ہوجائے۔

۴-میت کے جسم کا کوئی بھی حصہ منتقل کرنے کی صورت میں ضروری ہے کہ اس بات کا تیقن ہوجائے کہ یہ شخص مر چکا ہے اور اس کے اندر زندگی کا کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

۵-عطیہ دہندہ کی منظوری اور اجازت یا اس کے ولی کی اجازت ہو۔

۶-جس کو بطور عطیہ دیا جارہا ہے وہ اس جزء انسانی کا محتاج اور اضطرار کی حد تک پہنچ چکا ہو، اس طور پر کہ اس کی زندگی یا اس کے جسمانی نظام کی درستگی اسی عضو پر موقوف ہو۔

۷-اس عطیہ کی وجہ سے عطیہ دہندہ کے جسم میں کوئی بڑا عیب اور ظاہری بگاڑ پیدا نہ ہو۔

۸-عطیہ دہندہ کامل الأہلیت ہو۔

۹-اس بات کا ظن غالب ہو کہ یہ آپریشن کامیاب رہے گا اور مریض اس کے بعد ٹھیک ہوجائے گا۔

۱۰-جس شخص کو بہ طور عطیہ دیا جارہا ہے وہ مباح الدم نہ ہو، مثلاً مرتد یا زانی محصن یا ناحق کسی اور کو قتل کرنے والا نہ ہو۔

۱۱-اس مریض مضطر کے علاج کے لئے اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت نہ ہو۔

۱۲-لازمی طور سے یہ احتیاط برتی جائے کہ اس سے عطیہ دہندہ کی موت نہیں ہوگی اور نہ ہی اسے انسانی اعضاء کی اسمگلنگ کا ذریعہ بنایا جائے گا۔

بلڈ بینک کے قیام کا پس منظر:

خون منتقل کرنے میں مختلف تجربات اور نت نئے اکتشافات کے پس پردہ درحقیقت وہ مختلف جنگیں ہیں جو پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے دوران ہوئیں، چنانچہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کے دوران بڑی وافر مقدار میں متاثر فوجیوں کو خون چڑھایا گیا، اسپین کی خانہ جنگی (۱۹۳۷ء-۱۹۳۹ء) نے بھی بڑے پیمانے پر خون کے جمع وحفاظت کے لئے ڈاکٹروں کو متوجہ کیا، اس کے علاوہ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) کے دوران خون کی طلب اور زیادہ بڑھ گئی اور ایک اندازے کے مطابق صرف ایک شہر لندن میں دوسو ساٹھ ہزار لیٹر سے زیادہ خون جمع کرکے مریضوں کو دیا گیا۔

دنیا کا پہلا بلڈ بینک:

البتہ یقینی طور پر دنیا میں قائم ہونے والے پہلے بلڈ بینک کی تعیین مشکل ہے، اس سلسلے میں تین رائے ملتی ہیں:

پہلی رائے: دنیا کا پہلا بلڈ بینک ۱۹۳۱ء میں روس کے شہر ماسکو میں قائم ہوا۔

دوسری رائے: ۱۹۳٦ء میں دنیا کے پہلے بلڈ بینک کا افتتاح شکاگو کے ایک اسپتال کوک کاؤنٹی میں ہوا۔

تیسری رائے: دوسری عالمی جنگ کے اختتام یعنی ۱۹۴۵ء کے بعد ڈاکٹر اس جانب متوجہ ہوئے۔

اس کے بعد میڈیکل سائنس کی ترقی کے ساتھ یہ بلڈ بینک بھی ترقی کرتیر ہے۔

بلڈ بینک کے مضرات:

اس امر کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ بلڈ بینک کی تمام ترافادیت اور مریضوں کے علاج میں اس کے غیر معمولی نافع ہونے کے باوجود اس میں جمع شدہ خون کے استعمال میں بہت سارے نقصانات کا بھی اندیشہ رہتا ہے، اور بسا اوقات اس کا خون مریض کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ خون کے مفید ثابت ہونے کے لئے صرف بلڈ گروپ HR کی تعیین اور مریض کے خون سے اس کی موافقت ہی کافی نہیں ہے، اور نہ ہی یہ کافی ہے کہ وہ مشینیں گرم ماحول اور جراثیم زدہ آلودگی سے دور ہوں، بلکہ ان کے علاوہ بھی کئی اسباب ہیں جن کے سبب خطرات باقی رہ جاتے ہیں۔

حکم شرعی:

بہت سے اہل علم بلڈ بینک کے قیام کے جواز کے قائل ہیں، چنانچہ سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ادارہ المباحث الفقہیہ کے ایک استفتا کے جواب میں فرماتے ہیں: ”مریض کے خون کا نمبر اور جو خون چڑھایا جائے اس کا نمبر یکساں ہونا ضروری ہوتا ہے، اس لئے ایک ایک نمبر کی کافی مقدار کا محفوظ رہنا ضروری ہوتا ہے، ان وجوہات کی بنا پر بینک کا قیام درست معلوم ہوتا ہے،“**لأن الشئ إذا ثبت ثبت بجميع لوازمه**“، لہٰذا اس فراہمی کے محفوظ رکھنے کے جو مناسب طریقے ہوں گے اور ان میں جو اخراجات درکار ہوں گے ان سب کو بھی حدود شرع میں برداشت کرنا ہوگا۔

سعودی عرب کے ہیئۃ کبار العلماء کی کونسل نے بھی بلڈ بینک کے قیام کے جواز کی تجویز منظور کی ہے جو اس طرح ہے:

”رضا کارانہ طور پر لوگوں کی طرف سے دیئے گئے خون کو قبول کرنے اور ان کی حفاظت کے لئے اسلامی بینک قائم کرنا جائز ہے تاکہ ضرورت مند مسلمان کی حاجت روائی ہو سکے، شرط یہ ہے کہ وہ بینک مریضوں یا ان کے اولیاء سے امداد کے لئے دیئے گئے ہوں، اس خون کا معاوضہ نہ وصول کرے اور نہ ہی کمائی اور آمدنی کا ذریعہ بنائے، بینک کا قیام اس لئے جائز ہے کہ اس سے مسلمانوں کا عام مفاد وابستہ ہے“۔

جواز کے دلائل:

جن حضرات نے بلڈ بینک کے قیام کو جائز قرار دیا ہے، انہوں نے عمومی اعتبار سے درج ذیل فقہی اصول وضوابط سے استدلال کیا ہے:

۱-عصر حاضر میں نقل دم کی زبردست حاجت کی تکمیل اس کے ذریعہ ہوتی ہے، اس طرح اس سے عامۃ المسلمین کی مصلحت عامہ وابستہ ہے، اس لئے اس کے قیام کی اجازت ہے۔

۲-شریعت مطہرہ میں درء مفاسد اور جلب مصالح کی خاص اہمیت ہے اور اس بینک سے بھی یہی غرض ہوتی ہے۔

۳-فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: "الضرورات تبیح المحظورات"۔

۴-ایک قاعدہ یہ بھی ہے: "مالایتم الواجب إلا به فهو واجب"۔

۵-جان اور نفس کی حفاظت مقاصد شریعت میں سے ہے اور اس طرح کے بینکوں کے قیام میں ان بہت سی جانوں کی حفاظت ہے جنہیں خون کی ضرورت ہے۔

خون کے عطیہ پر انعام واکرام:

رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دینے والوں کو انعام واکرام کے نام پر جو کچھ دیا جاتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: جانبین سے اس کی شرط ہوگی، یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ درحقیقت قیمت وصول کرنا ہے، اور خون کی قیمت جائز نہیں۔

دوسری صورت: یہ انعامات اور تحائف محض اکرام اور تشجیع کے لئے ہوں، پہلے سے کوئی شرط نہ ہو، تو اس میں معاصر علماء میں اختلاف ہے۔

پہلی رائے یہ ہے کہ جائز نہیں ہے، سعودی عرب کی افتاء کمیٹی کا یہی فتوی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ جائز ہے، اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اس لئے کہ انعامات تبرعات کی قبیل سے ہیں، بیوع اور معاوضات کی قبیل سے نہیں ہیں اور نا جائز خون کا معاوضہ اور بیع ہے اور یہ بیع اس لئے نہیں ہے کہ بیع نام ہے "مبادلة المال بالمال بالتراضی" کا اور خون مال ہی نہیں ہے، نیز عرفا بھی اس کو بیع نہیں خیال کیا جاتا ہے، اس لئے کہ کبھی انعام ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ہے، کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ، کوئی کم خون دے یا زیادہ اور کسی بھی گروپ کا خون دے سب کو یکساں انعام اور تحفہ دیا جاتا ہے، المجمع الفقهی مکہ مکرمہ کا یہی فیصلہ ہے۔

دودھ بینک (Milk Bank) کا قیام، نقصانات، حکم:

مغربی ممالک کے باشندگان نے قانون فطرت سے بغاوت کر کے الگ نظام زندگی اپنایا اور خواتین کو ان کی فطرت کے خلاف مشکل راہ پر ڈال دیا، اور اپنے زعم کے مطابق جب انہیں مساوات اور آزادی کے نام پر زینت خانہ سے زینت محفل بنا کر گھروں سے باہر کر دیا تو بچوں کی پرورش اور ان کی رضاعت کا سنگین مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا، اب عورت کے پاس اتنی فرصت نہیں رہ گئی کہ وہ اپنے بچے کو اپنا دودھ پلا سکے، اس لئے متبادل کی تلاش شروع ہوئی اور متبادل کے طور پر سب سے پہلے جانوروں کے دودھ سے تیار کردہ مادہ سے پرورش کی گئی اور اس طرح کا دودھ سب سے پہلے برطانیہ میں ۱۹۴۳ء میں اور اس کے بعد مختلف ملکوں میں بنایا گیا، لیکن جب مختلف طبی تحقیقات کے نتیجے میں بچوں کے لئے اس کے مضر اثرات کا علم ہوا اور ماؤں کے دودھ کی اہمیت وافادیت سامنے آنے لگی اور دنیا کے ملکوں کی وزارت صحت نے لوگوں کو ماں ہی کا دودھ استعمال کرنے کی صلاح دی تو مغرب کو انسانی دودھ کا مرکز قائم کرنے کا خیال آیا، اور اس طرح ملک بینک وجود میں آنے شروع ہو گئے۔

جمہور علماء اور فقہاء اس طرح کے بینک کے قیام کو ناجائز مانتے ہیں، انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ نے بھی اپنے دوسرے سمینار میں عدم جواز کی تجویز منظور کر رکھی ہے اور کہا ہے کہ عالم اسلام میں ماؤں کے دودھ بینک قائم کرنا ممنوع ہے۔

عدم جواز کے دلائل:

دودھ بینک کے قیام کے عدم جواز پر متعدد دلائل دیئے گئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱- دودھ بینک سے حرمت عام ہو جاتی ہے، جس سے نسب میں اختلاط اور شبہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے محظور شرعی لازم آئے گا۔

۲- قاعدہ ہے: ”الضرر لایزال بالضرر“۔

۳- دودھ بینک کے منفی پہلو اور مضرات اس کے مثبت پہلو اور فوائد سے بڑھ کر ہیں، اور اس کی ضرورت شدید بھی نہیں ہے۔

دودھ بینک سے حرمت رضاعت کا ثبوت:

دلائل سے واضح ہے کہ ثبوت حرمت کے لئے چھاتی سے ہی پلانا ضروری نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ یہی جمہور کا قول ہے اور احادیث وآثار سے مؤید ہے، اس لئے ہمیں دودھ بینک کے مسئلے پر اسی قول کی روشنی میں غور کرنا چاہئے۔

بینک سے جو دودھ حاصل کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ بچے کی نشو ونما اسی سے ہوتی ہے، انبات لحم اور انشاز عظم اسی

سے ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ صرف فرق اتنا ہے کہ وہ دودھ ڈبے یا بوتل کے ذریعہ بچے کی حلق تک پہنچایا جاتا ہے، لیکن اس سے ثبوت حرمت میں کوئی خلل نہیں آتا۔

لہذا بینک کے دودھ سے بھی حرمت ثابت ہوجائے گی، اس لئے بینک والے کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ہر عورت کے دودھ کی تفصیل رکھے، اور خواہش مند کو دودھ دیتے وقت اس کی وضاحت کردے، اور اگر وہ اس طرح نہیں کرسکتا تو بینک ہی قائم نہ کرے تاکہ لوگ نئے نئے مسائل کا شکار نہ ہوں، انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ نے بھی ثبوت حرمت کی تجویز منظور کررکھی ہے۔

منی بینک، قیام، نقصانات، حکم:

مادہ منویہ کو محفوظ رکھنے کا تصور ۱۹۵۰ء میں سامنے آیا جب سائنسدانوں نے جانداروں کے مادہ منویہ کو جمع کر کے بہ وقت ضرورت مصنوعی حمل کاری میں اس کے استعمال کی بابت غور وخوض شروع کیا، دراصل پیداواری صلاحیت کی کمی (Infertility) اور بانجھ پن (Sterility) دوایسی طبی پریشانیاں ہیں جن کا دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے ۱۰ سے ۱۵ فیصد افراد کو سامنا ہے، بلکہ اس تعداد میں روز بہ روز خطرناک حد تک بعض ملکوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، البتہ دنیا کا پہلا مادہ منویہ بینک کب شروع ہوا؟ اس میں دو آراء ہیں:

۱-ان بینکوں کا پھیلاؤ ستر کی دہائی میں ہوا۔

۲-۱۹۸۰ء میں پہلا منی بینک قائم کیا گیا۔

بینک میں جمع شدہ منی کے استعمال سے کئی طرح کے خطرات کا اندیشہ رہتا ہے، چنانچہ طبی ومعاشرتی اعتبار سے اس کے کئی نقصانات ذکر کئے گئے ہیں۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

مولانا محمد رمضان علی فرقانی ☆

دنیا میں انسانی زندگی کی بہت بڑی اہمیت ہے کبھی ایک انسان پوری دنیا کے لئے روح رواں اور مصلح بن جاتا ہے، اس لئے زندگی کی حفاظت کرنا انسان کا اولین فریضہ ہے۔تحفظ زندگی کا اہم ذریعہ علاج بھی ہے،خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا علاج کرایا اور علاج کرانے کی ترغیب بھی دی۔دور نبوی ﷺ اور اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک انسانی اجزاء واعضاء کے ذریعہ علاج کا تذکرہ نہیں ملتا ہے لیکن دور حاضر میں میڈیکل سائنس نے دنیا کو متحیر کر دیا ہے اور ایک انقلاب برپا کر دیا ہے، ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں چڑھایا جا سکتا ہے، ایک شخص کا جگر دوسرے کے کام آسکتا ہے،ان انکشافات نے علماء کے سامنے ایسے سوالات پیدا کر دیئے ہیں جن سے آنکھیں موند لینا درست نہیں ہے، کیونکہ انسان کی زندگی کا فقہ سے گہرا رشتہ ہے،اس لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے درج ذیل سوالوں کا جواب تعلیمات اسلامی کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ لوگ شریعت کے دامن گیر رہیں۔

۱-کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو اس کی ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے؟

یہ مسئلہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار کے زیر بحث آچکا ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے بیمار انسان کے جسم میں داخل کر سکتے ہیں یا نہیں؟اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا پورا جسم قابل احترام ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ولقد کرمنا بنی آدم** یعنی ہم نے آدم کی اولاد کو معظم بنایا۔

فقہاء کرام نے فرمایا:"**الانتفاع بأجزاء الأدمی لم یجز قیل للنجاسة وقیل للکرامة هو الصحیح کذا فی جواهر الاخلاطی**"(ہندیہ،الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات ۵/ ۳۵۴)۔

(آدمی کے اجزاء سے انتفاع جائز نہیں ہے، کہا گیا ہے کہ نجاست کی وجہ سے اور کہا گیا ہے کہ عظمت کی وجہ سے اور

☆ استاذ شعبۂ عربی دار العلوم مجیبیہ خانقاہ پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)۔

یہی صحیح ہے)۔

"واذا كان برجل جراحة يكره المعالجة بعظم الخنزير والإنسان لانه يحرم الانتفاع به كذا في الكبرى" (ہندیہ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات ۵/ ۳۵۴)۔

(جب کوئی زخمی شخص ہو تو اس کے لئے انسان اور خنزیر کی ہڈی سے علاج کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس سے انتفاع حرام ہے)۔

مذکورہ عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزوں اور انسان کے اعضاء واجزاء سے علاج کرنا حرام ہے، لیکن فقہاء کرام کی بعض تصریحات وہ بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شدید ضرورت کے وقت حرام اشیاء اور انسانی اجزاء واعضاء سے علاج کرنا درست ہے، مثلاً انسان کے لئے مردہ کھانا، خون پینا، عورت کے دودھ کا استعمال کرنا حرام ہے لیکن ضرورت کے وقت بطور دواء مردہ کھانے کی، خون پینے کی اور عورت کے دودھ کو استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

۲-بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟

۳-مسلمانوں کے لئے رضا کارانہ بینک قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بلڈ بینک دو اہم مقاصد کے لئے قائم کئے جاتے ہیں: ایک تو یہ کہ کسی غیر معمولی حادثہ کے وقت سارے زخمیوں کو خون مہیا ہو جائے اور سب کی جان بچ جائے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ مریض کو مطلوبہ گروپ کا خون مل جائے۔ ایسے بینک میں اگر لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ کریں تو یہ جائز ہے کیونکہ "اذا ثبت الشی ثبت بلوازمه" یعنی جب کوئی چیز ثابت ہوتی تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اس لئے جب متعین شخص کو خون کا عطیہ کرنا درست ہے تو اس کی بینکنگ بھی صحیح ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر بآسانی خون فراہم ہو سکے اور ضرورتمند کی جان بچ سکے۔ اگر مستقبل میں کوئی حادثہ پیش آنے والا ہو یا اس کا امکان ہو تو اس کی بھرپائی کے لئے سامان مہیا کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے قحط سالی آنے سے پہلے زیادہ مقدار میں اناج پیدا کرنے کا حکم فرمایا تھا تاکہ خشک سالی میں لوگوں کو کھانے کی پریشانی نہ ہو۔ ایسے بینک اگر مسلمان قائم کریں تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ وہ شرعی امور کا زیادہ خیال رکھیں گے اور خون کے خرید وفروخت سے بھی دور رہیں گے۔

۴- کسی کو اپنا خون دینا جائز ہے لیکن جب حالت یہ پیدا ہو جائے کہ مریض کو جس گروپ کا خون مطلوب ہے اس کا حامل کوئی ایک شخص ہے، اور وہ ایسا شخص ہے کہ خون دینے میں اسے کوئی جسمانی نقصان بھی نہیں ہے، تو اس کا مریض کی جان

بچانے کے لئے خون دینا مستحب ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر کسی شخص میں انسان کی جان بچانے کی طاقت ہے، تو ضرور اس کو جان بچانی چاہئے۔ حدیث میں ہے:" **من استطاع ان ینفع اخاه فلیفعل**" (یعنی جو شخص اپنے بھائی کو نفع پہونچانے کی استطاعت رکھتا ہے تو اس کو ایسا کرنا چاہئے)۔

فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی فرض نماز ادا کر رہا ہو اور کسی مجبور شخص کو کوئی ظالم پکڑ لے، یا وہ پانی میں گر جائے یا اس پر کوئی جانور حملہ کر دے، اور یہ لاچار آدمی، نمازی کو اپنی جان بچانے کے لئے پکارے، اس سے فریاد کرے، اگر نماز پڑھنے والا اس کی جان بچا سکتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی نماز کو توڑ دے اور اس مجبور کی جان بچائے۔

"**یجب قطع الصلوة ولو فرضا باستغاثة شخص ملهوف لِمُهِمٍّ أصابه کما لو تعلق به ظالم أو وقع فی ماء أو صال علیه حیوان فاستغاث بالمصلی أو بغیره وقدر علی الدفع عنه**" (مراقی الفلاح شرح نور الایضاح، فصل فیما یوجب قطع الصلوۃ ۱/۱۷۳)۔

جب کسی کی جان بچانے کے لئے فرض جیسی اہم عبادت کو منقطع کرنا ضروری ہے جب کہ انسان کو عبادت کے لئے ہی پیدا کیا گیا تو پھر کسی کی جان بچانے کے لئے اپنا خون دینا جب کہ اس گروپ کا کوئی اور موجود نہ ہو، اور اس کو اس میں ضرر بھی نہ ہو تو بدرجہ اولی مستحب ہونا چاہئے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کی جان بچا سکتا ہے یا بیمار کی مدد کر سکتا ہے تو ایسے مستعد آدمی پر جان بچانا مستحب ہے اس لئے جس گروپ کا خون بمشکل ملتا ہو تو ایسے گروپ کے حامل شخص کے لئے ضرورتمند مریض کو خون دینا مستحب ہونا چاہئے۔

۵- سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ جس انسان کے دل و دماغ کی موت ہو جائے اور اعضاء میں حیات باقی رہے اسے زندہ قرار دیا جائے یا مردہ؟ ایسی حالت میں عضو انسانی کی منتقلی زندہ انسان سے منتقلی ہے یا مردہ سے؟

شرعا جب تک انسان کے جسم میں روح ہے، وہ زندہ ہے اور جب روح بدن سے جدا ہو جائے تو وہ مردہ ہے، ایسی حالت میں جسم انسانی کے اعضاء دماغ کے تابع باقی نہیں رہتے ہیں۔ جدید میڈیکل کا نظریہ ہے کہ جب انسان بالکل مر جاتا ہے تو اس کے بعد بھی اعضاء میں ایک درجہ حیات باقی رہتی ہے، یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ اگر اعضاء کو نکال کیا جائے تو دوسرے جسم میں منتقل ہو کر اپنا فرض انجام دے سکتے ہیں، اگر اعضاء کی حیات باقی رہتے ہوئے ان کو نہ نکالا جائے تو موت کے بعد آہستہ آہستہ یہ اعضاء اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔ "موت" کی دونوں تعریفیں تقریباً ایک جیسی ہیں۔

انسان اپنے اعضاء کا مالک ہے یا نہیں؟ اس کی پوری تفصیل جواب نمبر ا میں آچکی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ

کوئی بھی آدمی اپنا عضو کسی کو دے سکتا ہے، لیکن انسان کے دل و دماغ کی موت کے بعد اس کے کسی عضو کو نکالنا کچھ حضرات کے نزدیک ناجائز ہے۔ ان کا کہنا ہے جس طرح کسی محروم الراحۃ انسان کو زندہ یا مردہ کا عضو دینا ایثار ہے، اسی طرح اس مجبور آدمی کا زندہ یا مردہ شخص پر رحم کھانا بھی انسانی تکریم میں داخل ہے، اور کس قدر بھیانک ہوگا وہ منظر کہ ایک طرف آدمی کی روح نکلے گی اور دوسری طرف وہیں پر پہلے سے کھڑے تیار ڈاکٹر، جسم ٹھنڈا ہونے سے پہلے، سینہ چاک کر کے جگر، گردے باہر نکالیں گے۔

کچھ حضرات کے نزدیک موت کے بعد انسان کے عضو کو نکالنا درست ہے، ان کی دلیل ہے کہ انسان قابل احترام ہے، لیکن مجبوری میں انسانی اعضاء سے انتفاع فقہاء کرام کے نزدیک جائز ہے (حوالے جواب نمبر ا میں ملاحظہ ہوں) اور یہاں پر بھی کسی مجبور کی جان بچانے کے لئے جگر کو نکالا جارہا ہے اس لئے یہ جائز ہونا چاہئے۔ اور جن لوگوں نے میت کا جسم ٹھنڈا ہونے سے قبل سینہ چاک کرنے کو یا عضو نکالنے کو بھیانک منظر کہا ہے، اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اگر اعضاء میں حیات باقی رہتے ہوئے ان کو نہ نکالا جائے تو وہ کسی کام کے نہیں رہیں گے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اہانت واکرام کے متعلق شریعت نے کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا ہے، اس کا دارومدار عرف زمانہ پر ہے، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو لوگ پہلے برا سمجھتے تھے لیکن اب اچھا سمجھتے ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں اجزاء انسانی سے انتفاع کو اس لئے اہانت آمیز سمجھتے تھے کیونکہ اس سے مہذب طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تھا، اب جب کہ شائستہ طور پر اعضاء کی پیوندکاری ممکن ہے تو اس کو کوئی توہین نہیں سمجھتا بلکہ اپنے جسمانی جزء کو عطیہ کرنے والا خود اس میں توہین محسوس نہیں کرتا، اس میں فخر محسوس کرتا ہے، عطیہ لینے والا بھی اس کو اپنا محسن مانتا ہے۔ اس لئے جگر، گردہ نکالنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

٦-(الف): انسان کے جسم میں بعض اعضاء جفت جفت ہیں مثلاً دو انکھ، دو گردے، دو پیر، دو ہاتھ، دو ہونٹ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "الم نجعل له عينين ولساناوشفتين" (سورۂ بلد)، جس کا مطلب ہے کہ کیا ہم نے انسان کو دو آنکھ، زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے۔ انسان کے جسم میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی عضو بیکار پیدا نہیں کیا ہے بلکہ ہر عضو کی تخلیق میں ایک عظیم مصلحت اور راز پنہاں ہے جس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اس لئے یہ نظریہ قائم کرنا کہ انسان کے جسم میں کوئی عضو زائد ہے، سراسر غلط ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو گردے، دو آنکھ، دو ہاتھ و پیر دینے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ اگر انسان کا ایک گردہ یا پیر خراب ہوجائے تو وہ دوسرا سے کام چلا سکے بالکل ہی لنگڑا ہو کر نہ بیٹھ جائے، اگر اس کی ایک آنکھ خراب

ہوجائے تو دوسری سے کام چلا سکے اور وہ بالکل ہی بینائی سے محروم نہ ہوجائے۔لیکن جدید میڈیکل سائنس،طبی تحقیقات اور تجربات کے مطابق انسان ایک گردہ پر زندہ رہ سکتا ہے،اگر اس کے جسم سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا،اسی طرح اگر کوئی انسان اپنی آنکھ کا قرنیہ کسی کو عطیہ کردے تو وہ اپنی ایک آنکھ سے بینائی کا کام لے سکتا ہے اور اس کو اس میں کوئی جسمانی نقصان بھی نہیں پہنچتا اس لئے زندہ شخص کا اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرنا جائز ہونا چاہئے۔

فقہاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ شخص کا کوئی عضو،کسی دوسرے کے جسم میں منتقل کرنا،جائز نہیں ہے اگرچہ وہ اس کو حکم دے۔"**مضطر لم یجد میتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع یدی وکلها أو قال اقطع منی قطعة وکلها لا یسعه ان یفعل ذلک ولا یصح امره به کما لایسع للمضطر ان یقطع قطعة من نفسه فیاکل کذا فی فتاوی قاضیخان**"(ھندیۃ،کتاب الکراھیۃ،الباب الحادی عشر فی الکراھۃ فی الاکل وما یتصل بہ ۵/۳۳۸)۔

(اگر کوئی مضطر مردار نہ پائے اور اسے اپنی جان کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو اور اس سے کوئی شخص کہے کہ میرا ہاتھ کاٹ کر کھالو یا کہے کہ میرے جسم کا ایک حصہ کاٹ کر کھالو تو مضطر کے لئے ایسا کرنا جائز نہ ہوگا اور نہ یہ حکم دینا صحیح ہوگا اور نہ مضطر کے لئے یہ درست ہے کہ وہ اپنے ہی جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر کھالے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان خود اپنے اعضاء سے انتفاع کرسکتا ہے لیکن اضطرار کی حالت میں اپنے جسم کا کوئی عضو کھانے کے لئے کاٹنا یا کاٹنے کا حکم دینا جائز نہیں ہے فتاوی خانیہ میں ہے:"**لا یسع للمضطر ان یقطع قطعة من نفسه فیاکل**"(فتاوی قاضی خان علی الھندیۃ)۔

(خود مضطر کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنے جسم کے کسی حصہ کو کاٹ کر گوشت کھائے)۔

(ب) جواب نمبر ۵ کے ضمن میں یہ بات آچکی ہے کہ مجبوری میں مردہ انسان کے جسم سے انتفاع جائز ہے اس لئے اگر کوئی شخص رضامندی کے ساتھ یہ وصیت کردے کہ میری موت کے بعد میری آنکھیں کسی شخص کو دیدی جائے،تو اس کی موت کے بعد اس کی آنکھ کو نکالنا اور اس سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔

(ج) جب کوئی زندہ شخص اپنی آنکھ کا عطیہ کسی دوسرے کو کرسکتا ہے،اور اگر وصیت کرکے مرے تو اس کی موت کے بعد اس کی آنکھ حاصل کی جاسکتی ہے اور اس سے انتفاع کیا جاسکتا ہے،تو اگر کوئی شخص بلا جبر واکراہ اور پوری رضامندی کے ساتھ اپنی آنکھ کسی کو عطیہ کردے یا عطیہ کی وصیت کرکے مرے تو ایسی صورت میں بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھیں دی جاسکتی ہیں۔

چونکہ انسان شئ مبتذل نہیں ہے، قابل احترام ہے، اس لئے حکومت سے درخواست کرنی چاہئے اور علماء کو بھی اس میں ٹھوس قدم اٹھانا چاہئے کہ کسی بھی صورت میں آنکھ یا دوسرے اعضاء انسانی کی خرید وفروخت بالکل نہ ہو کیونکہ یہ ناجائز و حرام ہے، انسانی اعضاء سے انتفاع کو بالکل آخری مجبوری کے درجہ میں جائز قرار دیا گیا ہے تا کہ کسی کی جان بچ سکے یا مجبوری دور ہو سکے۔ اعضاء کی بینکنگ اس لئے جائز ہونی چاہئے کہ ضرورت پڑنے پر ایک مجبور کو آسانی کے ساتھ انسانی اعضاء و اجزاء کی فراہمی ہو سکے۔

۷- مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ یا کوئی دوسرا عضو حاصل کرتے وقت ضروری ہے کہ خود اس آدمی نے اپنی زندگی میں برغبت ورضا بلا جبر واکراہ اجازت دی ہو کیونکہ وہ اپنے جسم کا مالک ہے نیز اس کے ورثہ کی اجازت اور ان کی طرف سے آمادگی بھی ضروری ہوگی، کیونکہ موت کے بعد اس کی تکفین وتدفین ورثہ کے ذمہ ہے، دفن ہونے تک اس کی تمام ذمہ داری ورثہ پر ہے۔ صرف میت کی وصیت یا صرف ورثہ کی آمادگی کافی نہیں ہوگی بلکہ دونوں کی اجازت ضروری ہوگی۔

۸- انسان کے دودھ کی تجارت یعنی خرید وفروخت میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے، چونکہ انسان کا پورا وجود قابل احترام ہے، اس لئے تکریم انسانیت کا خیال کرتے ہوئے احناف، دودھ کی تجارت کو منع کرتے ہیں۔

”**قوله ولبن المرأةبالجرای لم یجز بیع لبن المرأة لأنه جزء الادمی وهو بجمیع اجزائه مکرم مصون عن الابتذال بالبیع**“ (البحر الرائق، باب البیع الفاسد)۔

امام شافعیؒ نے دودھ کے خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے۔

احناف کے نزدیک دودھ کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن اجرت پر کسی عورت کو دودھ پلانے کے لئے رکھنا اور عورت کے لئے دودھ پلانے کی اجرت لینا دونوں جائز ہے۔

دودھ بینک سے متعلق دوسرا مسئلہ حرمت رضاعت کا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: ”**وأمهاتكم اللاتی أرضعنكم وأخواتكم من الرضاعة**“ (یعنی تم پر تمہاری وہ مائیں بھی حرام کر دی گئیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری رضاعی بہنیں بھی)۔

قرآن وحدیث اور فقہاء کرام کے اقوال کی روشنی میں یہ واضح ہو گیا جن عورتوں سے نسب کی وجہ سے نکاح کرنا حرام ہے، ان عورتوں سے رضاعت کی بنا پر بھی نکاح کرنا حرام ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اگر کسی بچہ نے مدت رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پی لیا تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

دودھ بینک کا کام یہ ہے کہ دودھ کی فراہمی کرتا ہے پھر بعض کیمیائی تبدیلی کر کے اسے جمع کر لیتا ہے، ظاہر ہے کہ دودھ کی فراہمی کرنے والی عورتوں میں زیادہ تر، اسی شہر کی عورتیں ہوں گی یا آس پاس کی ہوں گی، جب مجبور بچوں کو بینک، دودھ مہیا کرائے گا اور وہ بچے جوان ہوں گے تو ان کے درمیان نکاح کا مسئلہ درپیش ہوگا جوان کے لئے بہت بڑا باعث الجھن ہوگا، جوان ہونے کے بعد ان کے لئے یہ طے کرنا دشوار کن ہوگا کہ کس نے کس عورت کا دودھ پیا اور کس نے نہیں پیا، اگر بینک اس طرح کی معلومات پوری ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ فراہم کرے تاکہ رضاعت سے متعلق کوئی شبہ ہی نہ رہے تو بینک کا قیام جائز ہونا چاہئے ورنہ نہیں، لیکن بینک میں اتنی احتیاط نہیں برتی جاتی ہے۔اس میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر چند عورتوں کا دودھ کسی ایک ہی برتن میں ملایا گیا تو ان تمام عورتوں سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی، اور اس دودھ کو پینے والے بچے، بچیاں آپس میں رضاعی بھائی بہن کہلائیں گے۔

بعض لوگوں نے دودھ بینک کے قیام کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ شک سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی، جیسا کہ فقہی کتابوں میں موجود ہے:

"فلو التقم الحلمة ولم يدر أدخل اللبن فى حلقه أم لا لم يحرم، لأن فى المانع شكا۔والوالجية۔ولو ارضعها اكثر اهل قرية ثم لم يدر من ارضعها فاراد احدهم تزوجها ،ان لم تظهر علامة و لم يشهد بذلک جاز ۔خانية" (الدر المختار علی الرد باب الرضاع ۴/ ۴۰۲)۔

(اگر عورت نے اپنی چھاتی رکھ دی اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بچہ کے حلق میں دودھ داخل ہوا یا نہیں، تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ مانع میں شک واقع ہو گیا...اگر کسی لڑکی کو چند گاؤں کی عورتوں نے دودھ پلایا پھر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس نے اس کو دودھ پلایا، اور اسی گاؤں کا کوئی باشندہ اس سے شادی کرنا چاہے، رضاعت کی کوئی علامت موجود نہ ہو اور نہ اس رضاعت کی کوئی گواہی دینے والا موجود تو نکاح جائز ہوگا)۔

"وفى الفتح:لوأدخلت الحلمةفى فىّ الصبى وشكت فى الارتضاع لا تثبت الحرمة بالشک، ثم قال :والواجب على النساء أن لايرضعن كل صبى من غير ضرورة، وإذا أرضعن فليحفظن ذلک وليشهرنه ويكتبنه احتياطا" (ردالمحتار، باب الرضاع ۴/ ۴۰۲)۔

فتح القدیر میں ہے: اگر کسی عورت نے اپنی چھاتی، بچہ کے منہ میں رکھ دی اور اس کو دودھ پلانے کے بارے میں شک ہو گیا (کہ بچہ نے دودھ پیا ہے یا نہیں) تو شک کی وجہ سے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ پھر کہا: عورتوں پر ضروری ہے کہ وہ بلاضرورت کسی بچہ کو دودھ نہ پلائیں، اگر پلایا کریں تو اسے محفوظ کر لیں اور اس کو مشہور کر دیں اور احتیاطا اس کو لکھ بھی لیں۔

’’جاز هذا من باب الرخصة کی لا ینسد باب النکاح وهذه المسالة خارجة عن قاعدة: الأصل فی الارضاع التحریم‘‘(ردالمحتار، باب الرضاع ۴/ ۴۰۲)۔

(’’رضاعت میں شک کی وجہ سے نکاح کا جائز ہونا‘‘ رخصت کے باب میں سے ہے تا کہ نکاح کا دروازہ بند نہ ہوجائے اور یہ مسئلہ ’’الاصل فی الارضاع التحریم‘‘ کے قاعدہ سے الگ ہے)۔

مذکورہ عبارتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دودھ بینک کا قیام جائز ہونا چاہئے اولاً تو اس وجہ سے کہ اگر بینک سے کسی بچہ نے دودھ پیا اور جوان ہونے کے بعد اس کو معلوم ہی نہیں کہ اس نے کس عورت کا دوھ پیا اور کس کا نہیں، اور اس بات کو کوئی بتانے والا بھی موجود نہ ہو تو اس کا نکاح کسی بھی غیر محرم لڑکی سے جائز ہوگا، کیونکہ شک کی وجہ سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

ثانیا: اس بناء پر کہ اگر بینک، دودھ فراہم کرنے والی عورتوں کے ناموں کو کسی رجسٹر میں لکھ کر محفوظ کرلیں، اور دودھ پینے والے بچہ کے سرپرست کو اس کی فہرست دیدے کہ اس بچہ نے جو دودھ پیا اس میں فہرست میں نامزد تمام عورتوں کا دودھ شامل ہے۔ یا دودھ فراہم کرنے والی عورتوں اور بچوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جائے تا کہ ضرورت پڑنے پر کوئی بھی آدمی بینک سے رجوع کرسکے کہ جس لڑکی سے اس کو نکاح مطلوب ہے وہ اس کی رضاعی بہن ہے یا نہیں، بینک کے ریکارڈ سے اس کو جو بات معلوم ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر بینک ان باتوں کی ذمہ داری لے تو لوگوں کا شبہ اور ان کی جہالت دور ہوسکتی ہے، اور بینک کا قیام جائز ہوسکتا ہے۔

لیکن احناف کے نزدیک انسان کے دودھ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ اگر بینک سے دودھ کا لین دین بلا معاوضہ ہو تب بھی دودھ بینک کا قیام درست نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ ضرورتمند بچوں کو دودھ کے بدلہ میں کوئی دوسری مقوی غذا دی جاسکتی، یہاں اس درجہ کی مجبوری نہیں ہے کہ اگر بینک سے بچے کو دودھ نہ پلایا جائے تو اس کا متبادل کوئی اور ہے ہی نہیں یا اس کی موت ہوجائے گی، بلکہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے عورتوں کو اجرت پر رکھ سکتی ہیں جو کہ اسلام کے موافق ہے، نیز یہ طریقہ آج بھی ممکن ہے۔ بینک کے لاگت اس قدر ہیں کہ غریب ماں باپ روزانہ دودھ پلانے کے لئے اس کو برداشت نہیں کرسکتے، پھر یہ کہ مسلمانوں کو شبہ سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے بینک قائم نہ کئے جائیں اور نہ اس کو دودھ کی فراہمی کی جائے، اور نہ اس سے دودھ کی خرید وفروخت کی جائے۔

☆☆☆

بلڈ بینک، دودھ بینک اور منی بینک کے شرعی احکام

مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہی☆

خون کا عطیہ:

اگر کسی دوسرے شخص کو خون کی اشد ضرورت ہو تو کیا آدمی اپنا خون نکلوا کر دوسرے بیمار کے لیے عطیہ کر سکتا ہے، اس طرح بلڈ بینکوں کو خون کا عطیہ پیش کر سکتا ہے یا نہیں؟

تو اس سلسلہ میں شرعی اصولوں سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اگر کسی مریض کی ہلاکت کا اندیشہ ہو اور ماہر طبیب کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو ایسے مریض کو خون دیا بھی جا سکتا ہے؛ مگر اس کی فروخت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ خون نجس ہے اور نجس کی بیع جائز نہیں ہے، اگرچہ مضطر کے لیے اس سے انتفاع کی اجازت دی گئی ہے مگر فروخت کرنا جائز نہیں، قاعدہ ہے: ''ان جَوازَ الانتفاعِ لاَ یَسْتَلْزِمُ جَوازَ البیع'' خون کی بیع کو خون کے عطیہ پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ قاعدہ ہے: ''انَّ کُلَّ مَایَصِح بَیْعُه یصحُّ ھِبَتُه ولا عکس'' کہ جس چیز کی بیع جائز ہوتی ہے اس کا عطیہ بھی جائز ہوتا ہے، اس کے برعکس ایسا ضروری نہیں کہ جس کا عطیہ جائز ہو اس کی بیع بھی جائز ہو بلکہ اس سلسلہ میں سنن دارقطنی کی حدیث ہے: ''ان اللہ تعالی اذَا حَرَّم شَیْئاً حَرَّمَ ثَمَنَهُ'' (سنن دارقطنی کتاب البیوع، حدیث ۲۸۱۵)، نیز صحیح بخاری میں حضرت ابو جحیفہؓ کی حدیث ہے: ''نَھَی رسولُ اللہ ﷺ عن ثَمَنِ الدَّمِ وَ ثَمَنِ الْکَلْبِ الخ'' (صحیح بخاری کتاب البیوع، باب ثمن الکلب، حدیث ۲۲۳۸)، اور جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے تو وہ عطیہ سے پوری ہو سکتی ہے۔

خون کی بیع کی حرمت کے سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ انسان اپنے خون کا مالک نہیں ہے، اور جس کا وہ مالک نہ ہو اس کو بیچنا بھی جائز نہیں ہے۔

☆ خادم الحدیث والفقہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ۔

خون کا عطیہ محض جائز ہے:

اگر کسی مریض کو خون کی اشد ضرورت ہو اور اس کے گروپ کا خون بمشکل کسی شخص کے پاس ہے، یعنی دونوں کا گروپ ایک ہے تو اس حالت میں اس گروپ کے خون کے حامل شخص کو خون کا دینا محض جائز ہی ہے واجب نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دوسرے کی جان بچانے کے لیے مکلّف نہیں بنایا ہے، البتہ بہت ممکن ہے کہ ایسی حالت میں اس کا خون دینا کار ثواب اور باری تعالیٰ کے یہاں اجر کا سبب ہو، حدیث میں آتا ہے کہ: ''مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤمِنٍ کُرْبَةً مِنْ کُرَبِ الدُّنیَا نَفَّسَ اللهُ عَنْه کُرْبَةً مِنْ کُرْبِ یومِ الْقِیَامَةِ'' (صحیح مسلم حدیث ۴۶۷۷)۔

دودھ بینک کا شرعی حکم:

ان اداروں کو'' دودھ بینک'' سے تعبیر کیا جاتا ہے جو ادارے عورتوں کے دودھ کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے کا کام انجام دیتے ہیں، عورتیں دودھ کو اپنی پستانوں سے بذریعہ مشین نکال کر ان اداروں کو یا تو اس وجہ سے دے دیتی ہیں کہ ان کا دودھ ان کے بچوں کی ضرورت سے زائد ہوتا ہے، یا ان کے بچے مر چکے ہوتے ہیں اور دودھ پستانوں میں بھرا ہوتا ہے، یا دنیوی مال کے حصول میں ایسا کرتی ہیں، کیونکہ بینک ان کو اس دودھ کا بھاری معاوضہ دے دیتے ہیں، بینک جمع شدہ دودھ کو جراثیم سے صاف کر کے ایسی شیشیوں میں محفوظ کر دیتا ہے جن میں جراثیم اثر نہیں کرتے، پھر یہ دودھ اپنی اسی سیال حالت میں رہتا ہے جس طرح اس کو عورت کی پستانوں سے حاصل کیا گیا تھا، اور اس دودھ میں وہ پروٹین اور اجزاء باقی ہوتے ہیں جو صرف انسانی دودھ میں پائے جاتے ہیں، دیگر حیونات: گائے، بھینس، اور بکری وغیرہ کے دودھ میں ایسے مفید اجزاء نہیں ہوتے۔

دودھ بینکوں کی ابتداء:

بیسویں صدی کی ساتویں دھائی میں مغربی مما لک میں دودھ بینکوں کے قیام کا نظریہ رونما ہوا ہے، جب کہ اس سے پہلے ان مغربی مما لک میں بلڈ بینک، آئی بینک، باڈی بینک اور منی بینک کا قیام ہو چکا تھا، اور ان دودھ بینکوں کے قیام کا بنیادی سبب ایک طرف تو مغربی معاشرہ کی کمزوری اور حیرت انگیز طریقہ پر برائیوں کا پھیلنا تھا، دوسری طرف عورتیں متعدی امراض اور کسب معاش کی جدوجہد میں شامل ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلانا چاہتیں، اس پس منظر میں مغربی مما لک میں دودھ بینکوں کے قیام کا نظریہ پروان چڑھا اور ان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جن بچوں کو انسانی دودھ کی ضرورت شدیدہ ہو اور ان کی ماؤں کا دودھ فراہم نہ ہو سکے اور نہ ہی رضاعت کے طور پر دودھ پلانے والی عورتوں کا ملنا ممکن نہ ہو تو ان بینکوں سے فائدہ اُٹھالیا جائے۔

دودھ بینکوں سے استفادہ کرنے والے بچے:

عامۃً وہ بچے جو قبل از وقت پیدا ہوجاتے ہیں اور غیر انسانی دودھ ان کے لیے مضر ہوتا ہے ان کو ان بینکوں سے دودھ لینا آسان ہوجاتا ہے، اسی طرح وہ بچے جو پیدا تو وقت پر ہوئے لیکن ان کا وزن بہت کم ہے، اور ان کو دودھ پلانے والی کوئی عورت نہیں ہے۔

دودھ بینکوں کے فوائد:

چونکہ ان بینکوں میں جو دودھ ہوتا ہے وہ انسانی ہی ہوتا ہے جس میں بچہ کے لیے مناسب غذا موجود ہوتی ہے، چنانچہ اطباء کا کہنا ہے کہ اس دودھ میں پروٹین، وٹامن، شوگر، پانی اور چکنائی بہت مناسب مقدار میں موجود ہوتی ہے۔

بینکوں میں محفوظ دودھ کے اندر انٹی بوڈی اور بیماریوں سے حفاظت کا مادہ ہوتا ہے، جس سے بچے کے قوی اور اعضاء مضبوط ہوتے ہیں اور وہ بہت سی بیماریوں کا مقابلہ کرنے والا ہوجاتا ہے۔

غیر انسانی دودھ بچوں کے نظام ہضم میں کمزوری پیدا کرتا ہے جبکہ انسانی دودھ معدے کے اندر پائے جانے والے جلن اور شورش کو ختم کرتا ہے۔

انسانی دودھ بچوں کو سرطان کی بیماری سے حفاظت میں بہت معین و مددگار ہے۔

جن بچوں کو انسانی دودھ نہیں مل پاتا ان کو یا تو جلدی امراض ہوجاتے ہیں، یا وہ اسہال کی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور جن بچوں کی پرورش انسانی دودھ پر ہوتی ہے ان کو جلد کی بیماری بہت کم ہوتی ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ ان فوائد کا حصول بینکوں ہی سے ہوسکتا ہے؛ لیکن دودھ بینکوں کے قیام سے جہاں یہ فوائد ہیں وہیں پر نقصانات بھی ہیں، بلکہ فوائد کی بہ نسبت نقصانات زیادہ ہیں، چنانچہ ہم ذیل میں ان بینکوں کے کچھ نقصانات کو ذکر کرتے ہیں۔

دودھ بینکوں کے نقصانات:

دودھ بینکوں کے قیام سے پیدا ہونے والے نقصانات ایک قسم کے نہیں ہیں بلکہ دینی، اقتصادی اور معاشرتی ہر طرح کے نقصانات اور مضرات ہیں ہم اختصار کے ساتھ ہر قسم کے نقصان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

دینی نقصانات:

متعدد عورتوں کے دودھ کو جمع کر کے ایک ساتھ ملا دیا جاتا ہے جس سے پتہ نہیں چلتا کہ کس بچے نے کس عورت کا

دودھ پیا ہے اور رشتۂ رضاعت مجہول ہو جاتا ہے اور اس میں کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی عورت کا دودھ متعدد بچوں نے پیا ہو اور وہ آپس میں رضاعی بھائی بہن ہوں، لیکن معلوم نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے شادی کر لیں جو شرعی اعتبار سے حرام ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''**يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب**'' (بخاری، حدیث ۲۵۰۲، ومسلم حدیث ۱۴۴۵)۔

دودھ بینکوں کا قیام درحقیقت اعلیٰ اور افضل کو چھوڑ کر ادنی کو اختیار کرنا ہے، جب مرضعہ خواتین ہیں تو ان کو چھوڑ کر بینکوں کا سہارا لینا بے سود ہے؛ یہ تو ایسے ہی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل نے من وسلوی کو چھوڑ کر پیاز اور لہسن وغیرہ کو طلب کیا۔

اقتصادی نقصان:

دودھ بینکوں کے قیام پر بہت بڑا سرمایہ خرچ ہوتا ہے، اگر اتنا بڑا سرمایہ ایک قوم کی دینی یا دنیوی ترقی پر خرچ ہو تو اس کے فوائد اس سے کہیں زیادہ ہوں گے، اور اگر ان بینکوں پر اتنا بڑا سرمایہ خرچ نہ کیا جائے تو پھر اس دودھ میں جراثیم پھیل جاتے ہیں جو بجائے فائدے کے بے پناہ نقصان دے ثابت ہوں گے۔

صحتی نقصان:

بینکوں میں جو دودھ جمع ہوتا ہے اس میں بسا اوقات وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مادے تحلیل ہو جاتے ہیں جو انسانی دودھ میں ہوتے ہیں، جس کی بناء پر یہ دودھ بچوں کی صحت کے لیے انتہائی نقصان دے ثابت ہوتا ہے، اگر چہ یہ اندیشہ بلڈ بینکوں میں بھی ہوتا ہے مگر اس میں اتنا نہیں ہے۔ نیز عورت جب مشین سے اپنی پستانوں کا دودھ نکالتی ہے تو یہ ایک غیر فطری طریقہ کو اختیار کرنا بھی ہے اور عورت کے لیے نقصان دہ ہے، جب کہ اگر بچہ اس کی پستان سے دودھ پیتا ہے تو وہ عورت کے لیے مفید ہے۔

اخلاقی نقصانات:

دودھ پلانے کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک مقصد ماں اور بچے کے درمیان تعلق اور محبت کا پیدا کرنا بھی ہے اور یہ فطری محبت جو رضاعت سے ثابت ہوتی ہے، دودھ بینکوں کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہی ہوتا ہے جس کا اثر بچہ کے اوپر پڑتا ہے۔

پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ دودھ کا محتاج ہوتا ہے اور اس کی والدہ دنیا کے مال کے حصول کے لالچ میں اپنا دودھ بینک کو فروخت کر دیتی ہے اور اپنے بچہ کو مصنوعی دودھ پلاتی ہے؛ کیونکہ بینکوں کی طرف سے اس دودھ پر عورت کو

بھاری معاوضہ مل جاتا ہے جو وہ بینک کو دیتی ہے، اس صورت میں بچے اپنے فطری حق سے محروم رہ جاتے ہیں جو ان کا ان کی ماؤں کے اوپر ہوتا ہے۔

طبی نقصانات:

نیز جب ایک عورت مستقل کسی بینک کو دودھ فروخت کرنے کی عادی ہوجاتی ہے تو خود اس عورت کی صحت بے حد متاثر ہوجاتی ہے اور آج کل تو جدید سائنس کی روشنی میں طبی نقطۂ نظر سے یہ بات طے ہوچکی ہے کہ مصنوعی رضاعت سے عورت میں فطری رضاعت کے ذریعہ آنے والی کمی کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ کمی واقع ہوتی ہے۔

جب بچہ عورت کی پستان کو چوستا ہے کہ ایک ''ہرمون اکسیر توسین'' نکلتا ہے جس کی وجہ سے ولادت کے بعد عورت کا رحم سکڑ کر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے جو عورت کی صحت کی علامت ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ترین ہے کہ جب عورت بچے کو سینے سے لگا کر دودھ پلاتی ہے تو اس کو ایک فطری سکون حاصل ہوتا ہے جو مصنوعی رضاعت سے ہرگز حاصل نہیں ہوتا ہے۔

اسی طرح جب بچہ عورت کی پستان کو اپنے منہ میں لے کر چوستا ہے تو بچہ ان جراثیم اور میکروبات (Germs Microbes) سے محفوظ ہوجاتا ہے جو اس کے جسم میں ہوتے ہیں اور جن بچوں کو اپنی ماؤں کا دودھ نہیں ملتا ان کو بہت سے مہلک امراض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عورت کا بچہ کو دودھ نہ پلانا پستان سے دودھ کے کم اترنے کا سبب بن جاتا ہے جب کہ بچہ جب پستان سے دودھ پیتا ہے تو ''ہرمون برولاکتین (Prolactin)'' باہر نکلتا ہے جس کے نتیجہ میں دودھ زیادہ اترتا ہے۔

خارجی نقصان:

سنن بیہقی کبریٰ میں ایک مرفوع روایت ہے: ''نَهَى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم أَنْ تُسْتَرْضَعَ الحَمْقَاءُ فانَّ اللَّبَنَ يُشْبِهُ'' (سنن کبری بیہقی ۷/ ۷۶۵ حدیث/ ۱۵۶۸۲)، اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ان خواتین کے دودھ سے منع فرمایا ہے جو کم عقل ہوں، اب بینک جو دودھ جمع کرتا ہے وہ ایک عورت کا تو ہوتا نہیں، نامعلوم کن کن متعدد عورتوں کا ہوتا ہے، ان میں کون کم عقل ہے اور کون نہیں۔ نیز اس حدیث میں یہ بھی بیان کردیا گیا کہ دودھ میں مشابہت ہوتی ہے یعنی دودھ کا اثر بچہ پر پڑتا ہے۔

اسی طرح حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ: ''فَلاَ تُسْقَ مِن يهوديةٍ ولا نصرانيةٍ ولا زانيةٍ'' (منار السبیل

۲/۲۹۲ طبع بیروت)۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں: ''أن الحَمْقَاءُ لا تَحْتَمِيُ مِن الأشياء الضارة للولد فَيُؤثِّرُفي لَبَنِهَا فَيَضُرُّ بالصبي و هذا موافق لما تقوله الأطباء فانهم يأمرون المرضعة بالاحتماء عن أشياء تورِثُ بالصبي عَلَّةً'' (البحر الرائق ۲۳۸/۳)۔

اہانت انسان:

دودھ بینک قائم کر کے ان میں عورتوں کے دودھ کو جمع کرنا فطرت اور تکریم انسانیت کی خلاف ورزی بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان-خواہ مرد ہو یا عورت-کو معزز و مکرم بنایا ہے اور اس کے لیے ایک نظام حیات مقرر کیا ہے۔ اب اگر دودھ بینک قائم ہوں گے تو عورتوں کی حیثیت ایک بکاؤ مال کی سی ہوجائے گی یا ایک گائے، بکری اور بھینس جیسی حیثیت ہوگی جس میں اس معزز و مکرم انسان کی اہانت لازم آتی ہے۔

ہماری اس گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ دودھ بینک کے قائم کرنے میں دینی، اجتماعی، طبی اور اقتصادی ہر طرح کے نقصانات ہیں جس کے پیش نظر ہمیں مغرب کی اندھی تقلید کرتے ہوئے جواز کی بات نہیں کہنی چاہیے؛ کیا ضروری ہے کہ ہر چیز میں مغرب کی پیروی کی جائے، اصل ہمارے لیے دین اسلام ہے۔

دودھ بینک کا شرعی حکم:

شرعی طور پر دودھ بینک کا قائم کرنا، خواتین کا ایسے بینکوں کو عوض لے کر یا بلاعوض دودھ مہیا کرنا اور لوگوں کا ضرورت مند بچوں کے لیے ان بینکوں سے دودھ خریدنا جائز نہیں ہے، اور اس کی کچھ وجوہات تو وہ ہیں جو ماقبل میں نقل کی گئیں اور کچھ وجوہات حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام میں رضاعت کا رشتہ نسب کے رشتہ کی مانند ہے، پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''یحرم مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ'' (صحیح بخاری، کاتب النکاح باب لا تنکح المرأۃ علی عمتہا)۔

اور نسب کی حفاظت شریعت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے، جبکہ دودھ بینک سے نسب میں اختلاط اور شبہ پیدا ہوسکتا ہے۔

(۲) مخصوص حالات میں انسانی دودھ کے ضرورت مند بچوں کے لیے دودھ پینے کا فطری انتظام ہو ہی جاتا ہے۔

(۳) ان دودھ بینکوں کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ کبھی انسان اپنی رضاعی ماں، رضاعی بیٹی یا رضاعی بہن سے بھی نکاح

کرسکتا ہے، جو ارتکاب حرام ہے، لہٰذا سداً للذریعہ حرام ہوگا۔

(۴) حفاظت نسل اسلامی شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، لہٰذا جس وجہ سے بھی اختلاط نسل لازم آتا ہو وہ حرام ہوگا، اور بینکوں میں جو دودھ ہوتا ہے اس کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس عورت کا ہے اور کس کس بچہ نے اس کا دودھ پی رکھا ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ مستقبل میں اس کو کون پئے گا۔ اس سب سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ دودھ بینکوں سے اختلاط نسل لازم آرہا ہے اور قاعدہ ہے: ''**مالا يتم ترك الحرام الا به فتركه واجب و فعله محرم**''۔

(۵) دودھ بینکوں کے قیام میں متحقق مفاسد ہیں جب کہ فوائد غیر متحقق اور متوہم ہیں، اس لیے کہ جن بچوں کو کوئی عورت دودھ پلانے والی نہ ملے تو مصنوعی دودھ سے ضرورت پوری ہوسکتی ہے اور مفاسد متحققہ سے بچنا ضروری ہے۔

(۶) ان بینکوں کے قیام کا مقصد ضرورت مند بچوں کو انسانی دودھ فراہم کرنا ہے اور یہ ایک تحقیق مصلحت ہے مگر دوسری طرف مفاسد عظیمہ بھی ہیں جن کی طرف ماقبل میں اشارہ کر دیا گیا اور قاعدہ ہے: ''**درء المفاسد مقدم على جلب المصالح**''

(۷) اور اگر دودھ بینکوں کو قائم نہ کیا جائے تو صرف اسی خاص بچے کو ضرر لاحق ہوگا جس کو دودھ پلانے والی نہ ملے اور نہ ہی مصنوعی دودھ اس کو موافق آسکے، اور اگر دودھ بینک کو قائم کیا جائے تو اس میں ضرر عام ہے، اب دو ضرر ہو گئے ایک عام اور دوسرا خاص اور قاعدہ ہے کہ جب دو ضرر جمع ہو جائیں ایک عام اور ایک خاص تو ضرر عام کا دفع کرنا مقدم ہوگا ضرر خاص پر، ''**اذا تعارض ضرران عام و خاص فان دفع الضر العام مقدم على دفع الضرر الخاص**''

(۸) دودھ بینکوں کے قیام میں صرف چند بچوں کی ہی مصلحت ہوسکتی ہے اور عدم قیام میں ایک معاشرہ کی بڑی مصلحت ہے اور اصول میں یہ بات طے شدہ ہے: ''**اذا تعارضت مصلحتان رُوْعِيَ اعلا هما بتفويت أدناهما**'' یعنی بڑی مصلحت کی وجہ سے چھوٹی مصلحت کو چھوڑا جاسکتا ہے۔

ان وجوہات کے پیش نظر یہی رائے زیادہ مضبوط ہے کہ دودھ بینکوں کو قائم ہی نہ کیا جائے، تاکہ مذکورہ بالا مفاسد لازم نہ آئیں۔

بینک کے دودھ سے حرمت رضاعت:

ماقبل کی تفصیل سے یہ بات واضح طور پر اخذ کی جاسکتی ہے کہ دودھ بینک کے دودھ سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی، حضرات فقہاء کے اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ مذاہب اربعہ کے فقہاء سے یہ صراحت منقول ہے کہ

اگرعورت کی پستان سے دودھ نکال کر بچے کے منھ میں یا ناک میں ٹپکایا تو اس سے اسی طرح حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی جس طرح پستان سے منہ لگا کر پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے؛اس لیے کہ تحریم کے لیے جو چیز مؤثر ہے وہ دودھ سے غذا کا حاصل ہونا، گوشت کا بڑھنا، ہڈیوں کا مضبوط ہونا اور بھوک کا ختم ہونا ہے اور یہ سب چیزیں سعوط اور وجور (منہ سے دودھ ٹپکانا، ناک سے ٹپکانا) سے بھی حاصل ہوجاتی ہیں؛ لہٰذا اس سے حرمت ثابت ہوجائے گی۔

حدیث شریف میں ہے:''لاَ رَضَاعَ اِلاَّ مَاشَدَّ الْعَظْمَ وَ أَنبَتَ اللَّحْمَ''(سنن ابوداؤد حدیث/۲۰۵۹)۔

دوسری حدیث میں ہے:''لا یَحْرُمُ مَنَ الرَّضَاعِ اِلاَّ مَا أَنْبَتَ اللَّحْمَ و أَنْشَزَالعَظْمَ''(سنن ابوداؤد حدیث ۲۰۶۰)۔

تیسری حدیث میں ہے:''فانَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ المَجَاعَةِ''(سنن ابوداؤد حدیث ۲۰۵۸)۔

مبسوط میں ہے:''وَالسُّعُوطُ والوُجُوْرُ یُثْبِتُ الحُرْمَةَ لأنَّه مِمَّا یَتَغَذِیّ بِه الصَّبِیُّ، فان السُّعُوطَ یصل إلی الدماغِ فیتقوی به والوجور یصل الی الجَوْفِ''(المبسوط للسرخسی ۵/۱۳۴)۔

اس طرح کی عبارت مجمع الانہر (۱/۳۷۸)اور بدائع الصنائع (۴/۹) میں بھی ہے،فقہ حنفی کے علاوہ دیگر فقہاء کی عبارتوں سے بھی یہی ثابت ہوتا۔

''المعدة فالو صول الیها یثبت التحریم سواء ارتضع الصبی أو حُلِبَ اللبنُ وأُوجِرَ في حلقه حتی وصلها ولو حُقِنَ باللبن أو قطر فی اِحْلِیْلِهِ فوصل مثَانَتَه أو کان علی بطنه جراحة فَصُبَّ اللَّبُنُ فیها حتی وصل الجوفَ لم یثبت التحریم علی الأظهر۔ ولو صُبّ فی انفه فوصل دماغه ثبت التحریم علی المذهب''(روضۃ الطالبین للنوی ۹/۶ ط المکتب الاسلامی)۔

اورجن لوگوں نے دودھ کوخون کے او پر قیاس کرکے یہ کہہ دیا کہ جس طرح خون سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی تو اس طرح بینک کے دودھ سے بھی حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، یہ قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ دودھ سے رضاعت کا ثابت ہونا منصوص ہے، نہ کہ خون سے، لہٰذا منصوص کو غیر منصوص پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے، نیز دودھ تو غذا ہی کے لیے بنایا گیا ہے جب کہ خون میں تغذی نہیں ہے بلکہ وہ تو بطور دواء کے چڑھایا جاتا ہے دودھ پاک ہے اور خون ناپاک ہے، پاک کو ناپاک پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

لہٰذا صحیح یہی ہے کہ بینک کے دودھ سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی۔

مادیہ منویہ بینک:

سوالنامہ میں ایک سوال یہ مذکور ہے کہ مغربی ممالک میں بہت سے مقاصد اور وجوہات کے پیش نظر ''مادہ منویہ بینک'' قائم کیے جارہے ہیں تو کیا شرعاً ایسے بینک قائم کرنا جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں اس تفصیل کا تو موقع ہے نہیں کہ مادۂ منویہ بینکوں سے استفادہ کی کیا کیا شکلیں ہیں اور کون سی درست ہیں اور کون سی درست نہیں؛ اس لیے کہ اس کے تعلق سے تو تفصیل ہے اور معاصر فقہاء نے سات صورتیں تفصیل کے ساتھ نقل کر کے ان کے احکامات قلم بند کیے ہیں، ہم تو صرف سوال کے اصل جزء کہ ان کے قیام کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پر مختصراً روشنی ڈالتے ہیں:

مادۂ منویہ بینک کی شرعی حیثیت:

بنیادی طور پر ''مادۂ منویہ بینک'' کے قیام کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ جو لوگ بے اولاد ہیں ان کو اولاد میسر ہوجائے، خواہ طریقہ شریعت کے مطابق ہو یا غیر مطابق، دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے مال حاصل ہوجائے اور پھر دنیاوی طور پر ان بینکوں کے فوائد کو بیان کیا جاتا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بینکوں کے فوائد کے مقابلہ میں نقصانات ہی زیادہ ہیں، ہم چند نقصانات کو ذکر کر کے ان کا شرعی حکم تحریر کرتے ہیں۔

(۱) اختلاط نسب، اس لیے کہ جب ایک شخص کا مادۂ منویہ یا عورت کے بیضے بینک میں جمع کردئے جاتے ہیں تو بینک ان کو مخلوط کردیتا ہے، پھر بسا اوقات ایک شخص کے مادۂ منویہ کو اجنبیہ عورت کے بیضہ کے ساتھ مخلوط کر کے پرورش کی جاتی ہے، جو شرعاً حرام ہے۔

(۲) بانجھ افراد کے ہاتھوں مادۂ منویہ یا عورت کے بیضے کو فروخت بھی کیا جاتا ہے۔

(۳) ان بینکوں کی نحوست یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے بہت سے ایسے بچوں کا ظہور ہوتا ہے جن کے ماں باپ کی معرفت بھی نہیں ہوتی اور وہ غیر ثابت النسب ہوتے ہیں۔

(۴) زوجیت کے تعلقات کا ختم کرنا بھی لازم آتا ہے، اور اس کے بجائے استمناء بالید والا حرام عمل ہوتا ہے۔

(۵) اس سے بہت سے موروثی امراض بھی پیدا ہوتے ہیں۔

(٦) کبھی کبھی ایک انسان کی منی کو اس کی وفات کے بعد استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص نے اپنا مادۂ منویہ بینک کو دیا اور بینک نے اس کو محفوظ کر کے رکھ لیا اور پھر اس شخص کا انتقال ہوگیا اور اس مادۂ منویہ کو کسی عورت کو یا خود اس مرنے والے

کی بیوی کو دے دیا جاتا ہے اور وہ اپنے رحم میں رکھ کر مصنوعی بارآوری کرتی ہے جو شرعاً حرام ہے۔

(۷) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت بینک سے مادۂ منویہ لیتی ہے اور اپنے رحم میں انجکٹ کرا لیتی ہے، حالانکہ یہ مادہ منویہ اس کے کسی محرم مثلاً باپ بھائی یا بیٹے کا بھی ہوتا ہے۔

(۸) یہ بینک کبھی کسی عورت کے رحم کو کرائے پر بھی لیتے ہیں اور جن عورتوں میں بیضے تو ہوتے ہیں لیکن رحم قابل حمل نہیں ہوتا تو ان کے بیضے لے کر اور شوہر کا مادہ لے کر اس تیسری عورت کے رحم میں بارآوری کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ایسی عورتوں کو بھاری معاوضہ بھی دیا جاتا ہے اور اس سے رشتۂ ازدواجیت متاثر ہوتا ہے اور خاندانی نظام پر بھی برے اثرات پڑتے ہیں۔

(۹) ان بینکوں کی وجہ سے زنا کاری بھی بڑھتی ہے، اس لیے کہ ایک زنا سے حاملہ ہو کر یہ کہہ سکتی ہے اس نے بینک سے اپنے شوہر کا محفوظ مادۂ منویہ لیا ہے۔

اب اگر ان بینکوں کے قیام سے مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی خرابی لازم آتی ہے تو ان بینکوں کا قیام ممنوع ہوگا اور اگر ان بینکوں کے قیام کا مقصد صرف اور صرف یہ ہو کہ جو شادی شدہ عورت رحم کی کسی کمزوری کی وجہ سے حاملہ نہیں سکتی تو اس کے بیضے لے کر اور اس کے شوہر کے مادہ کو لے کر ایک ٹیسٹ ٹیوب میں خارجی بارآوری کر کے پھر اس انڈے والی بیوی کے رحم میں داخل کر دیا جاتا ہے اور یہ عمل شوہر کی موجودگی میں تمام شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے کیا جائے تو اس کے لیے ایسے بینکوں کو قائم کرنا شرعاً درست معلوم ہوتا ہے۔ عمومی حالات میں ان کے قیام کی اجازت دینا خطرات سے خالی نہیں ہے۔

بینک سے مادہ منویہ کا لینا دینا بھی درست نہیں:

سابقہ تفصیل سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مرد یا خاتون کا بینک کو مادہ منویہ اور بیضے فراہم کرنا یا بینک کا کسی ضرورت مند کو مادۂ منویہ کا فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے دینا شرعی طور پر جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور فقہ شافعی

مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی۔(شافعی)☆

خون کا عطیہ اور بلڈ بینک کا قیام:

مذہب اسلام نے انسانی جان کی قدر و قیمت اور اس کے تحفظ کی جتنی اہمیت بتلائی ہے وہ کسی اور مذہب میں نہیں، اسی لئے اسلام میں کسی کی ناحق جان لینا حرام اور باعث گناہ ہے، ایک جان کو مارنا پوری انسانیت کو برباد کرنے کے مترادف ہے اور ایک جان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے قائم مقام ہے، انسانی جان کی حفاظت کا مدار جن بنیادی چیزوں پر ہے ان میں سے ایک خون ہے، اس لئے کہ جب کسی کے جسم کا خون ختم ہو تو اس کا بچنا مشکل ہو جاتا ہے، اسی کے ضمن میں خون کا عطیہ اور ہبہ نیز حفظ ماتقدم کے طور پر بلڈ بینک کے قیام کی ضرورت پیش آتی ہے، لہذا اس سلسلہ میں فقہ اکیڈمی کی طرف جو سوالات موصول ہوئے ہیں ان کے جواب درج ذیل ہیں۔

۱- حدیث پاک میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''" بندہ جب تک اپنے بھائی کی مدد کرتے رہتا ہے، اللہ تعالی اس کی مدد کرتے رہتے ہیں'' (مسلم:۲۶۹۹)، دوسری حدیث پاک میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص دنیا میں کسی کی مصیبت کو دور کرے گا اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی مصیبت کو دور فرمائے گا'' (مسلم:۲۶۹۹)، مذکورہ احادیث اور آپ ﷺ کے دیگر ارشادات دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کرنے پر کثرت سے دلالت کرتے ہیں، چاہے وہ خیر خواہی کسی بھی قسم کی ہو یا کسی کے ساتھ بھی ہو، خیر خواہی اور ہمدردی کی ایک شکل کسی ضرورت مند مسلم و غیر مسلم کو خون دینا بھی ہے، اس لئے کہ یہ ایک قسم کا اس کا تعاون اور اس کے ساتھ خیر خواہی ہے، اور چوں کہ انسانی جسم میں خون بڑھنے والی چیز ہے، اگر جسم سے خون نکالا جائے تو اس کی جگہ دوسرا خون تیار ہوتا ہے، اسی لئے ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کی خاطر خون کو عطیہ کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے: (۱) عطیہ کرنے والا مکلّف ہو یعنی عاقل، بالغ اور رشید ہو (۲) اپنی رضامندی اور خوش دلی سے خون

☆ جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور کرناٹک۔

دے، (۳) خون دینے کے بعد خون دینے والے کو کسی قسم کا ضرر لاحق نہ ہو (۴) خون کا عطیہ علاج ومعالجہ کے لئے ہو۔

علامہ زحیلیؒ فرماتے ہیں: ''**یجوز نقل العضو من جسم انسان إلی جسم انسان آخر ،إن کان هذا العضو یتجدد تلقائیاکا الدم والجلد ،ویراعی فی ذلک کون الباذل کامل الاهلیة ،وتحقق الشروط الشرعیة المعتبرة**'' (موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرہ: ۹/ ۵۰۷)۔

شیخ ابن بازؒ فرماتے ہیں: ''**حکم التبرع بالدم: لابأس فی ذلک ولا حرج فیه عندالضرورة**'' (فتاوی ابن باز: ۲۰/ ۷۱)۔

۲، ۳- اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ''**وتعاونوا علی البر والتقوی**'' کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں لوگوں کا تعاون اور مدد کرو (المائدہ: ۲)، لہذا کسی کی زندگی اور حیات کے لئے کوئی ممدوح اور مندوب کوشش بھی بھلائی کا ہی کا کام ہے، شریعت نے جان کی حفاظت کے خاطر مردار اور خنزیر تک کو کھانا واجب قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں: ''**ومن خاف علی نفسه موتا او مرضا مخوفا ووجد محرما کمیتةولحم خنزیر وطعام الغیر لزمه أکله**'' (مغنی المحتاج: ۶/ ۲۰۳) نماز سے بڑھ کر شریعت میں کوئی مقدس اور اہم عبادت نہیں، لیکن شریعت نے دوسرے کی جان کی حفاظت کو نماز پر مقدم رکھا ہے کہ اگر کوئی غرق ہو رہا ہو یا کسی اور وجہ سے مر رہا ہو تو نماز کو موخر کر کے اس کی جان بچانا واجب ہے، چنانچہ علامہ زین العابدین ملیباریؒ فرماتے ہیں: ''**ویؤخر أیضا وجوبا من رأی نحو غریق أو أسیر لو أنقذه خرج الوقت**'' (فتح المعین مع اعانۃ: ۱/ ۱۹۰)، فقہاء کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح اپنی جان کی حفاظت ضروری ہے، اسی طرح دوسرے کی جان کی حفاظت اتنی ہی اہم ہے، اس لئے قدرتی اور غیر معمولی حادثات سے نمٹنے کے لئے بلڈ بینک کو قائم کرنا اور ان میں بغیر کسی عوض کے ثواب کی نیت سے خون دینا فرض کفایہ ہے، یعنی جب دوسرے لوگ ان بلڈ بینکوں میں اپنا خون بلاعوض دے رہے ہوں، تو پھر اس کے لئے خون دینا واجب نہیں، البتہ مستحب ہے، البتہ خون کو عوض کے بدلہ دینا جائز نہیں ہے اس لئے کہ اللہ تعالی نے فرمایا: ''**ولقد کرمنا بنی آدم**'' (بنی اسرائیل: ۷۰) (کہ ہم نے بنی آدم کو قابل تکریم بنایا ہے)، لہذا انسانی جسم کے کسی حصہ اور خون کی بیع یہ تکریم انسانی کے خلاف ہے، اور حدیث میں خون کے ثمن سے منع فرمایا ہے: ''**نهی عن ثمن الدم** ''**وفی شرح السنة بیع الدم لا یجوز لانه نجس**'' (مرقاۃ المفاتیح: ۶/ ۱۳) اس لئے عوض کے بدلہ خون دینا اور اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر تبرعا خون دستیاب نہ ہو تو اس صورت میں بطور مجبوری خون خریدنا جائز ہے۔

چنانچہ اس تفصیل پر دکتور حسام الدین بن موسی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:"ان التبرع بالدم من الامور الضروريةللناس ولا أبالغ أن قلت أن حكمه فرض كفاية، إذا قام به البعض سقط الاثم عن الباقين، وذلک لما يترتب عليه من انقاذ المرضى والجرحى فى الحوادث المختلفة،وعلى الانسان أن يبذل دمه تبرعا، وحسبة لله تعالى، ولا يطلب أى مقابل عند تبرعه بدمه لإنقاذ حياة الانسان محتاج لذلک الدم، ولا يجوز أخذالعوض مقابل هذا الدم ...وذلک لأن الانسان مكرم لا يجوز بيع أي جزء منه ، فلا يحل أن يبيع شعره مثلا كما تباع اصواف الحيوانات وكذلک دمه لا يحل له بيعه لقول تعالى: ولقد كرمنا بنى آدم ،وأخذ من هذا التكريم لا يجوز للانسان أن يبيع أى جزء منه كما تباع السلع .واذا لم يتيسر للانسان المحتاج للدم الحصول على الدم تبرعا وهبة إلا عن طريق الشراء فحينئذ يجوز الشراء الدم والإثم على الاخذدون المعطى"(فتاوی یسئلونک للدکتور حسام الدین بن موسی:۱/۱۲۶)۔

۴- اگر مریض کا خون کسی نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو تو اس گروپ کے حامل شخص کے لئے اسے خون دینا اس وقت واجب ہوگا جب کہ اس کے خون نہ دینے کی صورت میں اس کی جان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہو، اگر یہ اندیشہ نہ ہو بلکہ اس کی نقاہت اور مرض میں اضافہ کا امکان ہو تو خون دینا مستحب اور جائز ہے۔"التبرع بالدم جائز اذا كان لايؤخر على صحةالمتبرع،لكن إذا ترتب عليه انقاذ معصوم ولا يوجد غيره فانه يجب والحالة هذه"(فتاوی اللجنۃ :۲۵/۶۹)۔

۵- اعضاء کا عطیہ:

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا:"لا إله إلا هو خالق كل شى ء فاعبدوه وهو على كل شى ء وكيل"(انعام:۱۰۲)،اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ انسان اللہ تعالی کا مملوک ہے، لہذا وہ اپنے جسم کے اجزاء اور اعضاء میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتا، اس لئے عام حالات میں انسان کے لئے کسی عضو کو کاٹ کر دوسرے انسان کے علاج کے لئے دینے کی اجازت نہیں ہے، خاص طور پر اس وقت جب کہ دینے والے کی زندگی اس عضو کے کاٹنے کی صورت میں خطرہ سے دوچار ہوجائے، لیکن اس کے برعکس جب عضو دینے والے کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو یا پھر اس عضو کی اس کو خاص ضرورت نہ ہو اور کسی دوسرے کو دینے کی صورت میں اس کی زندگی کے بچنے کا امکان ہو تو پھر شرعا اپنے کسی عضو کو دینا جائز ہے، جیسا کہ کسی مضطر کے لئے اپنی زندگی کی حفاظت کی خاطر اور ہلاکت سے بچنے کے لئے کسی دوسرے کے عضو کو کاٹ کر کھانا جائز

ہے، چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں: "انه یجوز قطع المضطر عضوا من غیره لانقاذ نفسه من الهلاک" (المجموع: ۹/۴۵)، دوسری طرف مالک طعام پر کسی مضطر کو اتنا کھانا کھلانا واجب ہے جس سے اس کی جان بچ سکے، اگر چہ اس کھانے کی مقدار کا وہ مستقبل میں محتاج ہو، اور اگر وہ کھانا دینے سے انکار کرے تو مضطر کے لئے اس کھانے کو زبردستی لینا جائز ہے، چنانچہ شیخ زین الدین ملیباریؒ فرماتے ہیں: "ولزم مالک طعام مضطر قدر سد رمقه ان کان معصوما وان احتاجه مالکه مالا..... فان منع فله وأخذه قهرا بعوض ان حضر" (فتح المعین: ۲۳۳)، اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ جس چیز پر کسی کی جان بچنا موقوف ہو وہ چیز اسے دینا ضروری ہے، لہذا اگر کسی متعین مریض کو جو موت کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہو یا ایسے ادارہ کو جو زندگی اور موت کے کشمکش میں مبتلا افراد کی زندگی کی حفاظت کا انتظام کرتا ہے، کسی مردار شخص کا جگر دینا جائز ہے اور شدید ضرورت کے وقت واجب ہے، اس لئے کہ اس صورت میں میت کو نہ کسی قسم کے ضرر کا امکان اور اندیشہ ہے اور تبرعا دینے کی صورت میں نہ تکریم انسانیت کی توہین ہے، البتہ اس کی بیع درست نہیں ہے، اس لئے کہ بیع کرنا تکریم کے خلاف ہے، البتہ اگر کسی میت کے وارثین میت کے جگر کو تبرعا دینے کے لئے تیار نہ ہو تو اس صورت میں بطور مجبوری اس کی بیع بھی درست ہے، اس لئے کہ شرعا ضرورت شدیدہ کے وقت بہت سے حرام امور کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے یہ قاعدہ نقل کیا ہے "الضرورات تبیح المحضورات" (الاشباہ والنظائر: ۱/۱۶۸)۔

علامہ زحیلیؒ "تعریف نقل العضو" کے عنوان کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"هو أخذ عضو من انسان حی أو میت ،فیه مقومات الحیاة الخلویةوزرعه فی جسدانسان آخر وهو أهم أنواع النقل والزرع؛وللعلماء فی حکمه رأیان:أما الرای الاول للجمهور فهو یعتمد علی المبدأالشرعی المعروف،وهو أن الانسان لا یملک التصرف باجزاء أو أعضاء جسده لا تبرعا ولا معاوضة لأن الانسان مملوک لله تعالی خالقه ،لا لأحد سواه لقوله تعالی: "الله خلق کل شیء .. وهو علی کل شیء وکیل" ..وذلک دلیل واضح علی أنه لا یجوز اقتطاع عضو أو جزء من عضو لغرسه فی جسد انسان آخر للعلاج أو غیره۔وأما الرای الثانی:للمعاصرین ،فهو یجیز النقل والزرع للضرورة أوالحاجة أوالمصلحة المتعینة ،ومشروعیة الضرورة مقررة فی خمس آیات من القرآن الکریم،منها:"فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه "وبناء علیه قررالفقهاء القاعدة المشهورة وهي "الضرورات تبیح المحضورات" وقاعدة: "الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة کانت أو خاصة

"والمراد بكونها خاصة أن يكون الاحتياج لطائفة منهم كاهل بلد أو حرفة"(المدخل الفقہی العام للشیخ مصطفی الزرقاء: ۶۰۳۔بحوالہ موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرۃ: ۱۳/ ۱۹)۔

۶-آئی بینک یا کسی شخص کو آنکھوں کا عطیہ:

(الف۔ب۔ج۔)انسانی اعضاء کے نقل کے شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جو شخص اپنا کوئی عضو دے رہا ہے جس کی بناء پر اسے کسی قسم کا ضرر لاحق نہ ہو،اس لئے کہ اللہ تعالی نے فرمایا:''ولا تلقوا بأيديكم الى التهلكة '' کہ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو(البقرۃ:۱۹۵)،اسی طرح اللہ تعالی نے فرمایا:''ولا تقتلوا انفسكم ''تم اپنے آپ کو قتل مت کرو(نساء:۲۹)،نیز نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"لاضرر ولا ضرار" کہ کسی کی تکلیف کو دور کر کے خود کو تکلیف میں نہیں ڈالنا ہے(مؤطا:۲/ ۷۴۵)،ان دلائل کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک زندہ آدمی کے لئے کسی ایسے انسان کو جو دونوں آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکا ہو اسے صرف اپنی ایک آنکھ نہ کہ دونوں (دونوں کی صورت میں یقیناً ضرر ہے،اور ایک آنکھ کی اجازت بھی ضرورتاً ہے،اور قاعدہ "الضرورة تتقدر بقدرها" کے تحت جو چیز ضرورتاً جائز ہوتی ہے وہ بقدر ضرورت ہی جائز ہوتی ہے)،دینا اس شرط کے ساتھ جائز ہوگا جب کہ اسے ایک آنکھ سے اپنی زندگی گزارنا ممکن ہو،اور کسی قسم کا ضرر لاحق نہ ہو،اس لئے کہ جس طرح اپنی تکلیف دور کرنے کے لئے دوسرے کو تکلیف میں ڈالنا درست نہیں،اسی طرح دوسرے کی تکلیف دور کر کے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا بھی درست نہیں،جیسا کہ ایک مضطر کے لئے دوسرے مضطر کا کھانا درست نہیں اسی طرح اپنا کھانا دوسرے کو دے کر خود ہلاک ہونا بھی درست نہیں،چنانچہ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:"ولا ياكل المضطر طعام مضطر آخر ..ولا قطع فلذة من فخذه ولا قتل ولده أو عبده ،ولا قطع فلذة من نفسه،ان كان الخوف من القطع ،كالخوف من ترك الاكل، وكذا قطع السلعة المخوفة'' (الاشباہ والنظائر:۱/ ۱۷۹)،الہذا اپنی مکمل رضامندی اور تبرع اور ھبہ کے اہل شخص کے لئے یا آئی بینک کے لئے مذکورہ شرائط کے ساتھ دینا جائز ہے،اور دونوں آنکھیں دینا جائز نہیں ہے:''يحرم نقل عضو من انسان حى يعطل زواله وظيفة أساسية فى حياته وان لم تتوقف سلامه أصل الحياة عليها كنقل قرنية العين كلتيهما'' (موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرۃ:۹/ ۵۰۸)۔

جہاں تک کسی میت کی آنکھ کا مسئلہ ہے،یا کسی زندہ شخص کی آنکھ کسی بیماری کی وجہ سے نکالنا پڑھی ہو اور اس قرنیہ اچھے اور قابل استعمال ہوں تو چوں کہ موت کے بعد اسے اور اس مریض کے لئے نہ آنکھ کی ضرورت ہے اور نہ آنکھیں نکالنے

کی صورت میں اسے کسی قسم کی تکلیف کا امکان ہے، اور نہ تبرعا آنکھیں دینا تکریم انسانی کے خلاف ہے، اس لئے اس کے جواز میں کوئی حرج نہیں بلکہ ضرورت شدیدہ کے موقع پر واجب ہے۔ چنانچہ علامہ زحیلیؒ فرماتے ہیں: "**تجوز الاستفادة من العفو الذى استؤصل من الجسم لعلة مرضية لشخص آخر كأخذ قرينة العين لانسان ماعند استيئصال العين لعلة مرضية**" (موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرہ: ۹/ ۵۰۷)۔

۷- مردہ جسم سے جگر یا آنکھ حاصل کرنے کا جواز مذکورہ شرائط وتفصیل سے واضح ہو چکا اب اس کے حصول کے لئے صرف میت کی اجازت و وصیت، یا پھر اس کے انتقال کے بعد ورثہ کی اجازت کافی ہے، اگر میت نے موت سے پہلے اجازت دی ہو تو پھر ورثا کے انکار کا اعتبار نہیں ہوگا، اگر میت لاوارث یا مجہول الحال ہے تو پھر مسلمان ذمہ داروں کی اجازت کا اعتبار ہوگا۔ "**يجوز نقل عضو من ميت الى حى تتوقف حياته على ذلك العضو... بشرط أن يأذن الميت قبل موته ،أو ورثته بعد موته ،أو بشرط موافقة ولى أمرالمسلمين ان كان المتوفى مجهول لهوية أولا ورثة له**" (موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرہ: ۱۳/ ۲۳)۔

۸- دودھ بینک کا قیام:

چند سال قبل بچوں کی زندگی میں انسانی دودھ کی اہمیت کے پیش نظر بعض مفکرین نے عورتوں کے دودھ کو جمع کرنے اور احتیاط سے اسے ڈبوں میں پیک کر کے فروخت کرنے کی بینک کاری شروع کی، آج یورپ میں انسانی خون کی طرح دودھ کی بینک کاری بالکل عام ہے یہ بینک عورتوں کا دودھ خرید کر دیگر اشیاء کے ساتھ خلط ملط کر کے اسے پیک کرتی ہے اور مارکیٹوں میں فروخت کرتی ہے، یہ دودھ دراصل انسانی دودھ ہے، اس کی خرید وفروخت باقاعدہ اس زمانہ میں شروع ہوئی، لیکن فقہاء کی عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں بھی کسی نہ کسی طرح انسانی دودھ کی خرید وفروخت کا کسی حد تک رواج تھا، چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں: "**بيع لبن الآدميات جائز عندنا لا كراهة فيه ...بانه لبن طاهرمنتفع به فجاز بيعه كلبن الشاة ، لأنه غذاء للآدمى فجاز بيعه كا لخبز**" کہ انسان کے دودھ کی بیع بغیر کراہت کے جائز ہے، اس لئے کہ انسان کا دودھ پاک ہے اور قابل انتفاع ہے اس کی بیع بکری کے دودھ کی طرح جائز ہے، اور اس لئے بھی کہ وہ آدمی کی غذا ہے اس کی بیع روٹی کی بیع کی طرح جائز ہے (المجموع: ۹/ ۲۱۴)۔

مذکورہ تحریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دودھ کی خرید وفروخت تو جائز ہے، البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ کیا اس طرح کے دودھ کا استعمال نقصان دہ ہے؟ چوں کہ یہ دودھ انسانی ہے تو اس میں دو طرح کے نقصان کا امکان ہے، ایک نقصان کا

تعلق تو بچہ سے ہے، یعنی اس دودھ کے استعمال سے بچہ کے اخلاق وعادات میں فساد و بگاڑ پیدا ہوگا، کیوں کہ ایک مومنہ ماں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ کے ایک ایک قطرہ کے ساتھ اللہ ورسول کی عظمت، دین کی محبت اور ایمان ویقین کے جام سے بھی اسے سیراب کرے، اور اچھے اخلاق اور پاکیزہ خیالات کو اس کے قلب وروح میں بسانے کی کوشش کرے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دودھ کا اثر بچوں کی طبیعت اور اخلاق میں ظاہر ہوتا ہے، اور دودھ کی بینک کاری کے ذریعہ ڈبوں میں جمع کیا جانے والا دودھ کس طرح کی عورتوں کا ہے اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا، اگر بالفرض یہ دودھ مشرکہ، زانیہ اور فاحشہ عورتوں کا ہو تو تو دودھ کے ساتھ بچوں کی زندگی میں شرک، زنا اور فحاشی جیسے صفات رزیلہ کا اثر نمایاں طور پر ظاہر ہوگا۔

اس دودھ کے استعمال سے جو دوسرا نقصان ہے وہ اپنا دودھ فروخت کرنے والی عورتوں سے ہے کہ اس طرح دودھ کے خرید وفروخت میں اگر اس عورت کا بھی بچہ ہو تو اس بچہ کے لئے دودھ کی کمی باعث تکلیف ہوگی جس سے بچہ کی صحت متأثر ہوگی، مذکورہ طریقہ میں عورتوں کی کرامت کی توہین کا پہلو بھی غالب ہے کہ جانوروں کی طرح عورتوں کا دودھ نکال کر فروخت کیا جائے، اسی طرح خود اس عورت کی صحت بھی متأثر ہوگی کہ جب بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے تو اس کے پستان کو چوستا ہے اور اس عمل سے ماں کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، لیکن اگر یہ دودھ کسی جدید آلہ سے نکالا جائے تو دودھ کی رگوں کو ضرر پہنچنا یقینی ہے جس سے اس کی صحت بھی متأثر ہوگی، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ جن عورتوں کا دودھ ڈبوں میں پیک کیا جاتا ہے ان میں سے کوئی عورت ایسی ہو جو کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو اور اس کا یہ مرض دودھ کے ذریعہ بچوں میں منتقل ہوگا اور بچے بھی اس مرض کے شکار ہوں گے، اگرچہ اس بات کا امکان ہے کہ نقصان دہ دودھ کی تشخیص کری جاتی ہوگی لیکن بعض مرتبہ تشخیص ناکام بھی ہوجاتی ہے۔

اور سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس طرح کے بینک میں جمع ہونے والے دودھ کو کوئی ایسا بچہ پی لے جس کی عمر دوسال سے کم ہو اور وہ دودھ نوسال سے زیادہ عمر والی لڑکی کا ہو، نیز وہ دودھ کسی بیماری سے پیدا نہ ہوا ہو اور ایک ہی عورت کا دودھ پانچ مرتبہ پی لے تو رضاعت ثابت ہوگی، گرچہ شرائط رضاعت کا مکمل طور پر بینک کے دودھ میں پایا جانا ممکن نہیں ہے، اور اس صورت حال میں بعد میں چل کر رشتہ رضاعت کو باقی رکھنا انتہائی دشوار ہے، اس لئے کہ بینک سے حاصل ہونے والے دودھ میں یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ دودھ کس عورت کا ہے، اور مستقبل میں اس عورت کی بیٹی سے اس دودھ پینے والے لڑکے کا یا اس کے برعکس نکاح ہونے کا بھی امکان ہے، جو ایک حرام فعل ہے۔ لہذا ان تمام مضرات کو سامنے رکھتے ہوئے شرعی طور پر دودھ بینک کے قیام کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

علامہ زحیلیؒ رقم طراز ہیں:

”ان الاسلام یعتبرالرضاع لحمة کلحمة النسب یحرم به مایحرم من النسب باجماع المسلمین، ومن مقاصد الشریعة الکلیة المحافظة علی النسب ،وبنوک الحلیب مؤدیة الی الاختلاط أو الریبة۔أن العلاقات الاجتماعیة فی العالم الاسلامی توفر للمولود الخداج أو ناقص الوزن أو المحتاج إلی اللبن البشری فی الحالات الخاصة مایحتاج الیه من الاسترضاع الطبیعی ،الامر الذی یغنی عن بنوک الحلیب ۔وبناء علی ذلک قرر:أولا: منع انشاء بنوک حلیب الامهات فی العالم الاسلامی۔ثانیا :حرمة الرضاع منها“ (موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرہ:۹/۷۷۴)۔

۹-مادہ منویہ بینک کا قیام:

شریعت اسلامیہ میں نسب کی حفاظت بہت ہی حساس معاملہ ہے،اور انسان کی عزت وتکریم میں اس کے نسب کا بڑا کردار ہے،معاشرہ میں صاحب نسب ہی مؤقر اور صاحب فضل سمجھا جاتا ہے،نکاح کے وقت لڑکی کے نسب کا خیال رکھنا شرعی حکم ہے،اس پس منظر میں نسب کی حفاظت خاص طور پر جب نسبی شناخت زنا کے عام ہونے کی بناء پر معاشرہ سے ختم ہوتی جارہی ہو بہت ہی ضروری ہے،اسی کے ساتھ آج بانجھ پن کا مرض بھی عام ہوتے جارہا ہے جس کو ختم کرنے کے لئے جدید طبی آلات اور ایجادات کا سہارا لیا جارہا ہے،ان طبی ایجادات سے پیدا ہونے والی اولاد کا نسب محفوظ ہوگا یا ان کا نسب کالعدم قرار دیا جائے گا یہ ایک قابل غور پہلو ہے۔

فقہاء شوافع کی تصریحات کے مطابق طبی طریقہ سے پیدا ہونے والی اولاد میں ثبوت نسب کے لئے مادیہ منویہ کا محترم ہونا ضروری ہے،یعنی مرد کی منی اگر محترم طریقہ سے نکالی گئی ہو یعنی یا تو جماع کرتے وقت نکلنے والی ہو،یا بیوی کے ہاتھ سے نکالی گئی ہو،یا وطی شبہ میں نکلنے والی ہو،اس کے برخلاف خود کے ہاتھ سے یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے نکالی ہوئی ہر یا بدنظری یا کسی اور حرام چیز کو دیکھنے کی وجہ سے نکلی ہو تو یہ مادہ منویہ غیر محترم ہے۔

☆اب شوہر کی منی محترم کو کسی طبی طریقہ سے اس کی بیوی کے رحم میں داخل کی جائے تو پیدا ہونے والا بچہ اس کی طرف منسوب ہوگا اور نسب ثابت ہوگا۔

☆شوہر کی منی کو غیر محترم طریقہ سے نکال کر اس کی بیوی کے رحم میں داخل کی جائے تو نسب ثابت نہیں ہوگا۔

☆کسی اجنبی شخص کی منی محترم اور اس کی بیوی کے بیضہ کو یا صرف منی محترم کو کسی اجنبیہ کے رحم میں داخل کی جائے تو

منی محترم ہونے کی بناء پر اس بچہ کا نسب اس شخص سے ہی ثابت ہوگا (حاشیۃ البجیر می: ۳/۲۳۲)۔

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ بینک کے قیام کی صورت میں اس میں منی محترم اور غیر محترم دونوں طرح کی منی جمع ہوگی، اگر منی غیر محترم ہے تو اس صورت میں ایک ایسی نسل تیار ہوگی جس کی نسبی شناخت باقی نہیں ہوگی۔

اور اگر منی محترم ہے تو منی جب کسی ایسے شخص کے حوالہ کی جائے جو تولیدی صلاحیت نہ رکھتا ہو، پھر وہ منی اس کی بیوی کے رحم میں داخل کی جائے تو پیدا ہونے والا بچہ صاحب منی کا ہوگا، اور بینک والوں کے لئے صاحب منی کی شناخت دشوار ہوگی تو اس صورت میں یہ بچہ اپنے حقیقی نسب سے محروم ہوگا اور جس شخص نے اس بچہ کا مادہ منویہ خریدا تھا وہ اس اعتبار سے گنہ گار ہوگا کہ وہ اس بچہ کو اپنی طرف منسوب کرے گا، جب کہ شرعی طور پر وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ اور منی پر عورت کے بیضہ کو قیاس کرتے ہوئے یہی حکم ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا بیضہ چاہے محترم طریقہ سے نکالا گیا ہو یا غیر محترم دونوں ہی صورتوں میں بینک کے ذریعہ اولاد پیدا کرنے کے طریقہ میں نسب کی حفاظت ممکن نہیں ہے اور مضرت کے ساتھ ساتھ گنہ کا سبب ہے، لہذا ان مضرات کے پیش نظر منی پاک ہونے کی بناء پر اس کی خرید وفروخت کے جواز کے باوجود اس طرح کے بینک کا قیام جائز نہیں ہے، البتہ اگر بینک میں صرف منی محترم ہی کو لیا جاتا ہو اور ہر ایک کی منی کو باقاعدہ شناخت کے ساتھ رکھا جاتا ہو، نیز کسی بے اولاد جوڑے کو اس کی بیع کے وقت اس بات کو لازمی قرار دیا جاتا ہو کہ اس سے پیدا ہونے والے بچہ کا نسب فلاں سے منسوب ہوگا تو پھر اس طرح کے بینک کا قیام جائز ہے، لیکن یہ مشکل ترین امر ہے۔

☆☆☆